جشن نمبر ۱۹۴۲

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامینِ "ہمایوں"

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۲ء

تصویر:- میاں سر محمد شفیع

میاں محمد شفیع

نیت ایسی نیک کہ زندگی ایک مسلسل مسکراہٹ!

ذکاوت، مشقت، محبت! ان کی فاتحانہ قوت کے ساتھ ہمیشہ خدمت و عزت کی چوٹیوں کی طرف سا

مقتضائے حال کا کارکن ـــ گذشتہ کو بھول کر اپنا مستقبل ہمیشہ اپنے خدا پر چھوڑے ہوئے!

فلسفے کی الجھنوں سے آزاد ـــ بلندیوں اور گہرائیوں کو چلتی پھرتی زندگی کی سطح پر لانے والا، فکر و ندامت

کا منہ اعتقاد و محنت کے شگوفوں سے بھرنے والا، خدائے رحمٰن کے لطف و کرم کا دلی معتقد ـــ مسرور مومن

دوستوں کا شیدائی، دشمنوں کا دوستدار ـــ مخالفت میں مفاہمت کا آرزومند، عناد و فساد میں صلح

کا نعرہ بلند کرنے والا صلح جو رضاکار!

انجمنوں کی روح رواں، محفلوں کا چشم و چراغ، بیواؤں بینواؤں کا ماویٰ و ملجا ـــ اُس کے ند

دولت سے ایک خشک دنیا کی آبیاری۔ اُس کے بحرِ محبت پر ہزاروں دردمندوں کی زندگیاں رواں!

تمدن کا موتی، معاشرت کا چندن ہار ـــ بچوں میں بچہ، جوانوں میں جوان، بوڑھوں میں بوڑھا

سب کا ہم عمر، ہر دلعزیز ہمجولی!

خوبی و خوشنمائی کے پھولوں کا بھونرا، دائمی شباب کی ایک ہنستی کھیلتی مورت ـــ چہرے

دلکشی، چال میں لوچ، قد راست، قامت زیبا، جسم قوی، روح کندن سی!

دریا دل، خوش طبع، شریف دل امیر ـــ صد ہزار آنکھوں کا تارا!

مقرر، مدبر، منتظم ـــ شفیعِ قوم و ملک!

بشیر احمد

میاں سر محمد شفیع

سر محمد شفیع کی زندگی پر ایک نظر

میاں سر محمد شفیع ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء کو بمقام باغبانپورہ (متصل بہ لاہور) پیدا ہوئے۔ وہاں انہوں نے پہلے گاؤں کی مسجد میں پھر سکول میں اور پھر لاہور میں سنٹرل ماڈل سکول، گورنمنٹ کالج اور مشن کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۹ء میں انگلستان کو روانہ ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں وہ بیرسٹر بن کر وطن واپس آئے +

پہلے انہوں نے ہوشیارپور میں وکالت شروع کی۔ تین سال بعد ۱۸۹۵ء میں وہ لاہور چلے آئے اور کئی سال تک یہیں بیرسٹری کرتے رہے + ولایت سے واپس آتے ہی انہوں نے علی گڈھ کی تحریک میں شرکت کی اور برسوں تک وہ سرسید کے ساتھ قومی کاموں میں منہمک رہے۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے مسلم لیگ کی بنیاد میں حصہ لیا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے اور ۱۹۱۲ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن مقرر کئے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے کامیابی کے ساتھ امپیریل کانفرنس پر ہندوستان کی نمائندگی کے حق کا اظہار کیا اور ۱۹۲۳ء میں وہی امپیریل کانفرنس میں ہند کے نمائندے مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۷ء سے کروہ پنجاب کے قابل ترین بیرسٹروں میں شمار ہونے لگے اور بہت جلد سب سے مقتدر اور لائق بیرسٹر تسلیم کئے گئے۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۸ء میں انہوں نے ہائی کورٹ کی ججی قبول کرنے سے انکار کیا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں وزیر تعلیم اور ۱۹۲۲ء میں وزیر قانون مقرر ہوئے۔ جہاں تین سال تک وہ کونسل آف سٹیٹ کے لیڈر اور وائسرائے کی کونسل کے نائب صدر بنے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ لاہور واپس آئے اور یہاں پانچ سال تک اپنی وکالت کے کام میں انہوں نے عدیم النظیر کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں وہ گول میز کانفرنس کے رکن مقرر ہوئے اور وہاں انہوں نے انتہائی قابلیت اور خلوص کے ساتھ اپنی قوم اور اپنے ملک کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں وہ دوبارہ وائسرائے کی کونسل میں رکن تعلیم مقرر ہوئے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۷۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے +

مسلمانوں میں سر محمد شفیع تنہا وہ فرد تھے جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، آل انڈیا اردو کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ ان تین آل انڈیا مجمعوں کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی طرح ہندوستانیوں میں تنہا وہی ایک مدبر تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا میں تین مختلف شعبوں کے ممبر اور دوبار وزیر تعلیم مقرر ہوئے + اس کے علاوہ وہ بیسیوں آور ملکی و قومی انجمنوں کے صدر اور ہزاروں اہم جلسوں جلوسوں کے سرکردہ تھے + اور ایسی پر بس نہیں۔ طول و عرض ہند میں ایسے بہت کم شخص گزرے ہیں

جو اُن کی مانند بیک وقت بیرسٹر، مقنن، سیاست دان، مدبر، مقرر، ماہرِ تعلیم اور مصلحِ قومی ہوں۔ شبانہ روز محنت سے، انہماک و یکسوئی سے، ہمت و استقلال سے اور حیرت انگیز ایمان و امید پسندی سے اُنہوں نے وہ اقتدار و کمال حاصل کیا جو قوم و ملک کے نوجوانوں کے لئے ہمیشہ ایک مشعلِ ہدایت بنا رہے گا۔

وکالت میں اُن کی محنت کا یہ حال تھا کہ رات کے دو دو بجے تک کام میں منہمک رہے اور بعض اوقات ایک سو دو درجے کے بخار میں بھی انہوں نے عدالت میں جا کر تقریریں کیں۔ موکل کے کام کو وہ اپنا کام سمجھتے۔ وکیلی تقریروں میں ان کی پُر زور آواز اُن کا جوش و انہماک اُن کے قاطع دلائل خاص و عام میں مشہور تھے۔ پنجاب میں کسی شخص کی وکالت کبھی اس قدر وسیع و پُر اثر نہیں ہوئی۔ سیاست و تدبر میں وہ اعتدال کے حامی اور مفاہمت کے علمبردار تھے۔ اگر ایک طرف وہ انقلابی تحریکوں سے منحرف تھے تو دوسری طرف وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے خود اختیاری حکومت اور تدریجی آزادی کے سب سے زبردست موید تھے۔ جیسا کہ عموماً ایسے نیک اعتدال پسندوں کا حال ہوتا ہے۔ ایک مدت تک بعض افراد اُن سے بدظن رہے لیکن جب زمانے کا آفتاب بالآخر اُس نیک دل وجود پر چمکا تو اُس کے جوہر دوست دشمن دونوں پر صاف ظاہر ہو گئے۔ دوسری گول میز کانفرنس کی آخری نشستوں میں مسلمانوں کے مخصوص حقوق کی صحیح ترجمانی کرنے کے بعد انہوں نے انگلستان کی قدامت پسند حکومت پر صریح لفظوں میں یہ امر واضح کر دیا کہ مسلمان اس بات پر مصر ہیں کہ ہندوستان کو فی الفور مرکز میں ذمہ داری دی جائے یعنی دنیا کو بتا دیا کہ ہندوستان کے مسلمان غدار نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے وطن کے ایسے ہی سچے خادم ہیں جیسے ہندو یا کوئی اور گروہ۔

تعلیم میں اُن کا ایک یہی کارنامہ کافی ہے کہ اپنی وزارت کے دوران میں انہوں نے ملک میں پانچ بڑی یونیورسٹیاں قائم کیں۔ اصلاحِ معاشرت کے سلسلے میں شمالی ہند میں وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے باوجود شدید مخالفت کے پردے کی مذموم رسم کو علانیہ ترک کیا۔ اور ایک ایسا نیا مخلوط دائرۂ معاشرت قائم کیا جس کے آداب و اطوار پر اُن کا سخت سے سخت مخالف بھی حرف گیر نہ ہو سکا۔

لیکن شاید وہ بات جو اُن کے عزیز اور اُن کے احباب بلکہ اور اصحاب بھی جنہوں نے کبھی چند لمحوں کے لئے اُن سے ملاقات کی یا اُن کو محض دیکھا بھی وہ بات جو لوگ کبھی نہیں بھول سکتے اُن کی امید بھری مسکراہٹ اور اُن کی اک دنیا کا دل موہ لینے والی دریا دل محبت تھی۔ اگر پوچھا جائے کہ وہ کس خاندان سے تھے تو دماغ کچھ کہے لیکن دل یہی گواہی دیگا کہ وہ خاندانِ برمک سے تھے۔ اور وہ شعر جو کسی عربی شاعر نے برامکہ پر لکھا تھا اُن پر خوب صادق آتا ہے کہ "غم اس کا نہیں کہ کوئی گھوڑا یا ہاتھی مر جائے یا بہت سا مال گم ہو جائے بلکہ غم اس کا ہے کہ ایک ایسا شخص مر جائے جس کے مرنے سے ایک عالم مر جائے"۔

آج کروڑوں ہیں جو اُن کی ذات کو ایک قومی نقصان تصور کر رہے ہیں اور سینکڑوں ہزاروں ہیں جن کے لئے اُن کا انتقال ذاتی اور دلی رنج کا جب خسر میں والد کا عکس نظر آتا ہے۔ والد نے انتقال فرمایا تو میرے لئے خسر موجود تھے۔ آفتاب میری آنکھوں سے اوجھل ہوا تو ماہتاب جلوہ گر ہو گیا۔ شاہ دین شفیع قوم میں منعکس تھے۔ آج جہاں وہ ہیں وہیں یہ بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ ہاں میرے دل میں اک یہ آواز صاف سنائی دیتی ہے کہ اُن کے جسم تہِ خاک ہوں لیکن اُن کی روحیں روز و شب ہم سب پر اپنے نور کی بارش کرتی ہیں اور سننے والوں کو ہر لحظہ ہمت و شجاعت کا سبق دے رہی ہیں۔

بشیر احمد

قطعاتِ تاریخ رحلت میاں سر محمد شفیع علیہ الرحمۃ

ببیں بسوئے فلک دِل زار! ایں چہ بارانِ ابرِ نور است
کہ از زمیں تا بہ ماہ و خورشید سر بسر جلوہ ہائے طور است
شفیعِ قومِ محمدی از زمیں بہ عرشِ بریں بیاید
زمیں بنالد فلک بخندد یگانہ باغبان پور است
۱۳۵۰ھ

صد حیف دوستاں! کہ محمد شفیع مُرد
واحسرتا کہ ہمرہِ خود زندگی ببرد
نالند بر مزارِ منوّر بزرگ و خورد
تلخ است آہ زیست کہ شکر فروش مُرد
۱۳۵۰ھ

رُوح میں عزم، دل میں درد، آنکھ میں لُطف، رُخ پہ نُور
رہبرِ قوم سر شفیع حسرتِ باغبان پُور
۱۹۳۲ء

بشیر احمد

نوائے غم

بر وفات آنریبل خان بہادر ڈاکٹر میاں سر محمد شفیع کے سی ۔ ایس ۔ آئی + سی ۔ آئی ۔ ای + ایل ایل ۔ ڈی + ڈی لٹ ۔ بیرسٹرایٹ لا ۔ ممبر اگزیکیٹو کونسل وائسرائے ہند

فسردہ ہو گئی شمع وطن کیوں　　نظر آتی ہے برہم انجمن کیوں
پیام یاس دیتا ہے چمن کیوں　　لہو روتا ہے گردون کہن کیوں

کوئی رہبر جہاں سے چل دیا ہے
مکیں ہے ہے مکاں سے چل دیا ہے!

پڑا ہے قوم کو سردار کا غم　　تجھ ایسے بے ریا غمخوار کا غم
ہوا جسموں کو جان زار کا غم　　نہ دکھلائے خدا ابرار کا غم

ہے منصب نوحہ گر کس کو ملوں میں
ترقی رنج میں ہے کیا کروں میں؟

کرے مہر و وفا اپنوں سے کون اب　　کرے اپنائیاں غیروں سے کون اب
رکھے ہمدردیاں خویشوں سے کون اب　　دعائیں لے تو بیگانوں سے کون اب؟

"غریباں را دل از بہر تو خون است
دل خویشاں نمے دانم کہ چون است"

ہوا ہی جان جسم عارضی تھی　　ہوا سے اس جہاں کی زندگی تھی
یہ کب کی اس ہوا کو دشمنی تھی　　ہوا تجھ کو یہ کیا ہو کر لگی تھی

رفاقت عمر بھر کی چھوڑ دی کیوں؟
عدو ہو کر ہوا تجھ کو لگی کیوں؟

بھنور میں قوم کی کشتی پھنسی ہے اندھیری رات سر پر چھا رہی ہے
نہیں منہ موڑنے کی یہ گھڑی ہے تجھے کیوں ناخدا نیند آ گئی ہے

بھنور میں ناخدائی اب کرے کون
ہزاروں کی بھلائی اب کرے کون؟

ہمیشہ نیکیاں کرتا رہا تُو جہاں میں نام اپنا کر گیا تُو
یہاں بھی قوم کا سردار تھا تُو وہاں بھی عرش کا تارا بنا تُو

سفارش تُو رہا لوگوں کی کرتا
شفیعِ دو جہاں کا اُمّتی تھا

بکھیرے نیکیوں کے پھول تُو نے لٹائے حکمتوں کے پھول تُو نے
کھلائے خوبیوں کے پھول تُو نے سمیٹے رحمتوں کے پھول تُو نے

وطن کا مہرِ فیض آثار تھا تُو
کہ رفعت کا علمبردار تھا تُو

چمن کا بوٹا بوٹا نوحہ خواں ہے زمیں ساکت پریشاں آسماں ہے
فسردہ صبحِ حیراں کا سماں ہے ہوا کیسا یہ صدمہ ناگہاں ہے

"برفت آں گلبنِ خرّم بباد ے
دریغا ماند و فریاد و دادے"

ح - ب

سر محمد شفیع

کارزارِ زیست میں اک قلعہ تھا تیرا وجود — موت نے یہ قلعۂ مضبوط بھی سر کر لیا
خیر و خوبی۔ علم و فن۔ عقل و خرد۔ الطاف و جود — یہ خزانہ خاک نے دامن میں کیونکر بھر لیا

اے یتیموں کے ولی۔ بیواؤں کے درد آشنا — ننھے بچے اور مائیں یاد کرتی ہیں تجھے
زندگی بھر جن کی غربت کا تجھے احساس تھا — اُن غریبوں کی دعائیں یاد کرتی ہیں تجھے

دل کسی کا بھی نہیں تُو نے دُکھایا عمر بھر — اس لئے مرنے سے تیرے دُکھ گیا ہر ایک دل
لے کے تیرا نام کہتا ہے یہ ہر فردِ بشر — نیک سیرت نیک طینت نیک خصلت نیک دل

زندگی تیری نمونہ تھی زمانے کے لئے — جب تلک زندہ رہا۔ زندہ رہا عزّت کے ساتھ
اور جب راہی ہوا جنّت بسانے کے لئے — ہم سفر ہے روح تیری سرمدی راحت کے ساتھ

تھا ہمیشہ امن و صلح و آشتی تیرا چلن — تیری کوشش تھی کہ مٹ جائیں یہ سب جنگ و جدل
اب تجھے کھو کر بہت پچھتائے گی خاکِ وطن — اب بڑی مشکل سے پائے گی ترا نعم البدل

اے تیری اولاد ہو دنیا میں شاد و بامراد! — تیری ہی رفعت کو پہنچیں تیرے اقبال و رفیع!
اے تیرا رتبہ ہو دنیا سے بھی عقبیٰ میں زیاد! — تیرا حامی ہو خدا، تیرا محمدؐ ہو شفیع

حفیظ

صدائے ماتم

پلٹا لیا جو چرخ ستمگر نے ناگہاں
پھولے پھلے چمن پہ مسلط ہوئی خزاں
منہ کو کلیجے آتے ہیں آنکھیں ہیں خوں فشاں
وہ زخم چشم قوم کو پہنچا کہ الاماں
تا حشر جس کے درد سے راحت نہ پائینگے
ہم سینہ چاک خون کے آنسو بہائیں گے

ہیہات سر شفیع کا ہونا تھا انتقال
اس وقت جب کہ قوم ہے بے حد شکستہ حال
لایا ہے رنگ ملک میں تفریق کا سوال
ہوتے نہیں ہیں منتشر افرادِ ہم خیال
زوری دکھا رہی ہیں بہت خود پسندیاں
پھیلی ہوئی ہیں چاروں طرف فرقہ بندیاں

وابستہ ایک شخص سے تھی سب کی آرزو
تھا جو کہ قوم پرور و ہمدرد و نیک خو
رہتا تھا بہرِ صلح جو سرگرمِ جستجو
کرتا تھا اتحاد کی ہر وقت گفتگو
افسوس ہے وہ انجمن آرا نہیں رہا
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا نہیں رہا

دار العلوم جس نے ہر اک جا بنا دیئے
پردے جہالتوں کے دلوں سے اٹھا دیئے
اُجڑے ہوئے دیار میں گلشن کھلا دیئے
دستِ کرم سے فیض کے دریا بہا دیئے
جس پر نگاہ ڈال دی خوش حال کر دیا
بدقسمتوں کو صاحبِ اقبال کر دیا

گو اُٹھ گیا جہان سے وہ مردِ نیک نام
باقی رہے گی اُس کی مگر شہرتِ دوام
احسان اُس کا بھول نہ جائینگے خاص و عام
تا دیر ذکرِ خیر رہے گا بہ احترام
تاریخ لکھی جائے گی ہر اک زبان میں
ہاں کوئی شخص گزرا ہے ہندوستان میں

صد حیف حال قوم کا اس وقت ہے سقیم
اس سانحے نے کر دیئے لوگوں کے دل دو نیم
اور روتے دھوتے رہ گئے اسلام کے یتیم
لیکن رہا وہ ہو کے جو ہونا تھا اے فہیم
ملتی ہے کس کو موت کے ہاتھوں رہِ مفر
دامن سے اشک پونچھ کے بس تھام لے جگر

بے سود ہے یہ آہ و فغاں گریہ و بکا
وہ راہیِ عدم کبھی واپس نہ آئے گا
رہنا نہیں کسی کو بھی اس بزم میں سدا
بس اب حضورِ قلب سے لازم ہے یہ دعا
پس ماندگاں کو صبر و تحمل عطا کرے
مرحوم سر شفیع پہ رحمت خدا کرے

فہیم بیگ چغتائی

اُردو شاعری اور مُلکی سرمایہ

شاعری میں ملکی وغیر ملکی خصوصیات کی کاوا کی ظاہر ہو جانے کے بعد ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کیا فی الحقیقت تشبیہ اور استعارے کے لئے جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں اُن کا مرئی، مقرون و محسوس ہونا بھی ضروری ہے؟ کیا اَن دیکھی چیزوں کی تشبیہ لطیف و موثر نہیں ہوسکتی؟ کیا قریب کی اشیا، دور کی چیزوں سے زیادہ تعجب خیز و مسرت بخش ہوتی ہیں؟ کیا مستحضرات کا بیان ماضیات کے حوالہ سے زیادہ دلپذیر و انبساط انگیز ہوتا ہے؟ جہاں تک تاریخی واقعات و روایات سے ثابت ہے۔ حال کے مقابلہ میں ماضی زیادہ حیرت انگیز و پُرلطف ہوتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کی رنگ آمیزی گذشتہ واقعات کو نہایت شاندار بنادیتی ہے۔ بسا اوقات قدامت کے ساتھ تقدس بھی وابستہ ہو جاتا ہے۔ اساطیر الاولین کی طرح حالیہ واقعات دلکش نہیں ہوتے۔ اخبارات میں جو واقعات درج ہوتے ہیں اُن کی دلچسپی عارضی و ہنگامی ہوتی ہے عجیب سے عجیب باتوں کا چرچا بھی دو چار روز سے زیادہ قائم نہیں رہتا۔ لیکن قدیم واقعات و روایات کے ساتھ سرمدی دلچسپیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ ادبی روایات ملکی۔ قومی اور مذہبی بندشوں سے آزاد ہوتی ہیں۔ اور اُن کی دلکشی تاریخی تحقیق کی رہینِ منت نہیں۔ جامِ جم۔ آئینہ سکندر۔ مارِ ضحاک۔ ارژنگِ مانی کو تاریخی تحقیقات بے بنیاد قرار دیتی ہے لیکن ادب و شاعری کو اس فیصلہ کی مطلق پروا نہیں۔ شاعری میں یہ چیزیں ہمیشہ سے استعمال ہوتی آئی ہیں۔ بچپن ہی سے ہمارے کان اِن سے آشنا ہیں۔ ان کا تصوّر ہمارے ذہن میں حقیقی واقعات کے تصوّر سے کہیں زیادہ واضح و روشن ہے۔ یہ باتیں ہمارے ادب و شاعری کا جزوِ لاینفک بن گئی ہیں۔ اگر کوئی وطن پرست طبقہ اُن کے بجائے نئی ملکی اشیا کی تلمیحیں تجویز کرے تو وہ نامرغوب۔ اجنبی اور غیر مانوس ثابت ہونگی۔ اسی طرح تشبیہ و استعارہ کے لئے بھی ملکی و مقامی اشیا کی شرط بالکل غیر ضروری ہے۔ اُن کے انتخاب و استعمال کا انحصار اہلِ زبان کے مذاق و میلانِ طبعی پر ہے۔ ہندی کے کوی (شاعر) کو ہاتھی کی چال اس قدر پسند ہے کہ وہ اس سے معشوق کی رفتار کی تشبیہ دیتا ہے۔ لیکن اس بھدّی اور بھونڈی چال پر اردو شاعری کی بھویں تن جاتی ہیں۔ اس کے نزدیک وہ رفتار ہی کیا جو ہنگامۂ محشر اور فتنۂ قیامت نہ برپا کردے۔ اسی طرح مہاراج تلسی داس کو برسات کے موسم میں تالاب کے مینڈکوں کی ٹرٹر ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اسے پاٹھ شالا میں لڑکوں کی ویدخوانی سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن ایرانی شاعر کا ذوقِ سماعت ذرا سی بے ترتیل قرأت سے اپنی بیزاری اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ:۔

"اگر تو قرآں بدیں نمط خوانی   ببری رونقِ مسلمانی"

انگریزی مذاق بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں کا گرویدہ ہے لیکن ہمارے مذاق میں وہ خوش آئند نہیں چینی طبائع کو چشم محبوب کی تشبیہ ایک گول آنکھ کی مچھلی سے دینا پسند ہے۔ مگر اردو کے شاعر اس لبانہ تشبیہ سے سخت بیزاری محسوس کریں گے۔ عرب کے لئے اونٹنی عجیب معشوقہ ہے لیکن اردو کا شاعر غزال کے بدلے اونٹنی لینا پسند نہ کرے گا۔ غرض کہ ہر قوم کا مذاق و پسند جداگانہ ہوتا ہے جس زبان کی جو خصوصیات مقرر ہو چکی ہیں اور جو ادبی روایات مدت سے راسخ چلی آرہی ہیں وہی اس کی شاعری کے لئے باعثِ زینت ہیں۔ زبانوں کا باہمی رشتہ و تعلق اُن کی خصوصیات کی ہم رنگی۔ یکسانی و ہم آہنگی پر قائم ہے نہ کہ قربِ مکانی و زمانی پر۔ اردو کو فارسی سے گہرا لگاؤ ہے ویسا اس کو کسی ہندوستانی زبان سے نہیں ہے۔ بھاشا کی اکثر و بیشتر تشبیہیں۔ استعارے اور تلمیحیں اردو شاعری کے لئے بالکل اجنبی و غیر مانوس ہیں۔

یونانی و رومی صنمیات اور مسیحی روایات و مقامات تاریخی و جغرافیائی لحاظ سے اہلِ انگلستان کے لئے بالکل اجنبی و غیر ملکی ہیں لیکن ادبی لحاظ سے وہ ملکی واقعات و مقامات سے زیادہ مانوس۔ مشہور اور دلچسپ ہیں۔ انہیں سے انگریزی شاعری کی زینت ہے۔ اور شاعری ہی کی بدولت انگلستان کا بچہ بچہ ان سے پوری پوری واقفیت اور دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی طرح اردو شاعری کی بعض تشبیہیں اور تلمیحی واقعات جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے غیر ملکی سہی لیکن بچپن سے انہیں سنتے سنتے ہمارے کان اُن سے اس قدر آشنا ہو گئے ہیں اور اُن کی ایسی واضح و روشن تصویریں ہماری لوحِ ذہن پر مرتسم ہو گئی ہیں کہ اُن میں اور مرئی و محسوس اشیا میں مطلق فرق باقی نہیں رہا ہے۔ اگر کسی نے سنبل و ریحان۔ جیحون و سیحون۔ بحرِ ظلمات۔ آئینۂ سکندر۔ ہما و عنقا اور کوہ قاف کی پریوں کو اپنی جسمانی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے تو کیا مضائقہ؟ اپولو۔ منروا۔ مڈس۔ پروسپرن۔ آرگس۔ بیکس۔ ہڈرا۔ ہارپیز۔ لیتھ (دریائے فراموشی) وغیرہ کو یا کلپ برکش (نخلِ مراد) اندراسن۔ اپسرا۔ گج مکتا پھل۔ سومیرو پربت۔ مدرستھن۔ سمدر پرنتھن۔ وغیرہ کو کس نے دیکھا ہے؟ لیکن شاعروں نے ان تمام چیزوں کی نہایت صاف اور روشن تصویریں ہماری چشمِ تخیل کے آگے پیش کی ہیں۔ دنیا کے دو جلیل القدر شاعر ہومر اور رودکی نابینا تھے۔ ملٹن بھی اخیر عمر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا۔ اگر انہوں نے تشبیہ و استعارہ کی چیزوں کو جسمانی و ظاہری آنکھوں سے نہ دیکھا تو کیا ہرج ہوا۔ اُن کی باطنی آنکھوں نے عالمِ کائنات کے ایسے ایسے پر اسرار منظر دیکھے جن کے مشاہدے کی بڑے بڑے دیدہ وروں اور صاحب نظروں کو بھی حسرت ہی رہ گئی۔ بات یہ ہے کہ شاعری کی تخئیلی و مثالی دنیا عالمِ آب و گل سے زیادہ دلکش ہوتی ہے تشبیہ و استعارہ اور تلمیح کے لئے لطافت شگفتگی۔ مانوسیت اور واقفیت شرط ہے۔ دیکھی یا ان دیکھی یا ملکی یا غیر ملکی چیزیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

بسا اوقات ان دیکھی چیزیں بہت زیادہ مرغوب و دل پسند ہوتی ہیں جب تک ہم اُن سے صورت آشنا نہیں

ہمارے ذہن میں اُن کا نہایت وسیع و شاندار تصوّر قائم رہتا ہے لیکن اُنہیں دیکھ لینے پر اگر ہم اُن کو جیسا سمجھتے تھے ویسا نہیں پاتے تو ہمیں ایک گونہ مایوسی ہوتی ہے۔ نرگس کو چشمِ جاناں سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ جنہوں نے نرگس نہیں دیکھی ہے وہ معلوم اُسے کتنا خوبصورت۔ رسیلا، مستانہ، مخمور، نورانی اور دلفریب تصور کرتے ہونگے۔ لیکن نرگس کو جسمانی آنکھوں سے دیکھ لینے پر پہلا سا لطف باقی نہیں رہتا۔ لہذا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ "جن چیزوں کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ان کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کو سمجھنا اور اُن سے لطف اٹھانا ممکن نہیں"۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی چیز کی مختلف کیفیتوں اور حالتوں کو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کام تو حکمت اور سائنس کا ہے۔ شاعر کو ان تمام باتوں سے کوئی غرض نہیں کہ نرگس کا پودا کتنا بلند ہوتا ہے۔ اس کی عمر کیا ہوتی ہے؟ وہ کس جنس سے تعلق رکھتا ہے؟ اس جنس کے اور کون کون سے انواع ہیں۔ اس کا پھول کب تک تروتازہ رہتا ہے؟ اس کی نشوونما کے لئے کس قسم کی زمین اور کتنی رطوبت درکار ہے؟ اس میں کتنے برگ ہوتے ہیں؟ اس کے خول اور ریزے کیسے ہوتے ہیں؟ اس کے حقہ۔ سرنقچہ اور زرِ زر کہاں واقع ہیں؟ اس قسم کی تفصیلی معلومات کی ضرورت صرف علمِ نباتات کے طالب علموں کو ہوگی۔ شاعری سے لطف گیر ہونے کے لئے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ نرگس ایک خوشنما پھول ہے جو آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سکندر کے سوانح حیات۔ اس کی تمام فتوحات۔ اس کے فوجی انتظامات و ملکی اصلاحات اس کی کشورکشائیوں اور ملک گیریوں کے واقعات سے شاعر کو کوئی سروکار نہیں۔ البتہ مورخ کو ان باتوں کے جاننے اور تحقیق کرنے کی ضرورت ہے لیکن شاعر تو صرف یہ جانتا ہے کہ سکندر ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا خضر کی رہبری میں آبحیات کی تلاش کو نکلا اور بحرِ ظلمات تک پہنچ کر ناکام و نامراد واپس ہوا۔ سب سے پہلے اسی نے لوہے کو جلا دے کر آئینہ تیار کیا۔ اور دنیا کو یاجوج ماجوج کی غارت گری اور ہلاکت باری سے بچانے کے لئے سدِّ سکندری تعمیر کرائی۔ بھلا ان فرضی باتوں کو تاریخ سے کیا تعلق؟ الغرض شاعری سے مسرت اندوز ہونے کے لئے کسی شے کو دیکھنے اور اُس سے متعلق علمی تحقیق و تفتیش کی مطلق ضرورت نہیں۔ شاعری کسی چیز کے جس پہلو کو پیش کرتی ہے فقط اسی کا چشمِ تخیل سے مطالعہ کافی ہے۔ شمشاد کو اگر کسی ہندوستانی طالبعلم نے نہ دیکھا ہو تو مضائقہ نہیں۔ شاعری نے بچپن ہی سے ہمیں اس سے روشناس کرا دیا ہے۔ ذہن نے اس کا جو تصوّر قائم کر لیا ہے وہ لطف اندوزی کے لئے کافی ہے۔ علاوہ بریں تخیلی شمشاد قدِ یار سے جو مناسبت رکھتا ہے وہ غالباً حقیقی شمشاد نہیں رکھتا۔ شمشاد کو دیکھ لینے پر اغلب ہے کہ ہماری دلچسپی میں قدرے کمی واقع ہو جائے۔

ایک قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ تشبیہ و استعارہ کے سامان غیر ملکی ہی کیوں نہ ہوں لیکن اُن کی کثرتِ استعمال نے انہیں مشبہ و مستعار کا ہم معنی بنا دیا ہے۔ مثلاً نرگس کے معنی صرف ایک پھول ہی کے نہیں ہیں جس سے آنکھ کی تشبیہہ دی جاتی ہے بلکہ خود لفظ نرگس کے اصطلاحی معنی چشمِ یار کے ہوگئے ہیں۔ نرگس کا لفظ سنتے ہی ہمارا ذہن چشمِ محبوب کی جانب منتقل ہو جاتا ہے شمشاد کا لفظ کان میں پڑتے ہی قامتِ یار کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ اسی طرح تیر اور نظر، کمان اور ابرو، آتش

اور رخسار۔ سرو اور قامت۔ عارض اور گل میں صرف مشبہ اور مشبہ بہ کا تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے مترادف الفاظ کی طرح استعمال ہونے لگے ہیں۔ وہ ادب و شاعری کا جزوِ بدن اور فرہنگِ مترادفات کا سرمایہ بن چکے ہیں۔ ان کا اخراج در اصل الفاظ و معنی کا اخراج بلکہ اعضا و جوارح کی قطع و برید کے مماثل ہے اردو شاعری سے انہیں خارج کر کے اُن کے بدلے دیسی یا ملکی تشبیہیں اور استعارے اختیار کرنا ٹھیک ویسا ہی ہوگا جیسے کوئی وطن پرستی کے جنون میں اپنے پاؤں کٹوا کر کاٹھ کے پاؤں یا اپنی آنکھیں نکلوا کر پتھر کی آنکھیں لگا لے اور لوگوں سے فخریہ کہتا پھرے کہ میرے پاؤں دیسی بڑھئی کے اور میری آنکھیں ملکی چشم ساز کی بنی ہوئی ہیں۔

ہمارے قدما تمام گروں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اِن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی لیکن وہ فرقہ وار جھگڑوں اور مذہبی تنگ نظریوں کا زمانہ نہ تھا۔ سب مل کر شیر و شکر کی طرح رہتے تھے۔ اردو کو اپنی مشترکہ زبان سمجھتے تھے شاہدِ سخن پر دونوں یکساں طور پر فریفتہ تھے۔ اردو شاعری پر دونوں کی مربیانہ نگاہ تھی۔ وہ اس کی تمام خصوصیات اور فطرت و طبیعت سے واقف تھے۔ وہ اسے تمام ملکی و سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور مقامی و جغرافیائی حدود بندیوں سے بالاتر خیال کرتے تھے۔ شاہدِ اردو کو انہوں نے وہی لباس پہنایا جو اس کے لئے موزوں تھا۔ اسے انہیں زیوروں سے مزین کیا جن کا بار اُس کی نزاکت برداشت کر سکتی تھی۔ اُسے وہی غذا دی جو اس کے مرغوب خاطر تھی اور اس کو اسی راستہ پر چلایا جو صاف ستھرا تھا۔ ہندو شعرا بھی وضع کے بڑے پابند تھے۔ وہ بھی اپنی تصنیفات کی ابتدا حمد و نعت اور منقبت سے کرتے تھے۔ زبان کے جو اصول۔ صرف و نحو کے جو قاعدے۔ الفاظ و محاورات کے جو نمونے۔ فصاحت و بلاغت کے جو معیار۔ تشبیہات و تلمیحات کے جو ضابطے مقرر تھے ان کی وہ سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ادب و شاعری میں ملکی و غیر ملکی سرمایہ کا متنازعہ مسئلہ کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں گذرا ہوگا۔ وہ اتحاد و اتفاق کا زمانہ تھا۔ خیر و برکت کا دور تھا۔ ملک میں شیر و شہد کی ندیاں بہتی تھیں۔ زمین نمونۂ بہشت بنی ہوئی تھی۔ ہندوستان بجا طور پر جنت نشان کہلاتا تھا۔ اب آنکھیں اُس دن کے لئے ترستی ہیں۔ نگاہیں اُن مقدس ہستیوں کو ڈھونڈتی ہیں لیکن مایوس ہو کر خانۂ چشم میں ملپٹ آتی ہیں۔ آج وہی خوش نصیب ملک تمام بلاؤں کا نزول گاہ بنا ہوا ہے۔ ہر جگہ نفاق اور پھوٹ کا خوفناک منظر دکھائی دیتا ہے کہیں سیاسی جماعت بندیاں ہیں کہیں معاشری انجمن آرائیاں۔ کہیں مذہبی تفرقہ اندازیاں ہیں کہیں قومی ہنگامہ آرائیاں۔ کہیں انفرادی فتنہ خیزیاں ہیں۔ کہیں سماجی شر انگیزیاں۔ ایک ادب و شاعری کا میدان بچا ہوا تھا وہاں بھی اب لسانی فرقہ بندیاں شروع ہو گئی ہیں اور کئی حریفانہ اکھاڑے قائم ہو چکے ہیں۔ بیچاری اردو کی جان ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں ہے۔ کوئی اس کو اس کے مادری ترکہ سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ کوئی اسے ہندی لباس میں جلوہ گر ہونے کی صلاح دیتا ہے۔ کوئی اس کے اعضا و جوارح کی قطع و برید کی فکر میں ہے۔ کوئی اسے بھاشا کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی ہدایت کرتا ہے لیکن ابھی تک اس کی غیرت و خودداری نے اس کو بھاشا کی گدایانہ خوشہ چینی سے اور اُس کی ہمت و پامردی

نے اسے ہندی کے آگے سپر انگن ہونے سے باز رکھا ہے۔

کچھ اردو ہی پر موقوف نہیں بلکہ دنیا کی کوئی مہذب زبان کسی مصلحت کی بنا پر اپنی لسانی خصوصیات اور قدیم روایات سے دستبردار ہو کر اپنی مستقل ہیئت وصورت بگاڑنا گوارا نہیں کرسکتی۔ اگر انگریزی شعرا کو کوئی شخص یہ صلاح دے کہ وہ انگریزی ادبیات سے تمام صنمیاتی واقعات کو خارج کردیں کیونکہ ان کا تعلق قدیم یونان اور روما سے ہے یا کل مسیحی روایات ومقامات کو ترک کردیں کیونکہ وہ فلسطین اور شام کے ملکوں سے وابستہ ہیں تو کیا انگلستان کے شاعر اس مشورہ کو قبول کریں گے ؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ جواب دیں گے کہ "یہی غیر ملکی عناصر تو انگریزی ادب وشاعری کا سنگِ بنیاد ہیں۔ ان کو ہٹاتے ہی ساری ادبی عمارت آن کی آن میں منہدم ومسمار ہو جائے گی۔ یہ عناصر غیر ملکی سہی لیکن اب وہ انگریزی شاعری کے اپنے خمیر میں داخل ہو چکے ہیں۔ ان سے کسی قسم کی غیریت واجنبیت باقی نہیں رہی۔ انگلستان کے بچّے بچّے کو ان سے یگانگت اور مانوسیت ہوگئی ہے۔ وہ اب انگریزی ادب کا ذاتی سرمایہ ہیں" آج ہندوستان میں انگریزی زبان کا دور دورہ ہے۔ جو شخص انگریزی نہیں جانتا اُس کو مہذب سوسائٹی میں کوئی وقیع جگہ نہیں ملتی۔ ملک کے مختلف حصوں میں بیسیوں یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ اگرچہ عام طور پر وہ محض "منشی گر" "مشین گر" سمجھی جاتی ہیں تاہم اُن میں سے بعض ایسے دل ودماغ والے انسان بھی نکلے ہیں جو انگریزی زبان میں شعر گوئی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی سرمایۂ ملکی کا حامی انگریزی شاعری کی لسانی خصوصیات اور مقررہ اصول سے منحرف ہو کر معشوقۂ مغرب کے سنہری بالوں کو کتر ڈالے اور اُس کے سر پہ کالے ناگ لہرانے دے۔ اس کے سیمیں بدن کو سیاہ رنگ کر شیام برن یا میگھ برن بنا دے اور اُس کی چشم نیلگوں کو کاجل لگا کر بھنورے جیسا کالا کر دے۔ اور اظہارِ شوخی کے لئے اس کی چتون میں ممولے کی اچپلاہٹ بھی بھر دے تو کوئی انگریز عاشق خواہ وہ کتنا ہی دل پھینک کیوں نہ واقع ہُوا ہو ایسی بھیانک محبوبہ کی طرف شاید نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا بلکہ عجب نہیں کہ اُسے دیونی یا بھتنی سمجھ کر دور بھاگے۔ اسی طرح اگر آپ کے اردو کے شاعر کے سامنے ایک ایسا ملکی محبوب پیش کریں جو چنپک برنی ہو۔ ہتھنی کی چال چلتا ہو جس کی آنکھیں آم کی پھانک اور ناک طوطے کی چونچ جیسی ہو اور گردن صراحی دار ہو تو وہ شاید ہی ایسے معشوق کے لئے آغوشِ محبت وا کرے۔ اب اسی اردو شاعر کو ایک ایسا معشوق دکھا دیجئے جو برقِ تبسم۔ تیرِ نظر۔ کمانِ ابرو۔ دشنۂ ناز اور خنجرِ غمزہ سے مسلح ہو جس کی ہر ادا محشر در آغوش ہو جس کی رفتار قدم قدم پہ قیامت برپا کرتی ہو ممکن ہے کہ ہندی کا کوی اور انگریزی کا شاعر اس سپاہی منش محبوب سے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہو لیکن اردو کا شاعر ان تمام ستم نمائیوں اور ظلم آرائیوں کے باوجود اس کی طرف نہایت گرمجوشی کے ساتھ بڑھتا ہے۔ دستِ تمنا دراز کرتا ہے اور وفورِ شوق سے کہتا ہے ؎

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ۔۔۔ کاشکے تم میرے لئے ہوتے ۔۔۔ (غالب)

صاف ظاہر ہے کہ ہر زبان کی شاعری کو اپنی ہی خصوصیات پسند ہیں خواہ وہ اوروں کی نگاہ میں بھلی معلوم ہوں یا

بُری ہے وہ اپنے حدود میں اغیار کی مداخلت گوارا نہیں کر سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری کی سرحد سے بھاشا کے ڈانڈے ملے ہوتے ہیں لیکن اردو شاعری کی غیور طبیعت ایسی رواداری کی سخت مخالف ہے جس سے اس کے ہمسایہ کو اس کے چمنستان میں آزادی کے ساتھ گلگشت کرنے اور اس کے بعض تختوں اور روشوں میں اپنے پودے لگانے کا موقع ملے جس سے اُس کے فطری حسن و لطافت میں فرق آجائے۔ تاہم "ہماری شاعری" کے مولف صاحب سیاسی و معاشری معاملات کی طرح ادبی معاملات میں بھی مصلحت آمیز دلی کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ اردو ادب کی محفلِ آرائش میں خالص دیسی چیزیں بھی استعمال کی جائیں۔ ہندوستانی رسموں۔ ہندوستانی روائتوں۔ ہندوستانی حکایتوں سے بھی کام لیا جائے۔ رستم و سہراب کی صف میں بھیم و ارجن کو بھی جگہ دی جائے۔ شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے پہلو میں نل اور دمن۔ دشینت اور شکنتلا بھی بٹھائے جائیں۔ بلبل کے نغموں اور قمری کے نالوں کے ساتھ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک بھی سنائی جائے۔ کوہِ طور اور کوہِ قاف کے ساتھ ہمالیہ پہاڑ اور سمیرو پربت کی بھی سیر کی جائے۔ سرو و شمشاد کے ساتھ کلپ برکش اور اکشے بٹ کی بھی ہوا کھائی جائے گل و یاسمن کے ساتھ کنول اور کوکا بیلی کی بہار بھی دیکھی جائے۔ جہاں چمن میں آتشِ گل سے شعلے اٹھاتے ہیں۔ وہاں جنگل میں ڈھاک کے پھولوں سے بھی آگ لگائیں۔ جہاں دیدہ دلبر نرگس سے نگاہ بازیاں کرتے ہیں وہاں شرمیلی لاجونتی کی ادائیں بھی دیکھیں"۔ لیکن ادب و شاعری کی محفل کوئی تنقیدی مجلس یا تشریعی ایوان نہیں ہے جہاں ہر فرقہ اور ہر جماعت کے نمائندوں کے لئے آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کرنے کی ضرورت ہو اگر بزم ادب کوئی سیاسی مجلس ہوتی تو البتہ رستم و سہراب کی صف میں بھیم و ارجن کو جگہ دی جاتی اور شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے پہلو میں نل و دمن اور دشینت و شکنتلا بھی بٹھائے جاتے۔ اقلیم سخن میں ہمیشہ حریت و آزادی کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔ قلمرو سخن اپنے آزادانہ قواعد و ضوابط رکھتی ہے۔ کسی قوم کی سلطنت تباہ ہو سکتی ہے۔ اُس کی حکومت مٹ سکتی ہے۔ اُس کے کندھے پر غیر ملکی جوا رکھا جا سکتا ہے۔ وہ کسی فاتح قوم کی حلقہ بگوشی پر مجبور ہو سکتی ہے لیکن اس کے ادب و شاعری کی اقلیم اغیار کی مداخلت سے بری رہتی ہے قلمرو سخن کی آزادی سلب نہیں ہو سکتی۔ اس اقلیم میں کوئی شے راہ نہیں پا سکتی جب تک وہ اس کے معیار مقررہ پر پوری نہ اترے وہاں انہی چیزوں کی درآمد ہو سکتی ہے جن کا داخلہ اس کے مخصوص آئین و قانون کی رو سے ممنوع نہ ہو۔ اس کے حدود میں وہی اجانب داخل ہو سکتے ہیں جن کو تاجدارانِ سخن نے پروانہ راہ داری عطا کیا ہو۔

"ہماری شاعری" کے فاضل مؤلف اردو ادب کی محفل میں خالص ہندی عناصر کو جگہ دینے کی پر زور سفارش کرتے ہیں لیکن ادب کی محفل بہت وسیع ہے۔ اس میں نظم، نثر، تاریخ، افسانہ، تمثیل، شاعری سب کچھ شامل ہے۔ بحیثیت مجموعی اردو ادب میں ہندی قصص، ہندی روایتوں، ہندی رسم و رواج، ہندی پیداوار، ہندی الطال، ہندی تقاریب، ہندی مناظر و مرثیا وغیرہ ضرورت سے زیادہ جگہ پا چکے ہیں۔ ابتدا ہی سے محفل ادب کی آرائش کے لئے ہندوستانی ساز و سامان

بھی استعمال ہوتے آئے ہیں۔ شاعری میں بھی جہاں تک سماں بندی۔ وصف نگاری اور واقعہ گوئی وغیرہ کا تعلق ہے ہندی عناصر کی کمی نہیں۔ خارجی شاعری نے بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ ہندی چیزوں سے اپنی محفل کو آراستہ کیا ہے۔ شاعری کے دو اہم اجزا مادہ اور صورت یا مضمون اور اسلوب ہیں۔ مادہ و مضمون کے لحاظ سے ہندی قصوں۔ روایتوں جانوروں، پرندوں، دریاؤں، پہاڑوں، موسموں اور نباتاتی پیداواروں کو اردو شاعری میں کافی جگہ مل چکی ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے منثور و منظوم ترجمے ہو چکے ہیں۔ نل اور دمن۔ دشینت اور شکنتلا۔ وکرم اروسی کے علاوہ اور بہت سے قصے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ کوئل۔ پپیہا۔ گنگا۔ جمنا۔ ہمالیہ۔ بندھیاچل وغیرہ پر نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ صبحِ بنارس، شامِ اودھ۔ برسات، بسنت، ہولی، دیوالی کی دلکش تصویریں کھینچی جا چکی ہیں۔ اب زیادہ حرص بڑھانا بےکار ہے کیونکہ ہر شے کی زیادتی بیزارکن ہوتی ہے۔

اب ہمیں داخلی شاعری پر غور کرنا چاہئے۔ فی الحقیقت داخلی شاعری ہی اصل شاعری ہے جس میں امورِ ذہنیہ، وارداتِ قلبیہ، احساساتِ لطیفہ، جذباتِ عالیہ اور خیالاتِ پاکیزہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اکثر نقادانِ فن تو خارجی شاعری کو محض نظم نگاری کے مترادف خیال کرتے ہیں جو گرمی، تڑپ اور تاثیر سے معرا ہوتی ہے۔ داخلی شاعری کی مشہور و اہم صنف غزل ہے۔ اردو شاعری میں غزل ہی کا سرمایہ سب سے زیادہ ہے اور آج بھی اسی صنف پر بکثرت طبع آزمائیاں کی جاتی ہیں۔ یہی صنفِ سخن یعنی غزل اصل شعریت کی حامل ہے۔ غزل میں ہندی عناصر کے جگہ پانے کا بہت کم موقع ہے اس کی محفل کی زینت ہندی ساز و سامان سے بجائے بڑھنے کے اور گھٹ جائے گی۔ یہاں فارسی الفاظ کی شیرینی و شگفتگی اور فارسی کی دلآویز و لطیف ترکیبوں کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ غزل کی لطافت و نزاکت۔ دشینت، کلپ برکش، اکھشے بٹ، کوکا بیلی، ڈھاک وغیرہ کی کرختگی۔ ثقالت اور غرابت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ان میں سب سے سہل التلفظ غالباً ڈھاک کا لفظ ہے تاہم اس کی ثقالت کا یہ حال ہے کہ اگر اسے کسی شعر میں باندھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ بم کا گولہ رکھا ہوا ہے جس کے دھماکے کے ڈر سے شاید ہی دوسرے نازک طبع الفاظ اس کے پہلو میں بیٹھنا پسند کریں۔ جب غزل میں خود فارسی و عربی کے غیر مطبوع و دقیق الفاظ کو جگہ نہیں ملتی تو اس میں ہندی کے ثقیل و اجنبی الفاظ کی گنجائش کہاں؟ غزل کا ہر شعر ایک مکمل واقعہ۔ جذبہ یا خیال کی تصویر ہوتا ہے۔ وسیع سے وسیع اور نازک سے نازک خیال کو صرف دو مصرعوں میں ادا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اسی لئے غزل کا اختصار دراصل اعجاز کہلاتا ہے۔ فارسی اضافت فارسی حروفِ عطف اور فارسی نازک و لطیف ترکیبوں کے ذریعہ سے شاعر کو اختصار پیدا کرنے میں بڑی سہولت واقع ہوتی ہے۔ مثلاً

لٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے
بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے

یہاں "تبسمِ عاجز نواز" کی دلآویز و لطیف ترکیب نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اس اعجاز نما اختصار کی نظیر ہندی

ں کہاں مل سکتی ہے۔ ہندی الفاظ کے ذریعہ اگر ہم "تنبیہ عاجز نواز" کا مفہوم ادا کرنا چاہیں تو اس کے لئے کئی جملے درکار ہونگے۔ پھر بھی وہ کیف، وہ دل کشی، وہ اثر پیدا نہ ہوگا جو اس لطیف فارسی ترکیب کا منت پذیر ہے۔ فارسی کی خوشنما ترکیبیں آواز میں شیرینی اور ترنم پیدا کرنے کے علاوہ ایک ادنیٰ خیال کو نہایت رفیع الشان بنا دیتی ہیں۔ برعکس اس کے ہندی کے الفاظ اعلیٰ اور بلند خیال کو پست سطح پر کھینچ لاتے ہیں۔ ہندی الفاظ کے ساتھ خواہ مخواہ کا، کی، کے ور ایسا جیسا وغیرہ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جس سے کلام میں طوالت اور اُس کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً "سرو قامت" کیسا مختصر، خوشنما، اور دلپذیر ترکیب ہے۔ اب اگر سرو کے بجائے اکشے بٹ کی تشبیہ لائی جائے تو کہنا پڑے گا "اکشے بٹ جیسا قامت" کیا اس تشبیہ سے کلام کی نزاکت، صفائی، اختصار اور اثر خاک میں نہیں مل جائے گا؟ اسی پر سے اور ہندی تشبیہوں کا اندازہ کر لیا جائے۔

علاوہ بریں فارسی ذرائع سے حاصل شدہ تشبیہات و تلمیحات کے جو ہندی بدل یا مترادفات یا مساوات تجویز کئے گئے ہیں وہ صوتی، ترنمی، صوری، معنوی ہر اعتبار سے کمتر درجہ کے ہیں۔ اس لئے شیریں فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے پہلو بہ پہلو نل دمن اور دشینت و شکنتلا ہرگز نہیں بٹھائے جا سکتے۔ اگر سوانح حیات یا ڈراما یا قصہ لکھنا ہو تو یہ چاروں جوڑے مساویانہ حیثیت کے ہیں لیکن داخلی شاعری اور خصوصاً غزلیات کو اُن کے واقعاتِ زندگی یا عاشقی و معشوقی کے قصے سے کوئی سروکار نہیں۔ غزل میں بسا اوقات لیلیٰ و مجنوں یا شیریں و فرہاد سے مخصوص شخصیتیں مراد نہیں ہوتیں۔ بلکہ کثرتِ استعمال سے وہ مجردِ عشق و عاشقی کا مجسمہ بن گئے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے مجازی و حقیقی عشق کی لاتعد نیرنگ کاریوں، محبوبیت کے ہزاروں غمزوں اور کرشموں، عاشقی کی لاکھوں دردمندیوں اور نیاز آگینیوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن نل دمن یا دشینت و شکنتلا کے واقعات مخصوص معین، محدود اور مقرر ہیں جو عشق و عاشقی کی تمام حالتوں اور کیفیتوں پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ اردو شاعری اور ہندی شاعری کے تصورِ عشق میں قطبین کا فرق پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں عشق و محبت کا اظہار مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ عاشق اپنے محبوب کی خاطر ہزاروں سختیاں اور مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن اُف نہیں کرتا بلکہ درد و تکلیف ہی میں لذت محسوس کرتا ہے۔ لیکن تمام ممالک متمدنہ کی شاعری کے خلاف ہندی شاعری میں جذبات عشق کا اظہار صنفِ نازک کی طرف سے ہوتا ہے حالانکہ یہ طریقہ اس کی فطرت و طبیعت کے منافی ہے۔ بھاشا کی شاعری میں مرد کرمئے "مردافگنِ عشق" کا حریف بننے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ بالعموم سخت تغافل شعار، آرام طلب اور بے حس نظر آتا ہے۔ لیکن عورت اپنی فطری کمزوریوں اور نزاکتوں کے باوجود طرح طرح کے مصائب برداشت کرتی ہے تڑپتی ہے۔ لوٹتی ہے جوگن کا بھیس بدلتی ہے بن بن ماری پھرتی ہے۔ اپنے نالہ و شیون سے دنیا سر پر اٹھا لیتی ہے۔ عشق و محبت کے اظہار کا یہ طریقہ غیر فطری ہے۔ صانعِ مطلق نے عورت کو مرد سے کہیں زیادہ شرم و حیا کا مادہ عطا کیا ہے۔ اس کی غیرت نسائی اس کو اپنے جذباتِ عشق کا ڈھنڈورا پیٹنے اور بیتابی

وبیقراری ظاہر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتی۔ بعض جدت پسند طبائع اردو شعرا کو بھاشا کی شاعری سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن کیا عشق ومحبت کے غیر فطری طریقۂ اظہار کی پیروی اردو شاعری کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ بھاشا کی عشقیہ شاعری کبھی الہامی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس میں شاعر کے دل کی سچی پکار نہیں پائی جاتی۔ الہامی کیفیت طاری ہونے پر جو شعر کہے جاتے ہیں وہ دوسرے وقت کے اشعار سے کہیں زیادہ پرکیف وپراثر ہوتے ہیں۔ الہامی کیفیت طاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ شاعر پر ایک گونہ بے خودی کی حالت چھائی ہو اور وہ اپنے ماحول کو بھول کر جس زمانہ جس مقام جس منظر کی تصویر پیش کرتا ہو وہیں منتقل ہوجائے۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ انتقال جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے شخص کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنا چاہتا ہے تو اس وقت تک اس کے اشعار سچے اور صحیح جذبات کے حامل نہیں بن سکتے جب تک وہ خود کو اس کی شخصیت میں محو نہ کردے اور اپنے دل ودماغ پر اُس شخص کی تمام کیفیتیں نہ طاری کرلے۔ مثلاً اگر کوئی شاعر میدان جنگ میں کسی جنرل کے جذبات کی ترجمانی کرنا چاہے تو وہ اپنا ماحول بھول کر خود کو میدانِ حرب میں منتقل کرسکتا ہے۔ تمام جنگی نقشے اُس کے پیش نظر ہو سکتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر کے لئے خود کو جنرل کی شخصیت میں تحویل کرسکتا ہے۔ اور اپنے دل ودماغ پر وہ تمام کیفیتیں طاری کرسکتا ہے جو اس موقعہ پر ایک جنرل کے دل ودماغ میں ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں وہ جو اشعار کہے گا اُن میں جنرل کے جذبات واحساسات کی صحیح اور سچی ترجمانی ہوگی۔ عورت اور مرد کے خوشی، غم، نفرت، رغبت، حسد وغیرہ کے جذبات قریب قریب یکساں ہوتے ہیں اس لئے عورت کے کسی جذبہ کی تصویرکشی کے وقت شاعر مرد کی حیثیت سے اپنے اوپر وہ تمام حالتیں اور کیفیتیں طاری کرسکتا ہے جن میں عورت گھری ہوئی ہو۔ اور خود کو عورت فرض کئے بغیر بھی وہ مختلف نسائی جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ لیکن مرد اور عورت کے عشقیہ جذبات میں بہت تفاوت پایا جاتا ہے۔ فرق نہ صرف جذبہ کی نوعیت وماہیت ہی میں ہے۔ بلکہ دونوں کے طریق اظہار تو بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔ عورت کو مرد جیسی آزادی حاصل نہیں ہے۔ لڑکی کی جانب سے جذباتِ عشق کا کھلم کھلا اظہار اُس کے خاندان کی شرافت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہوگا۔ علاوہ بریں صنفِ نازک کی شرم وحیا اسے حالِ دل کے اخفا پر مجبور کرتی ہے۔ چونکہ عورت اور مرد کے عشقیہ جذبات میں فرق پایا جاتا ہے اس لئے شاعر عورت کے صحیح عشقیہ جذبات کی ہو بہو تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ کوئی بھاشا کا شاعر کتنا ہی زن خصلت کیوں نہ ہو لیکن وہ خود پر ایسی مدہوشانہ کیفیت طاری نہیں کرسکتا کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کی شخصیت عورت کی شخصیت میں گم ہوجائے اور اس کے دل میں وہی عشقیہ جذبات اپنی تمام لذتوں اور دردمندیوں کے ساتھ رونما ہونے لگیں جو عورتوں سے مخصوص ہیں۔ الغرض بھاشا کی شاعری میں عورتوں کے جتنے جذبات بیان ہوتے ہیں وہ محض فرضی اور خیالی ہوتے ہیں خود شاعر کے قلبی احساسات نہیں ہوتے۔ اس لئے بھاشا کا عشقیہ کلام الہامی نہیں ہوسکتا۔ اردو شعرا کو بھاشا کی شاعری کی تقلید کرنے کے لئے

و مشورہ دیا جاتا ہے وہ بالکل مہمل و بے کار ہے۔

اردو شاعری کی بزمِ عشق اور بھاشا کے عشقیہ اکھاڑے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک میں معشوق کے خالِ سیاہ کے آگے سمرقند و بخارا کی سلطنتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ دوسرے میں خود محبوبہ جس کے لئے آہ و زاری کرتی ہے اس کے بے حس دل میں اس کی کوئی قدر نہیں۔ ایک میں معشوق کی ایک ایک ادا پر عاشق جان وطن قربان کرنے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ دوسرے میں عاشق کا کم ہمت دل بادیہ پیمائی کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہے۔ کجا آن خود داخودی کجا ایں بے نمکی۔ کہاں مجنوں کہاں نل۔ کہاں فرہاد کہاں دشینت۔ مجنوں اور فرہاد کے عاشقانہ جذبات نفسانیت کے لوث سے پاک ہیں۔ دونوں میدانِ عشق کے جانباز شہسوار ہیں۔ آستانۂ یار پر جان قربان کر دینا اُن کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ ایک تیشۂ سنگ گراں کا حریف ہے دوسرا زنجیر و سلاسل کا مدمقابل۔ ایک کی گرمیٔ عشق پتھر کو موم بنا دیتی ہے۔ اُس کی ہمت مردانہ اور سعیٔ پیہم پہاڑ کا سینہ چیر کر جوئے شیر کے لئے راستہ صاف کر دیتی ہے۔ دوسرے کے شوقِ دشت پیمائی کے آگے نجد کا لق و دق صحرا چشمِ حسود کی طرح تنگ ثابت ہوتا ہے۔ اور اُس کی آبلہ پائی سے ریگستان کا ذرہ ذرہ گل بداماں نظر آتا ہے۔ اب ذرا ہندی عشاق پر نظر ڈالئے نل اور دشینت دونوں عیش پرست۔ آرام طلب اور سہل انگار زاہد ہیں۔ ان کو نہ امتحان گاہ عشق کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں نہ رنج و مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ عشق کی خوفناک قربان گاہ پر انکو دمڑی کی سوئی بھی بھینٹ چڑھانی نہیں پڑتی۔ انہیں نہ محتسب کا خوف ہے نہ رسوائی کا ڈر پہلے سے اُن کے دلوں میں عشق و محبت کی ایک چنگاری بھی موجود نہ تھی۔ پہلی ہی نظر میں اُن کا محض حسنِ صورت اور شاہی طمطراق دو بھولی بھالی پری رویوں پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اور بات کی بات میں بغیر کسی دقت و دشواری کے دونوں جوڑے شربتِ وصال سے بھی لذت آشنا ہو جاتے ہیں۔ تمام ممالکِ متمدنہ کے لٹریچر میں عشق و عاشقی کا کارنامہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ مغربی دنیا کی شاعری افسانہ، ڈراما، سینما پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ دنیائے عشق کی ساری ہنگامہ آرائیاں، سرگردانیاں اور مہمیں اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کہ عاشق و معشوق مستقل طور پر۔ ملے نہ ہوں۔ جہاں معشوق قبضہ میں آیا عشق کی ساری سرگرمیوں اور بیتابیوں کا خاتمہ ہوا۔

لفکاڈیو ہرن کا بیان ہے کہ "عاشق کی تمام جانبازیوں اور فداکاریوں کی غرض یہی ہے کہ معشوقہ پر کسی طرح قبضہ و تصرف حاصل ہو جائے۔ آغازِ عشق سے دمِ تسخیر و حصولِ قبضہ تک کا زمانہ نہایت پر اسرار، حیرت انگیز اور اعلیٰ شاعری کا موضوع بننے کے لائق ہوتا ہے لیکن جب محبوبہ عاشق کے ہاتھ آ کر اُس کی رفیقۂ حیات بن جاتی ہے تو گرمیٔ عشق اور ولولہ خیزی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں میں جو گہرا تعلق قائم رہتا ہے اسے ہم عشق سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ ایک قسم کی دوستی، ہمدردی اور محبت ہے جو ایک ساتھ رہنے سہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس محبت میں نہ تپش پائی جاتی ہے نہ تڑپ نہ سرگرمی نہ بے تابی بلکہ یہ اسی قسم کی محبت ہے جیسی انسان کو دوسرے اعزہ و اقارب کے ساتھ ہوتی ہے۔ بسا

اوقات اولاد کی محبت زن وشوہر کی درمیانی محبت پر غالب آجاتی ہے۔" اردو شاعر کا نصب العین نہایت اعلیٰ و ا
اُس کے نزدیک محبوب کو قبضہ میں لانا اور شریکِ زندگی بنالینا عشق کی غایت نہیں ہے۔ باوجود تمام ظاہری تلخ کام
اور درد آفرینیوں کے عشق کے اندر ایک ایسی لذت پنہاں ہے جس سے وہ محروم ہونا نہیں چاہتا۔ وہ مدت العمر عشق
پسوری کا شکار بنا رہتا ہے۔ عشق کو وہ ہر درد کا مداوا خیال کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک زندگی کا لطف عشق ہی کی بد
ہے چنانچہ غالب کا شعر ہے کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

بلکہ عشق خود زندگی ہے عشق نہ رہے تو زندگی بے لطف و بے مزہ بن جاتے۔ ایسی بے لطف زندگی موت سے
اردو کا شاعر مرض کی چارہ جوئی سے گھبراتا ہے اور کہتا ہے۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں جاری چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

جہاں شاہدِ حقیقی کے ساتھ عشق کا اظہار ہوتا ہے وہاں طالب کو دیدار کی تمنا ہوتی ہے لیکن اردو کا بلند فکر شاعر عش
مجازی کے معاملہ میں بھی وصالِ یار کا متمنی نہیں ہوتا۔ دیدارِ دوست عام طور پر مریضِ عشق کے لئے دارو سمجھا جاتا۔
لیکن مرضِ عشق سے شفایابی مذہبِ عشق میں موت کے مترادف ہے کیونکہ زندگی اور دردِ عشق دونوں لازم وملزوم
وہ زندگی ہی کیا جو لذتِ عشق سے بے بہرہ ہو۔ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے لہذا اردو کا بلند حوصلہ شاعر دیدا
خواہش سے پناہ مانگتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اسے وصال نصیب نہ ہو ورنہ اسے تمام لذّتِ عشق سے مح
ہونا پڑے گا۔

یارب دعائے وصل نہ ہرگز قبول ہو پھر دل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی

اسے عشقِ سرمدی و دردِ جاوداں کی تمنا رہتی ہے۔ وہ عشقِ حقیقی سے بھی اس لئے بیزار نظر آتا ہے کہ وہاں طلب
ہے۔ اگر یہ طلب پوری ہوجائے اور مدعا بر آئے تو پھر عشق کا خاتمہ ہی ہوجائے۔ مصائبِ عشق کے مادی معاوضے سے
دلی نفرت ہوتی ہے خواہ یہ معاوضہ حور وقصور ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو۔ اس خیال کو مومن اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمہیں نصیب ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

مجنوں اور فرہاد مدت العمر لذتِ عشق سے ذوق آشنا رہے۔ تا زیست اُن کے عشق ومحبت کی ہنگامہ آرائیاں
رہیں۔ وہ آغوشِ لحد میں بھی داغِ حسرت لے گئے۔ مغربی لٹریچر میں جدائی ومفارقت کا زمانہ نہایت شاندار۔ حیرت
پراسرار و پرعظمت ہوتا ہے۔ اور جب عاشق ومعشوق باہم مل جاتے ہیں تو ساری ولولہ خیزیاں اور بیتابیوں کا خاتمہ ہو
ہے۔ لیکن نل اور دمینت کو کبھی مفارقت کا رنج اور جدائی کا صدمہ اُٹھانے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ وہ ایک نظر ڈالتے
عاشق ہوئے اور بات کی بات میں اپنی اپنی محبوبہ کے وصال سے لذت گیر ہوگئے۔ اُن کی زندگی میں عشق کا کا

مفقود ہے۔ دونوں جوڑوں میں اگر محبت باقی رہی تو وہ محض زن وشوہر کی معمولی الفت تھی۔ الغرض دنیا کے لٹریچر میں جہاں عشق کی ہنگامہ آرائیوں پر تماشے کا آخری پردہ گرتا ہے وہاں سے نل ودمن اور دشینت وشکنتلا کی زندگی کا ڈراما شروع ہوتا ہے نل قماربازی میں اپنی ساری حکومت، دولت، ثروت ہار جاتا ہے۔ کاش وہ ان چیزوں کو عشق کی مقدس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتا تو دنیائے عاشقی میں کچھ نام بھی کر جاتا۔ اس کی انتہائی مصیبت وجلاوطنی کی حالت میں بھی وفادار و باعصمت دمن اس کا ساتھ دیتی ہے لیکن بے وفا نام نہاد عاشق اسے خوفناک جنگل میں درندوں کے رحم وکرم پر سوتا چھوڑ کر چل دیتا ہے۔ دشینت کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو حاملہ چھوڑ کر سلطنت کا کاروبار سنبھالنے کے لئے چلا جاتا ہے۔ اور کبھی بھول کر بھی اپنی معشوقہ کو یاد نہیں کرتا۔ یاد کرتا بھی تو کیونکر اس کے دل میں سچے عشق کی گرمی تو تھی نہیں اُس نے محض خواہشِ نفسانی سے مغلوب ہوکر دور دراز نخچیر گاہ میں چند روزہ صحبت کے لئے اس دوشیزہ کو گندھاروا طریقہ پر اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا تھا اس کی بیسیوں ازواج میں سے ایک وہ بھی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جوگی کے سراپ نے دشینت کے دل سے شکنتلا کا نقشِ محبت نہیں (جو پہلے ہی سے معدوم تھا) بلکہ اس محبوبہ کا خیال بھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ شکنتلا طرح طرح کی صعوبتیں اور عقوبتیں جھیلتی ہے سخت ذلت ورسوائی برداشت کرتی ہے لیکن دشینت کا دل نہیں پسیجتا۔ معشوقہ کا رخِ زیبا اس کے قلبِ سنگیں میں دبے ہوئے شررِ محبت کو اجاگر کرنے میں ایک حقیر انگشتری سے بھی کم اثر ثابت ہوتا ہے۔ سچے عشق کی گرمی پہاڑ کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ اس کے آہن گداز شعلے کے آگے جوگی کی کٹیاکو رشی کے سراپ کی کوئی حقیقت نہیں۔ عاشق کو دن رات معشوق کی دھن لگی رہتی ہے۔ اس کے صنم خانۂ دل میں صرف ایک ہی بتِ لعب رہتا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے لیکن دشینت کو گرمئ عشق سے کیا تعلق؟ بالآخر طلسمی انگشتری کے اثر سے دشینت کو شکنتلا کا خیال آتا ہے۔ وہ اپنی تغافل شعاریوں پر بظاہر نادم ہوتا ہے اور چند معذرت خواہیوں کے ذریعہ سے شکنتلا کی اشک شوئی کر دیتا ہے۔ نل اور دشینت کی ساری حیاتِ معاشقہ کی یہی پونجی ہے مجنون وفرہاد کے درخشاں کارناموں کے آگے اس جنسِ کم ارز کی کیا حقیقت؟ اپنی کم بضاعتی کو محسوس کرتے ہوئے کیا خود نل اور دشینت مجنوں جیسے سید العاشقین کے پہلو میں جگہ پانا تو درکنار اس کی حاشیہ نشینی کی بھی جرأت کر سکتے ہیں؟ حقیقت الامر یہ ہے کہ اگرچہ نل اور دشینت کا عاشقانہ کارنامہ قابلِ لحاظ نہیں لیکن اُن کے قصے دلچسپ ضرور ہیں محض لطف ودلچسپی کی خاطر اُن کا اُردو میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کا عشقیہ کارنامہ نہایت بودا اور پست ہے۔ ہندی کے عشقیہ معاملات اور اُن کے اسالیبِ بیان اردو شاعری کی فطرت وطبیعت اور مذاق وپسند کے بالکل منافی ہیں نہ ہندی عاشقوں کو صحرانوردی وپا بجولانی کی ہمت ہے اور نہ ہندی معشوق میں وہ ناز وانداز اور شوخی وطنازی پائی جاتی ہے جو اردو شاعری کے معشوق کا طرہ امتیاز ہے۔ ہندی اور اردو شاعری میں عاشقی ومعشوقی کا تصور ایک دوسرے کی ضد ہے اور اجتماعِ ضدین کا محال ہونا ایک مسلمہ امر ہے۔ لیلیٰ ومجنوں، شیریں وفرہاد، وامق وعذرا، سلمیٰ ورباب آسمانِ عشق کے

آفتاب و ماہتاب ہیں لیکن نل اور دمینتی ۔ دشینت اور شکنتلا، وکرم اور اروسی، اگنی متر اور مالویکا، مالتی اور مادھو وغیرہ محض ڈراموں اور افسانوں کے کردار ہیں۔ ان ڈراموں اور قصوں کے ترجمہ سے ادب اردو میں چند کتابوں کا اضافہ ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اُن کے عشقیہ کارناموں میں کوئی قوت و گیرائی نہیں ہے اس لئے عشق کی گوناگونیوں نیرنگ کاریوں، اور اُس کے بوقلموں راز و نیاز کی تشریح میں اُن سے بہت کم مدد مل سکتی ہے۔

جہاں تک نغمہ سرائی و درد نوائی کا تعلق ہے کوئل اور پپیہے کو اردو شاعری میں کافی جگہ مل چکی ہے۔ سندر برسات پر جو اشعار کہے ہیں اُن میں ہم کوئل اور پپیہے کے چہچہے سنتے ہیں۔

کوکے اک سمت پپیہا کہیں کوئل کریں شور ۔۔۔ مور چلاتے ہیں رات آئی ہے کیا ساون کی

سر اقبال سے بڑھ کر بادۂ شیرازی کا سرشار کون ہوگا۔ لیکن وہ بھی گولکنڈہ کے سکوت پرور باغ میں جہاں سلاطین قطب شاہیہ محوِ استراحت ہیں بلبل کا نغمہ نہیں بلکہ ہندی کوئل کے نعرے سنتے ہیں اور ہمیں بھی سناتے ہیں ؎

نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانہ میں ۔۔۔ چشم انساں سے نہاں پتوں کے عزلت خانہ میں

بہ ایں ہمہ کوئل اور پپیہے کا کارنامہ صرف کوک ہوک اور نعرہ زنی ہی تک محدود ہے۔ لیکن گل و بلبل اور سرو و قمری کے ساتھ حسن کے ہزاروں ناز و انداز اور عشق کے لاکھوں راز و نیاز اور شور و ہنگامہ وابستہ ہیں۔ ان کا ذکر جن دلکش خوابیدہ افسانوں کو بیدار کرتا ہے۔ اُن کے نام میں جو شعریت کیفیت، دلچسپی اور رنگینی مضمر ہے۔ ان کا حوالہ جن خوش آئند یادوں کو تازہ اور لطیف خیالات و تصورات کو متحرک کرتا ہے وہ کوئل اور پپیہے کو کہاں نصیب۔ کوئل اور پپیہے کی طرح بلبل محض ایک گانے والا پرندہ ہی نہیں ہے بلکہ سر اقبال کی زبانی سنئے کہ وہ اور کیا ہے ؎

اور بلبل مطربِ رنگیں نوائے گلستاں ۔۔۔ جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے ۔۔۔ خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

مسز سروجنی نائیڈو کو اُن کی شیریں کلامی و خوش نوائی کی بنا پر بلبلِ ہند کا لقب دیا گیا ہے۔ مذاق سلیم اس حسن انتخاب کی داد دیتا ہے اور مسز موصوفہ بھی اسے اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہیں لیکن آپ کسی شکر ریز و سحر مقال خاتون کو "ہندوستان کی کوئل" کہئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آپ ہزار عذر پیش کریں کہ کوئل دیسی پرندہ ہے اور بلبل اجنبی و غیر ملکی ہے لیکن کوئی شخص آپ کے مذاق و پسند کی تعریف نہیں کریگا کیونکہ کوئل کا لفظ سنتے ہی ذہن کسی کالی کلوٹی چیز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کوئل کا خطاب باعثِ توہین خیال کیا جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ وہ خاتون جسے آپ کوئل کہیں آپ پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعوے کر بیٹھے۔ اندھا دیس کا قانون بھی جہاں کا مذاق "حسن سیہ فام" کا گرویدہ ہے شاید آپ کی حمایت نہیں کرے گا اور آپ بیٹھے بٹھائے قانونی شکنجہ میں پھنس جائیں گے۔ کہاں بلبلِ ہزار داستاں

اور کہاں نعرہ زن کوئل۔ دونوں کو ایک صف میں جگہ دینا مذاقِ سلیم کا خون کرنا ہے۔

اسی طرح اگر کسی کی سیر و سیاحت کا مقصد محض پتھر کے تودے یا بڑے بڑے چٹان دیکھنا ہو تو اُس کے لئے کوہِ طور اور ہمالیہ پہاڑ دونوں یکساں ہیں بلکہ دور دراز کا سفر کر کے کوہِ طور یا ہمالیہ پہاڑ تک جانے کی زحمت گوارا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ وہ آس پاس کی کسی پہاڑی کی سیر کرے۔ لیکن اردو شاعری کوئی کورمذاق سیاح نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں جلوۂ یار کی متلاشی ہیں وہ برقِ تجلی کی متمنی ہے وہ شمعِ ایمن سے فروغِ نور حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ انوار کی بارش اور تجلیوں کی ریزش کا سماں دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ کدھر کا رُخ کرے کوہِ طور کا یا ہمالیہ پہاڑ کا؟ ہمالیہ پہاڑ باوجود اپنی فلک بوس نورانی چوٹیوں کے برقِ تجلی سے محروم ہے۔ اس کا سینہ سوز و گداز سے خالی ہے اسے کبھی جلوہ گاہِ ناز بننے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہندوستان کا سنتری یا پاسبان ضرور ہے لیکن رموزِ سرا پردہ کا رازدار یا حریمِ ناز کا محرم نہیں۔ اب ذرا کوہِ قاف کی سیر کیجئے۔ وہاں پری جمالوں کا نظارہ آنکھوں کو نور اور دل کو سوز بخشتا ہے۔ اس باصرہ نواز منظر سے اردو شاعری کو محروم کر کے آپ اسے سمیرو پربت کی طرف گھسیٹتے ہیں جہاں چھوٹے بڑے دیوتاؤں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اردو شاعری اور خصوصاً شاہدِ غزل پریوں کے جھرمٹ سے علیحدہ ہو کر دیوتاؤں کے جمگھٹ میں قدم رکھنے سے گھبراتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ فطرتاً شوخ و بیباک واقع ہوئی ہے وہ کسی کی مدح سرائی اپنے لئے کسرِ شان سمجھتی ہے۔ اور صاف کہتی ہے کہ

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں ۔۔۔ میں حوالِ نسیم بادفروشِ چمن نہیں

اس کی رندمشربی و آزادہ روی سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کی طنازی و گستاخی بڑے بڑے جلیل القدر پیغمبروں مثلاً موسیٰ، عیسیٰ، خضر و سلیمان وغیرہ کو بھی بے تکی سنانے سے باز نہیں رہتی اور آزادی سے کہتی ہے کہ ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ۔۔۔ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک ۔۔۔ اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر ۔۔۔ نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

جب اُس کی شوخی و بیباکی حد سے زیادہ بڑھتی ہے تو وہ "خاکم بدہن" کہہ کے شریعت کی گریباں گیری سے بچنے کا بہانہ ڈھونڈ کر خود خدا کو بھی کھری کھری سنا دیتی ہے اور لغوی معنی کی آڑ لیتے ہوئے شکوہ سنج ہوتی ہے کہ ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

باقی ۔۔۔ محمد حسین ادیب

عقدۂ مشکل

میں جانتا ہوں کہ اُن کا کچھ اعتبار نہیں — میں جانتا ہوں کہ اُن کو کسی سے پیار نہیں
اُنہیں خبر ہی نہیں ہے رہِ وفا کیا ہے — وہ جانتے نہیں الفت کا ماجرا کیا ہے
عبث ہیں اُن کیلئے بیقراریاں میری — عبث ہیں اُن کے لئے آہ و زاریاں میری
ہزار حالِ دل اُن سے کہو اثر ہی نہیں — مجھے یقیں ہے مری کچھ انہیں خبر ہی نہیں

کسی کی بھی ہے جو اُن کو تو اپنی پروا ہے
خدا ہی جانے مجھے اُن کی کیوں تمنا ہے

میں جانتا ہوں کہ ایسے وہ کچھ حسیں بھی نہیں — دل آئے ٹوٹ کے ان پر وہ مہ جبیں بھی نہیں
نہیں ہے مجھ کو عقیدت بھی حسن والوں سے — بھرا پڑا ہے جہاں ورنہ مہ جمالوں سے
خدا نے حسن دیا ہے بہت حسینوں کو — ہزاروں ناز سکھائے ہیں نازنینوں کو
ملا نہیں ہے مجھے دل ہی چاہنے کیلئے — بنا نہیں ہوں میں الفت نباہنے کیلئے
نہیں یہ بات کہ میری کچھ اُن کو پروا ہو — نہیں یہ بات کہ مجھ کو جنوں ہو سودا ہو

نہ اُن کو مجھ سے نہ مجھ کو کچھ اُن سے نسبت ہے
کوئی بتائے کہ کیوں اُن سے مجھ کو الفت ہے

ممتاز حسن

اجتماعی زندگی کا نیا دور

ذاتی مہارت، امانت داری، علمی تنظیم! ہم ان تینوں کی جزئیات سے واقف ہو چکے ہیں اور یہ جان چکے ہیں کہ ان تینوں کا ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریب کا تعلق ہے + اب ان کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کون شان دار کام ہے جو تعمیری شہریت کے پیش نظر ہے ۔ اور وہ کام ہے صنعتی تمدن کا استحالہ کم سے کیف میں دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ تہذیب کو بسیار پسندی کے پیچھے سے چھڑا کر اُس کے سامنے بلند معیاری کا نصب العین قائم کرنا، اُسے ڈھیر سے گن کی طرف بیشتر سے بہتر کی طرف لے چلنا + یہ کوئی آسان کام نہیں ۔ اکثر لوگ کہہ اُٹھیں گے کہ یہ ایک ناممکن کام ہے + ہاں ناممکن سہی لیکن جب خدائے عزیز وحکیم نے انسان کے جسم میں روح پھونکی تو اُس نے "ناممکن" ہی کو انسان کا نصب العین بنایا اور تمدن کی ساری تاریخ سے جو ایک زبردست معجزہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ انسان یقیناً اس بلند منتہائے کمال کے ہر طرح قابل ہے ۔ اس وقت دنیا کے طول و عرض میں کافی سماجی جرأت ہے جو اس غایت درجہ دشوار لیکن شاندار کام کو سرانجام دے سکے + اگر نوعِ انسان اس قدر ذلیل اور ناکارہ ہوتی جتنا غم پسند سمجھے ہوئے ہیں تو اُسے کبھی اس بات کا علم و شعور نہ ہوسکتا کہ وہ ذلیل و ناکارہ ہے ۔ انسان کو اس بات کا شعور ہونا ہی اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ وہ ابھی قعر مذلت میں نہیں گرا + اس وقت صنعت و حرفت قانون، طبیعیات اور کئی اور شعبوں میں اچھے اور عمدہ کارکنوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے + گاڑیاں اور انجن چلانے والے، کشتیاں اور جہاز چلانے والے، انجنیر، مستری، معمار، باغبان، کاشتکار ان میں لاکھوں اپنا اپنا کام تن دہی اور جانفشانی سے کر رہے ہیں + آج نوجوانوں کے لئے ہزاروں موقع ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے اور دوسرے کے لئے مفید ثابت ہوسکتے ہیں ۔ وہ جائیں اور ان محنتی لوگوں کا ہاتھ بٹائیں ان کی مشکلوں میں ان کے کام آئیں + ایک نوجوان کو چاہئے کہ وہ گھر میں نہ بیٹھا رہے بلکہ باہر کی دنیا میں جا نکلے اور جو کچھ بھی مضبوط و توانا کے مقابل میں کمزور و ناکارہ ہے اُسے تقویت دے ۔ "مکان اندیشی" مضبوط ہے مقدار کا بول بالا ہے اُن کے مقابل میں "زمان اندیشی" ہے اور عمدگی ۔ ان کو سب کی مدد درکار ہے اور ان کی مدد سے بڑھ کر دوسروں کی کیا خدمت ہوسکتی ہے ؟ اس سے یہ مراد نہیں کہ عمدگی ہی اچھی ہے اور مقدار محض بُری ہے ۔ ہر شے اپنی جگہ اچھی ہے + مقدار عمدگی کی دشمن نہیں ۔ مقدار بھی بیش قیمت ہے ۔ جب تک وہ اپنی جگہ پر قائم رہ کر نوعِ انسان

کی خدمت کو تیار رہے اور اس پر سوار نہ ہو جانا چاہیے + پہاڑے مفید ہیں لیکن اگر وہ ریاضی میں بجائے کام دینے کے کام لینے پر اصرار شروع کر دیں تو ظاہر ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو + "تم بلند معیاری کی تلاش کرو۔ مقدار خود بخود تمہارے پیچھے چلی آئے گی"۔ "تم پہلے "بہتر" کو ڈھونڈو، "بیشتر" خود بخود تمہارے قدم لے گا"۔ سچائی، خوبصورتی، اچھائی خود بخود بڑھتی اور چمکتی ہیں!

ممکن ہے اُسے محض خوش اعتقادی کہا جائے لیکن سچ یہ ہے کہ ایک ایسے ہی اعتقاد کی آج ہمارے صنعتی تمدن کو سخت ضرورت ہے اور بلند معیاری کا صحیح مقصد دستکاری کے معیار کو بڑھانا نہیں بلکہ اُن انسانوں کے معیار کو بلند تر کرنا ہے جو اس میں مصروف ہوں + سوال یہ ہے کہ کیا اُس کام نے جو کسی کارکن یا دستکار نے کیا ہے اُسے ایک زیادہ قابلِ قدر انسان بنا دیا ہے یا نہیں ؟ کیا اُس شخص کے ساتھ مل جل کر رہنا سہنا زیادہ آسان اور باعثِ مسرت ہو گیا ہے کیا اب وہ پہلے سے زیادہ عقلمند زیادہ پُر صحت زیادہ ہمدرد ہے، کیا اس کام کے کرنے کے بعد اور اس کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اب ایک زیادہ انصاف پسند آقا ہے زیادہ دیانت دار خادم ہے ؟ زیادہ اچھا ہمسایہ، زیادہ وفادار دوست، زیادہ سچا محبت کرنے والا ہے ؟ یعنی کیا اچھے کام سے کام کرنے والا خود ایک بہتر آدمی بن گیا ہے یا نہیں ؟ آبادی کے بڑھنے میں زیادہ اندیشہ یہ نہیں کہ دنیا میں آدمی یا کاریگر زیادہ ہو جائیں گے بلکہ یہ ڈر ہے کہ اس سے کہیں نکمے آدمیوں اور نکمے کاریگروں میں اور اضافہ نہ ہو جائے + اچھے کاموں ہی سے اچھے انسان بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ ہے صحیح طریقہ بہتری و ترقی کا۔ براہِ راست بہتری و ترقی پر تقریر و وعظ کرنے سے مدعا حاصل نہیں ہو سکتا + ایک تجربہ کار مدرّس نے ایک دفعہ خوب کہا کہ "اگر تم چاہتے ہو کہ انسانی نفس کی تربیت کرو تو نفس کی تربیت نہ کرو بلکہ کسی اور شے کی تربیت کرو"۔ اور جب اُس سے پوچھا گیا کہ وہ "اور شئے" کیا ہو سکتی ہے تو اُس نے جواب دیا کہ "جسم" اور پھر اس کی تشریح یوں کی کہ جسم ہر قسم کی تخلیقی مہارت کا ذریعہ ہے وہ محض ایک میکانی لاش نہیں جیسے مادیتین کا خیال ہے۔ اسی طرح اگر تم ضمیر کی تربیت کرنا چاہو تو بجائے ضمیر سے شروع کرنے کے اُن آلات کو جلا دو جنہیں ضمیر استعمال کرتا ہے بالخصوص ہوا کو اور دست و پا کو۔ ضمیر ان اعضا کے بغیر ایسا ہی ہے جیسا نقشے پر خطِ استوا ایک فرضی اور موہوم شے لیکن ان کے ساتھ اور ان کے ذریعے سے وہ ایک اصلی وجود بن جاتا ہے + تم ایک شخص کو کسی ساز پر لمبے چوڑے لیکچر دینے سے ایک سازندہ نہیں بنا سکتے۔ بہتر ہے کہ تم اسے کوئی ساز دو جسے وہ بجائے اور جس کی آوازوں کو وہ سنے اور جس کے سروں کو سمجھے + زندگی میں صحیح تعلیم صرف ذاتی تجربے سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے بغیر ناممکن ہے + علمِ اصلاحِ پیدائش سے تم شوق سے نوعِ انسان کی نسل کو زیادہ پُر صحت اور زیادہ تنومند بناؤ لیکن یہ یاد رکھو کہ جب تک اس بہتر و قوی تر آنے والی نسل کے لئے بہتر کام موجود نہ ہو گا۔ ایسا کام جو ان بہتر انسانوں کے شایانِ شان ہو اُس وقت تک یہ بہتری و قوت بے کار ہو کر رہ جائیں گی +

ہم چاہتے ہیں انسان کو بہتر انسان بنانا اور یہ کام بہتر کام کی انجام دہی سے ہی ہو سکتا ہے + بلاشبہ حالات اور ماحول انسانی فطرت پر بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ انسان کا ماحول محض اس کی ظاہری فضا ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ وہ زمانہ ہے گذرا ہوا اور گذرتا ہوا جس کے اندر سے انسان ظاہر ہوا اور جس کے اندر اس کا وجود ہے، عادات، رسوم، عقاید اور سب سے زیادہ اُس کے ہم جنسوں کا دائرہ جن کے ساتھ وہ زندگی بسر کرتا ہے + دوسرے شخص ہمارا ماحول ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اُن کا ماحول۔ "دوسروں" کی خدمت اچھی شے ہے مگر یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ ہم بھی دوسروں کے لئے یہی "دوسرے" ہیں + اور حالات بھی انسانی محنت ہی کا ثمرہ ہیں اور اس کا مظہر۔ پس اِن کے بہتر کرنے کا بہترین ذریعہ انسانی محنت کو بہتر بنانا ہے + آج کل کی تعمیرات بڑی بڑی اور چھوٹی چھوٹی اور معمولی سی بھی اِن سب کو کس بے پروائی اور بے دردی اور تیزی سے بنایا جاتا ہے اِس بُرے کام کا بُرا اثر بنانے والوں پر بنوانے والوں پر اور ساری معاشرت پر ہونا لازم ہے + بُرے کام میں مصروف رہنے والے اور مصروف رکھنے والے سب کے سب دنی النفس اور خبیث ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ذرا ذرا سے بہانے سے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگ جاتے ہیں + اگر ہم چاہیں کہ لوگوں کے باہمی معاشری تعلقات بہتر و خوشتر ہوں تو اس کا بہترین و آسان ترین ذریعہ اس کام کو بہتر و خوب تر بنانا ہے جو اُن کے ہاتھوں سرانجام ہو + عمدہ، نفیس، صاف ستھرے، مکانوں اور اچھے بازاروں اچھی گلیوں والے شہر میں رہنا کس قدر دل خوش کن ہے۔ یہ باشندوں کے لئے بجائے خود ایک تعلیم ہے۔ اس سے انسان میں خودداری کا خیال پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص میں خود بخود یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی ماہروں اور چابک دستوں اور معتمدوں کے زمرے میں جا شامل ہو۔ اس کے برعکس دوسری نوع کے مقامات میں رہنا روح و نفس کے لئے ایک عذاب ہے اور ہلاکت +

لہٰذا "تعمیری شہریت" کا اصلی مقصد ہر انسان کی ذات کو بلند تر کرنا ہے + یہ دشوار و شاندار کام کہاں سے شروع کیا جائے؟ جیسا کہ اوپر بار ہا کہا جا چکا ہے اس کا صحیح ذریعہ انسانی کارگزاری کو زیادہ بلند معیار بنانا ہے، ذاتی مہارت اور صلاحیت اور امانت داری کی اعانت سے + محض پند و وعظ سے انسان بہتر انسان نہیں بنتا۔ اس کی ایک نہایت عمدہ مثال صنعتی دنیا سے لی جا سکتی ہے۔ اگر تم چاہو کہ لوہے یا تانبے کی ایک چادر میں جو ابھار یا بل سا پڑ گیا ہے اُسے مٹا دو تو اس کا طریقہ عین ابھری جگہ پر ہتوڑے مارنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم اس کے اردگرد سب طرف ہتوڑا مارو اس طرح ابھار جاتا رہے گا اور چادر خود بخود ہموار ہو جائے گی + یہی قاعدہ انسانی معاشرت کے لئے مفید ہے جہاں تم خرابیاں دیکھو اُن کے براہِ راست دور کرنے میں زیادہ وقت نہ کھوؤ بلکہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرو کہ اس سے وہ زیادہ جلدی دور ہو سکیں گی +

آج کل کے تمدّن پر اعتراضات کی جو بوچھاڑ کی جاتی ہے اُن میں سب سے بڑا اور عام اعتراض یہ ہے کہ یہ تمدّن مادّی ہے اور مادیت پرست ہے + یہ ایک مرض خیال کیا جاتا ہے اور مختلف فلسفی معالج اس کا مختلف علاج تجویز

کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے اس درد کی دوا مذہب کی پڑیا ہے۔ کوئی کہتا ہے قوانین کا منتر اسے اڑان چھو کر سکتا ہے ان علاجوں میں اکثر علاج خود مادی ہیں اور روحانی معالجوں سے بھی پوچھ دیکھو تو تم پاؤ گے کہ ان کی روحانیت بھی آخر کسی نہ کسی قسم کی مادیت پر آکر ٹھہرتی ہے۔ کوئی جلسہ کرنا، کوئی مجلس قائم کرنی، کوئی مضمون لکھنا وغیرہ وغیرہ + اصل یہ ہے کہ جب تک انسان کی روح اُس کے جسم سے وابستہ ہے یا جب تک اس کا نفس اُس کے دماغ سے متعلق ہے "مادیت" پر سب اعتراض لاحاصل ہیں بلکہ قطعی ضرررساں + مسئلہ جو درپیش ہے وہ یہ نہیں کہ مادے کو "موقوف" کر دیا جائے بلکہ یہ کہ اُسے اپنے صحیح محل اور موقع پر قائم رکھا جائے + مادہ کیا ہے؟ اس کی تعریف میں بہت اختلاف ہے مگر غالباً اس کا مفہوم اِس طرح بخوبی ذہن نشین کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسی شے ہے جس کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں اُس بیوی کی طرح جس کے متعلق اُس کی لحد کے کتبے پر مرقوم تھا کہ اُس کے ساتھ رہنا مشکل، اُس کے بغیر رہنا اور بھی مشکل +

مادہ روح کی منزل کا پہلا مرحلہ ہے۔ روحانی قدور تک ہم صرف مادی اشیاء کے ذریعہ سے پہنچ سکتے ہیں۔ روح مادہ ہے جب ہم مادہ کو غور سے دیکھیں اُس کا صحیح استعمال کریں اور اُس سے گہرا تجربہ حاصل کریں جب مادی اشیاء ہنرمندی کے ساتھ کام میں لائی جائیں اور وہ گویا ہمیشہ کے لئے حُسن ومسرت سے معمور ہو جائیں تو روحانی اشیاء خود بخود وجود میں آجاتی ہیں اور جب تم اُن کا حسن دیکھو اور اُس سے لطف اٹھاؤ تو تم خود بھی روحانی ہو جاتے ہو + اس قسم کی شاندار تبدیلیوں سے وہ خوراک بھی جس سے ہمارے جسم پرورش پاتے ہیں ایسی قوتِ لایموت بن سکتی ہے جس سے ہماری روحیں نشو ونما پائیں اور وہ محنت جس سے ہم اپنی روزی کماتے ہیں ایسی دولت بن سکتی ہے جس سے ہماری روح ہمیشہ کے لئے مالا مال ہو جائے + کارلائل کا قول ہے کہ دو آدمیوں کی میں عزت کرتا ہوں اور کسی تیسرے کی نہیں ایک تو محنتی دستکار کی جو دنیاوی آلات سے دنیا کو انسان کے لئے مسخر کرتا ہے۔ دوسرے اور اس سے بھی زیادہ روحانی ضروریات کے لئے کام کرنے والے کی۔ یہ دونوں قابلِ احترام ہیں باقی سب خس وخاشاک ہیں" لیکن کیا یہ دونوں قسم کے آدمی ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں؟ غور کرو تو تم دیکھو گے کہ فی الحقیقت وہ ایک ہی ہیں۔ وہ متحد ہوتے ہیں اُس چیز کے لابدی ہونے میں جسے وہ الگ الگ تیار کرتے ہیں اور اس شعور میں کہ وہ لابدی ہے +

مادہ کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں لیکن یہ بھی نظرانداز نہ کرنا چاہئے کہ اگر اُس سے اچھا سلوک کیا جائے تو وہ اچھائی کا جواب اچھائی دیتا ہے + بدسلوکی سے مادہ ہمارا دشمن اور خوش سلوکی سے وہ ہمارا بہترین دوست بن جاتا ہے + مادہ سے زیادہ مددگار کون ہوگا؟ ذرا ذرا سی معمولی بلکہ بھونڈی چیزوں سے بھی کیسی کیسی خوبصورت چیزیں بنتی ہیں، کیسے کیسے دل خوش کن لمحے روح کو نصیب ہوتے ہیں! موسیقی کیا ہے؟ محض ایک نوع کی سازش دھات کے تاروں اور اردگرد کی ہوا کے درمیان، اور کچھ بھی نہیں، لیکن ان سے خاص طریقے سے کام لینے والا مطرب اُن کے راگ رنگ سے

خاکی زمین کو کیونکر ایک آسمانی عالم میں تبدیل کر دیتا ہے + یہ ہے مادے کی خدمت انسان کے لئے یہ ہیں مادے کی روحانی نعمتیں اُن کے لئے جو انہیں حاصل کرنا سیکھیں + اس کے برخلاف مادہ اُن پر اپنے ستم ڈھانے سے نہیں چوکتا جو اس کا غلط استعمال کریں + ہمیں خدا کا شکر بجا لانا چاہیئے کہ اُس نے ہمیں اس مادی دنیا میں پیدا کیا جس میں آزاد روح کے لئے ایسی شاندار ممکنات موجود ہیں + تو مادے سے ''خوش سلوکی'' کے کیا معنی ہیں ؟ اس کے محض یہی معنی ہیں کہ مادی اشیا سے جب تم کام لو تو اپنی ذاتی مہارت سے اپنی امانت داری سے اور اپنی علمی قابلیت کے ساتھ کام لو + یہیں ہمارے فرائض اس مادی دنیا میں لیکن ہمارے حقوق و فرائض کا تعلق محض اس مادی دنیا سے نہیں بلکہ ساری کائنات سے ہے اور ساری کائنات کی آنکھیں ہر انسان کے روزانہ کام پر لگی ہیں۔ وہ کام جس میں وہ مادہ کا امانتدار ہے جیبن علی کے لفظوں کو یاد کرو ''دستکار اور ریاضی دان اور خدا کے بزرگوار کا بندہ'' + تمام معاشری ''بیماریوں'' کی جڑ مادے کا غلط استعمال ہے ''مادیت'' ''حصول'' ''مقابلہ'' موجودہ تمدن پر جو یہ الزامات دھرے جاتے ہیں تو یہ سب موجودہ نفسِ انسانی کے اس میلان کا نتیجہ ہیں جو اسے مقدار اور مکانیت کی طرف لے جاتا ہے ''حصول'' محض ہل من مزید کا نعرہ مارے جاتا ہے ''مقابلہ'' اس پر تلا ہوا ہے کہ کون بہت کچھ سمیٹ سکتا ہے + ''حصول'' کی تمنا بے شک ہو لیکن حقیقی قدور کے ''حصول'' کی ''مقابلہ'' شوق سے ہو لیکن اس لئے کہ کون سب سے اچھا کام کرتا ہے۔ اس طرح ہم اپنے لئے ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والے عالی شان قصر بنا سکیں اور زمانہ خود اُن کا محافظ ہو!

غرض اس بات پر جتنا زور بھی دیا جائے کم ہے کہ انسانی شائستگی کا اصلی منبع انسان کا روزانہ کام ہے اور انسان کی کتنی بدقسمتی ہے جب معاشرت کی روحانی شائستگی یعنی فنون اور علم ادب اور مذہب اس عام کام سے علیحدہ ہو جائیں اور مل جل کر مصروفِ کار نہ ہوں + تمدن کا پہلا فرض ہے کہ ان مادی اور ان روحانی اشیا کو ان بچھڑے ہوؤں کو باہمی اتحاد و محبت کے اندر ملا دے + صداقت حسن نیکی جب تک یہ محض فلسفی یا مذہبی مجردات ہیں تب تک گویا ''فرضی فرشتے'' ہیں۔ ہم اُن کی حقیقت کو ٹھیک ٹھیک اسی وقت سمجھنے لگتے ہیں جب اُن میں سے ہم کسی نہ کسی کو خود پیدا کرنے لگیں + جب کوئی آدمی دیانت داری کے ساتھ کوئی خوبصورت چیز بنانے لگتا ہے جو بصورتِ دیگر بدصورت بنائی جاتی، جب کوئی آدمی توجہ کے ساتھ کوئی اچھا کام کرنے لگتا ہے تو گویا سرمدی قدور اور ازلی خوبیاں اُس پر اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتی ہیں + کوئی سیاست دان بنے یا ایک نظم لکھ دے یا اینٹیں جوڑ کر دیوار بنانے لگے معاملہ ہر حالت میں یکساں ہے + ازلی خوبیاں کوئی غیر مرئی بھوت پریت نہیں، وہ انسانی محنت کے جیتے جاگتے اصول ہیں، تم اپنی ذاتی مہارت سے اُن کو مرئی اور مقبول اور سودمند بنا سکتے ہو +

اور یہ سب کچھ محض اشیاء کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ مادی اشیاء کے ذریعے سے + ہاں اشیاء! ایمرسن کا قول ہے کہ ''اشیا پا در رکاب ہیں اور نوعِ انسان پر سوار'' وہ نوعِ انسان کو اپنی سواری کے کام میں لاتی ہیں بلکہ وہ

انسانوں کو اپنے گدھے بناکر، اور انسانوں کا گدھے بن جانا کچھ مشکل نہیں، اُن کو خوب بھگاتی دوڑاتی اور ذلیل کرتی ہیں اِس کا علاج اُنہیں کو سنا اور غم وغصہ سے بے تاب ہو جانا نہیں بلکہ اس حقیقت کے مفہوم کو سمجھنا ہے کہ انسان کائنات کا باشندہ ہے، دوسرے لفظوں میں وہ مادہ کا امانت دار اور اسی لئے ایک روحانی ہستی ہے+

انسان جو کچھ بناتا ہے اُس میں اُس کے نفس کا پرتو صاف نظر آتا ہے بلکہ جو کچھ وہ کھاتا پیتا ہے جو کچھ وہ پہنتا ہے جہاں بھی وہ رہتا ہے اِن سب میں اُس کی جیتی جاگتی تصویریں ہم کو نظر آتی ہیں+ ہر بنی ہوئی شے پر انسان کی شخصیت نقش ہوتی ہے لیکن اسی طرح ہر ایسی شے انسان کی شخصیت پر بھی اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے+ انسان ہی چیزوں کو نہیں بناتا چیزیں بھی انسان کو بناتی ہیں۔ پس ہمیں چیزوں کے بنانے اور کاموں کے کرنے میں تن دہی سے کام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہر شے جو ہم بنائیں ہر کام جو ہم کریں ہر بات جو ہم کہیں اِن سب کی مہر ہمارے نفس پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتی ہے۔

تمدن کی ترقی کے لئے مادے کے صحیح مصرف کے علاوہ اشتراکِ عمل یا امدادِ باہمی کی سخت ضرورت ہے+ ہر معاشری معاہدے میں خواہ وہ شادی کی صورت اختیار کرے یا مجلسِ اقوام کی متحدہ ارادوں کا مسلسل طور پر اپنے اتحاد کے ارادے کی تجدید کرتے رہنا اور یوں اُسے استوار بناتے رہنا لازم ہے+ عہد نامے اور اقرار نامے محض جب وہ قسماقسمی اور اقرار اور عہد اور دستخط تک محدود ہو کر رہ جائیں محض کاغذ کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور قوت و زندگی سے خالی+ معاشری زندگی ہے تعاونِ خود افزا، ایک نہایت دشوار مہم! زمانہ معاہدوں کا دشمن ہے+ زن و شوہر کے درمیان محبت محض عقد ہو جانے سے قائم نہیں رہ سکتی۔ جب تک وہ روز بروز اسے اپنی مساعی سے زندہ نہ رکھتے رہیں+ قوموں کے معاہدوں کا اور بھی بُرا حال ہے۔ موسیو شر بولئے کے اندازے کے مطابق ۱۵۰۰ ق م سے لیکر ۱۸۶۰ء تک آٹھ ہزار معاہدے قوموں کے مابین کئے گئے۔ ان کا اوسط دوران دو سال تھا+ شادی سے لے کر صلح ناموں تک شکستہ معاہدوں کے ہزاروں لاکھوں ٹکڑے تاریخ کے ساحلوں پر جا بجا بکھرے پڑے ہیں+

تعاون یا امدادِ باہمی کے معنی ہیں انسانی ارادوں کی مختلف طاقتوں کا مل جل کر ایک مشترک مدعا کی طرف چل نکلنا۔ تعمیر و تخریب کی کیا کیا صورتیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں! ایک طرف ہے انسانی ارادوں کی موجودہ دنیا جس میں یہ ارادے عموماً متناقض کوششوں اور باہمی ہلاکتوں میں صرف و تباہ ہوتے ہیں۔ دوسری طرف تخیل ایک نئی دنیا دکھاتا ہے جس میں یہ متحدہ مساعی بغیر اپنی قوت کو ضائع کئے مشترک مقاصد کے حصول کے لئے کامرانی کے ساتھ یلغار کرتی ہوئی بڑھی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہے امدادِ باہمی کی وہ دنیا جس کی تخلیق ہمارا مطمحِ نظر ہے+

"تعاون" ایک دوسرے کی مدد، ہم کاری، ارادوں کا اتحاد یہی ہے وہ مضبوط بنیاد جس پر مختلف معاشری منصوبوں کی تعمیرات کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مجلسِ اقوام کا قصر، اشتراکیت کا مکان، مزدوری انجمنوں کی عمارتیں+ اور یہی اتحاد

دیرپا ہوتے ہیں جن کے مقاصد زیادہ بلند ہوں مثلاً تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں، معابد لیکن وہ جن کا مطلب محض ادنیٰ قسم کی مطلب برآری ہو مثلاً شہوت رانی، زرگری وغیرہ ایسے اتحادوں کی مدت نہایت مختصر ہوتی ہے اور وہ جلد انجام پذیر ہو جاتے ہیں۔ بے شک بقول شخصے محبت نہ کرنے سے محبت کرنا بہتر ہے گو محبت کھوئی کیوں نہ جائے" لیکن اس کا یہ مفہوم بھی نہیں کہ شادی نہ کرنے سے شادی کرنا اور پھر طلاق دے دینا بہتر ہے۔ یعنی انسانوں میں جو اتحاد بھی ہو وہ صحیح معنی میں اتحاد اسی وقت کہلا سکتا ہے جب وہ مسلسل خواہش سے تقویت پاتا ہے اور ایک خاص سمت میں رواں ہو، نہ صرف یہ کہ سکون کی ایک منجمد حالت میں رہے، نری اک دوسرے کے پاس پاس کی زندگی، بغیر توانائی کے، بغیر جوش کے، صرف اک یہ احساس لئے ہوئے کہ ہم اک دوسرے کے عاشق زار ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے سچے "رفیق" اگر ہو سکتے ہیں تو صرف مشترک محنت اور ہم کاری کے اک ماحول میں۔ اور انسانی محبت کی بہترین نشوونما اگر ہو سکتی ہے تو صرف سود مند کاموں میں مل جل کر حصہ لینے سے۔ انجیل میں آیا ہے کہ "ایک دوسرے سے محبت کرو اپنے کاموں میں" بیشک اس کرمگ میں وہی محبت پائدار و شیریں ہوتی ہے جو مصروفیت کی فضا میں پھولے پھلے۔ مرد عورت کی باہمی محبت بھی ایک مدعا کے حصول کے لئے ہے اور بغیر مسلسل تعاون کے مرجھا جاتی ہے۔ امدادِ باہمی کے یہ معنی نہیں کہ ایک دفعہ مل کر باہمی مدد کا وعدہ کر لیا اور انسانی ارادے کو گویا چھٹی مل گئی۔ نہیں بلکہ یوں اس ارادے کے لئے ایک نیا اور زیادہ دشوار کام پیدا ہو جاتا ہے جس کی مناسب انجام دہی صحیح ترقی کا باعث ہے۔ ایک متحد تمدن میں اس کی ساری توانائی مصروفِ کار ہوتی ہے۔ وہ ایک ہوائی جہاز کی مانند ہے جسے برابر چلتے رہنے کی ضرورت لاحق ہے۔ جہاں وہ رکا وہ گرا۔ غرض امدادِ باہمی کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بھی ایک اعلیٰ درجے کا مشکل کھیل ہے جس میں ہر کھلاڑی اپنی جماعت کے جیتنے کا خواہاں ہے لیکن اگر وہ ہار جائے تو نہ وہ اپنے ساتھیوں سے دست و گریباں ہوتا ہے نہ خود ہمت ہار دیتا ہے بلکہ شکست میں بھی اسی طرح سرفراز رہتا ہے جیسے فتح میں۔ امدادِ باہمی بہادروں کا کام ہے یہ بزدلوں کا پیشہ نہیں ہو سکتا۔

امدادِ باہمی کی بہترین مثالوں میں آج کل کی بوائے سکاؤٹس کی تحریک ہے جس کے اندر ایک کھلاڑی کی شرافت ایک کاروباری آدمی کا ربط و ضبط اور ایک نوجوان کی ہمت و مردانگی سب ملی جلی کام کرتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری تعمیری شہریت ایسے ہی نظامات کی گود میں پل رہی ہے۔

مادہ کا صحیح استعمال، انسانوں کی باہمی اعانت کیا اس سے تمدن اور ترقی کے مسائل حل ہو گئے؟ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کے مقاصد کو "مسائل" نہ سمجھنا چاہئے۔ زندگی ہمارے لئے ایک مسئلہ نہ ہو جس کے مکمل حل اور صحیح جواب ہی سے ہماری تسلی ہو سکے بلکہ وہ اک معرکہ ہو مسلسل اور ہمیں یہ کاوش نہ رہے کہ ہم اس کی کشمکش سے نجات پائیں۔

زندگی کی کشمکش! "کش" اور "مکش"۔ "تم کش" میں مصروف رہو "مکش" خود بخود آ کر تمہارا دامن پکڑ لے گی۔ معاشری

کشاکشیں! یہی متمدن زندگی ہے، ایک اینچا تانی ایک کھینچ ایک تناؤ + بلکہ ساری کی ساری کائنات ایک عظیم الشان کل ہے جس میں اینچا تانی کا ایک وسیع سلسلہ جاری ہے۔ جس کے اندر پرزوں کی ایک دوسرے سے رگڑ گویا اُن کی مخاصمت کا آخری نتیجہ ساری کل کے مجموعی تعاون وتعامل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہاں کوئی ایک تاگا بھی نہیں کہ ڈھیلا ہو یا بے مصرف بلکہ تمام تنے ہوئے ہیں اور مضبوط، اسی تناؤ سے باہم وابستہ وزندہ جو بظاہر انہیں توڑنے اور فنا کر دینے پر تلی ہوا ہے + کسی زندہ نظام کی کشاکش کو ڈھیل دے دو اور بس۔ تم نے اس اصول کا جو اُسے قائم رکھے ہوئے ہے یوں استیصال کر دیا گویا تم نے خود اس نظام کو توڑ مروڑ دیا۔ ہر دو حالتوں میں نظام تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی روح و رواں اُسی کشاکش میں ہے +

ہمارا شعور بھی ایک نوع کی کشاکش ہے جو ہماری توجہ کو کسی خاص موضوع یا مقصد پر مبذول رکھتا ہے + ہمارے کسی مقصد کا حصول کبھی اک نری سیر نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہوتا ہے ہمیشہ بہ مقابل کا مقابلہ اور اسی کا شعور ہے جو ہمیں زندہ چہت وچاق اور قابل بنائے رکھتا ہے۔ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکنا سکھا دیتا ہے +

کشاکش کا یہ شعور عموماً لوگوں کو ایک مصیبت اور آفت بن کر نظر آتا ہے۔ بلاشبہ کشاکش درد خیز ہے اور اس کا حد سے بڑھ جانا غم انگیزی کا باعث ہو جاتا ہے بالخصوص اگر ہم یقین کرنے لگیں کہ زندگی کو صرف پسندیدہ احساسات ہی کی خواہش رکھنی چاہئے لیکن جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا ہے انسان کی فطرت اگر خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہے تو ساتھ ہی تکلیفوں کے برداشت کرنے کے لئے بھی ہے + حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا "امرِ واقع" نہ لذت وانبساط ہے نہ درد والم بلکہ ان دونوں کی بیک وقت موجودگی کی کشاکش کا شعور + جو انسان پورا شعور حاصل کر لیتے ہیں اُن کی خوشیوں میں درد کا اور اُن کے درد میں بھی خوشی کا ایک عنصر برابر موجود ہوتا ہے + وکٹر ہیوگو کا قول ہے کہ "پورا خوش ہونا بھی ایک آفت ہے" آفت اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ خوشی دیرپا نہیں۔ وقت کا گھن اُس کو لگا ہوا ہے + اُدھر پاسکل کا قول ہے کہ جب مصیبت کی حد ہو جائے تو انسانی شعور کو نجات کی امید ہونے لگتی ہے + زندگی نہ محض خوشی ہے نہ محض درد بلکہ خوشی اور درد دونوں زندگی کے مرکب کے لئے ضروری ہیں۔ جیسے آکسیجن اور ہیڈروجن پانی کے لئے + زندگی محض درد نہیں لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ درد زندگی کا لازمی جز ہے۔ زندگی ہمیشہ درد آفریدہ اور ایک حد تک درد پروردہ ہے ڈاکٹر ایڈلر کا قول ہے کہ "نوعِ انسان کے تمام بڑے نصب العین درد آفریدہ ہیں" وہ ہیں جوابات جو انسان کی دلیر روح نے قسمت کے درد والم کی دھمکیوں کو دیئے۔ شکست، عزیزوں کی موت، اپنی موت کی اصلی اور نقلی دھمکیاں اور درد والم کی اور ہزاروں صورتیں جو انسان کے گرد وپیش منڈلاتی رہتی ہیں + معاشری خدمت کے نصب العین کی بھی یہی نوعیت ہے معاشری زندگی کی جو اونچ نیچ نیک مردوں عورتوں کی آنکھ میں کھٹکتی ہے اُسی سے معاشری خدمت کا احساس پیدا ہوتا ہے + پس معاشری خدمت کی روح بھی کشاکش کی روح ہے۔ اُس میں معاشری ارادہ ایک مخالف طاقت کا مقابلہ کرتا نظر آتا ہے +

غرض گو یہ درست ہے کہ بغیر گاہے گاہے کے غیر ذمہ دار ساکن اوقات کے زندگی ہم سب کے لئے ایک مسلسل عذاب ہو جائے تاہم اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جُوں جُوں تمدن کی سطح بلند تر ہوتی ہے زندگی کی کشاکشیں بجائے کم ہونے کے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ جوں جوں زندگی کی قدور بڑھتی ہیں اُن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے اور اسی لئے اُن کے بچانے کا فرض بھی روز بروز زیادہ اہم ہو جاتا ہے + معاشرت اپنے ارکان کی ذمہ داری کے کم کرنے سے نہیں بلکہ ہمیشہ اُس کے زیادہ کرنے سے ترقی پاتی ہے +

یہ معاشری کشاکشیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ شاید ان کا وجود اور مقصد مسٹر چسٹرٹن کی اس مثال سے واضح ہو جائے کہ محراب کے اطراف میں گرنے کا میلان ہی محراب کو استوار کئے رکھتا ہے۔

"محبت کی عالمگیری" پر بہت تقریریں کی گئی ہیں کہ محبت ہی "معاشری مسائل" کا یقینی اور بہترین علاج ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ محبت کی راہ کبھی پوری صاف نہیں ہوتی۔ پائدار محبت وہ نہیں ہوتی جس کی راہ میں رکاوٹیں نہ ہوں بلکہ وہی جوان تمام رکاوٹوں کو توڑ کر اُن سے عبور کر جائے + یہی محبت مخالفت کی متوقع ہوتی ہے اور اُس سے بے نیاز ہو کر اُس کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے + بدھ لوگ کہتے ہیں کہ محبت نفرت کا اخراج کرتی ہے۔ ہاں اخراج ضرور کرتی ہے لیکن یہ خارج شدہ نفرت باہر محبت کے گھر کے دروازے پر ہی کھڑی رہتی ہے کہ موقع ملے اور یہ پھر اندر آ گھسے + محبت جہاں و محض ایک شہوانی یا خیالی جذبہ ہو ہمیشہ ناقابل اعتبار اور کمزور ہوتی ہے۔ محبت کا قیام و استحکام اس امر کا متقاضی ہے کہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان اور اُن کے سامنے کوئی نہ کوئی تیسری شے ہو جن پر اُن کی باہمی محبت مشترکہ طور پر اپنی مساعی کو صرف کر سکے اور اس صورت میں اپنی زندگی کو قوی تر اور زندہ تر بنا کر قائم رکھے۔ ور دائم بنائے + یہ تیسری شے اُن دونوں کی نگاہ میں ایک مشترک مقصد ہو ایک منتہائے کمال۔ خواہ وہ بچے ہوں یا کوئی معاشری تحریک یا اُن کا شہر یا مملکت یا نوع انسان ہی یا کوئی مذہبی نصب العین غرض کچھ ہو لیکن کچھ نہ کچھ ہو ضرور کہ محبت اگر تعاون کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار نہ کرے گی تو ایک شعلہ کی طرح آہستہ آہستہ بجھ کر رہ جائے گی +

پروفیسر روئیس نے محبت کی اس خاصیت کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اس ضمن میں اُسکی ایک تمثیل بہت دلچسپ ہے وہ لکھتا ہے کہ چونکہ مجھے اپنے دوست سے محبت ہے میں چاہتا ہوں کہ جب مجھے کوئی کام کی بات کہنا ہو وہ اُسے سن لے۔ اسی طرح میرا دوست چاہتا ہے کہ جب اُسے کوئی ایسی ہی بات کہنا ہو میں اُس کی سن لوں + طرفین کی اس مماثل خواہش کا نتیجہ جلد یا بدیر لازم طور پر یہ ہوگا کہ ہم دونوں بیک وقت اپنی اپنی کہنا چاہیں گے اور اس کا لازمی نتیجہ کسی نہ کسی قسم کے تنازعہ کی صورت میں نکلے گا + یہ ایک عجیب بات ہے کہ جتنا زیادہ اقوام اور افراد کو ایک دوسرے سے قریب کا تعلق ہوگا اتنی ہی جلد وہ ایک دوسرے کے گلے کا ہار ہو جائیں گے + جب دو آدمی ساتھ ساتھ چل رہے ہوں تو اُن کا ایک دوسرے کی راہ میں مزاحم ہو زیادہ ممکن ہے بہ نسبت اس حالت کے جب وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوں +

محبت و منافرت کے بارے میں انسان کے فطری میلانات کیا ہیں؟ کیا انسان فطرتاً اپنے ہم جنسوں سے محبت رکھتا ہے یا نفرت؟ کیا وہ دوسروں کی اعانت کرنا چاہتا ہے یا مخالفت؟ ٹامس ہابز ایک سترھویں صدی کا انگریز فلسفی کہتا ہے کہ انسان فطرتاً جھگڑالو ہے اور فساد کو پسند کرتا ہے اور دشمنی زندگی کا تین چوتھائی حصّہ ہے + انسان کو صلح پسند بنانے کے لئے تلوار کی ضرورت پڑتی ہے اور یوں مملکت ظہور میں آتی ہے +

اٹھارھویں صدی کے مشہور فرانسیسی مفکر رُوسو نے انسانی فطرت کے متعلق اس کے عین برعکس نظریہ قائم کیا + رُوسو کا خیال ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے ہم جنسوں سے محبت رکھتا ہے اور یہ محبت برابر قائم رہتی اگر "قانون سازی کی شیطنت" بیچ میں مخل نہ ہو جاتی + مملکت کے قیام نے نوعِ انسان کو تباہ کر دیا ہے + حال کے بعض مشہور ماہرین علم الانسان کا بھی یہی خیال ہے کہ انسان فطرتاً ایک خونخوار جانور نہیں ہے +

اِن دو متضاد و متناقض خیالات کے تطابق اور اس مسئلے کے حل کی کوشش اور نہایت کامیاب کوشش شہرۂ آفاق جرمن فلسفی کانٹ نے کی ہے + وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً اپنے ہم جنسوں سے محبت بھی رکھتا ہے اور نفرت بھی۔ اُس کا نہ اپنے ہمسائے کے ساتھ گذارہ ہے اور نہ اس کے بغیر۔ انسان کے سب ساتھی چھین لو اور وہ دنیا کی تنہائی کو سخت محسوس کریگا۔ اُسے ایک ساتھی دے دو تو جلد ہی یا دیر میں وہ اس سے لڑنے جھگڑنے لگ جائیگا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کانٹ کہتا ہے کہ اس کی وجہ انسان کی ان مل ملنساری میں مضمر ہے جس کا نتیجہ ہے معاشری کشاکش + ایک طرف تو یہ حالت ہے کہ ہم نے ایک نہایت منتظم معاشری نظام وضع کیا ہے جس میں فرد پر روز بروز زیادہ معاشری قیود عاید ہوتی جاتی ہیں اور دوسری طرف معاشرت اپنی شائستگی اور اپنی تعلیم کے ذریعے سے افراد کی شخصیت کو ترقی دے رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بات بات میں اپنی ذاتی آزادی پر زور دیتے ہیں۔ اس تضاد سے وہ کشاکش پیدا ہوتی ہے جو زندگی اور بالخصوص آج کل کی متمدّن زندگی کی امتیازی خصوصیت ہے + کانٹ نے اس الجھن کو خوب سلجھایا ہے + وہ کہتا ہے کہ یہ کشاکشیں وہ ذرائع ہیں جو قدرت نے انسان کی بہترین قوتوں کو ابھارنے کے لئے وضع کی ہیں۔ "انسان آرام سے زندگی گذارنا چاہتا ہے لیکن قدرت جو اس سے بہتر جانتی ہے کہ وہ کیوں بنایا گیا تھا" (گویا اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہہ کر) اُسے مشکل کام کرنے کو دیتی ہے اور اُسے تکلیفوں میں ڈال دیتی ہے تاکہ وہ اپنے غموں کے حلقے سے بالاتر و بلند تر ہو کر ایک بہتر انسان بن جائے"+

انسانی برادری کو عموماً ایک ایسی جماعت سمجھا گیا ہے جس کا مقصد مل جل کر خوشیوں سے لطف اُٹھانا ہے + بیشک یہ بات بھی اُس کے مقاصد میں شامل ہے لیکن اس پر بس نہیں + انسانوں کا کام نہ صرف مل کر خوشی میں حصہ لینا ہے بلکہ مل کر ایک دوسرے کے غموں میں بھی شریک ہونا ہے + اسی لئے معاشری جرأت اس قدر اہم اور کار آمد شے ہے اور اسی لئے اگر عوام کے سامنے سوخوشی ہی کو منتہائے زندگی قرار دیا جائیگا تو نتیجہ معاشرت کی کمزوری اور بزدلی ہوگا + آخری سانسوں تک درد کی چوٹیں ہر ایک کو سہنی پڑیں گی۔ یہی ایک راہ ہے جس سے انسان "غموں کے حلقے" سے بلند تر ہو سکتا ہے +

آج کل ہم اخلاقی نقاہت کا شکار ہو رہے ہیں جو زندگی کو خوشی کی ترازو میں تولنے کا لازمی نتیجہ ہے اور جس کا اثر کم و بیش
م طبقوں پر پڑ رہا ہے + اس قسم کے زمانے میں لوگوں کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ کشمکش
زندگی کو پیٹھ دکھا کر پیچھے کو نہ بھاگ نکلیں بلکہ آگے بڑھ کر اُسے لبیک کہیں + جہاں تک اس نوع کی تبدیلی محض پند و وعظ
تقریر و تحریر سے پیدا کی جاسکتی ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اس بات کی تعلیم دیں کہ انسانی تمدّن کا منتہائے کمال خوشی
یں بلکہ خوبی ہے تاکہ اخلاقی توانائی کی ندی کا پانی دنیا کے روزانہ کام کی چکّی کو چلائے جس سے ادھر ہم قوی ہوں،
ھر نوعِ انسان کے روح و رواں میں صحیح تمدن کا خون دوڑے +

اگر ان اصولوں کو مان لیا جائے تو ہمیں معاشری خدمت کے اصول کے لئے ایک مضبوط بنیاد مل جائے + معاشر
ت کی اہمیت کا آج کل ہر کسی کو اقرار ہے۔ لیکن معاشری خدمت صرف ہماری فرصت کے اوقات میں اور ہمارے
لتو روپے سے سرانجام نہیں ہوتی بلکہ اس کی اصلی بنیاد ہمارے روزانہ کام کی نیت میں مضمر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے
کیا یہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا گیا ہے؟ کیا ہم نے حتی الامکان اپنی پوری کوشش اس کی عمدگی میں صرف کی
ہے؟ کیا ہم نے اپنے شہروں کو اُن کی دی ہوئی قیمت کا پورا نعم البدل دیا ہے یا کیا ہم نے اُن کی آنکھوں میں خاک جھونک کر
قط اپنا الّو سیدھا کیا ہے؟ یہ ہے معاشری خدمت اور صنعتی اخلاق کا مسئلہ + کون انکار کر سکتا ہے کہ معاشری اور انسانی
مت کی دوسری صورت یعنی برضائے خود اپنا مال اور وقت لوگوں کی بہبود اور بہی خواہی میں صرف کرنا لائق صد تحسین ہے،
فامی حکومت کے مختلف شعبوں میں، ہسپتالوں کے انتظامات میں، تنگ و تار اور غلیظ گلی کوچوں کی کشادگی اور صفائی میں،
ریب بچوں کی نگہداشت میں، طرح طرح کے امراض کے سدباب میں، شراب خواروں، مجرموں اور فاحشہ عورتوں کی
صلاح میں ہزاروں شخص سینکڑوں مفید کام کر رہے ہیں جن سے نوعِ انسان کو معتدبہ فوائد حاصل ہوتے ہیں اور موجودہ تمدّن
ں اکثر گذرے ہوئے تمدنوں پر فوقیت صریح طور پر ثابت ہو جاتی ہے + یورپ یا امریکہ کے کسی بڑے شہر کو اگر ہم ایک نظر میں
یکھ سکیں تو ہم حیران رہ جائیں کہ وہاں کتنے مرد اور عورتیں بے غرضی سے، دلیری سے، بغیر کسی ستائش کی تمنا کے، بغیر کسی
صلے کی پروا کے، بے شمار مشکلوں اور دقتوں اور ناامیدیوں کے ہوتے ہوئے کیونکر خود بخود نیکی کے ہزاروں کاموں
یں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔ یوں انسانی ہمدردی اور محبت کی ایک لہر کئی پیاسے اور بھوکے بدنصیب شہریوں کا کلیجہ
ٹھنڈا کرتی ہے + کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ تمدّن جو ایسے ایسے مخیر اور ایسے ایسے رضاکار پیدا کرے ہزاروں خوبیوں
کا حامل اور لاکھوں امیدوں کا علمبردار ہے!

مگر جب یہ پوچھا جائے کہ وہ برائیاں اور کمیاں کہاں سے آئی ہیں جن کے دور کرنے اور پورا کرنے کے لئے اتنی شجاعت
و فیاضی کی ضرورت درپیش ہے تو اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ ان برائیوں اور کمیوں کے وجود کا سبب معاشری خدمت
کے اس دوسرے شعبے کی ناکامی میں مضمر ہے جو ہر کارکن اور دستکار کے روزانہ کام سے متعلق ہے جو اس سے تقاضا کرتا

ہے کہ وہ اپنا کام تن دہی اور ایمانداری کے ساتھ سرانجام دے + یہ معاشری برائیاں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ انسانی جماعت
کو انسانی افراد نے اپنی خراب کارگذاری سے کس حد تک ذلیل کر دیا ہے۔ یہی معاشری خرابی کا سب سے بڑا سبب ہے
آنے والے زمانے کے اخلاق دنیا کے روزانہ کام کو خوبی سے کرنے پر منحصر ہونگے۔ یہ ہوگی وہ مضبوط و پائدار بنیاد
جس پر آئندہ کے آرٹ اور اخلاق اور مذہب اپنی اپنی تعمیرات بنائیں گے اور ان تعمیرات کی خوبی و بلندی کی کوئی
حد نہ ہوگی + فن صنعت کے ساتھ متحد ہوگا محنت تعلیم کے ساتھ +

اپنا کام بخوبی سرانجام دینے کا قانون اتنا ہی عمیق ہے جتنی کہ خود کائنات + اسے اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنا
کر ہم کائنات کے باشندے بن سکتے ہیں، خدا کے ساتھ کام کرنے والے، جو زمانے کو ہماری دنیا میں اس طرح چکر دیتا رہتا ہے
جیسے قوت کسی کل کو اور جو اجزا کی غیر محدود مخالفتوں کے اندر سے کل کا شاندار تعاون و تعامل پیدا کرتا رہتا ہے، ایک ایسی
کائنات کی روح جس کے لئے وہی کشاکش فی الحقیقت ہر لمحہ حیات بخش ہے جو ہر وقت تباہی اور موت کی دھمکی دیتی ہے +

ایڈمنڈ برک کہتا ہے کہ ہم متمدن انسانوں کا یہ کام ہے کہ ہم اپنے نفوس میں فیاضی اور دیانت داری کے جذبات
کو ابھاریں، بڑھائیں۔ ہمارے گھر بار کی زندگی میں جو دلکش خوبیاں ہوں ہم ان کو عوام کی خدمت میں عمل میں لائیں۔ ہم محب
وطن بنیں لیکن اس طرح کہ ہم اپنی انسانیت کو نہ بھول جائیں۔ ہم دوستیاں بڑھائیں اور دشمنیوں سے نہ ڈریں۔ ہماری
دوستیاں اور دشمنیاں دونوں مضبوط ہوں لیکن منتخب، ان میں ہم نرم دل ہوں اُن میں اٹل۔ ہم اپنے اصولوں کو اپنے
فرائض اور اپنے حالات کے سانچے میں ڈھالیں۔ ہم یہ جی سے مان لیں کہ تمام وہ نیکی جو ناقابل عمل ہے محض ناکارہ
ہے اور شوق سے ایک ایسی راہ میں جہاں ہم اثر اندازی اور توانائی کے ساتھ مصروفِ عمل ہو سکیں غلطیاں کرنے
کے خطرے میں پڑ جائیں بجائے اس کے کہ اپنے روز و شب یوں پڑے پڑے گذار دیں کہ نہ ہم پر کوئی الزام عاید ہو اور
نہ ہم دنیا میں کسی کے کام آسکیں۔

اجتماعی زندگی تن دہی اور جاں فشانی اور جاں فروشی کی زندگی ہے جو اپنا کام کرتے ہوئے سوجاتا ہے وہ اپنے
فرائض کو کماحقہ انجام نہیں دیتا +"

بشیر احمد

راحت کدہ[۱]

(۱)

شورشِ آبادِ جہاں سے سخت گھبرایا ہوں میں
ہے تری زیبائش پہ کھنچ کر آ گیا ہوں میں
ہے یہ تسکیں تری یادِ دلِ برباد میں
رہ گیا ہے آہ باقی چند آنسو جن کو میں نذر کو لایا ہوں میں

(۲)

ترے جلووں سے دلِ زار سراپا مست ہے
بے تاب سدا رہتا ہے
تری ہی یاد میں لب بند ہیں لیکن دل میں
گرچہ آنکھیں ہیں ایک ہنگامۂ خاموش بپا رہتا ہے

(۳)

میں جب بے خانماں تنہائی میں کچھ یاد کرتا ہوں
ترے جلووں سے اپنی خلوتیں آباد کرتا ہوں
عجب لذت سی ملتی ہے مجھے فریاد و شیون میں
ترا ہی درد ہوتا ہے اور فریاد کرتا ہوں

(۴)

فصلِ گل ہے یا خزاں کا دور ہے کس کو ہوش ہے
میرے سینے میں بپا طوفانِ غم کا جوش ہے
جب ترے نغمے سے گھلتی تھی شب کی چاندنی
شام مری افسردگی سے نالہ خاموش ہے

اثر صہبائی

۱ حضرت اثر صہبائی نے "راحت کدہ" کے عنوان سے درد انگیز قطعات کا ایک سلسلہ لکھا ہے۔ یہ تمام اشعار انہوں نے اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات کی یاد میں لکھے ہیں جنہیں وہ "راحت" کے لقب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے قطعات کا یہ سلسلہ "راحت کدہ" کہلاتا ہے۔ "ہمایوں"

انگریزی شاعری میں محبّت کا تصوّر

(۲) محبت کے التباس کا ایک دلپذیر پہلو قدیم شناسائی کا احساس ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبوب سے کسی قدیم زمانے میں جسے گزرے مدتیں ہوگئیں اور کسی ایسی جگہ جو ہمیشہ کے لئے فراموش ہوگئی پہلے بھی جان پہچان اور محبت رہ چکی ہے میں سمجھتا ہوں تم میں سے اکثر کے مشاہدے میں یہ بات آئی ہوگی کہ جب کسی نئی اور حد سے زیادہ مسرت بخش چیز کا احساس باصرہ یا سامعہ میں شدید ہیجان پیدا کردیتا ہے تو اس کی جدت یا انوکھے پن کی حس تقریباً بالکل مٹ جاتی ہے ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تم کسی نئی چیز کو دیکھتے یا سنتے ہو بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا مدتوں پہلے تم اس چیز سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں ٹنکوکُو کے ایک چھوٹے سے دل کشا قصباتی شہر میں ایک جاپانی لڑکے کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور ابھی ہم بڑے بازار میں داخل ہوئے ہی تھے کہ لڑکا بے اختیار بول اُٹھا: "اوہو، میں نے تو یہ جگہ پہلے بھی دیکھی ہے!" دراصل اُس نے یہ جگہ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی کیونکہ وہ تو اوساکا کا رہنے والا تھا۔ اور اس سے قبل اُس نے اُس بڑے شہر سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن ایک نئے تجربے کے سرور نے ایک ایسی چیز کے متعلق اُس کے دل میں آشنائی کا احساس پیدا کردیا جس سے فی الحقیقت وہ ناآشنا تھا۔ مجھے آشنائی وناآشنائی کے اِس عقدے کے حل کرسکنے کا دعوےٰ نہیں ہے۔ یہ اب بھی اسی طرح ایک گہرا راز ہے جس طرح رومۃ الکبریٰ کے فاضل خطیب سسرو کے لئے یہ ایک گہرا راز تھا۔ لیکن ہر اس شخص پر جو محبت کرچکا ہے غالباً ایک آدھ لمحہ کے لئے یہ کیفیت طاری ہوئی ہے کہ "میں اس عورت سے پہلے بھی واقف رہ چکا ہوں"۔ لیکن کب؟ اور کس جگہ؟ یہ بھید ہیں۔ زمانۂ حال کے شعرا میں سے بعض نے اس احساس کو حسن وخوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال جو مجھے یاد ہے روزیٹی کے دل نشیں اشعار موسوم بہ "تنویر ناگہاں" ہیں ؎

میں پہلے بھی ضرور یہاں آچکا ہوں۔
لیکن کب اور کس طرح، یہ میں کیونکر بتاؤں؟
دروازے کے سامنے جو گھاس اگی ہے میں اُسے پہچانتا ہوں
یہ تیز میٹھی میٹھی خوشبو،
یہ سسکیاں لیتی ہوئی آواز، یہ ساحل کے گرد کی روشنیاں، سب مجھے
یاد ہیں۔

تم کبھی پہلے بھی یقیناً میری ہو چکی ہو ———
اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے کتنا عرصہ گزر گیا۔
لیکن اس ابابیل کی پرواز پر
جوں ہی تمہاری گردن یوں مڑی
ایک پردہ گر پڑا ——— میں نے یہ سب کچھ پہلے بھی دیکھا تھا۔

کیا یہ سب کچھ پہلے بھی یوں ہی ہو چکا ہے؟
اور کیا وقت کا تیز رو گرداب اسی طرح
ہماری زندگیوں کے ساتھ ہم دونوں کی محبت کو نہیں لوٹائے گا۔
خواہ موت اور فنا کتنا ہی زور لگائیں؟
اور کیا دن اور رات مل کر ایک بار پھر سرور کا ایک ایسا ہی نقش نہیں
چھوڑ جائیں گے؟

غالباً تمہیں اعتراف ہوگا کہ یہ شعر نہایت لطیف ہیں۔ اسی شاعر نے یہ مضمون بعض اور نظموں میں جو زیادہ پیچیدہ قسم کی ہیں یکساں خوبی کے ساتھ باندھا ہے لیکن اس دور کے ایک اور شاعر آنغر اوشانیسی کے دماغ میں یہ خیال روزیٹی سے بھی زیادہ چکر لگاتا رہتا تھا۔ روزیٹی کی طرح اُس نے بھی والہانہ محبت کی تھی اور محبت میں ناشاد و نامراد رہا تھا۔ اُس کی نظمیں جو اب مشہور ہیں اس درد و حسرت کا نتیجہ تھیں جس سے اُس کا دل معمور تھا۔ اسی طرح گانے والی چڑیوں کے متعلق جو پنجرے میں پیدا ہوئی ہوں کہا جاتا ہے کہ اگر اُن کی آنکھیں نکال دی جائیں تو وہ پہلے سے زیادہ خوش الحانی کے ساتھ گاتی ہیں۔ یہاں میں ایک مثال دیتا ہوں ؎

ابھی ابھی باغ کی روشوں کے ساتھ ساتھ
میں نے پھولوں کو بولتے ہوئے سنا
سفید گلاب نے مجھ سے تمہاری پیشانی کا ذکر کیا
اور سرخ گلاب نے تمہارے رخساروں کا
کنول نے تمہارے جھکے ہوئے سر کی داستان سنائی۔
اور سنبل نے تمہارے پرپیچ و خم بالوں کی
ہر پھول کتنا حسین کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا مگر پھر بھی اُس کی زبان سے یہ

صدا آتی تھی۔
کہ تمہارا حسن بہت زیادہ دلکش تھا۔

یہاں سے پلٹ کر میں جنگلوں میں پہنچا
اور میں نے طائرانِ صحرا کو یہ راگ گاتے ہوئے سنا
کہ تمہاری ادائیں کتنی شیریں تھیں، وہ اسی طرح گاتے رہے
اور بار بار یہی ایک گیت، یہی ایک ترانہ اُن کے سروں سے نکلتا تھا —
طوطی اور کوئل اور بلبل لگاتار انہیں سروں کو دہراتے تھے
اور رہ رہ کر پھر اسی نغمے کو شروع کرتے تھے
کیونکہ تمہاری ادائیں بہت زیادہ شیریں تھیں

اور یہاں سے گزر کر میں سمندر کے کنارے پہنچا
جہاں اس کو بھی میں نے ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں
اسی قدیم راز کا ایک حصہ دہراتے سنا
جو سب کا سب مجھ سے اور تم سے بنا ہے،
کہ کس طرح کئی ہزار برس گزرے ہیں
میں نے تمہیں اپنا دل دیا تھا اور تم میں دلبری کی سب ادائیں موجود تھیں۔
اس سے زیادہ مجھے تم سے دور رہنے کی تاب نہ رہ سکی، اس لئے
میں پلٹ کر پہنچا اور تمہارے قدموں میں گر پڑا۔

آخری بند میں علی الخصوص اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے جس کا ذکر میں تم سے کر رہا تھا لیکن ایک نظم بعنوان "یاد" اکبر میں یہ خیال زیادہ وضاحت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یادِ اکبر سے مراد اس زندگی سے ماورا گزرے ہوئے منازل زیست کی یاد ہے یہ قطعہ انیسویں صدی کی اس شاعری میں شامل ہو گیا ہے جو باقی رہے گی اور مناسب ہے اس میں سے بعض بہترین بند یہاں پڑھے جائیں ؎

حرماں نصیب دل میں مدتوں تک
محبت کے آنسوؤں اور آہوں سے بھری ہوئی داستان دبی رہی

ــــ اُس بہشت کی جس کی تعمیر دو انسانوں نے مل کر شروع کی
اور اُس دہشت کی جس نے ان دونوں کو گھسیٹ کر الگ کر دیا۔
جب ایک کے ہاتھوں محبت کا خون ہوگیا لیکن دوسرے نے
اپنے دل میں محبت کے لئے ایک مزار بنایا۔

طویل مدتیں اپنے بھاری اُسست رو قدموں کے ساتھ خاموشی سے گزرتی رہیں
اور وہ محبت اسی طرح اپنے مزار میں پڑی رہی اور وہیں
چپکے چپکے بدلتی رہی۔
یہاں تک کہ ایک دن اپنے نہاں خانے کے کنج سے
ننگ اور خجالت اور رسوائی کے داغ کی بجائے
محبت ایک نورانی چہرہ لئے ہوئے اُٹھی،
جیسے کوئی فرشتہ شہرِ خموشاں سے چلا آتا ہے۔

اُس نے وہ پتھر ہٹایا جو لحد پر لگا ہوا تھا
ــــ اُس لحد پر جسے دل نے اپنے اندر اب تک محفوظ رکھا تھا
لیکن رنج والم اندر ہی اندر گل گل کر فنا ہو چکا تھا۔
اور اُس دروازے سے جو مدتوں بند رہا تھا
ایک پیاری صورت نکلی جو نہ تو وہ گناہ تھی
اور نہ وہ رنج جو پہلے وہاں دبا ہوا تھا۔

× × × × × × × ×

اُس چہرے پر جو جان سے زیادہ محبوب تھا
اب کسی ایک آنسو کا نشان بھی نہ تھا۔
یہ پہلے سے زیادہ حسین تھا مگر پھر بھی وہی تھا
یہ پرانی محبت کا پاکیزہ ترجزو تھا
اور صبحِ اولین کا وہ خواب تھا

اور میں سوچتی تھی کہ شاید اُسے محبت ہے، شاید وہ بھول نہیں گیا،
شاید وہ میرے لئے کڑھتا ہے۔

آخر زینے پر وہی قدم سنائی دیا۔
قفل پر ہاتھ کی وہی جنبش تھی جس سے میں خوب آشنا تھی۔
اُس گھڑی پہلے پہل یہ معلوم ہوا کہ نسیم فردوس کے جھونکوں کی خوشبو
میری روح تک آرہی ہے،
اُس گھڑی پہلے پہل وقت کی سست رفتار ریگ کی روانی سنہری
ہوگئی۔
اور مجھے معلوم ہوا کہ میرے بالوں پر ایک نور برسنے لگا ہے۔
اور میری روح میں ایک نئی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

عورت مر چکی ہے اس کمرے میں جہاں اُس نے جان دی مرنے والی کے لئے چڑھاوے کے طور پر پھول رکھ دیئے گئے ہیں۔ بستر پر بھی پھول بچھا دیئے گئے ہیں۔ عورت کی روح کو یہ سب کچھ نظر آتا ہے مگر ان چیزوں کی وجہ سے اس کو نہ کوئی مسرت ہوتی ہے نہ رنج۔ اس کے دل میں صرف اپنے زندہ عاشق کی یاد ہے جو اس کی موت کے موقع پر وہاں نہ تھا بلکہ کہیں بہت دور تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ واقعی اُس کو مجھ سے محبت تھی اور کیا واقعی وہ یہ سُن کر ملول ہوگا کہ میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ مرنے والی کے کمرے کے باہر پرندے گیت گا رہے ہیں اور کھڑکیوں کے سامنے کے کھیتوں میں کسان کام کررہے ہیں اور ساتھ ساتھ باتیں کرتے جاتے ہیں لیکن روح اِن آوازوں کو بالکل نہیں سنتی۔ وہ کمرے میں صرف محبت کی خاطر رکی ہوئی ہے اور اس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک عاشق وہاں پہنچ نہ جائے۔ آخر اُسے اُس کے آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ وہ اس کے قدموں کی چاپ پہچانتی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ جب دروازے کے قفل پر اُس کا ہاتھ پڑتا ہے تو وہ اس آواز کو بھی پہچانتی ہے۔ اور پھر ایکبارگی، اس سے قبل کہ عاشق پر اس کی ایک نگاہ بھی پڑی، اُسے مسرت محسوس ہوتی ہے ابھی سے اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہشت کے پھولوں کی خوشبو سونگھ سکتی ہے اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سر کے گرد ایک ہالۂ نور کھنچ رہا ہے جیسا فرشتوں کے سروں کے گرد ہوتا ہے اور اصلی بہشت جو بہشتِ عشق ہے قریب آپہنچا ہے۔

یہ شعر کس قدر دلآویز ہیں! ابھی ایک مصرع اور ہے جس کو الگ طور پر تشریح کے ساتھ سمجھنا چاہئے میرا اشارہ اس فقرے کی طرف ہے جس میں "ریگ وقت کی روانی کے سنہرا ہوجانے" کا ذکر ہے۔ شاید تم کو یاد ہوگا کہ یہی تشبیہ

ٹینی سن کی نظم "لاکسلے ہال" میں بھی استعمال ہوئی ہے۔

محبت نے وقت کا شیشہ اٹھا لیا اور اسے اپنے دمکتے ہوئے ہاتھوں میں گھمایا

اور ایک ایک لمحہ ہلکی سی جنبش پاکر، اپنی روانی میں سنہری ریت بنتا ہوا بہتا گیا

یہاں وقت کو شیشۂ ساعت کی ریت سے تعبیر کیا گیا ہے اور "روانی" سے مراد ریت کا شیشے کے بالائی حصے سے نچلے حصے میں ٹپکنا ہے یہ الفاظِ دیگر باریک ریت بالکل اسی طرح "رواں" ہوتی ہے جس طرح پانی۔ یہ کہنا کہ "ریگِ وقت کی روانی سنہری ہوگئی" یا ریت تبدیل ہوکر سونا بن گئی، صرف اس حقیقت کے بیان کا ایک شاعرانہ طریقہ ہے کہ وقت محض خوشی ہی سے نہیں گزرا بلکہ ایک ایسی کیفیت اس پر طاری ہوگئی کہ وہ بہشتی یا آسمانی معلوم ہوتا تھا۔ اب تمہیں اندازہ ہوگا کہ اس چھوٹی سی نظم میں جہاں عورت کی روح اپنے عاشق کے آتے ہوئے قدموں کی آہٹ کا انتظار کر رہی ہے، ریگِ وقت کی یہ تلمیح کس قدر دل نشین بن گئی ہے۔

اب محبت کے جذبے کے بعض اور پہلوؤں پر جدا جدا بحث کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ایک پہلو جو بالخصوص دلآویز ہے گزری ہوئی باتوں کی یاد ہے۔ یہ تو خیر ظاہر ہی ہے کہ محبت کی یاد آنے والی باتوں کے کئی پہلو ہوتے ہیں جن میں سے بعض سراپا مسرت اور بعض انتہا درجے کے غمناک ہوتے ہیں مثلاً کسی سیر یا ملاقات یا وداع کے لمحے کی یاد۔ اس قسم کی باتوں کی یاد سے انگریزی کی عشقیہ شاعری کا خزانہ بھرا ہوا ہے میں صرف تین مثالیں دوں گا لیکن ہر مثال کی نوعیت جداگانہ ہوگی۔ پہلا شاعر جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں کونٹری پیٹمور ہے۔ اُس نے نظم کی دو عجیب کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک کا نام "گھر میں فرشتہ" اور دوسری کا "نامعلوم عشق" ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب میں اُس نے اپنے معاشقے اور شادی کی تمام داستان لکھی ہے۔ کسی شاعر کے لئے اس قسم کے کسی کام کا بیڑا اٹھانا خطرے سے خالی نہیں لیکن پیٹمور کی نظم کامیاب رہی۔ دوسری کتاب متفرقات کا مجموعہ ہے اور اس میں بعض نہایت نفیس چیزیں ہیں میں ایک نظم بعنوان "امیلیا" کے صرف چند شعر نقل کرتا ہوں۔ اس نظم میں ایک شام کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کسی محبوبہ کے ساتھ بسر ہوئی جو شعر میں نقل کر رہا ہوں اُن میں اس وقت کا ذکر ہے جب عاشق لڑکی کو گھر تک پہنچانے کے لئے جا رہا ہے۔ یہ شعر اب خاصے مشہور ہو چکے ہیں۔

...... دھندلے بازار تک

میں نے اُس کے مقدس قدموں کی رہنمائی کی۔

اور اس طرح بیٹی کو

نرم و نازک پتنگے کی سی، شیریں ادا والی

گلِ دمشق کی طرح بھڑکیلی اور مشک کے مانند شرگیں

بیٹی کو ماں کے حوالے کر دیا جو دھندلکے میں تشویش کے ساتھ راہ دیکھ رہی تھی

لہ شوخ رنگ؟

اور اب "شب بخیر!"

شاعر لڑکی کا ذکر آخر اس انداز میں کیوں کرتا ہے؟ وہ اس کے قدموں کو مقدس کیوں کہتا ہے؟ لڑکی نے ابھی ابھی اس سے شادی کا وعدہ کیا ہے اور اب وہ اسے بالکل ایک آسمانی ہستی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اپنی لطیف ترین حسیات کو ادا کرنے کے لئے اُس نے چند نہایت سادہ الفاظ ڈھونڈ لئے ہیں۔ بازار دھندلا ہے، اس لئے کہ رات کا وقت ہے۔ اور اس وقت وہ دوشیزہ جو خوبصورت پوشاک میں ملبوس ہے ایک نظر فریب پتنگے کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ رات کی تتلیوں کو انگلستان میں "پتنگے" کا نام دیا جاتا ہے۔ انگلستان میں پتنگے اصلی تتلیوں سے بہت زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ ان کے پر قرمزی اور ارغوانی اور بھورے اور سنہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ پس یہ تشبیہ اگرچہ انگلستان کے مقامی حالات سے مخصوص ہے مگر بہت عمدہ ہے۔ ساتھ ہی پتنگے کی اڑان کے بے صدا ہونے کی طرف بھی کنایہ ہے "گل دمشق کی طرح بھڑکیلی" پر زور تشبیہ ہے اور یہ صرف اس لئے کہ گل دمشق ایک عجیب شاندار پھول ہے جو انگلستان کے باغات میں گلاب کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ شوخ رنگ کا پھول ہے۔ "مشک کے مانند شرگیں" ایک اچھوتی اور ذرا انوکھی سی تشبیہ ہے۔ "مشک" ایک خوشبو ہے جسے انگریز اور ایشیائی خواتین سبھی استعمال کرتی ہیں لیکن یہ ایک ایسی خوشبو ہے جسے حد درجہ سلیقے اور احتیاط سے برتنا پڑتا ہے مشک کے لگانے میں خفیف سا شائبہ بھی اگر اندازے سے زیادہ لگ جائے تو نتیجہ اچھا نہیں رہتا لیکن اگر مناسب مقدار ٹھیک ٹھیک استعمال کی جائے اور ذرا سی زیادتی بھی نہ ہو تو کوئی خوشبو اس سے زیادہ پیاری نہیں ہوتی۔ گویا "مشک کی طرح شرگیں" کا اشارہ دوشیزگی کے اُس حجاب کی طرف ہے جس سے ذرے کے برابر بھی کوئی لغزش نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ لطیف حیا ہے جو بجز لطیف ہونے کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی۔ بایں ہمہ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ تشبیہ محسوس کرنے کی ہے، سمجھانے اور تشریح کرنے کی نہیں۔

جن تین مثالوں کے پیش کرنے کا وعدہ میں نے کیا تھا اُن میں سے دوسری مثال رابرٹ براؤننگ کے اشعار سے ہوگی۔ اس مثال میں ایک ایسا احساس نظم کیا گیا ہے جس پر شعرا نے اگرچہ کم توجہ دی ہے لیکن یہ احساس عشاق کے لئے مخصوص ہے۔ میری مراد اس خواہش سے ہے کہ جب ہم بہت خوش ہوتے ہیں یا کسی دلچسپ چیز کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ہم اپنی مسرت میں محبوب کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا اتفاق بہت ہی کم ہوتا ہے۔ کہ حقیقت میں بھی یہ خواہش اور یہ شرائط یکجا پورے ہوں۔ اس آرزو کا خیال کر کے براؤننگ نے ایک چھوٹی سی نظم لکھی جس نے اب مستند اور بلند پایہ اشعار کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ انیسویں صدی کے بہترین جواہر ریزوں میں سے ہے:

کبھی یہ نہ ہوا کہ وقت اور جگہ
اور محبوب سب باہم میسّر ہو سکتے!
یہ رہگزار — چلنے میں کتنا نرم و لطیف ہے!

یہ بہار —— ہائے کیسا جادو بھرا موسم ہے!

میرے محبوب کا چہرہ کہاں ہے؟
ایک خواب میں اُس محبوب کا چہرہ میرے چہرے سے ملتا ہے
لیکن مکان تنگ ہے اور جگہ وحشت خیز اور ہوا کے جھکڑ کی زد میں،
باہر مینہ اور آندھی نے ایکا کر رکھا ہے ——
اگر میں بولنا چاہوں تو کان لگا کر چوری چوری سننے کا
میرے سرخ ہوتے ہوئے رخسار کو اپنی عناد پر ورآنکھ سے دیکھنے کا
اور میرے خلاف ایک ایسے کینے سے کام لینے کا جو میری ایک ایک
جنبش میرے ایک ایک لفظ کی خبر رکھتا ہے!

اس دنیا میں کبھی سب چیزیں حسب مراد نہیں ملتیں۔ ایک خوشگوار دن، ایک دل پسند جگہ اور محبوب کا قرب
ب کے سب ایک ہی وقت میں کبھی نصیب نہیں ہوتے۔ کسی نہ کسی چیز کی کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ اگر جگہ اچھی ہو
نا ید موسم خراب ہوتا ہے یا اگر جگہ اور موسم خوش آئند اور نفیس ہوں تو وہ عورت جس سے محبت ہو موجود نہیں ہوتی۔ شاعر
ب اپنے آپ کو ایک خوبصورت جگہ میں پاتا ہے تو اسے یہی خیال آتا ہے اور معاً اُس کے دل میں محبوبہ کے ساتھ اپنی گزشتہ
فات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ ملاقات ایک چھوٹے سے تاریک اور سرد مکان میں ہوئی تھی۔ مکان سے باہر بارش
رہی تھی اور جھکڑ چل رہا تھا۔ آندھی اور مینہ کی آوازیں چھپ کر باتیں سننے والوں کی آوازوں کے مانند تھیں یا اُن لوگوں کی آوازو
ے مانند جو چوری چوری کھڑکیوں میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی مجبوری کی وجہ سے
ملنا چوری چھپے کا ملنا تھا اور بحیثیت مجموعی یہ ملاقات بہت زیادہ مسرت افزا نہیں تھی۔

تیسری مثال ایک نہایت دلکش نظم ہے لیکن ہمیں صرف اس میں سے ایک اقتباس لے کر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ یہ ایک
نگنی کے دن کی یاد ہے اور لکھنے والا فریڈرک ٹینی سن ہے۔ غالباً تم جانتے ہو کہ ٹینی سن کے نام کے تین بھائی تھے۔
ور اگرچہ الفریڈ شاعرانہ کمال میں سب پر سبقت لے گیا لیکن سبھی اچھے شاعر تھے:

موسم بہار کی ایک سنہری صبح ہے
میرا چہرہ زرد ہے لیکن اس کے رخساروں پر شگفتگی کی حرارت دوڑ رہی ہے
اور ہم اس پرانے کمرے میں اکیلے رہ جاتے ہیں
اور وہ ایک راگ گانے لگتی ہے۔

کھلا ہوا دریچہ نسیم کے جھونکوں میں لرز رہا ہے
اور ایک بڑا سا گلاب کا پھول اپنا شبنمی حسن
کمرے کے اندر ایک ہنستے ہوئے چہرے کی طرح جھکائے ہوئے ہے۔
اور اس کے گرد شہد کی مکھیاں تیرتی پھرتی ہیں

× × × × × × ×

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں نے کیا کہا صرف وہ جواب جو اس کے لبوں سے نکلا۔
ایک ہمیشہ رہنے والی دھوپ کی طرح اب بھی میرے دل میں چمکتا ہے
اور پھر میں نے محبت سے بھری ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا، آہ ہم کبھی جدا نہ ہوں
میری پیاری، میری جان، میری دلہن!

اس عظیم الشان شادمانی کے بعد ہم پر خاموشی
اسی طرح چھا گئی جیسے کوئی خوشگوار سایہ۔ اور میں نے سنا
کہ بہت دور جنگل آہیں بھر رہا ہے اور ایک طائر بہار
درختوں میں گا رہا ہے

اس خوش نوا طائر کا نغمۂ مسرت جو چاروں طرف لہرا رہا تھا
درختانِ صحرا کی ہلکی صدائیں اور لاجوردی آسمان
سب میرے دل پر نقش ہو گئے، اگرچہ نہ کانوں اور نہ آنکھوں کو کسی منظر یا آواز کی خبر تھی۔

وہ آرام سے اپنے سنگِ تربت کے نیچے سو رہی ہے
لیکن ہائے یہ تمام نظارہ اسی قدر صاف نظر آتا ہے
کہ مجھے یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ مرنے والی پھر قبر سے اٹھائی گئی یا موت

آئی ہی نہ تھی

اگر میں اپنے آپ کو یہاں یکہ و تنہا نہ پاؤں۔

کسی لمحۂ محبت کی اس قدر روشن اور زوردار تصویر کھینچنا کمالِ فن کی دلیل ہے۔ آؤ اس کی چند خوبیوں پر غور کریں۔ عاشق کا چہرہ اس لئے فق ہو رہا ہے کہ وہ تشویش اور اضطراب میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سے ایک سوال کرنے والا ہے مگر ڈرتا ہے کہ معلوم نہیں وہ کیا جواب دے۔ اس واقعے کو پیش آئے مدت گزر چکی ہے، سالہا سال ہو چکے ہیں مگر اس صبح کے گہرے اور پُرزور جذبات اپنی ہر تفصیل کا ایک حیرت انگیز طور پر واضح نقش حافظے پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اُس شخص کو کمرے کی صورت، دھوپ کا کمرے میں پڑنا، گلاب کے قرمزی پھول کا باغ میں سے اندر کی طرف رخ کئے ہوئے ہونا اور مکھیوں کا اس کے گرد بھنبھنانا سب کچھ یاد ہے اور پھر جب سوال پوچھا جا چکا اور اس کا جواب باصواب مل گیا تو خوشی کے مارے دونوں کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکتی تھی۔ اس خاموشی کی وجہ سے قدرت کی باہر سے آنے والی تمام صدائیں اس قدر واضح ہو گئیں کہ اُن کے احساس میں ایک درد کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اب وہ یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کمرے میں بیٹھے ہوئے اُس نے بہت دور کے درختوں میں ہوا کی سنسناہٹ اور ایک پرندے کا گیت سنا تھا۔ ساتھ ہی اُسے اُس دن کے تمام رنگ اور روشنیاں بھی یاد آ جاتی ہیں۔ لیکن اس بات کو بہت لمبا، بہت ہی لمبا عرصہ گذر چکا ہے اور وہ مر چکی ہے۔ تاہم اس کے دل میں اس واقعے کی یاد اتنی صاف اور روشن ہے کہ اسے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وقت کی رفتار رک گئی ہے یا وہ قبر سے پھر واپس آ گئی ہے۔ صرف ایک چیز اسے بتاتی ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے اس کی حقیقت پرانی باتوں کی یاد سے زیادہ نہیں —— وہ اکیلا ہے۔

اب التباسِ محبت کے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ فریب ہر صورت میں جاتا نہیں رہتا۔ ان صورتوں میں جب محبت کامیاب ہو اور مسرت آمیز طور پر ملاپ ہو جائے یہ فریب ہمیشہ جاتا رہتا ہے۔ اس وقت قدرت کو اپنے عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن ناکامی، موت (Death) یا محبوب لڑکی کے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عالمِ تصور کی تمثال کبھی غائب نہیں ہوتی بلکہ دل پر عمر بھر اس طرح چھائی رہتی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی اور اس طور پر اس میں اتنی قدرت ہوتی ہے کہ نہایت ہی کامیاب زندگی کو بھی ناشاد و نامراد بنا دے۔ بعض اوقات اس قسم کی ناکامی کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے خیالات دنیا اور زندگی اور مذہب کے متعلق بالکل پلٹ جائیں۔ اور پھر اس کے لئے ہر چیز پر ہمیشہ تاریکی اور یاس کا سایہ محیط رہتا ہے۔ بہت سے نوجوان محبت میں مایوس ہوتے ہیں تو اسی وقت سے ان کی مذہبی حس بھی فنا ہونے لگتی ہے۔ محض اس لئے کہ تقدیر اُن کے ساتھ نامہربانی سے پیش آتی ہے اُن کو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کائنات کی

بنیاد ہی ٹیڑھی ہے۔ بخلاف اس کے کامیاب عاشق یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے انتظامات ٹھیک چل رہے ہیں۔ وہ اپنے معبود کا شکر بجالاتا ہے اور مذہب اور انسانی فطرت پر اس کا ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ مجھے اس وقت کوئی ایسی قابلِ ذکر انگریزی نظم یاد نہیں جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہو۔ لیکن فرانسیسی زبان میں وکٹر ہیوگو کی ایک چھوٹی سی نفیس نظم ہے جس سے سیدھی سادھی طبیعتوں میں کامیاب عشق اور مذہبی وجدان کا باہمی رشتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

نظم کا موضوع محض ایک رات کی چہل قدمی ہے۔ نوخیز دلہن اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لئے چل رہی ہے شوہر کے دل میں اس رات کی جو یاد ہے یوں ظاہر کی گئی ہے۔

میں نے اس ساعدِ سیمیں کو، جس میں ہلکی سی لرزش تھی،
محبت سے دبایا۔ اور ہمارے خیالات نے
عشق کی دل نواز فتح مندی کا اقرار کیا۔
خدا کی روحِ عظیم الشان، پیاری پیاری رات پر چھائی ہوئی تھی۔
محبت ہمارے دلوں پر چھا رہی تھی۔
ستاروں کا نور جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

یوں ہی پھرتے پھرتے اور خواب دیکھتے دیکھتے،
وہ خواب جن میں زمین سے لے کر آسمان تک کے تمام جلوے جھلکتے ہیں،
ایسا معلوم ہوا کہ ہماری روحیں بولنے لگیں۔
ستاروں نے تیرے عارض پر نظر ڈالی ———
تیری آنکھوں کو فضائے لاجوردیں سے
ستاروں کی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں

اور اژدہامِ کواکب کے نور میں
تو نے محسوس کیا کہ نرم و شیریں بات
رستہ چیر کر تیری روح سے ہم کنار ہو گئی۔
تو نے کہا، اے سرور و شادمانی کے خدا!

گنبدِ نیلوفری کے مالک!
جزو و کل کو تو نے ہی بنایا ہے!"

اور ستاروں نے دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں
فضائے عمیق کے خدا سے کہا: ہم جانتے ہیں،
اے ازل و ابد کے خداوند،
اے ہمارے پیارے مالک، سب عشق و محبت تجھ سے ہے،
ہم نورِ محبت ہی سے تو فروزاں ہیں!
حسن کو تو نے ہی بنایا ہے!"

یہ تو ظاہر ہے کہ اس نظم میں خود احساسِ مذہبی بھی التباسِ محبت ہی کا ایک جزو ہے لیکن اس نے احساسِ عشق میں بہت زیادہ گہرائی اور زیبائی پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظم ایک صداقت کی نہایت پر زور طور پر توضیح کرتی ہے یعنی جب ہم کو کامل مسرت حاصل ہو تو کائنات خدا کی محبت اور خدا کے جمال کا عکس معلوم ہوتی ہے، بہ الفاظِ دیگر ہم بہشت میں ہوتے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم کسی عظیم رنج میں مبتلا ہوں تو دنیا ایک جہنم معلوم ہوتی ہے جہاں نہ کوئی امید ہو نہ خوشی اور نہ کوئی معبود جس سے دعا مانگی جائے۔

لیکن سب سے بڑھ کر جس وجہ سے میں نے وکٹر ہیوگو کی نظم تمہیں سنائی وہ یہ ہے کہ اس میں وہ خاص کیفیت موجود ہے جسے فلسفی نقادانِ ادب کی اصطلاح میں "کونی جذبہ" کہتے ہیں۔ کونی جذبہ انسانی جذبے کی بلند ترین کیفیت ہے، لفظ "کون" سے مراد کائنات ہے، صرف یہی دنیا نہیں بلکہ افلاکِ معلومہ کے لاکھوں کروڑوں سورج اور دنیائیں بھی اس مفہوم میں شامل ہیں اس لئے بداہتہً "کونی" کے اسمِ صفت کے معنی ہوئے "بہ تمام کائنات کے متعلق" یہ ضروری نہیں کہ معمولی جذبہ اپنے علائق یا نسبت کے اعتبار سے محض انفرادی ہی ہو یعنی یہ بالکل ممکن ہے کہ تمہارے احساسات میں کسی ایسی چیز کے خیال یا ادراک سے تحریک پیدا ہو جائے جو صرف تمہاری ہی زندگی سے نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگوں کی زندگی سے علاقہ رکھتی ہو۔ اس معمولی جذبے کی عظیم ترین شکل وہ ہے جسے احساسِ قومی کا نام دیا جاتا ہے یہ اس تعلق کا احساس ہے جو تمہیں پوری قوم یا پوری نسل کے ساتھ حاصل ہے لیکن جذبے کی اس سے بلند تر شکل بھی ہے جس وقت تم اپنے آپ کو جذباتی طور پر صرف اپنے ملک یا اپنی قوم سے نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان سے متعلق سمجھو اس وقت تم پر تیسرے یا دوسرے درجے کا کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے۔ میں نے قصداً "تیسرے یا دوسرے" کہا ہے اس لئے تمہارے جذبے کا دوم یا سوم درجے کا ہونا بڑی حد تک اس پر منحصر ہے کہ تمہارے دل میں بنی نوعِ انسان

کی وحدت کا کیا تصور ہے۔ لیکن اگر تم اپنے آپ کو محض اس دنیا کے متعلق نہیں بلکہ کروڑوں ستاروں اور سیاروں کی تمام کائنات سے، عالم شہود کے پورے بھید سے، متعلق سمجھو تو تمہیں اعلیٰ ترین صنف کا کوئی جذبہ میسر ہوگا یہ ظاہر ہے کہ خود اس میں بھی تدریجات موجود ہیں فلسفی یا مابعد الطبیعیات کے حکیم کا کوئی جذبہ اس جذبہ سے کہیں زیادہ لطیف ہوگا جو شاعر یا صناع کو نصیب ہو سکتا ہے لیکن عشاق پر بہت کثرت سے اپنی اپنی دماغی ترقی یا استعداد کے متناسب ایک قسم کا کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے اور وکٹر ہیوگو کی چھوٹی سی نظم سے اس حقیقت کی توضیح ہوتی ہے۔ رات اور ستارے اور آسمان کا گنبد سب عاشق کی آنکھ کو حسن اور محبت کے جوش سے لرزتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ خود ایک محبت آمیز سرور کی حالت میں ہے اور پھر اس کا سلسلۂ خیال ہستی مطلق سے، اس سر عظیم سے جو ہر قسم کی صورت اور ہر قسم کے نام سے ماورا ہے، اپنا تعلق قائم کرنے لگتا ہے۔

اس قسم کے جذبے کی ایک تیسرے یا چوتھے درجے کی مثال کیٹس کی ایک نفیس و جمیل نظم سے لی جا سکتی ہے جو اس نے اپنی موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے لکھی تھی۔ کوئی بہت ہی نوجوان شخص یہ شعر لکھ سکتا تھا، اس لئے کہ کوئی بہت ہی نوجوان شخص اس انداز میں محبت کرتا ہے۔ لیکن یہ کس قدر دلآویز ہے! اس کا کوئی عنوان نہیں۔

روشن ستارے! کاش تیری طرح میری ہستی کو بھی ثبات حاصل ہوتا ——
اس لئے نہیں کہ میں قدرت کے ماہ بہ ماہ گردش کرنے والے شب زندہ دار
زاہد کی طرح سکوتِ شب کی پرعظمت تنہائی میں آسمان کی بلندیوں پر معلق
رہ کر سدا کھلی آنکھوں کے ساتھ ان جنبش کرتے ہوئے پانیوں کا مشاہدہ
کرتا رہوں جو اس خاکی دنیا کے کناروں کے ارد گرد ہر وقت طہارت
کے پاکیزہ شغل میں مصروف رہتے ہیں
اس لئے بھی نہیں کہ میں پہاڑوں اور میدانوں پر ملائمت اور آہستگی
کے ساتھ گری ہوئی تازہ تازہ برف کی سفید چادر کا نظارہ کیا کروں،
نہیں، بلکہ میں اس لئے ایک ثبات پذیر، ایک غیر تغیر آشنا وجود چاہتا
ہوں کہ اپنی محبوب حسینہ کے نوخیز گدرائے ہوئے سینے کو تکیہ گاہ بنا کر اس کے ہلکے
ہلکے مدوجزر کو محسوس کرنے کے لئے ہمیشہ ایک شیریں بے آرامی کی
حالت میں بیدار رہوں اور اس کے دھیمے دھیمے تنفس کی آواز سنا کروں۔
اے کاش! یا تو ہمیشہ میں اسی حالت میں رہوں یا پھر موت مجھے اپنے
آغوش میں اٹھا لے۔

ٹینی سن نے نہایت دل نشیں انداز میں ایک عاشق کو یہ آرزو کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کا ہار یا بیٹی یا

کان کا آویزہ ہوتا لیکن یہ کسی صورت میں کوئی جذبہ نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ٹینی سن کے گیت کا اصل خیال بعض قدیم فرانسیسی اور انگریزی عشقیہ گیتوں سے لیا گیا تھا جو معمولی کسانوں کے بنائے ہوتے ہیں لیکن کیٹس اس دلکش نظم میں جہاں عاشق یہ آرزو کرتا ہے کہ اسے ایک ستارے کی جاودانی زندگی اور مماثلت نصیب ہوجاتی مگر اس لئے کہ اس کو معشوق کا دائمی وصال حاصل ہو، اس پرانے یونانی خیال کی کچھ جھلک نظر آتی ہے جس نے دو تین ہزار سال قبل یہ نفیس مصرعے کہلوائے تھے!

تُو ستاروں کو دیکھ رہا ہے، میرے ستارے! کاش میں ہی آسمان ہوتا،

ہزار آنکھوں سے ستارہ پوش، ہمیشہ تیری ہی طرف دیکھنے کو!

لیکن کیٹس کی نظم میں خیال کے یونانی حسن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ کیونکہ یہ شاعر خارجی کائنات کا ذکر وسیع ترین علائق میں کرتا ہے۔ ستارے اُس کے نزدیک ہمیشہ سمندر کے پانیوں کے مدوجزر پر نگاہ جمائے رکھتے ہیں۔ خود یہ مدوجزر سروقت دنیا کی طہارت اسی طرح کرتا ہے جس طرح کوئی پجاری کسی مندر کی۔ اس لڑکے کا تخیل پھیلتے پھیلتے فلسفے کا تخیل ہوگیا ہے۔ یہ شاعری فلسفے اور مخلصانہ جذبے کی باہم آمیزی ہے۔

جن نظموں کا مطالعہ ہم نے مل کر کیا ہے اُن سے تم سمجھ گئے ہوگے کہ انگریزی کی عشقیہ شاعری جاپان کی عشقیہ شاعری کی طرح شاخوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے یا بہ لحاظِ وسعتِ موضوع اس کی جماعت بندی کی جاسکتی ہے جس کی حد نہایت سادہ احساس کے بیان سے لے کر اُس بلند ترین مرتبے تک پہنچتی ہے جو کوئی جذبے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ مضمون بہت سیر حاصل ہے۔ طالب علم کو یہی الجھن ہوتی ہے کہ کس چیز کا انتخاب کرنے۔ میں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ التباس کے مضمون کی اہمیت کو صحیح طور پر پیش نظر رکھو علی الخصوص ان مثالوں کی روشنی میں جو ہم نے مل کر پڑھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی دنیا کی عشقیہ نظموں کی ایک تعدادِ عظیم غالباً تمہیں کچھ عجیب بلکہ شاید مہمل اور بے وقوفانہ معلوم ہوگی۔ لیکن تم یقیناً اس حقیقت کو تسلیم کروگے کہ انگریزی زبان کی عشقیہ شاعری کی بعض انواع ایسی ہیں جو نہ عجیب ہیں اور نہ احمقانہ اور جو نہ صرف اپنی جگہ پر بلکہ تمام ادبیات میں اظہارِ جذبات کی بلند ترین صورتوں سے متعلق ہونے کے باعث بدرجۂ اولیٰ مطالعے کے مستحق ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری میں سے بہت کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے جو خود تمہاری ادبیات میں جذبات کو ایک نیا آب و رنگ دے کر مالا مال کردے۔

حمید احمد خاں

انقلاب

تیری نگاہیں کیا پھریں، مجھ سے زمانہ پھر گیا
تیری نظر سے کیا گرا، میں ہر نظر سے گر گیا

ہاروتِ بابل بھی مری مشکل سے عاجز آگیا
ہر سحر بے تاثیر ہے جس دن سے وہ ساحر گیا

محرومِ اُلفت اب نہ رو، تیرا خزانہ لُٹ چکا
دنیا سے تُو غائب اُٹھا عقبیٰ کو تُو خاسر گیا

جس دل سے مہر و ماہ نے پائی مسرت کی ضیا
گھنگھور غم میں پھنس گیا، کالی گھٹائیں گھر گیا

اب جوئبارِ زندگی چپ چاپ سی ہے، ہاں کبھی
اُٹھی صدائے درد جب کوئی کنارہ کر گیا

یاد

یاد اُس کی مجھے اک دن دیوانہ بنا دے گی
آئینِ دو عالم سے بیگانہ بنا دے گی

اُس چشمِ فسوں گر کی جاں سوز فسوں سازی
جینے کی تمنا کو افسانہ بنا دے گی

پھر یاس گھٹا بن کر امڈی دلِ مسکیں پر
وحشت مری بستی کو ویرانہ بنا دے گی

اے پیرِ مغاں خوش ہو اب میری سیہ مستی
آفاق کی وسعت کو میخانہ بنا دے گی

ہر فتنۂ گردوں کو صہبا میں ڈبو دے گی
ہر گردشِ دوراں کو پیمانہ بنا دے گی

تھی کس کو خبر یارب! یہ بے بصری مجھ کو
اک شمعِ خیالی کا پروانہ بنا دے گی

حامد علی خاں

جنگ و جدال

ایکٹ دوم

چنار کے درختوں میں ایک کوٹھی، اوپر کی منزل میں ایک چوڑی بیلکونی، جہاں سے چناروں کے درمیان سے سمندر دکھائی دیتا ہے۔ دائیں اور بائیں ایک ایک دروازہ، داہنی طرف کا دروازہ ڈرائنگ روم میں، اور بائیں طرف کا کمرے میں کھلتا ہے، جس کا سامان اور فرنیچر نہایت قیمتی اور اعلیٰ قسم کا ہے

پردہ اٹھتے وقت، ولی بائیں دروازے کے سوراخ میں سے جھک کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔

ولی (سر اٹھا کر اور ہٹ کر) الٰہی، یہ بھی کیا عمر، اور کیا زمانہ ہے، ساری رات صبح تین چار بجے تک باہر گھومنا، اور پھر دوپہر تک بستر پر پڑے رہنا۔ (ذرا آگے بڑھ کر) سب نوجوان امیر عیش کے سوا اور کوئی کام کرتے ہی کب ہیں۔ (باہر کے دروازے کی گھنٹی بجتی ہے، دوڑ کر بیلکونی میں جاتا ہے، اور وہاں سے نیچے دیکھتا ہے) کوئی آیا۔ اوہو، یہ تو آنیفقہ آئی ہیں، کاہے کو آئی ہیں (داہنے دروازے سے جاتا ہے تھوڑی دیر میں آنیفقہ کے ساتھ واپس آتا ہے)

آنیفقہ:۔ بک کہاں ہیں؟

ولی:۔ تمہیں اُن سے کیا کام ہے؟

آنیفقہ:۔ تمہیں کیا، کچھ ہوگا، میں اُنہیں دیکھنے آئی ہوں کچھ باتیں کہنی ہیں، جلدی کرو، جلدی۔ میرے مُنہ کو کیوں تاک رہے ہو۔ ٹکٹکی لگا رکھی ہے۔ میں کہتی ہوں بک کہاں ہیں، میں اُن سے ملوں گی۔

ولی:۔ اوہو، ایسی بھی کیا جلدی۔ حالانکہ تم ان سے نہیں مل سکتیں۔

آنیفقہ:۔ کیوں کیا وہ یہاں نہیں۔

ولی:۔ ہاں کل رات بھی یہاں نہ تھے، کہہ گئے تھے میں نہیں آؤں گا۔

آنیفقہ:۔ خیر تو جاؤں (جانے کو ہوتی ہے)

ولی:۔ ذرا تو ٹھیرو، ایسی بھی کیا جلدی۔ تم بھی عجیب عورت ہو۔ کیوں اچھلی پڑتی ہو، ٹھ دست، کوئی تمہیں کھا نہیں جائیگا۔ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔

آنیفقہ:۔ کیا تم سے ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ مجھے کام ہے اس لئے جا رہی ہوں۔ نہیں تو، تم آدم خور تو نہیں ہو۔

ولی ۔ (کمرے کے اندر سے گھنٹی بجتی ہے! اُس سے چونک کر) حضور!

مجدی ۔ (اندر سے) تم کس سے باتیں کر رہے ہو۔

آنیفتہ ۔ (خوش ہو کر جلدی سے) مجھ سے حضور۔ آپ کو سلام کرنے آئی تھی۔

ولی ۔ (آنیفتہ کو ہاتھ سے پکڑ کر، اشارے سے اُسے چُپ کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر آہستہ سے کہتا ہے) چُپ رہو، اری طاعون کی وبا۔ (آنیفتہ کواڑ کو ہٹاتی ہے) نہیں، نہیں، تم اندر داخل نہیں ہو سکتیں۔

آنیفتہ ۔ کیوں؟ مجھے ان سے کچھ باتیں کہنی ہیں۔

ولی ۔ اچھا باتیں کہنا میں منع کب کرتا ہوں۔ لیکن وہ ابھی پلنگ پر ہیں۔ ایسی بھی کیا بے صبری۔ رُکا ہی نہیں جاتا۔ ذرا ٹھیرو۔ وہ بستر سے اٹھیں، کپڑے پہن لیں۔

آنیفتہ ۔ کچھ پروا نہیں، اگر وہ آرام کر رہے ہیں، تو بھی میں اُن سے باتیں کروں گی۔

ولی ۔ میری بات کیوں ماننے لگیں۔ اگر بک ہوتے تو فوراً تمہارا طیو بدل جاتا۔

مجدی ۔ (اندر سے) ذرا ٹھیرو، آنیفتہ، ابھی آیا۔

ولی ۔ اب اپنی حد پہچانی؟ بد تمیز کہیں کی۔

(آنیفتہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے، بیلکونی (برآمدے) میں جاتی ہے اور وہاں سے جھک کر چناروں کے اندر نظر ڈالتی ہے: اتنے میں مجدی پاؤں میں سلیپر ڈالے، اور ڈریسنگ گون پہنے دکھائی دیتا ہے۔ آنیفتہ آنکھ کے اشارے سے، ولی کو باہر جانے کے لئے کہتی ہے۔ مجدی بھی اُسے باہر جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ ولی بھی پُرمعنی نظروں سے آنیفتہ کو دیکھتا ہوا داہنی طرف سے باہر جاتا ہے۔)

مجدی ۔ کہو کیا خبریں ہیں۔

آنیفتہ ۔ (مسکرا کر) ہم پہونچ گئے، بک افندی۔

مجدی ۔ (خوش ہو کر) تم؟ اور وہ کہاں ہیں؟

آنیفتہ ۔ چناروں میں مجھے بھیجا ہے کہ آپ کو خبر کر دوں تاکہ آپ نوکر کو دفع کر دیں۔

مجدی ۔ ابھی لو۔ ذرا ٹھیرو (میز کے قریب جا کر گھنٹی بجاتا ہے، ولی داخل ہوتا ہے) (اُس سے) دیکھو فوراً ساحل پر جاؤ کیا بجا ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) اوہو نو بج رہے ہیں۔ جو جہاز ملے، اُسی پر استنبول جاؤ۔ بک اوغلے میں میرے درزی سے کہو کہ میں نے جن سوٹوں کا آرڈر دیا ہے، اُن کا پیکٹ بنا کر تمہیں دے۔ شام کے جہاز سے واپس آؤ۔ سمجھے، ہاں ٹھیرو، روپے تو لیتے جاؤ (روپیہ لانے کے لئے پھر کمرے میں جاتا ہے)

ولی ۔ (آنیفتہ سے) معلوم ہوتا ہے یہ حکم تمہارے اشارے سے ملا ہے۔ سچ ہے تمہارے کاٹے کا منتر نہیں۔

(مجدی کمرے سے باہر آتا ہے، ولی کو نوٹ دیتا ہے، وہ سلام کرکے باہر جاتا ہے۔)

مجدی۔ (آنیقہ سے) دیکھو ہوشیاری سے، کہیں راستے میں تمہیں ولی نہ مل جائے۔

آنیقہ۔ نہیں بک افندی، پوری احتیاط کی جائے گی۔

مجدی۔ تو پھر جلدی کرو، جاؤ اُن سے عرض کرو تشریف لائیں۔ میں بھی ذرا جا کے کپڑے پہن لوں۔ اور ہاں آنیقہ، تم جب لوٹ آؤ، تو دروازے میں کنجی لگا دینا اور باہر بیٹھ جانا۔ اور کوئی بھی آئے اُسے اندر آنے مت دینا۔ اور دیکھو خبردار کسی سے یہ نہ کہنا کہ میں آج کسی سے ملاقات نہ کرونگا خواہ مخواہ شبہ پیدا ہوگا۔

آنیقہ۔ بہت اچھا حضور، میں سمجھتی ہوں، آپ کے فرمانے کی ضرورت نہیں حضور اطمینان رکھیں، میں پوری احتیاط کرونگی۔

مجدی۔ شاباش، تم کو میں خوش کردونگا۔ ہاں، اب جاؤ۔ (آنیقہ داہنے سے، مجدی بائیں دروازے سے جاتے ہیں، آدھے منٹ کے بعد داہنی طرف سے، بہیجہ نقاب ڈالے داخل ہوتی ہے۔ لباس نہایت مکلّف ہے، ہاتھ میں لیڈیز کی چھتری ہے)

آنیقہ۔ کمرے میں ہیں۔ کپڑے پہن رہے ہیں۔ آپ کو ذرا انتظار کرنا ہوگا۔ (بہیجہ سر کے اشارے سے موافقت کرتی ہے اور آگے بڑھ کر، میز پر کی تصویروں کو دیکھتی ہے، پھر برآمدے کے دروازے سے ٹیک لگا کر باہر کی سیر کرتی ہے۔ مجدی بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے، اور بہیجہ کی طرف جو مڑ کر اسے دیکھتی ہے، لپک کر اُس کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں تک بوسے کے لئے جاتا ہے اور کہتا ہے۔ کیسی بڑی عنایت، کتنا بڑا احسان!

بہیجہ۔ بیشک آپ مہمان کے آنے سے خوش ہی ہوئے ہونگے۔

مجدی۔ اُف کیسا مہربان اور کتنا عزیز مہمان! کاش وہ مہمان اپنی عنایات سے، ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہے، کبھی نہ جائے۔

بہیجہ۔ مہمان کی بھی خواہش تو یہی ہے۔ کہ جتنا ہو سکے یہاں رہے۔ ابھی کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے کہ میں یہاں آئی تھی کل یہاں پھر آنے کے لئے جا رہی تھی۔ مگر شام تک دل پر جبر کرتی رہی، آخر آج میں نے سوچا کہ اگر نہ آئی تو صبر نہ کر سکونگی میں نے سب سے کل شام یہ کہہ دیا کہ آج میں اپنی خالہ سے ملنے جاؤں گی۔ لوگوں نے کہا کہ ابھی تو گئیں تھیں میں نے کہا بیمار چھوڑ آئی تھی۔ اس لئے جانا ضروری ہے غرضکہ سینکڑوں حیلوں اور ہزاروں بہانوں سے پھر آئی ہوں۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کتنے اور کن خطروں میں سے گذر کر آئی ہوں۔ تاکہ اُنہیں شبہ نہ ہو ساحل تک ان کے ساتھ آئی اور وہاں سے دوسرا راستہ لے کے بڑی مشکلوں سے چاپ داست باز انتک گئی اور وہاں کی گلیوں اور کوچوں سے گذر کے پھر جہاز لیکر یہاں تک پہنچی

مجدی۔ اس قدر زحمت اٹھانے کا مجھے جس قدر افسوس ہے اسی قدر آپ کی تشریف آوری کا احسان مند ہوں۔

بہیجہ۔ مگر آپ نے کس قدر اچھا کیا کہ اس تنہا مقام میں یہ کوشک (بنگلہ) لیا۔ اگر وہیں رہتے تو ہر وقت ایک دوسرے سے مل تو سکتے لیکن جیسا چاہتے ہیں ویسا نہ مل سکتے۔ اب اس مکان کی بدولت آرام سے اور اطمینان سے ملاقاتیں ہوا کرینگی۔

مجدی۔ اس میں کیا شبہ ہے۔ وہاں مجھ پر بہت کچھ اعتراضات ہوئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ معاملہ اس قدر بڑھ جانے کے بعد

میرا وہاں رہنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ آہ! میں جب اُن دنوں کا خیال کرتا ہوں جو ایسے ہیجان و آتشِ شوق میں گذرے ہیں۔

بہیجہ۔ کیا اچھا زمانہ گذرا تھا۔

مجدی۔ وہ پہلی شام جب میں وہاں آیا تھا اُس وقت سے لیکر اس وقت تک کا زمانہ جبکہ میں نے پیانو کے پاس اعترافِ عشق کیا، اُس زمانے کا ذوق و ہیجان میں بھول نہیں سکتا۔ وہ شام جبکہ آپ میری نظر کے نیچے پیانو بجا رہی تھیں .....

بہیجہ۔ اُسے صرف نظر کہنا، اس کی اہانت کرنا ہے۔ وہ نظر نہ تھی، ایک آتش، ایک التہاب تھی۔ اُف یا ربی! وہ اک آگ تھی جس نے میرے تمام جسم کو مشتعل کر کے، میری روح، میرے قلب کو زیر و زبر کر دیا۔ اُسے صرف نظر کہتے ہو؟ مدت سے میرے صنم خانۂ خیال میں مرد کا، اور مرد کے حُسن و کمالات کا جو تصوّر رکھا تھا، وہ میں نے تم میں اتنا مکمل پایا کہ تمہیں دیکھتے ہی میں نے اپنے دل سے کہا۔ مرد یہی ہے! جب سے میں دنیا میں آئی ہوں مجموعۂ محاسن مرد یہی دیکھا ہے، پھر یہ مرد جبکہ میں اس آتش سوزاں سے مضطرب تھی، اس نافذ نظر سے میری روح میں گھس رہا تھا۔ بھلا اس نظر کا میں کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ سوچو، تم وہ مرد تھے جس کا میں بچپن سے پوری معنویت سے انتظار کر رہی تھی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ دامنِ ضبط و استقلال چھوڑ کر میں کیوں تمہارے پاؤں پر نہ گر پڑی۔

مجدی۔ لوگ تمہیں گھیرے ہوئے تھے۔ اور میں پورے طور پر آپ کے رجحان کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باغ میں جس وقت آپ نے ایک گلدستہ مجھے پیش کیا تھا، اُس وقت مجھے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ آپ کے احساساتِ قلب میری طرف کیا ہیں۔ شبہ کا پیدا ہونا تھا، کہ پہلی علامت نے اس شبہ کو پوری شدت سے تقویت دی۔ اُف! آپ کا حال کیا تھا۔ ہونٹوں میں لرزش تھی، رخساروں پر رنگ، آنکھوں سے کیا کچھ نہ برس رہا تھا۔

بہیجہ۔ مجھ سے قسم لو، کہ اس دن جس آتشِ محبت سے میں مشتعل تھی، کسی عورت نے اپنے میں، اپنے محبوب کو سپرد کرنے کے لئے اپنے دل میں ایسا شعلہ بھڑکا ہوا نہ پایا ہوگا۔

مجدی۔ میں نے اپنی زندگی کو آپ کی محبت سے اس قدر مستغرقِ لطف و لطافت پایا کہ میرا دل ایک ناقابلِ بیان انشراح و مُسرت سے کھل گیا۔ دو دن کے اندر محقق ہو گیا کہ ایک دوسرے کے متعلق ہمارے دلوں کی کیفیات کیا ہیں۔ آپ جیسے ایک خزینۂ یگانہ کو پا کر، سوسائٹی کی پابندیوں اور بیہودہ قیود سے ڈر کر، ہاتھ سے دے بیٹھنا، بے شک ایک ناموسکارانہ اور مردانہ حرکت ہوتی۔ لیکن میں ایک عاجز و مریض و بیچارہ عاشق ہو کر رہ گیا۔ شرف و ناموس کہاں؟ نہ معلوم میں نے بُرا کیا یا اچھا کیا۔

بہیجہ۔ اُس کے اور قریب آ کر، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہیں کیا خبر تم نے کتنا اچھا کیا۔ اگر میں تمہاری طرف سے رد کی جاتی، تو یقین مانو میں خودکشی کر لیتی۔ کیونکہ میں تمہیں اس طرح نہیں چاہتی جس طرح عورتیں مردوں کو چاہتی ہیں۔ تمہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ میں نے تمہیں اُس بے پناہ، بے امان، چارہ ناپذیر عشق سے چاہا ہے جو ایک انسان اُس انسان کیلئے محسوس کرتا ہے جسے قدرت نے محض اس کے لیے پیدا کیا ہو۔

مجدی۔ کیا اچھا ہوا کہ میں عاشق ہوا اور اعلان عشق کیا۔ میں تو خوش بخت ہوا ہی، آپ کو بھی باعث زحمت نہیں ہوا۔

ہیمیہ۔ بے شک بے شک لیکن اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے آپ نے اپنے عشق سے وہ مسرت بخشی ہے جو دارستہ اندیشہ ہے، یا جس پر کسی کدورت کا سایہ نہیں، تو آپ غلطی پر ہیں۔

مجدی۔ وہ کیوں؟

ہیمیہ۔ میں حال سے اس قدر ہوں کہ استقبال سے ڈر رہی ہوں، نہیں چاہ کر، اور تم سے چاہی جا کر، میرے دل کو وہ راحت پہونچ رہی ہے کہ میں اس کے انجام سے خوف کھانے لگتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ مجھے اس خوف و اضطراب کا شکار نہ بننا چاہیئے، لیکن کیا کروں، یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔

مجدی۔ نعیم سے؟

ہیمیہ۔ نہیں، اُس سے ڈرنے کی مجھے کوئی حاجت نہیں، کیونکہ اگر وہ خبر پا جائیگا، تو یقیناً مجھے مار ڈالیگا اور اُس وقت میں اپنے عذاب و اضطراب سے چھوٹ جاؤنگی، میں جس چیز سے ڈر رہی ہوں، وہ ہمارے عشق کا مستقبل ہے۔

مجدی۔ خدا کے لئے بتلایئے ہمارے عشق کے مستقبل کے متعلق آپ کو کیا خوف ہے۔

ہیمیہ۔ فرض کیجئے کہ ہم تا ابد اسی طرح ایک دوسرے کو چاہیں گے۔ مگر ہوگا کیا؟ اول تو یہی عذاب کیا کم ہے کہ ایک دوسرے سے جُدا رہنا اور محرومیت کے بعد، چھپا چوری ملنا۔ اس کے بعد غمگین طریقے سے اپنے سر کو اس کے کندھے پر رکھ کر، اس کے بعد واقعہ یہ ہے کہ مجھے ایک شخص کی طرف سے اس کا بھی اطمینان نہیں کہ وہ مجھے برابر اتنا ہی چاہتا رہیگا جتنا میں چاہتی ہوں۔

مجدی۔ تمہاری زبان سے اور میں یہ سنوں؟ یقین مانو، کس قدر بیکار اور غلط اندیشے کو دل میں جگہ دے رہی ہو۔ اول ذرا سوچو، تم جیسا ایک لطیف نادرۂ عشق مجھے ملیگا کہاں۔ تم نہیں سمجھ سکتیں کہ آج کل کی سوسائٹی کی شرائط ہیمیہ کے اندر میں کسی دوسری عورت سے نہ عشق کر سکتا ہوں نہ شادی کر سکتا ہوں۔

ہیمیہ۔ میں نہیں سمجھتی، نہیں سمجھتی، کیا میں اپنے عشق کو خطرے اور تہلکے سے گھرا ہوا خیال کروں تو حق بجانب نہیں ہوں۔ تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری نسبت، میں تمام عورتوں کو کس شبہ اور کس قدر شدید رقابت کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ ابھی میں زندہ نہ رہوں گی، یہ تمام اندیشے مجھے برباد کئے دے رہے ہیں۔ ہماری خوشی کا یہ پہلا ہی ہفتہ ہے۔ مگر رقابت اور خوف کی آگ کے تحمل سوز شعلے مجھے جلا رہے ہیں۔

مجدی۔ کس قدر فضول اندیشے اور خوف میں مبتلا ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ . . . .

ہیمیہ۔ (بات کاٹ کر) ہاں اگر ایک دفعہ مجھے یقین آجائے کہ میرے اندیشے بے بنیاد ہیں تو اس وقت میں پوری مسرت کی زندگی بسر کر سکتی ہوں، صرف اس وقت، مگر اس سے قبل ممکن نہیں ہو رنہ میں تو چاروں طرف خطرہ ہی دیکھتی ہوں، اپنے عشق کو خطرے سے گھرا ہوا پاتی ہوں

مجدی۔ میری جان تم بھی کس قدر وہم میں مبتلا ہو خطرہ کیسا، خطرہ کہاں ہے؟ میں تو سوائے اپنے عشق کی اور اپنی مسرت کی تابانی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھ رہا۔

ہیجیہ۔ لیکن، میرے نوجوان اور خوبصورت عورت، خاص کر نوجوان کنواری لڑکیوں سے مجھے خطرہ ہے جانتے ہو؟ سب سے زیادہ حسد مجھے کس سے ہے؟ ان کنواری لڑکیوں سے جن کا تمہاری بننا ممکن ہے۔ مثلاً نسیمہ۔ ہنستے ہو؟ تمہیں کیا معلوم کہ میں اُس سے کس قدر جلتی ہوں، خاص کر اُس کے آزاد ہونے سے۔ حالانکہ میرے پاؤں میں ایک بھاری اور خوفناک زنجیر پڑی ہوئی ہے جو مجھے ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کر رہی ہے جسے میں ذرا نہیں چاہتی میں اپنے دل سے کہتی ہوں۔ آج کے دن کاش میں بھی آزاد ہوتی تو جس سے محبت کرتی ہوں اُس کے پاس جاتی اور اُس سے کہہ سکتی "مجھے لے، میں تیری ہوں، جو چاہے کر"۔ آہ ہمارے عشق میں خفیہ مسرتیں ہیں، تو اُس میں تلخیاں بھی ہیں۔ سب سے اول اُس کا پوشیدہ ہونا ہی اک مصیبت ہے، خیانت کی طرح ہر شخص سے چھُپانا۔ اگر یہ راز فاش ہو جائے، تو ہم پر لعنت بھیجی جائے گی۔ چونکہ یہ عشق جو اس قدر مسرت دے رہا ہے، کہا جائیگا کہ یہ تمہارا حق نہیں، چونکہ اگر لوگوں کو خبر ہو جائے، تو میں نفرتِ عامہ کا نشانہ بن جاؤں گی۔ چوروں کی طرح چوری کرنا، یہ احساس مجھے پیسے ڈالتا ہے۔

مجدی۔ میری پیاری سمجھ لو کہ عشق دسعادت دُنیا میں ہر چیز سے بالا تر ہے۔ اور جس عشق سے تمہیں دُنیا میں مسرت پہونچی ہے، اس کا چند بوسیدہ اور بے حس آدمیوں کے خود تراشیدہ قواعد کے مخالف ہونا، نہیں کیوں مضطرب کرتا ہے؟ کیوں میری جان؟ میرے ہاتھ اگر تم جیسی نایاب و معزز ہستی آ جائے، تو میں سوائے اس کے اور کچھ نہ سوچوں کہ تمام قواعد و رسوم کو خیر باد کہہ کر، ایک ایسا آشیانۂ مسرت بنانے میں مشغول ہو جاؤں جہاں تمہیں اور اپنے عشق کو اوروں سے چھپا کر رکھوں، اور میری تم سے بھی یہی التجا ہے کہ تم بھی اس کے سوا اور کچھ نہ سوچو۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ تمہاری خوبصورت آنکھیں، ان واہی اور بے بنیاد وہموں اور فکروں کی وجہ سے نمناک ہوں؟ بجائے اس کے کہ ہم اپنے عشق کے خیالی خطروں کو سوچ سوچ کر مکدر ہوں، آؤ، اپنی موجود اور محض مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوں، دیکھو ان چناروں کے نیچے، اس بے مثال منظر کے درمیان، عشق و محبت کرنے سے بڑھ کر اور بھی کوئی خوشی ہو سکتی ہے، آہ کس قدر افسوس ہے کہ یہ تمام محاسن طبیعیہ رائگاں جا رہے ہیں۔ یہ بے نظیر جزیرہ جو ایک آشیانہ عشق ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، یہ خوبصورت جزیرہ، حیف ہے اگر چند بد ذوق، اور تنگ نظر آدمیوں کے ایجاد کردہ قواعد کی بدولت، ایک غیر دلکش تصویر کا چوکھٹا بن کر رہ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر دل میں محبت و عشق جا گزیں نہ ہو، تو اس حسین منظر پر نظر ڈالنا بھی گناہ ہے۔ کیونکہ خدا کے یہ خوبصورت مناظر صرف عشق و محبت کے لئے، صرف ان لوگوں کے لئے پیدا کئے ہیں جو شراب عشق سے مدہوش ہو کر ایک دوسرے کو چاہتے ہوئے ان کی سیر کے لئے نکلیں.... یہ مناظر، یہ مملکت، یہ سماں یہ چناروں کی قطار، یہ خوشبوئیں کس قدر دل آویز اور وجد انگیز ہیں۔ یہاں کا ہر ذرہ کہہ رہا ہے کہ میں اس قدر خوبصورت

اس لئے پیدا کیا گیا ہوں کہ حسن و عشق یہاں مصروفِ گلگشت ہوں۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اس جزیرے کی پیدائش کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ جو نہ جانتے ہوں انہیں بتائے کہ عشق و محبت کیا چیز ہے۔ یہاں، صرف اس ہوا اس نسیمِ عشق و سودا میں سانس لینے سے عورتیں پُر غلیان و پُر شفقت ہو جاتی ہیں۔ اور صرف یہی نہیں کہ اپنے تئیں تسلیم کر دیں بلکہ اپنی تمام روح و قلب کے ساتھ تسلیم ہونے کے مہیا پائی جاتی ہیں۔ یہاں مرد بے اختیاری طور پر شاعر یعنی روحاً و قلباً عاشق بن جاتا ہے، یہاں ایک معمولی بات بھی، اس روح پرور منظر کے درمیان، ان چناروں کے سایۂ دلاویز کے نیچے اک لطیف شعر، ایک رنگین غزل، ایک ولولہ انگیز قصیدہ بن جاتی ہے بلا شبہ، اگر دنیا میں وطنِ عشق تلاش کیا جائے، تو یہی آ طہ لر ساتھ ہیں۔ آہ ان چناروں کے گھنے اور سرسبز سائے، ان کی خوشبوئیں اور ان کی ترنم آمیز سرسراہٹ!

ہیجہ۔ آپ کس قدر صحیح کہہ رہے ہیں۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب پہلے پہل یہاں آئی ہوں۔ ہم خرستوس کو گئے تھے چناروں کے نیچے ان کی سرسراہٹ سے مست و مدہوش ہو کر میں جا رہی تھی اور چاہنے اور چاہے جانے کی ایک عمیق احتیاج میری روح کو مضطرب کر رہی تھی، آخر وہاں جہاں پاپائے اعظم کی اقامت گاہ تھی وہاں پہنچ کر میرے سامنے نامتناہی عظمت کے ساتھ میرے پاؤں تلے بحرِ مرمر شعاعِ آفتاب سے چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی چمک سے میری آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ ان قطعاً چناروں کے رنگ، ان کی خوشبو، ان کی سنسناہٹ سے مست و مدہوش ہو جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی ہر ایک چیز اس سے صرف عشق کا ہی ذکر کرتی ہے۔ اور اُسے شوق آرزو اور غلیان کی طرف کھینچے لئے جاتی ہے۔ اس دن میں نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنے دل سے صدائے شکایت سنی "یہاں چاہا نہ جانا کس قدر قابلِ افسوس ہے"۔ یہ فریاد میرے دل سے اس دن نکلی تھی۔ آہ اُس دن تمام خوبصورتیوں کو میں نے زہرناک تلخی سے محسوس کیا تھا۔ مگر آج تمہاری بدولت میرا قلب شوق و آرزو سے انہیں دیکھ رہا ہے۔ اور میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے اب انہیں سمجھا ہے۔ نیچر کی خوبصورتی میں نے پہلے بھی دیکھی مگر اس سے جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ تم نے مجھے سکھایا۔ اب میں تمہاری نظروں سے اُسے دیکھتی ہوں۔ اب تک نیچر کے جو رنگ نہ دیکھے تھے اب دیکھ رہی ہوں۔ اور اب وہ خوشبوئیں سونگھ رہی ہوں جو اب تک میرے مشامِ جان تک نہ پہونچی تھیں۔

مجدی۔ آہ پیاری ہیجہ۔

ہیجہ۔ میں اپنا تمام انشراحِ قلب تمہیں بتانا چاہتی ہوں، اور یہ آرزو رکھتی ہوں کہ جو الفاظ کسی کو نہ ملے ہوں اُن کے ذریعے سے تمہیں سناؤں کہ میں تمہاری کس قدر مفتون، کس قدر مملوک ہوں۔

مجدی۔ یقین مانو کہ وہ الفاظ جو تمہاری نظریں کہہ رہی ہیں دنیا کی زبان کا کوئی لفظ ان سے زیادہ بلیغ اُن سے زیادہ محبت پاش نہیں ہو سکتا۔

ہیجہ۔ اگر یہ بات ہے، تو فقط میری نظروں سے نظر ملاؤ۔ محبت کی نظر سے محبت کی نظر ملاؤ۔ وہ نظر ڈالو جو مجھے بتائے کہ تم مجھے کتنا

---

۵۱ استنبول کے چند نہایت خوش سواد جزیرے ہیں، جہاں امرا اپنے قصروں میں رہتے ہیں۔ اس ڈرامے کا سین وہیں ہے۔

چاہتے ہو، وہ نظر جو میری روح میں نفوذ کر جائے اور میری روح کو اطمینان حاصل ہو۔

مجدی۔ بہیجہ کے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے، دیر تک مفتونانہ نظر سے دیکھتا ہوا آہ میری حیات اور میری روح سب تیری ہے۔

بہیجہ۔ (مست و مدہوش) میرے محبوب، دیکھ مجھے دیکھ اور گہری نظر، اور محبت بھری نظر سے دیکھ۔

مجدی۔ (اسی کی طرح مست و مدہوش) تجھے چاہتا ہوں، تجھ پر فدا ہوں (سر جھکا کر، ایک لمبے بوسے سے اُسکے ہونٹوں کو بند کر دیتا ہے)

بہیجہ۔ آہ اور، اور اور محبت کی نظر ڈال۔

مجدی۔ میں تیری پرستش کرتا ہوں۔ مگر تم تو اپنی آنکھیں بند کئے لیتی ہو، یہ نہ ہوگا۔

بہیجہ۔ اچھا تو تم میری آنکھوں میں کیا دیکھتے ہو؟ ان کی گہرائیوں میں تمہیں کیا نظر آتا ہے؟

مجدی۔ آہ تمہیں کیا معلوم میں وہاں کیا دیکھ رہا ہوں؟ وہ کہہ رہی ہیں۔ "ہم دنیا کی سب سے زیادہ حسین و دلکش آنکھیں ہیں جو ہم پہ فدا ہوتا ہے وہ خوش قسمت اور جس سے ہم محبت کریں وہ خوش قسمت ہے۔

بہیجہ۔ پھر کہتی ہوں۔ "یہ نہ کہنا کہ میں نا متناہی محبت سے چاہا نہ گیا، کسی عورت کی طرف سے لازوال و بے مثال عہد وفا نہ دیکھی جتنا میں چاہتا ہوں اتنا چاہا نہ گیا! اس لئے کہ تم اپنے تصور سے زیادہ چاہے جا رہے ہو۔ اور عورتوں پر طعن و تشنیع نہ کرو اس لئے کہ اگر وہ تمام وفا و صداقت جو عورتیں تمام مردوں کے مقابلہ میں کرتی ہیں، ایک جگہ جمع کر دی جائے تو بھی وہ اس محبت کے برابر نہ ہوگی جس شدت سے کہ میں تمہیں چاہ رہی ہوں۔ (ایک ناقابل رد جذبۂ محبت سے مغلوب ہو کر اس کے اور قریب آ کر) ہاں یہ بالکل صحیح ہے جس عشق میں میں مبتلا ہوں، وہ مجھے ایسی بڑھ چڑھ کر باتیں کہلوا رہا ہے ٹھیرو، دیکھو، سنو، ہوا کیا کہہ رہی ہے چناروں کی سنسناہٹ کیا کہہ رہی ہے۔

مجدی۔ محبت کرو، محبت کرو۔ دنیا میں صرف عشق ہے، اور دنیا میں شایان تبریک و تحسین صرف وہی اک قوت ہے، وہی اک قوت ہے جو انسان کو شوق و سعادت بخش سکتی ہے۔" یہ کہہ رہی ہیں۔

بہیجہ۔ بس اس قدر؟

مجدی۔ نہیں، اور یہ کہہ رہی ہیں کہ اگر زندگی تمہیں اس قدر خوش نصیب کر دے یعنی تمہیں چاہنے کے قابل اور چاہے جانے کے قابل اک حسین و مشتاق عورت مل جائے، تو خبردار اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا، اور فضول تصورات میں مبتلا ہو کر یہ دیوانگی مت کر بیٹھنا کہ اس فرصت کو ضائع ہو جانے دو۔

بہیجہ۔ (اُس سے چمٹ کر) اور، اور میری جان، اور

مجدی۔ اور بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں۔

بہیجہ۔ (اُس سے اور چمٹ کر) اگر وہ عورت جسے تم چاہتے ہو، تم بغیر زندہ نہ رہ سکے، اور تمہیں خوش کر کے خود خوش ہونے کے لئے ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کر کے تم تک پہنچے، اور پہونچکر تم سے، بوسوں، نوازشوں کی منتظر و مشتاق ہو، تو....

مجدی ۔ (عارفانہ) یہ کہتے ہیں کہ فوراً اس خزینۂ سعادت کو اپنی آغوش میں لے لو، اسے اپنی آغوش میں بھینچو، اُس کی زلفوں کو سونگھو، اور اس پر سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بوسوں کی بھرمار کردو۔

بہیجہ ۔ اگر یہ بات ہے تو تم کیوں اس حکم کی اطاعت نہیں کرتے (دونوں جوش سے ایک دوسرے کے بوسے لیتے ہیں)

نسیمہ (کی آواز نیچے سے) مجدی بک، مجدی بک! (دونوں گھبرا کر علیحدہ ہوتے ہیں) مجدی تھوڑے سے تذبذب کے بعد بیلکونی میں آتا ہے اور نیچے دیکھتا ہے۔

مجدی ۔ آہا نسیمہ خانم ہیں۔ آیئے آیئے اندر کیوں نہیں آتیں۔

نسیمہ ۔ مجھ سے دروازہ کھلتا ہی نہیں، دیر سے کوشش کر رہی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اندر قفل لگا ہوا ہے، مہربانی کر کے کھولئے ہم آئیں۔ باجی اور دولھا بھائی بھی ساتھ ہیں۔

مجدی ۔ ضرور، ضرور۔ ابھی آیا۔ (اندر جا کر، ہاتھ سے بہیجہ کو اشارہ کر کے بائیں طرف کا دروازہ دکھاتا ہے) ادھر۔ (اس کی گھبراہٹ دیکھ کے) پریشان نہ ہوجئے ہیں اُس میں کنجی لگادونگا اور کنجی اپنی جیب میں رکھ لونگا، آپ بالکل نہ ڈریئے۔

بہیجہ ۔ میں ڈرتی نہیں، میرا ڈر دراس لئے ہے کہ میں تمہیں اُس کے ساتھ تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی

مجدی ۔ اُف رہی بدگمانی بچپن چھوڑیئے، اور جلدی سے جایئے۔ (بہیجہ بادل ناخواستہ کمرے میں جاتی ہے، مجدی اس کی چھتری وغیرہ کو پیچھے سے کمرے میں ڈال دیتا ہے، کمرہ بند کر کے کنجی لگا دیتا ہے، اور کنجی اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے پھر دوڑ کے دلہنے دروازے سے جاتا ہے۔ ایک دومنٹ کے بعد نسیمہ کے ساتھ آتا ہے۔ نسیمہ ایک اعلیٰ لباس میں ہے اور ہاتھ میں سُرخ چھتری ہے)

نسیمہ ۔ ہاں، ہم یہاں آنے کے لئے ساتھ ہی نکلے تھے۔ راستے میں چناروں میں میاں بیوی کو دیوانگی نے گھیرا۔ کہنے لگے ہم تو پہلے پہاڑی کی چوٹی پر جائیں گے۔ میں اُنہیں چھوڑ کر یہاں آگئی۔ آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔

مجدی ۔ آپ نے یہ کیا بات کہی۔ آپ نے مجھے مرہون منت کیا۔

نسیمہ ۔ آپ سے سچ کہوں جس دن آپ ہمیں اُس کوٹھی سے چھوڑ آئے ہیں۔ اُس دن سے مجھے آپ پر بھروسا نہ رہا میرا خیال آپ کی طرف سے بدل گیا۔

مجدی ۔ وہ کس طرح؟

نسیمہ ۔ ہر وقت آپ یہی کہتے تھے کہ آپ کو اپنے خاندان سے یعنی ہم سب سے کتنی محبت ہے، مگر اس حرکت سے آپ نے اپنے ادعا کو خود غلط ثابت کردیا۔

مجدی ۔ چھوٹی خانم، آپ کو اپنے دل میں ان خیالات کو جگہ نہیں دینی چاہیئے۔

نسیمہ ۔ (اُس کے چہرے پر تھوڑی سی سختی آتی ہے) آپ کو معلوم نہیں میں یہ سوچ سوچ کر کس قدر خوش تھی کہ آپ یورپ سے

واپس آئیں گے تو آپ مجھے تصویر کشی سکھائیں گے۔ لیکن اب آپ کو آئے دو مہینے ہو گئے اور آپ نے مجھے اک سبق بھی نہیں دیا۔

مجدی۔ بس اس قدر۔ اس کی تلافی تو بہت آسان ہے۔

نسیمہ۔ کس طرح؟ بہت آسان ہے؟ آپ آسان خیال کرتے ہیں، حالانکہ میرے نزدیک بہت دشوار ہے۔

مجدی۔ وہ کیوں؟

نسیمہ۔ اس لئے آپ بھاگتے ہیں۔ آپ تلافی کرنا نہیں چاہتے۔ اس سے آپ انکار کر نہیں سکتے۔۔۔ آپ جب ہمارے گھر پہلے پہل آئے، تو ایک ہفتہ تک تو اچھے رہے۔ اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا کہ آپ میں اجتناب و فرار کے علامات ظاہر ہونے لگے اک دم آپ میں ایسا تغیر واقع ہوا کہ اسکا کوئی سبب ہم لوگ معین ہی نہ کر سکے لیکن یہ تغیر یقینی ہے۔ ہم سے اجتناب ہی کافی نہ تھا کہ آپ نے گھر چھوڑنے کا بھی خیال ظاہر کیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "لیجئے" اب پولے طور پر بھاگنا چاہتے ہیں۔ آپ ہی کہئے، میں غلط کہہ رہی ہوں! (اس کے تردد کو دیکھ کر) میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کو جواب ملتا ہی نہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ آپ جو تنہائی کی اس قدر شکایت کرتے تھے، خاندان کے چہل پہل میں تو آپ کو لطف آنا چاہیئے، اور اسے اس گھر کی تنہائی پر ترجیح دینی چاہیئے تھی۔

مجدی۔ میری نسبت جو آپ نے اپنی لطف و عنایت کا اظہار کیا، اس کا ہزار با شکریہ۔ لیکن میں اس بات کو آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ میری طرف سے آپ نے اپنے دل میں چند غلط خیالات جاگزیں کر لئے ہیں اور اس کا مجھے رنج ہے۔

نسیمہ۔ غلط خیالات؟ آہ میں نے کس قدر چاہا کہ میرے خیالات کاش غلط ہو جائیں کیونکہ ایسی حالت میں (فقرے کو پورا کرنے میں تردد کرتی ہے)

مجدی۔ ہاں ایسی حالت میں کیا؟

نسیمہ۔ میں جو آپ کو ہاتھ سے کھویا ہوا سمجھتی ہوں، دوبارہ حاصل کر لوں گی۔

مجدی۔ یقین رکھئے کہ وہ کبھی آپ کے ہاتھ سے کھویا نہ جائیگا۔

نسیمہ۔ اگر میں اس پر یقین کر سکتی ہوں تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

مجدی۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ یقین کیجئے۔ آپ نے یقین کیا؟ کہئے (نسیمہ کے سر کے تصدیقی اشارے پر) یعنی اب ہم میں آپ میں صلح ہو گئی۔ اچھا چونکہ آپ نے اپنے تئیں اس قدر اچھا بات ماننے والا ثابت کیا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ میں آپ کو کوئی انعام دوں۔ اچھا آئیے میں آپ کو اپنی تصویریں دکھاؤں۔

نسیمہ۔ (خوش ہو کر) آپ نے مجھے اپنا کتنا احسان مند کیا۔ بتائیے کہاں ہیں؟

مجدی۔ فی الحال میں نے انہیں زینے کے مقابل کے کمرے میں جمع کر دیا ہے۔

نسیمہ۔ تو غالباً آگئے۔ (دوڑ کر بالکونی سے جھانکتی ہے) (دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

مجدی (اس کے جانے پر اس پر حسرت وارانہ نظریں ڈالتا ہے، اور تھوڑے سے تردد کے بعد لوٹ کر میز پر سے اک ... (ہاں وہی ہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں دوڑ کر نیچے جاتی ہوں۔ دروازہ کھول دوں گی

لے کر چلا جاتا ہے۔ اتنے میں ممدوح و فرخندہ و نسیمہ داخل ہوتے ہیں۔

مجدی۔ آیئے، آیئے۔ اس عنایت کا شکریہ۔

فرخندہ۔ سچ تو یہی ہے کہ ہم فرطِ عنایت سے ہی تم سے ملنے آتے ہیں، ورنہ ہمیں تم سے شکایت کرنے کا حق حاصل ہے۔

ممدوح۔ بے شک۔ اول تو یہی ہماری توہین کہ ہمارا گھر چھوڑ کے، اس دور افتادہ پہاڑی کی چوٹی پر آ بسے، گویا ہمارے ہاں آپ کو ٹھیرانے اور مہمان رکھنے کی جگہ ہی نہ تھی۔ لیکن اصلی توہین یہاں آنے کے بعد شروع ہوئی۔ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ آپکا منہ دیکھنا گویا عید کا چاند دیکھنا ہے، ہمارے گھر کا رُخ ہی نہیں کرتے۔

مجدی۔ اگر آپ کو علم ہو کہ میں آج کل کس قدر مشغول ہوں تو آپ مجھے ضرور معذور خیال فرمائیں گے۔ بایں ہمہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرا قصور نہیں ہے۔ اگر آپ چار پانچ منٹ کی اجازت دیں تو میں نسیمہ خانم کو وہ تصویریں دکھا آؤں جو آجکل میں تیار کر رہا ہوں، وہ ابھی بہت مصروف تھیں۔ میرا نوکر استنبول گیا ہوا ہے، اس لئے معاف فرمائیگا قہوہ وغیرہ میں اس وقت پیش نہیں کر سکتا۔ (اُن سے اجازت پاکر داہنی طرف سے نسیمہ کے ساتھ جاتا ہے)

ممدوح۔ (مجدی کے چلے جانے کے بعد) یقیناً اس کی زندگی میں کسی عورت کا ضرور دخل ہے، مگر وہ عورت کون ہے، یہ تحقیق طلب ہے۔

فرخندہ۔ آپ بھی غضب کرتے ہیں، آپ کو ہمیشہ ہر چیز، ہر معاملے کے اندر عورت کا دخل نظر آتا ہے۔

ممدوح۔ تو غلط ہے؟ دنیا میں کونسا کام ہے جس میں عورت نہیں۔

فرخندہ۔ ہر چیز میں عورت، ہر چیز میں عورت، شاید عورت ایک دن آپ کی آنکھیں نکال لے گی۔

ممدوح۔ (ہنسکر) گویا اب وہ نہیں نکال رہی۔

فرخندہ۔ یہ مان کر کہ عورت کا دخل ہے، پھر ہمیں اس سے کیا؟

ممدوح۔ بے شک ہمیں اس سے کیا تعلق، لیکن محض ایک تجسُّس۔

فرخندہ۔ تجسّس جس کے معنی ہیں کہ تھوڑا سا رشک بھی، کیوں ہے نا؟ لیکن فرق اتنا ہے کہ مجدی بک متاہل نہیں یعنی آزاد و مختار ہے۔

ممدوح۔ مطلب یہ کہ ہم اسیر و پابند ہیں۔ لیکن کم سے کم اس اسارت کو اپنے اوپر اتنا گراں ہوتا تو ظاہر نہ کرو۔

فرخندہ۔ مذاق چھوڑیئے، اگر کسی آدمی کو، کسی عورت سے تعلق ہے، تو ہمیں کیا، ہمیں خاموش رہنا چاہیئے لیکن اگر ہم یہ دیکھیں کہ اس عورت سے اس کو نقصان پہنچ رہا ہے تو بحیثیت اُس کے دوست کے بیشک ہمیں اس کو متنبہ کر دینے کا حق حاصل ہے، لیکن فی الحال مجدی بک کی کوئی حرکت ہمیں ایسی نہیں نظر آتی کہ ہمیں اسے متنبہ کرنے کی ضرورت ہو۔ اس لئے ہمیں اُسے آزاد چھوڑنا چاہیئے۔

ممدوح۔ بیشک صحیح کہتی ہو۔

فرخندہ۔ تو مہربانی کر کے اس معاملے میں اپنی زبان بند ہی رکھیئے۔ اور ہر شخص کے سامنے اس عورت کے مسئلہ کو

نہ چھیڑیئے، خاص کر نسیمہ کے سامنے۔

ممدوح۔ کیوں؟

فرخندہ۔ کیوں کی اچھی رہی۔ تمہیں خبر نہیں کہ نسیمہ پھنک رہی ہے۔

ممدوح۔ یہ تو عجب بات سنائی۔ کاہے میں پھنک رہی ہے۔

فرخندہ۔ اور کس میں پھنکے گی عشق کی آگ میں پھنک رہی ہے۔

ممدوح۔ عشق؟ کس سے۔

فرخندہ۔ توبہ الٰہی! آپ اتنی بھی موٹی سمجھ کے نہ تھے۔ مجدی کے لئے پھنک رہی ہے، اور کس کے لئے پھنکتی۔

ممدوح۔ سچ ہے، میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ بالکل ہی احمق۔ لیکن اب سمجھ میں آگیا۔ تو یوں کہو کہ تم آج....

فرخندہ۔ ہاں آج میں جو یہ کوہ بیابان طے کرکے آگئی تو نسیمہ ہی کے لئے تو آئی۔ جس دن سے مجدی ہمارے گھر سے اُٹھ آیا ہے اس دن سے نسیمہ کا حال تم بدلا ہوا نہیں دیکھتے؟ تم نہ دیکھ سکتے ہو، لیکن میری پہچاننے والی نظر سے وہ نہیں بچ سکتا۔ اس لڑکی کا دل کیسا صاف، کیسا اصلی سونے کی طرح پاک و خالص ہے۔ مگر دس بارہ دن سے۔ میں دیکھ رہی ہوں، کہ رنجیدہ رہتی ہے، ہر وقت سوچ میں ڈوبی رہتی ہے، بالآخر میں نے اُس سے دبا کر پوچھا۔ اس قدر بھری ہوئی تھی، کہ میرے چھیڑنے پر باوجود ضبط کے، پھوٹ پڑی اور رو رو کے اُس نے مجھ سے اعتراف کیا سالہا سال سے، مجدی کی محبت میں گرفتار تھی، اور یہ سوچ رہی تھی کہ مجدی اس سفر سے واپس آئیگا تو ضرور شادی کریگا۔ اور شادی کرے گا تو اس کے سوا اور کس سے شادی کریگا۔

ممدوح۔ بیچاری نسیمہ۔ حالت یہ ہے کہ مجدی صاحب بالکل بے خبر ہیں، اور اس لئے اپنی ہوا ہوس میں مبتلا۔

فرخندہ۔ اسے اگر خبر نہیں، تو کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اس کو خبردار کریں۔ اور بلاشبہ، مجدی کو نسیمہ جیسی اچھی لڑکی اور مل نہیں سکتی۔ بس ہمارے خاندان میں اک بیاہ رچے، اور مجدی بھی ہم میں آشامل ہو۔

ممدوح۔ اور سناؤ۔ اُف تم بھی بھیدوں کی کتنی پوٹ ہو۔ کیا کیا بھید پیٹ میں لئے بیٹھی تھیں.... کیا کیا اہم فیصلے کر چکیں۔ اور مجھے خبر بھی نہ کی۔

فرخندہ۔ ہر بات کا اک وقت ہے، اور بات یہ ہے کہ کل رات ہی تو قطعی طور پر تحقیق ہوا۔ اور یہ فیصلہ میں نے رات ہی کیا۔ لو آج صبح نسیمہ کو لے کے یہاں آئی کہ اسے دیکھے اور تھوڑی سی تسکین حاصل کرے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نسیمہ کی پچھلی بیماری سے ڈاکٹر ڈر گئے تھے۔ کہتے تھے کہ کہیں دق تو شروع نہیں ہو رہی۔ کہتے تھے نسیمہ میں دق ہو جانے کی بہت استعداد ہے۔

ممدوح۔ بیشک، بیشک، لیکن میں یہ کیا جان سکتا تھا کہ مجدی کو وہ دل دیئے بیٹھی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو ابھی مجدی کو بلاتا ہوں اور اس سے معاملہ صاف کرکے اس سے قول لئے لیتا ہوں۔

فرخندہ۔ میری بات سنو۔ اتنی جلدی نہ کرو۔ فوراً گلا گھونٹنا ٹھیک نہیں۔ آہستہ آہستہ کام کرنا چاہیئے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔

ممدوح۔ ہائے چھوٹی نسیمہ۔ شریر لڑکی۔

فرخندہ۔ (بیلکونی میں سے دیکھتے ہوئے یکایک) ارے نعیم؟

ممدوح۔ (دوڑکر اور نظر ڈال کر) کیا نعیم بک؟

فرخندہ۔ ہاں وہی اور کون؟ (کھڑکی میں سے) آغا بک؟ آغا بک۔ (بیلکونی میں آکر) ادھر آیئے، ادھر آیئے۔ ہم ادھر ہیں۔ (ممدوح سے) جایئے جلدی دروازہ کھولئے (ممدوح جلدی جلدی جاتا ہے تھوڑی دیر بعد ممدوح و نعیم داخل ہوتے ہیں فرخندہ ان کا استقبال کرتی ہے) بتایئے تو آپ کہاں سے نکل پڑے۔

نعیم۔ تو بھائی میں واپس نہ آنے کے لئے تو گیا نہ تھا۔ بس اس خیال سے کہ گھر واپس آنے کی ممانعت نہیں ہے۔ میں صبح کے جہاز سے استنبول سے آیا سب سے پہلے گھر گیا۔ مگر وہاں دیکھا کہ پنجرہ خالی ہے۔ سب چڑیاں اڑی ہوئی ہیں۔

فرخندہ۔ ہاں۔ بھیجہ خانم صبح ہی سے اپنی خالہ کے پاس گئی ہوئی ہیں . . .

نعیم۔ رہیں آپ، سو اس نٹ کھٹ مجدی سے ملنے، مع اپنے حوالی موالی کے آگئیں۔ مجھے جو یہ معلوم ہوا تو میں بھی یہیں دوڑ آیا کہ مجدی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ مگر وہ ہیں کہاں؟

ممدوح۔ کمرے میں، نسیمہ کو اپنی بنائی ہوئی تصویریں دکھا رہے ہیں

نعیم۔ نسیمہ بھی یہیں ہیں؟ آپ ہی کے ساتھ۔ اچھا یہ تو بتایئے آپ سب خیریت سے ہیں نا؟

فرخندہ۔ ہم سب الحمدللہ خیریت سے ہیں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں نسیمہ تھوڑی دُبلی ہو گئی ہے۔ رنگ بھی کچھ زرد ہو گیا ہے مگر اس کے اعادۂ صحت کے لئے بھی دوا مل گئی ہے (مسکراتی ہے)

نعیم۔ کیا مطلب؟

ممدوح۔ بھائی، دوا، اور کیا۔ لو دروازے سے میرا خیال ہے مجدی آ رہے ہیں۔ اچھا اب نسیمہ کے متعلق تم سے بعد میں باتیں ہونگی۔

مجدی (داہنے دروازے سے داخل ہوتا ہے نعیم کو دیکھتے ہی ہاتھ بڑھا کر اُس کی طرف دوڑتا ہے) اوہو یہ کیا نعمت غیر مترقبہ؟ کہاں سے آ گئے۔ (اُس کا زور سے ہاتھ دباتا ہے)

نعیم۔ نہیں دیکھتے ہیں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے لئے فوراً کہیں سے کہیں پہنچ جانا مشکل نہیں ہے ایسا آدمی ڈھونڈو تو میں ہی ملونگا

مجدی۔ بیشک اور یہ بھی ایک حیرت انگیز وصف ہے۔

نعیم۔ میں نے اس لئے نہ کہا تھا کہ آپ سے اپنی تعریف سنوں میں تعریف و توصیف سے بالاتر ہوں، اور اس لئے ان سب تعریفوں کو اس کان سنتا ہوں اور اس کان سے اڑا دیتا ہوں۔

مجدی۔ مجھے پہلے سے معلوم ہے کہ آپ کسی کی سننے والے نہیں۔

فرخندہ ۔ مجدی بک، نسیمہ کو کیا کیا؟ وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں۔

مجدی ۔ (ہنسکر) وہ تصویر حیرت بن کر میری تصویروں کو دیکھ رہی تھیں۔ اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بیحد حساس، بیحد رقیق طبیعت پائی ہے۔ اور پھر یہی نہیں، ان کی نظر کیسی صنعت شناس اور ناقدانہ ہے۔ تعجب ہوتا ہے۔

فرخندہ ۔ آپ جیسے نکتہ چین اور نقاد آدمی سے، اُس کی قابلیت کی تعریف سننا میرے لئے بہت باعثِ فخر و مسرت ہے۔

ممدوح ۔ بیشک کوئی آسانی سے، مجدی بک کو اپنا معترف نہیں کر سکتا۔ نہ وہ جلدی اپنی رائے قائم کریں نہ جلد بدلیں۔ ایک دفعہ کسی چیز کو سُرخ کہہ دیا۔ بس وہ سُرخ ہے، سیاہ کہہ دیا، سیاہ ہے والسلام

فرخندہ ۔ آپ اُس کی ظاہری قابلیتیں دیکھ رہے ہیں۔ کاش آپکو معلوم ہو کہ ان ظواہر کے نیچے، اُسکی روح، اسکا قلب کس قدر نجیب، منتخب و پاک ہے۔

نعیم ۔ نسیمہ کے متعلق بحث ہو رہی ہے؟ میں بھی اُس لڑکی کی شرافتِ طبع اور نفاستِ مذاق کا قائل ہوں۔

مجدی ۔ بیشک، اس میں شُبہ کا امکان نہیں۔

ممدوح ۔ وہ جس کے ہاتھ آئیگی، وہ خوش قسمت آدمی ہوگا، یہ میری قطعی رائے ہے۔ (فرخندہ کو دیکھ کر مُسکراتا ہے)

نعیم ۔ مگر ہوگا کیا؟ کوئی محض نالائق گدھا آئیگا اور اسے لیجائیگا اور ایک دو برس کے اندر ہی، وہ بھی تمام عورتوں کی طرح خراب و برباد ہو جائیگی۔

مجدی ۔ اگر ایسا ہوا تو کتنے افسوس کی بات ہوگی، کیونکہ یہ نزاکت و نفاستِ طبع، اس سے بہتر نصیبے کی مستحق ہے۔ میں تو ہر حالت میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ اس کی قسمت میں خوش رہنا لکھا ہو۔

فرخندہ ۔ ہم سب کی یہی دُعا ہے۔ مگر افسوس کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے بھی ہر باکمال ہستی کی طرح، محرومیت کے سوا کچھ اور نہ ملے۔

ممدوح ۔ خدا اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھے، اور ایسی مصیبت سے بچائے۔ وہ اک وجودِ لطیف و نجیب ہے جو سزاوارِ خوش بختی ہے۔

مجدی ۔ کوئی شُبہ نہیں، میں نے جتنی عورتیں دیکھی ہیں اُن میں نسیمہ خانم سب سے زیادہ قابلِ عزت ہیں، بالخصوص اُس قابلیت و شوق کا خیال کر کے جو تصویر کشی کے بارے میں اُن کو ہے۔ اگر انسان کو نسیمہ خانم جیسی باکمال و پاکیزہ طبیعت ہستی ملے، تو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ اس کے برعکس، وہ بڑی خطا کا مرتکب ہوگا، ہے نا؟

تینوں ۔ (بیشک از زمیں تا آسماں)

مجدی ۔ عورتوں کی تفریق اور ان کی قدر و قیمت کے متعلق میرا ایک اور معیار ہے۔ میں ان عورتوں کو شوپن کے والس Chopin walts سے تشبیہ دیتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بادی الامر میں شوپن کے والس، اور اور معمولی والسوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو یہی کہ نظرِ اول میں معمولی رقص، شوپن کے والس سے زیادہ جاذبِ نظر، زیادہ لطیف اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ عورتیں بھی انہیں والسوں کی طرح ہیں۔ یعنی ظاہراً ان میں فرق نہیں۔ بلکہ جیسے معمولی رقص، شوپن کے رقص سے بڑھے چڑھے معلوم ہوتے ہیں، بعض عورتیں بھی اپنی آلائشوں کے باوجود، دوسری عورتوں سے برتر معلوم ہوتی ہیں، مگر تھوڑی سی تدقیق نظر سے تھوڑی سی معرفت سے جس طرح، شوپن کے رقص کی ممتازیت، شوق و اصالت ادا۔ بمقابلہ اور رقصوں کے ظاہر ہونے لگتی ہے اور

جس طرح، اس کی روح، اپنی نجابت وصنعت سے انسان کو مسحور کر دیتی ہے، اور اہل نظر کو اس کی رفتار و ادا کی بے مثالی اپنا گرویدہ کر لیتی ہے جو لوگ عورتوں پر نقادانہ نظر ڈالتے ہیں اور اُن کی نفاست و محاسن پر غور کرتے ہیں، ان کے لئے عورتوں میں بھی ایسے ہی فرق نظر آتے ہیں۔ موسیقی شناس جس طرح شوپن کے والس کو معمولی رقصوں سے بڑھا ہوا سمجھتے ہیں، اتنا ہی ہم لوگ، ایسی عورتوں کی معمولی عورتوں سے زیادہ روحی وجد سے پرستش کرتے ہیں جن کیں اُن تجربہ کار و قیمت شناس لوگوں کو جانتا ہوں جو ایسی مستثنا عورتوں کو صرف اُن کی نگاہ (اُن) کی رفتار سے پہچان لیتے ہیں اور اُن کی عزت کرتے ہیں۔ اور خود اپنے تئیں بھی اُن لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔ اور اس بنا پر میرا دعویٰ ہے کہ شوپن کے والس کی طرح، نسیمہ خانم بھی، اپنی اصالتِ روح، ورقتِ حسیات کی وجہ سے قابلِ قدر ہیں۔

(نسیمہ، اس اثنا میں، داہنے دروازے سے داخل ہوتی ہے اور نعیم کو دیکھتے ہی خوش ہو کر اُس کی طرف دوڑتی ہے)

نسیمہ۔ آہ! میرے آغا بک، آپ کب آئے؟ (دوڑ کر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہے، وہ بھی جھک کر اُس کے سر کو بوسہ دیتا ہے) اللہ بتایئے آپ کہاں سے آ گئے۔

نعیم۔ توپ کے گولے کی طرح جنگلوں سے میدانوں سے، تم پر آگرا۔

نسیمہ۔ (شکایتاً) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کیوں ایسی برہمی باتیں کہتے ہیں۔ (فرخندہ اور ممدوح کی طرف پھر کر) آج میں نے مجدی بک کی تصویروں کو دیکھ کر معلوم کیا کہ شراب کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ کیا رنگ آمیزیاں ہیں، کس بلا کے رنگ بھرے ہیں (مجدی سے) خدا کے واسطے بتلایئے آپ کو یہ رنگ کہاں سے ملے، اور ان رنگوں کو ملا کر آپ انہیں اس قدر روح پرور چمک کس طرح دے دیتے ہیں میں قسم کھاتی ہوں، اب میں ہاتھ میں تصویر کا برش نہ لوں گی۔

مجدی۔ اگر ایسا کیا تو بہت قابلِ افسوس حرکت ہوگی۔ کیونکہ میں بھی استادوں کے شاہکاروں کو دیکھ کر اگر اتنا ہی مایوس ہو جاتا، تو میں جو کچھ اب کر سکتا ہوں نہ کر سکتا۔ اور نہیں اس قدر تعجب و حیرت میں نہ ڈال سکتا۔ بات تو جب ہے کہ ہم جن شاہکاروں کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں، ان کی مانند تصاویر بنانے کی کوشش کریں بلکہ ہم میں یہ شوق پیدا ہو کہ ان سے آگے بڑھ جائیں ہمیں۔

نسیمہ۔ (تھوڑا سوچ کر) آپ سچ کہتے ہیں۔ معاف کیجئے میں غلطی پر تھی۔ مگر میرے خدا کیا کبھی یہ ممکن ہے کہ میں اُن تصویروں کی طرح، ایک تصویر بھی بنا سکوں جو آپ نے بنائی ہیں۔

ممدوح۔ کیوں نہیں، کوشش کرو، تو سب ممکن ہے۔ کیوں مجدی بک؟

نسیمہ۔ کوشش؟ آپ کیا کہتے ہیں۔ میں اپنی تمام زندگی کے شوق و شغف کو سوائے اس کے اور کس چیز میں صرف کر رہی ہوں۔ مجھ سے قسم لیجئے کہ ان جیسا کمال حاصل کرنے کے لئے میں اپنی عمر کے کم سے کم دس برس تو فدا کر سکتی ہوں۔

مجدی۔ (مسکرا کر) اگر ایسا کرو تو بھی قابلِ افسوس حرکت ہوگی۔ کیونکہ جن برسوں کو آپ فدا کرنے کے لئے تیار ہیں، اُن کا ایک دن بھی اتنا قیمتی ہے کہ وہ کسی چیز پر فدا نہیں کیا جا سکتا۔

نسیمہ۔ لیکن انہیں خدا کرے جو شعت کہ میں حاصل کروں گی وہ کیا کچھ کم قیمت ہے۔
مجدی۔ وہ کم قیمت نہیں، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ.....
فرخندہ۔ بس بہت ہو چکا، چلو اب راستہ پکڑیں۔ راستے میں باتیں ہو سکتی ہیں۔ بارہ بج چکے اگر آپ کا معدہ اس کی آپ کو خبر نہیں دیتا تو کیا آپ گھڑی بھی نہیں دیکھ سکتے۔
ممدوح۔ بالکل ٹھیک ہے۔ مجدی آؤ ہم سب ساتھ چلیں، وہیں ہمارے ساتھ کھانا کھانا، اور جتنا چاہنا باتیں کرنا۔
نسیمہ و فرخندہ۔ آفریں ممدوح بک۔ کیا اچھی تجویز کی۔
مجدی۔ مگر افسوس کہ میں اس پر عمل نہیں کر سکتا۔
فرخندہ۔ ناممکن ہے، آپ اس تجویز کو رد نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو ضرور لے چلیں گے (نعیم و ممدوح کی طرف مڑکر) کیوں ہے نا؟
نعیم و ممدوح۔ بے شک، بے شک۔ یہاں تنہا رہنے کے بجائے، ہمارے ساتھ آکر، مزے مزے کی باتیں کر کے، ساتھ کھانا کھانا کیا زیادہ اچھا نہیں؟
نسیمہ۔ اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہے۔ آپ خود ہی سوچیے۔ علاوہ ازیں یہاں تنہا رہنا کس قدر ملال انگیز ہے۔
مجدی۔ یہ ٹھیک ہے مگر میں آج اتنا مشغول ہوں کہ آج نہیں چل سکتا۔ کسی دوسرے دن جس دن آپ کہیں خوشی سے حاضر ہوں گا، ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ دیر تک گپ شپ لڑاؤں گا۔ غرضکہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ مگر آج ممکن نہیں۔
نعیم۔ صاف تو یوں ہے کہ ساتھ نہ چلنے کے لئے آپ کا اس قدر اصرار کچھ شبہ پیدا کرتا ہے؟
مجدی۔ وہ کیا؟
نعیم۔ آپ کا اپنے تئیں یہاں قید رکھنے سے شبہ ہوتا ہے۔ (چھیڑکر) آپ اقبال کیجئے کہ اس ٹھیرنے کے معاملے میں کسی عورت کا پاؤں درمیان ہے۔ (فرخندہ اور ممدوح نسیمہ کی طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، نسیمہ کا رنگ زرد ہے، مگر نعیم اس طرف متوجہ نہیں۔) ہاں قبول لئے۔ شاید آج ملاقات کا وعدہ ہوگا۔ کیا خبر ہم یہاں باتیں کر رہے ہیں، گھر میں کہیں عورت چھپی بیٹھی ہوگی۔
مجدی۔ (اندیشے سے الجھن کی باتیں مت کرو، تم سے سنجیدہ آدمی کے لئے ایسا مذاق مناسب نہیں۔
نعیم۔ مثلاً اسی کمرے میں (کمرے کو کھولنا چاہتا ہے، کمرہ بند پاکر) ذرا بتائیے اس کمرے میں کیا ہے۔
ممدوح۔ یہ آپ کے سونے کا کمرہ ہی تو ہے، مجدی بک؟
مجدی۔ (پریشان حالت سے) ہاں میرے سونے کا کمرہ ہے۔ مگر اس کی کیا ضرورت ہے۔

نعیم۔ فرض کیجئے کہ اس کے اندر، آپ کے بستر پر کوئی عورت آپ کی منتظر بیٹھی ہے۔

مجدی۔ پھر وہی بچوں کی سی باتیں۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں، اصرار نہ کیجئے۔ (نسیمہ کو آنکھوں سے اشارہ کرتا ہے کہ

نعیم۔ (ممدوح و فرخندہ کے اشاروں کو نہ دیکھ کر، اور مجدی کے اشارے کو دیکھا ان دیکھا کرکے) کوئی نہیں؟ عورت دورت کوئی نہیں؟ اچھا تو پھر ہمارے ساتھ چلئے۔ اور اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں چلتے تو میرے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ میں لات مار کر کواڑوں کو توڑ دوں، اور جو اسرار اس کمرے میں پوشیدہ ہے اُسے باہر نکال لاؤں۔

مجدی۔ نعیم بک، آپ کیوں اتنا بچپن کئے جا رہے ہیں۔ بخدا، مجھے کام ہے اس لئے نہیں چلتا۔ ورنہ میں ضرور ساتھ چلتا۔

نعیم۔ (تھوڑا سا نرم ہو کر) اچھا تو آپ کو ضمانت دینی ہوگی۔ اس کمرے کی کنجی کہاں ہے۔

مجدی۔ میں...... میں.... میرے پاس۔

نعیم۔ تو بتایئے کمرے میں قفل کیوں لگا دیا۔

مجدی۔ کیونکہ جس وقت نسیمہ خانم تشریف لائیں، میں کپڑے پہن کے باہر ساحل تک جانے کو تھا۔ جب میں باہر جاتا ہوں تو اس کمرے کو مقفل کر جاتا ہوں۔

نعیم۔ اچھا، شریر۔ اس وقت تو میرے ہاتھ سے سستے چھوٹ گئے۔ مگر خبردار پھر میرے ہاتھ نہ پڑنا۔ سمجھے؟ اچھا خدا حافظ۔ شام کو آؤ گے نا؟

مجدی۔ (پسینے پسینے ہو کر) ضرور آنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر نہ آسکا تو مجھے معذور سمجھئے۔ اگر نہ آسکا تو سمجھ لیجئے گا کہ کوئی ایسا سبب تھا جس پر میں قابو نہ پا سکا۔

فرخندہ۔ بہرحال۔ خدا حافظ، مجدی بک۔ چلو، نسیمہ۔ تم آگے ہو۔

نسیمہ۔ (غمگین طریقے سے) خدا حافظ مجدی بک۔ آپ بھول نہ جائیگا کہ ہم لوگ ہر روز آپ کے منتظر رہیں گے۔

مجدی۔ بے شک، اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں آپ سب کا کس قدر احسان مند ہوں (ممدوح اور نعیم، اس سے ہاتھ ملا کر باہر جاتے ہیں۔ اسٹیج کوئی دس سیکنڈ خالی رہتا ہے۔ اس کے بعد، مجدی داہنے دروازے سے داخل ہوتا ہے اور جا کر بیلکونی سے دیکھتا ہے، اور اپنے ہاتھ اس طرح ہلاتا ہے گویا باہر سے جو لوگ ابھی ہاتھ سے خدا حافظ کر رہے ہیں انہیں جواب دے رہا ہے۔ پھر لوٹ کر، اطمینان کا لمبا سانس لیتا ہے، اور جیب میں سے کنجی نکال کے بائیں جانب کے دروازے کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

سجاد حیدر یلدرم

شاعر کی تربت

صحنِ بہشت زار میں ہے — اک شاعرِ نوجوان کی تربت!
یا وادیٔ نو بہار میں ہے — اک نکہتِ رائیگاں کی تربت!

آتیں نہیں اس طرف ہوائیں — شاداب و حسین پھول لے کر!
زائر بھی نہیں کہ جو چڑھائیں — دو اشک، دلِ ملول لے کر!

ممنون بہار کی نہیں ہے — کھلتے نہیں پھول اس زمیں سے!
یہ تودۂ خاکِ مرمریں ہے — بیگانہ، گلاب و یاسمیں سے!

پر چشمِ بصیرت آشنا کو — مل جائے جو رخصتِ تماشا!
اور غور سے گورِ باصفا کو — دیکھو تو ہے کثرتِ تماشا!

شاعر کے الم گسار ہیں جمع — تربت پہ ہجوم ہو رہا ہے!
شمع و دلِ داغدار ہیں جمع — اور جام بھی خون رو رہا ہے!

وہ شمع کہ جس کی روشنی میں — راتوں کو وہ فکرِ شعر کرتا!
وہ جام کہ جس کو زندگی میں — وہ بادۂ شعلہ گوں سے بھرتا!

وہ دل کہ جو تھا اسیرِ الفت — اور آج بھی خوگرِ وفا ہے!
پیوست ہے جس میں تیرِ الفت — جو پھول کی طرح جانفزا ہے!

اک سمت فضا پہ چھا رہا ہے — آئینۂ رخنمائے سلمیٰ!
یا موت کو گدگدا رہا ہے — نظارۂ [illegible] سلمیٰ!

شاعر کو خبر نہیں مگر کچھ — وہ تیرِ نصیب سو رہا ہے
اس پہ نہیں حال کا اثر کچھ — یا گا شاعر [illegible]

...رمقالہ فارسی زبان میں نظامی عروضی سمرقندی چہ
ادب تاریخ کی بہترین کتاب ہے ۔ عہ

...یخ دربار امرتسر دربار صاحب امرتسر کے مفصل تاریخی
حالات قیمت عہ

...رنامہ بغداد مولوی محبوب عالم صاحب نے دوران جنگ
عظیم میں خلفائے عباسیہ کے قدیم پایہ
... و عراق عرب کے چشم دید حالات لکھے ہیں قیمت عہ

...مائے مسافران ہند سہولیت مسافران و سیاحان و
جاتریان ہندوستان عہ

...مائے کشمیر سیر جنت نظیر کیلئے بہترین رہنما قیمت عہ

...روشن دربار دہلی اس میں کارونیشن دربار دہلی میں شامل
ہونیوالے کل راجوں نوابوں رؤسا
...براروں اور صوبجاتی حکومتوں کے تمام بڑے افسروں و ایسرائے
...یخ کی عکسی تصویریں اور مفصل سوانح حالات وغیرہ درج ہیں کتاب
درجہ کے آرٹ پیپر پر مدراس کی چھپی ہوئی ہے قیمت مع مجلد

...یخ مراکش سلطنت مراکش کی ابتدا سے لیکر جنگ کی
مفصل تاریخ قیمت عہ

...یخ سیالکوٹ ضلع سیالکوٹ کے حالات علامہ عبدالحکیم
سیالکوٹی کی زندگی اور مع علماء کے
...وغیرہ اس کتاب کا دیباچہ سر محمد اقبال صاحب نے لکھا ہے قیمت عہ

...باب کشمیر کشمیر کے مشہور بادشاہ بڈشاہ کی دور حکومت کے
مفصل حالات قیمت عہ

...فرنامہ اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا کے خود
نوشت حالات قیمت عہ

...ت الحجاج ۸ر تاریخ جنگ سمالی لینڈ ۶ر
...لینڈ و اسلام ۸ر جنگ یورپ کے مکمل حالات ۸ر
...ی زمین گوری قومیں ۸ر لاہور عہد مغلیہ میں ۶ر
...ہی سیر کشمیر ۸ر شالامار باغ ۸ر

...وں کے متعلق مفید کتابیں

...کے گیت اس کتاب میں نہایت دلچسپ بچوں کے

اخلاقی کہانیاں نہایت دلچسپ بچوں کیلئے
مفید حکایات جس پر پنجاب
گورنمنٹ نے مصنف کو تین سو روپیہ انعام دیا قیمت عہ

گلیور صاحب کی سیاحت بالشت بھر کے آدمیوں
باؤنوں یا بالشت بھر کے آدمیوں
کے ملک میں گلیور صاحب کی
سیاحت کے عجیب حالات مع تصاویر ۲ر

سندباد جہازی ۱۲ر اسیر قفس ۸ر پانچ بانکے ۸ر پانچ باتونیاں ۵ر

لطائف و ظرائف

گذشتہ تیس سال سے پنجاب کا لاجواب ہفتہ وار پیسہ اخبار جو لاکھوں
دلچسپ لطیفے چھپتے رہے ہیں ناظرین کے اصرار پر کتابی صورت میں چھاپے
گئے ہیں ان کی دلچسپی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پہلا حصہ قریباً
بیس دفعہ چھپ چکا ہے پانچسو لطائف حصہ اول تا حصہ ہشتم ہر ایک
حصہ میں پانچ پانچسو لطائف درج ہیں اور ہر ایک حصہ کی قیمت آٹھ آنہ
آٹھوں حصوں کی قیمت للعہ ر

رہنمائے پولیس جملہ ملازم محکمہ پولیس و عوام کے فائدہ
کے لئے رہنما قیمت عا

محبوب الاخلاق یعنی مسلمانوں عیسائیوں اور ہندوؤں کے
مشاہیر بزرگوں مصنفوں لیڈروں اور
حکمائے یونان کے چیدہ اقوال کا دلچسپ مجموعہ بہ ترتیب حروف تہجی ۸ر

خط تقدیر یا تصویر ہاتھ کی ہتھیلی سے انسان کی قسمت و حالات
معلوم کرنیکا رہنما قیمت ۱۲ر

نوشتہ تقدیر حکیم فیثاغورث کے چالیس سوالوں کا جواب
علم نجوم میں یکتا کتاب ۔ ۱۰ر

جادو کی پہلی دوسری اسمیں تمام جادو و شعبدے باز بیان
چالاکیاں اور ہتھکنڈے درج ہیں ۸ر

علم ہپناٹزم علم ہپناٹزم کی پہلی کتاب ۸ر

گنجینہ عملیات ہر قسم کے تعویذات اور نقش
لکھنے کے طریقے قیمت عہ

ہدایت تعلیم انگلستان انگلستان میں جاکر مختلف
کالجوں اور کارخانوں

خواجہ ناصر الدین ۸ر چیستان و معمے ۶ر
مامحبان ۸ر آئینہ مسمریزم ۶ر علم کاسہ سر ۲ر
ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے ۸ر

دواوین وغیرہ

مسدس حالی مولانا حالی مرحوم کا جادو اثر کلام جس کے
شعر شعر میں اسلامی جذبات کی تصویر کھینچ
دی گئی ہے قیمت ۲ار

دیوان حافظ خواجہ حافظ شیرازی کا شیریں فلسفیانہ کلام عہ

باغ خیال اکبر اکبر میرٹھی داناپوری کے کلام کا
مجموعہ قیمت ۱۰ر

دیوان غالب حضرت اسداللہ غالب کا مکمل دیوان اردو عہ

دیوان ذوق ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم
ذوق کا مکمل دیوان عہ

دیوان داغ نواب میرزا خان صاحب داغ دہلوی استاد
نظام دکن کا دیوان عہ

دیوان ظفر شہنشاہ ہند ابوظفر بہادر ظفر کا مشہور اردو دیوان عہ

ترانہ موسیقار اس میں غذائے روحانی یعنی نغمات
اور سروں کو محفوظ رکھنے اور علم موسیقی
کے علمی جزو پر بحث کی گئی ہے قیمت ۸ر

ہندو شعرا کا نعتیہ کلام اسمیں ہندو شعرا کے اس
کلام کو جمع کیا ہے جو
انہوں نے رسول خدا محمد مصطفےٰ کے متعلق لکھا ہے ۔ ۸ر

انوار احمدی یا میلاد محمدی اسمیں آنحضرت کی پیدائش معجزات
معراج شریف کے واقعات درج ہیں ۸ر

گلدستہ سہرا تمام مشہور مشہور سہرے جو آجتک مختلف شادیوں
کے موقعوں پر لکھے گئے ہیں اس گلدستہ میں جمع کر دیے ہیں ۔ ۸ر

معلومات بوسہ بازی تمام دنیا کی قوموں میں بوسہ بازی کے
رواج کے متعلق معلومات ۸ر

میلاد اکبر وارث میرٹھی نے اس میلاد شریف میں مختلف
قصیدے، درود، سلام وغیرہ جمع کیے ہیں ۔ ۱۲ر

ناول ڈرامہ فسانے

...ل ۱۳ ۱۱ سراغرسانی کا حیرت انگیز اور دلچسپ ناول۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت ۱۱؎

انطاکیہ یہ ایک اسلامی تاریخی ناول ہے اسمیں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے کیسی جانفروشانہ ...ی کر کے عیسائیوں پر غلبہ پاکر انطاکیہ فتح کیا۔ للعہ

...یرموک یہ بھی ایک اسلامی تاریخی ناول ہے اسمیں بتایا گیا ہے حضرت خالد بن ولید کی ...دلیر بہادری اور مجاہدین اسلام کے کارنامے درج ہیں ۱۲؎

...تا یہ ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کا قصہ ہے۔ جو ہندوستانی لڑکی پر عاشق ہوا۔ قیمت ...

...ر دریا سہ حصہ منشی عبد الغفور صاحب مصنف حق بحقدار ...گاہ عالم وغیرہ نے اس سات سو صفحہ کے ناول میں حیرت انگیز ...پے درپے پیش آنا اور مجرموں کا نہایت چالاکی سے کامیاب ...اطلاع اور پرکالۂ آتش سراغرسان کا بھانڈا پھوڑنا ۱۲؎

...رگذشت ... رینلڈس کے مشہور ناول میری پرائس کا ترجمہ ایک خادمہ کی آپ بیتی کہانی۔ نہایت سنسنی خیز ...چار حصوں میں خوبی یہ ہے کہ جب تک اس کو ختم نہ کر لیا جائے ...ے کو دل نہیں چاہتا چار حصوں کا حجم (۱۳۰۰) صفحہ۔ سرگذشت ...ل ۴۴۴ صفحہ قیمت ۱۲؎ سرگذشت حصہ دوم ۲۳۲ صفحہ ۱۲؎ ...دم ۲۳۶ صفحہ قیمت ۱۲؎ حصہ چہارم ۲۹۶ صفحہ قیمت ۱۲؎

...شہ گاہ عالم منشی عبد الغفور صاحب مرحوم مصنف حق بحقدار و تعمیر دریا نے ہندوستانی زندگی کا ...نقشہ پیش کیا ہے۔ نہایت دلچسپ۔ ۱۲؎

...ی عورت اسمیں ایک عورت اپنے اغراض کیلئے ایک مالدار شخص کی لڑکی کو گم کر کے ...ی کو اس کی لڑکی ظاہر کرتی ہے آخر حق بحقدار رسید ۔ علاوہ

...تفتیش ... وار برٹن ناسہ جرائم پیشہ اقوام اور مجرموں کے سراغ رسانی کے **...آئین** کے متعلق پولیس و خفیہ پولیس کی ...

بد انجام جس میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے واقعات کو اس مشہور تاریخی ناٹک کے ایکٹروں کی زبانی۔ علاوہ

دو حریف سراغرسان۔ ملک افریقہ کی سراغرسانی میں سے ایک چوٹی کا پرحیرت قصہ طبع پنجم علاوہ

شمع شبستان لاہور کا ایک امیرزادہ ایک نہایت مفلس بڑھیا کی لڑکی پر شیدا ہوتا ہے جو بڑی مشکلات سے اس کے ہاتھ آتی ہے وغیرہ ۹؎

حسن آرا بیگم ایک زنانہ اخلاقی ناول۔ علاوہ

قدرتی سیرتین ہندوستانی زندگی کا دلچسپ اور عبرت انگیز ناول ۱۲؎

دلفگار ایک حسین لڑکی کی درد بھری کہانی ۸؎

اسرار انگلینڈ اس میں نیکیوں کے خوشگوار نتائج اور شریروں کو سزا وغیرہ قیمت ۱۲؎

سیر بکاولی قلعہ بکاولی کے پراسرار طلسمی حالات ۸؎

داستان چل وزیر ترکی زبان سے الف لیلہ کی کہانیوں کی طرح نہایت دلچسپ کہانیوں کی کتاب ایک بادشاہ کو چالیس روز تک اسکی بیوی اپنے سوتیلے بیٹے کے خلاف ہر روز نئی کہانی سنا کر اس کو قتل کر دینے کی خواہاں ہوتی ہے اور دوسری صبح ایک وزیر ایک نئی کہانی عورتوں کے مکر کی سنا کر بادشاہ کے بیٹے کا قصور معاف کرا دیتا ہے۔ ۱۲؎

حق بحقدار منشی عبد الغفور صاحب مرحوم مینیجر ڈپوٹی شاپ مشہور ناولسٹ نے نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز طرز سے لکھا کہ بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ قیمت ۱۲؎

قدیم لندن کے اسرار دو حصہ رینلڈس مشہور فسانہ نگار کے ناول کا ترجمہ دو حصوں میں ہے

چلتا پرزہ رینالڈس کے مشہور ناول کا ترجمہ۔ ایک عیار کی مکاریاں۔ قابل دید ہے۔ علاوہ

بدر کمال ہر دو حصہ۔ نہایت دلچسپ ناول ہے ۱۲؎

موتیوں کا جزیرہ یا کونٹ آف مانٹی کرسٹو مشہور و معروف فرانسیسی ناولسٹ سر الیگزینڈر ڈوما کے شائقین کے اصرار سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے پایہ کا ناول آج تک اردو ...

غبارہ میں پانچ ہفتے ہوائی جہازوں کی ایجاد سے ... یہ ناول تصنیف ہوا تھا اس میں ... ورن نے ہوائی جہاز کی پرواز کے وہ امکانات دکھائے ہیں جو آجکل ...طور پر ہو رہے ہیں اس وقت وہ صرف فسانہ تھے۔

پرستان بغداد بصرہ۔ بغداد۔ دمشق حلب وغیرہ مقا...ت کے عشقیہ فسانے قیمت

دس پونڈ کا نوٹ ایک معشوقہ کی ملاقات۔ دس پونڈ کے نوٹ کی پیشکش۔ قیمت

آستانہ کی حور جنگ یورپ میں ترکوں کی بہادری کے کارنامے انجمن اتحاد و ترقی اور ینگ ٹرکس پارٹی کا زور و شور وطن فروش ترکی وزیر داماد فرید پاشا اور خلیفۃ المسلمین کی جلاوطنی وزراء سلطنت کی نیک نیتی اور خود غرض ارباب عقد نے کس طرح قسطنطنیہ کو برباد کیا کس طرح ترک برباد ہو کر اندرون ملک میں چلے گئے مجلس ملی کا انعقاد جنرل نور الدین کی فتوحات۔ یونانیوں کے مظالم یونانی لشکر کی تباہی۔ ترکوں کی شجاعت و بسالت جن کو پڑھ کر حرارت اسلامی سے خون جوش میں آتا ہے۔

سعید و فلپانہ اسلامی شجاعت تہور اور بہادری کے سچے تاریخی فسانے عربوں کی دلیرانہ فاتحانہ زندگی کی سرگذشت غازیان اسلام کی فتح ایک پادری کی لڑکی فلپانہ اسلام کے سچے اصول و سعید کی بہادری دیکھکر مسلمان ہو جاتی ہے پھر مسلمان علم تبلیغ لیکر تمام علاقہ شام کو فتح کرتے ہیں عیسائیوں کے قلعوں پر اسلامی پرچم لہراتے ہیں۔ یہ اسلامی ... کا نہایت شاندار ناول ہے قیمت ۱؎

اکبر و زہرہ ایک عشق و محبت کی داستان۔ اکبر اپنے محبوب کے جنازہ تک ہمراہ جاتا ہے۔ اور دنیا کی مصائب مردانگی سے جھیلتا ہے قیمت عہ

امریکہ کی نازنین امریکہ کی ایک عالمگیر نمائش میں ایک نازنین سے ملاقات ۱۲؎

بخیل کی دولت ایک بخیل کی زندگی و دولت جمع کرنے اور حرام موت مرنے کے حالات ۱۲؎

پرکالہ آتش ایک پرکالہ آتش سراغرسان کی بہادری ...

لہ کے کامیاب لوگ زیادہ کامیاب اور دولتمند

مرد ہیں اس کتاب میں امریکہ کے تمام چوٹی کے کامیاب لوگوں کے

وران کی کامیابی کے وسائل درج کئے گئے ہیں کہ کس طرح یہ لوگ

ں ورگمنامی سے اس عزت اور دولت کی انتہا تک پہنچ گئے عه

فرض ادا کرو فرض ادا کرنے سے جو کامیابی ہو سکتی ہے اسکی نہایت شاندار مثالیں اس تین صد

ی کتاب میں درج ہیں۔ روم۔ یونان اور یورپ کی تاریخ سے

یسے واقعات دکھائے گئے ہیں جن کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے

ولے نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ جن سے قیصر و کسرے

بادشاہ لرزا اٹھے قیمت ۱۲؎ حصول دولت ۸ ؍ عمدہ حفظ کا راز ۶ ؍

ورگاری کا علاج جو لوگ تنگدستی و مفلسی کا علاج کرنا چاہیں وہ اس کتاب

کو پڑھیں قیمت ۱۲؎ کی کیمیا ۳ ؍ مطالعہ نفس ۴ ؍ مطالعہ باطن ۴ ؍

سرمایہ تجارتیں اگر آپکے پاس زیادہ سرمایہ نہیں ہے تو یہ کتاب منگا کر پڑھیں بہت

سے آپ بڑی بڑی اچھی تجارتیں کر سکتے ہیں۔ عه

تذکرات و سوانحعمری

تعلیمات نعیم فی ذکر نبی کریم سید المرسلین کی زندگی کے حالات

اقوال و واقعات قیمت ۸ ؍

تعبیر اسلام روسی ناول نویس ٹالسٹائی کے خیالات حضرت

خیر البشر کی تعریف میں قیمت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شاندار زندگی کے حالات۔ رفیق بک کی

کتاب مشاہیر الاسلام کا ترجمہ عه

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی کے حالات۔ ۱۲ ؍

خالد بن ولید حضرت خالد سیف اللہ سپہ سالار اسلام کی سوانحعمری قیمت عه

سعدی شیخ مصلح الدین شیرازیؒ کی زندگی کے حالات عه

شہنشاہ جارج پنجم مفصل سوانحعمری باتصویر عه

گارفیلڈ ایک یتیم بچہ جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کا پریزیڈنٹ بن گیا۔ ۶ ؍

سسر سیدریوکاری کروڑپتی قیمت عه

سلطان علاءالدین خلجی ہندوستان کے عظیم الشان دانشمند اور طاقتور بادشاہ کے عہد کی ترقیاں اور ضمناً اکابر و علماء و فضلا کے حالات ۶ ؍

سوانح خواجہ غریب نواز نہایت اچھے انداز میں دہلی کی لکھی ہوئی۔ عه

سلطان فاتح ۵ ؍ سلطان الشہدائے سندھ ۴ ؍

سوانح پنڈت موتی لال نہرو ۳ ؍ مہادیو گووند رانا ڈے ۴ ؍

حیات مشتاق ۶ ؍ حیات زیب النساء ۶ ؍

ابراہیم لنکن ۸ ؍ مصنفان اسلام ۳ ؍ اکابر اسلام ۴ ؍

البو ریحان البیرونی ۴ ؍ نپولین بونا پارٹ ۳ ؍

سلطان صاحبقران ۴ ؍ غازی محمد بن قاسم ۳ ؍

جمال الدین افغانی ۴ ؍

اسلامی کتابیں

تجرید الاحادیث حدیث شریف کی اہم مختلف کتابوں کا خلاصہ دس ہزار احادیث عربی معہ اردو ترجمہ قیمت للعہ

شرح عقائد نسفی اس نام کی مشہور عربی درسی کتاب کا اردو ترجمہ قیمت ۴؎

آئینہ اسلام ابتدائے اسلام سے آج تک تاریخ و معاملات اسلام کا عالمانہ بیان جو تمام انگریزی اردو خوان مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہے

زیور ایمان تمام ضروری و معتبر اسلامی مسائل فقہ کی کتابوں سے اردو لباس میں قیمت ۶ ؍

دلیل الحیران قرآن شریف کی تمام آیات بحروف ابجدی ترتیب وار قیمت ۶ ؍

علم الکلام امام غزالی کی مشہور کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد کا ترجمہ اردو۔ قیمت ۴؎

فیض الرحمن فی تسہیل القرآن قرآن مجید کے مطلب کو سمجھانے کیلئے مختلف معانی کی شرح قیمت ۴؎

رام پیاری ۴ ؍

پاربتی ۸ ؍

اختر و بلقیس ۴ ؍

ذبیح فاطمہ ۸ ؍

یوسف برنیہ ۱۲ ؍

اختری بیگم ۸ ؍

بیٹے کا قاتل ۴ ؍

فیروز محمودہ ۸ ؍

حمیدہ بانو ۸ ؍

ماں کا قاتل ۶ ؍

تاریخی عربی ناولوں کے ترجمے

حسن پرست ۱۰ ؍

قدسیہ ۴ ؍

بوالہوس نواب ۴ ؍

نرالی بھوت ۸ ؍

بڈھے میاں ۴ ؍

رن بیر کا تنا ۸ ؍

کمسن بی بی مسن شوہر ۴ ؍

جوان بی بی کمسن شوہر ۴ ؍

نور جہان ۸ ؍

تاریخی ناول

بانو یک شہزادی ۵ ؍

انقلاب فرانس ۸ ؍

معرکہ بلونس ۱۲ ؍

جنگ نفقاء ۶ ؍

جنگ طرابلس ۶ ؍

جنگ سمرنا ۸ ؍

اورنگ زیب چنچل کماری ۱۲ ؍

نازنین بلخ ۸ ؍

سراب فینش ۸ ؍

ماہ لقا ۸ ؍

برق غضب ۱۲ ؍

زر پرست ۱۲ ؍

بڑا مہار گھوڑا

مقدس دیوی

جانفروش

سفید پوش ۴

سر کی حرم سرا

سائیکل بانو حبینہ

اسرار افریقہ ۲

بھیڑوں کا ملاپ ۴

خونی ملاح ۴

خونی چیلہ ۶

خونی ساحر ۱۲

خونی آغا ۶

خونی بہن ۶

خونی بھائی ۶

خونی بھید ۸

خونی منظر ۸

خونی تصویر ۴

عشق و محبت کا خزانہ

نرالا عاشق ۶

پیارا عاشق ۱

دلیر عاشق ۴

ہوا باز عاشق ۴

شیطان عاشق ۴

رومال کا عاشق ۸

دردِ عشق ۴

قانون عشق ۶

نظیر عشق ۴

ظالم عشاق ۶

معشوقۂ فرانس ۸

دنیا کے چند مشہور جاسوس ناول

لندنی جاسوس

بنگالی جاسوس

فطرتی جاسوس

زنانہ کتابیں

...نسوان مصنفہ مشیر حسین صاحب قدوائی اسلام میں عورتوں کا مرتبہ مہر اولاد دیکھ بھال کثرت ازدواج طلاق۔ پردہ وغیرہ پر مفصل بحث ہے

...زیب النسا زیب النسا بیگم کی نہایت دلچسپ سوانح حیات قیمت ۶ر

...نظمیں مختلف شعرائے عورتوں کے متعلق اب تک جس قدر دلچسپ نظمیں لکھی ہیں ان کو ایک جگہ کر کے چھاپا ہے قیمت ۱۲ھ

...خط و کتابت اس میں ہر قسم کے خطوط جو لڑکیوں کو لکھنے کی ضرورت ہے بطور نمونہ لکھ کر دکھائے گئے ہیں قیمت ۸ر

...بیدکاری ریشمی، سوتی وغیرہ کپڑوں پر مختلف رنگ کے دھاگوں سے کشیدہ بننے کے دو سو مختلف نقشے قیمت ۱۲ھ

...نا شبلی النعمانی کی مشہور کتابیں

...ات سعدی شیخ سعدی کے مفصل حالات۔ طالب علمی سیر سیاحت بشیرازی سبک شاعری داغزل گوئی نکتہ سنجی وغیرہ پر مع تبصرہ و لباب ۸ر

...ات حافظ خواجہ حافظ شیرازی کے نام و نسب تعلیم شاعری فلسفہ اخلاق کلام کی بندش وظرافت پر نہایت عالمانہ تبصرہ ہے قیمت ۸ر

...لانا کا سفرنامہ روم و شام مصر و شام۔ اس سفرنامہ میں ترکوں عربوں کی حالت اور ان کی معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۸عہ

...ئع نظم شبلی و سوانح حیات۔ مولانا کی وہ تمام اردو نظمیں اور مولانا مرحوم کی لائف نثر لکھنوی کے قلم سے ۸ر

...لانا شبلی مولانا شبلی کے وہ علمی و تاریخی مضامین جو اب تک رسائل... [illegible]

آغاز اسلام ترجمہ بدء الاسلام مسلمان بچوں اور لڑکیوں کیلئے مولانا شبلی مرحوم کے قلم سے ۶ر

سوانح مولانا جلال الدین رومیؒ۔ مولانا شبلی نے مثنوی شریف مولانا روم کی دیگر تصانیف پر شاندار تبصرہ لکھا ہے۔ مولانا کی شاعری، اخلاق، ریاضت اور تصوف کی گہرائی پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱۲عہ

سوانح شیخ الاسلام ہند مولوی محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا کے خود نوشت حالات پڑھ کر سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ ۸عہ

الغزالی اسلام کے سب سے بڑے مصنف کی سوانح حیات ان کے عقائد اور طرز استدلال امام صاحب کی سوانح عمری ہے آج تک کوئی کتاب طبع نہ ہوئی تھی پرچہ اپنی خوبیوں کے یہ کتاب سلسلہ آصفیہ میں داخل ہے۔

النعمان امام اعظم ابو حنیفہ کی مکمل سوانح عمری۔ خاتمہ پر امام صاحب کے شاگردوں کے حالات درج ہیں۔ امام صاحب کا عام اخلاق اور مناظرات کی بہت سی شاہیں تاریخی حیثیت سے درج ہیں ۱۲عہ

المامون فرمانروایان اسلام کے سلسلہ میں خلافت مامون رشید کی فتوحات، خانہ جنگیوں وغیرہ کے مفصل حالات پڑھنے کے قابل کتاب ہے قیمت ۸عہ

اورنگ زیب پر سرسری نظر۔ عالمگیر اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی خاطر برادران وطن نے سنکڑوں جھوٹے قصے تراشے کہ جن کی تردید کرنے کے لئے مولانا شبلی نے یہ رسالہ لکھا قیمت ۸ر

جوزف میزینی اٹلی کے نامور محب الوطن کی سوانح عمری قیمت ۱عہ

پیٹر اعظم روس کے نامور بادشاہ کی زندگی کے عبرت انگیز حالات قیمت ۸ر

سوانح علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی علمی زندگی ان کی نادر تصنیفات کے تذکرے۔ اکبر جہانگیر شاہجہان عالمگیر کے عہد زرین کے علمی کارنامے قیمت ۱عہ

سوانح راجہ بیربر مشہور و معروف راجہ بیربر کی زندگی کے حالات ... [illegible]

سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبی جنگوں کے سپہ سالار کے حالات زندگی مصنفہ مولوی اشہری صاحب مرحوم قیمت ۸عہ

سوانح نور جہاں ملکہ نور جہاں اور شہنشاہ جہانگیر کی پرلطف زندگی کی تصویر۔ ۸ر

ابراہیم ادھم۔ ۸ر

تاریخی عربی ناولوں کے ترجمے

امین و مامون خلافت بنی عباس کے جلیل القدر ارکان کی زندگی کا خلاصہ قیمت ۲ر

شارل اور عبدالرحمن فرانسیسی بہادروں کا مسلمانوں سے مقابلہ اور شکست وغیرہ ۲ر

ابن طولون تیسری صدی کی مصری اسلامی حکومت کے سیاسی واقعات قیمت ۱۲ر

عروس فرغانہ خلیفہ معتصم باللہ کے عہد حکومت کے پراسرار واقعات ۱ر

محبوبہ قریش حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد کی فتوحات کا ذکر ۸عہ

اسمعیل صفیہ اسمعیل کا ڈاکوؤں کے خوف سے وطن کو خیرباد کہنا جنگل میں اس کی بیوی صفیہ کا گم ہونا اسمعیل کا واپس آکر ڈاکوؤں سے ملک کو صاف کرنا وغیرہ ۸ر

عصمت کا البم اکبر کی وزیر خان اعظم کی دختر عفت کے شادی قیمت ۱۲ر

مالن کی بیٹی ایک مالن کی بیٹی تارا اور نیپال کے کنور کی شادی۔ ایک نہایت ہی دلچسپ عشقیہ فسانہ قیمت ۸ر

شوخ پھون دیہاتی زندگی کا زندہ مرقع شوخی اور شرارت کی تصویر قیمت ۸ر

فتنہ ایک پیارے بچے کے کارنامے اس کے بھولے پن کی جیتی جاگتی تصویر، بلا ارادہ شرارتوں ... [illegible]

بدذائقہ اور نقصان دہ جلاب ترک کرو

ان کی بجائے۔ خوش ذائقہ۔ لذیذ بے خطر اور موثر کیسٹوفین کی میٹھی گولیاں استعمال کرو کڑوی دوائیاں شکر میں ملا کر کھانے کے دن گئے کیسٹوفین میں کیسٹر آئیل جیسی مفید اور بد ذائقہ چیز کو اس خوش اسلوبی سے گولیوں کی شکل میں تبدیل کیا گیا ہے جو سال کیسٹر آئیل کا اثر بدستور قائم ہے بدبو اور بد ذائقہ کا نام نہیں

کیسٹوفین

کیسٹر آئیل کی میٹھی گولیاں

دوائی کی دوائی مٹھائی کی مٹھائی ہے یہ خالص ارنڈی کے تیل سے انگلینڈ کی مشہور کیسٹوفین کمپنی کی تیار شدہ بچے مٹھائی کی طرح خوشی اور شوق سے کھاتے ہیں۔ ہر موسم میں ہر عمر کیواسطے مفید ہیں

ہر دوکان دار سے مل سکتی ہیں

کیسٹوفین مینوفیکچرنگ کمپنی (انڈیا) پوسٹ بکس کراچی

تین روپے میں مکمل ڈاکٹری

طب ہومیوپیتھی کے نہایت خوبصورت دوائیوں سے بھرے ہوئے بکس ساختہ امریکہ مع مکمل کورس یعنی گائیڈ بحروف اردو کے صرف تین روپے کے وی پی سے طلب کیجئے۔ اور گھر بیٹھے ڈاکٹر بن جائیے سر کی چوٹی سے لے کر پیر کے ناخن تک ہر مرض کا حکمی علاج ان طلسمی بکسوں میں بند ہے۔ اور کورس میں ہر مرض کی تشخیص اس خوش اسلوبی اور ہر نسخہ ایسے عام فہم پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ گھر میں بچے اور عورتیں بھی آسانی سے کسی مہلک مرض کی دوائی تجویز کر سکتی ہیں۔ اگر آپ کو کڑوی کسیلی اور بد مزہ دوائیوں کے کھانے سے عار ہے۔ آپ ڈاکٹروں اور حکیموں کی بے جا ناز برداریوں سے بے نیاز ہو کر خود مسیحائے زمان بننا اور دولت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اپنی سب سے پہلی فرصت میں آرڈر بھجوائیے کیونکہ بہت تھوڑا سٹاک باقی رہ گیا ہے

یونیورسل ہومیوپیتھک سٹورز پوسٹ بکس ۱۵۱ لاہور

ایک اللہ والے درویش کا عطیہ

ہیمال

یعنی ہیمال

دس روزہ خوراک
یعنی
روز میں
قیمت

دوائیں دعا ہے!
کمائی ہے مگر دولت کی نہیں ثواب کی!
مطلب ہے مگر دنیا کا نہیں عاقبت کا!
دوائی۔ مزدوری اور اجرت اشتہار کا تخمینہ لگا کر قیمت نہیں بلکہ لاگت۔

ملنے کا پتہ **عطائے درویش لاہور**

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرست مضامین "ہمایوں"

جلد:- ۲۱

بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء

تصویر:- جلوہ گاہ

اعلان

ہمایوں کے سالانہ چندے میں مستقل تخفیف

ہمایوں کا سالانہ چندہ اب تک پانچ روپے (علاوہ محصول ڈاک) رہا۔ دسویں سالگرہ کے موقع پر ہم نے نومبر دسمبر کے لئے عارضی طور پر رعایتی چندے کا اعلان کیا تھا۔ اس دو مہینے کے عرصے میں ہمایوں کی اشاعت نے اس سُرعت کے ساتھ ترقی کی کہ چند ہی دنوں کے اندر خریداروں میں سابق تعداد کے ایک ثلث کا اضافہ ہو گیا۔

اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ شائقینِ ادب کی ایک عظیم الشان تعداد ہمایوں کی خریداری کی دل سے خواہشمند ہے مگر چونکہ "ہمایوں" کا چندہ اکثر رسالوں سے زیادہ ہے اور ملک کی اقتصادی حالت بے انتہا پست ہے اس لئے اکثر لوگ رسالوں کے زیادہ چندے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

"ہمایوں" کا بلند معیار قائم رکھنے کے لئے ہمیں پہلے ہی مقابلۃً زیادہ مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے اور اگرچہ موجودہ مصارف کے پیشِ نظر کسی قسم کی مستقل یا عارضی تخفیف کی گنجائش نہیں مگر ہمارا مطمحِ نظر عموماً محض تجارتی نہیں رہا ہمایوں سے اگر زبان و ادب کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ اور ملک کو اس کی ضرورت ہے تو ہم پہلے کی طرح اب بھی ایک حد تک نقصان برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ اس اعلان کے بعد ہمایوں کا سالانہ چندہ پانچ روپے کے بجائے چار روپے (علاوہ محصول) ہو گا۔

موجودہ صورت میں ایک کاپی کی کمی ناگزیر تھی۔ لیکن چونکہ جنوری ۱۹۳۲ء سے قبل ہمایوں کے ایک صفحہ میں ۲۴ سطریں ہوتی تھیں اور اب ۲۵ ہیں۔ اس کے علاوہ خط بھی زیادہ خفی ہو گیا ہے۔ اس لئے موادِ مطالعہ پہلے سے زیادہ یعنی تقریباً ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ موجودہ رسالے سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

امید ہے کہ شائقینِ "ہمایوں" اس رعایتی چندے سے فائدہ اٹھائیں گے اور ناظرینِ "ہمایوں" رسالے کی توسیعِ اشاعت میں حسبِ سابق ہماری مدد کر کے زبان و ادب کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

جن حضرات کی خریداری کی درخواستیں یکم اپریل سے پہلے دفترِ "ہمایوں" میں پہنچ جائیں گی۔ ان کو ہمایوں کا ایک ضخیم سالگرہ نمبر جس میں اردو زبان کے بہترین ادیبوں کے مضامینِ نظم و نثر جمع ہیں۔ بالکل مفت نذر کیا جائے گا۔ اس شاندار نمبر کا سرورق رنگین اور خوبصورت ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ہاف ٹون اور رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ صرف اسی نمبر کی الگ قیمت عہ روپیہ ہے۔ گو نئے خریداروں کو یہ سال بھر کے بارہ پرچوں کے علاوہ بلا قیمت بھیجا جائے گا فرمائشیں جلد بھیجئے اور بھجوایئے۔

ناظمِ دفترِ "ہمایوں"

۲۳ لارنس روڈ۔ لاہور۔

جہاں نما

ہندوستان کا افلاس

مسٹر بریلز فورڈ رسالہ ایشیا میں ہندوستان کے افلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی کا غریب حصہ اس قدر فاقہ کش اور کمزور ہے۔ کہ وہاں اوسط عمر کی توقع ۲۳ سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ انگلستان میں اوسط عمر ۵۴ سال ہے۔ ہندوستان میں صرف ملیریا ہی سے ہر سال دس لاکھ انسان ہلاک ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ محض آب و ہوا کی خرابی نہیں قرار دی جاسکتی۔ بنارس کی آبادی کے یورپین حصہ میں موت کا اوسط ۱۲ فی ہزار ہے اس کے مقابلہ میں شہر کے اندر اس کا اوسط ۴۶ فی ہزار ہے۔ یہاں بچوں کی اموات کا اوسط ۴۱۹ فی ہزار ہے۔ حالانکہ انگلستان میں یہ ۷۰ سے زیادہ نہیں۔

مسٹر بریلز فورڈ حکمران جماعت کے ساتھ سود خواروں اور زمینداروں کو بھی دیہاتی آبادی کے افلاس و زبون حالی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی حکومت کا قیام اور ہندوستان کا قابل اعتراض رسم ورواج دونوں یکساں اس ابتری کے لئے جواب دہ ہیں بعض صورتوں میں تو غیر ملکی حکومت کی برکات ہی دیہاتیوں کے لئے بلائے جاں ثابت ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ریلوے کو لیجئے۔ ریل نے قریہ قریہ میں مشینوں کی تیار کردہ ارزاں مصنوعات کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دیہاتی دستکار اور صناع بھی قوت لایموت حاصل کرنے کے لئے کاشتکاری پر مجبور ہوگئے۔ حالانکہ قابل کاشت اراضی پر پہلے ہی ضرورت سے زیادہ ہجوم ہو رہا تھا۔"

زندگی کے بہترین دس سال

ریورنڈ ہارٹن نے انسان کی زندگی کو دس دس سال کے حصوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے۔

۱۔ خالص اور بے فکر مسرت کا زمانہ، ایک سے دس سال کی عمر تک۔

۲۔ زندگی کی مسرتوں کے شدید ترین احساس کا زمانہ، دس سے بیس سال کی عمر تک۔

۳۔ فنون لطیفہ کے متعلق احساس کی بیداری کا زمانہ، بیس سے تیس سال کی عمر تک۔

۴۔ خدمت و عمل کا بہترین وقت، تیس سے چالیس سال تک۔

۵۔ باہمی انسانی تعلقات کا دور چالیس سے پچاس سال کی عمر تک۔

۔ پچاس سے آخرِ عمر تک تکمیل و اتمام کا زمانہ ہے۔
۔ یں زیادہ گہری ہوتی ہیں مگر ناکامی اور مایوسی کے رنج سے آلودہ۔ تعلقات کا احساس بھی زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اور انجام کار دو جہانوں
کا رشتہ جوڑتا ہے۔

ٹکٹ جمع کرنے کا شوق

دنیا میں ٹکٹوں کا سب سے عظیم الشان مجموعہ بیرن فیریرے (پیرس) کے خاندان میں ہے۔ اس مجموعہ کی ابتدا ۱۸۶۵ء میں ہوئی تھی
اور اس کا مالک آج تک اس پر...... ہم پونڈ یعنی ساٹھ لاکھ روپیہ صرف کر چکا ہے اس مجموعہ میں تقریباً ہر اُس ٹکٹ کا جو آج تک کہیں بھی جاری ہوا
ایک استعمال شدہ اور ایک غیر مستعمل نمونہ ہے ——— مجموعی طور پر پانچ لاکھ سے زائد مختلف نمونے ہیں!

سینما کا مستقبل

جب سے سنیمیٹوگراف ایجاد ہوا ہے بعض بہترین دماغ اس کے نقائص دور کرنے کے لئے وقف ہیں۔
توقع کی جاتی ہے۔ کہ وہ زمانہ زیادہ دور نہیں جب فلمیں حقیقت سے اس قدر مشابہ ہو جائیں گی کہ دیکھنے والوں کے لئے یہ بتانا مشکل
ہوگا۔ کہ وہ زندہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ رہے ہیں یا محض انہیں ان کی تصویریں نظر آرہی ہیں۔ ایک حیرت انگیز نیا طریقہ دریافت بھی ہو چکا ہے اور
تجربہ سے ثابت ہوا ہے۔ کہ فلمیں بالکل حقیقت کے مطابق بنائی جا سکتی ہیں۔
پردہ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ہال کے ہر حصہ میں فلمیں عکس ریز ہو سکتی ہیں۔ ایکٹر اور نظارے وغیرہ بالکل حقیقی اجسام کی طرح ابھرے
ہوئے نظر آتے ہیں اس کے متعلق تفصیلات ابھی معلوم نہیں ہوئیں کیونکہ تجربے انتہائی اخفا کے ساتھ مقفل دروازوں کے اندر ہوتے رہے ہیں صرف اتنا معلوم
ہوا ہے کہ ان تجربوں کے دوران میں ایسے لنز استعمال کئے گئے جن کی جسامت مختلف تھی اور جن میں فصل ماسکہ کا اختلاف بھی پایا جاتا تھا۔

سر محمد شفیع

مشہور انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو اپنی فروری کی اشاعت میں رقم طراز ہے۔
سر محمد شفیع کا انتقال صرف مسلمانوں ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ تمام ہندوستانی قوم کا نقصان ہے اُن کی ہستی فرقہ پرست سیاست دانوں سے بالاتر تھی
اُن کی فرقہ وارانہ سیاسیات میں متعصبانہ جوش تھا وہ لوگ جو ان سے ملے ہیں اُن کا قول ہے کہ اُن کی فرقہ پرستی محض ایک ارتقائی زینہ تھی جسے وہ عام قومیت پر پہنچنے
کے لئے ضروری سمجھتے تھے چنانچہ ان کی قابل صاحبزادی بیگم شاہنواز کی مقابلتہً زیادہ قوم پرستانہ تقریریں میاں صاحب کے حقیقی مطمح نظر کا عکس سمجھی گئیں ان کی صاحبزادی
کی اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت عورتوں کے متعلق اُن کے خیالات اور طرزِ عمل کی آئینہ دار ہے۔
ذاتی اور شخصی تعلقات میں وہ انتہائی رواداری برتتے تھے۔ اور مذہب و ملت کی عام تفریقات کے پابند نہ تھے۔

میاں سر محمد شفیع کی شاعری

ذیل کے اشعار سر عبد القادر کے نوٹ کے ساتھ مخزن بابت نومبر ۱۹۰۲ء سے نقل کیے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ میاں سر محمد شفیع مرحوم فن شعر میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس لیے اُن کے یہ دلکشا اشعار اکثر لوگوں کے لیے ایک انکشاف ثابت ہونگے شیخ عبد القادر صاحب لکھتے ہیں کہ اگست و ستمبر گذشتہ میں ایڈیٹر مخزن کو خوش قسمتی سے سیر کشمیر کا اتفاق ہوا مولوی محمد شاہ دین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا اور میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا جیسے ذی علم اور طباع دوست رفیق راہ اور شریک سفر تھے دن رات گل و گلزار اور باغ و راغ کے نظاروں کے ساتھ دو با مذاق حضرات کے علمی مباحثوں کا تماشا پیش نظر رہا اور علمی چرچے رہے۔ وہاں کچھ شعر و شاعری کی بھی باری آئی مولوی محمد شاہ دین صاحب نے دو تین نتیجہ خیز غزلیں ان دنوں میں لکھیں جو ابھی صاف نہیں ہوئیں سر دست میاں محمد شفیع صاحب کی طبع آزمائی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو انہوں نے عمر میں پہلی دفعہ کی ہے صاحب موصوف انگریزی میں کبھی کبھی نظم لکھتے رہے ہیں۔ جو اخبار آبزرور میں چھپ کر مقبول ہوتی رہی ہے۔ اردو میں آج تک انہیں کبھی لکھنے کا موقع نہیں ہوا تھا۔ مگر چونکہ قدرتاً طبیعت موزوں پائی تھی کشمیر کی آب و ہوا نے گدگدا کر یہ چند شعر نکلوا لیے:-

وادیٔ لِدر

یہ کشمیر کے دل کشا مرغزار — یہ پانی، یہ شمشاد و سرو و چنار
یہ سرسبز دشت اور یہ کوہسار — سدا جن میں رہتی ہے گل کی بہار
ہیں بے شبہ جاں بخش و فرحت فزا
پہ سب ہیچ تجھ بن ہیں اے مہ لقا

یہ دلکش لدر کی ہے وادی جہاں — سہانا ہے قدرت نے باندھا سماں
زمیں ایسی پائے مسافر کہاں — کہے صنعتِ حق کی جو داستاں
گھری ہے پہاڑوں سے چاروں طرف
ہیں اشجار سرسبزیاں گل بکف

سدا راگ گاتے ہیں یاں آبشار — ہیں عاشق کے دل کی طرح بے قرار
ہمیشہ اگرچہ ہیں خود دل فگار — پہ ہے رونقِ گل کا ان پر مدار
چمن گر کھلے ہیں تو ان کے طفیل
جو میداں ہرے ہیں تو ان کے طفیل

کناروں پہ ان کے درختِ چنار — ہے جنگل کا شاہنشہ باوقار
مسافر کا ہے دوست لیل و نہار — اسے دیکھ کر میری جانِ نزار
مسرت کے ہے جوش سے شادماں
کہ سایہ ہے اس کا فرح بخشِ جاں

یہ گھیرے ہیں وادی کو کوہِ بلند — نہ رستم کی بھی جن پہ پہنچے کمند
ہیں نیچر کے عشاق کے دل پسند — عجب راز قدرت کے ہیں ان میں بند
لیے تاج سر پر ہیں اشجار کے
ہیں تختِ رواں رکھتے انہار کے

یہ وادی کی جاں بخش تازہ ہوا — ہے جس سے دلِ ناشگفتہ کھلا
مرے پاس لاتی ہے تجھ سے سدا — پیامِ محبت سلام وفا
محبت کی بو اس میں پاتا ہوں میں
تو پھولا نہیں پھر سماتا ہوں میں

سکر سے چلے جب سوئے پہلگام — ہوا دل مرا اور بھی شادکام
دل آویز و دلکش تھا ہر اک مقام — صداقت کو پہنچا کسی کا کلام
کہ فردوس دنیا میں ہے گر کہیں
یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے یہیں

م۔ش

جمعیت الاقوام کا تاریخی پہلو

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جمعیت الاقوام پریذیڈنٹ ولسن کی اختراع ہے۔ مگر تاریخ پہ ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔

مختلف قوموں کا کسی غرض سے یکجا ہونا معمولی بات ہے۔ اس یکجائی کی دو صورتیں ہیں:۔

۱۔ آزاد قوموں یا طاقتوں کا کسی خاص مقصد کے لئے جارحانہ یا مدافعانہ اتحاد۔ جیسے محمود غزنوی کے حملوں سے بچنے کے لئے ایک موقع پر ہندوستان کے تمام راجا متحد ہو گئے تھے۔ یا اسی طرح وجے نگر کے آخری فرمانروا رام راجا کے خلاف احمد نگر گولکنڈہ بیدر بیجاپور کے مسلمان سلاطین متحد ہو کر تلی کوٹ کے مقام پر لڑے اور وجے نگر کے وقار کا قلع قمع کر دیا تھا۔

۲۔ مختلف غلام قوموں کا کسی حکمران قوم کے زیر سایہ یکجا ہونا اس کی مثالیں تاریخ کی عظیم الشان سلطنتوں میں ملیں گی۔ سلطنتِ عباسیہ کی حکومت عربوں۔ ایرانیوں۔ ترکوں۔ افغانوں۔ حبشیوں اور دوسری قوموں پر تھی سلطنت عثمانیہ کے ماتحت مشرقی یورپ کی گوناگوں اقوام بھی تھیں۔ یہی حال کم وبیش دوسری سلطنتوں کا بھی ہے۔

یورپ میں جمعیت الاقوام کی سب سے پرانی مثال ایمفک ٹیونک لیگ ہے۔ اس جمعیت میں یونان کی وہ تمام ریاستیں شامل تھیں۔ جو ڈلفی کے مندر میں پرستش کرتی تھیں جمعیت کا مقصد اس مندر کی محافظت تھا۔ (سومنات کے مندر کی محافظت بھی اسی طور پر تھی)

یونانی اقتدار کے خاتمے پر سلطنتِ روما معرضِ وجود میں آئی۔ یہ صحیح معنوں میں اُن مختلف اقوام کی ایک جمعیت تھی۔ جو روما کے عقابی جھنڈے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتی تھیں۔ ان میں برٹن (انگریز) گال (فرانسیسی) اور مختلف گاتھ (جرمن) لوگ شامل تھے۔ ان سب پر رومن تہذیب۔ رومن قانون اور ایک حد تک رومن (لاطینی) زبان غالب تھی۔

جب روما کو زوال ہوا۔ تو اس کی بجائے یورپ کی مختلف قوموں کا ایک مذہبی اتحاد ایک مسیحی شہنشاہ اور پوپ کے زیرِ سایہ قائم ہوا جس کا نام مقدس رومن سلطنت تھا یہ سلطنت شارلیمن شاہِ فرانس کے ہاتھوں قائم ہوئی اور نپولین اعظم کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سلطنت کے شہنشاہ اکثر آسٹریا کے شاہی خاندان (ہیپس برگ) سے ہوتے تھے بظاہر شہنشاہ کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ مگر عام طور پر اس انتخاب کی حیثیت ایک کھیل سے زیادہ نہ ہوتی تھی

مقدس رومن سلطنت کا خاتمہ ہونے سے پہلے اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب

وہ ذہنی اور روحانی انقلاب جو حروب صلیبیہ کے زیر اثر پیدا ہوا۔ اور فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) کے بعد یورپ کے گوشے گوشے پر ظہور میں آیا یعنی ریناسانس۔ اور دوسرا سبب وہ مذہبی اختلافات جنہیں ریفارمیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو زیادہ تر اسلامی اصولوں کے تتبع کی وجہ سے پیدا ہوتے۔ بہر حال ان دونوں تحریکوں کا یہ اثر ہوا کہ یورپ کا اتحاد نہ رہا اور "قومیت" اور "وطنیت" کے تصور کی ابتدا ہوئی۔ مختلف قوموں کو اپنے سامنے ترقی کی ایک نئی دنیا نظر آئی اور ایک مقابلے کی دوڑ شروع ہوئی جس میں قدم قدم پر لڑائی جھگڑے کا سامان تھا۔

اس صورت حالات میں قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ درپیش ہوا جس کے حل کی دو قسم کے اشخاص نے کوشش کی۔ ماکیا فیلی اور اس کے اطالوی ہم خیالوں کی رائے میں ایک قوم کی بہترین حکمت عملی خود غرضی ہے۔ البتہ یہ خود غرضی ظاہر نہیں ہونی چاہئے۔ یعنی مختلف اغراض کے ظاہری پردے میں اپنی خود غرضی کو فروغ دینا چاہئے۔ برخلاف اس کے ایک بڑے گروہ نے وقتاً فوقتاً چند بین الاقوامی اصول وضع کرنے کی کوشش کی۔ اور صلح عمومی کے ذرائع پر غور کیا۔ سولھویں صدی کے شروع میں ایرش کردسے نے اپنی ایک کتاب میں ایک بین الاقوامی مجلس کے انعقاد کی تجویز پیش کی جو مختلف قوموں کے باہمی جھگڑے فیصل کیا کرے۔ ایک ایسی ہی تجویز فرانس کے بادشاہ ہنری چہارم کے وزیر اعظم سلی کی خود نوشتہ سوانحعمری میں بھی موجود ہے۔

۱۶۹۳ء میں ایک مشہور انگریز ولیم پن (جس کے نام پر امریکہ میں پن سل دینیا کا علاقہ آباد ہوا) نے بین الاقوامی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے قوموں کی پارلیمنٹ تجویز کی۔ جس کے ارکان یورپ کے فرمانروا یا ان کے نامزدگان ہوں۔ جو عدل وانصاف کا دور دنیا میں قائم کریں۔ اس پارلیمنٹ کی دو زبانیں ہوں۔ لاطینی اور فرانسیسی کسی معاملے میں فیصلہ دینے کے لئے رائیں لی جائیں۔ رائے دینا پوشیدہ طور سے ہو مگر ہو ہر ایک کے لئے ضروری۔

ولیم پن کے کچھ عرصہ بعد ایبے سینٹ پیار نے ایک "عہد نامۂ صلح دائمی" پر خیال آرائی کی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک مستقل جمعیت قائم کی جائے۔ جو ہر قسم کے بین الاقوامی اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کرے جھگڑے فیصل کرے جس قوم کا قصور ہو اُسے سزا دے۔ اور سزا دینے کے لئے دوسری قومیں اپنی اپنی فوجوں سے اس جمعیت کی امداد کریں۔

انہی لوگوں کی طرح مشہور ومعروف جرمن فلسفی امانول کانٹ نے بھی "دائمی صلح" پر ایک کتاب لکھی جس میں آزاد حکمران ریاستوں کی ایک جمعیت کا خیال موجود تھا۔

ان لوگوں کی صلح جوئی سے دنیا کو بہت فائدہ پہنچا مگر سب سے زیادہ فائدہ ہیوگو گروٹی اس کی ذات سے ہوا کیونکہ اس نے بین الاقوامی قانون کی بنیاد ڈالی۔ اور ایسے اصول وضع کئے۔ جو صلح اور جنگ دونوں میں قوموں کی رہنمائی کرسکیں یہ اصول اس کی کتاب میں موجود ہیں۔ جو یورپ کی "جنگ سی سالہ" کی وحشیانہ کارروائیوں سے متاثر ہو کر ۱۶۲۵ء میں لکھی گئی۔

اب ہمیں چند اور واقعات کا جائزہ لینا ہے جنہیں موجودہ جمعیت الاقوام کے وجود سے بہت گہرا تعلق ہے جب سولھویں صدی میں ہنری ہشتم شاہِ انگلستان ۔ فرانسس اول شاہِ فرانس اور چارلس پنجم شاہِ سپین وشہنشاہ مقدس رومن سلطنت کے درمیان لڑائیاں ہوئیں تو یورپ کی سیاسیات میں "توازنِ قوت" کا اصول قائم ہوا۔ یہ اصول ایک فرانسیسی مصنف فنیلون نے نہایت مختصر مگر واضح الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

"یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر کمزور سلطنتیں طاقتور سلطنتوں کے مقابلے پر متحد نہ ہوں۔ تو وہ طاقتور سلطنتیں ان کو شکست دے کر ان پر قابو پالیں گی"

اس اصول پر چلتے ہوئے یورپ کی سلطنتوں نے لوئی چہاردہم شاہِ فرانس اور نپولین کے خلاف جو عمل کیا اس کا مفصل ذکر ضروری نہیں مختصر یہ کہ ان دونوں حکمرانوں کی شکست اور تباہی کا باعث یہی "توازنِ قوت" کا اصول تھا۔

نپولین کی شکست کے بعد الگزنڈر اول زارِ روس کی تحریک پر ۱۸۱۵ء میں یورپ کی طاقتوں نے مل کر ایک "مجلسِ دول" قائم کی جس کا عام نام "اتحادِ مقدس" ہے۔ یورپ کے بادشاہوں نے مل کر یہ عہد کیا کہ وہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑیں گے۔ مذہب عیسوی کے اصولوں پر کاربند رہیں گے۔ اور اپنی اپنی رعایا کے ساتھ عدل وانصاف روا رکھیں گے۔ بظاہر یہ ایک نہایت اچھا عہد نامہ تھا۔ مگر جیسا کہ لازم تھا کچھ عرصے کے بعد یہ اتحادِ مقدس اور اس کا سارا تقدس غائب ہوگیا اور دنیا کو اس کے پردے میں چند مطلق العنان بوالہوسوں کی ٹولی نظر آنے لگی جس کا کام محض استبداد کو فروغ دینا اور آزادئ جمہور کو سلب کرنا تھا۔ اس طرزِ عمل کی بدترین صورت مٹرنک وزیر آسٹریا کی کارروائیوں میں ملتی ہے۔

"اتحادِ مقدس" کے اس رویے کے خلاف انگلستان میں کیننگ اور امریکہ میں پریذیڈنٹ منرو نے احتجاج کیا۔ کیننگ وزیر اعظم برطانیہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا اچھا نہیں سمجھتا تھا "(اتحادِ مقدس" کے ارکان ہر ایک ملک میں آزادی کی روح کو کچلنا چاہتے تھے) چنانچہ جب "اتحادِ مقدس" نے سپین کی تحریکِ آزادی کو دبانا چاہا۔ تو کیننگ نے اپنا مشہور "نظریۂ عدم مداخلت" پیش کیا۔ اسی طرح منرو نے امریکہ کی یورپ سے اور یورپ کی امریکہ سے سیاسی بے تعلقی کا اعلان کیا۔

اس سیاسی ارتقا کے پہلو بہ پہلو بین الاقوامی قانون کا بھی ارتقا ہوا جس کی وجہ زیادہ تر انگریزی عدالتِ بحری کے جج ولیم سکاٹ (لارڈ سٹوول) کے وہ فیصلے ہیں جو اس نے وقتاً فوقتاً صادر کئے اس کا قول ہے کہ اگرچہ بحری عدالت کی قانونی طاقت ایک ملک میں محدود ہے مگر اس کا قانون ایک غیر محدود بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جج کو چاہئے کہ وہ اپنے ملک کی فوری سیاسی ضرورتوں سے متاثر نہ ہو۔ اور ان کو پورا کرنے کی غرض سے متضاد فیصلے صادر نہ کرے بلکہ انصاف سے کام لے کر ایسے اصولوں پر چلے۔ جو ہر موقع پر ہر ملک میں روا رکھے جاسکیں۔ لارڈ سٹوول نے اپنا ہر ایک

فیصلہ الٰہی انصاف کے اصولوں پر صادر کیا۔ اور اسی وجہ سے اسے بقائے دوام کا استحقاق ہے بین الاقوامی قانون اور خصوصاً بحری قانون کے معاملے میں لارڈ سٹویل کے بعد امریکن وکلا سٹوری اور مارشل بھی قابل ذکر ہیں۔

اس ارتقائی سلسلے میں جس کا ذکر اب تک ہوا ہے موجودہ جمعیت الاقوام کی تشکیل ہو رہی تھی اس جمعیت کی بنا نکولس ثانی آخری زار روس کے ہاتھوں رکھی گئی۔ زار نے اپنے وزیر خارجہ کاونٹ مورا ویف کی وساطت سے ۲۴ اگست ۱۸۹۸ء اور دوبارہ ۱۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو یورپین سلطنتوں کو صلح عمومی اور تخفیف اسلحہ کی دعوت دی۔ ابتدا میں تو اس دعوت پر کسی نے توجہ نہ کی مگر ۲۰ مئی ۱۸۹۹ء کو ایک روسی نمائندہ کی صدارت میں پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں چند قراردادیں منظور کی گئیں اور چند تقریریں ہوئیں۔ مزید براں ایک اور کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی گئی جو ۱۹۰۷ء میں ہیگ ہی میں ہوئی اور دوسری ہیگ کانفرنس کہلاتی ہے

ہیگ کانفرنس کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات "قصر صلح" کی تعمیر ہے یہ قصر ۱۸۹۹ء میں ہیگ میں تیار ہوا اس کے لئے آہنی دروازے جرمنی نے مہیا کئے پتھر سکنڈے نیویا سے آیا۔ کھڑکیوں کے لئے رنگین شیشے برطانیہ نے دئے ریشمی پردے جاپان نے گلدان چین نے اور لکڑی جنوبی امریکہ نے اس قصر کو آج بھی ایک امتیاز خصوصی حاصل ہے کیونکہ اس میں بین الاقوامی عدالت کا اجلاس ہوتا ہے ہیگ کی مختلف کانفرنسیں اسی میں ہوئیں ایک کانفرنس جنگ عظیم سے پہلے ہونے والی تھی جو جنگ کی وجہ سے نہ ہو سکی۔

شاید اقبال نے اسی کو مدِ نظر رکھ کر کہا ہے:-

این بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت	رقصید گردِ او بنوا ہائے جنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید	جز لیسفک الدماء وخصیمٌ مبین نبود

جنگِ عظیم ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ اس کی تباہ کاریوں کی تفصیل بے سود ہے اگر کسی نے ان کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو مسٹر کربی پیج کی تصنیفات موجود ہیں۔ خلاصہ یہ سمجھئے کہ بہت سے مغربی مصنفوں کے خیال میں ایک ایسی ہی جنگ دنیا میں اور ہو جائے تو انسانی تہذیب و تمدن بلکہ نسل انسانی کا خاتمہ ہو جانے کا اندیشہ ہے یہ اندیشہ دوران جنگ ہی میں پیدا ہو گیا تھا چنانچہ حکومت برطانیہ نے فلی مور کمیٹی کو ایک جمعیت الاقوام کی تجویز پر غور کرنے کے لئے مقرر کیا اس کمیٹی کی رپورٹ پر موجودہ لیگ کے عہد نامے کا بہت حد تک انحصار ہے یہ عہد نامہ پریذیڈنٹ ولسن کے ایما سے منظور کیا گیا اور ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو جبکہ حادثہ سراجیو کی برسی تھی۔ اس پر بتیس قوموں نے دستخط کر دئے۔

ممتاز حسن

جو میں نے صرف کیا وہ میرا تھا۔
جو میں نے رکھا وہ کھو دیا۔
جو میں نے دیا وہ اب بھی میرا ہے۔

گلچیں

بسنت

گاؤ بسنت نہیں اب دیری ۔ سکھ آنند کی آئی بیری

ساری دُنیا ہے دل شاد

آیا بور اور پکّی بیری ۔ آئی قلمی آم ہیں کیری

بن بستی سب ہیں آباد

کوئل سنے نہ میری تیری ۔ کوک کوک لگا وے پھیری

ہردے وا کے پیتم یاد

سن تو سکھی تُو، تُو چیت[1] چیری ۔ اسی سمے ہو پریم سے سیری

برہ کی آگ کرے برباد

سکھی یہی آسا ہے میری ۔ رکھوں ہندر وا گھی کی دیرٹی[2]

جب بھارت ہوئے آزاد

ہند دیش پر چھائی اندھیری ۔ کر پرمیشور رین اجیری

سُن لے بھارت کی فریاد

یہی دعا ہے داتا میری ۔ ملے ہند دیش کو سکھ سیری

اُجڑی نگری ہو آباد

سید مقبول حسین احمد پوری

[1] یعنی ہوشیار و عقلمند [2] یعنی چراغ

اُردو شاعری اور مُلکی سرمایہ

(۳)

کسی زبان کی شاعری کسی مخصوص طبقہ کی خوشنودی کے لئے اپنی فطرت وطبیعت نہیں بدل سکتی ایک طرف تو غزل اپنی شوخی وبیباکی سے ہاتھ دھونا خودکشی کے مرادف خیال کرتی ہے دوسری طرف سومیر د پربت کے دیوتا طنزیہ کلام برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے دونوں میں مصالحت ہو تو کیونکر اردو شاعری سومیر د پربت کی سیر کرنے سے قبل پروانۂ آزادی چاہتی ہے وہ دیوتائی بارگاہ کے آداب ومراسم سے ناواقف ہے ہندی صنمیات اور دیومالا کے افسانے اور روایتیں اس کے لئے بالکل اجنبی ونامانوس ہیں اگر اس کی رندمشربی وآزادہ روی میں کوئی رکاوٹ پیش ہو تو وہ دیوتائی دربار کی طرف رخ کرنا بھی پسند نہ کرے گی طنز شوخی بیباکی صنف غزل کی امتیازی صفتیں ہیں کیا کوئی تدبیر ایسی ہے کہ شاہد غزل طنز وبیباکی اور شوخی ورنگینی کے اوصاف سے دست بردار ہوئے بغیر دیوتائی سبھا میں باریاب ہوسکے؟ کیا اس ملک کے باشندے جن کا جنونِ مذہبی پیپل کی پتی اور باجے کی آواز پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ لینے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ اپنے دیوتاؤں کی شان میں طنزیہ کلام یا بنے کی باتوں کے سننے کی تاب لا سکتے ہیں؟ اردو شاعری دیوتائی بارگاہ میں دست بستہ ہو کر یا اپنی زبان پر مہر سکوت لگا کر حاضر ہونے سے یہی بہتر سمجھتی ہے کہ نہ وہ خود سومیر د پربت کی طرف رخ کرے اور نہ اس پربت کے جبل نشین اس کی محفل میں داخل ہوں۔

اب تک ہندو دیومالا کی صرف ایک ہستی رادھا نے اردو ادب کی محفل طرب میں حاضر ہونے کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اس سے سوائے ناچ کے اور کوئی کام نہ لیا جائے اور پہلے سے نومن تیل کی فکر کر لی جائے لیکن نومن تیل کی مشعلیں جلانے اور رادھا کے ناچنے کے لئے اتنی وسیع جگہ درکار ہے کہ غزل کی بیت میں جو صرف دو مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس کی گنجائش نکلنی مشکل ہے۔ اس لئے غزل کی محفل رادھا کے ناچ سے کبھی محروم ہی رہا کی ہے البتہ اکبر الہ آبادی نے اپنی ایک محفل میں بڑی مشکلوں سے رادھا کے ناچ کا انتظام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

قومی ترقی کی رادھا پیاری بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
نومن تیل کی فکر ہے طاری چندے کی تحریک ہے جاری

اگرچہ یہاں رادھا کے ناچ کے لئے نومن تیل کا بھی انتظام کر لیا گیا ہے لیکن غزل پکار اٹھتی ہے کہ اس دیبتی محفل سے مجھے کوئی سروکار نہیں یہ تو قطعہ کی زمین ہے سچی بات تو یہ ہے کہ زمین غزل میں نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

خیر غزل میں نہ سہی قطعہ کی زمین میں تو حلیم الطبع رادھا نے اپنے ناچ سے اہل محفل کو محظوظ و مسرور کر دیا۔ لیکن ہندی دیومالا کے دوسرے دیوتا تو اردو شاعری کی کسی مجلس میں شریک ہونا پسند نہیں فرماتے کیونکہ وہاں نہ انکی آرتی اور پوجا پاٹھ کا سامان ہے نہ ان کی ربوبیت والوہیت کا کافی احترام۔ علاوہ بریں غزل کی محفل رنگین نہ میدان جنگ ہے نہ کشتی بازی کا اکھاڑہ جہاں رستم و سہراب یا ارجن و بھیم کو دعوت دے کر نیزہ بازی۔ تیر اندازی یا پہلوانی کا تماشا دیکھا جائے۔ البتہ دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری اور قوت و شوکت کی ناپائیداری بیان کرتے ہوئے شاعر کبھی کہدیتا ہے کہ ؎

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام ہی نام باقی ہے

لیکن ارجن اور بھیم کے پرستار کہیں گے کہ دیوتا غیر فانی ہوتے ہیں۔ انسانی روپ دھارن کرنے پر بھی وہ جام موت نوش نہیں کرتے بلکہ لوگوں کی نظر سے اُن کا لوپ ہو جاتا ہے ارجن اور بھیم مرے نہیں بلکہ اپنے بقیہ تین بھائیوں کے ساتھ زندہ سومیر و پربت پر چلے گئے شاعر نے جو کام رستم اور سام کی قوت و توانائی کی بے ثباتی سے لیا اور جو نتیجہ اخذ کیا۔ ان کا بھیم اور ارجن کے قصہ سے انجام پانا ممکن نہیں۔ قصائد میں ممدوح کو رستم و اسفندیار سے زیادہ دلاور اور طاقتور دکھایا جاسکتا ہے اس قسم کا مبالغہ صنائع و بدائع میں داخل ہے جس کا مقصد محض زینت کلام ہے لیکن شاعر کو ارجن اور بھیم کے معاملے میں اتنی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔ مسلمان ممدوح کو تو محض غیریت۔ اجنبیت اور ناما لونیت کی بنا پر ہندو صنمیاتی سورماؤں کی تمثیل سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اور اگر کسی ہندو ممدوح کی قوت و طاقت کو بھیم اور ارجن سے بالاتر دکھایا جائے تو اس کے مذہبی جذبہ کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے۔ البتہ مثنوی کے ذریعے جہاں رستم و سہراب کی داستان بیان کی گئی ہے وہاں منظوم اردو مہابھارت میں ارجن اور بھیم کے کارناموں کا بھی استقصا ہو چکا ہے لیکن شعریت سے نہ سہراب و رستم کی منظوم داستان کو کوئی تعلق ہے۔ نہ مہابھارت کے منظوم ترجمہ کو غرض کہ داخلی شاعری اور خصوصاً غزلیات میں ہندو صنمیاتی کردار و اشخاص کو ایرانی و عربی ابطال کے پہلو میں جگہ دینا شعریت و معنی آفرینی کو کند چھری سے ذبح کرنا ہے۔ علاوہ بریں گل و لالہ۔ سنبل و ریحان نرگس و بنفشہ۔ سرو و شمشاد۔ بید و چنار وغیرہ کے بدلے جو ہندی پھول پودے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً کلاب برکش اکشے بٹ کو کابیلی۔ جٹا دھاری سورج مکھی وغیرہ ان کا نام سنتے ہی غزل پکار اٹھتی ہے کہ یہ میری زبان نہیں۔ یہ میرے محاورہ و روزمرہ کیخلاف ہیں۔ اگر یہ میرے پہلو میں رکھے جائیں۔ تو ہمیشہ خار بن کر کھٹکتے رہیں گے میری ساری رنگینی دلچسپی۔ شعریت۔ لطافت اور نزاکت کا خون ہو جائے گا۔ میں جس زبان کی شاعری کا دودھ پی کر پلی اور جوان ہوئی ہوں اس زبان کی بعض پیچیدہ ترکیبیں اور مغلق و ثقیل الفاظ جب میری طبع نازک پر گراں گذرتے ہیں۔ تو ایک اجنبی زبان کے خواہ وہ میری ہمسایہ ہی کیوں نہ ہو ثقیل و کرخت اور کثیف و نامطبوع الفاظ کو میری نازک مزاجی کب برداشت کرسکتی ہے؟

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لیلی و مجنوں شیریں و فرہاد۔ گل و بلبل۔ شمع و پروانہ۔ سرو و شمشاد۔ نرگس و سوسن کوہ طور و کوہ الوند۔ دجلہ و فرات۔ قیصر و کسریٰ۔ جمشید و فریدوں۔ خضر و سکندر۔ ارژنگ مانی۔ کارخ مصور۔ پیراہن یوسف۔ چاہ کنعان

چاہِ نخشب بحرِ ظلمات آبِ حیواں اور اس قسم کے سینکڑوں نام جن سے اردو شاعری کی محفل سجائی جاتی ہے۔ ہزاروں بار سینکڑوں پہلوؤں سے بندھتے آئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر لفظ کے ساتھ بیشمار تلازمات اشارات تلمیحات۔ ایتلافات۔ خیالات۔ تصورات اور واقعات وابستہ ہو گئے ہیں جس طرح جریب کی ایک کڑی کھینچنے سے تمام کڑیوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح ان میں سے کسی لفظ سے گوش آشنا ہوتے ہی اس کے تمام تلازمات۔ ایتلافات و توابعات حافظہ کی تعبیم شعوری سطح سے اُبھر کر چشمِ تخیل کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ لارڈ میکالے نے ملٹن کے شاعرانہ الفاظ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف ان پر بھی صحیح اترتا ہے اگرچہ ان الفاظ کے لغوی معنی و ظاہر امفہوم معمولی ہیں لیکن ہر لفظ کے اندر دریائے معنی پوشیدہ۔ وہ معمولی لفظ نہیں بلکہ منتر کے اکھر ہیں ان کے زبان پر آتے ہی ماضی مبدل بہ حال اور بعید چیزیں قریب ہو جاتی ہیں حسن کے نئے نئے پیکر جلوہ گر ہونے لگتے ہیں دماغ گڑے مُردوں کو اکھاڑ باہر کرتا ہے یعنی بھولی بسری باتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے خوابیدہ داستانیں اور افسانے بیدار ہو جاتے ہیں لیکن ان کا مرادف یا بدل استعمال کرو کوہ طور کو سمیرد پربت سے یا بلبل کو کوئل سے یا مجنوں کو نل سے بدلو آن کی آن میں سارا طلسم ٹوٹ جائیگا تمام سحر کاریاں غائب ہو جائینگی دفترِ معنی کا باب مسدود ہو جائے گا۔ ساری دلچسپیاں مفقود ہو جائیں گی تلازمات و ایتلافات کی زنجیر کٹ جائیگی، ان فسوں کارانہ الفاظ کو تبدیل کر دینے کے بعد بھی جو شخص سابقہ طلسمی مناظر و مرایا کے ہم آغوشِ نظر ہونے کی توقع کرے گا۔ اس کو ویسی ہی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا جیسی الف لیلہ کے قاسم کو درپیش آئی تھیں جبکہ وہ جادو کے دروازہ کو "کھل گیہوں کھل جو کھل چنا کھل مونگ" وغیرہ کہکر کھولنا چاہتا تھا حالانکہ وہ صرف "کھُل سم سم" کے منتر سے وا ہوتا تھا۔ اگر ان الفاظ کو شعر میں نہ باندھ کر یونہی یکے بعد دیگرے زبان پر لایا جائے تو بھی ہر نام کے ساتھ ذہن کے سامنے ایک رنگین طلسمی پردہ آتا جائیگا جس پر مختلف افسانوں مختلف حکایتوں اور مختلف واقعات کے نقوش ثبت ہونگے اور دماغ صورِ متحرکہ کی تماشا گاہ بن جائے گا۔ جب انفرادی الفاظ میں اس قدر طلسمی اثر کوٹ کر بھرا ہوا ہے تو شعر میں بند ھنے پر وہ نہ معلوم کیا قیامت برپا کریں گے۔ ان منتروں کو ہندی الفاظ سے بدل دینے پر شعر کا سارا سحر کارانہ اثر زائل ہو جائے گا۔

انگلستان کے مشہور نقاد مسٹر ابر کرامبی کا قول ہے۔ کہ صرف واقعات کو منظوم کر دینا شاعری نہیں بلکہ محض نظم نگاری ہے۔ شاعری کی پہلی ضروری صفت "فسوں کاری" ہے "فسوں کاری" کا کام صرف ہمیں مسرور و مسحور کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی اس کے وظیفے میں شامل ہے کہ وہ ہماری چشمِ بصیرت میں ایسی روشنی پیدا کرے کہ ہماری نگاہیں عالمِ محویت میں بھی اشیا کے ظاہری پردوں سے گذر کر ان کے بطون و دروں تک پہنچیں! اور پُراسرار حقائق دریافت کر سکیں۔ بغیر "فسوں کارانہ" صفت کی موجودگی کے کسی کلام میں شعریت کی اصل روح پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شاعری کا ہر لفظ اور ہر فقرہ ساحرانہ ہوتا ہے بسا اوقات طویل مسلسل نظموں میں سطروں کی سطریں پڑھ لینے پر بھی کوئی مسحور کن فقرہ نہیں ملتا اور ہم اکتا کر کہنے لگتے ہیں کہ شاعر نے کاوش و کاہش تو سخت کی ہے لیکن اس کے کلام میں شعریت کی روح مفقود ہے مگر مستقل مزاج قاری صبر و تحمل سے کام لیتا ہے اس کی نگاہیں گرمِ تلاش رہتی ہیں بالآخر بعد بسیار انتظار جب ساحرانہ فقرہ مل جاتا ہے تو اس پر محویت و بیخودی کی حالت طاری ہو جاتی ہے یہ ساحرانہ لفظ یا فقرہ صرف ایک ہی سطر یا بیت میں گرمی تڑپ اور "نشتریت" پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنے آگے پیچھے اور ارد گرد کی تمام

سطروں اور بیتوں میں برقی لہر دوڑا دیتا ہے۔ زبان کے تار و پود میں جادو کا رنگ و اثر بھر دیتا ہے اور پورے کلام کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے دنیا کی بڑی بڑی مشہور رزمیہ نظموں مثلاً ہومر کی "ایلیڈ" اور ملٹن کی "فردوس گم شدہ" کی غیر معمولی کامیابی کا راز یہی ہے بند کے بند پڑھتے جاؤ قلب میں نہ اہتزاز پیدا ہوگا نہ سوز و گداز لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسے اشعار ملتے جائیں گے جن میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا رہتا ہے انہیں درمیانی اشعار کی ساحرانہ قوت آس پاس کی بے کیف سطروں میں بھی حرارت اور چمک پیدا کر دیتی ہے۔ طویل نظموں کی بہ نسبت مختصر نظموں میں جادو کے الفاظ اور فقرے زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں اسی بنا پر ایمرسن کو تسامح ہوا اور اس کی شتاب کاری نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ طویل نظموں پر شاعری کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا وہ عموماً منظوم واقعات ہوتی ہیں جن میں کیف و اثر نہیں پایا جاتا البتہ کہیں کہیں ایک آدھ شعر دیکھنے میں آ جاتا ہے جس کی اہتزازی قوت بقیہ کلام کی بے اثری کی تلافی کا سامان مہیا کر دیتی ہے طویل نظموں کے یہی چیدہ چیدہ اشعار صحیح شاعری کے ضمن میں آ سکتے ہیں لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جو الہامی اشعار ملتے ہیں ان کے ساحرانہ الفاظ اور فقرے ترشے ہوئے ہیرے کی طرح چھوٹ دیتے ہیں اور ان کے پرتو سے اردگرد کی چیزیں بھی چمکنے لگتی ہیں اور جو شعر پہلے پھسپھسے معلوم ہوتے ہوں ان میں بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ طویل نظموں کے مقابلہ میں مختصر نظمیں زیادہ طلسمی الفاظ کی حامل ہوتی ہیں یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ غزل کا ہر شعر بمنزلہ ایک آزادانہ مختصر نظم کے ہوتا ہے ایک شعر کو دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہر شعر بذاتِ خود ایک جملۂ تامہ یا کلامِ مفید ہے۔ اس لئے یہاں ایک شعر کا طلسمی لفظ یا ساحرانہ فقرہ دوسرے شعر کو متاثر نہیں کرتا جس شعر میں کوئی فسوں کارانہ لفظ و ترکیب نہ ہو وہ بود اپست اور پھسپھسا ہوگا غزل کے ہر شعر میں فسوں کاری کا علیحدہ علیحدہ سامان ہونا چاہئے اردو کے شعرا مختلف وسائل سے کلام میں خوبی و دلکشی پیدا کرتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو اکثر اور بیشتر اشعار میں ساحرانہ اثر اور فسوں کارانہ عمل کا مرکز فارسی کی وہی لطیف و دلپذیر ترکیبیں ہوتی ہیں جن کو وطن پرست طبقہ غیر ملکی سرمایہ سے تعبیر کرتا ہے مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نام اُن کا آگیا جو کہیں وقتِ بازپرس
ہم کھنچے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

کس کے خرامِ ناز نے قبر میں دل ہلا دیا
چین سے سو رہا تھا میں آکے مجھے جگا دیا

سوالِ وصل پہ ہلنا پری رُ ترے ابرو کا
اشارہ ہے برات عاشقاں بر شاخ آہو کا

کرم کچھ آج ہے ساقی کا وہ طرب انگیز
کہ جرعہ جرعہ ہے موجِ نسیمِ سحری

شورِ محشر امیر کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب سونے دے

رشکِ فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں
محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا

ذرا ہو گرمیٔ صحبت تو خاک کر دے چرخ — مرا سرور ہے گل خندۂ شرر کا سا

حریف بے جگری صبر ورنہ کل کی صحبت میں — نیاز و ناز کا جھگڑا اگر د تھا ایک جرأت میں

ہنگامہ گرم کن جو دل نا صبور تھا — پیدا ہر ایک نالہ سے شور دلشور تھا

ہوا یہ سینہ یکسر خار زار دشت غم میرا — کہ آیا ناخوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

ان اشعار کی تمام خوبی خط کشیدہ الفاظ کی رہین منت ہے بعض جگہ خیالات نہایت معمولی تھے لیکن فارسی ترکیبوں کی ندرت اور لطافت نے انہیں بہت اعلیٰ وارفع اور پرکیف و دلکش بنا دیا۔ سطر ابرکرامبی اسی قسم کے فقروں کو سحر وافسوں خیال کرتے ہیں لیکن دراصل وہ صرف جادو کا نہیں بلکہ مسیحائی کا کام کرتے ہیں مردہ اشعار میں جان ڈال دینا ان کا ادنیٰ کرشمہ ہے قدما ان تمام گردں سے واقف تھے۔ چنانچہ مومن نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ اساتذہ کی غزلوں میں بھی صرف دو تین ہی اشعار الہامی ہوتے ہیں جو سامع کے احساسات کو مشتعل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں غزل کا بقیہ نصاب فارسی کی چست و دلآویز ترکیبوں کے ذریعے سے پورا کر دیا جاتا ہے الغرض جو الفاظ اور فقرے اردو شاعری کے تمام حسن و خوبی کا منبع ہیں۔ جو دلاویز ترکیبیں شعر کی جان ہیں اور اپنے فسوں کارانہ اثر سے سامعین کو مسحور و بیخود بنا دیتی ہیں، اگر حامیان سرمایۂ ملکی کی خوشنودی کی خاطر انہیں سے دست برداری اختیار کر لی جائے تو اردو کا ذخیرۂ شاعری بالکل جنس کاسد بنجائیگا جس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

لیکن فارسی ترکیبوں کے اعجاز نما اختصار اور ساحرانہ اثر آفرینیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے "تاریخ ادبیات اردو" کے فاضل مصنف شکوہ سنج ہیں۔ کہ "اردو کے قدیم غزل گو شعرانے فارسی کی نامانوس اور رشانداز ترکیبوں کے آگے بھاشا کی شیرینی اور نزاکت کو نظر انداز کر دیا" جو چیز اردو شاعری کی گھٹی میں پڑی ہو اس کو نامانوس قرار دینا گویا چاند پر دھول ڈالنا ہے ممکن ہے کہ بھاشا کی شاعری میں کسی حد تک شیرینی اور نزاکت پائی جاتی ہو لیکن یہ ایک محدود و تنگ اور گمنام شاعری ہے ایک محدود و مخصوص خطۂ ملک کے باہر اسے کون جانتا ہے مگر فارسی شاعری کی لطافتوں اور نزاکتوں کی ایک عالم میں دھوم ہے فارسی شاعری کو دنیا کے کلاسیکل لٹریچر (ادب العالیہ) میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے جہاں تک زبان کی شیرینی اور نزاکت کا تعلق ہے۔ دنیا کی کوئی زبان مشکل ہی فارسی کا مقابلہ کر سکتی ہے بھاشا کہاں کی ایسی ترقی یافتہ زبان ہے کہ وہ فارسی جیسی ہمہ گیر و شہرۂ آفاق زبان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے اس میں اتنی قوت و گیرائی کہاں کہ وہ اردو شاعری کے لئے نمونہ کا کام دیتی اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ بھاشا کی عشقیہ شاعری الہام والقا کا نتیجہ نہیں ہوتی اور اس کا طرز اظہار بالکل مصنوعی و غیر فطری ہوتا ہے اثر کے لحاظ سے بھی اس کا کارنامہ زیادہ وقیع نہیں بھاشا کی شاعری کے متعلق عجیب و غریب غیر ذمہ دارانہ بیان دیکھنے میں آتے ہیں عام طور پر مشہور ہے۔ کہ بھاشا کی شاعری میں عاشقانہ احساس کی اس قدر شدت اور گرمی پائی جاتی ہے۔ کہ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان اس کی حریف بن سکے لیکن یہ غلو آمیز بیان صداقت سے اتنا ہی بعید ہے جتنی نور سے ظلمت۔

ماہرین فن کا خیال ہے کہ وہی شعر نہایت پُر اثر اور کیف آور ہوتا ہے۔ جسے پڑھ کر انسان محسوس کرے کہ یہ میری ہی

آواز اور قلبی پکار کی صدائے بازگشت ہے۔ جو شعر سامع کے خیالات و جذبات کے آئینہ دار نہیں ہوتے وہ کیفیت و اثر سے بالعموم معرا ہوتے ہیں۔ غالب نے اسی نکتہ کو اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی لئے اساتذۂ سخن اپنے شخصی و انفرادی تجرباتِ ذہنیہ و وارداتِ قلبیہ کو بھی عمومی رنگ میں پیش کرتے ہیں مضمونِ شعر کا عامۃ الورود ہونا بہت بڑا وصف ہے۔ میر اور درد کے اشعار کی "نشتریت و خنجریت" کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیان تو کرتے ہیں اپنے ذاتی تجربات لیکن طریقۂ بیان ایسا اختیار کرتے ہیں کہ ہر شخص انہیں اپنے حالات و واقعات کے مطابق پاتا ہے۔ مثلاً میر کا ایک شعر ہے ؎

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

عاشق شدتِ انتظار سے بیتاب ہو کر معشوق کے خلاف شکایتوں کا ایک دفتر تیار کر لیتا ہے اور دل میں سوچتا ہے کہ ملاقات ہونے پر خوب جلی کٹی سناؤں گا۔ لیکن جب معشوق آتا ہے تو اس کے رُعبِ حُسن سے عاشق کو سخت کلامی کی ہمت نہیں ہوتی۔ بلکہ خود عاشق کا وفورِ شوق اسے بجائے شکوہ سنجی کے عجز و نیاز کے اظہار پر مجبور کرتا ہے یہ معاملہ صرف عشقِ جنون پرور کے بادیہ پیماؤں ہی کے ساتھ پیش نہیں آتا بلکہ ہر شخص کو جو کسی کا فرادا سے تھوڑی بہت بھی محبت رکھتا ہے اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا فی الحقیقت یہ ایک عامۃ الورود واقعہ ہے۔

اب بھاشا کی عشقیہ شاعری پر غور کیجئے اس شاعری کو مردانہ جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں صرف عورتوں کے جذبات وحسیات کی مرد کوی کی جانب سے ترجمانی کی گئی ہے۔ جب تک مرد خود کو عورت نہ تصور کر لے اس وقت تک یہ شاعری اس کے ذہنی حالات و دلی کیفیات کے مطابق نہیں ہو سکتی لیکن مرد کا اپنے اوپر عورتوں کے جذبات و احساسات طاری کر لینا خلافِ فطرت اور محال ہے۔ اس بنا پر بھاشا کی عشقیہ شاعری مرد کے جذباتِ عالیہ وحسیاتِ لطیفہ کو مشتعل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اردو غزل کے اکثر اشعار عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی دونوں پر منطبق ہوتے ہیں لیکن بھاشا کی شاعری میں عشقِ حقیقی یا تصوف کی مئے دو آتشہ کی تندی و گرمی بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہاں شاہدِ حقیقی کے ساتھ بھی اظہارِ محبت کا وہی مجہول و انفعالی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو نئی دلہن اختیار کرتی ہے خود کو دُلہن فرض کر لینا ممکن ہو تو ہو لیکن دُلہن کے حقیقی جذبات و احساسات اپنے اندر پیدا کر لینا غیر ممکن ہے بہر طور بھاشا کی شاعری نہ مردانہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہے نہ پڑھنے والے کے احساسات کی آئینہ داری۔ بھاشا کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی آبادی صرف مردوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ نصف آبادی صنفِ نازک کی ہے مرد کے جذبات کی ترجمانی اگر نہیں ہوئی تو کیا ہرج یہی کیا کم ہے کہ دنیا کی نصف آبادی کی تسلی و تشفی کا یہاں کافی سامان موجود ہے لیکن جب

کوئی شریف خاتون بھاشا کے ولولہ خیز و پُرجوش اشعار سنتی ہے تو کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے اور کہتی ہے کہ "حاشا و کلّا یہ نالہ و شیون اس باحیا مخلوق کا نہیں ہے جو عورت کہلاتی ہے مردوں نے اپنے جی سے یہ تمام بے شرمی کی باتیں گھڑ کر ہماری رسوائی و بدنامی کا سامان اکٹھا کر لیا ہے ہم کبھی اپنے رازِ درُوں کو اس طرح طشت از بام نہ کرتے۔ اور نہ کبھی اپنے دردِ دل کا ڈھنڈورا پیٹتے جب تک کسی عورت کے دیدہ کا پانی نہ گر جائے۔ وہ ہرگز مردوں کی سبھا میں اپنی چھل بل دکھانے پر آمادہ نہ ہوگی ہماری غیرت نسائی اور شرم و حیا ان باتوں کو زبان پر لانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتی جنہیں بھاشا کے ظالم شاعر نے ہماری طرف منسوب کر دیا ہے ہم ناچار ہیں مجبور ہیں بے بس ہیں کریں تو کیا کریں مردوں کے جو جی میں آیا بے دھڑک کہدیا قلم ان کا۔ زبان ان کی ہماری عزت و خودداری کا کچھ پاس نہ کیا۔ پھر بھی ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ کہ بھاشا کے شاعروں نے جو کچھ ہرزہ سرائی کی ہے۔ وہ ہماری زبان نہیں۔ ہماری پکار نہیں ہمارا انداز بیان نہیں یہ تمام امور ہماری فطرت و طبیعت کے منافی ہیں"۔

ان حالات کے مدِنظر بھاشا کی عشقیہ شاعری محض مصنوعی بے اصل اور غیر فطری نہیں تو اور کیا ہے دعویٰ کیا جاتا ہو اس شاعری میں احساسات کو مشتعل کرنے کے لئے انتہا درجہ کی شدت و حرارت پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ کیا وہ ہمارے جذبات عالیہ و احساسات لطیفہ میں جنبش و حرکت اور دل و دماغ میں اہتزاز و انبساط پیدا کرنیکی قوت و صلاحیت رکھتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ شباب کی سرمستیوں سے مغلوب ہو کر جب کوئی ماہ جبیں اپنی البیلی چال ڈھال دکھائیگی۔ تو لامحالہ نازبرداروں کے خرمن صبر و سکون پر بجلیاں گرائیگی جب کوئی کافر ادا خود پیش قدمی کرے گی۔ آغوش محبت کھولے گی بیقراری و بیچینی دکھائے گی دست تمنا دراز کریگی۔ تو لازمی طور پر دوسری جانب سے ہوسناکی و نفس پرستی استقبال کے لئے آگے بڑھے گی غرض کہ ایک نوخیز محبوبہ کی دردسرائی صرف جذباتِ کثیفہ و خواہشاتِ سفلیہ ہی کو برانگیختہ کر سکتی ہے البتہ قرونِ وسطیٰ کا کوئی مبارز (نائٹ) اگر بھاشا کے اشعار سنے تو بہت ممکن ہے کہ وہ صنفِ نازک کے نالہ و شیون سے بیتاب ہو جائے اس کے دل میں بجائے جذبۂ شہوانی کے رحم اور ترس کا احساس پیدا ہو اور وہ اُس کی امداد و اعانت کے لئے آگے بڑھے مختصر یہ کہ "پیا بن کیسے کٹیں دن بہار کے" یا "چھار و چھار دموری بہنیاں البیلے سیاں" یا اسی قماش کی اور شاعری کا سارا کارنامہ یہی ہے کہ وہ یا تو نوجوانوں کے جذبۂ ہوسناکی کو اشتعال دے یا معمر و سنجیدہ لوگوں کے دلوں میں ترس اور رحم کا احساس پیدا کرے علاوہ بریں بھاشا کوئی ایسی مہذب متمدن اور ترقی یافتہ زبان بھی نہیں ہے اور نہ اس کا دامن ایسے علمی و ادبی خزانوں سے معمور ہے۔ کہ اردو کو اس سے خوشہ چینی کی ضرورت لاحق ہو۔ اردو ادب و شاعری کو ہر اعتبار سے بھاشا پر ترفع و تفوق حاصل ہے اس لئے اس کی خودداری و حمیت ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے سے کمتر درجہ کی زبان کو اپنا خضرِ راہ سمجھے اور اس کے نقشِ قدم پر چلے۔

آج کل مُلک میں کئی زبردست علمی ادارے قائم ہوئے ہیں جو اپنا مقصد اردو کی اصلاح و ترقی بتاتے ہیں لیکن جو تجویزیں پیش کرتے ہیں ان پر عمل کرنے سے اردو زبان ترقی کرنے کے بجائے روبہ زوال ہو جائیگی اور اس کا رخ بلندی

پستی کی جانب مائل ہو جائے گا۔ ان کی پہلی مہلک تجویز یہ ہے کہ اردو ادب و شاعری سے جہاں تک ممکن ہو فارسی و عربی الفاظ
خارج کر دئے جائیں اور ان کی جگہ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں اُن کا خیال ہے کہ اردو زبان کی زمین ہندی ہے جس
پر محض خوشنمائی کے لئے عربی و فارسی کے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ اگرچہ ادب و شاعری میں الفاظ و ترکیب کی خوشنمائی و لطافت بھی
بڑی اہمیت رکھتی ہے بلکہ بعضوں کے نزدیک شائستگی کو افادت پر تفوق حاصل ہے تاہم عربی و فارسی کے الفاظ صرف بیل
بوٹوں ہی کا کام نہیں دیتے۔ بلکہ ابتدا ہی سے وہ اردو ادب و شاعری کی جان ہیں جو اس کے رگ و پے میں سرایت کئے
ہوئے ہیں اور جزو بدن بھی بن گئے ہیں۔ ان کا اخراج گویا جسد شاعری سے جان کو جدا کرنا اور اسے مردہ بنا دینا ہے نثر سے
ان کا اخراج اگر ہلاکت آور نہیں تو کم سے کم اعضا و جوارح کی قطع و برید کے مماثل ضرور ہے اردو میں اعلیٰ و لطیف جذبات
اور بلند و نازک خیالات کی ترجمانی کے لئے عربی و فارسی الفاظ ناگزیر ہیں کوئی زبان اگر صرف کاروباری ضروریات کے لئے
استعمال ہوتی ہو اور محض بول چال تک محدود ہو تو معمولی لفظوں سے کام چل سکتا ہے لیکن اس میں علمی و ادبی شان پیدا کرنے
کے لئے اس کو عام روش سے بالاتر بنانے کی ضرورت ہے جو زبان صرف لین دین اور سودا سلف کے لئے استعمال ہوتی ہو
اس سے شاعر کا کام نہیں چل سکتا شاعر ایسے الفاظ منتخب اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے جو جذبات و حسیات میں تموج و تلاطم
پیدا کر سکے۔ اس لئے اس کو کسی قدیم کلاسیکل لٹریچر کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے چنانچہ یورپ کی تمام ترقی پذیر زبانیں یونانی و
لاطینی سرمایۂ ادب کو اپنے لئے خضر راہ سمجھتی ہیں۔ لطیف نازک اور پیچیدہ خیالات کے اظہار کے لئے اس سے استمداد کرتی ہیں
علمی و حکمیاتی اصطلاحات تو زیادہ تر یونانی و لاطینی ہی کی مدد سے بنائی جاتی ہیں واضح رہے کہ ہر نئی زبان اسی قدیم ادب العالیہ
کا سہارا ڈھونڈتی ہے جو اس کی فطرت۔ طبیعت ہیئت و ساخت کے مطابق ہوتا ہے فارسی و عربی اردو کے ساتھ اور سنسکرت
ہندی کے ساتھ میل کھاتی ہے۔ اس لئے ہر دو زبانیں اپنے ساتھ میل کھانے والی قدیم السنہ سے استفادہ کر رہی ہیں نئی زبان
کے ارتقا و ترقی کا یہی قدرتی طریقہ ہے۔ آج کل یہ خیال وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے کہ علما نے اردو زبان کو فارسی و عربی کے ادق و
مغلق الفاظ سے اور پنڈتوں نے ہندی کو سنسکرت کے سخت و غیر مانوس الفاظ سے گرانبار کر دیا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ
جانتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے فطری قانون و لسانی اصول کے تحت عمل میں آ رہا ہے اس میں بیچارے عالموں اور پنڈتوں کے
تعصب کو مطلق دخل نہیں اعلیٰ اور شاندار خیالات اپنے اظہار کے لئے پرشکوہ و جزیل الفاظ کے متقاضی ہوتے ہیں البتہ
سادہ و بسیط خیال کے لئے سادہ و معمولی الفاظ کافی ہیں۔ خیال اور لفظ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ماہرین نفسیات جانتے
ہیں کہ کبھی مجرد خیال بغیر لفظی جامہ کے ہمارے دماغ میں رونما نہیں ہوتا اعلیٰ خیال اعلیٰ لباس میں اور سادہ خیال سادہ لباس
میں جلوہ گر ہوتا ہے شیخ عبدالقادر سابق مدیر مخزن کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں ڈاکٹر اقبال کی نظمیں مخزن میں شائع ہوا
کرتی تھیں اس وقت بعض لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ بہت ادق اور مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں فارسی کی پیچیدہ ترکیبوں
کی وجہ سے ان کا کلام عام فہم نہیں ہوتا۔ یہ شکایت ڈاکٹر اقبال تک پہنچا دی گئی جس پر انہوں نے مجبوری کا اظہار کرتے

ہوئے فرمایا کہ اعلیٰ وارفع خیالات سہل اور سادہ الفاظ میں ادا ہو ہی نہیں سکتے۔ خیالات کی جدت و ندرت شاعر کو نئی نئی ترکیبیں تراشنے پر مجبور کرتی ہے۔ سر اقبال کا خیال ہے کہ مرزا غالب بھی اپنے کلام میں صرف شوکت و جزالت پیدا کرنے کے لئے قصداً فارسی کی پیچیدہ اور انوکھی ترکیبیں استعمال نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس امر پر فطرتاً مجبور تھے۔ ایک تو ان کی طبیعت ہی مشکل پسند واقع ہوئی تھی دوسرے ان کا فکر فلک پرواز تھا اور عام پست سطح پر شاذ و نادر ہی اترتا تھا۔ اس لئے خیالات کی بلندی و طرفگی کی مناسبت سے ان کے پیرایۂ بیان میں بھی علویت۔ ندرت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ اردو زبان جب تک محض بول چال کی زبان تھی اس کا ذخیرۂ الفاظ نہایت سادہ سہل اور محدود تھا۔ لیکن جوں جوں اس میں علمی و ادبی شان پیدا ہوتی گئی اس کی لغت بڑھتی گئی اور خیالات کی رفعت و لطافت کے ساتھ ساتھ شاندار الفاظ اور خوشنما فارسی ترکیبوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اسی اصول پر ہندی زبان کی بھی ترقی ہوئی ادبی ترقی کے ساتھ خیال میں نزاکت و لطافت پیدا ہوتی گئی۔ جب نازک و لطیف خیالات کے اظہار کے لئے معمولی بول چال کے لفظ ناکافی ثابت ہوئے تو ہندی نے سنسکرت کے خرمنِ ادب سے خوشہ چینی شروع کی اب اگر اردو زبان فارسی و عربی عناصر سے اور ہندی زبان ان چیزوں سے جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں محروم کر دی جائیں تو دونوں کے ادب و شاعری پر زوال آ جائے گا دونوں محض قصہ کہانیوں کی زبان بن جائیں گی۔ دونوں کی تگ و دو صرف پنگھٹ میکے اور سسرال کی باتوں اور ساس نند کی شکایتوں تک محدود ہو جائے گی ان میں اعلیٰ علمی ادبی و تنقیدی مضامین کے بیان اور باریک صوفیانہ فلسفیانہ و حکیمانہ نکات کے اظہار کی مطلق صلاحیت باقی نہ رہے گی۔

ہندوستان میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو محض ادب کو سیاست کا میدان تصور کرتے ہیں وہ ہندوستان کی مختلف النسل قوموں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے ایک مشترکہ زبان کا وجود ضروری سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مشترکہ زبان (لنگوا فرنیکا) اس وقت تک معرضِ وجود میں نہیں آ سکتی جب تک ہندوستان کی دو حریف زبانیں یعنی اردو اور ہندی اپنی غیریت و اجنبیت دور کر کے ایک دوسرے سے معانقہ نہ کریں لیکن دونوں کے لئے بغیر اپنی اپنی خصوصیات ترک کئے ہوئے اس کی تکمیل محال ہے علاوہ بریں ان کو آپس میں معانقہ کرنے کے لئے اس پست سطح پر اترنا پڑے گا جیسے مبتذل سوقیانہ سخیف اور بازاری کہتے ہیں شاطر و چالاک ہندی جانتی ہے کہ اتحاد و اتفاق کا خوش آئند خیال اس نفاقستانِ ہند میں کبھی شرمندۂ عمل ہونے والا نہیں اس لئے وہ سنسکرت آمیز موقف سے ایک قدم پیچھے ہٹنا بھی گوارا نہیں کرتی لیکن سادہ لوح اردو کو مشترکہ زبان بننے کا سبز باغ دکھا کر اس امر پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شاندار ایرانی مخمل میں دیسی ٹاٹ کا پیوند لگا لے اسی قسم کی ایک ہلاکت بار کوشش کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت نیاز فتحپوری فرماتے ہیں کہ ہندی تو اپنے "رتی ماسک پتریکا" کے اونچے سنگھاسن سے ایک انچ بھی نیچے نہ اتری لیکن بیچاری اردو "کونسہ ماہی" کا عالیشان کاخ چھوڑ کر "تماہی" کے نحس خانہ میں منتقل ہونے پر مجبور کیا گیا اہل زبان چلاتے ہی رہ گئے کہ اردو کی لسانی خصوصیات کے لحاظ سے یہ جدتِ ترکیب بہت بڑی بدشگونی ہے اگر ایسی انوکھی ترکیبیں جاری رہیں تو تین ہی مہینہ کے بعد اردو کا جنازہ نکل جائے گا تماہی کے معنی چہ ماہی کے قیاس پر وہ رسوم ہونگے۔ جو کسی کے مرنے کے تین مہینے کے بعد ادا کئے جائیں یہ مثال ہر اس حقیقت کی کہ کس طرح فارسی کی لطیف و خوشنما ترکیبیں معمولی خیال کو نہایت بلند کر دیتی ہیں لیکن دیسی یا ہندی آمیز ترکیب بلند

معنی کو پست و سخیف بنا دیتی ہے بات یہ ہے کہ فارسی عنصر ترک کر دینے اور دیسی چیزیں قبول کرنیکی صلاح دینا تو نہایت آسان کام ہے لیکن اس پر کاربند ہو کر کوئی اعلیٰ ادبی تنقیدی علمی یا فنی کارنامہ پیش کرنا ناممکن ہے۔ تماہی "والی زبان میں بڑی کوششوں اور جانکاہیوں سے صرف قصہ کہانی یا مختصر افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔

بزم ادب میں اصول سیاست رائج کرنے والوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ایک مشترکہ زبان اختیار کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں کہ اردو یا ہندی کو اس کی اعلیٰ علمی و ادبی منزل سے نیچے کھینچ کر عام بازاری سطح پر پہنچا دیا جائے تاکہ ملک کی کثیر آبادی اسے سمجھ سکے اور صرف لین دین کے معاملات میں اسے استعمال کرے اول تو ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں مختلف نسلیں اور مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور مختلف بولیاں بولتے ہیں ایک مشترکہ زبان کا خواب دیکھنا ہی بے سود ہے بنگالی۔ اڑیا تلنگی ملیالم تامل کنڑی مرہٹی بولنے والی قوموں نے کبھی اردو یا ہندی کو بطور مشترکہ زبان کے اختیار کرنے کے لئے آمادگی ظاہر نہیں کی ہے۔ صرف شمالی ہند کو بعض صوبوں ہی میں ایک مشترکہ زبان کا خواب دیکھا جاتا ہے ریاست حیدرآباد کی بات ہی اور ہے یہاں اردو کو سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے یہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے ہر قوم اور ہر فرقہ کا پڑھا لکھا شخص عام اس سے کہ اس کی مادری زبان مرہٹی ہو یا کوئی اور ڈری زبان اردو سے واقفیت رکھتا ہے اگر کل ہند کے لئے ایک مشترکہ زبان کا قیام ممکنات سے ہو بھی تو یہ کیا ضرور ہے کہ پہلے اردو ہی کو آزمائشوں میں پھنسا کر اس پر قطع و برید کا عمل شروع کر دیا جائے ہندی بھی تو اردو کی سب سے زبردست حریف ہے اسے سنسکرت کے عناصر سے پاک کر کے نیچی سطح پر لانے اور مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی۔ دوسری قومیں ہوشیار اور دور اندیش ہیں۔ وہ کسی ناممکن العمل فرضی و خیالی بات کی تکمیل کے لئے اپنی زبان کی صورت و ہیئت بگاڑنا پسند نہیں کرتیں حامیان ہندی کا بلند حوصلہ ہندی کو اس کی تمام خصوصیات قائم رکھ کر ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتا ہے لیکن اردو کے سادہ لوح علمبردار اپنی زبان کو مشترکہ زبان بنانے کی امنگ میں اس کی تمام امتیازی خصوصیات سے دست بردار ہو جانے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔

مشترکہ زبان کے قیام کے متعلق ہمارے سامنے امریکہ کی بہترین مثال موجود ہے جس سے اہل ہند ہدایت و بصیرت حاصل کر سکتے ہیں جب امریکہ دریافت ہوا تو مختلف یوروپی ممالک کی فاضل آبادی جو زیادہ تر غربا پر مشتمل تھی تلاش روزگار میں جوق در جوق وہاں جا بسی بعض امرا بھی امریکہ جا کر اس لئے آباد ہو گئے۔ کہ ان کے مہماتی شوق کے لئے وہاں وسیع میدان عمل موجود تھا۔ الغرض یہ لوگ اپنے اپنے دیس کی بولیاں بولتے تھے۔ مرور زمانہ جب ان کو ایک متحدہ قوم بننے کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے مقدس لہو سے آزادی خریدی۔ تو ان کو ایک مشترکہ زبان کی بھی ضرورت پیش آئی لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی بھانت بھانت کی بولیوں کے اختلاط و آمیزش سے کھچڑی تیار نہیں کی بلکہ انگریزی جیسی مہذب ترقی یافتہ زبان کو مع اس کی قدیم روایات تلمیحات اور نحوی و عروضی اصول کے اپنی مشترکہ زبان تسلیم کر لیا اور سب نے متحد ہو کر اس کی ترقی کے لئے انہیں قواعد و ضوابط کے مطابق کوشش شروع کر دی جن پر خود اہل انگلستان کاربند تھے اگر اہل ہند بھی محض دکھاوے

کے لئے نہیں بلکہ خلوص و دیانت کے ساتھ ایک مشترکہ زبان اختیار کرنا چاہتے ہوں تو اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی میں یوں زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو پھر ان کا فرض ہوگا کہ وہ اس منتخبہ زبان کی ترقی کے لئے متحدہ طور پر انہیں اصول و قوانین کے مطابق کوشش کریں جو اس کی فطرت ساخت اور طبیعت سے میل کھاتے ہوں یعنی اگر وہ ہندی کو مشترکہ زبان قرار دیں تو اس کے ارتقاء و ترقی کے لئے سنسکرت ہی کا سہارا ڈھونڈیں۔ اور اگر اردو کو مشترکہ زبان بنائیں تو اس کے علمی و ادبی خزانہ کو بڑھانے کے لئے اس کی عادت۔ فطرت۔ ہیئت و صورت کے مدِ نظر عربی و فارسی سے استفادہ کریں۔ اور اس کی شاندار روایات و تلمیحات کو برقرار رکھیں۔

بعض حضرات کو "خالص اردو" لکھنے کا خبط سمایا ہوا ہے۔ "خالص اردو" کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے۔ کہ کلام میں کہیں فارسی عربی یا ترکی لفظ نہ آنے پائے۔ اس لزوم مالایلزم پر مذاقِ سلیم اپنی ہنسی روک نہیں سکتا۔ "خالص اردو" نتیجہ کے لحاظ سے کوہ کندن و کاہ برآوردن کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ بعض وقت تو وہ نہ اردو نظر آتی ہے نہ ہندی اور اس پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ "دھوبی کے کتے بن گئے: گھر کے نہ گھاٹ کے" اس قسم کے کلام کے لئے کوئی اصطلاح بھی ہندی وضع کی گھڑنی چاہئے تھی۔ یہاں "خالص" لفظ عربی اور "اردو" لفظ ترکی ہے۔ علاوہ بریں ایسی زبان کو جو عربی و فارسی الفاظ سے بالکل معرّا ہو "خالص اردو" سے نامزد کرنا اردو زبان کی پیدائش اور تاریخ ارتقا سے ناواقفیت و عدم آگاہی کا پتہ دینا ہے کون نہیں جانتا کہ اردو زبان عربی فارسی ترکی ہندی الفاظ کے اختلاط سے معرضِ وجود میں آئی ہے خالص زبان اسی کو کہتے ہیں۔ جو اہلِ زبان بولتے ہیں اردو کے اہلِ زبان بغیر کسی تکلف و تصنع کے جو بولی بولتے ہیں وہی "خالص اردو" ہے اور تکلف و تصنع اور اہتمام و التزام کے ساتھ جو زبان استعمال کی جائے۔ وہ غیر خالص ہے ہر شخص جانتا ہے کہ اردو کے اہلِ زبان عام بول چال میں سینکڑوں عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کا تو کچھ کہنا نہیں وہ کلام میں حسن و خوبی اور کشش و اختصار پیدا کرنے کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے وہ روزمرہ کی بول چال اور عوام کی روش و محاورہ سے بہت بلند ہوتا ہے وہ کلام میں رفعت طرفگی لطافت اور جذب و اثر پیدا کرنے کے لئے عربی و فارسی کے شاندار و پُر معنی الفاظ اور لطیف و دلپذیر ترکیبیں استعمال کرنے پر مجبور ہے ہندوستان میں صدیوں تک فارسی کا اقتدار و تسلط قائم رہنے کی وجہ سے دیسی زبانوں کو بھی اپنا دامن جبراً کشادہ کرکے بہتیرے عربی و فارسی کے الفاظ قبول کرنے پڑے ہیں ایسی صورت میں "خالص اردو" سے عربی و فارسی الفاظ کا اخراج سخت مضحکہ خیز امر ہے انکے بغیر کلام ویسا ہی بے مزہ ہوگا جیسا طعام بے نمک ہر شاعر تو جذبات و حسیات کو مشتعل کرنے کے لئے ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے جو روش عام سے بلند تر ہو لیکن "خالص اردو" کے موجد کی عجیب و غریب ہنیت روزمرہ کے الفاظ و محاورات سے بھی دست بردار ہو کر پست و مبتذل زبان اختیار کرتی ہے۔ اور شاعری کو لزوم مالایلزم کا پابند کرکے ایسے مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ نام نہاد "خالص اردو" میں ابھی تک انشا پردازی کا کوئی اعلیٰ نمونہ پیش نہیں ہوا ہے۔ اس طرز خاص کے موجد نے وقتاً فوقتاً صرف دو تین صفحوں کے مضمون تحریر کئے ہیں جن میں نگھٹ سسرال۔ میکے ساس۔ نند۔ شادی۔ بیاہ موتے وغیرہ سے متعلق پرانی اور فرسودہ باتیں درج ہیں اسی طرح ان کی نظموں میں بھی بجز پست۔ مبتذل اور سوقیانہ خیالات کے کبھی اعلیٰ تخیل یا لطیف جذبہ کے

نمونے دیکھنے میں نہیں آتے، یہ مسلمہ امر ہے کہ فارسی کی دلآویز ترکیبیں بہن شعر کو آسمان بنا دیتی ہیں لیکن "خالص اردو" کا شیدائی بلند سے بلند خیال کو اپنے سخیف و مبتذل الفاظ کے ذریعہ سے تحت الثریٰ تک گرا دیتا ہے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اگر "مشک" کے بدلے "ڈولچی" اور "زحمت" کے عوض "کھکھیڑ" کا لفظ باندھا جائے تو شعر کس قدر بے کیف پھیسا اور مضحکہ خیز بن جائے گا بہر حال "خالص اردو" لکھنے کی کوشش کسی سیاسی یا معاشری مصلحت پر مبنی نہیں ہے جیسا کہ موجد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ محض جدت و طرفگی کی خواہش اس عجیب و غریب طرز کی محرک ہے لیکن اس طرفگی اور انوکھے پن کے لئے جس قدر خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے وہ نتیجہ کے اعتبار سے حرف کوہ کندن و کاہ برآوردن کا حکم رکھتا ہے۔ فارسی کے بعض قدیم یاوہ گو شعرا بھی جدت اور طرفگی کے خبط میں اپنے اوپر مہمل پابندیاں عائد کرتے تھے۔ کوئی اپنے کلام میں صرف غیر منقوط الفاظ کا التزام کرتا کوئی صرف نقطہ دار حروف لانے کی فکر میں رہتا کوئی ایک حرف نقطہ دار اور ایک بے نقطہ استعمال کرتا۔ کوئی صرف ایسے حروف لانیکی کوشش کرتا جن کے اوپر ہی نقطے ہوں کوئی اس کے برعکس نیچے نقطہ والے حروف استعمال کرنے میں منہمک رہتا اس قسم کی مہمل اور دقت کش پابندیوں کا شمار صنائع لفظی میں ہوتا تھا۔ اور ان کے لئے شاندار اصطلاحیں گھڑی گئی تھیں مثلاً منقوط۔ مہملہ۔ رقطا۔ خیفا۔ فوق النقاط۔ تحت النقاط۔ مقطع موصل واسع الشفتین و اصل الشفتین متلون۔ منقوص۔ توشیح وغیرہ ان غیر ضروری پابندیوں کی وجہ سے اظہار خیال میں جو رکاوٹیں پیش ہوتی ہیں، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں لزوم مالا یلزم کی مہمل صنعتوں میں "خالص اردو" کی صنعت ایک جدید اضافہ ہے جس شاعر کو قدرت کی جانب سے طبع رواں کی دولت عطا نہیں ہوتی وہ اسی قسم کی مہمل صنعت گری کو جودت طبع کی علامت سمجھ لیتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے اسی قماش کے شاعر کی نسبت حافظ علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا کہ "صنعت گر است آنا طبع رواں ندارد" موجودہ زمانہ کا نقاد ایسے مہمل و بیکار صنائع و بدائع کو شاہد سخن کے رخ زیبا کا خال نہیں بلکہ بدنما مسّہ قرار دیتا ہے "خالص اردو" بھی رخسار ادب کا بدنما مسّہ ہے اس میں نہ افادت کا کوئی پہلو ہے نہ مشاطگی کا "خالص اردو" کا سودا جس قدر جلد دور ہو اتنا ہی بہتر ہے۔

خاتمہ سخن پر سرمایۂ ملکی کے حامیوں سے ہماری التماس ہے کہ وہ اردو زبان کو قدرتی اصول کے مطابق ترقی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔ وہ خود بخود ان چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لے گی جنہیں اس کی طبیعت قبول کرتی ہے عام اس سے کہ وہ دیسی ہوں یا بدیشی ملکی ہوں یا غیر ملکی۔ مقامی ہوں یا غیر مقامی جو چیزیں اس میں جذب و تحلیل ہو کر اس کا جزو بدن بن جائیں گی وہ اس کا ذاتی سرمایہ کہلائیں گی۔ زندہ زبان ساکن و جامد شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ روز بروز ترقی کرتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اردو زبان میں بھی ترقی و اضافہ کی بہت گنجائش ہے لیکن اس میں صرف دیسی چیزیں ٹھونس دینے کا نام ترقی نہیں ہے نئی چیزیں خواہ دیسی ہوں یا بدیسی ایسی ہونی چاہئیں جن سے کلام کی لطافت پاکیزگی اور رنگینی میں فرق نہ آنے پائے اگر اردو شاعری ایک طرف اکشے بٹ کلپ برکش کھکھیڑ ڈولچی سمجھوتہ وغیرہ کی ثقالت برداشت نہیں کر سکتی تو دوسری جانب اس کی نزاکت کو ملتفت کارانہ طرز۔ گداختگی شعار ملائمت آمیز لبہائے شفا پاش۔ تقدیس استحکام۔ ترنم سیمیں۔ رقص حیا بار وغیرہ جیسی نادر ترکیبوں کی گرانسنگی بھی گوارا نہیں غرض کہ اردو شاعری کو نہ دیسی چیزوں سے نفرت ہے نہ بدیسی اشیا سے بلکہ اسے نفرت ہے ان چیزوں سے جو اس کی فطری نزاکت اور طبعی

لطافت کے خلاف ہوں وہ ان اشیا سے پرہیز کرنا چاہتی ہے جن سے اس کو روگ لگ جانے کا اندیشہ ہے صحت بخش ہندی عناصر کا وہ ہر وقت خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا دامن تعصب و تنگ نظری کے دھبوں سے پاک ہے ابتدا ہی سے وہ نہایت فراخ دلی و کشادہ جبینی کے ساتھ عربی فارسی ترکی برجی ہندی پرتگالی اور انگریزی چمنستان کے پھولوں کو حسب ضرورت اپنے دامن میں جمع کرتی رہی ہے البتہ کانوں سے دامن بچانا اس کا قدیم شعار ہے اس کے خرمن میں دیسی ذخیرہ کی کمی نہیں لیکن جو ملکی چیزیں اس کے پہلو میں خار بن کر کھٹکیں ان سے کنارہ کشی ہی مناسب ہے اس کی نظر دیسی اور بدیسی کے امتیاز سے بہت بلند ہے اس کا خزانہ بے شمار جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ان کی حقیقی قدر و قیمت سے واقف ہے سرمایۂ ملکی کے حامی دیسی جواہر کو گرانقدر اور بدیسی کو کم از خیال کرتے ہیں لیکن اردو شاعری کی نظر بلند ہے۔ وہ پچ اور پاسداری سے کسی شے کی قیمت نہیں لگاتی۔ اس لئے وہ حامیان سرمایۂ ملکی کے معیار قدر دانی کو غلط سمجھتی ہے وہ دیسی خزفریزوں کو بدیسی جواہرات پر محض ملکی ہونے کی وجہ سے ترجیح نہیں دے سکتی اور نہ دونوں کو ہم پلہ تصور کر سکتی ہے! ابن الوقتی و مصلحت کوشی ہزار چلاتی رہے کہ دیسی چیزوں سے بھی اپنی محفل سجاؤ اور شاندار غیر ملکی کارناموں کے پہلو میں بودی اور پست ملکی کارگذاریوں کو بھی جگہ دو لیکن اردو ادب و شاعری کی انصاف پسند طبیعت مصلحت وقت سے مغلوب نہیں ہوتی۔ وہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے پہلو بہ پہلو بٹھانے سے صاف انکار کر دیتی ہے اس کی اس نصفت شعاری مردانگی اور بے تعصبی کے مد نظر سرمایۂ ملکی کے مصلحت کوش حامیوں سے ہماری آخری گذارش ہے کہ وہ اردو ادب و شاعری پر رحم کریں اسے سبحہ و زنار کی کشمکش سے باہر رکھیں کسی سیاسی معاشرتی یا قومی و سماجی مقصد کے در پردہ اس کی شعریت رنگینی لطافت اور دلکشی کا خون نہ کریں اور حضرت جوش کی نصیحت کان دھر کر سنیں ؎

بہر خوشنودیٔ اغیار یگانوں کو نہ چھیڑ
صرف اپنے پہ جو چلتی ہے وہ تلوار نہ بن

محمد حسین ادیب

تم عزت و خودداری پر یقین نہ کر سکو گے۔
جب تک تم خود اسے حاصل نہ کر لو گے۔
اپنے آپ کو پاکیزہ و خوش دل بنائے رکھو۔
تم وہ دریچہ ہو جس میں سے تم دنیا کو دیکھتے ہو۔

قربانی بعض لوگوں کو بہت پسند ہے کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ بغیر قابلیت کے مشہور ہو جاتے ہیں
(برنارڈ شا)

غزل

اُس نے گو بات نہ مانی میری
سُن تو لی رام کہانی میری

اُس نگاہِ غلط انداز سے پوچھ
خلشِ دردِ نہانی میری

تجھ کو مجبورِ وفا کر دے گی
مری آشفتہ بیانی میری

میں کہ ہوں کشتۂ بے مہریِ دوست
ہے غزل مرثیہ خوانی میری

نہ امنگیں ہیں نہ امیدیں ہیں
کیا جوانی ہے جوانی میری

نازِ پروردۂ ناکامی ہے
تپشِ سوزِ نہانی میری

میں ہوں گم گشتۂ راہِ الفت
بے نشانی ہے نشانی میری

سرورؔ! اے محوِ فغانی! اظالم
ہے غزل رشکِ فغانی میری

سروری

غزل

کیا بتلائیں تم کو، عاشق کیوں کُڑھتے کیوں روتے ہیں؟
ان غم کے ماروں کو صدمے ایسے ہی کچھ ہوتے ہیں

کروٹ بدلی آہیں کھینچیں اٹھ بیٹھے پھر لیٹ رہے
اپنی تو شب یوں کٹتی ہے سونے والے سوتے ہیں

دیکھ آئے تصویر بنائی بھولے کچھ، پھر دیکھ آئے
اب تو کام یہی پکڑا ہے وقت اسی میں کھوتے ہیں

سر پھوڑیں یا جان گنوائیں ملنا اُس کا مشکل ہے
اور کریں کیا مجبوری ہیں بیٹھے دل کو روتے ہیں

کاش کسی دن تم بھی دیکھو کیا حسرت کا وقت ہو وہ
جب ہم صبح کو اٹھ کر پہلے منہ اشکوں سے دھوتے ہیں

کیا کیجے کچھ بس نہیں چلتا، دلجوئی کا کام نہیں
تیری حالت سُن کے سیفیؔ دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں

سیفی نوگانوی

احساسِ اُلفت

پیاری تو حسین ہی نہیں تو میرے لئے ایک حیرت ہے۔
کیونکہ جب میں تیری آنکھوں کو دیکھتا ہوں
تو میرے سامنے کنول کے دو ایسے تالاب آجاتے ہیں
جنہیں میں نے اپنی کسی گذشتہ زندگی میں اکثر دیکھا ہے
جب تو اور میں باہم ان میں تیرتے تھے
دو راج ہنسوں کی طرح ہنستے اور گاتے!

~~~

پیاری، تو حسین ہی نہیں تو میرے لئے ایک حیرت ہے۔
کیونکہ جب میں تیرے گلاب رخ کو دیکھتا ہوں
تو میری آنکھوں سے اس مادی زندگی کے پردے ہٹتے جاتے ہیں
اور میں تجھے ازل سے اپنا رفیق پاتا ہوں!

~~~

پیاری تو حسین ہی نہیں، تو میرے لئے ایک حیرت ہے
کیونکہ زمانے گذرے جب سے تیری اور میری محبت پہاڑوں کو چیرتی ہوئی
ایک صاف شفاف چشمے کی طرح بہتی ہے!
معلوم نہیں کب سے تیری اور میری محبت کا یہ رشتہ قائم ہے۔
اور کس جاودانی دنیا میں یہ ہمیں لئے جا رہا ہے!

ہندی ~~~ منصور احمد

میرے محبوب، میرے دوست!
دنیا کے لئے تو کچھ بھی ہو
میرے لئے تو ایک بالاتر ہستی ہے ــــــ
کیونکہ جب تو مسکراتا ہے، تو میری آنکھوں میں ہزاروں ستارے چمکنے لگتے ہیں۔
اور میرے تاریک گھر کا کونا کونا روشن ہو جاتا ہے

میرے محبوب، میرے دوست!
دنیا کے لئے تو کچھ بھی ہو
میرے لئے تو ایک بالاتر ہستی ہے ــــــ
کیونکہ جب تو گاتا ہے تو آسمانی راز
میرے سامنے ایک ایک کر کے کھل جاتے ہیں!

میرے محبوب، میرے دوست!
دنیا کے لئے تو کچھ بھی ہو
تو میری زندگی کا آفتاب ہے، میری قسمت کا ستارا!
کیونکہ جب تو مجھے ہاتھ لگاتا ہے
تو خدا کے گھر کے مینار کی روشنی میری آنکھوں میں چمکنے لگتی ہے۔

ہندی ــــــ منصور احمد

لاٹری

(ایک کشادہ مکان ہے جس میں بہت سے افراد بیٹھے ہیں اگرچہ ان سب میں بظاہر کوئی تفریق نہیں مگر بہ غور دیکھنے سے
ہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں ایک فریق کے کپڑے دوسرے فریق سے قدرے کم قیمت اور زیادہ گھسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
یک ادھیڑ عمر کی عورت کو امی جان کہہ کر پکارتے ہیں جو ایک کپڑا سی رہی ہے ان سب کی آپس میں ایسی بے تکلفی ہے کہ یہ ایک
کے معلوم ہوتے ہیں دوسری طرف ایک نوجوان لڑکا ہے جو بوسکی کا قمیص پہنے ہوئے ہے جن لوگوں سے وہ ہم کلام ہے تو وہ بھی لباس کے
ے اول الذکر فریق سے زیادہ ممتاز ہیں ایک چھوٹا لڑکا داخل ہوتا ہے)

لڑکا۔ سلام علیکم۔

امی جان۔ وعلیکم السلام۔ ظہیر آج اتنی دیر سے
اسکول تو کبھی کا بند ہو گیا ہوگا۔

ایک لڑکی۔ امی جان یہ بازار میں کھیلتا رہتا ہے
سے کچھ نہیں کہتیں۔

لڑکا۔ آپا صغرا تم ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہو
ے دیر سے آیا ہوں (بستہ تخت پر رکھتے ہوئے) روز تو
دی آجاتا ہوں۔

صغرا۔ پرسوں کیا ہوا تھا پانچ بجے گھر پہنچا تھا۔
ر کل صبح نو بجے ہی سکول چلا گیا تھا۔ تو نہیں کسی کا کہا

ایک بڑی لڑکی۔ صغرا تو بھی تو ہر وقت اس کے
کا ہار ہوئی رہتی ہے کیوں ظہیر آج کیوں دیر ہو گئی؟

ظہیر آپا جان یونہی سکول ہی دیر سے بند ہوا تھا
ہمارا ایک ماسٹر جو ہمیں ڈرائنگ پڑھاتا ہے اس کا اخیر کا گھنٹہ
تھا وہ ہمیں باتیں سناتا رہا لاٹری کے متعلق کہتا تھا۔

آپا جان۔ کیا لاٹری کے متعلق؟

ظہیر کہتا تھا کلکتہ میں ایک لاٹری جو نکلتی ہے گذشتہ
سال اس میں ایک چھٹی جماعت کے لڑکے کے نام ایک لاکھ روپے نکلے
اور پرسال ہی ایک کوچوان تھا اسے پچاس ہزار روپے ملے

صغرا۔ پچاس ہزار روپے؟

امی جان۔ ارے یہ لوگ یونہی گپیں ہانکتے رہتے ہیں
لاکھ اور ہزار سب دھوکا ہے۔

آپا جان۔ نہیں امی جان بالکل دھوکا تو نہیں ہوتا ہوگا
یہ باتیں ہمارے سکول میں بھی ہوتی تھیں میرا تو خیال ہے شاید وہ اخبار
میں چھاپ دیتے ہیں اور پھر یہاں کیا سنا ہے ولایت میں تو ہر ملک
میں بڑی بڑی لاٹریاں نکلتی ہیں۔

امی جان۔ تو اپنے نام آپ ہی نکال لیتے ہونگے ہم نے
تو کبھی اپنے جاننے والوں کے نام کچھ نکلتا نہ دیکھا۔

صغرا۔ امی جان یہ کیسے ہو سکتا ہے لوگ کچھ جانتے

ہی ہونگے جو لاٹری ڈالتے ہیں

امی جان۔ خاک جانتے ہیں یہ جو لاٹری دلی میں نکلی تھی۔ پارسال اس میں ثریا کے اباجی نے سُنا ہے پانچ پانچ رُپے کے پانچ نام ڈالے تھے ایک بھی نہ نکلا۔

ظہیر: مگر امی جان کسی کا نام تو نکلتا ہے یہ جو کوچوان کے نام پچاس ہزار اور اس لڑکے کے نام ایک لاکھ روپیہ نکلا تھا اس میں کہاں دھوکا تھا چچا اکرم سے پوچھ لیجئے۔

امی جان، (صحن کے دوسرے کنارے بیٹھے ہوئے پوسٹ پوش کو مخاطب کرکے) کیوں اکرم تمہیں معلوم ہے یہ لاکھ رُپے اور پچاس ہزار روپے کی لاٹریوں کا؟

اکرم: بھابی جان سنتا ہوں کہ انگلینڈ میں روز کسی ٹائپسٹ یا کسی موٹر ڈرائیور یا کسی مزدور کے نام دس ہزار پونڈ کبھی پانچ ہزار پونڈ نکل آتے ہیں۔

ظہیر: دیکھا میں نہ کہتا تھا.....

صغرا۔ اچھا چپ رہ.......

امی جان۔ تم کبھی بات بھی کرنے دیا کرتے ہو (خود اکرم سے) ان کے ملک میں مزدوروں کے نام نکل آتے ہونگے۔ یہاں میں نے تو کبھی سنا نہیں۔

اکرم۔ نہیں نہیں یہاں بھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے مگر یہاں لاٹریوں میں لوگ۔ دھوکے بہت کرتے ہیں کئی دفعہ تو داخلے کے روپے ہضم کر جاتے ہیں لاٹری کا نشان تک نہیں ہوتا

آپا جان۔ واقعی یہاں کے لوگ بہت کمینے ہوتے ہیں

اکرم۔ درحقیقت یہاں کے لوگوں میں تجارتی دیانتداری نہیں ہوتی ہر شہر میں لاٹریاں کھول بیٹھتے ہیں اگر کسی کے نام نکل بھی آئے تو اسے اصل سے بہت کم دیتے ہیں میں نے ایسے کئی قصے سنے ہیں

ظہیر: مگر چچا جان ماسٹر کو کہتا ہے کہ ایک مہینے میں ایک بہت بڑی لاٹری دہلی سے نکلنے والی ہے بڑے بڑے لوگ اس میں ٹکٹیں لے رہے ہیں۔

اکرم۔ شاید مگر میں نے اخبار میں اس کا ذکر نہیں پڑھا اور ہو آج صبح سے میں نے اخبار بھی تو نہیں دیکھا صبح کا گیا گیا اب آیا ہوں (اپنی طرف) رشیدہ ذرا اخبار تو اٹھا لانا۔

ظہیر: امی جان میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہم بھی لاٹری ڈالیں۔ شاید نکل آئے۔

امی جان۔ ارے جانے دے۔ تُو تو ہر مصلحہ پیلا مُور تہ ہے۔

صغرا۔ امی جان کیا پتہ ہے نکل ہی آئے۔

آپا جان۔ مجھے تو کوئی امید نہیں لاکھوں آدمی ڈالیں گے ہمارے ہی نام نکلے گی کیا؟

ظہیر۔ تو آپا جان کسی کے نام نکلے ہی گی نا اس کوچوان کے نام بھی نکل ہی آئی تھی۔

امی جان (آہستہ سے) وہ تو الگ بات ہے روپے کوئی مفت تھوڑے مل رہے ہیں اپنے خرچ تو پورے ہوں۔ لاٹری کی بھی دیکھی جائے گی۔

اکرم۔ ٹھیک ہے بھابی جان یہ دہلی سے واقعی لاٹری نکلنے والی ہے۔ فقط دو روپے ٹکٹ ہے لکھا ہے یہ بڑے اہتمام سے نکلے گی سرکاری بنک کے ماتحت ہوگی میرا خیال ہے یہ لاٹری شاید ٹھیک ہی ہو۔

امی جان۔ اکرم ان کا کوئی اعتبار نہیں پھر لاکھ آدمی اگر لاٹری ڈالیں تو لاکھ میں سے ایک اتفاق ہو سکتا ہے

کہ تمہارا نام نکل آئے فقط روپے ضائع کرنے ہیں۔

اکرم۔ مگر لوگوں کے نام نکل بھی تو آتی ہے یہی ظہیر جو
کہہ رہا تھا آخر کوچوان اور اس غریب طالبعلم نے ٹھیکہ تو نہیں
لے رکھا تھا یونہی اتفاق ہے نکل ہی آئی میں نے بھی آجتک
لاٹری نہیں ڈالی۔ اس دفعہ ڈال دیتے ہیں دو روپے ہی ہیں نا
کوئی پروا نہیں

امی جان۔ ہوں!

صغرا۔ امی جان

امی جان۔ !

صغرا۔ امی جان!!

امی جان (کپڑا سیتے ہوئے) ہوں!

صغرا۔ امی جان چلو ہم بھی ڈال ہی دیتے ہیں
کیا حرج ہے۔

آپا جان۔ صغرا تجھے کیا ہو جاتا ہے کہہ جو دیا کہ
نہیں ڈالیں گے بس رٹ لگائے جائیگی۔

ظہیر۔ مگر آپا جان ذرا دیکھو تو سہی اس غریب لڑکے
کے نام نکل ہی آئی تھی اتنے روپے آخر!

امی جان۔ تو ایک دفعہ نکل آئی تھی کہ روز روز غریب
لڑکوں کے نام ہی نکلتی آئیگی۔

صغرا۔ کیا پتہ ہے امی جان بس اس دفعہ ہی سہی
دیکھو نا شاید! کیا پتہ ہے۔

امی جان۔ تو روپے کہاں سے نکالوں ابھی ظہیر
کی فیس دینی ہے۔ تیرے پاؤں میں جوتی نہیں تیری چچی اپنے
روپے الگ مانگتی ہے روپے ہوں تو انہیں نہ دیئے جائیں

ظہیر! امی جان میرے پاس آٹھ آنے جمع ہیں
اس میں ڈیڑھ روپیہ اور ملالو بس دو ہو جائیں گے۔

صغرا۔ امی جان سچ مچ، میرے پاس خود تیرہ آنے
جمع ہیں میں نے عید کے پیسے بھی خرچ نہیں کئے تھے سب
جمع کر رکھے ہیں ایمان سے، امی جان دیکھئے کتنے ہوئے
ایک روپیہ، ایک روپیہ اور پانچ آنے بس گیارہ آنے اور چاہئیں

آپا جان۔ کیوں امی جان یہ تو کتنے ہی پیسے ہوگئے

امی جان۔ رہنے دے تو بھی زہرا۔ تیرا بھی دل کیا
ہوگا اتنی مصیبت سے تو انہوں نے پیسے جمع کئے ہیں اور
یوں لاٹری میں ضائع کر دوں۔ لا تو صغرا میں خود ایک روپیہ
ڈال کے تجھے دو پورے دو روپے کے سلیپر ہی لے دوں۔

صغرا۔ واہ امی جان! میں کیوں اپنے پیسے دوں
پچھلی دفعہ بھی آپ نے میرے پیسے لے کر مجھے وہ چمکا دیا
تھا میں نہیں دیتی سب کو تو آپ لے دیں اور میرے سلیپر
میرے پیسوں سے۔ میں نہیں دیتی

امی جان۔ دیکھا نا! لاٹری پر ضائع کرے گی
یوں نہیں خرچ کر لیتی۔

اکرم (اُدھر سے) کیوں بھابی جان کیا ارادہ ہے
ڈالیں گی یا نہیں

امی جان۔ کہاں اکرم روپے کہاں ہیں۔

اکرم۔ تو اس میں بہت سے روپے تو نہیں چاہئیں
فقط دو روپے ڈال دیجئے۔ دو روپے کیا ہیں۔

امی جان ہاں ہاں ہے تو کچھ نہیں مگر اس وقت
پاس ہی نہیں۔

ظہیر۔ چچا جان ذرا ان سے کہہ دو۔ یہ تو مانتیں
ہی نہیں دو روپے ہی ہیں نا۔ ہوا کیا؟

صُغرا۔ امی جان چلو ڈال دو (آہستہ سے) کُل
بارہ آنے ہی کی کمی ہے آپا جان سے لے لیجئے ان کے پاس
تو بہت کچھ ہے
زہرا۔ چل ری بہت کچھ کی خالہ میرے پاس کہاں سے آیا
امی جان۔ زہرا کیوں ایسا تلخ بولتی ہے۔
زہرا۔ تو امی جان میرے پاس کونسے روپے پیسے
ہیں آپ جانتی ہیں کُل سوا دو روپے تھے وہ آپ نے آج پانچ
دن ہوئے لے لئے تھے۔ تو میرے پاس کونسا خزانہ باقی
رہ گیا۔
امی جان۔ تو وہ تجھ سے چھوٹی ہے ذرا نرمی سے کہہ دیا ہوتا
زہرا۔ نرمی سے وہ ماننے والی ہے! صورت تو دیکھو۔
ظہیر۔ چلو جانے دو آپا جان۔ اب گیارہ ہی آنے رہ
گئے ہیں بس امی جان ڈال دیجئے شاید آ ہی جائے۔ کتنے روپے
آئیں گے۔ توبہ! اتنے!!
صغرا۔ چلو امی جان میں روز کا پیسہ نہ لوں گی
آپ لاٹری ڈال دیں۔
ظہیر۔ اچھا امی جان میں بھی نہ لوں گا اب تو ڈال دو
زہرا۔ نہ لے گا اور تُو۔ تُو تو ایک کے دو لے کے
چھوڑے گا۔
ظہیر۔ نہیں آپا جان خدا کی قسم نہیں لوں گا۔
زہرا۔ اچھا قسمیں نہ کھایا کر۔
امی جان۔ بھئی تم نے تو ناک میں دم کر دیا ہے
(اکرم سے) اکرم کب ڈالو گے۔ یہ تو جینے نہیں دیتے۔
اکرم۔ اچھا تو بھابی جان۔ آپ بھی مان گئی ہیں
کل صبح ڈال دیں گے ضرور۔

دُوسرا دن شام

(وہی وقت اور سب کچھ ویسے ہی)

صغرا۔ امی جان مجھے تو یقین ہوتا جاتا ہے لاٹری
ہمارے نام ہی نکلے گی۔
امی جان۔ کیوں وہ کیسے؟
آپا جان۔ امی جان اس کی بھی سُنتی ہو جب سے
سکول سے آئی ہے دس دفعہ مجھ سے پوچھ چکی ہے لاٹری
ڈالی ہے کہ نہیں۔ لاٹری کب نکلے گی؟ پاگل ہے!
امی جان۔ تو زہرا کیا ہوا۔ آخر بچی ہے۔
زہرا۔ انہی آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔
ظہیر۔ (مدرسے سے ابھی ابھی آکر) امی جان!
امی جان!! ذری ادھر تو دیکھو جانے دو آپا جان کو اور
آپا صغرا کو ان کو تو اور کوئی کام ہی نہیں کس وقت لاٹری
بھیجی تھی؟ چچا جان نے خود ڈالی تھی؟
امی جان۔ ہوں....
صغرا۔ تو ظہیر یہ بھی پتہ ہے کہ کب نکلے گی؟
ظہیر۔ ماسٹر کہتا تھا کہ ایک مہینے کے اندر اندر
نکل آئے گی۔
صغرا۔ اف! ایک مہینہ!!
ظہیر۔ تو کیا ایک دن میں نکل آئے۔
صغرا۔ نہیں تو مگر.....
ظہیر۔ بس ایک مہینہ ہی تو ہے ایمان سے
اگر لاٹری نکل آئے تو میں تو ایک سائیکل خرید لوں اتنی
دور سکول جانا پڑتا ہے۔

صغرا۔ اب سکول دور ہو گیا۔ کیوں نہ ہو۔ موٹر کیوں نہ خرید لیں میں تو کہتی ہوں پہلے تو امی جان مجھے ایک اعلیٰ ڈرگابی لے دیں پھر میرے کپڑے سارے پھٹ گئے ہیں دو جوڑے ذرا اچھے بنا دیں باقی ایک آدھ معمولی ہی سہی

ظہیر۔ آپا صغرا کو دیکھنا امی جان ذرا۔ ہر وقت کپڑوں کی پڑی رہتی ہے اتنے کپڑے ہیں پھر بھی کپڑے ہی کپڑے ہیں تو یہ کہوں گا۔ کہ مرغیوں کے دڑبے جالی دار بنا لینے چاہئیں۔ خاں نے اپنے ڈربے ایسے بنائے ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھے۔

زہرا۔ بس ظہیر کو تو بطخوں کا، مرغیوں کا، کنکووں کا ہر وقت خیال رہتا ہے میں تو امی جان سے کہوں گی اگر شیا نکل ہی آئے جس کی کوئی امید نہیں۔ تو ایک مشین خرید لیں

امی جان۔ آج روپے تو بھیج دئے اب جب تک نام نہ نکلیں گے ان کے لئے اور کوئی کام نہ ہوگا۔

صغرا۔ تو امی جان کیا حرج ہے اگر نکل ہی آئے تو اس کمرے کی سفیدی ضرور کرا لینی چاہئے۔ اور ایک دری ہو

ظہیر۔ امی جان جب کبھی منظور مجھ سے ملنے آتا ہے تو ایمان سے ایک کرسی بھی نہیں گھر میں ہوتی اور چچا جان سے مجھے مانگتے شرم آتی ہے۔ میرا خیال ہے دو تین کرسیاں ہوں تو بہت اچھا ہے۔

امی جان۔ سب کچھ ہی ہو جائے جو لوگوں کا دینا ہے۔ وہ نہ دیا جائے۔ میں تو کہتی ہوں اگر نکل ہی آئے۔ تو جن جن کا دینا ہے انہیں دے دوں۔ پھر دیکھی جائے گی

زہرا۔ آپ بھی ان کی طرح خیال کرنے لگ گئیں کہ ضرور نکل آئے گی۔

ظہیر۔ تو آپا جان ایک انعام تھوڑا ہی ہوتا ہے کئی ہوتے ہیں۔ اول۔ دوم۔ سوم اور معلوم نہیں کتنے کوئی بھی نکل آئے تو کمال ہو جائے۔

صغرا۔ سچ مچ آپا جان ذرا سوچو تو سہی کمرا صاف ہو جائے، دری ہو جائے، مشین ہو جائے، قرض اتر جائے کپڑے بن جائیں، توبہ توبہ امی جان پھر تو جنت ہی بن جائے

ظہیر۔ امی جان آپا صغرا تو یونہی کہتی ہیں ان کا کیا ہے۔ ایمان سے سائیکل کی سخت ضرورت ہے سب سائیکلیں پرانے ہیں آج کل تو قیمت بھی کچھ نہیں۔

امی جان۔ اچھا اچھا اب کان مت کھاؤ دیکھا جائے گا۔

صغرا۔ امی جان میرا خیال ہے۔ رضائیوں کے لئے ایک ٹرنک ضرور لے لینا چاہئے۔ الگنی پر لٹکے رہنے سے خراب ہو گئی ہیں۔ آپ میرا لحاف اوپر ڈال دیتی ہیں بالکل خراب ہو گیا ہے۔

زہرا۔ کس طرح خراب ہو گیا ہے، اس پہ کمبل نہیں پڑا رہتا۔ اور پھر گاڑھے کی چادر۔

صغرا۔ تو کیا ہوا پھر بھی نچلے لحاف ایسے تو خراب ہی رہتا ہے۔ اور اب تو اس میں کچھ رہا بھی نہیں کتنے سال کا پرانا ہو گیا ہے۔ امی جان اگر میرا لحاف نیا بن جائے تو . . . .

امی جان۔ سبھی کچھ ہو جائے گا۔ مہینہ تو گذر لینے دو۔ کہ "سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا!

ظہیر۔ آپا صغرا اگر نکل آئے تو ایک گراموفون نہ لیں۔ کتنے کو آتا ہوگا؟

صغرا۔ پتہ نہیں کیوں امی جان کتنے کو آتا ہوگا؟

امی جان۔ معلوم نہیں۔ زہرا وہ تیری سہیلی مختار کے
ابا نے بھی ابھی لیا ہے کتنے کو لیا ہے؟
زہرا۔ وہ تو اسی روپے کا ہے بلیٹس ملا کے کہتے
تھے ڈیڑھ سو کو آجاتا ہے۔
ظہیر۔ تو کیا ہے لاٹری تو کئی ہزار کی نکلتی ہے۔
زہرا۔ چل بے رہنے دے بڑا کہیں کا!
صغرا۔ ایمان سے آپا جان لطف ہی آجائے اگر باجا
ہو تو کیا مزا ہے۔
زہرا۔ اچھا اچھا اب کام کرو میں تمہاری طرح بیکار تو نہیں
ہوں اٹھ ظہیر بازار سے پیاز لادے پیاز ختم ہے میں مصالح پیس لوں

ایک ماہ بعد

(شام کا وقت ہے ظہیر ابھی سکول سے نہیں آیا)
صغرا۔ امی جان ہماری قسمت ہی ایسی ہے مجھے کبھی کبھی
کبھی شک ہوتا تھا کہ آخر ہمارے ہی نام کیسے نکل آئے گی اور اتنے لوگ
ہیں ان کے نام کیوں نہ نکلے گی اور پھر . . . . .
امی جان۔ مجھے تو اس بات کا ڈر ہے کہ ظہیر آئے گا تو
اسے کتنا صدمہ ہوگا اسے تو یقین ہو چلا تھا کہ ضرور بالضرور ہمارے نام
ہی نکل آئے گی۔
زہرا۔ اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ نکلی تو چچا اکرم کے نام خواہ چوتھے
درجے کا انعام ہی تھا مگر پانچ سو روپے بھی پانچ سو ہوتے ہیں آخر۔
صغرا۔ دیکھو نا امی جان چچا جان کے پاس تو آگے ہی اتنے
روپے ہیں۔ ان کے نام نکلا بھی تو کیا۔
امی جان۔ اور پھر ظہیر بیچارے نے اپنی پونجی بھی ساری دے
دی اور تو نے بھی مجھے تو اس بات کا بہت افسوس ہے۔
صغرا۔ چلو امی جان جانے دو اب کیا ہو سکتا ہے ہماری قسمت ہی پھوٹی ہے۔
زہرا۔ آخر اتنے انعام تھے پانچواں ڈھائی سو کا تھا۔ وہی نکل آتا تو کیا تھا
امی جان۔ اور اکرم کو تو یاد بھی نہ تھا وہ بھول بیٹھا تھا اسے کیا
دوریوں کی پروا اور ادھر جھٹ تار!
صغرا۔ اچھا (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) نہ سہی۔
امی جان۔ ظہیر کو چھٹی ہو گئی ہو گی آتا ہو گا مجھے تو نہیں سوجھتا اسے کہوں گی کیا۔
زہرا۔ یہ صغرا تو تھوڑا سا رو کے چپ ہو گئی تھی اللہ قسم کل گئی تھی میں جو
ڈیوڑھی کا گولا لینے گئی تو سسکیوں کی آواز میں حیران! میں نے کہا ہو نہ ہو صغرا ہے۔
امی جان۔ صغرا بہت اچھی بیٹی ہے بڑی سمجھدار ہے آخر لاٹری نہیں
نکلی تو کیا ہوا اور روٹی تو ملتی ہے پہلے بھی گذارہ ہوتا تھا اب بھی ہوتا جائے گا
زہرا۔ اف آخر کیا ہوا وہ بھی تو ہیں جنہیں کھانا بھی نہیں ملتا۔
صغرا۔ تو آپا جان ادھر چچا جان بھی تو دیں نا جن کے پاس آگے بھی بہت
کچھ تھا اب پانچ سو اور آگئے۔
امی جان۔ صغرا بیٹی ایسے ہوا ہی کرتا ہے دنیا میں میں تو پہلے بھی
کہتی تھی تمہیں نے بہت مجبور کیا تھا۔
صغرا۔ چلو امی جانے دو کیا ہوا ایسے تو تیرہ ہی آنے تھے ظہیر بیچارے
نے تو بہت مشکل سے وہ آٹھ آنے جمع کئے تھے اس سے بھلا جمع ہوتے تھے۔
بڑی مشکل سے رک رک کر پیسے پیسے پر جمع کیا کرتا تھا۔
امی جان۔ اب آتا ہی ہوگا۔ زہرا۔ میں کہتی ہوں ہم اسے بتائیں
ہی نہ۔ امی جان۔ کیسے نہ بتائیں اول تو اس کا پہلا
سوال ہی یہ ہوتا ہے پھر اکرم بتا دے گا۔ رشید سے سن لے گا۔
یہ کیسے ہو سکتا ہے نہ تو ضرور لگ جائے گا۔ صغرا۔ جی بہت مصیبت ہے
زہرا۔ یہ آواز باہر کسی کی ہے کسی سے باتیں کرتا ہے
ظہیر۔ (اندر آتے ہوئے) سلام علیکم + فیاض محمود

راحت کدہ

(۱)

یہ کیا نسیمِ ولولہ انگیز نے کر دیا
زخمِ جنوں کو اور بھی کچھ تیز کر دیا
پھر بھر دیا ہے روح میں سوز و گدازِ غم
پیمانۂ دل کو سوز سے لبریز کر دیا

(۲)

اک خوابِ پریشاں ہے وہ بزمِ گذشتہ میری
فضائے دہر پہ چھائی ہوئی ہے بیدلی میری
سحرِ فغاں کشتہ افسردہ ہے قلبِ تپش افشاں
بس اک آہِ مسلسل رہ گئی ہے زندگی میری

(۳)

ہوئے خاموش آغازِ محبت کے حسیں نغمے
کہاں ہیں اب شبابِ عاشقی کے آتشیں نغمے
بس اک ٹوٹا ہوا دل یادگارِ عشق باقی ہے
کچھ آزردہ ہیں کچھ آہیں اور کچھ اندوہ آگیں نغمے

(۴)

فصلِ بہار نغمۂ رنگیں سے مست ہے
گلپوش و گل بدامن و ساغر بدست ہے
اس نغمہ زار و جلوہ گہِ حسن میں مگر
مینائے بادۂ دل کی صدائے شکست ہے

اثر صہبائی

کانسٹنٹ گینارڈ

اُن کی شادی محبت کی شادی تھی۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی بڑی گرمجوشی سے ایک بیٹے کی آرزو کرنے لگے اور یہ ننھی منی ہستی اپنے ماں باپ کی تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے قبل از وقت دنیا میں آموجود ہوئی۔ ماں مر گئی اور باپ نے اس صدمے کی تاب نہ لاکر خودکشی کر لی۔

کانسٹنٹ گینارڈ بے نظیر بچہ تھا لیکن تقدیر اُس کے خلاف تھی۔ مدرسے سے وہ اکثر پٹتا تھا۔ اگرچہ ہمیشہ وہ بےقصور ہوتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی بہ نسبت اُسے زیادہ کام کرنے کو دیا جاتا اور جس سزا کے مستحق دوسرے طالب علم ہوتے وہ بھی کسی نہ کسی حیلے اُسی کے حصے میں آتی۔ اسی وجہ سے امتحان کے دنوں میں وہ اکثر بیمار ہوجایا کرتا۔ جب اُس نے اپنی تعلیم ختم کی تو وہ ایک مکار اور احمق مشہور ہوچکا تھا۔

بی اے کے امتحان میں اُس نے از راہ ہمدردی اپنے ساتھی کے لئے بھی پرچہ لکھا، جو قبول کر لیا گیا لیکن خود وہ نقل کرنے کے جرم میں امتحان کے کمرے سے خارج کر دیا گیا۔

ایسے ناہموار واقعات اگر کسی دوسرے شخص کو پیش آتے تو وہ بداخلاق ہوجاتا لیکن کانسٹنٹ گینارڈ ایک شریف انسان تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خوشی نیکی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے اس لئے اُس نے اپنی ناکامی کو شجاعت کے ذریعہ سے فتح کرنے کی ٹھان لی۔

جس کارخانے میں وہ ملازم تھا ایک دن اُس میں آگ لگ گئی۔ جب اُس نے اپنے آقا کا اُداس چہرہ دیکھا تو بےخوف ہوکر بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑا تاکہ قیمتی کاغذات اور نقدی وغیرہ بچا سکے۔ اُس کے بال جل گئے اور بازو اور ہاتھ جھلس گئے لیکن اپنی جان پر کھیل کر وہ صندوق کو توڑنے اور نقدی وغیرہ کو اُس میں سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اُس کو باہر کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ دو سپاہی اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔

ایک مہینے تک مقدمہ چلنے کے بعد اُسے چوری کے جرم میں پانچ برس کی قید کا حکم سُنا دیا گیا۔

قید خانے میں بغاوت ہوگئی اور باغیوں کے حملے سے ایک محافظ کو بچانے کی کوشش میں اُس نے نادانستہ طور پر خود اُسے اڑنگا لگا کر پچھاڑ دیا۔ باغی اُس محافظ پر ٹوٹ پڑے اور اُسے قتل کر دیا۔

کانسٹنٹ گینارڈ کو بلاتکلف جلاوطن کرکے کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا لیکن اپنی بےگناہی کی تقویت پاکر وہ

کسی طرح بچ نکلا اور پھر فرانس میں آ کر کسی دوسرے نام سے رہنے سہنے لگا۔ یہ سمجھ کر کہ اپنی حکمت سے اس نے قسمت کو ہرا دیا ہے اس نے نیکی کے کام ایک مرتبہ پھر شروع کئے۔

ایک دن ایک میلے میں اس نے ایک بگٹٹ گھوڑے کو دیکھا جو گاڑی سمیت ایک خندق میں گرنے کے قریب تھا۔ یکایک وہ گھوڑے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی کلائی ختم کھا گئی، ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور ایک پسلی شدید طور پر زخمی ہوئی لیکن گھوڑا اور گاڑی بچ گئی۔ مگر گھوڑے نے پلٹ کر ہجوم کی طرف رُخ کیا اور ایک بڈھے آدمی، دو عورتوں اور تین بچوں کو روندڈالا گاڑی کے اندر کوئی نہ تھا۔ . . .

بہادری کے کاموں سے مایوس ہو کر کانسٹنٹ گینارڈ نے خاموش اور پُرامن طریق پر نیکی کرنے کا فیصلہ کیا، اور دنیا کی مصیبت کو کم کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ لیکن وہ روپیہ جو وہ نادار عورتوں کو مدد کے طور پر دیتا اُن کے شوہر نہایت بے دردی سے شراب خانوں میں اُڑا دیتے۔ غریب مزدوروں کو اُس نے گرم کپڑے تقسیم کئے لیکن وہ سخت موسم کو برداشت کرنے کے عادی تھے، اس لئے وہ کھانسی زکام وغیرہ میں مبتلا رہنے لگے۔ ایک آوارہ کتے کو اس نے اپنے گھر میں رکھا جس سے محلے کے چھ آدمی ہڑک کے مرض میں گرفتار ہو گئے۔ ایک دلچسپ نوجوان نے جس کے لئے اُس نے ایک معقول رقم خرچ کر کے فوج میں جگہ حاصل کی بعد میں قلعے کا نقشہ دشمن کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

کانسٹنٹ گینارڈ نے خیال کیا کہ روپے کا عام استعمال فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لئے اپنی نیکی کو یوں بیکار کھونے کے بجائے اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی دولت کو ایک ذاتِ واحد کے لئے مخصوص کر دے۔ چنانچہ اُس نے ایک یتیم لڑکی لے کر اپنے پاس رکھی جو خوبصورت تو قطعاً نہ تھی لیکن بعض اعلیٰ صفات سے متصف تھی۔ ایک باپ کی سی شفقت کے ساتھ اُس نے اس بچی کی پرورش کی۔ آہ! اُس نے اُس سے اتنی مروت اتنی محبت اور اتنی شفقت کا برتاؤ کیا کہ ایک شام لڑکی نے آ کر اپنے تئیں اُس کے قدموں میں گرا دیا اور اُس سے اپنے عشق کا اظہار کرنے لگی۔ اُس نے اُسے سمجھایا کہ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھا اور اگر اب میں تمہاری اس ترغیب کو قبول کر لوں تو مجھے ایسا محسوس ہوگا جیسے میں کسی بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔

اس نے ایک باپ کی طرح اُس کے سامنے دلیلیں اور معذرتیں پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جسے وہ غلطی سے عشق سمجھ رہی ہے وہ درحقیقت اس کے احساس کی بیداری ہے۔ مگر اُس نے وعدہ کیا کہ وہ اُس کے لئے بہت جلد ایک شوہر تلاش کر کے اُس کی شادی کر دے گا۔

دوسری صبح اُس نے دیکھا کہ وہ اس کی دہلیز پر مردہ پڑی ہوئی ہے۔

اُس کے بعد کانسٹنٹ گینارڈ نے نیکی سے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور قسم کھائی کہ آئندہ

نیکی کرنے کی بجائے وہ صرف بدی کے روک دینے پر اکتفا کرے گا۔

اس واقعے کے کچھ دیر بعد اتفاقاً اُسے ایک ایسے جرم کا علم ہو گیا جو اُس کے ایک دوست سے سرزد ہونے والا
وہ اُس دوست کو نہایت آسانی کے ساتھ پولیس کے حوالے کر سکتا تھا لیکن اُس نے مجرم کو نقصان پہنچا۔
بغیر جرم کا ازالہ کرنا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ اُس نے اُس کی تجاویز کے تمام ناکے بند کر دئے اور اُس وقت کا انتظ
لگا جب وہ اُس کی کوششوں کو کالعدم کر کے رکھ دیتا۔ لیکن اُس خبیث کو اس کا علم ہو گیا اور اُس نے اپنے کام کو کچھ
طرق پر جاری رکھا کہ جرم تکمیل کو پہنچ گیا۔ مجرم بھاگ گیا کانسٹنٹ گینارڈ گرفتار کر لیا گیا۔

کانسٹنٹ گینارڈ کے خلاف سرکاری وکیل کی تقریر دلائل و براہین کا ایک شاہکار تھی۔ اُس نے ملزم کی
گذشتہ زندگی پر تبصرہ کیا۔ اُس کا تباہ حال بچپن، اُس کی مدرسے کی سزائیں، اُس کا امتحان سے اخراج، پہلی ہی چوری
اُس کی جرأت، قید خانے کی بغاوت میں اُس کی مکروہ سازش، کال کوٹھڑی سے اُس کا بھاگ نکلنا اور پھر ایک
نام سے فرانس میں آکر رہنا، یہ تمام منازل اُس نے بیان کر ڈالیں۔

اس کے بعد مقرر اپنی عدالتی لسّانی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اُس نے کہا کہ ملزم نے تمام عمر نیکی کو ایک پاکھنڈ بنا
رکھا، اُس نے شریف گھروں میں خلل اندازی کی، اپنی نفسانیت کی تسکین کے لئے وہ غریب عورتوں کے شوہر
روپیہ دے کر شرابخانوں میں بھیج دیتا رہا۔ اُس نے اپنی فیاضی کا ایک ڈھونگ بنا رکھا تھا۔ لوگوں کو تحفے دے
جھوٹی شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا...... وہ خیر خواہیٔ خلق کے پردے میں ایک دیو خونخوار تھا۔

پھر اُس نے ذرا خوف آمیز لہجے میں اُس کی سُلجھی ہوئی عیاریوں کا پول کھولنا شروع کیا۔ اُس نے کہا کہ
ایک لفنگا آدمی ہے جس نے ایک دیوانے کتّے کو محض لوگوں پر چھوڑنے کے لئے اپنے پاس رکھا۔ وہ ایک شہ
ہے جس کو بدی سے صرف بدی ہونے کے باعث اُنس ہے۔ اس نے ایک دفعہ اپنی جان پر کھیل کر ایک بگڑ
کو روکا۔۔۔ کس لئے؟ صرف یہ تماشا دیکھنے کے لئے کہ یہ وحشی جانور ہجوم میں گھس کر بڈھے آدمیوں کمزور عو
اور ننھے بچوں کو کس طرح کچلتا ہے۔

آہ! کیا ایک ایسے شخص سے نیکی کی کچھ توقع ہو سکتی ہے؟ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں
نے ہزاروں ایسے جرم کئے ہونگے جن کے متعلق ہمیں کبھی علم نہ ہو سکے گا۔ اس امر کے لئے ایک ہزار اور
وجوہ موجود ہیں کہ جس جماعت نے قلعے کا نقشہ بیچ کر فرانس سے غداری کی اُس کے ساتھ یہ بھی شریک تھا۔
یتیم لڑکی جس کو اس نے پالا اور جو ایک دن اس کے دروازے میں مری ہوئی پائی گئی اُس کو اس کے سوا
کس نے قتل کیا ہوگا؟ یہ قتل یقیناً بدکاری، اوباشی اور بے غیرتی کے انہیں ناپاک افسانوں کا ایک باب
کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

٭ مردہ

قانون کی اتنی خلاف ورزیوں کے بیان کے بعد یہ ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ اس آخری جرم پر بھی کوئی بحث کی جائے۔ اور ملزم کے پیہم انکار کے باوجود ہمیں جرم کا کامل ثبوت مل گیا ہے چنانچہ لازم ہے کہ اسے قانون کی انتہائی حد تک سزا دی جائے۔ وہ ایسی ہی سزا کا مستحق ہے اور اس سزا کو اُسکے لئے زیادہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ کوئی معمولی مجرم نہیں بلکہ جرم کا ایک پیکر عظیم ہے، فریب اور بد باطنی کا ایک دیو مہیب جسے دیکھکر نیکی کی قدر و منزلت میں ہمیں شک ہونے لگتا ہے اور انسانیت کا جذبہ ہمارے دلوں سے محو ہو جاتا ہے۔

کانسٹنٹ گینارڈ کے وکیل کے لئے اب اِسکے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنے موکل کے واسطے خللِ دماغ کا عذر پیش کرے۔ اُس نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی۔ . . . طبی حوالے پیش کئے، مجرموں کے اعصابی فتور پر بڑی عالمانہ بحث کی، اپنے موکل کو ایک غیر ذمہ دار خبطی اور ایک بے اختیار دیوانہ ظاہر کیا، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ایسے لوگوں کا علاج قید خانہ نہیں بلکہ پاگل خانہ ہے۔

کانسٹنٹ گینارڈ کے لئے متفقہ طور پر موت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔

نیک لوگ جنکے دلوں میں اس نفرت انگیز جرم نے خون آشامی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا خوشی سے اُچھل پڑے اور مرحبا! مرحبا! کے نعرے لگانے لگے۔

کانسٹنٹ گینارڈ کی موت بھی اُسکے بچپن کی طرح بے نظیر لیکن افسوسناک تھی۔ وہ بلا تامل اور بے خوف و خطر مقتل کی طرف بڑھ گیا۔ اسکا چہرہ اسکے ضمیر کی طرح مطمئن تھا، اور اُس پر ایک شہیدانہ نشان تھی۔ جسے ہر ایک نے اُس کی وحشیانہ سنگدلی پر محمول کیا۔

اس آخری لمحے میں بھی یہ معلوم کر کے کہ جلّاد ایک غریب و عیالدار آدمی ہے اس نے آہستہ سے اسکے کان میں کہا کہ میں اپنی تمام جائداد تمہارے لئے چھوڑتا ہوں۔ جلّاد یہ سن کر گھبرا گیا اور اس نے جلدی سے اپنے محسن کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ . . .

تین ماہ کے بعد کانسٹنٹ گینارڈ کا ایک دوست ایک طویل سفر سے واپس آیا تو اسے اس شریف انسان کی موت کی خبر ملی جس کے اوصاف کو تنہا وہی جانتا تھا۔ تقدیر کے ظُلم کی تلافی کرنے کے لئے اس نے سنگِ مرمر کی ایک خوبصورت یادگار تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اور اپنے دوست کے نام کا ایک کتبہ لکھا۔ لیکن تقدیر نے چاہا کہ اس دوست کو دوسرے ہی دن خون کی ایک سقے آئے اور وہ دیکھتے دیکھتے نہنگِ اجل کا لقمہ بن جائے۔ مگر چونکہ مصارف پیشگی ادا کر دئے گئے تھے۔ اِس لئے لوح یقینی طور پر بدقسمت گینارڈ کی قبر پر نصب ہونے والی تھی۔

جس شخص کے سپرد کتبہ لکھنے کا کام تھا۔ اُس نے یہ سمجھ کر کہ مسودہ لکھنے میں غلطی ہو گئی ہے اپنی طرف سے ایک لفظ کی اصلاح کر دی۔ چنانچہ وہ غریب جس نے ہمیشہ نیکی کی اور جسے عمر بھر دنیا نے نہ سمجھا ہمیشہ کے لئے اپنی قبر پر اس کتبے کو لئے سو رہا ہے۔

یہ کانسٹنٹ گینارڈ کی آخری آرامگاہ ہے

(وہ ایک معمولی انسان تھا)

کندہ کرنے والے نے "غیر معمولی" کو اصلاح دے کر "معمولی" بنا دیا تھا۔

(تران رشپن)

منصور احمد

نوائے عدم

دُکھے ہوئے دِل کی التجا پر دُعا کو پھر ہاتھ اٹھا رہا ہوں
فریبِ امید کھا کے تقدیر کو تماشا دکھا رہا ہوں

تری نظر میں جھلک ہے الطاف کی مگر دِل دھڑک رہا ہے
کہ میں نظرہائے مہرپرور کی گردشیں دیکھتا رہا ہوں

ہر ایک تحریر میں ہے ترمیم کی ضرورت بروئے حاجت
نوشتِ قسمت کو حسنِ کوشش سے حسبِ خواہش بنا رہا ہوں

میں اس لئے راستہ نہیں پوچھتا کہ منزل سے بے خبر ہوں
یونہی ذرا سادہ لوحیٔ راہبر سے اک لطف اٹھا رہا ہوں

عدم

جذباتِ محبّت

رُوح میں کیوں سما گئے ہو تم
میری ہستی پہ چھا گئے ہو تم

دِل کو مجنون کر دیا تم نے
ہوش کا خون کر دیا تم نے

دل ہے مندر تم اُس کی مورت ہو
ہائے! تم کتنے خوبصورت ہو

دُور رہتے ہو ماجرا کیا ہے؟
جور بے جا سے مدّعا کیا ہے؟

مجھ سے جتنا گریز کرتے ہو
میری وحشت کو تیز کرتے ہو

دن کو گو ضبط کر لیا میں نے
ضبط کر کر کے مر لیا میں نے

شب کو یہ خدمتِ محال کہاں
رات کو ضبط کی مجال کہاں

رات کی حشر خیز خاموشی!
خامشی کی عمیق سرگوشی

دِل سراپا خیال ہوتا ہے
اور تمہارا جمال ہوتا ہے

رنگ لاتا ہے جوش آہوں کا
یہ نکلتا ہے سیل اشکوں کا

رُوح محوِ نیاز ہوتی ہے
آنکھ وقفِ نماز ہوتی ہے

کاش ایسے میں تم کبھی آؤ
آ کے اک بار دیکھ ہی جاؤ

لیکن ایسے مرے نصیب کہاں
تم کہاں اور میں غریب کہاں

عدم

اصلاحِ ادب

مجھے اردو کی بے شمار کتابیں اخبارات اور رسالے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور رنج بھی۔ خوشی اس لئے کہ ہماری پیاری اردو کا دائرۂ اثر وسیع تر ہو رہا ہے اور رنج اس لئے کہ صرف چند کتابوں، ایک آدھ اخبار اور ایک دو رسالوں کے سوا کسی میں بھی صحتِ زبان کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اور نظم کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ضرورت تھی کہ کوئی جلیل القدر شاعر وحید العصر ادیب اور مسلم الثبوت محققِ ادب خدمتِ زبان کے اس نہایت اہم پہلو کی طرف توجہ فرماتے لیکن جب میں نے ہر طرف سکوت و جمود کا عالم دیکھا۔ تو اپنی محدود علمی استعداد کے باوجود محض اردو کی محبت سے مجبور ہو کر اس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کا تہیہ کر لیا۔ وبیدہ التوفیق۔

اس مضمون کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہے گا اور نثر و نظم میں عوام کی ناواقفیت کے باعث جو ادبی و عروضی غلطیاں جگہ پا گئی ہیں یا رہی ہیں ان کی اصلاح کی جائیگی تاکہ اردو کا معیارِ ادب گرنے نہ پائے اور رہ صحت و فصاحت کے ساتھ وسعت و ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی جائے زمانے کی ہر شے کے مانند زبان میں بھی برابر انقلاب آتا رہتا ہے۔ نئی نئی ضروریات کے ساتھ الفاظ بھی نئے نئے بنتے چلے جاتے ہیں جن میں بعض تو ادبی اعتبار سے صحیح ہوتے ہیں اور بعض غلط لیکن غلط بھی اس قدر تیزی کے ساتھ رواج پاکر زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ کہ عام لوگوں کے علاوہ ثقات بھی اُس طرح بولنے اور لکھنے لگتے ہیں۔ گویا وہی غلط الفاظ ٹکسالی اور فصیح قرار پاتے ہیں۔ انہیں غلط العام کہتے ہیں مگر جو غلط الفاظ عوام ہی تک محدود رہتے ہیں اور ثقات کے استعمال میں نہیں آتے، وہ غلط کے غلط ہی رہتے ہیں ان کو غلط العوام بولتے ہیں۔ میرا مقصد موخر الذکر الفاظ کی تصحیح اور ادبی اصلاح ہے۔ نثر سے زیادہ نظم میں اندھیر مچا ہوا ہے۔ اور نظم کا معاملہ نہایت نازک ہے۔ جس کے لئے زیادہ احتیاط و توجہ کی ضرورت ہے۔

(نشتر)

نثر

فقرہ۔ ہم نے تبادلۂ خیالات کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے

اصلاح۔ ہم نے مبادلۂ خیالات کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے

وجہ۔ تبادلہ کوئی لفظ نہیں۔ تبادُل بر وزن تَفَاعُل یا مُبادَلہ بر وزن مُفاعَلہ صحیح ہے۔

فقرہ "پیام مشرق" میں فلسفے کے سوا شعریت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے

اصلاح "پیام مشرق" میں فلسفے کے علاوہ شعریت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

وجہ۔ "سوا" وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی چیز کی نفی مقصود ہو مثلاً خدا کے سوا کوئی معبود نہیں" اضافے کے موقع پر "علاوہ" بولتے ہیں۔

فقرہ۔ اس فرض کی ادائیگی آپ کے ذمے ہے

اصلاح۔ اس فرض کی ادائی آپ کے ذمے ہے

وجہ۔ "ادا" سے "ادائی" آئے گا۔ جیسے "صفا" سے "صفائی"۔ "ی" سے پہلے "گ" کسی قاعدے سے درست نہیں۔ اور نہ یہ مستثنیٰ ہے۔ نہ غلط العام۔ اسی طرح "ناراضی" کی جگہ "ناراضگی" بھی غلط ہے۔

فقرہ۔ اردو زبان دن بدن ترقی کر رہی ہے۔

اصلاح۔ اردو زبان روز بروز ترقی کر رہی ہے۔

وجہ۔ "دن بدن" اصل میں "دن بہ دن" تھا اور "بہ" فارسی ہے۔ اس لئے ہندی اور فارسی کی ترکیب درست نہیں

فقرہ۔ آج ۲۸ جمادی الاول ہے میں انشاء اللہ ۲ جمادی الآخر کو حاضر خدمت ہونگا۔

اصلاح۔ آج ۲۸ جمادی الاُولیٰ ہے میں انشاء اللہ ۲ جمادی الاُخریٰ کو حاضر خدمت ہوں گا۔

وجہ۔ "جمادیٰ" مؤنث ہے اس لئے اس کی صفت بھی مؤنث ہی آنی چاہیے "جمادی الثانی" اور "جمادی الثانیہ" بھی غلط ہیں کیونکہ اوّل تو یہ عربی میں مستعمل نہیں دوسرے "ثانی" وہاں آتا ہے جہاں اس کے بعد "ثالث" بھی آئے۔

فقرہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حوادثِ زمانہ سے مصئون و مامون رکھے!

اصلاح۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حوادثِ زمانہ سے مَصُون و مامون رکھے۔

وجہ۔ "مَصْئُون" بر وزن مَفْعُول اجوف واوی ہے۔ مہموز العین نہیں۔ اس کا مادہ "صَوْن" ہے "صیان" نہیں۔ یہ اصل میں مصوون تھا

فقرہ۔ میں نے آپ کے مضمون میں صرف ایک فقرہ ایزاد کیا تھا۔

اصلاح۔ میں نے آپ کے مضمون میں صرف ایک فقرہ زیادہ کیا تھا۔

وجہ۔ "ایزاد" کوئی لفظ نہیں۔ باب اِفعال "ازادہ" آتا ہے۔ جو اردو میں مستعمل نہیں۔ "ایزاد" غلط در غلط ہے۔

فقرہ۔ آپ نے کیوں خاموشی اختیار کی ہوئی

اصلاح۔ آپ نے کیوں خاموشی اختیار کر رکھی

وجہ۔ "نے" کے ساتھ "ہوا" "ہوئے" یا "ہوئی" کا استعمال قواعد کے رو سے غلط ہے۔

فقرہ۔ کتاب کو پڑھا گیا۔

اصلاح۔ کتاب پڑھی گئی۔

وجہ۔ فعل مجہول سے "پہلے" کو نہیں آتا لیکن جب
مفعول مالم یُسمّ فاعلہ کے ساتھ ایک اور مفعول آئے۔ تو "کو" ضرور
لکھیں گے۔ مثلاً مصنف کو ہزار روپیہ دیا گیا۔ اگر فعل مجہول کرنا
ہو۔ اور دوسرا مفعول بھی نہ آئے۔ تو "کو" کا لکھنا یا نہ لکھنا دونو
طرح صحیح ہیں۔ مثلاً "کمرے کو آراستہ کیا گیا" اور "کمرہ آراستہ کیا
گیا" دونوں درست ہیں۔

بے شک قواعد میں یہی لکھا ہے۔ مگر مستند
فصحا اس کی پابندی نہیں کرتے۔ مثلاً حضرت داغ مرحوم
لکھتے ہیں۔ کہ ؎

اے حشر امتیاز کہ ہم ہیں شہید ناز
مُردوں کی طرح ہم کو اٹھایا نہ جائے گا

یہاں قواعد کے مطابق "ہم اٹھائے نہ جائیں گے"
ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن زبان کے اعتبار سے حضرت داغ کا پایہ اس
قدر بلند ہے۔ کہ کوئی قواعد مرتب کرنے والا ان پر حرف گیر
نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسے ان کا کلام سامنے رکھ کر قواعد بنانے
چاہئیں۔ غرض میری ذاتی رائے یہ ہے۔ کہ ایسے موقع پر "کو" کا
لکھنا یا نہ لکھنا ادیب یا شاعر کے ذوق پر منحصر ہے۔

فقرہ۔ صبح خیزی ان کا معمول تھا۔

اصلاح۔ صبح خیزی ان کا معمول تھی۔

وجہ۔ "صبح خیزی" مؤنث ہے۔ اور فعل ناقص تذکیر و تانیث
میں اس کے تابع ہوا کرتا ہے۔ نہ کہ خبر کے۔

فقرہ۔ انسان کو چاہیئے۔ کہ ہمیشہ تحصیل علم اور ہنر میں
مصروف رہے۔

اصلاح۔ انسان کو چاہیئے۔ کہ ہمیشہ تحصیل علم و ہنر
میں مصروف رہے۔

وجہ۔ "تحصیل" مضاف ہے۔ اور "علم" اور "ہنر" دونوں مل
کر مضاف الیہ۔ اس لئے اس فارسی ترکیب میں ہندی کا حرف
عطف نہیں آسکتا۔

فقرہ۔ سعیدہ اور طاہرہ نے کہا۔ "امی جان! اب ہم سوئیں گی"

اصلاح۔ سعیدہ اور طاہرہ نے کہا۔ "امی جان! اب ہم سوئیں گے"

وجہ۔ جمع متکلم میں مذکر و مؤنث کا صیغہ ایک ہی (مذکر)
ہوتا ہے۔ مؤنث کے لئے جمع مؤنث کا صیغہ نہیں بولتے۔

فقرہ۔ وہ فوق البھڑک لباس پہن کر بزم ادب کے
اجلاس میں شامل ہوا۔

اصلاح۔ وہ زرق برق لباس پہن کر بزم ادب
کے اجلاس میں شامل ہوا۔

وجہ۔ "فوق البھڑک" کی ترکیب غلط ہے۔ فوق عربی اور بھڑک
ہندی ہے۔ اسی طرح "قریب المرگ" بھی غلط ہے کیونکہ "قریب" عربی
ہے۔ اور "مرگ" فارسی۔ اس کی جگہ "قریب مرگ" لکھنا چاہیئے۔

فقرہ۔ مذہب اسلام میں تمام مُنشّی چیزیں حرام ہیں۔

اصلاح۔ مذہب اسلام میں تمام نشہ آور چیزیں
حرام ہیں۔

وجہ۔ "نشہ" فارسی ہے۔ اس سے عربی قاعدے
کے مطابق "مُنشّی" بنا لینا صحیح نہیں۔ اسی طرح "مرغن" اور "چرب"
بھی غلط ہیں۔

نظم

شعر۔ اپنے خالق کا ہے شاہد آپ ہی
ذرہ ذرہ عالم امکان کا

اصلاح۔ شاہد خالق ہے خود ہی اے ...

ذرہ ذرہ عالمِ ایجاد کا

یا

شاہدِ حق ہے زبانِ حال سے
ذرہ ذرہ عالمِ ایجاد کا

وجہ۔ پہلے مصرع میں تنافر اور ہلکی سی تعقید ہے۔
دوسرے مصرع کی ترکیب "عالمِ امکاں" (حالتِ اضافت میں)
نون کا اعلان غلط ہے۔ اور معناً بھی اس سے "عالمِ ایجاد"
بہتر ہے۔ اسی طرح "دل و جان" (حالتِ عطف) کو بھی "دل و جاں"
یعنی اخفائے نون سے باندھنا چاہیئے۔

مصرع۔ ہو اگر تعلیم اچھی خوب تربیت بھی ہو

اصلاح۔ ہو اگر تعلیم اچھی تربیت بھی خوب ہو

وجہ۔ "تربیّت" (بہ تشدید یا) غلط ہے "تربِیَت"
(بفتح یا بر وزن تفعلہ) لکھنا چاہیئے اسی طرح "تقوّیت"
غلط اور "تقوِیَت" صحیح ہے۔

اشعار۔

غیر سے لکھوا دیا خط کا جواب — کیا خطِ تقدیر تھا خط کا جواب
وہ نہیں آتے۔ نہ آئیں خوش رہیں — خیر جی دے تو دیا خط کا جواب
بن گئی کیا تجھ پہ قاصد! خیر ہے؟ — منہ سے تو کچھ پھوٹ کیا لایا جواب

اصلاح۔ پہلے دونوں شعر ٹھیک ہیں تیسرے
شعر کا دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیئے "منہ سے تو کچھ پھوٹ
لا خط کا جواب"۔

وجہ۔ مطلع میں "دیا" "اور تھا" قافیہ اور "خط کا
جواب" ردیف ہے۔ دوسرے شعر میں بھی قافیہ و ردیف
ٹھیک ہیں لیکن تیسرے شعر میں "لایا" قافیہ اور فقط "جواب"
ردیف ہے حالانکہ اس میں بھی پہلے دونوں شعروں کی طرح "خط
کا جواب" ردیف اور کوئی صحیح قافیہ لانا چاہیئے تھا۔ پہلے
دونوں شعر عیب کی وضاحت کے لئے لکھے گئے ہیں۔

شعر:-

وہ راہ میں ہیں سنا ہے۔ اب آئے کہ آئے
کدھر کا قصد ہے۔ او جانِ بیقرار! نہیں

اصلاح۔

وہ راہ میں ہیں اب آئے کہ آئے دم بھر میں
کدھر کا عزم ہے او جانِ بیقرار نہیں

یا

وہ راہ میں ہیں ابھی آئے جاتے ہیں دم سے
کدھر کا عزم ہے او جانِ بیقرار نہیں

وجہ۔ "کہ" میں "ہ" کا اعلان غلط ہے۔ دوسرے
مصرع میں تنافر ہے "عزم" سے یہ خامی بھی رفع ہو گئی۔ اور
شعریت بھی قائم رہی۔

اشعار۔

نغمۂ نے بن گیا، سوزِ عنادل ہو گیا
نالۂ دل چٹکیاں لینے کے قابل ہو گیا
پہلے وہ سفاکیاں تو غیر سے پیدا کرد
آپ خنجر باندھ کر سمجھے کہ قاتل ہو گیا
اب کہاں جائیں کسے چاہیں کدھر کے ہو رہیں
روٹھنا چھوڑ دو کہ جینا ہم کو مشکل ہو گیا

اصلاح۔ پہلا شعر ٹھیک ہے۔ اگرچہ دوسرے
مصرع میں تنافر کی خامی موجود ہے۔ دوسرا یوں ہونا چاہیئے۔

پہلے وہ سفاکیاں تو غیر سے پیدا کریں
آپ خنجر باندھ کر سمجھے! میں قاتل ہو گیا

تیسرا یوں ہو تو بہتر ہے ؎

اب کہاں جائیں۔ کیسے چاہیں کدھر کے ہو رہیں
تو جو اپنے چاہنے۔ والوں سے غافل ہو گیا

وجہ۔ دوسرے شعر میں "شترگربہ" ہے یعنی پہلے مصرع میں "کرو" اور دوسرے میں "آپ" لکھا ہے۔ نیز دوسرا مصرع تنافر کی خامی رکھنے کے علاوہ قواعد کے رُو سے بھی غلط ہے۔ یا تو یوں ہوتا کہ "آپ خنجر باندھ کر سمجھے کہ قاتل ہو گئے" اگرچہ تنافر پھر بھی موجود رہتا ہے لیکن اس طرح ردیف قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ یا اصلاح مذکور کے مطابق "کہ" کی جگہ "میں" ہونا چاہئے تھا۔ اور یہی ٹھیک ہے تیسرے شعر کا قافیہ غلط ہے کیونکہ جب مطلع میں تاسیس و دخیل کی قید ہے تو تمام اشعار میں لازماً قید ہونی چاہئے تھی یعنی "مشکل"۔ "دل"، "منزل" وغیرہ نہیں لا سکتے۔ بلکہ "غافل" "نازل"۔ "حاصل" وغیرہ لانے چاہئیں۔ ماہرینِ عروض اس نکتے کو خوب سمجھیں گے۔ پہلا شعر قافیوں کی وضاحت کے لئے لکھا گیا ہے۔

شعر۔ اُف۔ اُف مری وحشت ترے قربان ہی جاؤں
دامن کو سنبھالا تو گریباں نہیں ملتا

اصلاح۔ اللہ رے یہ جوشِ جنونِ دلِ وحشی!
دامن جو سنبھالا تو گریباں نہیں ملتا۔

یا

صدقے ترے اے جوشِ جنونِ دلِ وحشی
دامن جو سنبھالا تو گریباں نہیں ملتا!

وجہ۔ پہلے مصرع میں تنافر کی خامی کے علاوہ "ہی جاؤں" اور دوسرے میں "کو" حشو ہیں۔ شعر:۔

دل کو مرغوب ہیں تمہارے لفظ
پھر سنا دو پیارے پیارے لفظ

اصلاح۔ دل کو مرغوب ہیں تمہارے لفظ؛ پھر سنا دو پیارے پیارے لفظ

وجہ۔ "پیارے" میں "یا" کا اعلان غلط ہے۔ اسی طرح "پیاس" اور "دھیان" میں بھی جو ہندی ہیں "یا" کا اخفا ہی چاہئے

مصرع۔ مجھ کو دھوکا یہ ترا نقش کفِ پا دے گا۔

اصلاح۔ یہ ترا نقشِ کفِ پا مجھے دھوکا دے گا۔

وجہ۔ "دھوکا" اور "دے گا" میں بہت بُعد ہو گیا جس سے تعقید پیدا ہو گئی۔ قافیہ اور ردیف کو ملا کر پڑھنے سے نہایت مکروہ ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

شعر۔ میں نے ہر ایک گُل کی مہک پر کیا ہے غور۔
چھُو بھی نہیں گئی ہے ترے پیرہن کی بُو

اصلاح۔ سُونگھا ہی پھُول پھُول چمن زارِ دہر کا
چھُو بھی نہیں گئی مرے گُل پیرہن کی بو

وجہ۔ "ہر ایک گُل" میں "ایک" حشو ہے۔ "مہک" کے لئے غور کرنا اچھا نہیں۔ دوسرے مصرع میں "ہے" حشو ہے۔

شعر۔ جوانی بھی عجب شے ہے کہ جب تک ہی نشا اِس کا
مزہ ہے سادے پانی میں شرابِ ارغوانی کا

اصلاح۔ جوانی بھی عجب شے ہی کہ اس کا نشہ ہے جب تک
مزہ ہے سادے پانی میں شرابِ ارغوانی کا

وجہ۔ "نشا" بروزنِ "دغا" غلط ہے۔ "نشہ" بروزنِ "پشّہ" (بہ تشدیدِ شین) باندھنا چاہئے۔ اِس غزل میں "ارغوانی"، "جوانی" وغیرہ قافیہ اور "کا" ردیف ہے۔ لہٰذا اس شعر میں ردیف کے ملنے اور قافیے کے نہ ملنے کا نقص موجود ہے۔ شعر:۔

خوف کیا آتشِ دوزخ سی کہ او زاہدِ خشک؛ میرے سر پر ہے مرے دامنِ تر کا ٹکڑا

اصلاح۔ خوف کیا آتشِ دوزخ سی ہمیں زاہدِ خشک
سر پہ ہے ردِّ جزا دامنِ تر کا ٹکڑا

پہلے مصرع میں "کہ او" اور دوسرے میں "میرے سر" حشوِ قبیح ہیں

فروغِ نظر

ہر شے میں مجھے تیری تصویر نظر آئی
دُنیا تری صورت کی تفسیر نظر آئی

پردہ ترے چہرے سے اُٹھا تو سہی لیکن
ہر شخص کو اپنی سی تصویر نظر آئی

پاتا ہوں ارادوں میں ہاتھ اُس کے اشارے کا
تدبیر کے پردے میں تقدیر نظر آئی

بیداریٔ ہستی بھی اِک خوابِ پریشان تھی
جب بند ہوئیں آنکھیں تعبیر نظر آئی

رحمت نے تو عصیاں کو کوثر میں دیئے غوطے
پر مجھ کو ندامت بھی تعزیر نظر آئی

میں خوں کا اسدؔ اپنے الزام دھروں کس پر؟
قاتل نہ نظر آیا شمشیر نظر آئی!

اسد مُلتانی

غزل

تیری نظر نے دل کو مرے دل بنا دیا
رازو نیازِ عشق کے قابل بنا دیا

میں اس جہانِ عشق میں وہ دردمند ہوں
جس شے پہ کی نگاہ اُسے دل بنا دیا

مجھ کو نہ کیوں مآلِ محبت پہ ناز ہو
جس نے نگاہِ رحم کے قابل بنا دیا

بحرِ فنا میں دل کے سفینہ نے ڈوب کر
ہر موجِ بیقرار کو ساحل بنا دیا

اس زندگی کو میرے تخیل نے آپ ہی
آسان بنا دیا کبھی مشکل بنا دیا

ناکامیوں نے دل میں جگہ پا کے کاظمیؔ
ہر آرزو کو جذبۂ باطل بنا دیا

کاظمی (ہردوئی)

شب حرماں

تھی شام بلاخیز غضب ناک ہوائیں
آتی تھیں ہر اک سمت سے پُر ہول صدائیں

وُہ رقص بلاؤں کا وُہ جنگ ابر و ہوا کی
وہ رعد کے نالے وُہ جنوں خیز اُداسی

بجلی کے کڑکنے سے فلک کانپ رہا تھا
اور سینۂ گیتی میں بھی اِک حشر بپا تھا

اِس حال میں اِک دردو غم و یاس کا مارا
اِک خانۂ تاریک میں بے جاں سا پڑا تھا

وہ اُس کا عذابِ غمِ پنہاں سے تڑپنا
وہ نالۂ دل شکوۂ بے مہریٔ دنیا

چھوٹی ہوئی نبضیں، الم انگیز نگاہیں
جوشِ غم و حرماں میں وہ ڈوبی ہوئی آہیں

اندوہ و غم و یاس میں دم توڑ رہا تھا
جز ذاتِ خدا اور کوئی پُرساں نہ تھا اُس کا

اُف کتنی الم ناک و غم انگیز تھی وُہ رات
اے رازِ حزیں کتنی بلاخیز تھی وہ رات

محمد جمیل خان راز

غزل

وفا یا فریبِ وفا چاہتا ہوں
کوئی زیست کا آسرا چاہتا ہوں

جو ہمت ہو مجھ کو سنبھالیں دو عالم
کسی کی نظر سے گرا چاہتا ہُوں

تبسم ہے برحق مری سادگی پر
محبت بشرطِ وفا چاہتا ہُوں

تمنّا ہے مچلی ہوئی آرزو کی
تڑپتا ہُوا مُدعا چاہتا ہُوں

توجہ پہ لرزاں تغافل سے نالاں
خدا جانے میں اُن سے کیا چاہتا ہوں

فقط ایک جلوہ فقط اِک تبسم
گناہِ وفا کی سزا چاہتا ہُوں

نہ ہے حُسن مقصد کہ ہر دل میں زیبا
محبّت کی نشو و نما چاہتا ہوں

زیبا رودولوی

یونانی غلام کی سرگزشت

میں یونان میں پیدا ہوا۔ میرے والدین سمرنا میں غربت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب میں بیس برس کی عمر کو پہنچا تو میرے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اب مجھے اپنے لئے ذریعۂ معاش کی فکر ہوئی۔ اس سے پہلے بھی میں ایک یہودی شراب فروش کی ملازمت کر چکا تھا چنانچہ میں پھر اسی کے پاس ملازم ہو گیا جب مجھے وہاں کام کرتے ہوئے تین سال گذر گئے۔ تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جو میری گذشتہ خوشحالی اور موجودہ تباہی کا موجب ہوا۔

جس وقت کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ ان دنوں میں نے اپنی محنت اور میانہ روی سے اپنے آقا کو ایسا خوش کر دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کا منظورِ نظر ہو گیا۔ بعض دفعہ وہ صرف شراب خانے کا انتظام میرے سپرد کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی مجھے خود ہی تمام کام کرنا پڑتا۔ اس وقت میرے ذمہ شراب کو چھان کر صاف کرنا اور اسے ہر طرح سے تیار کر کے بازار کے لئے قابلِ فروخت بنانا تھا۔

میرے ماتحت یوٹوپیا کا ایک حبشی غلام بھی کام کیا کرتا تھا۔ وہ ایک نہایت طاقتور گراںڈیل اور ضدی شخص تھا بعض دفعہ میرے مالک کے لئے اس سے کام لینا تقریباً دشوار ہو جاتا۔ اسے زبردست سے زبردست سزا دی جاتی۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا۔ کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غضبناک اور ڈھیٹ ہو رہتا۔ جب کبھی میں اس کا کوئی قصور معلوم کرتا جو بے پروائی کے باعث اس سے سرزد ہوا ہو۔ تو اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے۔ مجھے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا۔ کہ کہیں کسی وقت وہ مجھے جان ہی سے نہ مار ڈالے۔ میں نے اپنے مالک سے کئی دفعہ التجا کی کہ وہ اسے ملازمت سے علیحدہ کر دے لیکن چونکہ وہ نہایت مضبوط اور قوی آدمی تھا اور حسبِ مرضی شراب کا بڑے سے بڑا کپّا بھی بغیر کسی کی مدد کے اٹھا لے جاتا تھا۔ اس لئے میرے مالک کو اس کا لالچ میری پیہم التجاؤں کے باوجود بھی حبشی کو علیحدہ کرنے سے باز رکھتا۔

ایک صبح جب میں شراب خانے میں داخل ہوا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ وہ حبشی غلام اس کپّے کے قریب غافل سو رہا ہے جو میں نے اسے فوراً صاف کرنے کے لئے دیا تھا۔ اور جس کی اس وقت شدید ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ضرور اسے اب تک صاف کر چکا ہو گا۔ مگر اس کی غفلت دیکھ کر جی میں آیا کہ مار مار کر اس کی تمام سستی نکال دوں۔ لیکن اس کو سزا دینے کی مجھے خود جرأت نہ ہوئی۔ اور میں اپنے آقا کو بلا لایا۔ تاکہ وہ اس کے طرزِ عمل کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔ میرا یہودی آقا اس کی غفلت اور سستی دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ اس نے ایک لکڑی اٹھا کر زور سے حبشی کے سر پر دے ماری حبشی غصہ کے مارے جست بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جب اس نے میرے بجائے آقا کو ہاتھ میں لکڑی لئے ہوئے دیکھا۔ تو وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اور ساتھ ہی آقا

سے جاتی دفعہ کہہ گیا۔" اتنا پٹ پٹ کر تو میں بھی یہاں کام نہیں کروں گا"۔ جب میرا آقا شراب خانے سے باہر چلا گیا تو حبشی مجھ پر برس پڑا کہ تم نے میرے خلاف کیوں اطلاع دی تھی۔ وہ لکڑی کا ایک سا ٹھا پکڑ کر مجھ پر جھپٹا تاکہ میرا سر اس سے پاش پاش کر دے میں جلدی سے کُپے کی آڑ میں ہوگیا۔ اُس نے مجھ پر پھر حملہ کیا۔ رستے میں ایک کلہاڑی پڑی تھی جب میں نے اپنی مدافعت کے لئے ہاتھ ڈالا۔ اُس وقت حبشی ایک سٹول سے ٹھوکر کھا کر زمین پر آن گرا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنی کلہاڑی سے اُس کے ایسی ضرب لگائی کہ اُس کی کھوپڑی بالکل پھٹ گئی۔ اور اب وہ میرے قدموں میں مُردہ پڑا تھا۔

اس واقعہ سے میں سخت دہشت زدہ ہوگیا۔ اگرچہ میں نے جو کچھ کیا تھا محض اپنی جان بچانے کی خاطر کیا تھا۔ اور میں اپنے آپ کو بالکل حق بجانب خیال کرتا تھا۔ تاہم مجھے معلوم تھا۔ کہ میرا آقا حبشی کی موت پر بہت رنجیدہ ہوگا۔ اور ممکن تھا کہ وہ غصہ میں آکر مجھی کو قصوروار ٹھہراتا۔ چونکہ اس وقت کوئی ایسا آدمی بھی موجود نہ تھا جو میری بے گناہی کی شہادت دے اِس لئے بہت ممکن تھا کہ میں قانون کے شکنجے میں بری طرح جکڑا جاتا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مجھے یہ تدبیر سوجھی۔ کہ حبشی یہ تو کہہ ہی چکا ہے کہ" میں اس طرح پٹ کر یہاں آئندہ کام نہ کروں گا" اس لئے میں اپنے آقا کو بہت آسانی سے یہ یقین دلا سکوں گا کہ وہ ملازمت ترک کر کے بھاگ گیا ہے۔ اور اس عرصہ میں اُس کی لاش کہیں چھپا دوں گا۔ لیکن یہ بھی تو کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس کی لاش کو باہر نکالنے میں مجھے اپنی پوری قوت سے کام لینا پڑا۔ مگر آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ اور اس کی لاش ایک کُپے میں ڈال کر اس کا ڈھکنا کیلوں سے جڑ کر اُسے گودام میں رکھ آیا۔ جہاں مجھے آئندہ سال کی بکری کے لئے اُس کو شراب سے بھرنا تھا۔ جب یہ کُپا اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ تو میں نے ایک لمبی نلی کے ذریعے سے تالاب کی شراب سے اس کو بھر دیا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ ایک بھاری بوجھ میرے دماغ سے اتر گیا ہے کیونکہ کافی عرصہ تک اس راز کے افشا ہونے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔

میں اپنا کام ختم کر کے بیٹھا ہی تھا۔ کہ میرا مالک بھی شراب خانہ میں آموجود ہوا۔ اور اس نے دریافت کیا کہ حبشی کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا" وہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ وہ قسم کھا کر کہتا تھا۔ کہ وہ یہاں آئندہ ہرگز کام نہ کرے گا"۔ میرے آقا نے اس کی گرفتاری کے لئے پولیس میں اطلاع دے دی تاکہ وہ اپنے بہترین نوکر کو کہیں کھو نہ بیٹھے۔ کچھ عرصے کے بعد جب "فرار شدہ" حبشی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ تو یہ خیال کر لیا گیا۔ کہ اُس پاگل نے غصہ کی حالت میں خودکشی کر لی ہوگی۔ اس کے بعد نہ تو اُس کے متعلق کچھ کہا گیا نہ سُنا گیا۔ پہلے کی طرح میں پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ چونکہ میں اس وقت شراب خانے پر پوری طرح سے مسلط ہو چکا تھا۔ اس لئے مجھے امید واثق تھی۔ کہ میں کسی نہ کسی دن چپکے سے اپنا بوجھ اٹھا کر شراب خانے سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

جب بہار کا موسم پھر شروع ہوا۔ تو میں بھی اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اتنے میں ترکی سپاہ کا سردار جسے آغا کہتے تھے آموجود ہوا۔ یہ لوگ عام طور پر نہایت ظالم اور خود مختار ہوا کرتے تھے۔ جہاں جاتے ایک تہلکہ بپا کر دیتے۔ وہ آغا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وُہ شرابی تھا۔ اور ہمارے بہترین گاہکوں میں سے ایک تھا۔ چونکہ اس کے تمام مصاحب عوام سے روشناس تھے۔ اس لئے وہ ان کو

شراب خریدنے نہ بھیجتا۔ بلکہ وہ خود ہمارے شراب خانے میں آکر ایک کُپّا پسند کر لیتا۔ جسے ایک پالکی میں رکھ کر اس کے پردے گرا دئیے جاتے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا کہ آغا نے کوئی نئی خاتون حرم میں داخل کی ہے۔ میرے آقا نے آغا کو شراب کے وہ سب کُپّے دکھائے جو اس سال کی فروخت کے لئے تیار کئے جا چکے تھے۔ اور دو قطاروں میں رکھ دئے گئے تھے۔ اس نے دو تین کُپّوں کی شراب چکھی۔ لیکن اس کو پسند نہ آئی۔ اور کہنے لگا "دوست الیسپر تمہاری قوم سے جہاں تک ممکن ہو ہمیشہ بدترین مال سب سے آگے رکھتی ہے۔ میرے خیال میں جو شراب تم نے مجھے دکھائی ہے۔ اُس سے بہتر پچھلی قطاریں ہوں گی۔ ذرا اپنے یونانی سے کہو تو کہ مجھے اُس کُپّے کی شراب چکھائے۔" اُس نے اُس کُپّے کی طرف اشارہ کیا جس میں حبشی نبیذ تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ جونہی آغا وہ شراب چکھے گا۔ اُس کا منہ بدمزہ ہو جائے گا۔ اور وہ اُسے فوراً تھوک دے گا۔ اس لئے میں نے جلدی سے اس شراب کا ایک گلاس بھر کر آغا کو پیش کر دیا۔ اُس نے اس کو چکھا اور پھر نہایت حیرت و استعجاب سے اس کو روشنی میں لے جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اُس نے اُس کو پھر چکھا۔ اور چٹخارے لے لے کر پینا شروع کر دیا۔ پھر وہ میرے مالک کی طرف مخاطب ہو کر یُوں گویا ہُوا "کیوں بے یہودی کُتّے تو مجھے صریح دھوکا دینا چاہتا تھا۔ جب تیرے پاس ایسی خوش ذائقہ مزے دار اور لطیف شراب موجود تھی۔ جسے بہشت کی حوریں بھی مزے سے گھونٹ گھونٹ پیئیں"۔

آقا نے مجھ سے پوچھا۔ کیا "یہ سب شراب ایک ہی قسم کی نہیں"؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں جناب یہ سب ایک ہی قسم ہے۔ آغا کہنے لگا: "اچھا ذرا اس کو چکھو تو۔ اور پھر اسے چکھو جو تم مجھے پہلے پیش کر رہے تھے"۔ جونہی آقا نے شراب کا گلاس منہ سے لگایا اس کا چہرہ متحیر ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ بھئی واقعی یہ شراب تو بڑے مزے کی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ کیا بات ہے چیرس ذرا اس کو چکھو تو"۔ میرا دل اس شراب کے چکھنے کو ذرا بھی نہ چاہتا تھا۔ میں نے نہایت بددلی سے تھوڑی سی چکھ کر اس کی تائید کر دی۔

آغا کو وہ شراب ایسی پسند آئی کہ اُس نے پچھلی قطار کے دو تین کُپّوں کی شراب چکھ ڈالی یہ اُمید کرتے ہوئے کہ شائد اُسے ایسی ہی شراب کچھ اور مل جائے۔ جب اُسے ایسی شراب نہ ملی۔ تو اس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ اس کُپّے کو گھر لے جائیں اُنہوں نے وہ کُپّا پالکی میں رکھ دیا۔ اور اُسے اُٹھا لے گئے۔

تم اس خوف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو میں نے اس وقت محسوس کیا جب کہ غلام شراب کا وہ کُپّا اٹھا لے گئے۔ میں نے سوچا کہ اب میری جان کی خیر نہیں۔ مجھے فوراً سمرنا سے بھاگ جانا چاہئے۔ میں نے اندازہ کر لیا۔ کہ کتنے عرصہ میں آغا کی شراب ختم ہو گی۔ اور اس کے مطابق نہایت سرگرمی سے تیاری شروع کر دی۔ میں نے اپنے آقا سے کہ دیا کہ میں جا رہا ہوں کیونکہ مجھے جزیرہ [illegible] میں ایک رشتہ دار نے بلایا ہے تاکہ میں اس سے مل کر کوئی کاروبار شروع کروں۔ میرا مالک جس کا گذارہ میرے بغیر مشکل تھا۔ مجھے وہیں ٹھہرنے پر رضامند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن میں اپنی ضد کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں اس کے پاس ہی رہوں۔ تو وہ مجھے اپنا حصہ دار بنانے پر تیار ہے۔ لیکن میں نے اس کی یہ بات نہ مانی۔ شراب خانے کے دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہوتا۔ تو میرا دل دھڑکنے لگتا۔ کہ کہیں آغا اپنے سپاہیوں کے ہمراہ مجھے گرفتار کرنے تو نہیں آ رہا۔ مجھے اگلے دن سدا

ہوتا تھا کہ میرا آقا ہاتھ میں ایک دستاویز لئے شراب خانے میں داخل ہوا۔ اور مجھ سے یوں کہنے لگا "چیرس شاید تمہیں خیال ہوگا کہ میں نے صرف تمہیں سفر سے باز رکھنے کے لئے اپنا حصہ دار بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ اور در اصل میں تم کو دھوکا دے رہا ہوں لیکن شک دور کرنے کے لئے میں یہ دستاویز لایا ہوں جس کے رُو سے تم میرے نفع کے تیسرے حصّے کے مالک قرار دیئے گئے ہو۔ دیکھ لو اس پر قاضی کی مہر تصدیق بھی ثبت ہو چکی ہے۔

آقا نے کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میں انکار کرتے ہوئے واپس کرنے ہی کو تھا کہ کسی نے زور زور سے شراب خانہ کا دروازہ کھٹ کھٹا کر ہمیں دہشت زدہ کر دیا۔ سپاہیوں کی ایک جماعت جو آغا نے ہماری گرفتاری کے لئے بھیجی تھی۔ اندر داخل ہوئی۔ مجھے تو معلوم ہی تھا کہ اصل بات کیا ہے۔ میں اپنے دل میں اپنے آپ کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ میں فوراً کیوں نہ بھاگ گیا بات یہ تھی کہ آغا کو وہ شراب ایسی پسند آئی۔ کہ اس نے میرے اندازے سے پہلے ہی چٹ کر ڈالی۔ شراب کے کپّے کے تیسرے حصّے میں تو غلام ہی سما چکا تھا۔ اس لئے شراب کا اس قدر جلد ختم ہو جانا لازمی امر تھا۔ اب میرے لئے فرار کا کوئی امکان نہ تھا میرا آقا جو اس حقیقت سے ناآشنا تھا۔ بالکل مطمئن تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے سپاہیوں کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن مارے دہشت کے میرا دل پھٹا جاتا تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو آغا نہایت غصّہ سے میرے مالک پر برس پڑا۔ اور کہنے لگا "او یہودی کتّے! کیا تو ایک دیانت دار مومن کے پاس دھوکے سے شراب کا ایک ایسا کپّا فروخت کرتا ہے جس کا دو تہائی حصّہ بھی بھرا ہوا نہیں۔ فوراً بتا کہ تو نے اس میں بھاری بھاری کیا چیز بھر دی ہے؟"

میرے آقا نے کہا "صاحب میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا بالکل بے قصور ہوں" آغا نے جواب دیا "اچھا کپّا خالی تو ہو چکا ہے۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ذرا اپنے یونانی کو بھیجو کہ اندر لے آئے۔ تاکہ اس کو میری موجودگی ہی میں کھولا جائے"۔ دو سپاہی اندر لانے کے لئے روانہ کر دئے گئے۔ جب وہ پاس آئے۔ تو آغا نے مجھے کپّے کا ڈھکنا اکھاڑنے کے لئے کہا۔ اب مجھے اپنی موت کا پورا پورا یقین ہو چکا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ آغا میرے مقابلے میں آقا سے زیادہ ناراض ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ کالے حبشی کی لاش پہچانی جائے گی تو فوراً میرا مالک بری ہو جائے گا۔ اور مجھ پر اس کے قتل کا الزام ثابت ہو جائے گا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جب میں آغا کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کپّے کا ڈھکنا اکھڑ گیا۔ حبشی کی لاش دیکھ کر سب حاضرین دہشت زدہ ہو گئے۔ میں بھی اس کو دیکھتے ہی نہایت خوفزدہ صورت بنا کر پیچھے ہٹا۔ تاکہ مجھ پر سے رہا سہا شک بھی دور ہو جائے۔

لیکن یہ بات بہت عجیب تھی۔ کہ بجائے اس کے کہ حبشی کی لاش بدستور سیاہ رہتی۔ وہ بالکل سفید ہو چکی تھی۔

"خدایا تیری پناہ"۔ میرے مالک کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "اے خدا میں کیا دیکھ رہا ہوں ـــــــ ایک لاش اے خدا۔ میری مدد کر۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ کیوں چیرس! تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو"؟ میں نے جواب دیا کہ "واللہ میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کے متعلق

کچھ علم نہیں"۔

جب ہمارے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ تو آغا میرے مالک کو نہایت غضبناک نگاہوں سے گھور رہا تھا جن سے آغا کی بے پناہ نفرت اور حقارت ظاہر ہو رہی تھی۔ باقی تمام حاضرین اگرچہ خاموش تھے لیکن اُن کے بشرے سے ظاہر تھا۔ کہ وہ میرے آقا کو چیر پھاڑنے میں بھی کوئی دریغ نہ کریں گے۔

میرے آقا نے کہا اے آغا میں بخوشی اس کُپّے سے دوسرا تبدیل کر دوں گا لیکن میں لاش کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ آغا نے جواب دیا "یونہی سہی میرا غلام اس کُپّے کو ابھی لے آئے گا" تھوڑے ہی عرصے میں غلام شراب کا ایک کُپّا لے کر آموجود ہوا۔ میرا آقا آغا سے کہنے لگا۔ گو ایک غریب یہودی کے لئے یہ بڑا بھاری نقصان ہے۔ تاہم میں یہ مفت آپ کی نذر کرتا ہوں" اور اس نے واپس جانے کے خیال سے اپنی ٹوپی اٹھالی۔

آغا نے چلا کر کہا "ٹھہر جاؤ میں تمہاری شراب مفت ہی میں ہضم نہیں کر دوں گا"۔ میرے آقا نے کہا اچھا تو پھر آپ مجھے اس کی قیمت بھی ادا کر دیں گے۔ آپ بڑے انصاف پسند ہیں آغا نے تیزی سے جواب دیا ابھی تم کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور اپنے نوکروں سے کہا کہ وہ اس شراب کو کپّوں میں بھر دیں۔ جب شراب کا کُپّا خالی ہو گیا۔ تو آغا نے اس کا ڈھکنا اُتروا دیا پھر اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ میرے آقا کو اٹھا کر اُس میں بند کر دیں اُس وقت میرے آقا کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی میں اپنے آپ پر لعنتیں بھیج رہا تھا کیونکہ میرے پاس اپنے آقا کو قصوروار ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور میں جانتا تھا۔ کہ میرے کئے کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ سپاہیوں نے میرے آقا کو اٹھا کر اُس کُپّے میں بند کر دیا۔ آغا نے مجھے حکم دیا۔ کہ تم پہلے کی طرح اِس پر کیلوں سے مضبوط ڈھکنا لگا دو۔ اگرچہ میرا دل یہ کام کرنے کو بالکل نہ چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس لئے میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب آغا نے نوکروں کو حکم دیا کہ وُہ اس کُپّے کو پھر شراب سے بھر دیں۔ اس طرح میرا بے قصور آقا ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا گیا

اب آغا میری طرف مخاطب ہو کر پوچھنے لگا "تم اس معاملے کے متعلق کیا جانتے ہو"؟ میں نے سوچا کہ اب میرے آقا کی جان تو لی جا چکی ہے۔ اب اگر میں اس کو کچھ بُرا بھلا بھی کہہ لوں۔ تو اُس کا کچھ نہ بگڑے گا۔ میں نے آغا کو جواب دیا "حضور میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ کچھ عرصہ قبل ایک حبشی نہایت پُراسرار طریقے سے غائب ہو گیا تھا۔ اور میرے آقا نے اس کی تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ حضور اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے۔ کہ اس بیچارے کا بھی یہی حشر ہوا ہو گا۔ اور جناب جب آپ شراب کا وُہ کُپّا اٹھا لے گئے تھے۔ تو میرا آقا بہت افسوس کرتا رہا۔ شاید اُس نے وہ کسی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ شاید میری بھی یہی گت بنتی مجھے شک ہے کہ اب باری بھی میری ہی تھی۔ کیونکہ جب میں نے یہاں سے جانے کا ارادہ کیا۔ تو وہ میرے یہیں ٹھہرنے پر مصر ہوا جب میں کسی طرح نہ مانا تو اُس نے یہ دستاویز پیش کی۔ یہ پڑھ لیجئے۔ اُس کے رُو سے میں اُس کے نفع کے تیسرے حصّے کا مالک قرار دیا جا چکا ہُوں۔ شاید میں اس نفع سے زیادہ دیر متمتع نہ ہو سکتا۔

آغا نے جواب دیا۔ اسے یونانی یہ اچھا ہی ہوا۔ یہ تمہارے لئے بہت فائدہ مند ہوگا۔ کیونکہ چند شرائط پر تم اُس کی تمام جائداد کے مالک قرار دیئے جا سکتے ہو۔ پہلی شرط تو یہ ہے۔ کہ شراب کا یہ کُپّا جس میں یہ حرامی یہودی بند ہے تمہیں اپنے پاس رکھنا ہوگا۔ تاکہ جب میں وہاں آؤں۔ تو اپنے انتقام اور انصاف کی یاد تازہ کر کے خوش ہوا کروں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شراب کا یہ دُوسرا کُپّا بھی تم اپنے پاس رکھو جس میں یہ حبشی غلام بند ہے تاکہ اس کو دیکھ کر میرا غصہ تازہ ہو جایا کرے۔ آخری شرط یہ ہے کہ میں تم سے جس قسم کی بہترین شراب مانگوں۔ تمہیں مفت دینی ہوگی۔ کیا تمہیں یہ شرائط منظور ہیں۔ یا میں تمہیں بھی اس گناہ کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ایک سمجھوں۔

میں نے شکر کیا۔ اور یہ سب شرائط مان لیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئیے۔ کہ اس وقت کوئی بھی کسی یہودی کی پروا نہیں کیا کرتا تھا۔ جب مجھ سے کوئی میرے آقا کی غیر حاضری کے متعلق کچھ پوچھتا۔ تو میں پوچھنے والے کے قریب نہایت رازداری سے جا کر کہتا کہ آغا کے سپاہیوں نے اُسے قید میں ڈال رکھا ہے اور اس کے رہا ہونے تک میں یہاں کام کروں گا۔

آغا کی خواہش کے مطابق شراب کے دونوں کُپّے جن میں حبشی غلام اور یہودی تاجر بند تھے۔ ایک بیچ پر سب کُپّوں سے الگ سٹور کے درمیان رکھ دیئے گئے۔ آغا ہر شام شراب خانے میں آتا اور گھنٹوں اس کُپّے کی طرف (جس میں میرا آقا بند تھا) ٹکٹکی لگائے گالیاں دیتا رہتا۔ اس دوران میں وہ اس قدر شراب پیتا۔ کہ اکثر اُس کو تمام رات شراب خانے میں بسر کرتے بنتی۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئیے۔ کہ میں نے اُن کُپّوں کے مفید اجزا سے کچھ کام نہ لیا۔ میں رات کو چپکے سے اُن کُپّوں میں سے پہلی شراب نکال لیتا اور تھوڑی تھوڑی شراب دوسرے کُپّوں میں ٹپکا دیتا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میرے پاس شراب کا ایک گیلن بھی ایسا نہ رہا جس میں میرے آقا اور حبشی غلام کے عرق کی آمیزش نہ ہو۔ اب میری شراب پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں میں ایک امیر آدمی بن گیا۔

تین سال نہایت خوشحالی میں بسر ہوئے۔ آغا میرا مستقل گاہک بن چکا تھا۔ اور کم از کم ہفتہ میں تین بار میرے شراب خانے میں آ کر نشے میں چور پڑا رہتا تھا۔ اب اس کی صحبت نے مجھے بھی پکا شرابی بنا دیا۔ ایک روز اُسے حکم آیا کہ اپنی سپاہ لے کر سلطان کی فوج سے آ ملے۔

جس دن اس کی فوج کو کُوچ کرنا تھا۔ وہ میرے دروازے پر ٹھہرا۔ اور اپنے عربی گھوڑے سے اُتر کر ایک آخری جام پینے آیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کوچ شروع کر دیں۔ وہ بعد میں اُن سے آ ملے گا۔ اس نے بے تحاشا شراب پینی شروع کی۔ ایک گلاس کے بعد دوسرا خالی ہوا اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ ساتھ ہی وقت بھی گذرتا گیا۔ رات ہونے کے قریب تھی اور آغا حسب معمول نشے میں مخمور پڑا تھا۔ اُس نے مجھ سے اصرار کیا۔ کہ میں اُس کو شراب خانے کے ذخیرہ میں جہاں شراب کے دونوں کُپّے رکھے تھے۔ لے جاؤں تاکہ وہ ایک دفعہ پھر میرے آقا کو اچھی طرح گالیاں دے۔ چونکہ اس رات میں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اس لئے میں نشے کے عالم میں آغا سے یوں گویا ہوا۔

"اے قابلِ ستائش آغا! میرے آقا کو زیادہ گالیاں نہ دیجئے۔ کیونکہ دراصل وہی میری خوشحالی کا باعث ہوا ہے۔ چونکہ آپ اب جا رہے ہیں۔ اس لئے میں آپ پر ایک راز افشا کئے دیتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ میرے ذخیرے میں شراب کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں۔ جو یا تو میرے آقا یا حبشی غلام سے خوشبودار نہ کر دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میری شراب بہترین مانی جا چکی ہے"۔

"ہیں! کیا!!" آغا نے بڑبڑا کر کہا جس کے لئے اب نشے کی حالت میں بولنا بھی تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ "اچھا اے حرامی تیری سزا موت ہے۔ تو بھی اپنے مالک کی طرح کیفرِ کردار کو پہنچے گا"۔ "تو ایک مومن کو ایک گنہگار کافر کے عرق والی شراب پلاتا رہا۔ اے دجال! تو ضرور موت کے گھاٹ اتارا جائے گا"۔

وہ لپک کر میری طرف بڑھا لیکن اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور نشے کے عالم میں وہ دھم سے زمین پر آ گرا۔ اور پھر نہ اُٹھ سکا۔ میں نے سوچا کہ یقیناً وہ ہوش میں آنے پر بھی یہ واقعہ نہ بھولے گا۔ اور میں اس کے انتقام کا شکار ہو جاؤں گا۔ موت کے خوف نے اور شراب کے نشے نے مجھے بتا دیا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے فوراً آغا کو گردن سے پکڑ کر ایک کُپّے میں گھسیڑ دیا اور اُس کا ڈھکنا مضبوط بند کر کے اس کو شراب سے بھر دیا۔ اس طرح میں نے اپنے غریب آقا کا بدلہ لے لیا۔ اور آغا کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک ہو گیا۔ اس کے بعد میں صحن میں گیا جہاں آغا کا گھوڑا بندھا تھا۔ میں نے آغا کی تلوار لے کر بیچارے جانور کو اچھی طرح زخمی کر کے چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنے گھر چلا جائے۔ آدھی رات کو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے آغا کے گھر والوں کو جگا دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ گھوڑا زخمی ہو چکا ہے اور آغا اس پر سوار نہیں۔ تو انہوں نے خیال کیا۔ کہ آغا کو دشمن کے کسی گروہ نے راستے میں قتل کر دیا ہو گا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ آغا کس وقت میرے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے کہا کہ شام ہونے کے ایک گھنٹہ بعد۔ اور میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس وقت شراب کے نشے سے چُور تھا چنانچہ وہ اپنی تلوار بھی یہیں بھول گیا ہے۔ میں نے تلوار ان کے حوالے کر دی۔ اب میں اپنے خطرناک رازدار سے رہائی پا چکا تھا۔ اگرچہ وہ میری شراب کا کافی حصہ پی گیا تھا لیکن میں نے بھی اس کی استعمال شدہ شراب پر سود لگا کر نقصان پورا کر لیا۔ یعنی آغا کی آمیزش سے اپنی باقی ماندہ شراب خوشبودار کر لی۔ میں نے یہ تیسرا کُپّا بھی ان دو کُپّوں کے ساتھ رکھ دیا اب مجھے اور بھی زیادہ نفع ہونے لگا۔ اور میری شراب دُور دُور تک مشہور ہو گئی۔

ایک دفعہ شہر کا قاضی جو میری شراب کی شہرت سُن چکا تھا۔ میرے شراب خانے میں آیا۔ میں اپنی اس عزت افزائی پر جھک کر آداب بجا لایا۔ میں مدت سے اس کو اپنا خریدار بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی کچھ بہترین شراب گلاس میں ڈال کر قاضی کو پیش کی۔ اور کہا "عالی جاہ! یہ میرے آقا کی شراب ہے۔ مرحوم آغا اس کے بڑے شیدا تھے۔ بس جناب وہ تو تمام کا تمام کُپّا ہی اُٹھوا کر لے جایا کرتے تھے"۔ قاضی کہنے لگا۔ ہاں یہ بھی خوب تجویز ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے غلام کو برتن دے کر بھیجا جائے۔ یہ بہتر ہے۔ کہ تمام کا تمام کُپّا ایک ہی دفعہ خرید لیا جائے۔ تاکہ انسان لوگوں کے اعتراض سے بچ جائے۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا لیکن خریدنے سے پہلے مجھے ذرا چکھ لینی چاہئے"۔ اُس نے بہت سے کُپّوں کی شراب چکھی لیکن اُس کو سب سے زیادہ پسند وہی آئی جو میں نے پیش کی تھی۔ آخر کار اُس نے اُن تینوں کُپّوں

پر نگاہ ڈالی جو سب سے اونچے رکھے گئے تھے۔ اور دریافت کیا کہ وہ کیسی شراب ہے؟ میں نے جواب دیا "خالی کپّے ہیں جناب"۔ لیکن وہ اپنی چھڑی سے کپّوں کو ٹھوکریں لگا کر کہنے لگا "تم تو کہتے تھے کہ کپّے خالی ہیں۔ لیکن یہ آواز سے تو بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یقیناً ان کپّوں میں تم نے بہتر شراب چھپا رکھی ہے۔ ذرا اس کپّے کی تھوڑی سی شراب تو دکھاؤ"۔

مجھے چار و ناچار تعمیل کرنی پڑی۔ اس نے وہ شراب چکھی۔ اور کہنے لگا "واللہ یہ نہایت ہی عمدہ اور خوشبودار شراب ہے۔ میں یہ تمام کی تمام خرید لوں گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ شراب دوسرے کپّوں کی شراب کو خوشگوار بنانے کے لئے رکھی گئی ہے۔ اور اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ مجھے امید تھی۔ وہ اس کی زیادہ قیمت ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ پوچھنے لگا "اس کی کیا قیمت ہے" میں نے کہا "پہلی سے چار گنا زیادہ"۔ قاضی چلا کر کہنے لگا "مجھے منظور ہے۔ مجھے منظور ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اچھی چیز قیمت خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتی"۔

میں سخت خوف زدہ ہوا۔ اور میں نے قاضی کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس شراب کو فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں نے اپنی شراب کو عمدہ بنانے کا سامان تباہ کر دیا۔ تو میری تمام شہرت خاک میں مل جائے گی"۔ لیکن میرے تمام عذر بے کار ثابت ہوئے قاضی کہنے لگا "میں نے تم سے قیمت پوچھی تھی اور تم عام شراب سے چار گنا قیمت پر رضامند تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے شراب خرید چکا ہوں اور اب اسے واپس نہیں دے سکتا"۔ اُس نے اپنے نوکروں کو بلایا۔ جو شراب کے تینوں کپّے اٹھا کر لے گئے۔

میں نے دوسرے ہی دن سفر کی تیاری شروع کر دی۔ جلد ہی قاضی سے قیمت بھی وصول کر لی گئی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اب یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے زبردستی اس شراب کی فروخت پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور مجھے اب اپنی تجارت کے فروغ کی بھی کوئی امید نہیں رہی۔ میں نے اُس سے دوبارہ التجا کی کہ اگر تینوں کپّے واپس دے دے۔ تو میں اُس کے عوض اس کو تین دوسرے کپّے مفت دے دوں گا۔ لیکن اُس نے میری ایک نہ سنی۔

میں نے ایک جہاز ران سے چند شرائط طے کر کے اپنی بچی کھچی شراب لدوا دی۔ اور اپنا تمام سرمایہ لے کر اس سے پہلے کہ قاضی پر میرا راز افشا ہونے پائے جزیرہ کارفیو کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن ہمیں رستے میں ایک سخت آندھی اور طوفان سے پالا پڑ گیا۔ دو ہفتے تک ہم آگے بڑھنے کی بے فائدہ کوشش کرتے رہے۔ آخر کار اس طوفان نے ہمارے جہاز کو پھر سمرنا کی طرف دھکیل دیا۔ جب موسم ذرا سکون پذیر ہوا۔ تو میں نے کپتان سے کہا۔ کہ اب ہمیں ساحل سے ذرا دُور لنگر انداز ہو جانا چاہئے۔ تاکہ مطلع صاف ہونے پر ہم فوراً اپنا سفر جاری کر سکیں۔ ابھی ہمیں لنگر ڈالے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ میں نے دیکھا۔ کہ ساحل کی طرف سے ایک کشتی ہماری طرف آ رہی ہے جس میں قاضی اور عدالت کے دوسرے رکن موجود تھے۔ مجھے اپنی گرفتاری کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ میں اپنے آپ کو کیوں نہ شراب کے ایک کپّے میں بند کر کے چھپ جاؤں میں نے کپتان کو جلدی سے جہاز کے نچلے کمرے میں بلایا۔ اور اسے مختصر طور پر تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ اور اس سے وعدہ

کیا کہ اگر وہ اس وقت میری مدد کرے گا تو میں اسے اپنے مال کا بہت سا حصّہ دے دوں گا۔

کپتان جو میری بدقسمتی سے یونانی تھا اس بات پر رضامند ہوگیا ہم جہاز کے گودام میں پہنچے۔ اور ایک کپّے سے شراب نکال کر میں اس میں داخل ہوگیا۔ اور کپتان نے اوپر مضبوط ڈھکنا جڑ دیا۔ اس کے بعد فوراً ہی قاضی بھی جہاز پر آپہنچا۔ اور میرے متعلق دریافت کرنے لگا۔ کپتان نے اسے جواب دیا کہ "جناب طوفان کے دوران میں وہ ڈک پر سے سمندر میں گر پڑا تھا۔ اور اس کے بعد اُس کا کچھ پتا نہیں چلا"۔

قاضی کہنے لگا "افسوس کہ میں اُس بدمعاش سے بدلہ بھی نہیں لے سکا لیکن کیا تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو۔ ذرا میں جہاز کی تلاشی تو لوں"۔

قاضی اور اُس کے مصاحبوں نے جہاز کا کونا کونا چھان مارا۔ لیکن وہ مجھے کہیں بھی نہ پاکر واپس چلے گئے۔ اب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کپّے کی لکڑی میں جو شراب سرایت کرچکی تھی۔ اس کی بدبُو سے میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد وہاں سے رہائی ہو۔ لیکن غدار کپتان کب مجھے چھوڑنے والا تھا۔ وہ تو میرے پاس پھٹکا تک نہیں۔ رات کے قریب اُس نے جہاز کا لنگر اٹھایا اور جہاز روانہ ہوگیا۔ میں نے کپّے کے پاس دو آدمیوں کو باتیں کرتے سُنا اور میں کپتان کے ارادے سے مطلع ہوگیا اس کا ارادہ تھا کہ وہ مجھے سمندر میں ڈبو کر میری تمام جائداد پر قبضہ کرلے۔ میں کپّے کے سُوراخ کے قریب (جس میں سے شراب ڈالی جاتی ہے) مُنہ لاکر زور زور سے چلّا کر رحم کی التجائیں کرنے لگا لیکن بے سود ثابت ہوا۔ جہاز کے آدمیوں میں سے ایک نے جواب دیا "تمہارے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو تم نے دُوسروں سے روا رکھا تھا"۔

اب میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اگر مجھے غرق ہی ہونا ہے۔ تو میرا جلد سے جلد فیصلہ کردیا جائے۔ تاکہ مجھے اس غم و اندوہ اور مصیبت سے جلد چھٹکارا حاصل ہو۔ مجھے موت کا خیال موت سے زیادہ اذیت دے رہا تھا لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ آندھی نہایت زور و شور سے چلنے لگی۔ اور جہاز کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگیا۔ کپتان اور دوسرے ملّاح جہاز کی نگرانی میں اس قدر منہمک ہوگئے کہ یا تو وہ مجھے بالکل بھول گئے۔ یا میری موت کسی پُرامن دن پر ملتوی کردی گئی۔

تیسرے دن میں نے ملاحوں کو کہتے سُنا کہ اگر اُن کے جہاز پر مجھ جیسا بدکردار تھوڑا عرصہ بھی اور رہا تو وہ ضرور غرق ہوجائے گا۔ انہوں نے کپّے کے سُوراخ کا ڈھکنا اُتار دیا اور مجھے موجیں مارتے ہوئے سمندر میں دھکیل دیا گیا۔ تاکہ کپّے میں پانی بھر جائے۔ اور میں ڈوب جاؤں۔ کپّے کے سوراخ میں میں نے اپنا رُومال ٹھونس دیا۔ اور کپّا پانی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ جب اُس کا سُوراخ والا حصہ پانی میں جاتا تو میں رُومال کی مدد سے اس میں پانی داخل نہ ہونے دیتا۔ جب سوراخ پانی سے باہر آتا۔ تو میں فوراً سوراخ سے رُومال نکال لیتا تاکہ اس میں تازہ ہوا داخل ہوسکے۔ کپّا گھومتا جا رہا تھا اور ان دھکوں اور چکّروں کے سبب بُرا حال تھا۔ میں تھک کر چُور ہوگیا۔ اور میں نے چاہا کہ سوراخ میں سے رُومال نکال لوں تاکہ اس منحوس زندگی کا کہیں خاتمہ ہو۔ دفعتہً سمندر کی موجوں نے مجھے تین ایسے دھکّے دیے۔ کہ میں اب رُومال کی مدد سے پانی نہ روک سکا۔ کپّا لڑھکتا ہُوا موجوں پر بلند ہوگیا۔ یکایک وہ زور سے کسی چیز کے ساتھ ٹکرایا اور میری

ناک کو بری طرح چوٹ آئی۔

ایک لمحہ کے بعد میں نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سُنا۔ وہ کُپّے کے پاس جمع ہوگئے اور انہوں نے اس کو کنارے کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ میں کُپّے میں خاموش رہا۔ کہ مبادا وہ میری آواز سُن کر خوف زدہ ہو جائیں! اور مجھے پھر سمندر کی بے پناہ موجوں کے حوالے کردیں جب وہ ایک جگہ آکر رُک گئے۔ تو میں نے سوراخ کے قریب منہ لاکر نہایت نحیف آواز سے کہا "خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور مجھے باہر نکالئے"

پہلے تو وہ لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ لیکن جب میں نے اُن سے کئی دفعہ گڑگڑا کر التجا کی اور انہیں بتایا کہ میں جہاز کا مالک ہُوں اور کپتان اور دوسرے ملاحوں نے مجھ سے غداری کر کے مجھے اس طرح سمندر میں پھینک دیا ہے۔ تو انہوں نے کُپّے کا ڈھکنا اکھاڑا اور مجھے رہائی دلائی۔

رہائی کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر میری نگاہ پڑی۔ وہ میرا جہاز تھا جو ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ ہر لہر جو جہاز کو کنارے کی طرف دھکیلتی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کی دھجیاں اڑائی جاتی تھی۔ جہاز کے بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اور پانی میں ہر طرف جھاگ ہی جھاگ نظر آتا تھا میرے سب کُپّے سمندر میں بکھرے ہوئے تیر رہے تھے۔ کیونکہ جہاز کی ٹکر کے بعد جب وہ کنارے سے آلگے۔ تو ساحل کے لوگوں نے انہیں پھر سمندر میں دھکیل دیا تھا۔

جب مجھے ذرا ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے سپاہی میرے ارد گرد بیٹھے آگ تاپ رہے ہیں۔ اور میری شراب کا ایک کُپّا نہایت سُرعت سے خالی کیا جا رہا ہے۔ میرے منہ میں بھی تھوڑی سی شراب ڈالی گئی جس سے مجھ میں اٹھنے کی طاقت آگئی! اب اُن سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ اُن کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ "جو آدمی جہاز کی تباہی سے بچ نکلے تھے۔ انہوں نے مجھے تمہارے بے پناہ گناہوں کی عجیب و غریب داستانیں سُنائی ہیں۔ اب بیٹھ جاؤ اور مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو اگر میں نے تمہارے بیان پر یقین کر لیا تو تم سے انصاف کیا جائے گا میں یہاں کا قاضی ہوں۔ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تم کہاں ہو تو یہ خلیج سیلیز کا جزیرہ اسچیا ہے۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تم کس کی صحبت میں ہو تو ہم وہ لوگ ہیں جنہیں جاہل لوگ بحری ڈاکو کہتے ہیں ہاں اب سچ سچ کہو"

میں نے خیال کیا کہ بحری ڈاکوؤں کو میری کہانی دوسرے لوگوں سے ذرا زیادہ ہی پسند آئے گی۔ اس لئے میں نے اپنی تمام کہانی لفظ بہ لفظ اسی طرح بیان کر دی جس طرح اب تم سے بیان کر رہا ہوں۔

وہ نہایت توجہ سے سنتے رہے جب میں اپنی کہانی ختم کر چکا تو قاضی کہنے لگا "جیسا کہ تم نے بتایا ہے تم ایک حبشی کو قتل کر چکے ہو اور ایک یہودی کے قتل ہونے کا سبب ہوئے ہو۔ نیز تم نے ایک آغا کو شراب میں ڈبو کر ہلاک کیا ہے! اس لئے تمہاری سزا یقیناً موت ہے لیکن میں تمہاری قابل قدر شراب کا لحاظ کرتے ہوئے اور ایک پُراسرار راز کے افشا کرنے کی بنا پر موت کا حکم منسوخ کرتا ہوں کپتان اور دوسرے سرداروں نے طوفانی سمندر میں غداری کی ہے جو ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے اس لئے ان کی سزا بھی فوری موت ہے لیکن چونکہ اُن ہی کی وجہ سے ہمیں ایسی عمدہ شراب حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے میں ذرا اور نرم ہونا ہوں اور اب ایک ایسا حکم صادر

کرتا ہوں جس کی وجہ سے تم سب اپنی تمام عمر محنتِ شاقّہ میں بسر کرو گے۔ تم سب قاہرہ میں بطور غلاموں کے بیچ دیئے جاؤگے۔ نقدی تو ہم اپنی جیبوں میں ڈال لیں گے۔ اور تمہاری شراب پی جائیں گے۔

بحری ڈاکوؤں نے قاضی کے انصاف کی داد تالیوں سے دی۔ اور ہماری کوئی فریاد نہ سنی گئی۔ جب مطلع صاف ہوا تو ہم ایک چھوٹے سے جہاز میں بٹھا کر قاہرہ کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ جب ہم بندرگاہ میں پہنچے، تو ہم فروخت کے لئے پیش کئے گئے اور زر خرید غلام بنا لئے گئے۔

مہدی علی خاں

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

حسنِ اتفاق سے غالب مغفور کا ایک غیر مطبوعہ خط مل گیا جس میں حروفِ تہجی کی تذکیر و تانیث پر بحث کی ہے۔ ناظرین ہمایوں کی ضیافتِ طبع کے واسطے نقل خط حاضر ہے۔

سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علیخان کو بعد دُعا کے دل نشین ہو کہ تذکیر و تانیث ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں ہے لو ایک لفظ اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہل پورب اس کو مونث بولتے ہیں۔ اخیر جو میری زبان پر ہے۔ وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گروہ نے کچھ مان لیا ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔ اس کا قاعدہ منضبط نہیں۔ الف مذکر۔ ب ت ث مونث۔ ج ح خ مونث۔ د ذ ال مونث۔ رے زے مونث۔ س ش مذکر۔ ص ض ط ظ مونث۔ ع غ مذکر۔ ف مونث۔ ق ک کاف لام میم نون مذکر۔ واو ہی ی مونث۔ لام الف حروف مفردہ میں نہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا۔ مثلاً لام الف کیا خوب لکھا ہے کہیں گے کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے۔ شہزادہ خداوندزادہ کا مخفف ہے لیکن فارسی نہیں عربی نہیں۔ اردو کا روزمرہ تھا۔ شہزادہ اور شہزادی مرادف صاحبزادہ اور صاحبزادی ہے۔ مگر فی زمانہ متروک ہے۔ رفق فارسی لغت نہیں ہو سکتا عربی بھی نہیں۔ روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن لکھتا ہے ؎ کہ رستم جسے دیکھ رہ جائے رفق۔ شعرائے حال کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ تکیہ لفظ عربی الاصل ہے۔ فارسی و اردو میں مستعمل۔ دونوں زبانوں میں ہم بمعنی بالش اور ہم بمعنی مکانِ فقیر آتا ہے۔ ایران میں تکیہ مرزا صائب مشہور ہے۔ گل تکیہ لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے۔ گل مخفف گال کا اور تکیہ بمعنی بالش وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں گل تکیہ کہلاتا ہے۔ گل بمعنی پھانسی انگریزی لغت ہے (غالباً مرزا صاحب کی Gallows سے مراد ہوگی ـــــ فرخ) انگریزی زبان سو بنگالہ میں سو برس سے اور دلّی اکبرآباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ گل تکیہ وضع کیا ہوا نورجہاں بیگم کا ہے جہانگیر کے عہد میں اہلِ ہند کیا جانتے تھے کہ گل کیا چیز ہے۔ معنی مفرد بہ لفظ جمع اس جملہ کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا بمعنی مفرد معانی جمع اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے معنے کیا ہیں یا اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں۔ اس میں دخل نہیں کیا جاتا۔ خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے معانی کی جگہ معنے بولتے ہیں۔ ارت لفظ ہندی الاصل ہے بہ ہائے مضمرہ بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث۔ ۱۲ شعر بہت اچھا ہے صاف و ہموار!

راقم غالبؔ

نوٹ:۔ خط میں تاریخ مرقوم نہیں۔

سید فرخ حیدر

کلامِ تاجور

مری زندگی جو کشاکشِ غمِ زندگی میں بسر ہوئی
تو کہا یہ عشق نے آ ادھر تری زندگی کو سنوار دوں

یہ ہے احترامِ جنونِ عشق، یہ فرضِ مذہبِ عشق ہے
کہ بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں

تجھے کیا سناؤں یہ حادثہ کہ چمن میں جوشِ بہار ہے
تجھے ہمصفیرِ اسیرِ قفس کی قید میں کیا نویدِ بہار دوں؟

تاجور

نواہائے راز

خورشید اُس کے نُور سے شرمندہ ہوگیا
ذرہ فروغِ حُسن سے رخشندہ ہوگیا

کیوں منفعل ہو پیرِ دہی خضر سے کوئی
میں تجھ پہ مر کے زندہ دپائندہ ہوگیا

جو حرف آگیا مرے دیوان میں ایک بار
آئینۂ گذشتہ و آئندہ ہوگیا

اُس شمعِ رُو کی یاد کا اعجاز دیکھنا
ہر ذرہ میری خاک کا تابندہ ہوگیا

افسونِ شعر بھی دمِ عیسیٰ سے کم نہیں
جس کا بھی ہم نے نام لیا زندہ ہوگیا

حامد علی خاں

فطرتِ شاعر

کبھی روئے یزداں کے ہمرنگ ہیں ہم
کبھی اہرمن سے ہم آہنگ ہیں ہم

کبھی ہم سراپا اسیرِ خودی ہیں
کبھی خود سے آمادۂ جنگ ہیں ہم

کبھی پیش رو ہیں نبردِ بقا میں
کبھی اپنی ہستی سے خود تنگ ہیں ہم

کبھی "فخرِ عالم" لقب ہے ہمارا
کبھی دہر میں باعثِ ننگ ہیں ہم

تغیّر پرستی ہے فطرت ہماری
برنگِ تماشائے نیرنگ ہیں ہم

جاذب

محفل ادب

مرزا غالب کی ظرافت نگاری

جب ہم مرزا غالب کی ظرافت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کسی جگہ پھبتی کہتے ہیں نہ ظرافت کے لئے انوکھی تشبیہیں تلاش کرتے ہیں نہ لطائف پر اپنا دار و مدار رکھتے ہیں۔ نہ غیر معمولی باتیں بیان کرتے ہیں۔ خوشی کی جگہ خوشی کے اور غم کی جگہ غم کے الفاظ لائے ہیں۔ واقعات کا بے کم و کاست اظہار کرتے ہیں۔ مگر ان کی فطری اور طبعی ظرافت اور زندہ دلی اسی سادگی میں بلا کی شوخی پیدا کر دیتی ہے وہ روا روی میں ایک بات کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ مگر سننے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔

کس قدر حیرت خیز اور کتنا تعجب انگیز ہے۔ یہ امر کہ وہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں اور انتا ناراض ہوتے ہیں۔ کہ خود اُن کے بڑھاپے کے ہاتھ پاؤں کانپتے نظر آتے ہیں۔ چہرہ پر غیظ و غضب کے آثار ہیں۔ ماتھے پر شکنیں ہوتی ہیں۔ غصہ سے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ زیر لب کچھ کہتے جاتے ہیں۔ مگر سننے والا سمجھتا ہے۔ کہ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور دل میں انبساط پیدا ہو رہا ہے۔ اور ظرافت اگر صرف ظرافت ہو تو خیر کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر ان کے یہاں تو اُسی میں اخلاق ہے۔ اُسی میں رنج و ملال کا اظہار ہے۔ اُسی میں اُن کی عاداتِ فطری کے آثار ہیں۔ اسی میں جذباتِ مسرت ہیں اسی میں درد کا بیان ہے۔ اسی میں تاریخی واقعات ہیں اسی میں شہر دہلی کے حالات ہیں اسی میں تعلیم ہے۔ اسی میں تلقین ہے۔ اُسی میں شفقتِ بزرگانہ کا لحاظ ہے۔ اُسی میں مراسمِ دوستانہ کا ظہور ہے۔ وہیں فخر و مباہات کے دریا بہ رہے ہیں اور وہیں سرِ عجز و نیاز جھک رہا ہے۔ غرض کہ ان کے چند فقرے نہ صرف تفنن کا کام دیتے ہیں۔ بلکہ ایک وسیع فضا پیش کر دیتے جہاں لطف و تفریح کے ساتھ عبرت و بصیرت بھی سامنے آجاتی ہے اور لوگ بھی جیسا کہ بیان ہو چکا۔ اِس رنگ کے لکھنے والے ہیں مگر وہ ظرافتِ حقیقی جس سے رُوح کو لطف حاصل ہو وُہ صرف مرزا کا حصہ ہے۔ عالمگیر کی تحریر میں بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ مگر ان کی ظرافت میں ایک جاہ و جلال اور ایک نوع کا غصہ بھی شامل ہے۔ مثلاً وہ محمد معظم شاہ کو لکھتے ہیں۔

"اعلیحضرت فردوس منزلت بہ گرفتن ولایت بلخ و بدخشاں و خراسان و ہرات ملک قدیم موروثی توجہ مفرط داشتند و کر را فواج بادشاہی بسرکردگی مراد بخش بآں سو فرستادہ شد چنانچہ اکثر آں ولایت فتح ہم شد لیکن بہ سبب کم حوصلگی آں نامراد کہ بے طلب حضور برخاستہ آمد و اصلاً اہالی و اکابر آں دیار پرداخت ملک مقبوضہ از دست رفت و محنت و زر ضائع گشت اینجاست کہ گفتہ اند از پسر ناخلف دختر بہتر نظر بایں توجیہ کہ ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند این فانی را آرزو باقی است و تدبیر ش جز اینکہ نبیرہ آنحضرت را با فوجی شایستہ و ساماں بالیستہ بآں سمت

بلفرستیم دیگراز ماچہ ماید۔ باوجود تاکیدات حضور شما تفنہ معارزانہ گرفتہ آید۔ یا باں ہم چہ رسد ظاہر اکار ما از شما نیست۔ عارف بخود پُرعارف است۔ ایں نمود بے بود خود آفتاب سرکوست بدست آمد چہ دینا مدچہ شما فکر خود کنید۔ کہ دریں جا ہم چشماں چہ رو خواہد نمود۔ و درانجا بحضرت حق سبحانہ تعالیٰ و حضرت اعلیٰ"

ضائع گشت تک مندرجۂ بالا عبارت میں بہت خشکی ہے۔ ازینجاست سے عبارت میں رنگینی شروع ہوتی ہے۔ نظر بایں توجیہ سے عبارت میں ایک تفنن کے ساتھ ظرافت کا بہت ہلکا رنگ شروع ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر حسن تنبیہ ظریفانہ انداز میں ہے۔ مگر ہر فقرہ سے غصہ۔ طنز طعن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ بیرۂ آنحضرت۔ و دیگراز ماچہ می آید۔ تاباں ہم چہ رسد۔ ظاہرا کار ما از شما نیست۔ عارف بخود پُرعارف است بشما فکر خود الخ یہ سب فقرے تفنن عبارت کے ساتھ بہت ہلکی ظرافت اپنے ذیل میں لئے ہوئے ہیں مگر کمی اتنی ہے۔ کہ رنگ طنز غالب ہی او رظرافت مغلوب۔ حکیم سوزنی۔ انوری جعفر زٹلی وغیرہ پھکڑ تک پہنچ کر رہ گئے۔ اس کے سوا اور کہیں ان کے یہاں نہیں ملتا۔ البتہ سعدی کے ظریفانہ رنگ میں ہر جگہ ظرافت محض کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اور بہار کا کام دیتا ہے۔

اردو میں بھی بہت سے ظریف ہیں۔ مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم کو ایک خاص ملکہ ہے۔ مگر دو باتیں ہیں ایک تو صرف نظم بیان کی ظرافت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرے ان کے کلام میں کوئی خاص ظرافت نہیں۔ بلکہ اس کا انحصار محض ایک خاص فرقہ کا خاکہ اڑانے اور ایک خاص جماعت کی ہجو ملیح کرنے پر ہے جس سے ایک تصویر دیکھنے والے کی نظر میں پھر جاتی ہے۔ اور اسی پر تمام لطف کا انحصار ہوتا ہے۔

برعکس اس کے مرزا نظم اور نثر دونوں میں ظرافت کے بادشاہ ہیں۔ ان کا کوئی خط ایسا نہ ملے گا جس میں ظرافت نہ ہو۔ مگر نہ اورنگ زیب کی طرح یبوست کو مزاجی رنگ پر غلبہ دیتے ہیں اور نہ نعمت خاں عالی کی طرح الفاظ کے گورکھ دھندے کو ہر جگہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ نہ انوری۔ سوزنی جعفر زٹلی کی طرح فواحش پر اتر آتے ہیں۔ نہ اکبر کی طرح کسی خاص طبقہ اور فرقہ کی طرف سے اظہار تنفر کرتے ہیں۔ اور ان سب عیوب ظرافت سے بچے رہنے کی خاص وجہیں ہیں۔ یبوست سے بچنے کا سبب یہ ہے کہ وہ دراصل فطری ظریف ہیں۔ شاد و خرم ہشاش بشاش دل اپنے پہلو میں رکھتے ہیں۔ تصنع اور آورد کا ان کے یہاں نام بھی نہیں۔ جو لب پر ہے۔ وہ دل میں بھی ہے۔ جو دل میں ہے وہ لب پر بھی ہے۔ برعکس اس کے عالمگیر کے مزاج میں خشکی بھی ہے ظرافت بھی ہے۔ شاہی تمکنت بھی ہے۔ ہر جگہ شان ملوکت کو بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ تقوی و طہارت بھی دامنگیر رہتی ہے۔ خلقی زندہ دلی بھی ان سب میں تھوڑی بہت شامل ہو جاتی ہے

نعمت خان عالی کی طرح الفاظ کے پھیر میں وہ پڑنا نہیں چاہتے۔ مراعات النظیر یا رعایت الفاظ سے انہیں بیر ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت صاف کہتے ہیں۔ مراسلت یا مکاتبت کو جب تک کہ مکالمہ نہیں بنا دیتے انہیں چین ہی نہیں آتا۔ چنانچہ متفخرانہ انداز سے جا بجا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

انوری۔ سوزنی کی طرح پھکڑ نہیں بکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کی سوسائٹی بہت بلند ہے۔ سوائے ایک دو جگہوں کے ان کے یہاں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے۔ جو کسی کے مرتبہ سے کم ہو۔ عالی مرتبہ لوگوں کی صحبت رہی۔ عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ذوق سلیم۔ اور صحیح مذاق لائے پھر ان کو ان باتوں سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

اُن کے رقعات کو دیکھئے اور اُن کے مکتوب الیہم کو جانچئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ وہ کس قدر مزاج داں اور نبض شناس فطرت واقع ہوئے ہیں۔ غیظ و غضب کی حالت ہو کیف و سرور ہو۔ مزاج کا غلبہ ہو۔ رنج و غم ہو۔ خوشی ہو مصیبت ہو غرض کچھ ہو یہ ممکن نہیں کہ ان کے قلم سے کوئی لفظ مکتوب الیہ کی شان کے خلاف نکل جائے۔ اور وہ ایک انچ دائرہ مزاج شناسی سے ہٹ جائیں صرف یہی نہیں کہ مدارج کو ملحوظ رکھیں صرف یہی نہیں کہ کوئی لفظ زائد یا خلافِ محل استعمال نہ ہو۔ یہ بھی ہے کہ مکتوب الیہم کی شان مزاج اور افتادِ طبیعت پر بھی ہر فقرہ روشنی ڈالتا ہے۔ اور اپنا رنگِ طبیعت بھی ظاہر کرتا ہے۔

"نگار"

اُردو فارسی کی مُشترک ترکیبیں

ایسی ترکیبیں بہت ہیں جو فارسی اور اردو میں مشترک ہیں۔ ان کو لوگ جب فارسی کی مخصوص ترکیب سمجھ بیٹھتے ہیں تو غلط بحث ہو جاتا ہے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے لگتے ہیں اس لئے چند مشترک ترکیبیں جو زیادہ اہم ہیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

(الف) ایک ترکیب فارسی کی یہ ہے۔ کہ دو لفظ لے کر ملا دیئے اور مرکب بن گیا مگر بھولنا نہ چاہئیے کہ یہ ترکیب کچھ فارسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اردو میں بھی یہی ترکیب موجود ہے۔ فارسی میں مثلاً اگر جہاں دار گیتی خداوند، شترسوار، شیر دل، راحت منزل، تاج محل، خانہ باغ، کارخانہ، یتیم خانہ وغیرہ ہیں تو اردو میں راج کمار، جگت گرد، بالک ہٹ، تریا ہٹ، مچھی بھون، سکھ بھون، موتی جھیل، رام پھل بہیتا پھل، اندر سبھا، کسان سبھا، اٹاگھر، چڑیا گھر، روشن کھڑکی، بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی، پیر گاڑی، چور گلی وغیرہ۔ اسی اردو ترکیب کی رو سے یہ لفظ بنے جو بالکل صحیح ہیں:۔

تو تا چشم ٹکڑ گدا، جگت استاد، جگت آشنا، پیر بھائی۔ استاد بھائی، چڑیا خانہ، عجائب گھر، کٹھ حجت، کٹھ ملا، امن سبھا، ڈاک خانہ، جھنگڑ خانہ، چانڈو خانہ۔ چھتر منزل، کیسر باغ، ہوا گاڑی۔ کھڑ پیچ، ہاتھ چالاک، چور دروازہ، چور محل، گل تکیہ (یعنی وہ تکیہ جو گال کے نیچے لگایا جاتا ہے۔ سانڈنی سوار وغیرہ۔

"ہندوستانی"

رُوسی ادب

ماں

اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا۔
اور جس وقت اس کے تین شوخ اور کھلنڈرے بچے۔
اس کے گرد کھیل رہے تھے۔ اور شور مچا رہے تھے۔
وہ کسی خیال میں محو تھی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔
بدنصیب بچو تم آخر کیوں پیدا ہوئے

تم بیدھڑک تباہی کے بدھے راستے پر چلو گے
تقدیر کے لکھے سے بچنے کی کوئی صورت نہیں
اے جانباز و جفاکش ماں ان کی قسمت پر مت رو
انہیں شروع جوانی ہی سے یہ سمجھا دے۔
ایک ایسا زمانہ بھی ہوتا ہے۔ پوری صدیوں کی صدیاں
جب کانٹوں۔ کے تاج سے زیادہ زیبا اور پسندیدہ
کوئی عزت نہیں ہوتی۔

"اردو"

تبصرہ و آرا

مرزاجی اور دیگر مضامین۔ مصنفہ ایم اسلم صاحب حجم ۳۰۰ سے زائد صفحات۔ کاغذ کتابت اور طباعت حد درجہ نفیس اور دلکش ہے۔ سرورق نہایت خوبصورت رنگین اور تصویردار ہے۔ اس قدر حسنِ اہتمام سے چھپی ہوئی کتابیں ہماری زبان میں کم ہیں قیمت عمر نسیم بک ڈپو لاہور سے طلب کیجئے۔

ایم اسلم صاحب ایک خوش بیان ادیب ہیں۔ اس کتاب میں ان کے ۲۳ مختلف مضامین جمع ہیں۔ جو مزاحیہ انداز میں لکھے گئے ہیں اور افسانوں کا لطف دیتے ہیں۔ فراغت کی گھڑیاں گزارنے کے لئے یہ کتاب تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور دو روپے چار آنے میں یہ نفیس کتاب جو ہر اردو لائبریری کے لئے باعثِ زینت ہو سکتی ہے۔ بہت ارزان ہے۔ ہم ناظرینِ ہمایوں سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں

اسلم صاحب کی زبان سلیس اور دلکش ہے۔ اور اگرچہ محاورہ کے اسقام سے کلیتہً پاک نہیں مگر اس سے کتاب کے محاسن میں کمی نہیں آتی سلاستِ زبان، محاکات اور لطفِ گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔ مس ماڈالین کی آمد کا ذکر ہے۔ مرزا جی میر کلن سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"میر صاحب کچھ سنا آپ نے؟"
"بیسیوں باتیں ہر روز سنتے ہیں جانے آپ کیا پوچھتے ہیں"
"ولایت والی مس ماڈالن آئی ہیں۔"
"ہاں فرنگن ہے فاحشہ" میر کلن منہ میں گلوری رکھے بکری کی طرح جگالی کرتے بولے "شہر میں چرچا تو بہت سنتے ہیں ہم بھی"
"اجی نہیں میر صاحب" مرزا نے سر ہلا کر کہا "فاحشہ نہیں رقاصہ ہے۔"
"سمجھے" میر کلن بٹیر کے پروں کو سنوارتے ہوئے بولے "تو درگاہ پر قوالی کرتے آئی ہوگی۔ یہ لوگ بھی پیر یادری کو بہت مانتے ہیں "خواجہ" صاحب نے بلوایا ہوگا"

"اجی نہیں" مرزا صاحب نے جھنجھلا کر کہا "کانا دانا نہیں جانتی"
"تو پھر؟"
"ناچتی ہے اور وہ بھی بالکل برہنہ ہو کر۔"
میر کلن دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے۔ مرزا جی کی طرف گردن بڑھا کر کہا۔
"کھائیے تو ہمارے سر کی قسم۔"
"ہاں آپ کے سر کی قسم" "اور پھر چلنے گا؟"
"اجی آنکھوں کے بل۔"

کارزار (ہفتہ وار) حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ادارت میں یہ پرچہ ماڈل ٹاؤن لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اب تک ہماری نظر سے اس کے کئی نمبر گزر چکے ہیں۔ اخبار دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اور قابلیت سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ البتہ بعض مخالفانہ مضامین میں نوک جھونک کی تیزی درشتی ذرا محسوس ہوتی ہے۔ رسالے کے مقاصد حسبِ ذیل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) تہذیب مغرب کے نقائص کی مخالفت اور مشرقی اخلاقِ حسنہ کی حمایت (۲) ملک کی تمدنی اور معاشرتی تحریکوں کی حمایت (۳) ملک کی تعلیمی حالت پر تبصرہ (۴) رائج الوقت اور جدید کتابوں پر آزادانہ رائے (۵) اچھی تحریکوں اور عملی کام میں روڑا اٹکانے والوں اور مذہب پر تمسخر اڑانے والوں کی مذمت (۶) مزدوروں اور کسانوں کی امداد حفیظ صاحب کی نظمیں عموماً اس میں شائع ہوتی ہیں چندہ تین روپے۔ نمونے کا پرچہ از "دفتر کارزار" ماڈل ٹاؤن لاہور سے طلب کیجئے۔

معلوماتِ شنگرف۔ یہ حکیم عبد المجید صاحب عتیقی ایچ پی کی قابل قدر طبی تصنیف ہے اس میں شنگرف کے متعلق تمام قدیم و جدید معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ پہلے باب میں شنگرف کے افعال و خواص کا ذکر ہے باب دوم میں شنگرف کے مرکبات اور اس کا کشتہ بنانے کے طریقے ہیں ساتھ ہی ان امراض کی فہرست دی گئی ہے جن میں شنگرف اور اس کے مرکبات وغیرہ مفید ہیں باب سوم میں کیمیائی عمل درج ہیں باب چہارم میں شنگرف کے متعلق صنعتی مفید نسخہ جات درج ہیں طبیبوں عطاروں اور تاجروں کے لئے یہ کتاب بے انتہا مفید ہے عام شائقین بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں حجم ۱۲۵ صفحات قیمت ایک روپیہ کار ایک ڈپو حلقہ ۲۹ لاہور سے منگوائیے۔

ڈینش رجسٹرڈ یاسمین۔ یہ بالوں کا تیل ہے جس کی ایک شیشی دفتر میں ریویو کے لئے آئی۔ یہ مرکب مختلف ادویہ کو تیل میں حل کر کے تیار کیا گیا ہے۔ اور بالوں کو بڑھانے اور گرتے ہوئے بالوں کو بچانے کے لئے مفید ہے بالوں کے دیگر امراض کے لئے بھی اس کی سفارش کی جاتی ہے۔ قیمت فی بوتل (۱۳ اونس) دو روپے۔ محصول ڈاک ۴/

ریاض کیمیکل اینڈ پرفیومری کمپنی۔ بیرون شیرانوالہ دروازہ۔ لاہور۔

مرزا غالب کے سوانح اور اُن کا کلام

اس موضوع پر مسٹر محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس (پروبیشنر) جو اس وقت آکسفورڈ میں مقیم ہیں۔ ایک مبسوط مقالہ لکھ رہے ہیں۔ وہ بذریعہ ہمایوں ناظرینِ ہمایوں سے درخواست کرتے ہیں، کہ اگر کوئی صاحب غالب کی کوئی نایاب یا غیر مطبوعہ نظم یا خط وغیرہ عاریۃً عنایت کر سکتے ہوں یا ایسے حوالہ جات دے سکتے ہوں جن سے غالب کی زندگی یا کلام کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔ تو وہ مقالہ نگار کو ممنون کرنے اور ایک خالص علمی خدمت بجا لانے سے دریغ نہ فرمائیں غالب کے مآخذِ معلومہ کے علاوہ کسی نئے یا نسبتہً غیر معروف ماخذ کا اضافہ غرض ایسی چیز جو مقالہ نگار کے لئے سوانح و کلامِ غالب کی تنقید و تحقیق کے کام میں باعثِ اعانت ہو شکریے کے ساتھ قبول کی جائے گی۔ جو صاحب اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہیں۔ وہ جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں یا خود مقالہ نگار صاحب سے جن کا پتہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ براہِ راست خط و کتابت فرمائیں۔

مسٹر محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس (پروبیشنر)

جیزس کالج۔ آکسفورڈ (انگلستان)

سالگرہ نمبر کے متعلق آرا

ہمیں ہمایوں کے دسویں سالگرہ نمبر کے متعلق بہت سی قابلِ قدر آرا موصول ہوئی ہیں جن کے ملخص ہم شکریہ کے ساتھ وقتاً فوقتاً "ہمایوں" میں شائع کرتے رہیں گے۔

آنریبل جسٹس سر شادی لال بالقابہ چیف جسٹس ہائیکورٹ پنجاب

میں نے ہمایوں کے مطالعہ پر کچھ وقت صرف کیا اور رسالہ کو دلچسپ پایا۔

شادی لال لاہور ۳ جنوری ۱۹۳۲ء

سر محمد یعقوب (مجلس وضع قانون ہند)

میں نے ہمایوں کا سالگرہ نمبر بالاستیعاب پڑھا۔ اس رسالے کے مدیر و منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ ان کی کوشش سے یہ پرچہ اپنی دہ سالہ عمر کے زمانے میں نہ صرف اوقاتِ مقررہ پر شائع ہوتا رہا بلکہ ابتدا سے وہ افسوسناک غلطیوں اور بے محل نکتہ چینیوں سے محترز رہا میرے خیال میں اس کی کامیابی کا راز اسی طرزِ عمل میں پنہاں ہے۔ بہ اعتبار ظاہری شان کے ہندوستان میں مشکل سے کوئی رسالہ ہمایوں سے بہتر ملے گا اس کے اکثر مضامین دلچسپ اور پر از معلومات ہوتے ہیں بحیثیتِ مجموعی "ہمایوں" ہندوستان کے بہترین رسالوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔

محمد یعقوب مقام نئی دہلی ۴ فروری ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا

سالگرہ نمبر حسنِ اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اور مضامین نظم و نثر دلکش ہیں۔

محمد اقبال لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء

پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم اے۔ آئی ای ایس

ہمایوں کا سالگرہ نمبر موصول ہوا سالِ نو کے اس بہترین تحفہ کے لئے دلی تشکر قبول فرمائیے۔ مجھے اکثر اردو رسالوں کے خاص نمبر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اس لئے مقابلہ کرنے کا امکان موجود ہے۔ ہمایوں کی غالباً یہ پہلی کوشش ہے لیکن ایک ہی سعی میں اپنے معاصرین پر سبقت لے گیا یہ صحیح ہے کہ بعض رسائل تصاویر کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور بعض دفعہ ایک رسالے میں بیسیوں تصاویر بھر دیتے ہیں لیکن راقم الحروف اب عمر کی اس منزل کو پہنچ گیا ہے۔ کہ ایسی تصویریں جن میں کوئی خاص خوبی نہ ہو بجائے دل خوش کن معلوم ہونے کے ناگوار گزرتی ہیں ہمایوں کے پیشِ نظر نمبر میں بھی تصویریں ہیں لیکن اعتدال اور حسنِ مذاق کے ساتھ۔ سرورق بھی سادگی اور زیبائی کا مجموعہ ہے مضامین کی تعریف تحصیلِ حاصل ہے یہ کہنا کافی ہے۔ کہ اس ایک پرچے میں ادب کی تقریباً ہر صنف کے قابلِ قدر نمونے موجود ہیں جن کی خوبی کے خود مضمون نگاروں کے اسمائے گرامی ضامن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اربابِ ذوق آپ کے انتخاب کی داد دیں گے۔

محمد سعید۔ دہلی ۲۷ جنوری ۱۹۳۲ء

سردار حبیب اللہ خان بیرسٹر ایٹ لا

اس رسالے کو آپ نے متواتر خرچ اور محنت کے بعد ایک بلند پایہ پر پہنچا دیا ہے۔ مجھے جس قدر اور ہندوستانی رسالہ جات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں سے یہ ہر طرح افضل و بہترین ہے بلکہ یورپ کے اعلیٰ درجے کے ادبی و علمی رسالوں سے کسی طرح بھی کم نہیں اعلیٰ درجے کے مذاق کے لوگوں کے لئے یہ رسالہ نہایت ہی دلچسپ و مفید ثابت ہو رہا ہے۔

حبیب اللہ لاہور ۵ جنوری ۱۹۳۲ء

اسلامی دنیا کیلئے ایک اور نایاب تحفہ
صحیح - خوشخط عکسی - رنگین - خوبصورت اور پاکیزہ
قرآن مجید
تیس روپئیہ
ھدیہ کا
صرف ایک روپیہ
ماہوار میں
آج تک ایسی خوبصورت چیز دنیا بھر میں کسی نے پیش نہیں کی
ہر گھر میں کم از کم ایک نسخہ ضرور رہنا چاہیئے
مفصل حالات اور نمونے کے صفحے آج ہی فہرست نمبر ۲۳ مفت منگوا کر ملاحظہ فرمایئے

اسلامی دنیا کیلئے دو قابل قدر نایاب تحفے
صحیح - خوشخط - خوبصورت - عکسی - رنگین
پنجسورہ شریف
پارہ اول
نہایت اعلےٰ قسم کے مضبوط کاغذ پر عکسی بلاکوں کے ذریعے خاص
احتیاط سے چھاپے گئے ہیں - جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں
دنیا بھر میں ایسی خوبصورت چیز آجتک کسی نے پیش نہیں کی آج
ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر مفصل حالات اور نمونے کے صفحے مفت طلب فرمایئے
ہر شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے
پیکو آرٹ پریس بیرون موچی دروازہ - لاہور
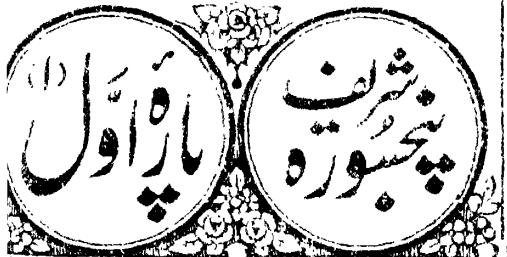
(بابہ)
۱۲-مارچ پر سب کی
۱۲ر مارچ ۱۹۲۶ء کو
امرت دھارا کی سلور جوبلی ایسی شان سے منائی گئی تھی اور اتنی سربرآوردہ ہستیوں نے اس میں حصّہ لیا تھا کہ اخبارات نے لکھا تھا کہ یہ جلسہ ایک تاریخی
ہو گیا ہے۔ امرت دھارا کی سلور جوبلی کے بعد اس قدر جوبلیاں لوگ منانے لگے کہ ایک اخبار نے لکھ دیا کہ پنڈت صاحب امرت دھارا کے تو موجد تھے
جوبلیوں کے بھی موجد کہنے چاہئیں۔ اس وقت سے ۱۲ر مارچ کو امرت دھارا کا سالانہ جلسہ برابر منایا جاتا ہے اور ہمارے مہربان اس تاریخ
کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ ناظرین! ۱۲ر مارچ کو اس سال بھی یاد رکھیں۔ گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی امرت دھارا ٹورنمنٹ میں صحت و طاقت
کے جسمانی مقابلے ہونگے۔ اس بار خاص بات یہ رکھی گئی ہے کہ عام لوگوں کا امتحان جسم کر کے ان کو صحت بڑھانے کیواسطے مناسب ہدایات
دی جاوینگی اور اگلے سال جو نسبتاً زیادہ اپنی صحت کو بڑھا کر دکھا دینگے۔ ان کو انعام بھی دیئے جاوینگے۔ عورتوں کی کھیلوں و چلنے کے مقابلے
اور بے بی شو بھی ہوگا۔ مریضوں کو ۹ - ۱۰ - ۱۱ تین دن تک مفت مشورہ دیا جاویگا۔ کٹی ٹانگ والوں کو مصنوعی ٹانگیں دی جاوینگی ۱۲ر مارچ
کو موتیا بند والوں کا مفت اپریشن کیا جاویگا۔ ان میں سے جن کی تفصیل چاہیں خط لکھ کر منگوا سکتے ہیں ہر خاص و عام بھی فائدہ اٹھا سکیں اس کیلئے
ادویات و کتب کی قیمت میں رعایت
ہندوستان اور اس دنیا کے کسی بھی ڈاکخانہ میں خط ڈالدیں۔ کارڈ یا خط کے اوپر ۱۲ر مارچ لکھ کر خط شروع کرنا چاہیئے اور ڈاک میں ۱۲ر مارچ کو ڈالنا چاہیئے۔ لاہور
کے اصحاب چاہئے کارڈ یا خط لکھ دیں۔ یا امرت دھارا دفتر کے باہر ایک بکس پڑا ہوگا۔ اس میں اپنا نام و پتہ و ادویات جو چاہیئے لکھ کر ڈالدیں۔ اس کے بعد ایک
ہفتہ کے اندر اندر کسی دن بھی آکر ادویات لے سکتے ہیں۔
جو اصحاب چاہیں۔ اس دن روپیہ جمع بھی کرا سکتے ہیں۔ اور باہر کے اصحاب اس دن منی آرڈر بھیج سکتے ہیں۔ جن کا روپیہ جمع ہو جاویگا۔ ان کو جب
تک وہ روپیہ ختم نہ ہوگا۔ اس رعایت پر یکدم یا چند بار میں بھی ادویات مل سکیں گی۔ اس ایک دن کیواسطے
رعایت یہ ہے
جن کے پاس فہرست نہ ہو وہ ابھی لکھ کر منگوالیں۔ اور ادویات نوٹ کر رکھیں!
خط و کتابت و تار کا پتہ:- ”امرت دھارا“ - لاہور
المشتہر
منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون - امرت دھارا اسٹرک - امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

ہنسو اور موٹے ہو جاؤ
رسالہ مسرت منزل لاہور کا سب سے سستا دلچسپ و باتصویر رسالہ ہے
فہرست اشیائے انعامی
بیس عدد انعامی ناولوں کی فہرست
مینیجر رسالہ مسرت منزل لاہور

گنج کی شرطیہ دوا
اور چند حسن و خوبصورتی کے بے نظیر تحفے
تیل نہیں بلکہ سائنٹیفک اصولوں پر تیار شدہ ایک قسم کا خوشبودار میڈیکیٹڈ لوشن ہے جس کے چند روزہ استعمال سے گنج دور ہو کر سر پر بال جمنے لگتے ہیں۔ بالوں کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ قوت حافظہ کیلئے از حد مفید ہے۔ بالوں کو از حد مفید ہے۔ بالوں کو سیاہ کرتا ہے۔ آئندہ بال گھنے اگتے ہیں۔ اگر اس کی آدھی شیشی سے فائدہ نہ ہو تو باقیماندہ شیشی واپس کر کے پوری قیمت طلب کر لیجئے۔ اس قسم کا دعوے صرف اسلئے کیا جاتا ہے کیونکہ ہماری اشیا سو فیصدی سود مند ثابت ہو چکی ہیں بڑی محنت پوری توجہ اور قیمتی اجزا سے تیار کیجاتی ہیں۔ قیمت فی شیشی (ڈینیش ہیر ٹانک) تین روپے محصولڈاک چودہ آنے
ڈینش جسٹرڈ یاسمین
عورتوں کے بالوں کا پیار کرنے میں بہترین اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ہفتہ کے استعمال سے بال کمر تک بڑھ جاتے ہیں۔ ہندوستان اور یورپ میں اس کے مقابلہ کی آج تک کوئی چیز ایجاد نہیں ہوئی جنہوں نے ایک دفعہ استعمال کیا وہ ہمیشہ کیلئے اس کے گرویدہ ہوگئے قیمت فی بوتل ۱؎ ونس تیل صرف ۱۲؎ محصول ڈاک ۱۴؎
ڈینیس گل اندام
یہ ایجاد چہرہ کے داغ دھبہ کیل چھائیاں دور کرنے کیلئے ایجاد کی گئی ہے۔ اس کے چند روزہ استعمال سے چہرہ کی سیاہی دور ہو کر گلاب کی پتی کی طرح خوبصورت نکل آتا ہے۔ داغ دھبہ اس طرح غائب ہوتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ یورپ کے پوڈر اور پیرس کے غازے اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں فضول رنگدار چیزیں استعمال کر کے چہرہ کو نہ بگاڑیئے بلکہ وہ چیزیں استعمال کیجئے جو ہندوستان کی فضا کو مدنظر رکھ کر تیار کی گئی ہیں قیمت فی شیشی تین روپے بارہ آنے (عہ؎) محصول ڈاک دس آنے (۱۰؎)
دیگر ہم سے ہر قسم کا انگریزی مال مثلاً تولیہ بنیان جراب رومال ثانی ریشمی رومال بازار سے مقابلۃً عمدہ اور سستے طلب کیجئے
ملنے کا پتہ: ریاض کیمیکل پرفیومری کمپنی ریاض بلڈنگ لاہور

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے اُرکا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ نمونہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

[illegible] پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

فہرست مضامین "ہمایوں"

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۲ء

تصاویر: شکر رنجی۔ جنگل کا بادشاہ

تصاویر

شکر رنجی ۔۔ یہ دلکش تصویر فرانس کے مقبولِ عام مصور بُوگرو کی بہترین تصاویر میں سے ہے۔ اس مصور کی تصاویر کثرت سے مختلف النوع ہیں! بس لحاظ سے اُس کا تخیل حیرت انگیز طور پر جامع اور محیط الکل سمجھا جا سکتا ہے موجودہ تصویر اس کے فن کا بہترین نمونہ ہے۔ صاف معلوم ہو رہا ہے۔ کہ رنجیدہ لڑکی کے ملال کا دورہ ختم ہونے کو ہے۔ اور ابھی صفائی ہو جائے گی یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ رنج و ملال کے جذبات زیادہ دیرپا نہیں ہوتے۔

جنگل کا بادشاہ "جنگل کے بادشاہ" کے سر کی یہ لاجواب تصویر جو شیر کے چہرے کے بہترین مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ روزا بونر کے مرقع سے لی گئی ہے اور میاں بشیر احمد صاحب کے "جنگلی مضمون" کے ساتھ ناظرین کی دلچسپی کے لئے دوبارہ شائع کی جاتی ہے۔

ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے متعلق آرا

آنریبل جسٹس سر شاہ محمد صاحب سلیمان ایم اے کینٹب بیرسٹرایٹ لا چیف جسٹس الہ آباد ہائیکورٹ

"ہمایوں" کا سالانہ نمبر جو آپ نے مجھے از راہِ نوازش بھیجا ہے موصول ہوا۔ اس کے مضامین کا معیار اعلیٰ درجے کا ہے۔ اور ظاہری محاسن کے اعتبار سے بھی یہ بہت بلند پایہ رسالہ ہے دعا ہے کہ ہمایوں ہر طرح کامیاب ہو۔

آپ کا مخلص ایس۔ ایم سلیمان ۱۲ جنوری ۱۹۳۲ء

آنریبل میاں سر فضل حسین صاحب بہ القابہ رکن مجلس حکومت ہند

مجھے "ہمایوں" کا سالگرہ نمبر کیپ ٹاؤن میں ملا۔ میں نے اسے پڑھا اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز میں مسٹر نایڈو، مسٹر بیچپائے اور بعض دوسرے دوستوں کو دکھایا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ ہندوستانی رسائل کی دنیا میں "ہمایوں" خوبی کے اس قدر بلند پایہ معیار پر پہنچ چکا ہے میں آپکو اس محنت اور استقلال پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے بزرگ کی یہ نفیس یادگار قائم رکھی جس کو اگر موت مہلت دیتی تو وہ موجودہ ہندوستان کے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہوشیار اور کامیاب طریقہ پر ملک و ملت کی خدمات انجام دے سکتا۔

آپ کا مخلص فضل حسین نئی دہلی ۱۴ مارچ ۱۹۳۲ء

پنڈت شیونرائن صاحب شمیم ایڈووکیٹ ہائیکورٹ پنجاب

"ہمایوں" کا سالانہ نمبر اس سال نہایت دلچسپ ہے۔ مجھے اپنے رفیق مرحوم مسٹر شاہ دین صاحب کی دستخطی تحریر کشمیر جہلم دریا اور بعض اشعار پڑھ کر بہت مسرت ہوئی اور وہ زمانہ یاد آیا جب کہ ہمایوں میرے دوست شاعر اور ادیب تھے۔ دنیوی منزلتیں ان کو بہت سی حاصل ہوئیں۔ اور ہم دونوں ادبی مشاغل میں مگن رہتے تھے۔ اس سال کے سالنامہ نمبر کو میں مجلد کرا کے اپنے اردو کتب خانہ میں رکھوں گا۔ بعض مضمون ایسے ہیں جو مستقل وقعت رکھتے ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ سرورق کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کی ضرورت کیا ہے۔ شالامار کا نظارہ یا تاج محل یا اور کوئی ہندی منظر کافی ہوسکتا ہے۔ کیا "بنجاب خوش شنو است ہمایوں دیار ما" فراموش ہونا چاہئے

شیونرائن شمیم ۲۴ جنوری ۱۹۳۲ء

جہاں نما

پردے کے متعلق شہریارِ دکن کا اعلان

گذشتہ مہینے اعلیٰ حضرت نظامِ دکن چند دنوں کے لئے لکھنؤ میں رونق افروز ہوئے۔ تو اثنائے قیام میں معائنہ کے لئے مسلم گرلز سکول لکھنؤ میں بھی تشریف لے گئے۔ امراء اعیانِ دولت کے علاوہ شہزادے اور شہزادیاں بھی حضور کی معیت میں تھیں۔ سکول کی چھوٹی بچیوں نے اظہارِ عقیدت کے طور پر شہزادیوں کو گلدستے نذر گذرانے۔ مجلس میں بہت سی مسلمان خواتین بھی اعلیحضرت اور شہزادیوں سے شرفِ باریابی حاصل کرنے کی متمنی نظر آتی تھیں سکول کی چھوٹی اور بڑی لڑکیوں نے اس امر کے پیشِ نظر کہ شہزادیاں بھی مجلس میں رونق افروز ہوں گی۔ عمر میں پہلی دفعہ پردہ ترک کیا اور اس مخلوط انجمن میں بے نقاب شامل ہوئیں۔ سر سید وزیر حسن صدرِ مجلس منتظمہ نے اعلیحضرت کا خیر مقدم کیا اور ایک مختصر سا سپاس نامہ پڑھا۔

اعلیحضرت نے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے سر وزیر حسن کو اختیار دیا کہ حضور کی طرف سے اس امر کا اعلان کریں کہ حضور اس بات سے بہت متاثر ہوئے ہیں کہ لڑکیوں نے پہلی دفعہ ان کے اعزاز میں پردہ ترک کیا ہے اور امید رکھتے ہیں کہ لڑکیاں دودمانِ آصفیہ کی پیش کردہ مثال سے پردہ ترک کرنے میں تقویت حاصل کریں گی اور مقتضائے وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رسم کو کلیتہً ترک کر دیں گی۔

بیسویں صدی کی ترقیاں

یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ موجودہ صدی میں بہت سے قدیم عقائد جن کی عظمت قرن ہا قرن سے مسلمہ تھی بالکل مٹ چکے ہیں۔ اس موقع پر ایک اہم سوال اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ کیا اس صدی نے پرانے مسلمات کی جگہ کچھ نئے مسلمات بھی پیش کئے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اکثر اصحابِ فہم و تدبر نفی میں دیتے ہیں۔ "ورلڈ یونیٹی میگزین" کے ایک مقالہ نگار نے موجودہ دور میں ذہنی اور روحانی ترقیوں کے حصول پر مخالفانہ نقطۂ خیال سے تبصرہ کیا ہے بیسویں صدی کے ربع اول میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جن کی جدوجہدِ حیات کا قصر متزلزل بنیادوں پر استوار ہو رہا ہے عورتیں اور مرد مصروفِ عمل اور سرگرمِ کار نظر آتے ہیں مگر ہزاروں لوگ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ ان کی اس

سعیٔ پرجوش کا مقصد کیا ہے۔ اور حاصل کیا ہے۔ ہرطرف لوگ مختلف النوع مصروفیتوں میں لگے ہوئے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مصروفیتیں کسی خاص مصرف کی بھی ہیں یا نہیں اور کونسی مصروفیت کسی دوسری مصروفیت کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ وہ تمام تصورات جو پہلے انسانی اعمال اور انسانی سرگرمیوں کے محرک اور مقصد و منتہا سمجھے اب فنا کردئے گئے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز افزوں ہو رہی ہے جو نہایت صدق دل سے یہ سوال کرتے ہیں کہ دنیا جینے کے قابل بھی ہے یا نہیں؟ آخر اس تمام جدوجہد کا کوئی خاص مقصد بھی ہے؟"

والٹر لپ مین نے اپنی کتاب "مقدمۂ اخلاق" میں لکھا ہے۔ کہ موجودہ زمانے میں انسان نے "پرانے توہمات" اور رسوم وقیود سے آزادی تو حاصل کر لی ہے۔ لیکن کیا اس نے ان پوشیدہ امراض کی کوئی دوا بھی تجویز کی ہے۔ جو آخر ان کہنہ علاجوں کی طرف رجعت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پرانے مسلمات اور پرانے خیالات کی تباہی سے بلاشبہ ہل چل اور سنسنی پیدا ہوگئی ہے لیکن اب یہ تباہی لانے والے خود اُس سوار کی طرح نظر آتے ہیں جو "زیب اسپ و زینت برگستواں" کے بعد منزل گہِ مقصود سے بالکل نابلد ہو۔ امریکہ کے پروفیسر ٹڈسن نے موجودہ صورتِ حال کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے انسان نے صرف اتنا غور کرنے کی تکلیف کی ہے۔ کہ "پرانے مسلمات کے دلائل کی ظاہری اور رسمی صورت میں کیا نقائص ہیں۔ اس کی فکر یہاں تک نہیں پہنچی۔ کہ یہ مسلمات محض اس لئے کالعدم قرار دئے جانے کے مستحق نہیں کہ ان کے اثبات کے پرانے دلائل ناقص یا غلط ہیں۔ آجکل کے لوگوں نے ان قدیم مسلمات کو نئے دلائل وبراہین کی کسوٹی پر نہیں پرکھا۔ حالانکہ آخری حکم لگانے سے قبل صحیح منطق اس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ موجودہ انسان کے تدبر کی پرواز محض بڑی باتوں کے انکار تک پہنچی ہے۔ بڑی باتوں کے اقرار تک نہیں پہنچی۔

زندگی کے قدیم معیار پر کسی کو اعتبار نہیں رہا۔ اکثر لوگ وقتی فیصلوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ مادیت عشرت پسندی کی طرف لے جا رہی ہے۔ انسان ہر قسم کی زنجیروں سے آزاد ہو رہا ہے، ایسے متشککین کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ جو کسی قدیم اخلاقی معیار کو مسلمات میں سے نہیں سمجھتے۔ بعض لوگ علمیت اور سیاسی قوت کے نشے کے رسیا ہیں۔ تو بعض لوگوں نے اخلاقیات پر حسن اور فنونِ لطیفہ کو ترجیح دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فلسفۂ اخلاق کے ماہر اس فیصلہ کو غلط قرار دیتے ہیں۔ بعض طبقات میں صنعتی ترقی اور مقابلہ کے جنون کا جوش آشوبِ محشر کا نقیب بن رہا ہے۔

چند دن جنگلوں میں

جنگل! جنگل! دُور دُور تک! درخت ہی درخت گنجان! گھنے! گھن دار! دن! دہاڑے رات ـــــ درندے چرندے پرندے! درندے! کسی شاعر کی طرح دھاڑنے، چنگھاڑنے، اکھاڑنے "پھاڑنے" والے! ـــ چرندے!؟! اور پرندے! (ہاں) اُڑنے والے پھُر سے بلکہ چکنے چھپانے گھونسلوں میں رہنے حق سرہ کہنے والے! جنگل ہاں وہی جنگل جس کے متعلق اسد الشعرا غالب نے لکھا کہ "مجنوں جو مرگیا ہے تو جنگل اُداس ہے" اگرچہ عرب میں جہاں مجنوں کا وطن تھا جنگل نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو ان میں درخت نہیں ہوتے۔ (تو پھر یہ کیسے جنگل ہوئے) اور ہندوستان میں جہاں جنگل ہوتے ہیں مجنوں نہیں ہوتے۔ اور اگر ہوتے ہیں تو اُن کے لئے کسی اور شاعر کو یہ مصرع لکھنا پڑے گا کہ ع

"لیلیٰ جو مرگئی ہے تو مجنون کا بیاہ ہے"

تو پھر یہ کیسے مجنوں ہوئے؟ ہاں وہی جنگل جس کے متعلق جناب شمس العلما مولانا سید امداد امام اثر نے اسی راقم کو تقریباً دس سال ہوئے پٹنے میں اپنے پوتے پوتی کی باہمی شادی پر اپنا یہ شعر سنایا تھا ؎

صحرا صحرا جنگل جنگل مارے مارے پھرتے ہیں ۔۔۔ آہو وحشی جان کے ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

بلکہ اُسی روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا تمہارے اور تمہارے خُسر کے لئے میں ایک ایسی دوا تجویز کئے دیتا ہوں، کہ تم لوگ کبھی بڈھے ہی نہ ہوگے۔ میاں صاحب تو خیر خدا بخشے ہمیشہ سے ایک ازلی جوان تھے۔ جوان جئے جوان ہی رحلت فرماگئے۔ لیکن مجھے کوئی دوائی فوراً بڈھا ہوجانے سے روک لے تو جانوں۔ سید صاحب موصوف نے Kali Phos (کالی فوس) دوائی لکھ دی۔ میں نے انہیں دنوں میں کلکتہ پہنچ کر اُسے حاصل کیا۔ دس سال بعد جو چند ہفتے ہوئے میں نے اپنی گنگا جمنی دوائیوں کی الماری صاف کرنے کو کھولی تو یقین مانئے کہ وہی باوفا "کالی فوس" جوں کی توں بند کی بند پڑی ہوئی دیکھی۔ اس پر میں نے اپنے ضمیر بشیر و نذیر سے پوچھا کہ بتا بے اب تو بوڑھا ہے یا جوان۔ میرے ایک عزیز جو اندریں وقت بقائمی ہوش و حواس سیالکوٹ میں سب جج کے عُہدۂ جمیلہ پر قبضہ فرمائے ہوئے ہیں اِس کے گواہ ہیں۔ بریکٹ کے اندر لکھا جاتا ہے کہ انہوں نے ہمارے ایک مشترک وکیل و نیم حکیم نیک طبع عزیز حال ساکن "دوا کل" شیخوپورہ کی دل و دماغ سے نکلی ہوئی نصیحت کے مطابق اسی "نیک بخت" دوائی کا استعمال دو ماہ ہوئے بڑے شد و مد سے اِس طرح شروع کیا کہ کھانے کے بعد اور شاید کھانے سے پہلے بھی اپنے ہی بستر پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتے اور نہ ہُوں نہ ہاں کرتے اور یوں چُپ چاپ طاقت حاصل کرتے جاتے۔ سب جج صاحب نے بزور فرمایا کہ اس "کالی فوس" نے مجھے بے انتہا فائدہ پہنچا دیا ہے تم اسے ساتھ کے کھیلے ہوئے اِسے استعمال کرو۔ کہ یہ اعصاب کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور جہاں اب تمہیں بھوک کم لگتی ہے۔ اور تم کمزور

ہوجانے کی وجہ سے "صوفی" اور "خدارسیدہ" ہوجاتے ہو۔ وہاں اسے نگل کرانشاء اللہ دو چار ہی سیکنڈ میں ہر ایک کو کھاؤں پھاڑو کرنے لگ جاؤ گے۔" اس پر میں نے اُن سے عرض کی کہ "یا سب جج دو عالم! دس سال سے مجھے اس کا علم ہے۔ اور برابر دس سال سے میں اس کے فوائد کی جزئیات کو اپنے دماغ میں جگہ دیئے ہوئے ہوں" (ہزاروں باتوں کا اسے پڑھنے والے مجھے علم رہا ہے جن پر عمل میں نے کبھی نہیں کیا پس اے بھائی اے تو کہ ذرا سی فارسی بھی جانتا ہے۔ من نہ کردم شما حذر بکنید)۔ اس پر میں نے حضرتِ اثر (عظیم آبادی) والا سارا قصہ کہہ سنایا۔ سب جج صاحب خوش ہوئے جوش میں آئے وہیلا انعام واکرام دیئے رخصت ہوگئے۔ میں نے سوچا بس غفلت کا زمانہ ہوچکا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔ اب عمل کرنا شروع کردو۔ مسٹر ـــ کے پاس صحت کی خاطر جا ہی رہے ہیں۔ بسم اللہ کہہ کر کے ایکبارگی صحت کو بہتر بنانا شروع کردو ـــــــ قطع کلام معاف مگر محض خوشنودیٔ حق اور افادۂ عام کی غرض سے مطلع کیا جاتا ہے کہ عام انگریزی ڈاکٹروں کی "اے لوپاتھی" کے خلاف ایک خفیہ تحریک "ہومیو پاتھی" مدتِ مدید سے دنیائے مغرب میں کامیابی کے ساتھ جاری رہی ہے۔ اس سے ملتی جلتی اس کی ایک شاخ جیسے ہم نے کی بندھیا چل ہے Scheusslers Twelve Tissue Remedies یعنی "شواس لر صاحب کی بارہ نشوی دوائیں" ہے۔ اس نظامِ حکومت کے مطابق انسان کے جسم میں کل دس نمک ہیں جہاں ان دسوں میں سے کسی ایک نمک کی کمی واقع ہوئی وہیں فوراً انسانی جسم کی کل کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہونے لگ گیا۔ یا اس کا دماغ پھرکی کی طرح چکر کھانے لگا۔ یا اوپر تلے سینکڑوں ڈکاروں کی بلا وجہ رسیدیں آنے لگیں اور یا دہی شاعروں کے لختِ جگر والے جگر یا دردِ دل والے دل میں اضمحلال واختلال وانفصال وانفعال وزوال کی بیسیوں علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ تم بھی اے ہم جنسو اپنی علالت کی علامات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرداد ردیکھ لو اور سمجھ لو کہ تمہارے اندر کون سے نمک کی کمی ہوگئی ہے۔ پھر مدیرِ ہمایوں کے پاس جو ایک پتہ لکھا ہوا ہے اُس پتے پر ایک خط لکھ بارو وی پی پارسل تمہارے نام چند ہی روز میں آدھمکے گا۔ نمکِ مرسلہ کھاؤ (میٹھی گولیاں ہوتی ہیں) اور یوں نمک حلال بن کر بجائے منحوس ومردود کے مضبوط ومربوط ہوجاؤ۔ واللہ عزیز حکیم (ترجمہ اللہ ہر ایک کا عزیز ہے اور ہر ایک کا حکیم!) میں بھی گھر سے نکلتے ہوئے اپنے عزیز کی ہدایات "ونصائحات" کے مطابق اِن "نمائک" میں سے دو شیریں نمک Kali Phos کالی فوس اور Kali Mur کالی میور لے آیا۔ پہلی اے دوستو۔ اعصابی قوت کی دوا ہے۔ کوئی عصب "غصب" ہو تو اس نمک کے نصب کرنے سے بقول شخصے کسب صحت ہوتا ہے (دیکھو مخزن القوانی حرف ب) دوسری جگر ومعدہ کی شقاوت وبغاوت کا بقول شخصے سدِ باب کرتی ہے۔ میں جنگل کی سمت جب آیا (اس "سمت ردی" کی تفصیل کے لئے مضمون ہذا کا دوسرا حصہ ملاحظہ ہو۔ ہاں جب آیا) تو ان "مقوی نمکیات" کو جذب کرنا شروع کردیا اور سب جج صاحب کو اطلاع دی کہ بھائی جان ہم تم ایک عمر نیکی کرنے میں جسم وجان گھلاتے رہے نہ دنیا کی پوری عزت ملی نہ ابھی تک جنت کی راحت نصیب ہوئی۔ اب "کالی فاش" اور کالی مور سے خدا نے چاہا تو جسم وجان ودل ودماغ وروح میں قوت وشجاعت ولیاقت وشہامت دن دونی رات چوگنی ترقی کریں گی۔ نیکی کو بہت آزما چکے۔ اب ذرا برائی کو بھی آزمادیکھیں کہ کیا بُروں کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو نیکوں کا ہوتا ہے ـــــــ (قارئین کرام معدرجہ

نادم ہوں کہ صرف ایک "جنگل" کے لفظ نے اتنی تقریر دلپذیر کرائی۔ بس اب تھوڑی سی اور باقی ہے مثلاً یوں کہ):۔
اے جنگل! اے تو کہ تجھے دیکھ کر خدائے عزوجل کی قدرتیں یاد آتی ہیں! اے جنگل! جس کے سایوں میں بیٹھ کر میں اُسے یاد
کیا کرتا ہوں جس کا گھونسلا میرے دل کے کیکر میں ہے۔ ارے او جنگل جس میں "منگل" ہوتا ہے اور تمام دن بھی جب انسان کو
دیس نکالا دیا گیا ہو اے جنگل اے وغیرہ وغیرہ وغیرہ . . . . . .

یہ تو تھی تمہید علم ادب کے اکھاڑے میں مضمون نویسی کی کُشتی کے لئے مصنّف کی تیاری اما بعد ——— میرے ایک
عزیز دوست ہیں (یعنی پہلے دوست تھے پھر عزیز بنے)۔ (اور چونکہ وہ نیک آدمی ہیں۔ اور اس لئے ایک ادبی مضمون میں ان کا پورا نام
لینا نیکی و ادب دونوں کے خلاف ہے لہٰذا آپ بھی اتنے پر ہی قناعت کرلیں کہ میرے ایک دوست ہیں) مسٹر ض معمول کے
موافق اُن کی ایک بیوی ہے۔ انہیں کہئے۔ ض بیگم (اگر بفضلِ خدا پردہ دار ہوتیں تو ض ب لکھنا پڑتا)۔ ان میاں اور ان بیگم کے
دو بچے ہیں۔ دونوں لڑکے ایک کو کہئے ض زادہ نمبر ۱ (عمر دس سال) دوسرے کو ض زادہ نمبر ۲ (عمر ڈھائی سال) ض زادہ نمبر ۱ کا نام
جو خوب ٹٹ بٹ انگریزی بولتے ہیں مع خدائے جبّار اور اپنے پدر بزرگوار کے نام کا ہم وزن وہم قافیہ ہے لیکن حضرت پدر کی شاعری
یہیں تک پہنچ کر ختم ہوگئی۔ کیونکہ ض زادہ نمبر ۲ کا نام محض لفظ مجبور کا ہم نوا ہے۔ گو اس سے یہ نہ سمجھئے کہ وہ نئی پود والوں سے کسی
طرح کم خوفناک ہیں۔ چنانچہ میزبانی کے پہلے ہی روز مجھ سے دریافت فرمانے لگے کہ "یہ کُچھ کی" (کرسی) کون کی ہے"؟ مطلب یہ تھا کہ
گو بالفعل اس کرسی پر تم بیٹھے ہو مگر یہ ہے ہماری قبضہ و ملکیت کے اس فاروق اصغر کا نام میں نے اُسی دن سے مسٹر کون کی
رکھ دیا! مسٹر ض جنگلات کے ایک "خاص" افسر ہیں اور اپنے کام کے ساتھ ساتھ اکثر مجھے بُلاوے بھیجتے رہتے ہیں۔ ڈیرہ دون،
باندہ، پیلی بھیت اور ایکی بلدوانی غرض جہاں جہاں یہ گئے گو چند روز کے لئے سہی میں بھی ان کے ہاں جا دھمکا مگر تصدیق
کر لیجئے۔ کہ ۱/۴ جا دھمکا۔ اور کم از کم ۳/۴ مدعو کیا گیا!! (اپنا کریکٹر سکیچ ہے) میں گو ابتدا میں ایک دیہاتی تھا لیکن اب اپنی موجودہ
عمر کے ۵/۸ حصّے کو ایک شہر میں بسر کر کے اس لئے ایک نیم دیہاتی بھی نہیں کہ ان ۲۵ سالوں میں میرا دیہاتی وطن بھی ایک نیم
شہر بن چکا ہے (چنانچہ آج کل وہاں ایک نوزائیدہ میونسپلٹی کی الکشن کا گرد وغبار اٹھ رہا ہے) لہٰذا آپ ہی اندازہ کرلیں۔
اس وقت میں کِتنے؟ شہری ہوں اور کِتنے؟ دیہاتی۔ قصہ مختصر میں یہی جو کچھ بھی ہوں۔ ایک مکان میں رہنے اور بیٹھ رہنے کا اس
قدر خوگر ہوں کہ بس مکاں جنبد نہ جنبد من مُحمد۔ اپنے شہر اپنی سڑک اپنے مکان اپنی ایک بیوی اپنے چار بچوں کو چھوڑ کر کہیں
اور جانا کہیں اور رہنا کسی اور سے بات چیت کرنا میرے لئے باعثِ صد کلفت و موجب ہزار مشقت ہے لیکن کیا کیا جائے
کہ کسی نہ کسی طرح لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا پر عموماً عمل نہیں ہوتا پر نہیں ہوتا اور یوں اس دفعہ میں اپنا کوٹھا کنبہ چھوڑنے
پر مجبور و مجبوراً مسرور ہوا۔ شہر میں طبیعت محض ذرا سی باغی ہوئی۔ کہ اُدھر عزیزوں نے اِدھر خود بدولت نے اپنے آپ کو یہ بزرگانہ
مشورہ دیا کہ چند دنوں جنگل کی ہوا کھا آؤ۔ مدت سے ان جنگلی افسر دوست کا بھی تقاضا تھا ان کے ساتھ یہ بہانہ کہ تمہارے

تقاضوں پر آرہا ہوں. دراصل یہ مطلب کہ جنگل کی آب وہوا میرے کمزور جسم وجان کی مالش کرے ـــــــ خیر چل نکلا!
لاہور سے پنجاب میل میں بریلی کو، بریلی سے چھوٹے ڈبوں والی ریل میں ہلدوانی کو چلا چلا اور پہنچ گیا۔ مسٹر ض کے ہاں وارد ہوا۔ بڑی دقت ہے۔ کہ یہ بڑے مہمان نواز ہیں اور میں بالکل اس کے برعکس خیر وارد ہوا متمکن ہوگیا۔ اب تھوڑی سی۔ . . ان ٹروڈکشن" ہوجائے۔ کاش میں خواجہ حسن نظامی یا مرزا فرحت اللہ بیگ ادام اللہ مضامینہم فی ہمایوں کے قلم کا مالک ہوتا تو ایسا ٹھیک ٹھیک نقشہ ان مسٹر کا کھینچ کر پیش کردیتا کہ اس انسانی شیر کی شکل آنکھوں میں پھر جاتی۔ مگر بالفعل اتنا کافی ہے کہ مسٹر موصوف سیمل کے درخت کی طرح لمبے چوڑے وجیہ گندمی رنگ پختہ چال تقریباً چالیس سال کے نوجوان ہیں۔ دس گیارہ بجے کے بعد، پتلون کوٹ والے جنٹلمین مگر یوں شب و روز بھلے مانس صاحب لوگوں کی صرف ایک خاصیت ان میں موجود ہے کھانے کے وقت دفتر کے کام کے وقت ملاقات کے وقت غرض متعدد بارہ جب نوکر کے بلانے کو "دیکھو ـــــ ت"! کہتے ہیں تو جنگل کے شیر اپنے "بلوں" میں سوئے سوئے چونک پڑتے ہیں۔ باقی ایک مذہبی آدمی کی طرح ضرورت سے زیادہ دیانت دار چیونٹی کی طرح اپنے کام میں منہمک، شیر کی طرح دلیر، چیتے کی طرح جری (واضح ہو کہ میں بطور ایک نیک بخت مہمان کے صرف اپنے میزبان کی خوبیاں بیان کررہا ہوں) چنانچہ کچھ کام کرنے کے بعد صبح کو یعنی کبھی دس کبھی گیارہ کبھی بارہ بجے تک جب غسل کرچکتے ہیں تو تہ بند نیچے اور رُومی ٹوپی اوپر پہن کر پہلے نماز اور بعد میں برآمدے میں بیٹھے قرآن شریف کی عربی بآواز بلند پڑھتے ہیں کہ آدمی کہیں ہو چلتے چلتے رُک جاتا ہے یا بیٹھے بیٹھے اُٹھ بیٹھتا ہے یعنی ۵/۱۱ جنٹلمین ہوں مگر واقعی ۱۱/۱ بھلے مانس اور فی الحقیقت ۱۱/۱۱ مسلمان ضرور ہیں۔ (مضمون کہیں ان ٹکڑوں کی کثرت سے خراب نہ ہوجائے۔ بہت خوب اس سلسلے کو ختم کردیتا ہوں۔ اگرچہ اے دل آنرا کہ حساب پاک است ازمحاسبہ چہ باک!) مسٹر ض نے ارادہ کر رکھا تھا کب آئے تو اس کی یک رنگی "ہمایونیت" کو ذرا کم کرنے کے لئے فوراً اسے ہلدوانی کے حدود اربعہ کے اندر سے کہیں باہر لے جائیں۔ ان لوگوں کے فائدے کے لئے جو بوجہ پنجابی یا کسی اور طرح شریف الطبع ہونے کے میرے مانند یو۔پی کے جغرافیائی حالات سے ناواقف ہیں میں ایک نقشہ اس علاقے کا پیش کرتا ہوں جس میں میری جنگل کی زندگی کے ۱۲/۱ ۱۲ دن کٹے ملاحظہ ہو:-

بریلی کو تو سب جانتے ہیں۔ اور جو نہیں جانتے انہیں جاننا چاہئے۔ کہ نویں جماعت میں To Carry Coals to Newcastle کا ترجمہ اُلٹے بانس بریلی کو لادنا ہمیں بتایا اور لکھایا گیا۔ بریلی اس طرف کو متمدن دنیا کی سرحد ہے پھر ۶۲ + ۲۵ میل پھاند جاؤ نو نینی تال مہذب مقام ہے۔ ان دونوں کے درمیان سب کچھ ایسے ویسے مقامات ہیں جہاں کم از کم لال کنوئیں کے پکے پہاڑوں تک اللہ میاں کا جلوہ ہے۔ اور یا ماشاء اللہ گیدڑوں اور بھیڑیوں اور شیروں اور لنگوروں کا اور شہر اور قصبے اور گاؤں جتنے اور جیسے بھی ہیں وہ جہاں تک میرا اور آپ کا خیال ہے۔ زیادہ تر اس لئے بنے ہیں کہ میرے دوست وہاں کے مستقل نگہبان ہوں اور میں ان کا عارضی مہمان، وہ سرکار کے جنگلی افسر ہوں اور میں آپ کا جنگلی مضمون نگار!

جاننا چاہیئے کہ جتنے مقامات کو میں نے اوپر کے نقشے میں نقطوں کے اوپر بٹھایا ہے۔ وہ اس نقشے میں خاص اسکیل کے مطابق قائم کئے گئے ہیں۔ اسکیل ۱ = ۲ ہے۔ ناپ کر دیکھ لیجئے۔ کہ کہاں سے کہاں تک کتنا فاصلہ ہے کتنا نہیں ہے!

یہ علاقہ جسے بھابر و ترائی کہتے ہیں۔ عام انگریزی علاقے کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک قسم کی سرکاری ریاست ہے جس کا بہت سا حصہ پرانی دیسی ریاستوں کے سابقہ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کو خام کہتے ہیں۔ یہاں خود سرکار زمیندار ہے۔ اور صرف بعض بعض حصے بندوبستی ہیں۔ دامن کوہ کا علاقہ جو نینی تال کے پہاڑوں کے نیچے نیچے چلا گیا ہے۔ بھابر کہلاتا ہے۔ اس کے جنوب کی طرف ترائی ہے۔ یعنی وہ خطۂ زمین جہاں پانی سطح کے قریب ہی دستیاب ہوتا ہے۔ بھابر اور ترائی کا علاقہ لمبائی میں پہاڑ کے ساتھ ساتھ ۵۷ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی چوڑان صرف سولہ سترہ میل ہے۔ ندیاں جو پہاڑوں سے آتی ہیں۔ سردیوں میں اکثر بھابر میں جذب ہو کر نیچے ترائی میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ دریائے کوسی رام نگر میں گم ہو کر آٹھ میل کے فاصلے پر جالا بن کے قریب پھر سطحِ زمین پر نکل آتا ہے۔ بھابر کا حصہ سمندر کی سطح سے تقریباً ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ بھابر کی آب و ہوا کم از کم سردیوں میں صحت بخش ہوتی ہے۔ لیکن ترائی کی حالت دگرگوں ہے۔ اور وہ اپنے موسمی بخار کے لئے دور دور تک مشہور ہے۔ لیکن خاطر جمع رکھئے یہ مضمون صرف بھابر سے تعلق رکھتا ہے۔

اب ایک مورخ کی طرح تاریخ پر ایک نظر ہو جائے۔ یہاں اس امر کا اعتراف و بیان ضروری ہے۔ کہ تاریخی نقطہ نگاہ سے جو کچھ بھی عرض کیا جائے گا۔ اس کی محض یہ حیثیت ہے۔ کہ جو کچھ کسی بھلے مانس سے بات چیت میں معلوم ہوا وہ نوٹ کر لیا تفریح اور فراغت کے دن ہیں۔ کون یہ مصیبت اپنے سر لے۔ کہ ایک تو جنگل کے متعلق تفریحی مضمون لکھے اور دوسرے لگے زمین کو کھود کھود کر پرانے مردے اکھاڑنے۔ اتنا جگرا ہوتا ہے۔ تو جنگل کو کیوں آتے شہر میں بیٹھے بیٹھے محمد حسین آزاد نہ بن جاتے؛

قصہ یہ ہے۔ کہ دو چار روز ہوئے مجھے بتایا گیا۔ کہ مسلمان بادشاہوں کے وقت میں یہ علاقہ ایک سرکاری شکارگاہ تھا اور انہیں ہمارے بھیڑیوں اور شیروں کے باوا جان ان جنگلوں میں تیغِ اسلام کے سایے میں امن کی زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ اسی حصہ ملک میں ایک مقام ہے (ہلدوانی سے مشرق کی طرف جہاں میں نہیں گیا۔ سو دروغ بر گردنِ راوی) اُجسے نانک متھا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بابا نانک سکھ مت کے بانی وہاں آئے تھے۔ انہوں نے یہاں آ کر جب اپنے ڈیرے جمائے

تو ایک ہندو گرو گورکھ ناتھ نامی نے اُن کا مقابلہ کیا۔ اور عناصر کے ساتھ سازش کر کے اس زور سے آندھی چلوا دی۔ کہ جس پیڑ کے نیچے بابا نانک تشریف رکھتے تھے۔ وہ جڑ سے اکھڑ کر ان پر گرنے لگا لیکن ادھر بھی خدا کا فضل شامل حال تھا۔ انہوں نے کہا رُک جا بیچارا جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ چنانچہ جا کے دیکھ لو۔ (میں نے جا کر نہیں دیکھا) کہ ابھی تک اس کی بعض جڑیں زمین کے اوپر لہلہا رہی ہیں۔ پھر ہندو جادوگر نے کھانے پینے کی سب چیزیں برباد کر کرا دیں چنانچہ یہاں کے کنوئیں کا پانی بھی سُکھا دیا۔ مگر اس کا انتظام بھی اُدھر سے خاطر خواہ طور پر ہو گیا۔ پھر جب نانک جی قریب کے پہاڑوں کی طرف گئے اور ان کے چیلوں کو سخت بھوک لگی۔ تو اتفاق سے کہیں ریٹھے کا درخت پاس تھا۔ نانک جی کی دعا سے اس کی ایک شاخ کے ریٹھے کڑوے سے میٹھے ہو گئے۔ اور اب تک میٹھے چلے آتے ہیں چیلے آناً فاناً درخت پر چڑھ گئے۔ اور خوب کھانے کھلانے لگے۔ دوسرے روز جو ان لوگوں کی نیت بدلی تو جی میں سمایا کہ کچھ دوسرے دن کے واسطے بھی لے چلیں۔ لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ خدائے رزاق صرف حال کی کفالت کرتا ہے مستقبل کے لئے بے ضرورت کھتے نہیں بھر دیتا۔ اب کی جو درخت پر چڑھے۔ تو دوسری شاخ کے پھل کو معمول کے موافق کڑوا پایا چنانچہ جا کے اسے بھی چکھ لو اُسے بھی۔ (میں نے جا کر نہیں چکھا۔ مگر دروغ بر گردن مسٹر ض جنہوں نے پرسوں اپنے بکس میں سے وہ میٹھے ریٹھے نکال کر مجھے کھانے کو دئے۔ پہلا ریٹھا تو کچھ کڑوا ہی تھا لیکن دوسرے پر جب مسٹر ض نے تھوڑا سا کھا کر اصرار کیا کہ یہ یقیناً میٹھا ہے۔ تو میں نے بھی میٹھا ہی پایا ہوگا۔ کہ فوراً آمنّا وصدقنا کہہ دیا!) اس مقام پر ایک گوردوارہ ہے جس پر ایک مہنت صاحب قابض ہیں۔ اس وقت اِس کے ساتھ تقریباً سولہ ہزار بیگہ زمین وقف ہے اور مہنت صاحب کی بسر اوقات اس پر موقوف ہے۔ مسلمانوں نے ایک زمانہ میں کل چوراسی ہزار بیگہ اراضی اس گوردوارے کے لئے مرحمت کی تھی۔ اور یہ گوردوارہ بھی انہیں کا تعمیر کردہ ہے۔

اس حصۂ ملک میں جو چند شہر یا قصبے ہیں وہ دراصل منڈیاں ہیں جہاں زیادہ تر سردیوں میں کاروبار ہوتا ہے بظاہر یہ شہر قصبے زیادہ متمول یا مہذب معلوم نہیں ہوتے۔ مگر ابھی آج کے اخبار میں دیکھا کہ ۲۷ فروری کو ہلدوانی میں سات کانگرسی عورتیں گرفتار ہوئیں۔ خانہ بدوش پہاڑی لوگ سردیوں میں پہاڑوں سے اتر آتے ہیں۔ اور گرمی ہوتے پھر سرکار انگریزی کی طرح پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ امسال پہاڑوں پر کم برف باری ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں رام نگر کی سڑک پر دیکھا کہ گویا ایک قوم کی قوم نقل مکانی کر رہی ہے۔ سامان کچھ بیل گاڑیوں میں کچھ مردوں کی بغل میں کچھ عورتوں کے سر پر (ان کی عورتیں ان کے مردوں سے زیادہ جفاکش ہوتی ہیں) اور عورتیں مرد بچے کہیں اکٹھے کہیں آگے پیچھے اس طرح چلے جاتے ہیں گویا جرمن قوم نے بلجیم پر حملہ کیا۔ اور بلجیم والے اپنا سب مال متاع اٹھائے جا رہے ہیں۔ اور جہاں رات ہوتی ہے۔ ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اس علاقے کا بہت سا حصہ جنگل ہے اور جنگل ہی سے اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ یوں کہ جنگل کو مختلف خطوں میں تقسیم کر کے ایک خاص جنس کے درختوں کو نیلام کر دیا جاتا ہے۔ البتہ گرد و نواح کے دیہاتیوں کو

پنے مکانات کے لئے اور ایندھن وغیرہ کے لئے لکڑی لے جانے اور جنگل میں اپنے مویشی چرانے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے
العموم ان جنگلوں سے دو ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ وصول ہوتا ہے۔ اگرچہ گذشتہ سال کسی حکمت سے سرکاری افسر
نے ساڑھے پانچ لاکھ روپے سمیٹ لئے۔ اب معاشی سرد بازاری کے باعث اور بقول بعض نمک خوار ٹھیکیداروں کے کانگرسی تحریک
ی وجہ سے اجناس کی قیمتیں بہت گرگئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج کل سنسان جنگلوں میں بھی سیاسی شہروں کی طرح مارے گئے
لُٹے گئے کا شور مچا رہتا ہے۔

ان جنگلوں میں ساکھو اور کھیر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لال کنوئیں کے سٹیشن کے قریب ایک نیم انگریز نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول رکھا ہے۔ اس میں سال کی لکڑی سے جرمن کلوں کے ذریعے سے بڑے چھوٹے تختے بنائے جاتے ہیں اور مختلف کمپنیوں اور دکانوں کو مہیا کئے جاتے ہیں۔ کارخانے میں نوے ہزار کا سرمایہ لگایا گیا ہے اور چند سمجھ دار سفید لوگ اس سے ہزاروں روپے سال کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کے مقابل میں ہم کالے لوگوں کا ایک کارخانہ ملاحظہ ہو کالاڈھونگی کے قریب جنگل میں ایک جگہ بہت سے دیگچے چولھوں پر چڑھے ہوئے نظر پڑے میرے دوست نے کہا۔ "آؤ ہماری دیسی صنعت کا ایک نمونہ دیکھو۔ چند ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ پہاڑی مرد اور بہت سی پہاڑی عورتیں باہر کھڑی ہوئی بڑے بڑے چولھوں پر دیگچے چڑھائے کچھ اُبال رہی تھیں۔ کھیر کے درخت کو چیر کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تراش کر انہیں پانی میں ڈال کر ابالا جاتا ہے۔ پھر یہ رنگدار پانی چھانا جاتا ہے۔ اور الگ ایک گھڑے میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ وہ جم کر کتھا بن جاتا ہے اور یہ کتھا پان میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے دیکھ کر چلتے ہوئے کہا۔ "سن لو کتھا ہماری" ساری پہاڑی عورتیں "کتھا ہماری" "کتھا ہماری" کہہ کر ہنس پڑیں۔ اور ہم صاحب لوگ بن کر رخصت ہوگئے کہ ہمارا فرض ادا ہوگیا۔

ہندوستان کے جنگلوں میں حکومت کی طرف سے ٹھیکیداروں کو درخت کے درخت نیلام میں فروخت کر دئے جاتے ہیں۔ کٹائی چرائی کے بعد وہ کارخانہ داروں اور تھوک فروشوں کے پاس اپنا مال فروخت کر دیتے ہیں پھر وہاں سے لکڑی مختلف طرح بکتی ہے لیکن مسٹر ض نے بتایا کہ یورپ میں حکومتیں اپنے جنگلوں میں سب کام خود کرا کے دوکانداروں کی طرح نفع اٹھاتی ہیں کلیں کارخانے جنگلوں میں قائم ہیں طلب کے مطابق سامان رسد سے اشیا تیار کی جاتی ہیں اور فایدہ اٹھایا جاتا ہے۔

ہاں اپنے طریقے میں ہماری سرکار بھی بڑی جنرس واقع ہوئی ہے چنانچہ میرے مسٹر ض نے اپنے علاقہ کے ایک حصے میں سونے کا ٹھیکہ بیس روپیہ سالانہ کو دیا ہے۔ سونا! سونا! سنہری سونا! ٹھیکیدار صاحب ندی کے خشک پاٹ کی ریت کو لے لے کر چھانتے چھنواتے ہیں۔ اور سونے کے اتنے ذرے جمع کر لیتے ہیں۔ کہ اُس کے لئے بیس روپے سالانہ کی رقم پیشگی لٹا دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اب قبل اس کے کہ آپ کو مسٹر ض کی موٹر میں بٹھاؤں اور پھر جنگل کی طرف لے چلوں۔ ذرا اس علاقے پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ ہلدوانی سے لال کنواں پھر نینی تال اور پھر دورے پر مسٹر ض کے ساتھ ساتھ کالاڈھونگی سے کوٹہ، کوٹہ سے پادل گڑھ،

پاؤں گڑھ سے چھوئی اور چھوئی سے رام نگر (دیکھئے پھر سے نقشے کو!) یہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں، یوں گئے ہم، یوں گھومے، یوں بھاگ دوڑ کی ہم نے!

سردیوں کا آخری زمانہ، فروری کا اخیر، سامنے نینی تال کے اونچے پہاڑ، اُن کے نیچے گویا ان کی آغوش میں پہاڑیاں جن کی جنوبی گھاٹیاں سبز و سرخ درختوں کے گنگا جمنی ملبوس سے مزین، پھر کہیں ذرا چڑھائی کہیں ذرا اترائی نشیب و فراز کی آنکھ مچولی پھر اُدھر پہاڑیوں سے آبشار کا گرنا اور اِدھر وادیوں میں پانی کا نہر بن کر بہہ نکلنا، اُدھر کنجو کے خزاں دیدہ درختوں کی بہار اِدھر خشک ندیوں کے پاٹ کی چمک یعنی حسن اپنے زوال میں بھی دل ربا و جان افزا کبھی کشمیر کی یاد تازہ ہوتی تھی کبھی سوئٹزرلینڈ کی، موسم ایسا کہ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم اور اوسا بھی اسی طرح بس نہ زیادہ بہت نہ کم پہاڑوں کی جگہ پہاڑیاں دریاؤں کی جگہ ندیاں، چڑھائی میں تھوڑا چڑھاؤ۔ اترائی میں تھوڑا اتار، غرض پہاڑی علاقے میں میدان کی سی وسعت یا یوں کہئے کہ میدانوں میں پہاڑ کی سی عظمت۔ بلندی و پستی کی ایک خوش منظر آرامگاہ!

جنگلوں کی یہ کیفیت ہے کہ کہیں تو کوسوں تک گنجان جنگل چلا جاتا ہے۔ ماسوا اس کے کہ کہیں کہیں چرائی کٹائی کے نشانات نظر آتے ہیں اور کہیں یہ حالت ہے کہ جنگل کے بیچ میں کھلے میدان اور پھر درختوں کے جھنڈ آجاتے ہیں۔ ان کھلی روشن جگہوں کو جنگل کی زبان میں چوڑ اور چاندر کہتے ہیں۔ اور ان تاریک گھری ہوئی جگہوں کو بوجھی یا جھیا۔ اور اگر وہاں کچھ پانی بھی ہو تو کچھار چنانچہ میرانیس کا مصرع ہے جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں، اس علاقے میں نہریں اور آبجوئیں کثرت سے ہیں یہاں تک کہ سردی کے موسم میں یہ چھوٹی چھوٹی پختہ سنگیں نہریں ہی ہیں جن سے کھیتوں کی آبپاشی ہوتی ہے۔ ان کی تہ پتھر کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے ان کی چوڑائی بالعموم دو چار گز اور زیادہ سے زیادہ دس گز ہوتی ہے اور ان کی گہرائی صرف دو چار فٹ۔ پانی خوب صاف شفاف اور ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا ہے۔ اور نہایت تیزی سے بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔

نور کے تڑکے ان اونچے نیچے کھیتوں کی سیر جھٹپٹا ہوتے یا تاروں کی چھاؤں میں جنگل کی فضا ایسی فرحت بخش ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے مہذب انسان بھی اپنے علم و فضل کو بھول کر فطری زندگی کا لطف اٹھانے لگتا ہے۔

اِس غفلت کے خواب سے مجھے مسٹر ض کی موٹر نے جگا دیا۔ آخر اس علاقے میں میں آسمان پر سے تو نازل ہوا نہ تھا ریل میں ہلدوانی آیا۔ پھر جو صاحب جنگل" کے تحت جنگلوں میں دور دور تک بس بنگلے پھیلے پڑے تھے۔ ان میں ایک دن یہاں دو دن وہاں ٹھہرتا ہوا سارے شمالی علاقے کی سیر کرتا چلا اور یہ سیر موٹر اور ہاتھیوں اور اونٹوں اور ملازموں اور فیلبانوں اور ساربانوں کے وسیلے سے ہوئی کبھی ہر روز کبھی ہر دوسرے روز یہ ہوتا کہ:۔ ہوتا ہے جادہ پیما کارواں ہمارا، موٹر متذکرۃ الصدر نے مجھے کیونکر بیدار کیا۔ اس کا قصہ یوں ہے۔ کہ اس جنگلی علاقے میں جو پورے ایک سو چودہ میل ہم اس موٹر میں گھومے تو گھومے کیا خوب ٹھپکے گئے۔ سڑکیں اکثر ایسی کہ موٹر میں مُردے بھی ہوں تو صور پھنکنے سے پہلے ہوش میں آجائیں، کبھی ہمارے سر کی ٹکر موٹر کی چھت سے، کبھی ہم آپس میں دھکم دھکا، غرض کہ ایک اچھا خاصہ مفت کا سینما، کہیں جنگلی رستوں پر، کہیں خشک ندیوں کے پتھریلے پاٹ

کے پار کہیں گھاٹیوں میں کہیں چٹانوں پر کہیں سڑک ایک طرف کو اونچی اور دوسری طرف اتنی نیچی کہ دایاں پہیہ زمین سے اُٹھنے کو تیار اور دل دھڑکے کہ بس ابھی گرے ابھی گرے کہ اتنے میں مسٹر ض کے بے باک اشاروں پر موٹر یہ جا وہ جا ہم بھی خوش وہ بھی ہمیں دیکھ کر خوش لیکن پھر وہی کم بخت سڑک کہ پیچھا نہ چھوڑتی تھی یعنی وہی جھٹ پٹ کھٹ پٹ کھٹ پٹ جھٹ پٹ کی آوازیں اور یک لخت گڑڑڑڑ ارے یہ کیا آفت آگئی۔ اف جو ہونا تھا سو آخر ہو ہی گیا جنگل کی سڑک غصے سے بل کھا رہی تھی۔ کہ یہ کالے لوگ کہاں مجھ پر سوار چلے جاتے ہیں، ایک جگہ موڑ جو مڑے تو سڑک بیچ سے اونچی اور دونوں طرف گڑھے پڑے ہوئے موٹر وہیں اٹک کے رہ گئی۔ اب لاکھ جتن کر دیکھے صفر مسٹر ض پرانے گھاگ تھے جی میں مسکرائے۔ مگر ذرا دل بہلانے کو کہنے لگے اب کیا بنے گا، میرے ہوائیاں چھوٹ گئیں۔ دور دور جنگل نہ آدم نہ آدم زاد، بس ایک مسٹر ض اور اُن کا کنبہ اور ضمیمے کے طور پر میں۔ موٹر میں سے ہم اُترے اتارے گئے، گدّوں کے نیچے سے طرح طرح کے اوزار نکلے جن سے پہیوں کو اونچا کیا۔ سڑک کو پھاوڑے سے تراشا حسنِ اتفاق سے کچھ پہاڑی عورتیں جنگل میں دور نظر پڑیں انہیں بلایا اور کہا کہ ذرا اپنی درانتی سے بہت سی گھاس کاٹ کر ہم کو دو۔ وہ ہنستی ہنستی گھاس کاٹتی تھیں اور ض زادہ نمبرا اور میں اُسے سڑک کی "گڑھیل" لیکوں میں بھرتے جاتے تھے کہ پہیئے ذرا اونچے کئے جائیں۔ اُدھر یہ کام ہو رہا تھا ادھر ض بیگم نے ایک پھبتی کہی کہ اور کچھ نہیں تو ٹ کے مضمون کے لئے تو کچھ مصالحہ تیار ہو گیا۔ اس سے ہم خوش ہو گئے اور اللہ میاں کی حکمت پر ایاک نعبد اور سمع اللہ لمن حمد کہنے لگے۔ بغرض خدا خدا کر کے سڑک تیار ہوئی پھر لگے شہری مرد اور جنگلی عورتیں موٹر کو پیچھے سے دھکیلنے۔ اے لو تھوڑی سی چلی۔ جان میں جان آگئی۔ بارِ خدایا تیری عنایات بھی کیسی ہیں۔ کہ اتنے میں پھر پہیہ پھنس گیا۔ یا الٰہی خیر، تھوڑا سا پھر تراشا اور پھر دھکیلا۔ موٹر چل نکلی سبحان اللہ، آج یقین آگیا کہ خدا ایک ہے۔ اور میں اس کا بندہ ہوں۔ پھرّ فرّ پھرّ فرّ چلے بنگلے کی طرف اور دھک سے جا ٹھہرے!

ان مزیدار دقتوں کے علاوہ سڑکوں پر چلتے ہوئے موٹر کی دھگ دھگ اور پھٹ پھٹ سے جو افراتفری بیچارے بے قصور مویشیوں کو پڑ جاتی تھی۔ وہ دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ بالخصوص بچھڑوں بچھیاؤں کی ایک دوڑ جس کا باعث ہم تھے حضور وائسرائے کی گھوڑ دوڑ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس "بچھیا دوڑ" میں دوڑنے والے اور والیاں اپنی دم اُٹھا کر نہیں اٹھا کر ایسی بے تحاشا دوڑیں کہ یہ واقعہ انسانی ملاحظات کی تاریخ میں ہمیشہ گرد آلود حرفوں سے لکھا جائے گا۔ سب سے بے وقوف جانور بار بردہ سڑک پر سب سے زیادہ دور تک ہمارے آگے آگے اور پھر ہمارے ساتھ ساتھ بھاگتے تھے۔ مجھے دیکھ کر خیال آیا کہ شاید اسی طرح تہذیب کی شاہراہ پر ترقی کی دوڑ میں سب سے تیز وہی دوڑ رہے ہوں جو سب سے زیادہ بیوقوف اور جاہل مطلق ہوں کیا عجب ہے کہ اسی طرح کوئی ہم سے زیادہ قوی اور فہیم اور فریب کار "طاقت" اپنی دھگ دھگ اور پھٹ پھٹ سے ہمیں بھگا بھگا کر اپنی زندگی کے لئے سامانِ تفریح پیدا کر رہی ہو لیکن اس طاقت کو آگاہ ہو جانا چاہیئے کہ جب سے ہم نے "وہ بچھیا دوڑ" دیکھی ہے ہمارے دل میں اُس طاقت کی "چالوں" کے متعلق سخت شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور وہ دن دُور نہیں جب ہم اپنے

آپ سے اور کائنات سے تنگ آکر اُس کی "دھگدھگی" کی راہیں مسدود ہوجائیں گے کہ بلا سے ہم لہولہان ہوجائیں لیکن اُس کو بھی اس مذاق کا (معاذاللہ) کچھ مزا چکھا دیں!

جو کام سڑکوں پر موٹر کا تھا وہ جنگلوں میں ہاتھی کا قرار پایا۔ ہاتھی کو جنگل کا سٹیم رولر (سڑک کوٹنے والا انجن) کہئے جھومتا جھامتا اپنے بھدے پن میں شاندار۔ یہ جانور نہایت زیرک اور دوربین ہے جنگل میں جہاں جھاڑ جھنکاڑ ہو وہاں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ لیکن قدم جب ایک بار رکھ دیتا ہے۔ تو پھر پیچھے کو نہیں ہٹاتا جو کچھ پاؤں تلے آجائے اسے روند ڈالتا ہے جو کچھ سامنے آجائے۔ اُسے ٹکر مار کر توڑ دیتا ہے۔ اور چاہے تو اچھے خاصے پیڑوں کو جڑ سے اکھیڑ کے رکھ دیتا ہے۔ ہاتھی فی الحقیقت جنگل کا انجنیر ہے۔ رستہ ڈھونڈتا ہے رستہ صاف کرتا ہے رستہ بنا دیتا ہے۔ انجن ڈرائیور انجن ریل گاڑی سب کچھ یہی ہے بس آپ اوپر بیٹھے رہیے۔ یہ اپنا کام کرتا چلا جائے گا۔ خیر ایک مہاوت گردن پر بیٹھا ہو تو "مَیل" (اٹھ چل) "بیٹھ دُم" اور بالخصوص "دھت دھت" (ٹھہر ہٹ) "بری بری" (مت کر) سے قواعد اردو کی بھولی ہوئی یاد تازہ ہوجاتی ہے

کالاڈھونگی کا جنگل قابلِ دید ہے۔ بڑے درختوں کی شان، چھوٹے درختوں کی نزاکت، خوبصورت جھاڑیاں کہیں کہیں گھاٹیاں۔ بس جی چاہتا تھا کہ زندگی کے کچھ دن یہیں بے فکر ہوکر کاٹئے لیکن عربی، فارسی و "اتی فکر" نے بہت جلد اردو کی فکر پیدا کردی۔ چیزوں سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت اس عاصی و احقر "رئیس مضمون تو بس" میں اِس درجے تک مفقود ہوچکی ہے۔ کہ ذرا لطف آیا اور وہیں معاً یہ خیال بھی دل میں چٹکیاں لینے لگا کہ اس لطف کے زور سے ایک لطیف مضمون لکھ دو۔ واہ ہم بھی لکھنے والوں کے لئے ایک دلکش موضوع بنے جاتے ہیں ایک معما ضرور لیکن ایک بہت جلد حل ہوجانے والا معما۔

جنگل کی سیر کر رہا تھا مشرِض سا تھ تھے۔ سال کے درخت سروِ سہی کی طرح کوسوں میں پھیلے ہوتے تھے۔ اِس خیال سے کہ شاید اِس کی ٹہنیاں گھونٹ کر پی لینے سے قد لمبا ہوجائے مجھ پست قد نے اس درخت میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ ہلدو، سال، سیمل، کنجو، باکلی، کھیر، روہنی، املتاس، بیل، رتی جینبیلی یہ ہے میرا پہلا سبق اور اسی سبق کی تصویروں سے ان جنگلوں کی لاکھوں جلدوں والی کتاب آراستہ پیراستہ ہے۔ ہلدو، سال، سیمل شاندار درخت ہیں ان کو دیکھ کر کشمیر کے دیودار اور سفیدہ یاد آئے۔ لیکن یہاں دیکھنے میں نہ آئے۔ ہلدو جس طرح اپنی اونچائی میں اسی طرح اپنے پھیلاؤ میں بھی ایک شاندار درخت ہوتا ہے لیکن اُس کی لکڑی صرف چھتوں کے اندرونی حصے کے لئے کام آتی ہے۔ سال کا پھیلاؤ بہت کم ہوتا ہے یہ ایک سیدھا اونچا خوبصورت درخت ہے جو ہندوستان کے قیمتی درختوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ جہاں اُگے وہاں صرف اپنوں کی موجودگی کو روا رکھتا ہے۔ غیروں کو اکثر پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ جہاں سال ہوں وہاں عموماً سال ہی سال ہوتے ہیں یعنی اپنے قبیلہ والوں کا بے حد جانبدار ہے۔ لیکن قبیلے والوں میں بھی پھوٹ پڑتے دیر نہیں لگتی۔ زندگی کا نام ہے جہد للبقا۔ جہاں بہت سے سال ہوئے وہ لگے ایک دوسرے کو دھکیلنے اور کچلنے نتیجہ وہی جو ہر جگہ ہوتا ہے،

کہ قوی کمزوروں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن ان کی بھی باری آجاتی ہے مگر وہ روز بعض اوقات عمر نوح کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی ہاتھی کے حملے یا کسی ٹھیکیدار کے کلہاڑے سے بچ رہے تو سال عموماً تین تین سو سال تک زندہ رہتا ہے بلکہ اس کی امکانی عمر اس سے دگنی تک ہو سکتی ہے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ کھیر سے کتھا بنتا ہے۔ یہ ایک قسم کا کیکر ہے اور اس کی شکل وصورت کیکر سے بہت ملتی جلتی ہے، ردھنی یہاں بکثرت دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کی شناخت بآسانی اس کے لال لال بیر کی طرح کے پھل سے ہو جاتی ہے جو گچھوں کی شکل میں لگتا ہے جنگل میں سینکڑوں جگہ پہاڑی عورتیں اپنے ٹوکرے لئے ہوئے روہنی کا پھل جمع کرتی اور اسے مل مل کر وہ لال آٹا سا اس سے بناتی ہیں جس کا نام کمیلا ہے جو ایک مشہور دوائی ہے۔ دن دن بھر وہ یہ محنت کرتی ہیں تب کہیں جا کر شام ہوتے تک وہ بمشکل دو یا تین آنے کما سکتی ہیں ہم وطنو! کیا یہ زندگی ہے یا محض موت سے گریز؟ سیمل سفید تنے والا ساں سے بھی زیادہ پرشوکت درخت ہے جنگل کا وجیہ جوان اس کی روئی سے سبک سروں اور نازک دماغوں کے نرم تکیے تیار ہوتے ہیں۔ اور اس کی لکڑی سے دیا سلائی کے سارے چوبی لوازمات تیار کئے جاتے ہیں چنانچہ بریلی میں سویڈن والوں نے جو دیاسلائی کا ایک بڑا بھاری کارخانہ قائم کر رکھا ہے اُس کے لئے وہ ایسی بھابر ترائی کے جنگلوں کے سیمل کی لکڑی حاصل کرتے ہیں، املتاس اور بیل کو میں نے بھی پہچان لیا۔ املتاس کی لمبی لمبی لکڑیاں جیسے لاٹھی مار پولیس کے ہنٹر اور بیل کے گول گول پھل جیسے ہاکی کرکٹ کے گیند، مگر یہ جنگل وہ نہیں جن پر صرف ٹھنٹی کا دل ریجھے بلکہ یہاں تو سنار کے منہ میں بھی پانی بھر آئے جگہ جگہ میں نے بعض درختوں کی ٹہنیوں سے سرخ سرخ دانے لٹکے ہوئے دیکھے ننھے ننھے گول گول خوبصورت سڈول سب ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور لطف یہ کہ یہاں یہ دانے ایک قسم کے درخت سے لٹک رہے ہیں اور ابھی چند قدم آگے دوسرے قسم کے درخت سے لٹکتے نظر آتے ہیں۔ حیران ہوا کہ کیا ماجرا ہے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ رتی کی بیل ہے جہاں موقع پاتی ہے جو درخت پاس ہو اس پر پڑھ جاتی ہے۔ جابجا رتیاں ہی رتیاں لٹک رہی ہیں ننھی ننھی سرخ گولیاں جن سے جنگل کی پریاں اپنے کھیل کھیلتی ہونگی! ایک ہی دن میں اتنی رتیاں نظر سے گذریں کہ غالباً کوئی سُنار یا ریاضی کا طالب علم ہی بتا سکے کہ ان کے کتنے ماشے اور تولے اور چھٹانکیں اور سیر اور من ہو گئے۔ ہائے ہائے ظالموں نے نازک اندام بھولی بھالی رتی کو بھاری بھرکم بد دماغ من کے پلے باندھ دیا۔ ارے کمبختو تمہارے علم وفضل نے حسن وخوبی کو ٹکرے ٹکرے کر دیا! کب نوع انسان تمدن کے پنجے سے چھوٹے اور کب وہ اپنی فطری زندگی اور طبعی قوت کو دوبارہ پالے!

جنگل کے چپ چاپ ساکن درختوں کی آبادی میں جنگل کے بولنے والے چلتے پھرتے جانوروں کی آبادی بھی آباد ہے۔ درختوں کو ہم دیکھ چکے۔ اب بعض جانوروں کی کہانی بھی سُن لیں۔ میرے خیال میں جس قدر ایک آدمی زیادہ خوف کھاتا ہے۔ اسی قدر زیادہ وہ خوفناک جانوروں کی کہانیاں سننا چاہتا ہے۔ کم از کم یہ میرا تجربہ ہے اپنے متعلق مسٹر ض جب مجھے ملتے ہیں میں ہمیشہ اُن سے شیروں کے متعلق تازہ ترین حالات سننے پر اصرار کیا کرتا ہوں یوں ان کے پاس بار بار آنے سے اتنا حوصلہ ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ کہ پچھلے دنوں جب کالا ڈھونگی کے جنگل میں انہوں نے مجھے ایک شیر کے پنجے کا نشان دکھا کر کہا کہ شیر

آج رات ہی یہاں سے گذرا ہے۔ تو میں تصور میں آٹھ گھنٹے پہلے کا خیال کرکے بھی مطلق نہیں ڈرا بلکہ اپنی جگہ پر قائم رہا اور "نقش پا" کو پامردی اور استقلال سے ٹکٹکی لگا کر دیر تک دیکھا کیا۔ شیر، چیتا، بھیڑیا، سانبھر، چیتل کاکڑ (یہ دونوں ہرن کی قسمیں ہیں) خنزیر، جنگلی کتا، بندر، لنگور سن لیجئے ان حضرات کی ہمسائیگی میں جنگل کے بنگلوں میں اور بنگلوں کے کمروں میں محفوظ ہوکر میرا دل ذرا بھی نہ دھڑکا۔ بلکہ میں نے اپنے دل سے اور دل کے ذریعے دماغ سے اور دماغ کے ذریعے گرد و نواح کے جانداروں سے یہ صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تم ایک ہی خدا کے بندے ایک ہی رسول کے پیرو اور جہاں تک بندروں لنگوروں کا تعلق ہے۔ (خدانخواستہ) ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں پس اے دہاڑنے والے شیرو اور اے کاٹنے والی چیونٹیو! میں ان جنگلوں میں انسانوں کی طرف سے ان کا ایلچی مقرر ہوکر تمہاری خدمت میں صلح و امن کا پیغام لایا ہوں۔ بلکہ چونکہ میں اپنی بندوق کی شکل بھی کم دیکھتا ہوں اس لئے میں تو عموماً تمہاری درازئ عمر کی دعائیں ہی مانگتا رہتا ہوں چنانچہ پچھلے روز جب مسٹر ض مجھے سال اور دو سو جنگلی پیڑوں کی عمریں بتا رہے تھے۔ تو میں نے ان سے پوچھا کہ جنگلی جانوروں کی عمریں کیا کیا ہوتی ہیں اس پر انہوں نے رسالہ "انڈین فارسٹر" کا فروری ۱۹۳۲ء نمبر دکھایا جس میں "ہندوستان کے دودھار جانوروں کی عمریں" کے عنوان سے ایک مستند مضمون درج تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگ بندروں کی اوسط عمر سات سال، پوری عمر پندرہ سال اور زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال تک ہوتی ہے۔ حضرت لنگور دس سے پندرہ سال تک زندہ رہتے ہیں اسی طرح چیتے کی ۶ سے ۱۵ بھیڑیے اور گیدڑ کی ۱۰ سے ۱۵، لگڑ بگڑ کی ۱۲ سے ۲۲، لومڑی کی ۱۳ سے ۱۵، بارہ سنگھے کی ۱۴ سے ۲۳، خنزیر (علیہ اللعنت) کی ۱۵ سے ۲۰، شیر کی قید میں عموماً ۱۴ یا ۱۵ اور آزادی میں ۱۱ سے ۱۹ تک، ریچھ کی ۲۰ سے ۴۰ تک لیکن ہاتھی کی ستر بلکہ سو سال تک ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ ہاتھی انسانی قید میں زیادہ عمر پاتا ہے جنگلی زندگی میں کم۔

اب چلئے آپ بھی انتظار کر رہے ہونگے۔ اب شکار کھیلیں، ہاتھی پر چیتے کا اور شیر کا شکار، موٹر پر کوؤں اور چیلوں کا، اور پیدل چل کر مرغیوں کا فاختاؤں کا لودں کا اور (اور شکاریوں کا قاعدہ ہے کہ) : ؎

سامنے آجائے جو کچھ دیکھ منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

پہلے میری "شنید" سنیئے پھر میری "دید" کی باری آئے گی! لال کنوئیں کے جنگل میں ہمارے افسر ایک واقعہ کے متعلق تفتیش کر رہے تھے۔ میں نے سن پایا کہ چند روز ہوئے وہاں انگریز "پولیس سپرنٹنڈنٹ" نے شیر کا شکار کرنے کو ایک کٹرہ بندھوایا راتوں رات شیر نے گالا کر دیا۔ یعنی کٹرہ کو مار دیا۔ (یہ قاعدہ ہے کہ اس طرح ایک بے گناہ کٹرہ جنگل میں بندھوا دیا جاتا ہے رات کو شیر یا چیتا آکر اسے مار دیتا ہے۔ صبح آپ اسے مرا ہوا دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں پاس کے درخت پر "مچان" یعنی ایک بے پایہ چارپائی بندھوا لیتے ہیں وہاں سہ پہر کو بیٹھ جاتے ہیں۔ شام تک انتظار کرتے ہیں شیر آتا ہے۔ پھر تو اگر آپ کے حواس باختہ نہ ہو جائیں۔ تو آپ اُس پر گولی چلا کر "شیر افگن" بن جاتے ہیں) اتفاق سے اسی دن ایک امریکی امیر تاجر اُدھر آنکلا اور وہ

جنگل کے سرکاری رکھوالے کو کچھ چاندی سونا دکھا کر اپنے "مچان" بندھوا کر درخت پر ہو بیٹھا۔ سپرن ٹانڈنٹ صاحب کو پتہ چل لیا۔ وہ ہاتھی پر جھومتے جھامتے تشریف لائے۔ اور امریکی کو اترنے کا حکم دیا۔ وہ اترا۔ مفصل حالات سن کر اپنے قصور کا معترف ہوا۔ اس پر سپرن ٹانڈنٹ صاحب نے خسروانہ فیاضی کے طور پر اسے پھر تخت پر بٹھا دیا لیکن جب انہوں نے سنا کہ شیر مار لیا گیا۔ تو ان کا شکاری غصہ زور پر آیا اور انہوں نے سرکاری رکھوالے کی رپٹ کر دی۔

ایک امریکی تاجر کی "شیر افگنی" کی داستان نے دوسرے سفید رنگ تاجروں کے دل میں بھی گدگدی پیدا کر دی چنانچہ جب ہم کالاڈھونگی میں مقیم تھے تو ایک دن صبح کو ایک موٹر نے اپنی آمد آمد کا آوازہ بلند کیا۔ حیران ہوئے کہ یہ نووارد کون ہیں۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ دو اطالوی مسٹر ض سے شیر کا شکار کھیلنے کی اجازت لینے آئے ہیں۔ وہ مسٹر موصوف سے اطالیانہ انگریزی میں باتیں کرتے تھے میں پاس کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ مسولینی کی دھاڑ جنگھاڑ کا کچھ ان کے لب و لہجے میں بھی نشان ہے کہ نہیں مگر میں نے دیکھا کہ چھپ کر شیر مارنے کی آرزو نے ان میں سے ہر ایک کو جنگل کے افسر کے آگے بالفعل ایک گدو باہ بنا رکھا تھا۔

اسی کالاڈھونگی کے گاؤں کے قریب ایک انگریز میجر متمکن ہے۔ مضافات میں دور دور تک اس کی جائداد پھیلی ہوئی ہے۔ گویا وہ ایک بڑا رئیس اور امیر کبیر ہے۔ (افریقہ میں بھی اس کی جائداد اور اراضی ہیں) یہ میجر بڑا تجربہ کار شکاری ہے اس نے اتنے مردم خور گلدار (چیتے) اور شیر مارے ہیں۔ کہ پہاڑی لوگ اُسے "چھوٹا پرمیشر" کہتے ہیں۔ ہمارے آنے سے دو چار ہی روز پہلے بعض پہاڑی لوگوں نے اس کے پاس آ کر دہائی دی۔ کہ فلاں مقام پر ایک شیر اکثر ہمارے مویشی مار کر کھا جاتا ہے۔ اس پر صاحب کٹر اندھوا کر بغیر مچان کے ایک درخت پر بیٹھ گیا۔ جب شام کا وقت ہوا تو ایک شیر دور سے آتا دکھائی دیا۔ وہ پہنچا ہی تھا کہ دور ایک اور شیر نظر پڑا۔ وہ بھی ادھر ہی کو آیا۔ پھر یہ پہنچا تو دوسرے ایک تیسرے شیر کی شکل بھی دکھائی دی لیکن اسی پر بس نہیں بلکہ ایک چوتھا شیر بھی وہاں آوارد ہوا۔ چار شیر اور ایک لاش۔ چاروں لگے غرانے میجر پہلے تو تماشا دیکھتا رہا پھر تاک کر اس نے سب سے بڑے شیر پر جو تقریباً بارہ فٹ لمبا تھا۔ گولی چلائی اب زخمی شیر اور دوسرے شیروں میں سخت لڑائی ہونے لگی۔ زخمی شیر سمجھا ہو نہ ہو ان حاسد بھائیوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے غصے میں آگیا اور ان پر جا پڑا۔ سارے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اور سارا جنگل ان کی چیخ پکار سے گونج اٹھا۔

یہ کہانیاں سن سن کر میں نے بھی کمر ہمت باندھی اور جی سے کہا کہ افسوس اک عمر دوسروں کا شاید لیکن اپنا یقیناً شکار بنا رہا مگر اب وقت آگیا ہے کہ اپنا شکار نہیں اپنا شکاری ہوں اور جس طرح انہیں مسٹر ض کی معیت میں اور ان کی ترغیب پر ایک دفعہ شملے میں میں دن بھر میں ستائیس میل پیدل چلا تھا۔ اسی طرح ان کی معیت میں کسی نہ کسی طرح میں بھی جنگل میں گھس جاؤں۔ کہ دلیروں کی دنیا خود بخود میری عزت کرنے لگے لیکن میری موجودگی نے کچھ ایسا

اثر پیدا کیا کہ کئی بار لال کنوئیں کی تو چیوں میں کالاڈھونگی کی جنگلی سڑکوں پر پادل گرتھ کے گنجان جنگل میں ہاتھیوں پر یلغار کرتے ہوئے نکلے۔ مگر مرغیاں بھی شاید ہم پر ہنستی ہوئی دور ہی دور کہیں اڑ گئیں ہم کیا گئے جنگل پرندوں درندوں سے خالی ہو گئے۔ یہ موقع بھی نہ ملا کہ بقول "مسٹر گونکی" (عمر ڈھائی سال) کے میں ڈل پلا (ڈر پڑا) میں طوطبیار ور رہا ہوں۔ صرف یہی ہوا کہ چھوئی کے جنگل میں ہاتھی پر بیٹھے ہی جھنبلی کے کچھ پھول توڑے اور وہیں کچھ بیر بھی توڑ لیئے جن میں سے ایک بیر سے جو انہوں نے رد کر ہم سے حاصل کیا۔ یہ مُنّے خاں یوں مخاطب ہوئے: "بیل (بیر)! آ ہم تم کو کھائیں" اسی طرح گویا میں بھی زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ شیر آ ہم تم کو ماریں" مگر میری قسمت میں تو "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" بھی نہ لکھا تھا تاہم میں بالکل مایوس نہ ہوا اور میرے ضمیر نے مجھے بار بار آواز دینی شروع کی کہ سن پنجاب کو اپنے سپوت سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور سن کہ اگر آج تو نے یو۔ پی والوں پر کچھ رعب نہ جمایا تو کل کو خود مختار ہندوستان میں تیرے صوبے کی کیا گت بنے گی۔ اس پر ایک دن صبح کو میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے تئیں سخت خطرے میں ڈال دوں گا مگر خالی ہاتھ واپس نہ آؤں گا۔ سویرے ہی مسٹر ض اور میں نکلے۔ ض زادہ نمبر ا نے بھی ہمراہ آنا چاہا میں نے سوچا خوردوں کے سامنے آبرو یہی رہے تو بہتر ہے مسٹر ض کے کان میں پھونک دیا کہ اسے روک دو۔ چھوئی کی ننھی سی ندی کے کنارے گئے۔ پہلے تو ایک جگہ اس کے خشک پاٹ میں گدھوں کا انبوہ دیکھا۔ سمجھے کسی گائے یا گدھے کی لاش ہوگی۔ قریب آئے تو یہ دیکھ کر جسم میں سنسنی پھیل گئی کہ یہ تو ایک انسان کی لاش ہے۔ پاس چارپائی پڑی ہے۔ کوئی بے رحم ظالم اس غریب کو یہاں لائے۔ ذرا سا گڑھا کھود ا تھوڑی سی مٹی اوپر ڈال دی اور چل دئے۔ گدھوں نے مٹی کرید کر نوچا کھسوٹا اور گھسیٹ کر لاش کو باہر لا ڈالا۔ کھوپڑی کو اس طرح صاف کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کا پڑا ہوا پنجر ہے لیکن نہیں الامان ابھی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ تازہ گوشت کے لوتھڑے سے تھے۔ پاس ہی ایک گیدڑ بھی معائنہ کر رہے تھے ہمیں دیکھ کر دوڑے۔ ہم بندوق لئے پیچھے پیچھے ہوئے فیر کیا مگر خالی گیا۔ واپس آئے اور ایک گدھ پر ڈز کیا مگر نتیجہ ندارد مرے ہوئے بھائی کا خون بہا بھی نہ ملا۔ اس کے بعد آگے بڑھے ایک ذرا سی ندی بہہ رہی تھی۔ ایک کوئے کو نشانہ بنایا گیا۔ مگر وہ بھی اڑ گیا۔ پھر اک بیچارہ اور ذرا سا لوا بیٹھا دم ہلا رہا تھا تیس مار خاں نے شست باندھ کر جو اس کی موت کا حکم دیا تو اس نے فوراً ہی جان دے دی اور بلا توقف راہئی ملکِ عدم ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون! اس پر ہم نے ازراہِ انکسار لوے مار خاں کا لقب اختیار کیا۔ اور چھوٹتے ہی ایک فاختہ پر کارتوس خالی کر دیا کہ اتنے میں ہاتف نے ذرا دور سے آواز دی کہ ؎

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک ؎ شیر افگن نے اک لوا مارا

(جنگلی ابجد کے حساب سے دیکھئے بلاشبہ ۲۷ فروری ۱۹۳۲ء تاریخ نکلے گی!) جب یہ سنا تو میں نے بھی مناسب جانا کہ فی الحال اپنی بہادری کو ذرا تہ کر کے رکھ لوں۔ بس سمجھ لیجئے کہ میرے لئے

شکار اور کل کائنات اس کی یہ تھی

ترتیبِ موضوع میرے سامنے لکھی پڑی ہے۔ اب عنوان نمبر ۶ کی باری ہے "متفرقات اور خاتمہ" متفرق چیزوں میں ترتیب و تدریج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ سوچتا ہوں کہ کونسی لے لوں کونسی چھوڑ دوں چند مثالیں پیش کرتا ہوں آپ بھی ٹھیک ٹھیک رائے دیجئے۔

مثال نمبر ۱۔ مجھے "کالی فاش" اور اس کی بہن کالی موز کی مصاحبت میں زندگی بسر کرتے ہوئے تین چار روز ہوگئے تھے کہ ایک روز پچھلی رات کمرے کے اندھیرے گھپ میں میرے تن من میں گویا آگ سی لگ گئی۔ بدن کا رواں رواں العطش الاماں پکارنے لگا۔ غالب کی نارِ بستر، خارِ بستر، زارِ بستر والی غزل یاد آ آ کر دماغ میں چکر کھانے لگی کبھی یہ خیال آئے کہ ان "کالیوں" نے غضب کی گرمی طبیعت میں پیدا کر دی ہے۔ اور فرار کی کوئی راہ نہیں چھوڑی کبھی یہ وہم کہ آج سے "جو خنگل کی زندگی" پر مضمون لکھنا شروع کیا تھا اس نے تھکے ماندے دماغ کو پھر بیدار کر دیا ہے اب دوائیں کھانی ترک کر دوں یا مضمون لکھنا بند کر دوں؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رات بھر اسی طرح بے چینی میں گذری صبح منہ اندھیرے جو مسٹر ض نے پاس کے پلنگ سے السلام علیکم کہہ کر مزاج پرسی کی تو میں نے اپنی رام کہانی کہنی شروع کر دی میں نے ابھی تھوڑا سا قصہ ہی بیان کیا تھا کہ انہوں نے بات کاٹ کر مرض کی صحیح صحیح پیشگی تشخیص کر دی اور مجھے بتایا کہ بھائی صاحب یہ تو میرے ملازمین کی عنایت سے آپ کو ایک "کھٹمل آبادی" چارپائی مل گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ کہ یوپی میں ذرا کھٹمل کے لفظ کو سوچ سمجھ کے استعمال کرنا یہ پنجاب کا سا سادہ لوح صاف گو ملک نہیں یہاں کھٹمل کے معنی شیعہ کے ہیں اور پسو کے معنی سنی کے (اگر میرا کھٹمل شیعہ نہ تھا بلکہ غالباً کوئی فلسفی دہریہ لینن کا پیرو)

آئندہ میری سوانح عمری لکھنے والے کو ہدایت ہو کہ وہ یہ "واقعہ کھٹملان" کسی طرح نظر انداز نہ کرے کہیں جنہیں طبعی اور دماغی اور شاید روحانی کیفیات سمجھے ہوئے تھا وہ فقط جسمانی واقعات نکلے۔ کہیں باقی ماندہ شعبہ ہائے زندگی کی بھی یہی حالت نہ ہو!

مثال نمبر ۲۔ پاڑل گڑھ کے رستے میں مسٹر ض مع اپنے معاونین کے ایک گاؤں ددھنیا میں ایک معاملہ کی تفتیش کے لئے اترے ہم موٹر میں بیٹھے رہے۔ ہمارے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کا جمگھٹا ہوگیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک کٹی پھٹی کتاب تھی۔ دیکھا تو ہندی کا قاعدہ ہے میں ہندی پڑھنی نہ جانتا تھا۔ اگرچہ کئی سال سے ہندی کے مختلف قاعدے جمع کرنے میں مصروف رہا تھا لیکن اس کی اب ت کو عبور کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ چند منٹ سیکھا کتاب کو کتابوں کے پیچھے پھینک دیا۔ پھر سال بھر کے بعد نکالا دو چار حرف اور پڑھے پہلے جو کچھ بھول چکا تھا، اسے پھر دہرایا۔ اور پھر اسی طرح سال بھر کی چھٹی منالی۔ اس سے علم تو نہیں لیکن ایک قسم کا زعم دماغ میں ضرور پیدا ہوگیا تھا۔ کہ میں ہندی کے حروف کی شناخت کا مادہ رکھتا ہوں۔ یہاں لڑکوں کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ ایک چھ سال کے لڑکے نے ایسے خوب خوب جواب دئے کہ میں نے فوراً ہتھیار ڈال دئے اور اُسے اپنا استاد بنا لیا۔ اتنے میں ان کے ماسٹر جی بھی آگئے ہم نے لڑکوں

لڑکیوں کو پیسہ پیسہ بانٹ کر بقدر ۲/۱ آنے کے اپنی جیب ہلکی کی۔ اور پھر ماسٹر جی سے پوچھا کہ ہندی قاعدہ کوئی فالتو ہو تو ہم مول لیں گے۔ غرض اُن سے ۲/۱ آنے میں قاعدہ خرید کر ان سے سارے حروف تہجی ہندی تصویروں کے سامنے لکھے ہوئے अ سے لے کر ज्ञ تک پڑھ ڈالے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہی اپنا "پاٹھ" پڑھتے ہیں مصطفے کمال کی نئی ٹرکی کی ملکی مشترک تعلیم کا نمونہ آنکھوں میں پھر گیا۔

مثال نمبر ۳۔ ہمارے ایک نوجوان عزیز آکسفورڈ کے تازہ بتازہ "گریجوایٹ" بن کر آئے ہوئے مسٹر ض کے پاس آنے والے تھے ہم انتظار میں ان کی راہ تکتے تھے۔ ان کا پہلا تار آیا جس سے آنے کی امید بندھی۔ دوسرا آیا کہ نہیں آرہا۔ امید ٹوٹ گئی مگر وہ تمام پلاؤ اور وہ پڈنگ اور وہ اور سب کچھ جو ان کی آمد کی تقریب میں بڑی بڑی "شادیانہ" دیگوں میں بھک بھک پک رہا تھا ہمارے جسم و جان اور ہمارے قلب و روح کا جزو لاینفک بن گیا۔

مثال نمبر ۴۔ چھوئی کے بنگلے میں مسٹر ض موٹر سازی کے کام میں مصروف تھے کہ بین جی اور ایک بھان متی آنازل ہوا۔ اس نے تقریریں کیں، کرتب دکھائے، سرٹیفیکیٹ دکھائے، جھوٹ سچ ملایا لیکن دو ایک کرتب واقعی ایسے حیرانی میں ڈال دینے والے تھے کہ اسے انعام دے کر میں نے کہا کہ اگر ہمیں یہ کوڑی والا کرتب سکھا دو تو ہم تم کو بڑا عمدہ اس سے بھی بڑے کاغذ پر ایک "سارٹی فکٹ" دیں۔ آخر "سارٹی فکٹ" اور بسکٹ کے ایک خالی ٹین پر سودا ہو گیا۔ کرتب یہ تھا کہ زمین میں ایک تنکا گاڑ کر اس پر ایک کوڑی رکھ دی جاتی تھی۔ پھر جب بھان متی صاحب اس پر تقریر کرتے اور پانی چھڑکتے تھے تو وہ کوڑی چاروں طرف گھومتی تھی اور "سلام کرتی تھی"۔ اب اس کرتب کا مکمل علم راقم کے قبضے میں ہے۔ جو صاحب ایک "سارٹی فکٹ" اور بسکٹ کا ایک خالی ٹین ہمایوں کے دفتر میں روانہ فرمائیں گے۔ انہیں راقم اپنا "تلمیذ الرحمٰن" بنانے کے متعلق ہمدردی کے ساتھ غور و خوض کرے گا۔ یہ ہے جنگل کی زندگی اور یہ ہے جنگل کی زندگی پر میرا مضمون کہ

تمت بالخیر

۲۶؍ فروری ۱۹۳۲ء

بشیر احمد

ضمیمہ

شیر کا شکار

بس اے ناامیدی نہ اب دل دکھا تو ۔۔۔ مجھے شکل اے شیر اپنی دکھا تو
ترے دم سے زندوں کو غش آ گیا ہے ۔۔۔ بہت بھینسوں ٹٹوؤں کو تو کھا گیا ہے

مگر آگئی آج تیری بھی باری
شکاری کا ہو تو شکار اے شکاری

مضمون فروری کے ساتھ ختم ہوا۔ یکم مارچ گویا چھٹی کا دن تھا۔ صرف صبح کو میں مضمون کو دہرا رہا تھا۔ اسی میں ساڑھے بارہ ایک بج گیا۔ میں غسل میں تھا کہ باہر سے آواز آئی "بھائی صاحب شیر نے لاش کر دی"۔ معلوم ہوا کہ چند روز ہوئے جو مسٹر ض نے میرا شیر کا شوق دیکھا۔ تو حکم دے دیا کہ بہت سے کٹڑے باندھے جائیں اس کے متعلق ابھی خبر آئی ہے۔ کہ شیر نے لاش کر دی یعنی ایک کٹڑا مار دیا۔ شیر کے شکار کا خیال موید غسل اور محرکِ حیات ثابت ہوا۔ نہانے میں کپڑا پہننے میں نرا سانس لینے میں بھی ایک لطف تھا۔ شائد ناموری کا ایک آسان رستہ مل گیا۔ کیونکہ مسٹر ض نے ایک روز بڑی سنجیدگی سے بتایا تھا کہ جو شیر مہمان کے ہوتے مارا جائے وہ "مہمان کا شیر" ہوتا ہے۔ رام نگر سے سات میل پر سانول دہیر کے گاؤں کے قریب جنگل میں شیر نے لاش کر دی تھی۔ موٹریں دھکے کھاتے جنگل کے عین بیچ میں جا پہنچے۔ ایک ٹھاکر صاحب شکاری بھی ساتھ تھے۔ وہ پہلے سے جا کر مچان بندھوا رہے تھے۔ موٹر سے اتر کر ہم ہاتھی پر گئے۔ اور موقع پر جا پہنچے۔ جنگل کے بیچوں بیچ ایک ندی کا خشک پتھریلا پاٹ تھا۔ اس کے دونوں طرف گھنے درخت، درختوں کے آگے ندی کی طرف کو کچھ سرکنڈے۔ اس ندی کے کنارے پر مچان بندھے۔ ٹھاکر صاحب ایک درخت پر مسٹر ض زادہ نمبرا اور میں دوسرے درخت پر اپنے اپنے مچان پر اپنی اپنی بندوق لئے بیٹھ گئے۔ ہاتھی رخصت کر دئیے گئے۔ ہدایت ہوئی کہ چپ سادھ لو دم نہ مارو اس طرح جیو گویا مردہ ہو۔ شیر کا شکار یوں ہوتا ہے بیل کے ایک درخت کے ساتھ کچنار کا ایک درخت لپٹا ہوا تھا۔ زمین سے پندرہ ندی سے سترہ فٹ کی بلندی پر ہمارے مچان ان دو ملے جلے درختوں کے ایک دوشاخے میں بندھے ہوئے تھے۔ میزبان میزبان زادہ اور مہمان بیک وقت یک جا اپنے "تخت سلیمان" پر نشستہ جنگل کے بادشاہ پر یلغار کرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ چپ چاپ ہمہ تن شیر سے لو لگائے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر تم منوں ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جبر شیر کے لئے تین چوتھائی گھنٹے بھی انتظار کرنا پڑتا تو کچھ بہت نہ تھا۔ مچان شاخوں میں چھپے چھپائے تین آدمی جھانک رہے تھے کبھی ادھر کبھی بائیں کبھی آگے کبھی پیچھے سامنے نیچے ندی کے پتھروں پر بیچارا مردہ کٹڑا پڑا ہوا۔ ندی کے سامنے کنارے پر اسے ایک بڑے درخت کے گرے ہوئے تنے سے باندھا گیا تھا۔ شیر نے رات "لاش کر دی"۔ شیر کا قاعدہ ہے کہ پہلے وہ اپنے شکار کی گردن دبوچتا ہے۔ گلا گھونٹ کر مار دیتا ہے کچھ خون پیتا ہے اور پیچھے کا حصہ پھاڑ کر کچھ کھا لیتا ہے۔ اور پھر کھینچ کر اسے ذرا دور کسی محفوظ جگہ میں رکھ دیتا ہے اور دوسرے روز اکثر شام کو کبھی رات کو آکر باقی ماندہ کو اطمینان کے ساتھ ختم کرتا ہے۔ یہی اس کٹڑے کا حال ہوا۔ شیر نے اسے مار کر کچھ کھا کر اسے کھینچا۔ اور چونکہ وہ ایک موٹے رسے سے تنے کے ساتھ بندھا تھا تنے سمیت اسے کھینچ کر چاہا کہ کسی محفوظ مقام میں اسے رکھ دے مگر یہ نہ ہو سکا تو ندی کے عین درمیان اسے چھوڑ دیا۔ تنا بہت بھاری تھا بڑا طاقتور شیر ہو گا جو اتنے بوجھ کو یہاں تک بھی کھینچ لایا یا ممکن ہے کہ پاس کی سڑک سے صبح ہوتے گاڑیبانوں کے شور سے ڈر کر وہ کنارہ کر گیا ہو۔ بہرحال اسے شام کے وقت پھر اپنی "لاش" پر آنا تھا سو ہم اپنی کمین گاہ میں بیٹھے شکار کرنے لگے۔ بات چیت بند، کھانسنا بند، ہلنا جلنا بند، صرف دل کے اندر کی گھبراہٹ اور اس کی بھی کھلی اجازت نہیں پانچ دس پندرہ بیس منٹ ——— اگر شیر ابھی آجائے تو گویا گھر بیٹھے شیر کا شکار ہو گیا۔ وہ دیکھئے ایک نیولا ندی کے اس کنارے سے آیا۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا اوپر دیکھا ہم سے آنکھیں چار ہوئیں

——— جنگل سنسان ہے پہلے ٹھہرا پھر آگے بڑھا پھر ٹھہرا پھر بڑھا، لاش سے دور ہی دور رہا پھر دیکھا کہ اس سے ذرا پرے وہاں جہاں خون کے نشان تھے۔ اک ذرا سا لوتھڑا ہے اسے لیا اور بھاگا سرکنڈوں کی طرف واپس ——— آدھ گھنٹہ پینتیس منٹ چالیس پچاس پچپن ——— ادھر داہنی طرف دور ندی میں ایک مور اور اُن کی مورنی اکٹھے چائے پی کر گلگشت کو نکلے مٹک مٹک کر اک انداز سے آگے مورنی صاحبہ پیچھے مسٹر مور چلے۔ اور جنگل کی دوسری طرف غائب ہوگئے ——— ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ ——— خاموشی ——— کبھی کبھی کسی چڑیا کی آواز ——— بارش کی چند بوندیں، بارش آگئی تو کیا کریں گے خیر تھوڑی سی ہوگئی تو حرج نہیں ——— ہوا خوب چل رہی تھی جنگل میں پتوں کی سرسراہٹ کا شور تھا، مسٹر ض نے مجھے کان میں کہا۔ یہ سارا موسم شیر کے شکار کے لئے خوب موافق ہے۔ زور کی ہوا کے باعث شیر کو آدمی کی بو نہیں آتی۔ نہ پتوں کی سرسراہٹ میں اسے ہماری جنبش کا احساس ہوسکتا ہے۔ . . . پھر خاموشی پھر ہلنا جلنا بند۔ . ایک ٹہنی کے ٹوٹنے کی آواز! ——— ایں یہ کیا ہے؟ شیر؟ ——— نہیں! پاس کے درخت پر بہت سے گدھ بیٹھے ہیں صبح سے مرا کے پاس کے درختوں پر متفکرانہ بیٹھے تھے۔ ان کی جنبشیں ہیں ——— مجھے بتایا گیا کہ جنگل کے پرندے تک بھی جب شیر کہیں قریب ہو اس کی لاش کے پاس نہیں پھٹکتے "بادشاہ" کے مال پر رعایا دست درازی نہیں کرسکتی ——— ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ خاموشی! سورج غروب ہو رہا تھا۔ بس مسٹر ض نے کہا یہ ہے شیر کے آنے کا وقت۔ اب چپ بیٹھے رہئے ——— میں پہلے سے چپ تھا۔ میں جو کبھی اپنے خیالوں سے رہائی نہ پاسکتا تھا۔ اس وقت شیر کے خیال سے رہائی نہ پاسکتا تھا کبھی کبھی ضرور اپنی آئندہ زندگی کے منصوبے دماغ میں گھوم جاتے تھے۔ یہ کروں گا یہ نہ کروں گا۔ یوں اپنے آپ کو "ٹھیک" کردوں یوں "غلط" نہ ہونے دوں۔ بس واپس جاتے ہی اپنا ردیہ اس طرح کا بنالوں گا۔ نہیں نہیں استقلال کے ساتھ کرد ں گا۔ جو کچھ بھی کرسکوں گا ——— یک لخت ایک مور کی آواز پھر ایک دوسرے مور کی، پھر بہت سے موروں کی آواز ڈری ہوئی آوازیں ——— مسٹر ض نے مجھے چھوا۔ اور اشارہ کیا پھر کان میں کہا یہ ہے شیر کے آنے کی نشانی کہ جانور بولنے لگتے ہیں ——— ایک کاکڑ (ہرن) کی آواز ——— پھر موروں کی آوازیں ——— پھر خاموشی، دس منٹ تک پوری خاموشی۔ ادھر دیکھا اُدھر دیکھا جھاڑیوں میں درختوں کے نیچے ندی کے پار کہیں کچھ بھی نہ تھا۔ ——— دور کہیں ایک آواز سی ہاں پھر ایک اسی طرح کی دبی ہوئی سی دھاڑ! دھاڑ! ——— شیر شیر! ابس اب تھوڑی دیر میں ——— خاموشی، انتہا کی خاموشی ——— کچھ نہیں پھر کچھ نہیں۔ دو سوا دو ڈھائی گھنٹے گذر گئے تھے ——— اندھیرا ہونے لگا، ہوگیا ——— اب کچھ نظر بھی نہ آتا تھا ——— بس ایسے وقت میں شیر آیا کرتا ہے۔ ——— وہ کیا ہے؟ کالا کالا سا بڑا بڑا! شیر؟ نہیں سرکنڈے کے پاس کی جھاڑی ہے اور کچھ نہیں! ——— شور ہوا، جھاڑیوں میں سرسراہٹ کھٹ کھٹ جھر جھر! ——— چپکے بیٹھے رہو! ——— سیٹی کی آواز! ——— ایں یہ کیا؟ ——— وہ جو ہاتھی والوں کو کہہ رکھا تھا کہ ۷½ بجے آجانا یہ تو وہ لوگ ہیں! ——— بس ڈراپ سین، شیر کا شکار ہوچکا، شیر کا کھانا شیر کے

لئے چھوڑ دیئے اور آپ اپنے گھر کی طرف منہ موڑ دیئے ۔ مسٹر ض بہت مایوس ہوئے میری خاطر میں نے کہا بھائی صاحب ملول نہ ہو جیئے ۔ مجھ سے شکاری کے لئے یہی کیا کم ہے ۔ یہ "ری ہرسل" تھا اگلی دفعہ اصلی کھیل ہوگا۔

سو قارئین بھی متنبہ ہوں کہ یہ "شیر کا شکار نمبر ا" تھا۔ آئندہ مضمون ہوگا "شیر کا شکار نمبر ۲"۔ اس میں شیر آئے گا ۔ مگر ہمیں سونگھ دیکھ کر دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔ پھر مضمون ہوگا "شیر کا شکار نمبر ۳" اس میں شیر آئے گا اپنی لاش کے قریب آئے گا کہ ہم گولی چلادیں گے۔ گولی شیر کی دم سے ½ انچ کے فاصلے پر زن سے نکل جائے گی ۔ شیر کا دل دھڑکنے لگ جائے گا اور وہ نعوذ باللہ کہتا ہوا چل دے گا ۔ اخیر میں "شیر کا شکار نمبر ۴ ہوگا" اس میں کٹرہ بندھے گا ۔ "لاش ہوگی" مچان بندھے گا ۔ ہم بیٹھیں گے شیر آئے گا ، کٹرہ کھائے گا ، ہم گولی چلائیں گے ، اس کی گردن میں لگے گی ۔ وہ غوغو کرتا گر جائے گا ، ہم نیچے اتریں گے ، فوٹوگرافر کا پہلے سے انتظام ہوگا ، سو ہمارا اور ہمارے گولی مارنے والے دوست کا مع شیر کے فوٹو کھینچے گا جس کا بلاک تیار کر کے ہمایوں میں تصویر بردی جائے گی ۔ تاکہ دنیا بھر میں ہماری دلیری اور ہماری دیانت داری کا بول بالا ہوجائے اور تاکس نہ گوید بعد ازیں ـــــــ کچھ بھی !!!

د ل ب

۲ رمارچ ۱۹۳۲ء

چاند اور سمندر

مرے محبوب تو ہے ماہِ تاباں میں سمندر ہوں

بپا ہوتا ہے طوفانِ تمنا میرے سینے میں	شعاعیں قلزمِ دل میں تری جب مسکراتی ہیں
ترے جلووں سے ہم آغوش ہوتی ہیں مری موجیں	چٹانیں اضطرابِ زندگی میں ڈوب جاتی ہیں
تو جب روپوش ہوتا ہے مرا دل بیٹھ جاتا ہے	پرانی صحبتیں اُس وقت اکثر یاد آتی ہیں
اندھیری رات کے منظر سے میرا دل لرزتا ہے	مجھے کالی چٹانیں ہر طرف آنکھیں دکھاتی ہیں

مرے محبوب تو ہے ماہِ تاباں میں سمندر ہوں

ترجمہ

جاذب

(دہلوی)

بیزاری

اے کاش! نہ یہ گلشنِ اسرار بناتے ۔۔۔ اے کاش! نہ یہ وادیٔ پُرخار بناتے

گر یونہی بن آتی تھی کہ ناچار بناتے ۔۔۔ اے کاش! نہ میرا دلِ بیزار بناتے

"ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے"

کلیاں نہ چٹکتیں کبھی اور گُل نہ مہکتے ۔۔۔ شاخیں نہ لہکتیں کبھی بلبل نہ چہکتے

سورج نہ چمکتا کبھی تارے نہ دہکتے ۔۔۔ مجھ ایسے زمانے میں جو دو چار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

کس واسطے اُٹھا مرے ہونے کا یہ جھگڑا ۔۔۔ پانے کا کہیں اور کہیں کھونے کا یہ جھگڑا

یہ پار لگانے کا ڈبونے کا یہ جھگڑا ۔۔۔ اے کاش نہ یہ دامِ دل آزار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

اقرار کرا کر کے وہ انکار ہوئے خود — اک راز سا ناقابلِ اظہار ہوئے خود

اِس پار مجھے پھینک کے اُس پار ہوئے خود — اے کاش مکاں میرا بھی اُس پار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

کیوں مجھ کو لگایا ہے یہ آزار جہاں کا — اے کاش نہ ہوتا میں گرفتار جہاں کا

بیمارِ ازل ہو گیا بیمار جہاں کا — اے کاش وہ اپنا مجھے بیمار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار مٹاتے

اس گلشنِ فانی میں کہاں بُوئے حقیقت — یہ رستہ کہاں جائے بھلا سوئے حقیقت

ظاہر میں ہوا جب سے چھپا روئے حقیقت — اس کذب کو ناقابلِ اظہار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

ح - ب

جبر کی شادی

مولیئر نے شاہِ فرانس لوئی چہاردہم کے دربار کی تفریح کے لئے بہت سے فرحیہ ڈرامے لکھے ہیں۔ یہ ڈراما اُس کے ایک ایکٹ کے تمام ڈراموں میں بہترین تسلیم کیا گیا ہے۔ مولیئر کے کردار زندہ کردار ہُوا کرتے تھے۔ چنانچہ اس ڈرامے میں ان اُس نے اپنے بعض ہمعصر درباریوں کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ جب یہ ڈراما ایکٹ کیا گیا تو خود بادشاہ نے اس میں ایک جپسی کا پارٹ ادا کیا۔

سینیرل (منظر کے پیچھے سے یہ کہتا ہُوا داخل ہوتا ہے) میں ابھی واپس آیا۔ گھر کا اچھی طرح سے خیال رکھنا۔ اور دیکھو، کسی بات میں بے قاعدگی واقع نہ ہو۔ اگر کوئی روپیہ لے کر آئے۔ تو مسٹر جرمینو کے ہاں سے مجھے بلا لینا۔ اور اگر کوئی تقاضا کرنے آئے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اور آج واپس نہیں آئیں گے۔

جرمینو۔ (سینیرل کے آخری الفاظ سن کر) نہایت دانشمندانہ فرمان ہے۔

سینیرل۔ آہ! جرمینو، خوب ملے۔ میں تمہارے ہی ہاں جا رہا تھا۔

جرمینو۔ کیا ارشاد ہے؟

سینیرل۔ میں تمہیں اپنے دل کی ایک بات بتانا چاہتا تھا اور اُس کے متعلق تمہاری رائے حاصل کرنا چاہتا تھا

جرمینو۔ بڑی خوشی ہے۔ اچھا ہُوا کہ ملاقات ہو گئی۔ اب یہیں اطمینان سے گفتگو کر لیتے ہیں۔

سینیرل۔ نہیں نہیں، تنہائی میں چلو۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ اور دوستوں سے مشورہ کر لینا اچھا ہوتا ہے۔

جرمینو۔ اس عنایت کا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مشورے کے لئے مجھے انتخاب کیا۔ اچھا، اب بتاؤ، بات کیا ہے؟

سینیرل۔ مگر سب سے پہلے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس معاملے میں محض میری دلداری کو ملحوظ نہ رکھنا بلکہ اپنی صحیح صحیح رائے سے مجھے آگاہ کر دینا۔

جرمینو۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کیا تامل ہو سکتا ہے۔ میں صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دوں گا۔

سینیرل۔ وعدہ کرو۔

جرمینو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ مگر بتاؤ معاملہ کیا ہے۔

سینیرل۔ میں تم سے اس معاملے میں رائے لینا چاہتا

ہوں کہ اگر میں شادی کر لوں تو ہرج ہی کیا ہے؟

جرمینو۔ کون؟ تم؟

سینیرل۔ ہاں میں خود۔ تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟

جرمینو۔ سب سے پہلے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں

سینیرل۔ وہ کیا؟

جرمینو۔ تمہارے خیال میں اب تمہاری عمر کیا ہوگی۔

سینیرل۔ میری؟

جرمینو۔ ہاں تمہاری۔

سینیرل۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی عمر کچھ معلوم نہیں۔

جرمینو۔ سینیرل، تمہاری عمر باون ترپن سال کے قریب ہوگی۔

سینیرل۔ کس کی؟ میری؟ نہیں، یہ ہو نہیں سکتا۔

جرمینو۔ اور اس لئے جیسا کہ تم نے مجھ سے درخواست کی تھی میرا صاف صاف دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ شادی کرنا تمہارے لئے مفید نہ ہوگا۔ تفصیل سے بچنے کے لئے میں صرف چند الفاظ میں اپنا خیال تم پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ شادی کا خیال بھول کر بھی دل میں نہ لانا۔ اگر اس وقت تک آزاد رہنے کے بعد اب تم دنیا کی ان تمام زنجیروں سے زیادہ بوجھل زنجیروں کو اپنے پاؤں میں ڈال لوگے تو میں سمجھوں گا کہ تم سے بڑھ کر نادان بھی کوئی نہیں

سینیرل۔ اور میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور وہ لڑکی ایسی ہے کہ اُس سے شادی کر لینا غیر دانشمندی ہرگز نہیں

جرمینو۔ اوہ، تو یہ اور بات ہے۔ یہ تم نے مجھ سے کب کہا تھا؟

سینیرل۔ مجھے لڑکی بے حد پسند ہے، اور میں اُسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔

جرمینو۔ تم اُسے دل و جان سے چاہتے ہو؟

سینیرل۔ بے شک۔ اور میں نے اُس کے باپ کو بھی رضامند کر لیا ہے۔

جرمینو۔ اُس کے باپ کو بھی رضامند کر لیا ہے؟

سینیرل۔ ہاں۔ شادی آج شام کو ہونے والی ہے، اور میں قول دے چکا ہوں۔

جرمینو۔ تو پھر شادی کر لو۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

سینیرل۔ ذرا سوچو تو سہی۔ میں اپنے ارادے کو کیونکر بدل سکتا ہوں۔ جرمینو کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اب شادی کے قابل نہیں رہا؟ اس کو جانے دو کہ میری عمر کیا ہے۔ یہ دیکھو کہ حالات کیا ہیں۔ کیا تمہیں کوئی تیس سال کا جوان بھی مجھ سے زیادہ تر و تازہ اور مجھ سے زیادہ سرگرم کار نظر آتا ہے؟ کیا میں اپنے اعضا سے پہلے کی بہ نسبت اب کچھ کم محنت لیتا ہوں؟ کیا میری شکل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اب جانے آنے کے لئے گاڑی یا آرام کرنے کے لئے کرسی کی ضرورت ہے

جرمینو۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ ضرور شادی کرو یہ تمہارے لئے نہایت مناسب ہے۔

سینیرل۔ پہلے مجھے اس بات میں شرم دامنگیر ہوتی تھی۔ لیکن اب میرے پاس اس کے حق میں زبردست

وجوہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے کتنی خوشی ہوگی
جب میں تھکا ہوا ہوں گا، اور ایک بیوی میری
خدمت گزاری اور نازبرداری کے لئے میرے
پاس ہوگی۔ اور اس خوشی کو چھوڑ کر بھی میں سمجھتا
ہوں کہ میرے اسی حالت میں رہنے سے ایک
اچھے خاندان کی نسل منقطع ہوجائے گی۔

جرمینو۔ واقعی اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہوسکتی اور
میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں۔ کہ جس قدر جلد بھی
ممکن ہوسکے۔ شادی کرلو۔

سینیرل۔ سچ کہتے ہو؟ تمہارا یہی مشورہ ہے؟

جرمینو۔ یقیناً اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں۔

سینیرل۔ میں خوش ہوں کہ تم نے ایک سچے دوست کی طرح
مجھے یہ مشورہ دیا۔

جرمینو۔ بھلا یہ تو بتاؤ، وہ خاتون ہے کون جس سے تم شادی
کررہے ہو؟

سینیرل۔ ڈوری مین۔

جرمینو۔ وہ نوجوان، خوش پوش، خوش گفتار لڑکی؟

سینیرل۔ ہاں۔

جرمینو۔ الکینڈر کی بیٹی؟

سینیرل۔ وہی وہی۔

جرمینو۔ السیڈ اس کی بہن، جو بڑا شمشیرباز بنتا ہے؟

سینیرل۔ بس وہی۔

جرمینو۔ واہ!

سینیرل۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

جرمینو۔ بڑی اچھی بات ہے۔ جلدی کرو اور شادی کرلو۔

سینیرل۔ کیا میں نے بہترین انتخاب نہیں کیا؟

جرمینو۔ اس میں کیا شک ہے۔ بہت اچھا جوڑ ہے اب
وقت نہ گنواؤ۔

سینیرل۔ جو کچھ تم نے کہا اس سے مجھے بے پایاں مسرت
حاصل ہوئی۔ میں تمہارے مشورے کا شکریہ
ادا کرتا ہوں اور میں تمہیں آج رات اپنی شادی
پر مدعو کرتا ہوں۔

جرمینو۔ میں ضرور آؤں گا۔

سینیرل۔ خدا حافظ!

جرمینو۔ (الگ) نوجوان ڈوری مین، الکینڈر کی بیٹی سینیرل
سے بیاہی جائے گی جس کی عمر ترپن سال کی ہے
آہ کیسی عجیب شادی ہے کیسی عجیب شادی ہے! اور
جاتے ہوئے اس فقرے کو بار بار دہراتا ہے)

سینیرل (تنہا) یہ شادی ضرور خوشگوار ثابت ہوگی کیونکہ
ہر کوئی اس کے متعلق سن کر خوشی کا اظہار کرتا ہے
جس کسی سے میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ ہنس
پڑتا ہے۔ میں کیسا خوش قسمت انسان ہوں!

* * * * * *

ڈوری مین۔ (اپنے ملازم چھوکرے سے) دیکھو، لڑکے!
انسانیت سے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ، اور
شرارت مت کرو۔

سینیرل۔ (الگ۔ ڈوری مین کو دیکھ کر) وہ آرہی ہے میری
بانو آرہی ہے۔ آہ اس کی صورت کتنی خوش آئند
ہے! اس کی ادا میں کتنا حسن ہے! اس کے
قامت میں کیسی رعنائی ہے! اسے دیکھ کر کون

اس سے شادی کرنا چاہے گا۔ (اس کے قریب جاکر) کہاں جا رہی ہو میری حسینہ، میری پیاری، میری بیوی؟

ڈوری مین۔ میں کچھ چیزیں خریدنا چاہتی تھی۔

سینیرل۔ بہت اچھا، میری پیاری، اب ہم دونوں کو خوشی نصیب ہونے والی ہے۔ اب جلد ہی مجھے وہ اختیار حاصل ہونے والا ہے کہ میں تمہیں پیار کرسکوں گا، تمہیں سینے سے لگا سکوں گا اور تمہیں کسی چیز سے مجھے محروم رکھنے کا حق نہیں ہوگا۔ کیا تم اس شادی سے خوش نہیں ہو۔ میری پیاری؟

ڈوری مین۔ یقین مانو، بے اندازہ خوش۔ کیونکہ میرے باپ نے اب تک مجھ پر بدترین پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ میں نہیں جانتی کہ کب سے میں اپنی آزادی کا غم کھا رہی ہوں، کب سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ میری شادی ہو جائے تاکہ میں اس عذاب سے نجات پاؤں اور اپنے اختیار سے جو چاہوں کروں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں بھیجا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی آئندہ زندگی کامل آزادی اور مسرت میں گزاروں تاکہ گذشتہ کی کچھ تلافی ہو سکے۔ چونکہ تم ایک متمدن اور شائستہ انسان ہو، اور تم نے دنیا کو اچھی طرح دیکھا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کی خوب نبھے گی۔ اور تم ان شوہروں کی طرح نہ ہو گے جو جان کا آزار بن جاتے ہیں۔ اور اپنی بیویوں کو خوشی کا ایک سانس تک نصیب نہیں ہونے دیتے۔ مجھے اقرار ہے کہ میں ایسی زندگی لبسر نہیں کر سکتی تنہائی مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے۔ مجھے شرطیں بدنے میلوں تماشوں میں جانے، سیر کرنے غرض کہ ہر قسم کی تفریح سے دلچسپی ہے مجھ سی بیوی پاکر تم بے انتہا خوش ہو گے۔ ہمارے درمیان کبھی اختلاف پیدا نہ ہوگا۔ میں تمہارے معاملات میں کبھی دخل نہیں دوں گی۔ اور مجھے امید ہو کہ اسی طرح تم بھی مجھے کسی بات میں مجبور نہیں کرو گے۔ مجھ سے پوچھو تو میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ہم مروت کو اپنا شعار بنائیں اور شادی کرکے ایک دوسرے کے لئے سوہانِ رُوح نہ بن جائیں۔ مختصر یہ کہ جب ہم شادی کرلیں تو ہم دو ایسے شخصوں کی طرح رہیں سہیں جنہوں نے دنیا کو دیکھا ہو۔ رشک و حسد ہمارے دماغوں کو پریشان نہ کریں بلکہ تمہیں میری وفا پر اعتماد ہو اور یوں مجھے تمہاری وفا پر اعتماد کرنے کا موقع ملے۔ مگر یہ کیا بات ہے؟ تمہارا چہرہ تبدیل کیوں ہو رہا ہے؟

سینیرل۔ میرے سر میں یکایک درد شروع ہو گیا ہے۔

ڈوری مین۔ ہاں ان دنوں یہ روگ بہت سے لوگوں کو ہو رہا ہے۔ لیکن ہماری شادی سے یہ سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ خدا حافظ۔ مجھے ایک موزون سے لباس کی ضرورت ہے۔ تاکہ میں ان چیتھڑوں کو اتار کر پھینک سکوں جن جن چیزوں کی مجھے ضرورت ہے وہ میں آج خرید لوں گی اور بل تمہاری طرف بھجوا دوں گی۔

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

جرمینو اور سینیرل

جرمینو۔ آہ! سینیرل، میں خوش ہوں کہ تم سے یہاں ملاقات
ہوگئی۔ میں ایک جوہری سے ملا ہوں جس نے یہ سن
کر کہ تم اپنی بیوی کو تحفے کے طور پر دینے کے لئے ایک
انگوٹھی کی تلاش میں ہو مجھ سے اپنی دوکان کی سفارش
کرنے کو کہا ہے۔ اُس کا دعوٰی ہے کہ دنیا بھر میں ایسی
نفیس انگوٹھی نہیں مل سکے گی۔

سینیرل۔ خدا کا نام لو! مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔

جرمینو۔ کیوں؟ اس کے کیا معنی؟ وہ گرمجوشی کیا ہوئی جو تم
ابھی ابھی دکھا رہے تھے؟

سینیرل۔ گذشتہ چند لمحوں میں میں شادی کے متعلق کسی قدر
متامل ہوگیا ہوں۔ اب کوئی مزید کارروائی کرنے سے
پیشتر میں اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں
میں اُس خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہتا ہوں جو میں
نے گذشتہ رات دیکھا تھا اور جو مجھے ابھی ابھی یاد
آیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے خواب بمنزلہ آئینوں کے
ہیں، جو بعض اوقات مستقبل کی تصویر من و عن کھینچ کر
رکھ دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ سمندر میں طوفان
آرہا ہے۔ اور میں ایک جہاز میں سوار ہوں اور . .

جرمینو۔ سینیرل، مجھے ایک سخت ضروری کام ہے اس لئے
میں تمہارا خواب سننے کے لئے ٹھہر نہیں سکتا۔ میں
خوابوں کو سمجھتا بھی نہیں۔ شادی کے مسئلے کے حل
کی میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا ہوں۔ تمہارے گھر کے
ساتھ ہی دو بڑے فاضل فلسفی رہتے ہیں۔ وہ اس
معاملے میں تمہیں مشورہ دینے کی پوری اہلیت رکھتے
ہیں، چونکہ دونوں کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف
ہے۔ اس لئے تم اُن کی مختلف آرا کا آپس میں
مقابلہ کر سکتے ہو۔ رہی میری رائے تو میں کہہ چکا ہوں
کہ اس وقت مجھے فرصت نہیں۔ یوں میں تمہارا
خادم ہوں۔

سینیرل۔ (تنہا) وہ سچ کہتا ہے۔ اس بیم و رجا کی حالت میں
مجھے ان لوگوں سے ضرور مشورہ لینا چاہئے۔

* * * * * * * *

پنکریس۔ ایک فلسفی (اندر کسی شخص سے بول رہا ہے اور
سینیرل کو اُس نے نہیں دیکھا) جاؤ میرے دوست
جاؤ۔ تم ایک گستاخ آدمی ہو۔ تم کلمات کی ترکیب و
ترتیب سے قطعاً نابلد ہو۔ تم جمہوریہ ادبیات سے
خارج کر دینے کے قابل ہو۔

سینیرل۔ شکر ہے، ایک تو وقت پر ملا۔

پنکریس۔ (پہلے کی طرح، اور سینیرل کو نہ دیکھتے ہوئے)
ہاں میں اپنے قول پر نہایت مضبوطی سے قائم
ہوں میں فلسفیوں کے فلسفی ارسطو کی حکمت کے
رو ثابت کر دوں گا کہ تم جاہل ہو، مجہول ہو، اجہل
ہو، بلکہ جہل کے مادہ سے جتنی صفات بھی وضع ہو
سکتی ہیں۔ وہ سب تم پر صادق آتی ہیں۔

سینیرل۔ کسی سے اس کا جھگڑا ہوگیا ہے (پنکریس سے)
جنابِ عالی!

پنکریس۔ (بدستور، اور سینیرل کو نہ دیکھتے ہوئے) تم بزعم خود
بحث کر رہے ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم بحث
کے اوّلیں اصول سے بھی ناواقف ہو۔

سینیرل۔ غصہ اسے میری طرف دیکھنے میں مانع ہے (پنکریس

سے) جناب عالی!

ریس۔ (بدستور، اور سینیرل کی طرف نہ دیکھتے ہوئے) یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ فلسفے کے جملہ مسالک نے اسے معیوب قرار دیا ہے۔

نیرل۔ (الگ) معلوم ہوتا ہے کہ اسے سخت دق کیا گیا ہے (پنکریس سے) میں کہتا ہوں . . . .

کریس (بدستور، اور سینیرل کی طرف نہ دیکھتے ہوئے) اختلافِ عظیم، اختلافِ زمین و آسمان۔

نیرل۔ علامۂ زماں، میں آپکے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں!

کریس۔ میں آپ کا خادم ہوں۔

ینیرل۔ کیا میں . . . . .

کریس۔ (دوبارہ مڑکر) تمہیں معلوم ہے۔ تم کس چیز کے مرتکب ہوئے ہو؟ تم نے ایک قضیۂ منطقیہ پیدا کر دیا ہے۔

ینیرل۔ میں . . . . . .

نکریس۔ (پہلے کی طرح) کبریٰ مہمل ہے، صغریٰ لغو ہے اور نتیجہ مضحکہ خیز ہے۔

ینیرل۔ میں . . . . .

نکریس۔ (بدستور) میں مرجاؤں گا لیکن تسلیم نہیں کروں گا؛ اور جب تک میرا قلم ٹوٹ نہ جائے میں اس کے خلاف تبلیغ کرتا رہوں گا۔

سینیرل۔ کیا میں . . . . . .

نکریس۔ (بدستور) میں اپنے دعوے کی حمایت میں جان تک لڑا دوں گا۔

سینیرل۔ ارسطوئے زماں، کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کی اس برہمی کا باعث کون سی بات ہوئی ہے؟

پنکریس۔ اس کے لئے معقول ترین وجوہ موجود ہیں۔

سینیرل۔ لیکن کیا؟

پنکریس۔ ایک جاہل نے اپنے غلط دعوے پر قائم رہنے کی جرأت کی تھی، خوفناک، خطرناک، مکروہ دعوے پر۔

سینیرل۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ دعویٰ کیا تھا؟

پنکریس۔ آہ سینیرل، ہر چیز آج کل تہ و بالا ہو رہی ہے ساری دنیا بد اعمالی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہر جگہ ہیبت ناک بغاوت کی حکومت ہے۔ مجسٹریٹوں کو جو ملک میں قیامِ امن کے لئے متعین ہیں شرم سے مر جانا چاہیئے کہ وہ ایسی ناقابلِ برداشت بددیانتیوں کے متحمل ہو رہے جس کا بیان میں ابھی کروں گا۔

سینیرل۔ تو وہ کیا ہے؟

پنکریس۔ کیا یہ خوفناک بات نہیں، کیا خدائے قہار کا انتقام اس بات کے لئے بے قرار نہیں کہ کسی شخص کو "ٹوپی کی شکل" کہنے کے آزاد چھوڑ دیا جائے؟

سینیرل۔ کیسے؟

پنکریس۔ میرا دعوے ہے کہ ہمیں "ٹوپی کی صورت" کہنا چاہیئے "ٹوپی کی شکل" نہیں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ شکل اور صورت میں یہ فرق ہے کہ شکل ذی رُوح اشیا کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور صورت غیر ذی رُوح اشیا کے لئے، اور چونکہ ٹوپی ایک غیر ذی رُوح شے ہے اس لئے ہمیں "ٹوپی کی صورت" کہنا چاہیئے نہ کہ "ٹوپی کی شکل"۔ (پھر اُسی طرف مڑ کر جس طرف سے وہ داخل ہوا تھا) ہاں، اے جاہل! گفتگو کا طریقہ یہ ہے۔ اور یہ ارسطو کی اپنی

اصطلاحات ہیں، جن کو اُس نے کتاب "صفات" میں بیان کیا ہے۔

سینیرل۔ (الگ ہیں تو یہ سمجھا تھا کہ ہم تباہ ہو گئے (پنکریس سے) علامہ صاحب، اب اس کا خیال چھوڑ دیجیے میں۔۔۔

پنکریس۔ مجھے اس قدر غصہ آ رہا ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہوتا میں کیا کر رہا ہوں۔

سینیرل۔ ٹوپی اور اُس کی شکل چھوڑیئے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں ۔۔۔۔۔

پنکریس۔ گستاخ!

سینیرل خدا کے لئے اب ختم کیجئے۔ میں۔۔۔

پنکریس۔ جاہل!

سینیرل۔ لاحول ولاقوۃ! میں ۔۔۔۔

پنکریس۔ ایسے مسئلے پر اصرار کی جرأت!

سینیرل۔ وہ یقیناً غلطی پر ہے۔ میں۔۔۔۔۔

پنکریس۔ اس مسئلے کو ارسطو نے رد کیا ہے۔

سینیرل۔ بجا فرمایا۔ میں۔۔۔۔

پنکریس۔ نہایت شدت سے۔

سینیرل۔ بالکل درست (اُس طرف جا کر جس طرف سے پنکریس داخل ہُوا تھا) ہاں، ہاں، تم احمق ہو بیوقوف ہو کہ ایک ایسے علامہ سے بحث کرتے ہو جو خوب پڑھا لکھا ہے۔ (پنکریس سے) لیجیئے اس کا جھگڑا تو ختم ہوا مہربانی فرما کر اب میری بات سنیئے میں آپ سے ایک ایسے معاملے میں مشورہ لینا چاہتا ہوں جس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ میں گھر کی تنہائی کو دُور کرنے کے لئے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکی خوبصورت اور خوش وضع ہے۔ مجھے وہ نہایت پسند ہے اور مجھ سے شادی کرنے پر خوش ہے۔ اُس کا باپ بھی رضامند ہے لیکن آپ کو معلوم ہے میں کس بات سے ڈر رہا ہوں؟ میں بدنامی سے ڈرتا ہوں کیونکہ بدنامی کی حالت میں انسان پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ مجھے آپ ایک فلسفی کے نقطۂ نظر سے بتائیے کہ آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟ آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟

پنکریس۔ میں یہ تسلیم کر لوں گا کہ فضا اجسام سے خالی ہو گئی ہے اور میں محض ایک احمق ہوں لیکن یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ "ٹوپی کی شکل" کہنا درست ہے۔

سینیرل۔ (الگ ہو کر) خدا اس شخص کو غارت کرے (پنکریس سے) حضرت علامہ ایک لمحے کے لئے میری بات بھی سن لیجئے۔ میں گھنٹے بھر سے بک بک کر رہا ہوں لیکن آپ نے کچھ جواب نہیں دیا۔

پنکریس۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھ پر سخت غصہ طاری ہو رہا تھا۔

سینیرل اچھا اب اسے رخصت کیجئے اور میری بات سننے کی زحمت گوارا فرمایئے۔

پنکریس۔ کہیئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

سینیرل۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

پنکریس۔ تو تم کون سی زبان استعمال کرو گے؟

سینیرل۔ کون سی زبان؟

پنکریس۔ ہاں۔
سینیرل۔ آہی خیر! وہی زبان جو میرے مُنہ میں ہے ورنہ ہمسائے کی زبان مستعار لینے کا تو مجھے خیال تک نہیں۔
پنکریس۔ میرا مطلب ہے کون سی بھاشا، کون سی بولی؟
سینیرل۔ اوہ! آپ تو اور ہی بات پوچھ رہے ہیں۔
پنکریس۔ کیا تم مجھ سے اطالوی زبان بولنا چاہتے ہو؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ سپینی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ جرمن؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ انگریزی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ لاطینی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ یونانی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس عبرانی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ شامی؟
سینیرل نہیں۔
پنکریس۔ ترکی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ عربی؟
سینیرل۔ نہیں، نہیں، فرانسیسی، فرانسیسی، فرانسیسی!
پنکریس۔ آہ، فرانسیسی!
سینیرل۔ بالکل۔
پنکریس۔ تو پھر اس طرف آجاؤ، کیونکہ یہ کان عالمانہ اور غیر زبانوں کے لئے ہے اور یہ کان عامیانہ اور مادری زبان کے لئے۔
سینیرل۔ جس معاملے کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرا ارادہ ایک لڑکی سے شادی کرنے کا ہے۔ جو خوبصورت اور نوجوان ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، اور میں نے اس کے باپ سے شادی کی اجازت بھی لے لی ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں۔ . .
پنکریس۔ (سینیرل کی بات نہ سنتے ہوئے) گویائی انسان کو خیالات کے اظہار کے لئے عطا ہوئی ہے، اور جیسے کہ خیالات حالات کے مظہر ہیں اسی طرح الفاظ خیالات کے مظہر ہیں۔ (سینیرل بیتاب ہو کر اپنے ہاتھ سے فلسفی کا منہ بند کر دیتا ہے لیکن جونہی کہ وہ ہاتھ اُٹھاتا ہے فلسفی پھر اپنی گفتگو شروع کر دیتا ہے) کئی مرتبہ ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن یہ مظاہر بعض دوسرے مظاہر سے اختلاف رکھتے ہیں، کیونکہ یہ دوسری قسم کے مظاہر ہمیشہ اپنی اصل سے مختلف ہوتے ہیں، درآنحالیکہ کلام حامل ہوتا ہے اپنی اصل کا، کیونکہ وہ خیالات کی تشریح ہے خارجی اشارات کے ذریعہ سے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اچھی طرح سوچ سکتے ہیں وہی بہترین طریق

پر لوں بھی سکتے ہیں۔ اب تم اپنے خیالات میرے
سامنے ایسے الفاظ میں پیش کرو جن میں اشارات
بدرجۂ اتم موجود ہوں۔

سینیرل۔ (فلسفی کو گھر میں اندر کی طرف دھکیلتے ہوئے اور
باہر سے دروازہ بند کرتے ہوئے تاکہ وہ پھر باہر نہ نکل
آئے) اس شخص کو طاعون ہو جائے!

پنکریس۔ (اندر سے) ہاں، ہاں، کلام خیالات کا مظہر ہے،
دل کا ترجمان ہے، روح کا پیکر ہے۔ (ایک کھڑکی سے
سر نکال کر کہتا ہے) یہ ایک آئینہ ہے جو ہماری انفرادیت
کے پوشیدہ ترین اسرار کا عکس ہمیں صاف صاف
دکھا دیتا ہے۔ اب چونکہ تم میں بحث و گفتگو کی قابلیت
موجود ہے، میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم اپنے خیالات
مجھ تک پہنچانے کے لئے کیوں اس قابلیت کا استعمال
نہیں کرتے؟

سینیرل۔ میں بھی یہی چاہتا تھا اگر تم نہیں سنو گے۔

پنکریس۔ میں سنتا ہوں، بولو۔

سینیرل۔ میں یہ کہتا ہوں کہ . . . .

پنکریس۔ مگر سب سے زیادہ اختصار کا خیال رکھو۔

سینیرل۔ میں خیال رکھوں گا۔

پنکریس۔ طوالت سے احتراز کرو۔

سینیرل۔ بہت خوب۔ تو جناب . . . .

پنکریس۔ قلّ و دلّ۔

سینیرل۔ میں . . . .

پنکریس۔ انتشار و اعوجاج قطعاً نہ ہو۔ (سینیرل اس زبان
بندی سے تنگ آ کر زمین سے پتھر اٹھاتا ہے تاکہ
فلسفی کے سر کی تواضع کرے) ہیں ہیں؟ توضیح
مطلب کی بجائے تم تنک مزاجی پر اتر آئے ہو چلے
جاؤ، تم اُس شخص سے بھی زیادہ گستاخ ہو جو کہتا تھا
کہ ٹوپی کی "شکل" کہنا چاہیئے۔ میں تمہیں منطقی دلائل
اور قاطع براہین سے ثابت کر کے دکھا دوں گا کہ
تم اب بھی ایک حیوان ہو اور آئندہ بھی کبھی انسان
نہیں بن سکو گے، اور میں اب بھی اور آئندہ بھی
ایک فاضل فلسفی رہوں گا۔

سینیرل۔ بے نظیر بکواس ہے!

پنکریس۔ (نیچے اتر کر) صاحب تصنیف، صاحب علم و
فضل!

سینیرل۔ اور؟

پنکریس۔ دانش و حکمت کا پیکر، (جاتے ہوئے) تمام
علوم طبیعی، اخلاقی و سیاسی کا ماہر۔ (واپس آ
کر) ایک فاضل و افضل انسان (جاتے ہوئے)
ایک انسان جسے تفصیل کُل کے صیغے میں حکایات
صنمیات اور تواریخ کا علم حاصل ہے۔ (واپس آ
کر) قواعد، شاعری، عروض، لسانیات اور
سوفسطائیت کا (جاتے ہوئے) ریاضی، حساب،
مناظرہ، طبیعات اور مابعد الطبیعات کا (واپس
آ کر) آفاقیات، اقلیدس، تعمیر اور تمام غیر معین
علوم کا (جاتے ہوئے) ادبیات، ہیئت، نجوم،
حیاتیات، قیافہ اور پیشین گوئی وغیرہ کا۔

سینیرل تنہائی میں

ایسے علما کو شیطان لے جائے جو کسی کی بات نہیں

سنتے! مجھ سے کسی نے سچ کہا تھا کہ اس کا استاد
ارسطو بھی باتیں بنانے کے علاوہ اور کچھ نہ جانتا تھا
اب مجھے اُس دوسرے کے پاس جانا چاہیئے، شاید
وہ کچھ زیادہ ہوشمند اور معقول ہو۔ تو چلے چلو!

* * * * * * * * *

دوسرا فلسفی مارفریوس

مارفریوس۔ مسٹر سینیرل کیسے آئے؟
سینیرل۔ جناب عالی مجھے ایک چھوٹے سے معاملے میں آپ
کا مشورہ درکار ہے۔ اور اسی لئے میں آپ کے پاس
آیا ہوں۔ (الگ) آہ! یہ خوب آدمی ہے، یہ لوگوں کو
بولنے بھی دیتا ہے۔
مارفریوس۔ مسٹر سینیرل، مہربانی کرکے یہ طرزِ گفتگو بدل دیجئے
ہمارا فلسفہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم کسی مسئلے کو بالاستحکام
بیان نہ کریں۔ بلکہ ہر چیز کو اشتباہ کی نظر سے دیکھیں
اور اس کے متعلق اپنے فیصلے کو ہمیشہ محفوظ رکھیں
سینیرل "معلوم ہوتا ہے"؟
مارفریوس۔ ہاں۔
سینیرل۔ آپ اعتبار کیجئے، اس میں کچھ شک نہیں کیونکہ
یہ حقیقت ہے۔
مارفریوس۔ یہ ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا معلوم ہوتا
ہو مگر حقیقت نہ ہو۔
سینیرل۔ کیسے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ میں آپ کے پاس
موجود ہوں؟
مارفریوس۔ یہ مشکوک ہے اور ہمیں ہر چیز کو مشکوک سمجھنا
چاہیئے۔

سینیرل۔ کیا میں یہاں نہیں ہوں؟ اور آپ مجھ سے بول
نہیں رہے؟
مارفریوس۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم یہیں ہو اور میں تم سے
بول رہا ہوں لیکن یقینی نہیں کہ یہ بات صحیح ہو۔
سینیرل۔ لاحول ولاقوۃ! آپ مذاق کر رہے ہیں، صاف نظر
آرہا ہے کہ یہ میں ہوں اور وہ آپ ہیں اور ہمارے
مابین "معلوم ہوتا" کہیں بھی نہیں، پھر کیوں ہم
فلسفہ کے ہیر پھیر کو ترک کرکے اصل موضوع پر
گفتگو نہ کریں۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں
شادی کرنا چاہتا ہوں۔
مارفریوس۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔
سینیرل۔ میں جو آپ کو بتا رہا ہوں۔
مارفریوس۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔
سینیرل۔ جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں، بالکل
نوجوان اور نہایت خوبصورت ہے۔
مارفریوس۔ یہ ناممکن نہیں۔
سینیرل۔ میں اس سے شادی کر دوں تو یہ اچھا ہوگا یا بُرا؟
مارفریوس۔ اچھا ہوگا یا بُرا۔
سینیرل۔ (الگ) اوہو! اس کو ایک دوسرا خبط ہے۔ (مخاطب
ہو کر) میں پوچھتا ہوں کہ جس لڑکی کا میں نے ذکر
کیا ہے آیا اُس سے میرا شادی کر لینا اچھا ہے؟
مارفریوس۔ دیکھیں۔
سینیرل۔ کیا بُرا ہے؟
مارفریوس۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔
سینیرل۔ خدا کے لئے ٹھیک ٹھیک جواب دیجئے۔

مارفریوس۔ میرا ارادہ تو یہی ہے۔
سینیرل۔ مجھے لڑکی بہت پسند ہے
مارفریوس۔ ہوگی۔
سینیرل۔ باپ نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔
مارفریوس۔ دے دی ہوگی۔
سینیرل۔ لیکن اگر میں شادی کرلوں تو مجھے دھوکے سی ڈر لگتا ہے۔
مارفریوس۔ یہ بات بھی ممکن الوقوع ہے۔
سینیرل۔ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟
مارفریوس۔ یہ ناممکنات سے نہیں۔
سینیرل۔ لیکن اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟
مارفریوس۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔
سینیرل۔ آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟
مارفریوس۔ جو آپ چاہیں۔
سینیرل۔ آہ! میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔
مارفریوس۔ میں اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتا ہوں۔
سینیرل۔ جھوٹ کہنے والا شیطان ہوتا ہے۔
مارفریوس ہو سکتا ہے۔
سینیرل۔ (الگ) اس نابکار کو خدا غارت کرے! فلسفی کتے میں تیرا اسرار انشاء ہرن کردوں گا! (اسے مارتا ہے)
مارفریوس۔ اوہ، اوہ، اوہ!
سینیرل۔ یہ تمہاری بے معنی باتوں کا جواب ہے، اور اب میں مطمئن ہوں!

مارفریوس۔ ہیں ہیں! یہ کیا حماقت ہے۔ یہ کیا طرز گفتگو ہے! اور تم مجھ جیسے بلند پایہ فلسفی کو مارتے ہو!
سینیرل۔ مہربانی فرما کر اپنے اندازِ کلام کی اصلاح کیجئے۔ دنیا کی ہر شے مشکوک ہے، اس لئے آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے۔ کہ میں نے آپ کو مارا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو مارا ہے۔
مارفریوس۔ اوہ! میں ابھی مجسٹریٹ کے پاس جا کر اس زدو کوب کی اطلاع دوں گا۔
سینیرل۔ میں اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتا ہوں۔
مارفریوس۔ میرے جسم پر نشان موجود ہیں۔
سینیرل۔ ہو سکتے ہیں۔
مارفریوس۔ اور یہ تم نے لگائے ہیں۔
سینیرل۔ یہ ناممکن نہیں۔
مارفریوس۔ میں عدالت سے تمہارے نام کا سمن نکلواؤں گا۔
سینیرل۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔
مارفریوس۔ اور تم گرفتار کر لئے جاؤ گے۔
سینیرل۔ جو ہو سو ہو۔
مارفریوس۔ مجھے اب اس کارروائی کے لئے تنہا چھوڑ دو۔

سینیرل تنہائی میں

اب کیا کروں؟ اس وحشی انسان سے ایک لفظ تک اگلوانا مشکل ہوگیا، اور میں اب بھی ویسا ہی کورے کا کورا ہوں جیسا کہ ابتدا میں تھا۔ شادی

کے نتائج و عواقب کے متعلق اس بے اطمینانی کی
حالت میں کیا کروں؟ مجھ سے زیادہ پریشانی بھی
کبھی کسی کو لاحق نہ ہوئی ہوگی۔ آہا! جپسی آ رہے ہیں
وہ میری قسمت کے متعلق کچھ بتائیں گے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

(دو جپسی عورتیں گاتی، طبلے بجاتی اور ناچتی ہوئی آ
رہی ہیں)

سینیرل۔ وہ کتنی خوش ہیں! میں کہتا ہوں جپسیو، تم میری
قسمت کے متعلق کچھ بتا سکتی ہو؟

پہلی عورت۔ ہاں، سرکار، ہم دونوں غیب جانتی ہیں۔

دوسری عورت۔ اپنا ہاتھ ادھر لائیے اور ہمارے ہاتھ پر
چاندی کا ایک ٹکڑا رکھ دیجئے۔ ہم آپ کو ایسی باتیں
بتائیں گے جو آپ کے بہت کام آئیں گی۔

سینیرل۔ یہ لو میرے دونوں ہاتھ۔ ایک میں قسمت ہے اور
ایک میں چاندی۔

پہلی عورت۔ آپ کی قسمت بہت اچھی ہے میاں، آپ
کی قسمت بہت اچھی ہے۔

دوسری عورت۔ ہاں، بہت اچھی سرکار، آپ کو انہیں دنوں
میں کچھ ملے گا۔

پہلی عورت۔ آپ کی بہت جلد شادی ہوگی حضور، آپ کی
بہت جلد شادی ہوگی۔

دوسری عورت۔ آپ کو ایک خوبصورت بیوی ملے گی، ایک
خوبصورت بیوی۔

پہلی عورت۔ جس سے ہر کوئی محبت کرے گا حضور، جسے ہر
کوئی پسند کرے گا۔

دوسری عورت۔ جس کے لئے بہت سے لوگ آپ کے دوست
بن جائیں گے، دوست!

پہلی عورت۔ جو آپ کے گھر میں ریل پیل کر دے گی۔

دوسری عورت۔ جو بڑی شہرت کی مالک ہوگی۔

پہلی عورت۔ جس کی خاطر لوگ آپ کی عزت کریں گے، بڑی
عزت۔

سینیرل۔ یہ تو ہؤا۔ تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ مجھے دھوکا تو نہیں دے
گی؟

دوسری عورت۔ دھوکا؟

سینیرل۔ ہاں!

پہلی عورت۔ دھوکا؟

سینیرل۔ ہاں، وہ مجھے دھوکا تو نہ دے گی؟ (عورتیں گانے
اور ناچنے لگتی ہیں) کیا لغویت ہے۔ یہ کوئی جواب
ہے؟ یہاں آؤ۔ میں پوچھتا ہوں کیا مجھے ایک
بے وفا بیوی دھوکا تو نہ دے گی؟

دوسری عورت۔ آپ کو؟

سینیرل۔ ہاں۔

پہلی عورت۔ آپ کو!

سینیرل۔ ہاں، مجھے دھوکا تو نہ دے گی؟

(جپسی عورتیں ناچتی گاتی چلی جاتی ہیں)

سینیرل تنہائی میں

خدا ان فقیرنیوں کو غارت کرے، یہ بھی مجھے اُسی
مذبذب حالت میں چھوڑ گئیں۔ مجھے اپنی شادی کا
انجام ضرور معلوم کرنا ہے۔ اُس ساحر کے پاس چلوں
جس کا آج کل بڑا چرچا ہے، اور جو اپنے حیرت انگیز

علم کے ذریعے سے جو کچھ کوئی چاہے دکھا دیتا ہے، وہ
ضرور مجھے جو کچھ میں چاہوں گا دکھا دے گا۔

* * * * * * *

ڈوری مین، لائی کاسٹ، سینیرل (نظروں سے اوجھل
پردے کے پیچھے)

لائی کاسٹ۔ پیاری ڈوری مین، کیا تم سچ کہتی ہو؟

ڈوری مین۔ بالکل سچ۔

لائی کاسٹ۔ تم حقیقت میں شادی کر لوگی؟

ڈوری مین۔ حقیقت میں۔

لائی کاسٹ۔ اور تمہاری شادی کی تقریب آج شام کو ہے؟

ڈوری مین۔ آج شام کو۔

لائی کاسٹ۔ اور تم میری محبت کو بھلا دو گی، ظالم حسینہ،
اور اپنی محبت کو؟

ڈوری مین۔ میں؟ کبھی نہیں۔ میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں
اور تمہیں اس شادی سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔
میں اُس سے محبت کے لئے شادی نہیں کر رہی
بلکہ اُس کی دولت نے مجھے اس پر آمادہ کیا ہے۔ دولت
نہ میرے پاس ہے نہ تمہارے پاس، اور دولت کے
بغیر تم جانتے ہو کہ کیسی گذر رہی ہے۔ سو خواہ اب
کسی قیمت پر بھی ملے ہمیں دولت حاصل کر لینی چاہئے
میں موقع دیکھ کر کو دپڑی ہوں اور مجھے امید ہے کہ
بہت جلد اس بڈھے کھوسٹ سے نجات مل جائے گی
وہ عنقریب مر جائے گا، چھ مہینے سے زیادہ وہ زندہ نہیں
رہے گا۔ اگر وہ اسے عرصے میں مر نہ جائے تو میرا ذمہ
تم اطمینان رکھو یہ وگی مسرت انگیز زندگی کے لئے مجھے
خدا سے زیادہ دیر تک التجا نہیں کرنی پڑے گی (سینیرل
کو دیکھ کر) آہا، ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔
اور بہت کچھ تمہاری تعریف و توصیف میں کہہ
رہے تھے۔

لائی کاسٹ۔ اچھا یہی ہیں . . . . . . ؟

ڈوری مین۔ ہاں، میری شادی انہیں سے ہو رہی ہے نا

لائی کاسٹ۔ جناب عالی، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ
کو آپ کی شادی پر ہدیۂ تہنیت پیش کروں اور
ساتھ ہی اپنی ادنیٰ ترین خدمات بھی پیش کر دوں
جس خاتون سے آپ شادی کر رہے ہیں۔ وہ
نہایت اعلیٰ صفات سے متصف ہیں۔ اور میں مس
ڈوری مین کو بھی مبارک باد دوں گا کہ انہوں نے
شوہر کا انتخاب نہایت مناسب کیا ہے۔

* * * * *

سینیرل تنہائی میں

لیجئے، اب تو اس شادی سے دل برداشتہ ہونے
میں مجھ پر کوئی الزام نہ آنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ
جا کر معاہدہ فسخ کر دوں تو بہتر ہے۔ میرے کچھ روپے
تو خرچ ہو گئے ہیں لیکن اتنے سے نقصان پر
ہی خلاصی ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ بھلے بچے۔
میں کوشش کرتا ہوں کہ اس جھنجھٹ سے نجات
مل جائے (الکنزر کے مکان پر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتا
ہے)

الکنزر۔ آہ، بیٹے، خوش آمدید!

سینیرل۔ جناب، میرا فرض ہے کہ . . . . .

الکنڈر۔ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟

سینیرل۔ ہاں۔

الکنڈر۔ کیا؟

سینیرل۔ مسٹر الکنڈر یہ سچ ہے کہ میں نے آپ کی بیٹی کے لئے پیغام بھیجا اور آپ نے میری اس درخواست کو منظور فرمالیا لیکن اب میں نے سوچا ہے کہ میری عمر کچھ زیادہ ہے اور آپ کی بیٹی بالکل نوجوان ہے۔

الکنڈر۔ معاف فرمایئے گا۔ میری لڑکی آپ کو اس کے باوجود پسند کرتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے گھر میں نہایت خوش رہے گی۔

سینیرل۔ نہیں، بعض اوقات میں عجیب وغریب اوہام میں گھر جاتا ہوں، اور اس لئے اُسے اکثر میری بدمزاجی کا متحمل ہونا پڑے گا۔

الکنڈر۔ میری لڑکی بڑی نیک خصلت اور فرمانبردار ہے آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے گی۔

سینیرل۔ مجھے کچھ جسمانی کمزوریاں بھی لاحق ہیں جن کے باعث ممکن ہے وہ بیزار ہو جائے۔

الکنڈر۔ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ ایک پاکباز عورت کبھی اپنے خاوند سے بیزار نہیں ہوتی۔

سینیرل۔ تو پھر میں صاف صاف کہہ دوں؟ میں آپ کو رائے نہیں دیتا کہ آپ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کریں۔

الکنڈر۔ آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں؟ جان بھی چلی جائے تو میں اپنے الفاظ سے نہیں پھر سکتا۔

سینیرل۔ مگر مجھے آپ سے کوئی گلہ نہ ہوگا، اور میں . . .

الکنڈر۔ نہیں، نہیں، میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں، اور باوجود اس کے کہ میرے پاس کثرت سے پیغام آ رہے ہیں۔ میں اپنی لڑکی کی شادی آپ ہی سے کروں گا۔

سینیرل۔ (الگ) تیرا ستیاناس!

الکنڈر۔ سنو۔ تمہاری دوستی کی میرے دل میں خاص عزت ہے۔ اور میں تمہارے مقابلے میں کسی شہزادے کو بھی اپنی لڑکی دینا پسند نہیں کرتا۔

سینیرل۔ جناب عالی! میں آپ کی اس عزت افزائی کا ممنون ہوں، لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔

الکنڈر۔ تم شادی نہیں کروگے؟

سینیرل۔ ہاں نہیں کروں گا۔

الکنڈر۔ کیوں؟

سینیرل۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ اور اس لئے کہ میں اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے کبھی شادی نہیں کی۔

الکنڈر۔ سنو جی۔ ہر آدمی اپنی پسند ناپسند میں آزاد ہے، اور میں ایسا شخص نہیں ہوں کہ کسی کو خواہ مخواہ مجبور کروں آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ میری لڑکی سے شادی کریں گے، لیکن اب چونکہ آپ اس سے دست کش ہونا چاہتے ہیں اس لئے میں جارہا ہوں، تاکہ دیکھوں کہ اس معاملے میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ میں ابھی آکر آپ کو بتاتا ہوں

سینیرل تنہائی میں

سینیرل۔ اب تو یہ میری توقع سے بھی زیادہ معقول ہو گیا۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ مجھے معاملہ کرنے میں بہت زیادہ تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ خدا کی قسم جب مجھے اس معاملے کا خیال آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے دستکش ہو کر بڑی دانشمندی کی ہے۔ میں ایک ایسا قدم اٹھا رہا تھا کہ شاید بعد میں مجھے اس کی وجہ سے بہت پشیمان ہونا پڑتا۔ وہ الکنڈر کا لڑکا آگیا، شاید کوئی جواب لایا ہے۔

السیڈراس۔ (نہایت نرمی اور اخلاق سے) جناب، آپ کا غلام حاضر ہے۔

سینیرل۔ مجھے بھی اپنا خادم تصور فرمائیے۔

السیڈراس۔ صاحب، مجھے والد نے بتایا ہے کہ آپ میری ہمشیرہ کی شادی کا معاملہ فسخ کرنے آئے ہیں۔

سینیرل۔ ہاں جناب، مجھے افسوس ہے لیکن . . . .

السیڈراس۔ اوہ، جناب یہ بھی کوئی بات ہے۔

سینیرل۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ یقین مانئے میرا دل چاہتا ہے کہ . . . . .

السیڈراس۔ جانے بھی دیجئے، اس میں ہرج ہی کونسا ہے۔ (سینیرل کے سامنے دو تلواریں پیش کرتا ہے) عالی جناب، ان میں سے ایک انتخاب فرمایئے۔

سینیرل۔ ان میں سے ایک تلوار؟

السیڈراس۔ ہاں، از راہِ نوازش۔

سینیرل۔ کس لئے؟

السیڈراس۔ جناب محترم، چونکہ آپ نے میری بہن کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ آپ میری اس پیش کش کو بیجا خیال نہ فرمائیں گے

سینیرل۔ کیسے؟

السیڈراس۔ دوسرے لوگ تو شور و غل مچاتے اور آپ کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کرتے، لیکن ہم اس قسم کے لوگ ہیں کہ ہر بات کو چپ چاپ قبول کر لیتے ہیں۔ اور میں نہایت عاجزانہ طور پر عرض کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ نوازش فرمائیں تو ہم دونوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

سینیرل۔ یہ تو بڑا رنجدہ پیشکش ہے۔

السیڈراس۔ آیئے، حضرت، از راہِ عنایت انتخاب فرما لیجئے۔

سینیرل۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ لیکن میرا یہ گلا کٹوانے کے لئے نہیں ہے۔ (الگ) کتنا ذلیل طریق گفتگو ہے!

السیڈراس۔ آپ کی اجازت ہو تو یہ امر نہایت ضروری ہے۔

سینیرل۔ میرے عزیز دوست، میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پیشکش کے سلسلے میں ذرا توقف فرمائیں

السیڈراس۔ آپ جلدی کیجئے، کیونکہ مجھے کچھ اور بھی کام ہے

سینیرل۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ میں اس کے لئے تیار نہیں۔

السیڈراس آپ لڑنے کے لئے تیار نہیں؟

سینیرل۔ یقیناً نہیں۔

السیڈراس آپ سچ کہتے ہیں؟

سینیرل۔ سچ۔

السیڈاس۔ (اُسے دو تین بید رسید کرتا ہے) جناب
کم از کم آپ شکایت نہیں کرسکتے، آپ دیکھتے
ہیں کہ میں ہر بات قاعدے کے مطابق کر رہا ہوں
آپ نے اپنے الفاظ کا پاس نہ کیا میں نے آپ
کو لڑنے کی دعوت دی، آپ نے لڑنے سے انکار کیا
میں نے آپ کو بید لگائے۔ ہر بات قاعدے کے
مطابق ہے، اور آپ بڑے شریف آدمی ہیں کہ مجھے
مطعون کرتے ہیں۔

سینیرل۔ (الگ) کیسا شیطان ہے!

السیڈاس۔ (پھر تلوار پیش کر کے) آئیے صاحب، شرافت
سے کام لیجئے ورنہ کہیں مجھے آپ کے کان کھینچنے پڑیں

سینیرل۔ کیا تم فیصلہ کر چکے ہو؟

السیڈاس جنابِ والا، میں کسی کو مجبور نہیں کیا کرتا، لیکن آپ
یا تو لڑیں یا میری بہن سے شادی کریں۔

سینیرل۔ جنابِ عالی، میں دونوں میں سے ایک بات بھی
نہیں کرسکتا۔

السیڈاس۔ حقیقۃً؟

سینیرل۔ حقیقۃً۔

السیڈاس۔ تو پھر مجھے اجازت دیجئے ..... (اُسے مارتا ہے)

سینیرل۔ اوہ، اوہ، اوہ!

السیڈاس۔ مکرم و محترم، مجھے سخت افسوس ہے کہ میں آپ
سے ایسا سلوک کرنے پر مجبور ہوا ہوں لیکن اگر
آپ اجازت دیں تو میں اُس وقت تک آپ کو مارتا
رہوں جب تک آپ میری بہن سے شادی کرنے
کا وعدہ نہ فرمالیں۔ (بید اٹھاتا ہے)

سینیرل۔ ٹھہرو، ٹھہرو، میں شادی کرلوں گا میں شادی کرلوں گا

السیڈاس۔ میرے محترم دوست، مجھے خوشی ہے کہ آپ کے
حواس درست ہو گئے اور معاملات بخیر و خوبی طے
ہو جائیں گے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے
دل میں اتنی عزت اور کسی کی بھی نہیں جتنی آپ
کی ہے، اور مجھے نہایت رنج ہوتا اگر آپ
مجھے اپنی ذات سے بدسلوکی کرنے پر مجبور کر دیتے،
میں والد کو بلاتا ہوں، اور آپ اُن سے کہہ دیجئے
کہ سب باتیں طے ہو گئی ہیں۔ (جا کر الکنڈر کے دروازے
کو کھٹکھٹاتا ہے)

السیڈاس۔ ابّا، یہ صاحب اب معقولیت پر آمادہ ہو گئے ہیں انہوں نے
ازراہِ مہربانی معاملات کو سلجھانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب
آپ بہن کو ان کے حوالے کرسکتے ہیں۔

الکنڈر۔ جناب یہ ہے میری لڑکی کا ہاتھ، آپ صرف اپنا ہاتھ
بڑھا دیجئے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ میں اپنے فرض سے سبکدوش
ہوا، آئندہ اس کے چال چلن کے آپ ذمہ دار ہیں آئیے،
اب اس مسرت انگیز شادی کا جشن منائیں۔

منصور احمد

اتمامِ عشق

کیا خوب تمہیں اب مجھے بدنام کروگے ۔۔۔ یہ کام کروگے تو بڑا کام کروگے

ہر چند برائی سے کروگے مری باتیں ۔۔۔ ق ۔۔۔ ہر چند مجھے یاد بہ دشنام کروگے

میرا یہ ستارہ ، کہ مرا ذکر لبوں سے ۔۔۔ دن رات کروگے سحر و شام کروگے

میں دشمنِ دل ، دشمنِ جاں ، دشمنِ ایماں ۔۔۔ مجرم ہو کوئی ، تم تو مرا نام کروگے

جتنی بھی زیادہ مری چاہو گے تباہی ۔۔۔ ق ۔۔۔ جتنا بھی زیادہ مجھے ناکام کروگے

اُتنا ہی بڑھاؤگے مرے ذوقِ وفا کو ۔۔۔ اُتنا ہی مرے عشق کا اتمام کروگے

پروانے کو جلنا ہے بہر حال جلے گا

حیران ہوں کیا شمع کا انجام کروگے

حامد علی خاں

ارتقا

سنہ ۱۹۱۲ء

عشا کی نماز سے فارغ ہو کر میں بستر پر لیٹی ہی تھی۔ کہ امی جان میرے کمرے میں آئیں اور میرے پاس بیٹھ کر نہایت پیار کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے دبی آواز میں مجھے بتایا کہ دوپہر کے وقت اباجان کے دیرینہ دوست ڈپٹی . . . صاحب ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے میرے رشتے کی خواہش ظاہر کی ہے ـــــــ رشتے کا نام سنتے ہی مجھے چکر آ گیا، میرا دم گھٹنے لگا اور مجھ پر غشی کی حالت طاری ہو گئی۔

اس کے بعد ایک دو ماہ کے عرصے میں ادھر ادھر سے تین چار پیغام اور آئے لیکن اباجان نے امی جان کے مشورے کے ساتھ ہر ایک رشتے کے نیک و بد کو سوچ سمجھ لینے کے بعد ڈپٹی صاحب ہی کے بیٹے کے ساتھ میرا دامن وابستہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ شادی کے خیال سے میرا دم بدستور گھٹتا رہا لیکن میں نے والدین کی خوشی کو اپنی خوشی تصور کیا اور ان کی رضامندی کو اپنی رضامندی۔

اب میں اکثر سوچا کرتی ہوں۔ کہ ابا اور امی کی نظرِ انتخاب کس قدر نیک بیں نکلی ہیں "تو کسی طرح بھی "ان" کے لائق نہ تھی۔

سنہ ۱۹۲۲ء

بھائی جان کے خط کے جواب میں انہوں نے لکھ بھیجا:۔

"آج صبح آپ کا نوازش نامہ مع سعیدہ کی عکسی تصویر کے ملا، شکریہ۔ تصویر کو صبح سے اس وقت تک بیسیوں بار دیکھ چکا ہوں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی اور جی چاہتا ہے کہ اسے دیکھتا ہی رہوں۔ اس خط کے ساتھ اپنی تازہ تصویر بھیج رہا ہوں سعیدہ کو دکھا دیجئے۔ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے بڑی بے صبری کے ساتھ جواب کا انتظار کروں گا جس قدر جلد ممکن ہو سکے اطلاع دے کر ممنون فرمائیں . . . . . . "

تصویر میں کچھ اس قسم کی نظر فریب جاذبیت تھی کہ اسے دیکھتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے اپنے تکیے کے نیچے چھپا لیا۔

انہیں اپنی اور ساتھ ہی میری قسمت کا فیصلہ اگلے روز کی ڈاک سے مل گیا ہوگا

۱۹۳۲ء

ہم دونوں ـــ رشید اور میں ـــ تماشے کے دردناک پلاٹ سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ اور جب فلم کے اختتام کے قریب ہیروئن نے دنیا و مافیہا سے منہ موڑ کر گھر بار، دولت بشرت یہاں تک کہ ماں باپ کی محبت کو بھی صرف اس شخص کو حاصل کرنے کے لئے قربان کر دیا جسے وہ دل سے چاہتی تھی تو میں نے اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل کے ساتھ روکا اور باوجود اس بات کے کہ آخرکار وہ دونوں آپس میں مل گئے اور خوشی اور کامیابی کی زندگی بسر کرنے لگے میرے دل پر ہیروئن کی آخری قربانی کا کچھ اس قدر گہرا اثر ہوا کہ تماشے کے ختم ہو جانے کے بعد دیر تک میں اپنی جگہ پر بیٹھی آہیں بھرتی رہی۔ جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سارا ہال خالی ہو چکا تھا اور رشید کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا سا میرے قریب چپ چاپ کھڑا تھا۔ دفعتہً ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کی نگاہوں میں ایک پُر سحر اداسی تھی ـ ایک لمحے کے بعد اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا اور نہایت آہستگی سے پوچھا "شمیم کیا ہم دونوں اس فلم کے ہیرو اور ہیروئن کی طرح ہمیشہ کے لئے ایک نہیں ہو سکتے؟"

میں نے اپنی آہ کو روکتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "ہاں"

۱۹۴۲ء

[سین: سطح زمین سے کئی ہزار فٹ کی بلندی پر ابر آلودہ فضا میں اڑتا ہوا طیارہ جسے مس یاسمین چلا رہی ہے۔ وہ مردانہ لباس میں ایک حسین لڑکا معلوم ہوتی ہے اسکی پیٹھ پر جدید ترین ساخت کا پیراشوٹ بندھا ہوا ہے۔ دوسری نشست پر اس کا نوجوان دوست جمیل بیٹھا ہوا ہے]

جمیل۔ یاسمین میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔

یاسمین۔ کہو۔

جمیل۔ کئی روز سے میرے دل میں ایک زبردست امنگ پیدا ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کروں۔

یاسمین۔ (طیارے کو بلندی کی طرف لے جاتے ہوئے) میں ہمہ تن گوش ہوں۔

جمیل۔ میں کئی بار اظہار کی کوشش کر چکا ہوں لیکن میری زبان آج تک میرے دل کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہی ہے۔

یاسمین۔ آخر کچھ کہو گے بھی؟

جمیل۔ (رک رک کر) یاسمین ... مجھے تم ... سے محبت ہے ... میں ... میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے ......

(یاسمین طیارے کو تیزی کے ساتھ گھما کر اس کے رخ کو نیچے کی طرف کرتی ہے)

جمیل (دیوانہ وار) ہماری باہمی زندگی نہایت خوشگوار اور کامیاب ثابت ہوگی ... کیا تم میری محبت کو شرف قبولیت ـــ

(یاسمین طیارے کو اسکی انتہائی رفتار تک تیز کر دیتی ہے ... دفعتہً انجن میں سے ایک زبردست دھماکے کی آواز آتی ہے اور طیارہ الٹ جاتا ہے)

یاسمین۔ (اپنی نشست پر سے ہوا میں چھلانگ مارتی ہوئی) افسوس مجھے تم سے محبت نہیں۔

[طیارہ ایک بہت بڑے شعلے کی صورت میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بستی کی طرف لپکتا ہے۔ یاسمین اپنے کھلے ہوئے پیراشوٹ کے ساتھ لٹکی ہوئی آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتی ہے]

لطیف الرحمٰن

لاہور سے جالندھر تک

ریل گاڑی لاہور کے عظیم الشان اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ناصر نے ناول کے چوتھے باب کی آخری سطروں پر عجلت سے نگاہ ڈالی اور کچھ دیر کے لئے اسے بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ وہ گھبرا گھبرا کر پلیٹ فارم پر نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ مبادا کوئی مسافر اپنی بے ہنگام آمد سے اس کی تنہائی کے لطف کو برباد کر دے۔ وہ طبعاً عزلت پسند تو تھا ہی، لیکن گاڑی کی صحبتِ ناجنس سے اسے خاص طور پر کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ خصوصاً اگر اس کے ہم سفروں میں کوئی "معزز خاتون" یا ننھا بچہ بھی آ شامل ہوتا۔ تو پھر سفر کے یہ گھنٹے اس کے لئے قیامت کی ساعتوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ ابھی گذشتہ ہی مہینے کا ذکر ہے۔ جب ایک خانہ داری کی ماہر سلیقہ شعار "خاتون کے گھی کا برتن اُن کے شوہر کی غلطی سے اوندھا ہو کر رہ گیا، گھی کا طوفان تو خیر طوفانِ نوح کی یاد دلاتا ہی تھا۔ لیکن خاتونِ موصوفہ راستہ بھر اپنے شوہر نامدار کی شان میں جو مدح سرائی کرتی چلی آئیں۔ وہ اس طوفان سے کہیں زیادہ ناقابلِ برداشت تھی۔ اور اُس بیمار بچے کو ابھی تک وہ نہیں بھولا تھا۔ جو اپنی ماں کی گود سے لپک لپک کر اسے "پیغام محبت" دیتا رہا تھا۔ اور جس نے اُس کے کوٹ پر متعدد قسم کے داغ لگائے تھے۔ اور اب بھی تک وہ داغ اگر کوٹ پر نہیں تو اس کے دل پر ضرور اُسی طرح موجود تھے۔

اس دفعہ وہ گاڑی کے آخری ڈبوں میں سے ایک میں بیٹھا نہیں بلکہ یوں کہئے کہ پناہ گزیں ہوا تھا۔ اور ہر اسٹیشن پر خلوصِ دل سے دعا مانگتا تھا کہ "الٰہی کوئی نہ آئے"۔ پندرہ منٹ گذر گئے اور اب وہ خوش ہو رہا تھا کہ آزمائش گذر گئی اور صاف بچ نکلے لیکن اتنے میں ایک ہندوستانی عیسائی خاتون گلابی ململ کی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی تقریباً کود کر اندر داخل ہوئیں ناصر کا دل دھک سے رہ گیا۔ دوبارہ نظر جو اٹھائی۔ تو ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ فام آیا۔ تقریباً ایک پانچ سال کے بچے کا ہاتھ پکڑے بھاگتی ہوئی داخل ہوئی بے اختیار ناصر کے منہ سے نکلا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعُون۔ لیکن ابھی کہاں بس ہوتی تھی۔ ایک قلی آیا اور اس نے عین اسی نشست کے نیچے جہاں وہ بیٹھا تھا۔ ایک ٹوکرا جس میں مرغ یا پیرو کی قسم کا کوئی جانور بند تھا گھسیڑ دیا۔ دوسرے قلی نے ایک بدنما سا کتا اندر پھینکا بس روح ہی تو فنا ہو گئی سیٹی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دو سوٹ کیس جن پر سے رنگ و روغن مدتیں گذریں رخصت ہو چکا تھا داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے ایک نعمت خانہ آیا۔ پھر ایک پرانا ٹفن باسکٹ اور ایک بچے کا کموڈ، اس کے بعد دو بستر نمودار ہوئے۔ جو بمشکل دروازے میں سے اندر داخل ہو سکے یہ اس قدر پھول رہے تھے۔ گویا موٹر کا پمپ لے کر ان میں ہوا بھر دی گئی ہے۔ اب گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ادھر تو کمرے میں

وہ جانور پھڑپھڑا رہا تھا۔ اُدھر کتے نے گھبرا کر بھونکنا شروع کیا۔ خاتون کھڑکی میں سے سر نکالے برابر جلدی، جلدی، کی رٹ لگا رہی تھیں۔ ناصر کا دل اس قدر سامان کو دیکھ کر ڈوبا جا رہا تھا۔ اس نے ناول پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کر اسے بیگ میں بند کر دیا اور دل میں کہا "اگر خود ہی یہاں سے زندہ نکل گئے تو بڑی بات ہوگی"۔ اتنے میں قلی نے سب سے آخری اور سب سے بڑا صندوق اندر دھکیل دیا۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چلی تھی۔ اس لئے قلی پلیٹ فارم پر کود پڑا۔ اور مزدوری طلب کی۔ خاتون نے توقف کیا۔ یہاں تک کہ گاڑی کی رفتار ذرا اور تیز ہوگئی۔ اس کے بعد نہایت فیاضی کے ساتھ چار آنے نکالے اور پلیٹ فارم پر چار قلیوں کے سامنے پھینک دئے۔ قلی چلائے "میم صاحب نصاف کیجئے"۔ خاتون نے کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔ صرف اتنا کہا "جاؤ گاڑی جاتی ہے یہ خوب انصاف کا وقت نکالا" پھر سر اندر کی طرف پھیرتے ہوئے بولیں "اب تو کبھی یہ ٹرین نہ پکڑوں گی"۔ آیا سے مخاطب ہو کر کچھ جانے دانی کا ذکر کیا۔ کتے کو چمکار کر اس کا منہ چوما اور اسے خاموش کیا۔ ناصر کی آنکھیں نفرت کے شدید احساس سے خود بخود بند ہوگئیں۔ اب تک وہ کتے کو دنیا کی بدترین مخلوق سمجھتا رہا تھا۔ اس کے بعد خاتون نے آیا سے کہا ادھر آؤ۔ ذرا یہ صندوق گھسیٹ کر برتھ کے نیچے کر دو قلی دروازے ہی میں چھوڑ گیا ہے۔ آیا شاید نئی نئی کسی گاؤں سے آئی تھی۔ اپنی بھدی اور کرخت آواز میں بولی "میم صاحب اتنے بڑے مرد سے تو صندوق ہل نہ سکا۔ میں بڑھیا کہیں نیچے آکر دب مروں۔ تو کسی کا کیا جائے"۔ خاتون نے کہا "بڈھی ہمیشہ بہانہ کرتی ہے"۔ پھر مڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے ناصر کی طرف دیکھا ذرا اپنی آستین کو اوپر کی طرف سرکایا۔ اور یوں مخاطب ہوئیں۔ "آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی"، ناصر گھبراہٹ میں اس فقرے کا وہی مطلب سمجھا جس کی متقاضی اس کی دلی کیفیت تھی شرمندگی کے لہجے میں رکتے ہوئے بولا جی بالکل نہیں۔ تشریف رکھئے "خاتون نے ایک لمحہ ٹھہر کر کہا میرا مطلب یہ تھا کہ اس صندوق کو ذرا ٹھیک کر لیا جاتا تو آرام سے بیٹھتے۔ دوسرے سٹیشن پر چڑھنے والوں کو دقت ہوگی"۔ ناصر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن دل میں خیال کیا "کیا ابھی اور چڑھنے والوں کی بھی گنجائش باقی ہے"، خاتون کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صندوق کو ہٹانے میں خود بھی شامل ہونگی۔ لیکن وہ ذرا حیران ہوا جب اس نے دیکھا کہ خاتون نے جلدی سے بچے کا ہاتھ پکڑا اور یہ کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گئیں "ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ مائی ڈارلنگ صندوق آتا ہے"۔

اب ناصر صندوق کو ہلاتا ہے۔ تو اس میں گویا لوہا اور سیسہ بھر دیا گیا ہے۔ ہلائے سے نہیں ہلتا۔ بدقت تمام اسے گھسیٹ کر دروازے سے ہٹایا۔ لیکن اتنے ہی میں چہرہ پسینہ پسینہ ہوگیا۔ اور صندوق کا کنڈا تو تقریباً ہاتھ میں گڑ کر رہ گیا۔ زخمی ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر درد کی تکلیف چہرے سے چھپاتے ہوئے مسکرا کر بولا "بس یہاں ٹھیک رہے گا"۔ خاتون نے کہا "تھینک یو"۔ "ویری گڈ" پھر فوراً ہی بولیں "دیکھئے وہ قلی اگر اوپر کی برتھ پر رکھ جاتا۔ تو کیسی حفاظت کے ساتھ پڑا رہتا۔ میرا سفر بھی تو بارہ گھنٹے کا ہے"۔ اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے ناصر کے چہرے پر شرم سے ہلکی سی سرخی آگئی۔ گویا صندوق کو اٹھا کر اوپر رکھنا خود اُسی کا فرض تھا۔ جھجکتے ہوئے بولا۔ اگلے سٹیشن پر دوسرے قلی

کو بلوا کر ٹھیک رکھوا دیا جائے گا۔

خاتون۔ نہیں نہیں آپ کو بہت تکلیف ہوگی" (ذرا ٹھہر کر) یہ سٹیشن قلی بھی بغیر مزدوری لیئے ہاتھ نہیں ہلاتے"

اب ناصر پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

خاتون۔ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ ۔۔۔۔ ناصر کو خیال تو آیا کہ اگلے سٹیشن کا نام لے دوں اور یہاں سے اتر کر کسی اور درجے میں جا بیٹھوں لیکن بدقسمتی سے اگلے سٹیشن کا نام ایسا حافظے سے گم ہوا کہ باوجود تھوڑا دفعہ سوچنے کے بھی یاد نہ آسکا۔ آخر منہ سے سچ ہی نکل گیا "جی میں جالندھر جا رہا ہوں"۔

خاتون۔ (تقریباً چیخ کر) "جالندھر؟ خوب وہیں تو میری آنٹی رہتی ہیں۔ آپ تو شاید جانتے ہوں گے مسز مایاداس مشہور ہیں لیڈی ڈاکٹر"

ناصر (بلا سوچے سمجھے) "ہاں کچھ کچھ یاد تو پڑتا ہے"۔

خاتون۔ (خوش ہو کر ذرا وضاحت سے) سنیئے وہ عام طور پر وہاں ذرا نرس مشہور ہیں یہی تو وجہ ہے کہ ان کی ذات سے ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ شہر کا کوئی شریف گھر ایسا نہیں جہاں وہ نہ جاتی ہوں میں تو کہتی ہوں بغیر ان کے شاید جالندھر کا شہر اجڑ جائے (پھر خود ہی ایک قہقہہ لگاتی ہیں)۔

ناصر "جی ہاں۔ پھر تو ضرور ہمارے ہاں بھی آتی ہونگی"۔

خاتون۔ (ہنس کر) "وہ اچھی خاصی موٹی ہیں۔ وزن میں مجھ سے دگنی ہوں گی۔ قد بھی مجھ سے کچھ نکلتا ہوا ہے عینک لگاتی ہیں۔ چہرے پر کہیں کہیں داغ ہیں۔ لباس ہمیشہ سفید پہنتی ہیں۔ اب تو آپ کو خوب یاد آ جائے گا؟"

ناصر۔ (دماغ پر خواہ مخواہ زور دے کر) "ایک دن اس حلیہ کی ایک لیڈی کو غالباً میں نے زنانے میں سے نکلتے تو ضرور دیکھا تھا۔ شاید وہی ہوں"۔

خاتون۔ (زور سے) "شاید کیا یقیناً وہی ہوں گی۔ اور کوئی نہیں ہو سکتی جب کہ آپ کو یاد بھی پڑتا ہے۔ اچھا یہ تو بتائیے چلنے میں ان کے دائیں پاؤں میں تھوڑا سا، بالکل خفیف (روش میں) بلکہ بالکل بے معلوم سا کچھ لنگڑا ۔۔۔۔ سا ۔۔۔۔۔ پن تو نہیں تھا۔

ناصر "مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس وقت اس پر غور نہیں کیا لیکن ہو سکتا ہے"۔

خاتون "آپ نے غور نہیں کیا؟ ٹھیک! اگر غور کرتے تو آپ بالکل یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے۔ آنٹی کی ناک اور آنکھوں کے اوپر کا حصہ میری سسٹر سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ہوتیں لیکن ایک وجہ سے نہ آ سکیں اگر وہ ساتھ ہوتیں تو آپ فوراً پہچان جاتے"۔

ناصر۔ جی ہاں پھر تو بہت آسانی ہوتی۔"

خاتون۔ تو پھر آپ ایک کام کیجیئے گا تکلیف تو نہ ہوگی؟

ناصر۔ جی نہیں تکلیف کا کیا ذکر (دل میں) الٰہی خیر!

خاتون:۔ تو صاحب یہ کتا لیجیے میری آنٹی کا ہے۔ ابھی بالکل بلّہ ہی تھا کہ اس کی ماں مرگئی آنٹی کو بہت صدمہ ہوا۔ انہیں نوں میری لُوسی (کتیا) نے بھی چار بچے دئے تھے۔ آنٹی نے اسے بھی میرے پاس بھیج دیا کہ ایک تو اسے ہر وقت دیکھ دیکھ کر مجھے رنج نہ ہوگا۔ دوسرے انہیں بچوں کے ساتھ پلتا رہے گا۔ (کتے کو پیار کرکے اب دیکھئے کیسا شریر ہوگیا ہے ان دنوں تو اس کے بچنے کی بھی امید نہ رہی تھی۔ ہاں تو اب آنٹی نے مجھے خط لکھا تھا کہ دلی جاتے ہوئے پیارے جیکی کو ساتھ لانا میں اسٹیشن پر آکرے لوں گی" اب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس خط کے جواب میں انہیں گاڑی کے وقت سے اطلاع دی تھی یا نہیں لیکن اب تو کچھ مشکل نہیں آپ کتا ساتھ لے جائیے! اول تو آپکے گھر میں سب جانتے ہونگے ورنہ کسی نوکر کے ہاتھ بڑے ہسپتال میں مسٹر ہایاد اس کے پاس بھجوا دیجئے"

ناصر (حواس باختہ ہوکر) لیکن میں . . . کتا . . . . . اچھا خیر۔

خاتون۔ (نہایت جوش و خروش سے) اول تو ناممکن ہے آنٹی نہ ملیں جبکہ آپ کے گھر میں ان کی آمد و رفت بھی ہے لیکن خیر اگر آٹھ دن جیکی آپ کے ہاں بھی گذارلے تو ہرج نہیں آٹھ دن بعد میرے شوہر جالندھر سے گذریں گے وہ کتا آپ سے لے کر آنٹی کو دے دیں گے۔ اب خوب بات بنی"

ناصر۔" درست ہے" (دل میں) "خدا کرے گاڑی اُلٹ جائے۔ اور سب فیصلہ یہیں ہو جائے"۔

خاتون:۔ اگر میرے شوہر ساتھ ہوتے تو آپ ان سے مل کر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتے"

ناصر۔ (بوکھلا کر) افسوس میں ان سے نہ مل سکا"

خاتون:" میں آپ کا ذکر کر دوں گی اور کہوں گی جالندھر میں ضرور آپ سے ملئے"

ناصر۔ زہے قسمت۔ آپ کی مہربانی (دل میں) لیکن اس وقت تک شاید میرا انتقال ہو چکا ہوگا۔

اب خاتون نے بچّے کی طرف توجہ کی اور ناصر نے دوسری طرف منہ پھیر کر آسانی سے سانس لیا۔

بچہ:۔ ماما! یہ صاحب کون ہیں"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور ناصر کو مخاطب کرکے یوں گویا ہوئیں۔ لیجئے صاحب آپ کو تو ایک اچھے خاصے دوست مل گئے۔ ابھی ابھی آپ کی نسبت پوچھا ہے۔ اب تھوڑی دیر بعد دیکھئے گویا آپ اور یہ کبھی الگ ہوئے ہی نہیں آپ کا سفر اچھا لطف سے گذرے گا عام طور پر اپنے ہمراہیوں کو یہ خاموش نہیں بیٹھنے دیا کرتے"

ناصر (آہستہ سے) "بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا" لیکن فوراً ہی ہوش میں آگیا (زہرخند

ہنسی ہنس کر) "یہ بھی بہت اچھا ہُوا۔ کیا نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

خاتون (بات کاٹ کر) نام وغیرہ سب یہ ابھی خود بتائے دیتے ہیں۔ ذرا دیر ٹھہریے بچے سے بھاؤ بیٹا وہ صاحب بلارہے ہیں"

یہ سننا تھا کہ بچہ برق کی سی تیزی سے ناصر کی طرف لپکا اور غلیظ بُوٹ اس کی پتلون پر رکھ کر اوپر چڑھ آیا۔ اب ناصر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ادھر بچے کے ساتھ خلق کرنا ضروری۔ ادھر نئی پتلون کا حشر آنکھوں کے سامنے تھا اگر مٹی جھاڑتے ہیں تو ڈر ہے کہ کہیں خاتون کج خلقی نہ سمجھیں۔ غرض پتلون کو تو اس کے حال پر چھوڑا اور بچے سے یوں مخاطب ہوئے

"آؤ میاں اچھے تو ہو؟ کدھر سے آنا ہُوا"

لڑکا۔ آپ پاپا کے دوست ہیں نا؟

ناصر: جھک کر) ہاں۔

لڑکا۔ آپ اونچے تو اتنے زیادہ ہیں۔ اور مونچھیں آپ کی پاپا سے کتنی چھوٹی ہیں؟"

ناصر (جھینپ کر) "کچھ پڑھتے بھی ہیں آپ" (اسے خود تو کسی بچے سے گفتگو کرنے کا ابھی تک کم ہی اتفاق ہوا تھا لیکن اتنا وہ ضرور جانتا تھا۔ کہ اس عمر کے بچوں سے لوگ عموماً یہی سوال کرتے ہیں)

لڑکا۔ "میں پڑھتا تو نہیں لکھتا ہوں"

ناصر: "کیا لکھتے ہیں"؟

لڑکا: یہی ——— Dog"

ناصر۔ (یہ بھول کر کہ مخاطب محض بچہ ہے) "بہت خوب! آپ کی لغت میں Dog ہی سب سے اہم اور جاذبِ توجہ لفظ ہے"

لڑکا۔ (کچھ نہ سمجھ کر) دیکھئے دیکھئے ذرا اپنی پتلون کو "کیسا ستیاناس کر دیا آپ نے (تالی بجا کر) اب آپ خوب پٹیں گے"

ناصر نے کچھ کہنے کے لئے لبوں کو جنبش دی یعنی آپ ہی کی نوازش ہے۔ کہ اتنے میں خاتون نے ایک قہقہہ لگایا لیجئے اب یہ آپ کو تہذیب کا پورا سبق سکھا کر چھوڑیں گے"۔

ناصر (پتلون جھاڑتے ہوئے) "واقعی خوب باتیں کرتے ہیں"۔

لڑکا۔ جناب یہ عینک آپ کی ہے؟ (ناصر نے دیکھا بدقسمتی سے عینک بیگ سے باہر ہی رہ گئی تھی۔ تھوڑی دیر تک بچے نے اسے اِدھر اُدھر سے کھینچا۔ اور اس کے بعد عینک اس کی آنکھوں پر تھی)

خاتون (بے ساختہ ہنستے ہوئے) بس وہی پرانی عادت۔ ذرا سنئے تو اپنے پاپا کی تین عینکیں اب تک فریم سے

جدا کریں ادھر عینک رکھی ادھر انہوں نے اٹھا لی۔"

ناصر (زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ) بچہ ہے نا!

خاتون: "سبھی بچے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ ہی کچھ عجیب قسم کا ہے۔ دیکھئے دیکھئے ذرا اس کی آنکھیں کس قدر شرارت ہے۔"

ناصر (اخلاقاً) بہت پیارا بچہ ہے"۔

خاتون (خوش ہوکر) میں کہتی ہوں۔ اس کی شکل بالکل اپنے پاپا کی طرح ہے اور میری ماما کہتی ہیں کہ نہیں یہ بالکل تمہارے بچپن کی تصویر ہے"

ناصر مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔

خاتون: "لیکن میں بچپن میں ایسی شریر کہاں تھی؟ البتہ میرے شوہر اپنے بچپن کی شرارتوں کے بہت قصے سنایا کرتے ہیں

ناصر (کافی صبر کے بعد بچے کو مخاطب کرکے) "لاؤ میاں عینک تمہارے کام کی نہیں بڑی ہے"۔

لڑکا: "میں اگلے سٹیشن پر دوں گا"

خاتون: "ہاں ہاں ضرور دے دینا ورنہ یہ تم سے خفا ہو جائیں گے۔ (پھر ناصر کو مخاطب کرکے) اس کے پاپا تو بس اس کی ہر بات مان لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: بچہ ہی کیا جس میں اتنی سی شرارت بھی نہ ہو:"

ناصر: "جی ہاں وہ بچہ ہی کیا؟"

خاتون: "سنئے اس شریر کی بات ہمارے پڑوس میں کہیں خودکشی کی واردات ہوگئی۔ ان کے پاپا نے دفتر جاتے ہوئے خاص طور پر ممانعت کی کہ تم اُدھر نہ جانا پولیس اظہار وغیرہ لے رہی تھی لوگوں کا خاصا مجمع تھا۔ ان کی حفاظت بھی بہت کی گئی۔ لیکن جب نعش کی تصویر اتری تو اس کے پاپا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ لوگوں کے ہجوم میں سب سے آگے انہیں کی تصویر تھی"۔

ناصر (ہنس کر) کیوں بھئی تم وہاں کہاں پہنچ گئے؟" (لڑکے نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا تو عینک غائب تھی)

ناصر (گھبرا کر) عینک کہاں گئی؟"

لڑکا۔ خاموش

خاتون: "ننھے۔ عینک کہاں رکھی ہے؟"

لڑکا۔ (بے پروائی سے) "بکری کے پاس"

ناصر: "بکری کے پاس؟ بکری یہاں کہاں آگئی!"

لڑکا (کھڑکی سے جنگل کی طرف اشارہ کر کے) "وہاں تھی"

اب ناصر کو معلوم ہوا کہ وہ خاتون کی بات سننے میں نہایت اخلاق سے ہمہ تن مشغول رہا۔ اور ادھر لڑکے نے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کیا کہیں جنگل میں بکریاں چر رہی ہوں گی۔ وہیں عینک گر گئی۔ یا ان حضرت نے دیدہ دانستہ بکری کو متوجہ کرنے کے لئے پھینک دی۔

خاتون۔ (ذرا تیزی سے) اسی لئے میں آپ سے کہنے کو تھی۔ کہ عینک لے لیجئے۔ معلوم نہیں کتنی قیمت کی تھی۔ آپ کو چاہئے تھا نہ دیتے یا کہیں پوشیدہ رکھتے۔ بچہ ہی تو ہے یہ کیا جانے کام کی چیز ہے یا کمی۔ کیا قیمت تھی عینک کی؟ یہ بھی ایک نقصان ہو گیا۔ بیٹھے بٹھائے۔

ناصر (اس بلا وجہ بوچھاڑ سے گھبرا کر اور بدقت تمام چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے) جانے دیجئے کچھ ایسی قیمتی نہ تھی۔

خاتون۔ (مطمئن لہجے میں گویا نہایت ہی برحق فیصلہ ہو گیا) یہ بھی اچھا ہوا میں تو گھبرا گئی تھی کہ۔ کہ نہ جانے کتنا نقصان ہو گیا۔ آپ کی فریم شاید معمولی سی تھی؟

ناصر۔ (جلدی سے) جی ہاں لیکن بعد میں اسے خیال آیا کہ در اصل فریم سونے کی تھی۔

خاتون۔ میرے شوہر کی عادت ہے کہ ہمیشہ اس قسم کی چیزیں خالص سونے کی بنواتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بس ایک دفعہ چیز پائدار اور خوبصورت خرید لی جائے۔

(جواب نہ پاکر) ایک طرح یہ عادت اچھی بھی ہے اور ایک طرح نہیں بھی۔

ناصر۔ (بلا سوچے سمجھے کہ زبان سے کیا نکل رہا ہے) "ہاں اچھے ہیں" اب در اصل اُس میں بات کرنے کا یارا باقی نہ تھا۔ ایک عینک گئی دوسرے کتے کا رُوح فرسا خیال تھا کہ اب اسے بھی ساتھ لئے ہوئے خدا جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا

ادھر آپا نے عادتاً اپنی چندھی آنکھیں نہایت بے ہنگم طریقے سے ناصر کے چہرے پر گاڑ دیں آپا کا تو معمول ہی یہی تھا۔ بلکہ اسے محسوس بھی نہ ہوتا ہوگا۔ کہ وہ کدھر دیکھ رہی ہے۔ لیکن ناصر نے ان نگاہوں کو بھی اپنی پریشانیوں کا ایک اہم جزو قرار دے لیا بار بار چہرے کو ادھر ادھر پھرا کر اس کی نظروں سے بچنے کی بے حاصل کوشش کرتا خوش قسمتی سے عین اس وقت گاڑی ایک اسٹیشن پر آکر رک گئی۔ وہ جلدی سے نیچے اترنے لگا۔

خاتون۔ "کہاں جائیے گا؟ ذرا جلد واپس لوٹئے۔ گاڑی یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی" ناصر نے کہا۔ ہاں غالباً زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرتی اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ کسی طرح یہاں سے نجات حاصل کر کے کسی اور درجے میں جا بیٹھے۔ چنانچہ کچھ دور جا کر وہ چپکے سے ایک ڈبے میں جا داخل ہوا۔ دو ایک دفعہ مجرمانہ طور پر پیچھے مڑ کر بھی جھانکنے میں ایک صاحب ہاتھ میں بیگ لئے ہوئے اندر داخل ہوئے بیگ پر نظر پڑتے ہی معاً ناصر کو اپنے بیگ کا خیال آ گیا اور پھر جلدی

سے وہ نیچے اتر پڑا طوعاً و کرہاً اسے واپس لوٹنا پڑا۔ ادھر خاتون متفکر انداز میں کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں۔ ناصر کے دل میں چونکہ اپنے "جرم" کا احساس تھا اس لئے اب اُسے مجبوراً ایک نل پر بھی جانا پڑا۔ ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ ایک آدھ کلی کی۔ اس کے خیال میں یہ ثابت کر دینا ضروری تھا کہ گاڑی سے کسی کام ہی کے لئے باہر نکلا تھا ورنہ خاتون تاڑ جائیں گی کہ یہ یہاں سے فرار ہونے کی فکر میں تھا۔ لیکن خاتون کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ اس خوشگوار صحبت سے اس قدر تنگ آچکا ہے۔ ناصر گاڑی میں داخل ہوا۔ چہرے پر زبردستی کچھ مسکراہٹ کے آثار پیدا کئے۔ لیکن آنکھوں سے ایسی دہشت برس رہی تھی کہ گویا شدتِ تکلیف سے ابھی پاگل ہوا چاہتا ہے۔ خاتون نے اسے دیکھتے ہی ایک قہقہہ لگایا پھر بچے کو مخاطب کر کے بولیں "وہ آگئے تمہارے پرانے دوست" "بس اب چپ ہو جاؤ۔ لڑکا کچھ بسور رہا تھا۔ اور یہاں سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا تھا۔ ناصر اپنی جگہ کو خالی پا کر کچھ خوش ہوا اور اطمینان سے بیٹھتے ہوئے پوچھا "یہ کیوں رونے لگے"

خاتون۔ "بس ادھر آپ گئے ادھر انہوں نے رونا شروع کر دیا کہ مجھے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے۔ میں بھی سٹیشن پر گھومنے جاؤں گا۔ دراصل اس کے پاپا کی یہی عادت ہے۔ کہ ساتھ ہوں۔ تو بس اسے ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتے۔ ہر سٹیشن پر ساتھ لیا اور گھوم آئے وہ کہتے ہیں کہ اس طرح بچہ ایک جگہ بیٹھا گھبرا جاتا ہے۔ اب انہیں ایک جگہ بیٹھے دیر ہو گئی۔ تو لگے گھبرانے کہ ہمیں یہیں چھوڑ گئے اور خود اسٹیشن کی سیر کرنے چلے گئے"۔

ناصر (دل میں) گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے۔ اب اسٹیشن پر اتر کر بھی چند اطمینان کے سانس لینے سے رہا خیر اسی میں ہے کہ یہاں سے حرکت نہ کروں لہٰذا اپنے پھر ناول نکالا پڑھا تو خیر اس حالت میں کیا جاتا ہاں صرف اس خیال سے ناول پر نگاہیں جما دیں کہ بچے کی معمولی سے معمولی حرکت پر جس میں کوئی دلچسپی یا دلکشی نظر نہ آتی تھی اسے خاتون کے ساتھ ان قہقہوں میں شریک ہونے سے نجات حاصل ہو جائے جو اس ذلت اس کے دیکھتے ہوئے دل پر نمک پاشی کا کام کر رہے تھے لیکن اس حالت میں ابھی کچھ ہی عرصہ گذرنے پایا تھا کہ دھڑام سے کوئی چیز آ کر اس کی گود میں گری اور ساتھ ہی آواز آئی "لو یہاں بیٹھو" نظر جو اٹھا کر دیکھا تو وہی کتا اس کی گود میں تھا اور لڑکا پاس کھڑا ہنس رہا تھا۔ بے ساختہ ناصر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس نے جلدی سے کتے کو نشست پر پٹخ دیا۔ لڑکے نے تالیاں بجانی شروع کیں "ادہو اتنے بڑے آدمی ہو کر ڈر گئے" خاتون بھی ہنس رہی تھیں۔ جلد ہی ناصر کے چہرے سے تنفرت کا اظہار کم اور ندامت کے آثار زیادہ ظاہر ہونے لگے۔ خاتون نے کہا آپ پڑھنے میں لگے ہوئے تھے لیکن ان کو آپ کی خاموشی ناگوار گذری۔ ناصر نے ناول پھر بند کیا اور لڑکے سے یوں مخاطب ہوا "اچھا یہ آپ کا کتا ہے"۔

لڑکا۔ ہاں۔ لیکن دیکھئے صاحب! یہ ایسا گندا کیوں ہے۔ بار بار منہ سے تھوک نکال دیتا ہے۔ ساتھ ہی تیزی سے ناصر کی جیب سے اس کا ریشمی رومال کھینچ لیا۔ اور اس سے کتے کا منہ اچھی طرح صاف کر کے پھر اُسی تیزی کے ساتھ دوبارہ اُسے ناصر کی جیب میں ڈال دیا۔ ناصر اب بالکل خاموش تھا وہ خیال کر رہا تھا کہ چلتی گاڑی سے نیچے کود کر جان پر کھیل جانا زیادہ آسان ہے۔ یا کچھ دیر اور اس لڑکے کے کھیلوں کا تختۂ مشق بنا رہنا کچھ دیر کے لئے بچے نے اپنی تمام توجہ

کتے کی طرف مبذول کرلی اُدھر خاتون آیا سے دلی پہنچنے کے متعلق گفتگو کرنے لگیں۔ ناصر نے غنیمت سمجھا اس نے جلدی سے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا تھوڑی ہی دیر کے لئے اس دلخراش منظر سے نظر ہٹالینا اس کے لئے بے حد غنیمت تھا وہ چاہتا تھا کہ کہیں جلد جالندھر کا اسٹیشن آجائے لیکن ساتھ ہی جب کتے کا خیال آتا تو پھر دل بیٹھ جاتا حقیقت میں وہ دُعا مانگ رہا تھا کہ "الٰہی کتے والی کو ضرور اسٹیشن پر موجود رکھیو"

کچھ دیر بعد پھر لڑکے نے اس کا شانہ ہلایا۔ اور کہا آپ ذرا ادھر تو دیکھئے۔ اُف جبکی شریر کی طرف یہ پھر تھوکنے لگا" ناصر نے ذرا مڑکر دیکھا اور پھر بدستور سر کھڑکی سے باہر رکھا۔

لڑکا۔ (دوبارہ شانہ ہلاکر) ذرا رومال تو دیجئے ؟

ناصر۔ (بغیر ادھر دیکھے) خود ہی لے لو۔

لڑکے نے پھر رومال جیب سے کھینچ لیا لیکن اس دفعہ ساتھ ایک چھوٹا سا بٹوا بھی نکل آیا۔

لڑکا۔ "صاحب یہ میں لے لوں" ؟

ناصر۔ (بغیر دیکھے) "لے لو" اس نے دل میں کہا۔ اچھا ہے کہ اس ناپاک رومال سے یہیں چھٹکارا ہوجائے بٹوے کا خیال تک اس وقت اس کے دل میں نہ تھا۔ لڑکے نے بٹوے کو ادھر اُدھر سے دیکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ اور اپنی جیب خالی کرنے کے لئے ڈبل روٹی کا ایک توس نکال کر رومال کے ساتھ ہی ناصر کی جیب میں ڈال دیا۔ ناصر نے پھر بھی مڑکر دیکھنے کی ہمت نہ کی۔ کچھ عرصہ کے بعد لڑکا کتے سے بھی تنگ آگیا۔ اور اس نے کھیلنے کے لئے جیب سے چاک کا ایک ٹکڑا نکالا۔ پھر دفعتہً کچھ سوچ کر مسکرایا۔ اور چاک سے ناصر کے کوٹ کی پشت پر کچھ لکھا۔ اس کے بعد پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔ ناصر نے یہ سمجھ کر کچھ جنبش نہ کی کہ غالباً انگلیوں سے چھیڑ رہا ہے۔

آخر خاتون نے پھر ادھر توجہ منعطف کی۔ اور پکار کر کہا "کیا دیکھتے ہیں آپ ؟ اب تو آپ کا جالندھر قریب آ رہا ہے"

ناصر۔ فوراً اندر کی طرف سر پھیر کر سیدھا ہو بیٹھا جی ہاں۔ آپ کو تو ابھی کافی دیر ٹھہرنا ہوگا۔

خاتون۔ "کیا اچھا ہوتا اگر ہمارا اور آپ کا ساتھ دلی تک رہتا"

ناصر۔ جی ہاں پھر تو خوب ہوتا"

لڑکا۔ "کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے" ؟

ناصر نے سر کی جنبش سے "نہیں" کہا۔

لڑکا (کتے سے) "جبکی! شیک ہینڈ صاحب جاتے ہیں"۔ کتے نے فوراً اپنا دایاں پنجہ اوپر اٹھایا۔ رشید نے کچھ جنبش نہ کی۔

لڑکا۔ آپ ہاتھ بڑھایے تو یہ کاٹتا نہیں آپ سے شیک ہینڈ کرے گا۔ ناصر مسکرا کر خاموش رہا۔

لڑکا۔ "آپ ڈرتے ہیں؟"

خاتون۔ "نہیں نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے آپ ذرا تماشا دیکھئے۔"

اب مجبوراً ناصر کو ہاتھ ذرا آگے بڑھانا پڑا لیکن جونہی کتے نے پنجہ اوپر اٹھایا بے اختیار اس نے ہاتھ پھر پیچھے کھینچ لیا۔ اس پر خاتون ہنس دیں لڑکے نے تالیاں بجانی شروع کیں اور ہنستے ہوئے بولا "آپ بہت ڈرپوک ہیں"

خاتون۔ (نہایت ہی مسرت کے لہجے میں) آپ بھی تو یاد ہی کریں گے۔

جالندھر کا اسٹیشن آگیا۔ خاتون جو کھڑکی سے سر نکالے باہر جھانک رہی تھیں ایکدم تالی بجا کر ہنسنے لگیں پھر زور زور سے رومال ہلاتے ہوئے مسرت خیز لہجے میں بول اٹھیں وہ آگئیں آنٹی" ان الفاظ کو سنتے ہی گویا ناصر کی جان میں جان آگئی۔ فرطِ تشکر سے آنکھیں جھک گئیں۔ اتنی خوشی اُسے شاید عمر بھر کسی شخص کے آنے سے نہ ہوئی ہوگی۔

ایک تقریباً ۴۰ برس کی سانولی سی خاتون جو ضرورت سے کچھ زیادہ قد آور اور اسی تناسب سے فربہ اندام تھیں سامنے دکھائی دیں ان کی دو نوجوان لڑکیاں اور دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ ان سب نے گاڑی کے رکتے ہی آکر اس درجے کو گھیر لیا۔ خاتون اور بچے کی توجہ اب زیادہ تر اپنے عزیزوں کی طرف تھی۔ ناصر نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی چھڑی اور بیگ سنبھالا اور خاتون کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔

لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ پیچھے سے پھر خاتون کی آواز سنائی دی" ذرا ٹھہریئے تو آپ کو آنٹی سے انٹروڈیوس تو کرایا ہی نہیں۔ مگر اب وہ آزاد تھا کسی نئی قید میں پھنسا اس وقت اسے کہاں گوارا ہوتا۔ وہ آگے بڑھتا گیا گویا کچھ سنا ہی نہیں کچھ دور تک اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ کے درمیان خاتون کے قہقہوں بچوں کے چہچہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور جب یہ آوازیں بھی ختم ہوگئیں تو اس نے پوری طرح اطمینان کا سانس لیا لیکن تبھی پیچھے سے آواز آئی "تسلیم! حضرت! کہئے یہ عجیب و غریب خطاب آپ نے کس کارِ نمایاں کے عوض حاصل کیا" ناصر اس وقت شاید کل بنی نوعِ انسان سے اس قدر خوف زدہ ہو رہا تھا کہ باوجود آواز شناسا معلوم ہونے کے بھی اُس نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ کہ مبادا کسی اور آفت کا سامنا ہو جائے اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ابھی تک اُس کا سر چکرا رہا تھا گویا برسوں کی قید با مشقت سے رہائی پا کر چلا آرہا ہے۔ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی ٹکٹ کلکٹر کی صورت دیکھ کر ٹکٹ یاد آیا۔ اور اُس نے بٹوا نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن بٹوا یہاں کہاں تھا؟ ڈبل روٹی کے توس کو اس نے بٹوا سمجھ کر نکالا۔ اور بغیر دیکھے چابی گھمانے کے لئے ہاتھ کو عجیب طرح جنبش دی۔ اس پر ٹکٹ کلکٹر کے علاوہ دو ایک اور بھلے آدمی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ معاً ناصر کی نظر توس پر پڑی۔ اور وہ سخت خفیف ہوا۔ دل میں حیران

تھا کہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔ پھر ایک ایک کرکے تمیوں جیبوں کی خوب تلاشی لی لیکن بٹوا یہاں تھا ہی نہیں۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ اُس آفتِ جان لڑکے کی نوازشیں ابھی تک اس کے ساتھ ہیں ٹکٹ کلکٹر اسے شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ناصر نے کہا میرا بٹوا ٹکٹ سمیت گاڑی میں رہ گیا ہے۔ اور پھر واپس جانے کے لئے پلٹا ٹکٹ کلکٹر نے تیز نظر سے دیکھ کر کہا ذرا اچھی طرح "تلاش کیجئے گا۔ اس فقرے سے اسے اور بھی اذیت ہوئی۔ آخر پھر اسی پلیٹ فارم پر آیا دل میں سوچ رہا تھا" اب پھر اسی آفت کا سامنا ہوگا۔ جس سے خدا خدا کرکے نجات ہوئی تھی"۔ کبھی سوچتا کہ وہ لوگ یہ نہ کہیں کہ چوری کا الزام لگانے آیا ہے"۔ کبھی خیال آتا خدا جانے بٹوا ملے یا نہ ملے۔ اور خواہ مخواہ کوئی نیا عذاب مول لے آؤں۔ ایک دفعہ یہ بھی خیال آیا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اسٹیشن پر بھیک مانگ کر کرایہ ادا کروں لیکن وہاں نہ جاؤں۔ اسی ادھیڑ بن میں کبھی قدم آگے رکھتا تھا اور کبھی پیچھے۔ اتنے میں پہلی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ آخر اس نے قدم بڑھایا اور جلد ہی پھر گاڑی کے اس ڈبے کے سامنے جا پہنچا۔

خاتون۔ (خوش ہوکر) آخر آپ پھر آگئے۔ آنٹی کو آپ کے نہ ملنے کا بہت افسوس تھا"۔

ناصر۔ جی میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ میرا بٹوا یہیں کہیں گاڑی میں رہ گیا ٹکٹ کے علاوہ نقدی بھی اسی میں تھی اس وجہ سے میں ٹکٹ کی قیمت بھی ادا نہیں کرسکا"۔

خاتون۔ "یہاں گاڑی میں رہ گیا"؟

ناصر۔ جی ہاں ذرا جلدی دیکھئے گاڑی جارہی ہے"۔

خاتون۔ (ادھر اُدھر دیکھ کر) "یہاں تو بالکل نہیں"

ناصر۔ "بچے سے پوچھئے"۔

لڑکا۔ "وہ تو میں نے پھینک بھی دیا"۔

ناصر۔ (گھبراکر) کہاں؟ کہاں؟

لڑکا۔ "بہت دور، ابھی گاڑی کھڑی کہاں ہوئی تھی"؟

ناصر۔ (بیتابی کے لہجے میں) "تم نے کیوں پھینکا"؟

لڑکا۔ "میری جیب میں جگہ تنگ ہوگئی تھی"۔

خاتون۔ (ہنسی کو بدقت روک کر) دیکھئے اس کی شرارت بھلا آپ کا بٹوا اُس کی جیب میں کیسے آگیا۔ اس کی تو عادت ہی شرارت کی ہے۔ آپ بچے مان گئے۔ آپ کو چاہئے تھا۔ ایسی چیز حفاظت سے رکھتے"۔

ناصر (منہ ہی منہ میں) حفاظت میں کیا خاک کرتا۔ اتنے میں گاڑی کو حرکت ہوئی۔ (خاتون اپنی خالہ اور اُس کی لڑکیوں سے رخصت ہونے کے بعد ناصر سے متفکر لہجے میں) اب آپ کا کیا انتظام ہوگا؟ پھر فوراً ہی نہایت تدبر کے ساتھ "اچھا آنٹی! آپ فی الحال ان کے ٹکٹ کی قیمت اور جرمانہ ادا کردیجئے یہ بیچارے اپنا ٹکٹ کھو بیٹھے"۔

گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی۔ خاتون نہایت اخلاق کے ساتھ برابر رومال ہلا رہی تھیں۔ لیکن ناصر کا جی چاہتا تھا کہ اُس کا بس چلے تو اس وقت تمام دنیا کی عورتوں اور بچوں کو یک قلم دنیا کے تختے سے نیست و نابود کر دے۔

بالآخر وہ گھر پہنچ ہی گیا۔ اس قدر شدید نقصان اٹھانے کے باوجود اسے اس وقت ایک سکون سا محسوس ہو رہا تھا سب سے پہلے اس نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا لیکن جونہی کوٹ کی پشت پر نظر پڑی کیا دیکھتا ہے۔ کہ سیاہ کوٹ کی پشت پر سفید چاک سے نہایت نمایاں طور پر Dog لکھا ہوا ہے۔

اس نے کوٹ اٹھا کر زور سے فرش پر پٹک دیا اور کہا جبھی میں بھی کہوں۔ ہر سامنے سے آنے والے کی بہ نسبت ہر پیچھے سے آنے والا کیوں ایک دفعہ زیادہ غور سے میرے چہرے کو تکتا ہے۔

"راہرو"

اقوال

انسان کا پہلا اور آخری تنزل یہ تھا کہ بتوں کو پوجنے کے قابل نہ رہا۔ منہ پھٹ پیغمبر اقبال کیا بیچ کی بات کہہ گیا ع

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

مگر بتوں کو توڑنے والا خود کب ٹوٹے گا؟ عمارتوں کے کھنڈر کچھ بھی نہیں، وہ کھنڈر جنہیں دیکھنے سے اصلی عبرت ہوگی انسان کے کھنڈر ہونگے۔ انہیں کون دیکھے گا.......... خدا

یہ جوٹ کے سیر کفر بر سر راہ آج کل بکتا ہے محض دیسی گلاسٹر ایمان ہے اصل ولایتی کفر یہاں آتا ہی نہیں یہاں کے ایک کافر نے یہ لکھ ڈالا کہ محض پرانے بیر کی وجہ سے خدا شیطان کی مدد نہیں کرتا ورنہ یہ دنیا کہیں سے کہیں ترقی کر جاتی۔ کس قدر کچا کافر تھا کہ اس کے نزدیک گویا اب تک یورپ اور امریکا خدا کی مدد کے محتاج ہیں۔ پکا کافر ہونا کس قدر مشکل ہے۔

تہذیب کا تازیانہ انسان سے کیا کیا نہ قبولوا دیگا! یہ تو مدت ہوئی کہ انسان انگوٹھا لگا کر تحریر دے چکا کہ مذاہب اور مذاہب کے اوہام سب باطل تہذیب کی ہر بیٹ سی مجبور انسان نے پہلے تو خدا کو بتخانوں سے نکال کر آسمان پر بٹھایا پھر آسمان سے اتار کر خود اپنے ذہن کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ہستی مطلق کہکر اسے مقید کیا اب انسان خود اس تنگ و تر ذہنی زندان سے بھی نکل سکتا ہے کائنات نے انسان کے پیچھے کس غرض سے یہ پولیس لگا رکھی ہے؟ کس جرم کے بدلے؟ بس یہی کہ عقل ہے کہ عقل ہے! ابھی جو یونہی گردن موڑ کر ان سال و ماہ کو دیکھ لیتا ہوں جو بالیں پشت ہیں تو جلدی سے منہ پھیر لیتا ہوں اُس تمام دھند لکے میں اگر کچھ اجالا ہے تو دو چار ابلہانہ امنگوں کا کیا اُب بھی وہی غلطیاں کرتا جاؤں؟ کیا انسان غلطیاں کرنے کرنے صراط المستقیم کی طرف ٹھیک نکلتا ہے؟ یا کیا یہ بات ہے کہ جنہیں ہم نادانیاں سمجھتے ہیں وہی اصل زندگی ہیں۔ کون بتائے اور کون سمجھے؟

فلک پیما

غزل

آج دل میں اثرِ الفت کامل دیکھا
آج دِل کو ترے ارمان کے قابل دیکھا

دونوں عالم کی خوشی نذرِ نظر کر بیٹھا
آپ نے بندۂ درگاہ کا بھی دل دیکھا

ہم نے پایا بھی تو اک درد بھرا دل پایا
ہم نے دیکھا بھی تو یہ زیست کا حاصل دیکھا

طلبِ دوست کے صدقے کہ زباں کو دن رات
دوست کے نام کی تسبیح میں شاغل دیکھا

طالبِ دوست کو اللہ کا طالب سمجھو
واصلِ دوست کو اللہ سے واصل دیکھا

ہم تو محتاج ہیں، شاہوں کو گدا بن بن کر
تیری سرکارِ گدا دوست میں سائل دیکھا

ساقیِ بزم اِترا جام بہ کف آنا تھا
بزم کی بزم کا ایماں کا متزلزل دیکھا

بحرِ الفت متلاطم ہے تو ہو —— کیا پروا
اب خدا چاہے تو نظّارۂ ساحل دیکھا

شکر صد شکر صعوباتِ سفر ختم ہوئیں
اور آنکھوں سے جمالِ رُخِ منزل دیکھا

عشقِ اصنام بھی ہے، دعوئی اسلام بھی ہے
تم کو آزاد! عجب مُرشدِ کامل دیکھا

حکیم آزاد انصاری

وُہ

میں نے اُس دن جارج مُور کا ناول "ایسنتھر واٹرز" ختم کیا تھا۔ کچھ عرصہ میں آرام کرسی پر نیم دراز، ناول کے مجموعی اثر پر جو مجھ پر ہوا تھا غور کرتا رہا۔ سب سے نمایاں یہ احساس تھا کہ مصنف نے گھوڑ دوڑ اور متعلقہ شرط بازی، اور اس کے الم ناک نتائج پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اسی وجہ سے افرادِ قصہ زیادہ ابھرے نہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان سے ان کی زندگی کا انہماک جُدا کر دیا جائے تو بجائے خود وہ کوئی نمایاں یا نادر شخصیت نہیں رکھتے، اگرچہ ہیروئن کی سیرت مصنف کے غائر مطالعۂ زندگی کا نتیجہ تھی۔ پھر بھی پڑھتے پڑھتے یہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی سیرت کی عظمت کا رعب مجھ پر چھا جائے۔ بلند سیرتوں اور ان کی زندگی کے عظیم واقعات کے بیان میں جہاں کسی موقع پر کسی کشمکش کی بدولت ان کی ہستیاں بہت بلندی حاصل کر لیتی ہیں، پڑھنے والے پر عموماً ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ بس یہ کیفیت اس ناول سے مجھے محسوس نہ ہوئی۔ کتاب متعدد جگہوں پر موثر تھی، مگر وہ بات نہ تھی۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شبہ ہوا کہ کمرہ تاریک سا ہو رہا ہے۔ اور تھا بھی یونہی۔ باہر نکلنے سے معلوم ہوا کہ آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ مشرق کا شہسوار اپنے سنہرے جلال میں رخصت ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر گیلری میں کھڑا رہا مگر شام کی بڑھتی ہوئی خاموش افسردگی نے کوئی تازگی نہ بخشی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس سے ماتھے کو ایک خوشگوار ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ مگر دل تھکا ہوا سا تھا۔ اس لئے کمرے میں لوٹ آیا اور چراغ جلا کر کتابوں کی الماری کے پاس آ کھڑا ہوا۔ میرے لئے مطالعہ یا کسی حسین شے کے تصور کے بعد اگر کوئی دلچسپی ہے۔ تو اپنی کتابوں پر نظر ڈالنا ہے گھنٹوں پہروں تو نہیں مگر منٹوں فقط ان کے نام پڑھتا اور لطف اٹھاتا رہتا ہوں چنانچہ اس موقع پر بھی یہ شغل عرصہ تک رہا۔ سوچتا تھا کہ کونسا ناول پڑھوں۔ پھر خیال آیا کہ متواتر کئی دنوں سے ناول پڑھ رہا ہوں۔ کوئی مفید علمی کتاب نہیں پڑھتا۔ یہ بہت بری بات ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ یک لخت تاریخ، یا سیاست یا سائنس کی کتب کا مطالعہ شروع کر دینا چاہیے اوپر کے تختے پر نظر دوڑائی۔ وہاں فقط "ٹھوس" کتابیں تھیں۔

رات کا وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ ایسے مضامین دن کے لئے ہوتے ہیں۔ رات کو تو کوئی "ملائم" سا اور رنگین سا مضمون ہو تو پڑھا جائے۔ آخر دماغی اذیت سے بھی تو کوئی فائدہ نہیں اس لئے ایک پل کے لئے خیال ہوا کہ نظم پڑھوں، ایک دمکتے ہوئے لمحے کے لئے ایک سرور سا محسوس ہوا۔ مگر پھر اس کے لئے بھی صبح کا وقت ہی موزوں سمجھا۔ ایک پل کے لئے خیال ہوا کہ شا کا طویل ڈراما "بیک ٹو متوسلح" ہی پڑھ لیا جائے۔ مگر پھر سوچا کہ شا تو ناول سے بھی دلچسپ ہوگا اور پھر وہ کافی "ٹھوس" نہ ہوگا کہ پچھلے ناولوں کا کفارہ

ادا کر سکے۔ اس لئے قطعی فیصلہ کر لیا کہ تنقید کی کوئی کتاب پڑھی جائے چنانچہ ایبر کرامبے کی ایک نکال لی اور الماری کو بند کر دیا
کتاب لئے اِدھر ہٹا اور اس کی ورق گردانی شروع کی۔ مگر جہاں تک مجھے خیال ہے میں ساتھ ہی یہ سوچ رہا تھا کہ مصنف
نے اگر اپنے نظریہ کی توضیح اور تشریح کے لئے نظموں کے اقتباسات دئیے ہوں تو خوب لطف ہو مگر مجھے ایک خفیف سا صدمہ ہوا
جب یہ دیکھا کہ اگر حوالے دئیے ہیں تو انگریزی شعرا کے نہیں، یونانی یا لاطینی شعرا کے ہیں مگر ساتھ ہی کتاب کے کئی حصّے مفید
ہونے کا یقین ہوگیا۔ اب خیال ہوا کہ پنسل ضرور ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ تاکہ بوقتِ ضرورت نشان لگانے میں تکلیف نہ ہو اس
لئے پنسل کے لئے میز کی دراز کھولی پہلے تھوڑی سی کیونکہ خیال تھا کہ پنسل پاس ہی پڑی ہوگی مگر معلوم ہوتا تھا کہ ہلنے جلنے
سے کہیں اِدھر اُدھر ہوگئی ہے۔ اس لئے دراز کو اور باہر کھینچا اور کاغذات اٹھائے پلٹائے مگر نہ ملی۔ دراز میں بہت سے کاغذات
تھے، دوستوں بھائیوں کے خطوط اور اخباروں کی کاٹیں ڈائری، نوٹ بک اور دیگر اشیا۔ سوچا کہ یہ بے ترتیبی کسی حالت میں جائز
نہیں چلو اسے درست کر دو۔ پہلے کاٹوں کو علیحدہ کیا۔ ایک طرف دو ایک جاذب نظر پرچے جو اشتہار کی غرض سے مغربی فرمیں مفت
بھیج دیتی ہیں۔ انہیں ایک طرف کیا خطوں کو چھانٹا۔ چند ایک کو غیر ضروری سمجھ کر پھاڑ دیا۔ باقیوں کو ایک کونے میں رکھ د
ایک ان میں ایسا بھی تھا جسے دوبارہ پڑھنے کو جی چاہا۔ اس لئے اور کام چھوڑ اسے اٹھا کر شروع سے آخر تک پڑھا۔
لفافے اور پیڈ ترتیب سے ایک جگہ رکھے کہیں سے اپنے کتب فروش کا بل نکل آیا اسے رکھنے میں بہت الجھن ہوئی
جی تو چاہتا تھا پھاڑ دوں مگر پھر ایک کونے میں رکھ ہی دیا۔ مجھے اکثر اس کی یاددہانیوں کی وجہ سے بہت غصہ آیا کرتا ہے ا
اب بھی بہت آیا مگر میں کام میں مشغول رہا۔ اس دیکھا بھالی میں ایک فوٹو فریم ہاتھ آگیا، یہ فریم سلولائڈ کا بنا ہوا تھا اور اس
کے چاروں طرف انگور کی بیل ابھری ہوئی تھی۔ انگور کاسنی رنگ کے تھے۔ البتہ بیل سنہری تھی یاد آیا کہ یہ فریم ایک دوست
نے چھ سال ہوئے دیا تھا کئی دفعہ گم ہوا، پھر مل گیا اسے کھڑا کرنے کے لئے پشت پر جو سہارا لگا ہوا تھا وہ تو کبھی کا ٹوٹ چ
تھا۔ اس لئے جتنی تصاویر میرے پاس ہوتی تھیں۔ اسی میں رکھ دیتا تھا۔
سب سے اوپر جو تصویر تھی وہ خاص طور پر اچھی نہیں تھی)۔ ایک دوست نے بہت ہوئی کھینچی تھی۔ اس میں چار
عمر لڑکے ایک توپ پر بیٹھے تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ مگر بہت ننھا سا۔ اپنی تصویر دیکھ کر حیران سا ہوا کہ چھ سال پ
کتنا منحنی سا تھا۔ اس لئے تصویر پسند نہ آئی۔ اسے نکال دوسری تصویر دیکھنے لگا۔ یہ ایک جوان لڑکی کی تصویر تھی، جو ایک
پھول دار ساڑھی پہنے بید کی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ بالوں پر ایک فیتہ بندھا ہوا تھا چہرہ سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ اس۔
اس میں کوئی خاص دلکشی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ اسے دیکھتا رہا مگر تصویر روکھی روکھی سی تھی۔
اس کے بعد ایک اور تصویر نکلی جس میں وہی لڑکی اپنی بہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور مسکرا رہی تھی تصویر سے اس
تبسم چھن چھن کر دل میں اترا جاتا تھا کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا کہ آنکھوں میں جذب ہوا جاتا تھا۔ کئی منٹ اس تصو
دیکھتا رہا مگر کوئی یاد تازہ نہ ہوئی۔ دل کی حرکت بھی نہایت پر امن رہی اس کے بعد فریم سے ایک لپٹا ہوا پرزہ برآ

ایک پرانے کاغذ کا تہ شدہ پرزہ! اتنا پرانا بھی نہیں مگر پھر بھی یوں معلوم ہوتا جیسے صدیاں ہی گذر گئی ہیں۔ کاغذ کا مضمون مجھے یاد تھا۔ یاد ہی نہیں تھا بلکہ کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ الفاظ تو انگریزی میں تھے مگر ان کا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے اس کے ساتھ ایک بدقسمت لڑکی کا سرد دل لپٹا آتا ہے، خدا جانتا ہے میں تمہارے لئے کتنی افسردہ ہوں تمہیں پیار کرنے والی بہن"۔

یہ کب میرے پاس آیا۔ اور کیسے، اور یہ "اس" کے کیا معنی ہیں یہ ایک داستان ہے میں نے وہ پرزہ کھولا۔ اس میں ایک ننھی سی تصویر نکلی۔ ایک انچ لمبی اور کوئی نصف انچ چوڑی ہوگی۔ اس میں ایک لڑکی کا ہنستا ہوا چہرہ نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی گروپ میں سے یہ تصویر کاٹ لی گئی ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ یہ اسی پھولدار ساڑھی والی لڑکی کی تصویر تھی۔ مگر کیا تصویر تھی! جس طرح ایک نہایت میٹھے راگ کو سُن کر دل میں ایک شیریں بےچینی پیدا ہوجاتی ہے، یا جیسے کسی باغ میں ایک آراستہ اور رنگین پھولوں کے تختے کو دیکھ کر ایک وجد سا آجاتا ہے۔ ویسے ہی اس چھوٹی سی تصویر کو دیکھ کر میرے دل نے ایک ملائم سی گرمی محسوس کی۔ شاعر فطرت کے نظارے، پرندوں کے گیت، شفق کی پرسرور خوبصورتی، عورت کا سراپا بیان کرتے ہیں، مگر جو نشہ، جو لطف، جو لذت اُن کی ہنسی میں تھی میرا دل جانتا ہے۔

بہت سے سال گذر چکے ہیں۔ ہندوستان بڑا ملک ہے۔ وہ کہیں کی کہیں ہیں۔ مگر وہ ہنسی مجھے نہیں بھولتی۔ میں اپنی زندگی کے اس واقعہ کو بھول چکا ہوں۔ مگر میرے دل کے تاریک گوشوں میں ان کی وہ ہنسی ابھی تک روشن ہے۔ مجھے اب بھی یاد پڑتا ہے۔ کہ جب وہ ہنسا کرتی تھیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ کہ دنیا میں اس سے زیادہ بھی کوئی حسین شے ہوگی! میں کئی جگہ پھرا ہوں۔ کئی حسین چہرے دیکھے ہیں! کئی ایک کو ہنستے بھی دیکھا ہے۔ مگر میں نے وہ آب و تاب وہ چمک کہیں نہیں دیکھی۔ ان کا حسن صبیح تھا۔ اور ہونٹ گلابی تھے ہلکے گلابی اور نرم اتنے نرم کہ دیکھنے ہی سے نرمی کا احساس ہوجاتا تھا۔ مگر جب وہ ہنستی تھیں۔ تو سوائے اُن کے دانتوں کی چمک اور ہنسی کے خمار آگیں اثر کے کچھ محسوس نہ ہوتا تھا بنا تھا کہ لوگ ہنسی کو سردیوں میں سورج کے یکدم بادلوں سے نکلنے یا رات کو پھلجھڑی کے چلنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مگر جب تک انہیں نہ دیکھا تھا۔ یہ تشبیہات بالکل بے مزہ اور پھیکی معلوم ہوتی تھیں۔

اور یہ تصویر کس قدر دلکش تھی کتنی پیاری تھی۔ انکے سر پر دوپٹا ذرا ڈھلکا ہوا تھا۔ اور بال کچھ بکھرے ہوئے اور اب جو میں سوچتا ہوں۔ تو کب ان کے بال بکھرے ہوئے نہیں ہوئے تھے، اور چہرہ ہنستا ہوا۔ ایسا کہ ان کا سارا مکھڑا پھول کی طرح کھلا ہوا ہوتا تھا۔ آنکھیں کیا اور رخسار کیا سارا چہرہ شگفتہ تھا۔ اور یہ تصویر کتنی منتوں کے بعد اور کب ملی۔ جب میں مانگتا تو وہ کہتیں۔ یہ میری سہیلیوں کا گروپ ہے خراب ہوجائے گا۔ میں کیسے کاٹ دوں۔ اور پھر کس طرح بن مانگے مل گئی!

وہ دن بھی اور دنوں کی طرح ایک دن تھا۔ دھوپ تھی، ہوا تھی، کمرہ تھا اور میں تھا۔ ان کی بہن نے مجھ سے کہا "تمہیں ایک خوشخبری سناؤں"۔ میں کتاب پڑھ رہا تھا میں نے کہا "کیا ہے آپا جان"؟ کہنے لگیں "اچھا تم بوجھو"۔ میں

نے کہا "تو یہ خوشخبری ہے کہ بھارت"؟ اور ساتھ ہی اس موقع پر جب کتاب دلچسپ ہو رہی تھی۔ ان کے آنے سے کر دیا۔ مگر یہ بہن ان سے عمر میں بڑی تھیں ہیں کیا کہتا خوشخبری سننے کے انتظار میں کتاب کو بند کر دیا۔ مگر وہ مجھ سے ہٹ کھڑکی کے پردے درست کرنے لگ گئیں۔

یہ ان کے مکان کا واقعہ ہے۔ میں دو دن کے لئے ان کے ہاں مہمان تھا۔ ان کی والدہ میری پھوپھی تھیں۔ صبح چار کے بعد کتاب دیکھ رہا تھا۔ کتاب بھی وہ اپنے کالج کی لائبریری سے لائی تھیں "اسکروائلڈ کی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" تھی۔ میں زبان کی گفتگو کی چاشنی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ اگرچہ کسی خوشخبری کے لئے کتاب سے جدا ہونا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ان کی بات سننے کے لئے ایک اشتیاق اور چاک چوبند سامع چاہئے تھا۔ ادر ادھر میں ایک دلچسپ کتاب سے زبردستی علیحدہ کیا گیا تھا۔ اسلئے انہیں میرا استغنا پسند نہ آیا۔ پردوں سے ہٹ کر وہ میز کی چیزیں درست کرنے لگ گئیں۔ اب انہیں انتظار تھا۔ کہ میں پوچھوں، مجھے لگن تھی۔ کہ وہ جائیں تو کتاب پڑھوں۔ میز کی آراستگی کرتے وقت تو وہ گویا بھول ہی گئیں۔ کہ کیا بات کہنی تھی۔ میں نے کتاب کھول لی۔ اس پر انہوں نے کہا۔ "تم بھی ایک ہی ہو" اب مجھے کچھ کہنا ہی پڑا۔ "تو آخر بتایئے نا وہ بات کیا تھی؟"

"سکینہ کی منگنی ہو گئی ہے"

"اچھا!!!" میں نے یہ اتنا کہا۔ اور بس۔

تعجب یہ تھا۔ کہ میں نے ابھی تک سنجیدگی سے اپنے جذبات کا مطالعہ نہ کیا تھا۔ اور نہ مجھے ان کی گہرائی کا کچھ اندازہ تھا۔ بلکہ یہ بھی صحیح علم نہ تھا۔ کہ ان میں صداقت کتنی ہے شروع شروع میں تو موقع ہی نہ تھا۔ مگر بعد میں بھی میں نے صورت حالات تسلیم کر لی تھی۔ اپنی سریع الحسی کا مجھے پتہ تھا۔ اور چونکہ ایسے تاثرات سراب صفت تھوڑی مدت میں ناپید ہو جایا کرتے تھے۔ اس لئے میں نے احتساب نفس کی طرف توجہ نہ دی تھی چنانچہ اس خبر کا ظاہرا مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ہاں یہ بات مجھے یاد ہے۔ کہ اس "خوشخبری" کی تمہید اور آپا سے مکالمہ اور کتاب کی دلچسپی نے جو بشاشت چہرے کو دے رکھی تھی۔ وہ یک لخت موقوف ہو گئی حیرت ہے۔ کہ اس امر کا احساس کیوں مجھے فوراً ہو گیا۔ مگر یہ سچ ہے کہ آپا سے باتیں کرتے وقت جو شکن گالوں پر پڑ گئے تھے ـــ شاید میں سکرا رہا تھا یا گیا ـــ ان کا مجھے فوراً احساس ہوا۔ کہ وہ بے محل ہیں۔

میں نے کتاب اٹھالی۔ مگر اب آپا شروع ہو گئی تھیں۔ اس لئے میں سنتا گیا۔ "وہ ڈپٹی ہے۔ اس کی زمین بھی ہے۔ ٹھیکے پر دے رکھی ہے۔ لاہور میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔ حال ہی میں موٹر لی ہے۔ باپ نہیں ہے۔ ایک بہن ہے۔ اور وہ بھی بیاہی ہوئی۔ بہت ہی اچھا رشتہ ہے چچا جان نے رشتہ ڈھونڈا ہے۔ وغیرہ اور وغیرہ۔

اتنے میں آپا چپ ہو گئیں۔ مجھے یونہی سا احساس ہوا۔ کہ وہ بھی کمرے میں موجود ہیں میں نے پلٹ کر

دیکھا تو اس دروازے میں جو ساتھ کے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ کھڑی تھیں۔ اور ان کا چہرہ خشمگیں سا تھا۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ میرے جذبات کی عکاسی کر رہا ہوگا۔ کیونکہ وہ یکدم مسکرا پڑیں۔ میں نہیں کہہ سکتا، اس مسکراہٹ سے مجھے تکلیف ہوئی یا خوشی مگر جواباً مجھے مسکرانا ضرور پڑا۔ پھر ہم سب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر چپ رہے۔ اب بات کون شروع کرے۔ میرا بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ یونہی بدن سست سا پڑ گیا تھا۔ مگر وہ موجود تھیں میں نے ناچار ان سے پوچھا۔ "آپ نے یہ ڈراما پڑھا ہے؟" مگر اس کا جواب انہوں نے اس بے التفاتی سے دیا کہ میں پھر نہ بولا۔ آپا نے دو ایک باتیں کیں۔ مگر میں گم سم تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا۔ میری طبیعت کی گرانی بڑھتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ آپا اکتا گئیں۔ اور انہیں ساتھ لے کے کسی کپڑے کی بیونت کی فکر میں چلی گئیں۔

ایک گھنٹہ گذر چکا ہوگا۔ مگر میں نے کتاب کے مطالعہ میں دو صفحوں سے زیادہ ترقی نہ کی تھی۔ دماغ کے کسی پردے میں الفاظ کی برجستگی اور ظرافت کا احساس تھا۔ مگر کتاب پڑھی نہ جاتی تھی۔ اس لئے یونہی پڑا سوچ رہا تھا۔ پریشان خیالات کھلے پھر رہے تھے۔ ان میں کوئی ربط نہ تھا۔ مجھے یہ باتیں یاد ہیں۔ کیونکہ ایک مدت کے بعد اس دن میں نے اپنا مطالعہ کیا تھا۔ اگرچہ کچھ غنودگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ مگر یہ سب باتیں کچھ عجیب طرح سے دماغ پر نقش ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کب تک ایسے ہی پڑا رہتا۔ مگر یک لخت میں چونک پڑا۔ درمیانی دروازے کا پردہ ہلا اور وہ اندر آگئیں۔ اب کی انکا چہرہ افسردہ تھا اور ان کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا پرزہ تھا۔

فیاض محمود

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیازمندی — بغرورِ دل ربائی بہ یقینِ دلپسندی
تری بزمِ ناز ظالم ہے عجب طلسمِ حیرت — کہ جہاں ہے میرے دل کو سرِ خدمت سپندی
غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں — مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں — کوئی اُس سا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے — جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

اے غائب از نظر بہ خدامی سپارمت — جانم بسوختی و بہ دل دوست دارمت
تا پایدم شدن سوئے ہاروتِ بابلی — صد گونہ ساحری بکنم تا بیارمت

محفلِ ادب

ایک نظم

میں نظم لکھ چکا۔ اس کے الفاظ کیسے آسان کیسے خوبصورت ہیں۔ اس کی زبان کیسی پیاری ہے۔ اس کے جذبات یسے بلند اور پاکیزہ ہیں اسے میری بیوی نے بھی پسند کیا ہے۔ اور مجھے تو خواب بھی اسی کے آتے ہیں۔ یہ نظم نہیں نظموں کی روح ہے لیکن اب یہ کسی بلند مرتبہ سالہ میں شائع ہوجائے۔ تو لوگوں پر بھی میری عظمت آشکار ہو۔ سمجھتے ہیں معمولی آدمی ہے چونک ٹھیں گے سارے شہر میں شور مچ جائے گا ——— اب میں شاعر ہوں۔ پہلے صفحہ پر شائع ہوگی۔ آئندہ ماہ ایڈیٹر صاحبان تصویریں انگیں گے۔

مگر افسوس ایڈیٹر بیوقوف نکلا۔ اس نے میری نظم لوٹا دی۔ بالکل احمق ہے شعر و شاعری کی قدر کیا جانے۔ امیر باپ کا یٹا ہوگا۔ ایڈیٹر بن بیٹھا۔ مگر اس سے ادب شناسی کی قابلیت تو پیدا نہیں ہوجاتی۔

چلو خود شائع کردیں۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی شاعر سے پالا پڑا۔ بیوی کا ایک زیور بیچ دیں گے اور کیا۔

میرا خیال غلط نکلا ساری دنیا ہی اندھی ہے نظم شائع ہوگئی لیکن بازاروں میں لوگ اُسی طرح خرید و فروخت کر رہے ہیں بھنگیار اسی طرح بھیجے پڑے ہیں۔ دوکاندار اسی طرح دوکانوں میں بیٹھے ہیں کسی کو پروا نہیں۔ کہ میری نظم شائع ہوگئی اور اُسے ے۔ ساری دنیا بیوقوف ہے۔ اگر کالیداس زندہ ہوتا۔ تو آج اُسے نیند نہ آتی۔ اگر تلسی داس زندہ ہوتا تو آج اسے پرماتما ں یاد کرنا بھول جاتی۔

چندن بحوالہ رتنا کر پوتا (مرہٹی)

میر مہدی مجروح دہلوی کا ایک خط

از دہلی ۵ رفروری ۱۸۸۰ء

شاہ عالی کو میر مہدی مجروح کی طرف سے سلام و دعا دونوں پہنچیں سلام اس لئے کہ مخدوم زادے ہو دعا اس لئے کہ مائی کرامت حسین ہمدانی مرحوم کے بیٹے ہو۔ استاد غالب مرحوم کے زمانہ میں شعر و شاعری کا جو چرچا یہاں تھا اس کا حال کیا لکھو لی جنہیں جو یاد آتی ہیں تو آنکھ سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑتا ہے۔ اس زمانے میں قلعہ معلی میں شاہی اہتمام سے مشاعرے ہوا تے تھے مخصوص اشخاص کو شرکت کی اجازت ملتی تھی۔ بادشاہ اور ولیعہد دونوں شعرگوئی کے دلدادہ تھے۔ بادشاہ خود تشریف لاتے تھے ماندہ وقت کے علاوہ دوسرے مشہور شعرا کو بھی باریابی کا موقع ملتا تھا جب کسی امیر و رئیس کے صاحبزادے بہ حیثیت شاعر اس جلسے

میں آتے تھے۔ تو سب سے پہلے بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اور پھر وہ اپنا کلام سناتے تھے۔

اُستاد غالب مرحوم اپنی زندگی میں دو بار کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں انہوں نے اپنی غریب الوطنی کی حالت اور اہل کلکتہ کی ناقدری کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اے رئیسانِ ایں سوادِ عظیم ... اے فراہم شدہ زہفت اقلیم
بہ تظلم رسیدہ است ایں جا ... بہ امید آرمیدہ است ایں جا
اسد اللہ بخت برگشتہ ... در خمِ پیچ عجز سر گشتہ
آں بہ ورسم کار سازی کو ... شیوہ میہمان نوازی کو
گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست ... بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست
با من ایں خشم و کیں دریغ دریغ ... من چناں تلخ و ایں دریغ دریغ

اُستادِ مرحوم کی اصلاح بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایک بار خواجہ الطاف حسین حالی نے یہ شعر لکھا تھا۔ حالی ؎

یارب اِس اختلاط کا انجام ہوگا کیا ؎ تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

میرا خیال تھا کہ شاید اِس پر اصلاح نہ ہوگی۔ مگر حضرت نے پہلے مصرعہ میں صرف ایک لفظ ایسا رکھ دیا جس سے شعر کا عالم ہی کچھ اور ہوگیا۔ دیکھو کیا اچھی اصلاح دی ہے ؎

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر ؎ تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

"انجام ہو بخیر"۔ اس ٹکڑے کا کیا کہنا ہے۔ ہائے اُستادِ مرحوم اب کہاں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ (سفی)

مالی سے

اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!!

میں نے ابھی آنکھ کھول کر دنیا کو نہیں دیکھا۔ ابھی تک میری خوبصورتی دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ ابھی تک میرا چہرہ طفلی کی موہنی سے محروم ہے ـــــ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

مجھے تیز و تند ہوا سے بھی ڈر لگتا ہے، پانی کی بوچھاڑ سے بھی ڈر لگتا ہے۔ مجھے دھوپ سے بھی ڈر لگتا ہے مجھے چھاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے ـــــ اے مالی ابھی مجھے نہ توڑ۔

میں چاہتی ہوں سکھیوں سے ملوں۔ آہستہ آہستہ ہوا میں رقص کروں اور دنیا کے سرسبز و شاداب مناظر دیکھوں اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

طفلی کا زمانہ پھر نہ آئے گا۔ یہ بڑی جلدی بیت جاتا ہے اور بڑی دیر میں بھولتا ہے ـــ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

وہ دیکھ میرا شباب اٹکھیلیاں کرتا ہوا آرہا ہے۔ وہ میری قدر و قیمت لوگوں کی نگاہوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ وہ چاندکی کرنیں میرا منہ چومنے کو آسمان سے زمین پر اتر رہی ہیں ـــــ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

ابھی بلبل نے میری شان میں گیت نہیں گائے۔ ابھی دیوتاؤں کے جسم نے میری خوشبوؤں میں غسل نہیں کیا۔ ابھی سورج کی شعاعوں نے میرے منہ کا گھونگھٹ نہیں الٹا ـــ اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

(چندن بحوالہ بنگ بیدار بنگالی)

تبصرہ

نیرنگِ فطرت - یہ پنڈت اندرجیت صاحب شرما کا مجموعۂ کلام ہے حجم ۲۰۱ صفحات ہے جس کا بیشتر حصہ پنڈت صاحب کی ادبی اخلاقی اور قومی نظموں پر مشتمل ہے آخری حصے میں غزلیات ہیں جن کی مقدار نسبتاً کم ہے۔ کتاب پنڈت صاحب کی تصویر کے علاوہ تین چار دوسری تصویروں اور متعدد حضرات کے مقدموں سے مزین ہے۔ پنڈت صاحب کی زبان صاف اور شستہ اور جذبات پاکیزہ ہیں۔ اوسط درجے کے شعرا میں بلاشبہ آپ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں مختلف مضامین پر انہوں نے کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے۔ ندرتِ موضوعات کے ثبوت کے لئے ان کی بعض نظموں کے عنوان درج کئے جاتے ہیں۔ ندرانۂ روح، موسمِ بہار کا آخری پھول، کوہ ہمالہ، دوشیزۂ صحرائی، سچا کسان، بچے کی آرزو، نے مری پیاری کتاب، سراب، چاند اور چکور، شیریں کلامی وغیرہ اس کے علاوہ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم بھی شامل ہیں نمونۂ کلام کے لئے غزلوں کے بعض اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ہر شے میں ترا یا رب جلوہ نظر آتا ہے ۔۔۔ جس کوہ پہ جاتا ہوں سینا نظر آتا ہے

معلوم یہ ہوتا ہے بس فرق جزو و کل کا ۔۔۔ قطرے کی مجھے تہ میں دریا نظر آتا ہے

سینے میں تڑپتا ہے ارماں ترے ملنے کا ۔۔۔ لیکن اسے کب کوئی رستہ نظر آتا ہے

حال رہتا ہے شب و روز پریشاں دل کا ۔۔۔ آرزو نکلی نہ نکلا کوئی ارماں دل کا

دیکھ لیتا ہے جسے بس یہ مچل جاتا ہے ۔۔۔ کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے مرے ناداں دل کا

اشکباری کے سوا کام نہیں آنکھوں کا ۔۔۔ محشرستانِ محبت ہے یہ طوفاں دل کا

کہاں تک کام دیں میری نگاہیں ۔۔۔ تری ارض و سما ہیں جلوہ گاہیں

غضب ڈھاتی ہیں ذرہ دیدہ نگاہیں ۔۔۔ کہ چھپ چھپ کر لیتی ہیں راہیں

[illegible] ۔۔۔ یہی تو حسن کی ہیں بارگاہیں

[illegible] ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

گنج کی شرطیہ دوا
اور چند حسن و خوبصورتی کے بے نظیر تحفے
نہیں بلکہ سائنٹفک اصول پر تیار شدہ ایک قسم کا خوشبودار میڈیکیٹڈ لوشن ہے۔ جس کے چند روزہ استعمال سے گنج
کر سر پر بال جمنے لگتے ہیں۔ بالوں کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ قوت حافظہ کو از حد مفید ہے۔ بالوں کو از حد مفید
بالوں کو سیاہ کرتا ہے۔ آئندہ بال گھنے اگتے ہیں۔ اگر اس کی آدھی شیشی سے نہ فائدہ ہو۔ تو باقیماندہ شیشی واپس کر کے
قیمت طلب کر لیجئے۔ اس قسم کا دعوےٰ صرف اس لئے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہماری اشیاء سو فیصدی سودمند ثابت ہو چکی ہیں۔ بڑی
پوری توجہ اور قیمتی اجزا سے تیار کیجاتی ہیں قیمت فی شیشی (ڈینش ہیر ٹانک) تین روپے محصولڈاک چودہ آنے
رجسٹرڈ یاسمین
عورتوں کے بالوں کو لمبا کرنے میں یہ تیل اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ہفتہ کے استعمال سے بال کمر
تک بڑھ جاتے ہیں۔ ہندوستان اور یورپ میں اس کے مقابلہ کی آج تک کوئی چیز ایجاد نہیں
جنہوں نے ایک دفعہ استعمال کیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس کے گرویدہ ہو گئے قیمت فی بوتل اونس تیل صرف (عه) محصولڈاک (۴؍)
گل اندام
یہ ایجاد چہرہ کے داغ دھبے کیل چھائیاں دور کرنے کے لئے ایجاد کی گئی ہے اس کے چند روزہ استعمال
سے چہرہ کی سیاہی دور ہو کر گلاب کی پنکھڑی کی طرح خوبصورت شکل آتا ہے۔ داغ دھبے اس طرح غائب ہوتے
تعجب ہوتا ہے۔ یورپ کے پوڈر اور پیرس کے غازے اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں فضول اور ناکارہ چیزیں استعمال کر کے
رنگ نہ بگاڑیئے۔ بلکہ وہ چیزیں استعمال کیجئے۔ جو ہندوستان کی فضا کو مدنظر رکھ کر تیار کی گئی ہیں۔ قیمت فی شیشی تین روپے
آنے (عہ) محصول ڈاک دس آنے (۱۰؍)
نیز ہم سے ہر قسم کا انگریزی مال مثلاً تولیہ بنیان جراب۔ رومال شالی ریشمی رومال بازار سے مقابلتہً عمدہ اور سستے طلب کیجئے
کا پتہ :- ریاض کیمیکل پرفیومری کمپنی (۱) ریاض بلڈنگ لاہور

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر عروس نہایت مقبول ہے ۔
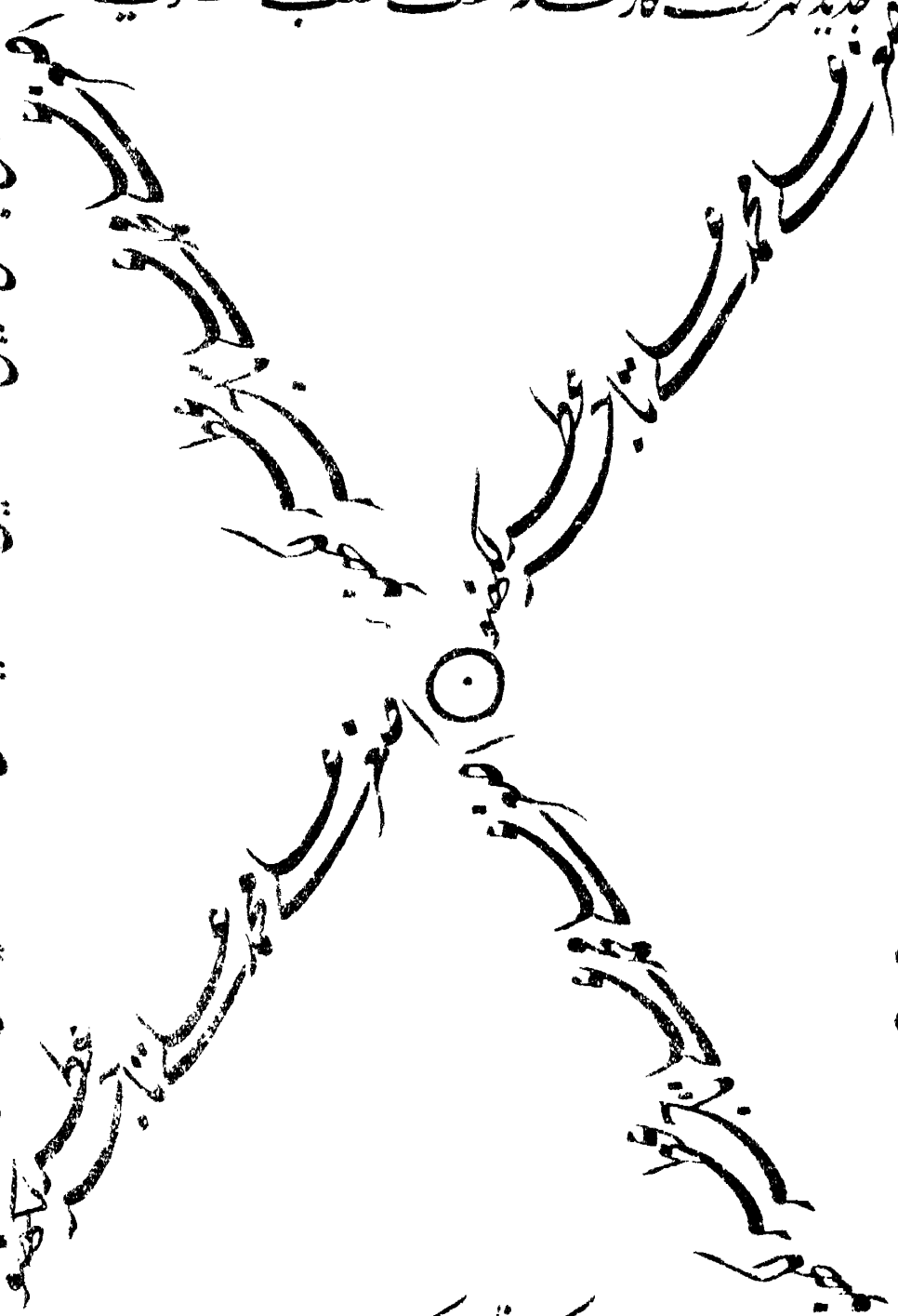
اعلیٰ طبقہ کی خواتین حسن برقرار رکھنے کے لئے اس کارخانہ کا پاؤڈر استعمال کرتی ہیں
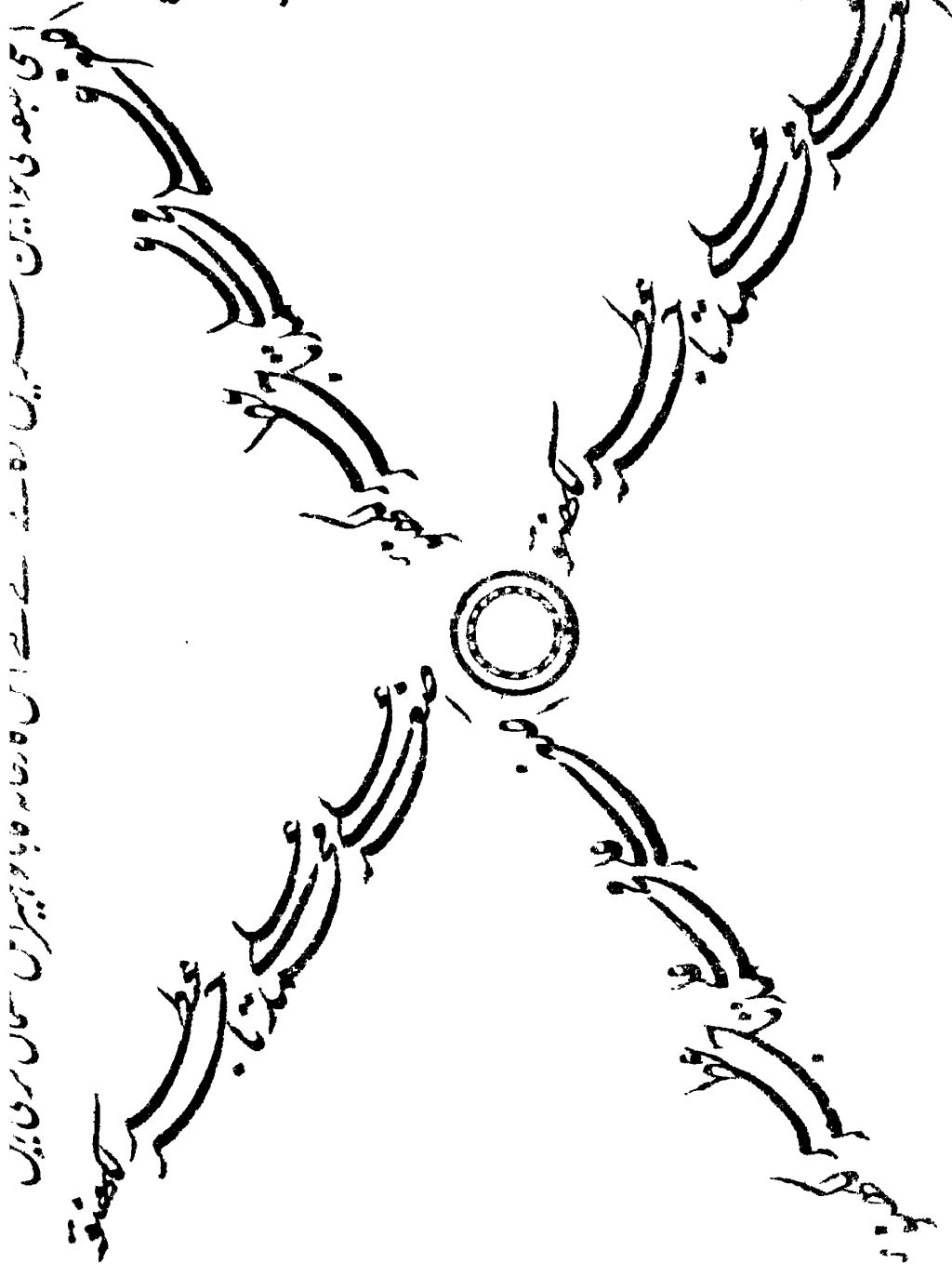
یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے ۔

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

محمد لطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے سلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں بی۔ اے

فہرست مضامین "ہمایوں"

جلد :- ۲۱

نمبر :- ۵

بابت ماہ مئی ۱۹۳۲ء

تصویر :- محبت

ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے متعلق رائیں

(کپتان سردار سکندر ح... خاں صاحب ریونیو ممبر)

جنوری نمبر جب سابق غیر معمولی ... پر خوبصورت ہے اور اس کے مضامین بحیثیت مجموعی اس کے بلند معیار کے مطابق ہیں جس کی مثال ... اردو رسائل میں بہ مشکل مل سکتی ہے۔

(۲)

...ت میرے سامنے صرف ہمایوں کا سالگرہ نمبر نہیں بلکہ کئی دوسرے سالنامے اور خاص نمبر بھی ہیں ۱۹۳۲ء ...ٹائمز آف انڈیا کا اور نیرنگ خیال کا دیگر متعدد رسائل کے مختلف سالوں کے خاص نمبر ہیں۔ اس لئے میری رائے مقابلتہً ہوگی۔ کسی خاص جذبہ یا رعایت کو دخل نہ ہوگا۔ ع یہاں دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ میں تو جب بھی پرچہ اٹھاتا ہوں۔ ٹائیٹل کو دیکھتا ہوں۔ طباعت عمدہ مضامین کے لحاظ سے کسی خاص نمبر سے کم نہیں بلکہ اپنی ندرت کی وجہ سے خاص شان رکھتا ہے۔ یوں تو تمام مضامین اور نظمیں بہتر ہیں اور عام دیگر اردو رسائل کے مقابلہ کی ہیں لیکن اس بلند بانگ دعادی کرنے والے رسائل کی فہرست میں نہ آنے والے ہمایوں میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو اپنی ندرت اور وحدت کے لحاظ سے کسی مغربی جریدہ سے کم نہیں اب بھی انگریزی داں اصحاب اردو جرائد کے مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھیں تو یہ ان کی مغرب زدگی کی علامت ہے۔ دگر نہ "کلام ہمایوں"۔ "کام سندیس"۔ تہذیب اور فلسفۂ زندگی نہایت اعلیٰ چیزیں ہیں۔ کاش "دام ہم رنگ زمیں اور زلف و خال" کے شیدا ان نظموں سے سبق حاصل کریں اور قوم کے نوجوانوں کے اخلاق کی تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں یہ نظمیں انمول موتی ہیں۔ در ناسفتہ ہیں۔ بالخصوص فلسفۂ زندگی اور تہذیب تو مجھے بار بار متاثر کرتی ہیں۔ آپ میری رائے کی قیمت تب جانیں جب ان نظموں کا انگریزی میں ترجمہ ہو۔ اور یورپ والے بھی ان کا مطالعہ کریں۔ حضرت جوش بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کا خطاب "شاعر انقلاب" صحیح ہے۔ اور آپ نے بھی فلسفہ زندگی بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ کام سندیس بھی اچھی چیز ہے پر کلام ہمایوں تو نوادرات سے ہے ہمایوں ہمیشہ قوم کو عمل کا پیغام سناتا رہا اور مجھے بالعموم ان کی ایسی نظمیں مطالعہ کرنے کا موقع نصیب ہوا حق یہ ہے کہ انہوں نے پیغام پہنچانے میں کبھی غفلت نہیں کی لیکن ؎

تنہا اٹھالوں میں بھی ذرا لطفِ گمرہی ۔۔۔۔ اے رہنما مجھے مری قسمت پہ چھوڑ دے

بار بار پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں اور متحیر رہ جاتا ہوں۔ کس قدر عمدہ تخیل ہے۔ نثر میں بھی عمدہ مضامین

موجود ہیں۔ تراجم کو چھوڑ کر "اجتماعی زندگی پر ایک نظر" اچھا مضمون ہے۔ ہمایوں کا ہر سالگرہ نمبر ایک ایسے قیمتی مضمون سے مزین ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر تو آپ کو شاباش نہیں دے سکتا۔ کیا گذشتہ سال کا تعلیم و تربیت کے نئے طریقے کچھ کم قیمتی مضمون تھا۔

فلک پیما صاحب کی فلک پیمائی ایک اچھی چیز لائی ناسپاسی ہوگی اگر نپولین اور اس کا خواب تو خیر "تاریخ عالم پر ایک نظر" کے مرتب "مورخ ہمایوں" کو (جو شاید منصور کے پردے میں خدا یوں رہا ہے۔ کے مصداق . . .) اس محنت و کاوش کی داد نہ دی جائے۔ بارہ صفحات میں تاریخ عالم کو لے آنا حیرت انگیز اور قابل تعریف کام ہے۔ یہ اپنی قسم کی واحد چیز ہے اور نہ صرف مبتدیوں بلکہ علما بزعم خود فضلا کے لئے بھی مفید ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی مضامین اچھے نہیں وہ تو میں نے پہلے کہہ دیا ہے۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار

البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ آئندہ دسمبر کے پرچے میں مضمون نگاروں میں کسی ایسے صاحب کا نام نہ لکھ دیا کریں جو وعدہ پورا نہ کریں یا جس سے آپ مضمون (خواہ کسی وجہ سے) حاصل نہ کر سکیں۔ کیونکہ ہمایوں ان چیزوں سے بالا ہے میری مراد سُدرشن اور ان کے افسانہ سے ہے۔ یہ دعاوی بلند بانگ رسائل کی قسمت ہیں بس مکمل رسالہ ابھی پڑھ نہیں چکا ورنہ دیگر خصوصیات یا اگر نقائص نظر آتے تو بھی ظاہر کرتا۔ اس کامیاب سالگرہ منانے پر آپ کو اور عملۂ ادارت کو مبارکباد عرض کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔ کہ خدا ہمایوں کو ایسی بیسیوں سالگرہیں نصیب کرے

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حامد اور منصور اچھا کام کرتے ہیں۔ ہمایوں کے لئے ایسے ہی مدیروں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ حامد کا "غم نصیب" (افسانہ) اور "خاطر میں حامد آج تک شاہوں کو بھی لایا نہیں۔ بے برگ و بے ساماں گدا اور اس پہ خوددار اس قدر" (غزل) اور منصور کا "کیڈر کا مصور" مجھے کبھی نہ بھولیں گے۔

میرزمان خان فائق کیانی (جہلم)

(۳)

کل سالگرہ نمبر امید کے موافق مل گیا سبحان اللہ اس کے مضامین اور وجد آفریں نظموں کی کیا تعریف کروں۔ خصوصاً حامد علی خاں اور جوش ملیح آبادی اور قبلہ گاہ ب۔ ل صاحب کا کلام!

عاصی از گوجرہ

(۴)

رسالہ غور سے دیکھا شروع سے لے کر اخیر تک دلچسپ تھا۔ ہر مضمون افسانہ۔ ڈراما نظم یا غزل Rayaũng کے الفاظ میں From the pen of a master تھی۔

ضیاالدین شمسی ایبٹ آباد

جہاں نما

گداگری کا مسئلہ

"ینگ من آف انڈیا" میں مسٹر والٹر پی وارن کا ایک مضمون گداگری کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ امر متمدن دنیا کے لئے موجب صد ننگ و عار ہے کہ تہذیب و تمدن کے اس ترقی یافتہ دور میں ہندوستان جیسا بڑا ملک اس قابل نہ ہو کہ گداگری کے مسئلہ کے حل کے لئے کوئی مفید قانون وضع کرسکے۔

شمار و اعداد کی کتابوں میں گداگروں کی حد سے بڑھی ہوئی تعداد کے متعلق جو لرزہ خیز بیانات شائع ہوتے ہیں وہ اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ انہیں پڑھنے سے ارباب حل و عقد کے دل اب اس طور پر متاثر نہیں ہو سکتے کہ وہ نوع انساں کے اس قعر مذلت میں گرے ہوئے طبقہ کے مصائب کا کوئی ہمدردانہ حل تجویز کرنے کی تکلیف گوارا کریں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ عوام میں اس کے متعلق تحریک کی جائے اور اس معاشری لعنت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس قدر موثر اور پرجوش مظاہرے کئے جائیں کہ آخر بڑے بڑے لوگ اس طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ عوام کو پرزور طریقے پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی چاہئے کہ بیمار اور محتاج گداگر ہماری صحت کے لئے ایک سخت خطرناک مصیبت ہیں۔ یہ طرح طرح کے روگی اور طرح طرح کے بیمار بد قسمت لوگ قسم قسم کے رستے ہوئے ناسوروں اور مختلف النوع بیماریوں کے جراثیم لئے ہوئے ہمارے بازاروں میں، گلی کوچوں میں اور گزرگاہوں اور شاہراہوں پر ادھر ادھر بیٹھے اور پھرتے پھراتے نظر آتے ہیں۔ اپنے متعدی امراض سے یہ ہمارے کھانے پینے کی چیزوں کو مہلک بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مکان کے فرش پر ان کا ہر نقش قدم ہلاکت خیز جراثیم چھوڑتا جاتا ہے۔ اور جب ہمارے ملازم ننگے پاؤں وہاں پھرتے ہیں تو ان کے ذریعہ سے یہ جراثیم ان دریوں، قالینوں اور غالیچوں پر پہنچتے ہیں جہاں ہمارے بچے کھیلتے ہیں ہمارے بچے عموماً بیمار رہتے ہیں لیکن ہم بیماری کا اصلی باعث سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں۔ ہم ہندوستان کی ناسازگار آب و ہوا کو ملزم گردانتے ہیں اور ان لوگوں کو مطلق اس بیماری کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے جو عوام کی دی ہوئی طاقت کا دیانت دارانہ استعمال نہیں کرتے۔ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مرض کے حقیقی علاج کی طرف توجہ دینے سے بالکل بے پروا ہیں۔

پیشہ ور گداگر ملک کے لئے ایک عذاب ہیں اور ان کا وجود عوام کے کندھوں پر ایک غیر ضروری بار ہے۔

جس سے نجات صرف قانون کی مدد سے حاصل ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ عوام کی سخاوت اور سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ایسے گداگر جو فی الواقع اپاہج یا ازکار رفتہ ہیں ان کی مدد کے لئے ضرور محتاج خانے قائم ہونے چاہئیں اور ان کے متعلق نہایت سخت قوانین وضع ہونے چاہئیں تاکہ انصاف کا منشا پورا ہو۔

شادی محبت اور مسرت

برٹرینڈ رسل نے "جنسی محبت اور مسرت" کے موضوع پر ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آدم اور حوا پر ہبوط کے بعد عنبریت کی بلا بطور سزا کے نازل ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جس قدر نوجوان مرد عورتوں سے شناسا ہوں وہ سب کسی نہ کسی صورت میں اس جذبہ کی کارفرمائیوں سے گرفتار عذاب ہیں۔ رسل اپنے قارئین سے پوچھتے ہیں کہ وہی بتائیں اس جذبہ کے طفیل انہیں زیادہ راحت ملی ہے یا کلفت۔ زمانۂ گذشتہ میں مرد یا عورتوں پر ہر طرح اقتدار تھا۔ مرد ہر طرح مختار تھے اور عورتیں مجبور۔ اُن دنوں نوع انسان کا صرف ایک حصہ عذاب میں تھا لیکن موجودہ مساوات کے عہد میں جب مرد و عورت کے یکساں حقوق کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے مرد و عورت دونوں ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں اور دونوں کی زندگیاں یکساں ناشاد ہیں۔ پرانے قصوں کا انجام ہمیشہ یہ ہوا کرتا تھا کہ اُس کے بعد ان کی شادی ہو گئی اور وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اگر آج کل بھی لوگ اپنی زندگی کے افسانے کا یہی انجام کریں تو جھگڑا ختم ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد یا بیوی اکتا جاتی ہے یا شوہر یا دونوں اس کا نتیجہ آخرکار طلاق ہوتا ہے۔ رسل نے لکھا ہے کہ میں امریکن لیڈیوں سے گفتگو کرتے ہوئے بارہا یہ دیکھ کر گھبرا گیا ہوں کہ جس کسی شخص کا نام میں نے اتفاق سے لیا اس کے متعلق مجھے یہ بتایا گیا کہ وہ کسی نہ کسی وقت ان کا شوہر رہ چکا ہے یہ حالات افسوسناک ہیں لیکن ان کا باعث یہ غلط خیال ہے کہ لوگ جنسی تعلقات کو مسرت کا موجب سمجھتے ہیں حالانکہ اگر وہ آئندہ رنج کی توقع رکھیں تو شاید انہیں بعد میں اتنا عذاب نہ ہو اگر ہم "حقیقت پرست" بن جائیں اور رشک و حسد اور بدمزاجی وغیرہ کو اعتدال پر لے آئیں تو کئی مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں۔ موجودہ زمانے کی شادیاں نہ صرف عورت اور مرد کی مسرت کی ضامن نہیں بلکہ ان سے قابلِ اطمینان بچے بھی پیدا نہیں ہوتے حالانکہ بحیثیت ایک معاشرتی نظام کے شادی کا یہی مقصد ہے آج کل کے بچے کمزور اور ذکی الحس ہوتے ہیں اور ان کی پرورش اس قسم کے دردناک ماحول میں ہوتی ہے کہ وہ اچھی طرح پھولنے پھلنے بھی نہیں پاتے موجودہ زمانے کے اکثر مصائب کا باعث یہ ہے کہ لوگ رومنٹک محبت کو شادی سے الگ نہیں سمجھتے حالانکہ وہ ایک مثالی اور شاعرانہ جذبہ ہے اور شادی ایک معاشری ضابطہ یا نظام۔ وہ شاعری ہے اور یہ حقیقت۔

(تصویر) یہ ایک انگریز مصور مارکس سٹون (۱۸۴۰ء) کی مشہور تصویر ہے۔ اس قسم کی شاعرانہ مصوری کے کئی نفیس اور پاکیزہ نمونے اس کے موقلم اور لطیف تخیل نے پیدا کئے۔ اس کی ایک تصویر "پہلا محبت نامہ" ساڑھے چار ہزار پاؤنڈ میں بکی تھی۔ اس مصور کی تاریخی تصاویر بھی مشہور ہیں۔ مثلاً "واٹرلو سے پیرس کو" "ہنری ہشتم اور این بولین" وغیرہ موجودہ تصویر پاکیزہ تخیلات و تصورات کی بہترین آئینہ دار ہے۔

گریہ

جلا کر شمع پروانے کو شب بھر آپ بھی روئی
نہ بے جا اعتمادِ عشق تُو نے آبرو کھوئی

یونہیں سات آسماں چکر میں ہیں، یارب یہاں کیا ہے
فغاں اِک بے نوا درویش کی سُنتا نہیں کوئی

جگانے والے روئے آسماں کو دیکھ کر برسوں
جو سوئی بھی تو کیسی نیند اے تقدیر تو سوئی!

مکدّر دوست سے ہو کس طرح، جس کی یہ حالت ہے
بُرائی دل میں دشمن کی، نہ لب پر اُس کی بدگوئی

حقیقت کھُل گئی شبنم پہ حُسنِ بے وفا تیری
اِدھر مُنہ پھُول کا چُوما اُدھر جی کھول کر روئی

حامد علی خاں

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن   دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

اقبال اور سیاسیات

اقبال نے اگرچہ سیاسیات کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اقبال کی تصنیفات سیاست کے بے شمار بلند حقائق سے لبریز ہیں۔ لٹریچر اُن زبردست اور عامل قوتوں میں سے ہے جو قوموں کو ایک زبردست ذہنی انقلاب کے لئے آمادہ کردیتی ہیں۔ اقبال کی شاعری کو صرف شاعری ہی کے نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اس حیثیت سے بھی) اس پر نظر ڈالنی چاہئے کہ اس کا شاعری کے علاوہ ایک اور بلند تر مفہوم بھی ہے۔ اقبال کی شاعری اور سیاست باہم اس طرح ملی جلی ہیں، جس طرح دانتے کی شاعری اور فلارنیس کی سیاسیات۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اقبال ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوا جب کہ مشرق و مغرب میں زندگی اور اس کے مختلف شعبوں میں عجیب و غریب انقلاب نمودار ہو رہا تھا۔ مشرق کی جہاں گیریاں، جہاں ستانیاں ختم ہوچکی تھیں۔ اور مغرب کی سیاسی فتح مندیوں کے قدم بقدم ذہن اور فکر کی فتوحات کا سکہ بھی، بیٹھ رہا تھا اہل مشرق اور علی الخصوص مسلمانوں کی آنکھیں مغرب کے روشن اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والے تخیل سے چندھیائی جارہی تھیں۔ ہر سمت زوال، اور پستی کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ اور مرعوبیت کی حد یہ تھی۔ کہ ہر شعبۂ حیات میں مغرب کی تقلید ضروری فرض بن گئی۔

اقبال اگرچہ استادانِ فرنگ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرچکا تھا اور تہذیبِ فرنگ کے خمستاں سے مدتوں تک سیراب ہوتا رہا۔ لیکن اسے پیرانِ مشرق کا فیضِ صحبت کہئے یا سعادتِ ازلی کی یاوری اور مساعدت کہ جس قدر یورپی افکار اور خیالات کے مطالعہ کا زیادہ موقع ملتا گیا اس کے ذہن میں مغربی اندازِ خیال کے خلاف ایک شورش ترقی پکڑتی گئی۔ مغربی سیاست کے نظری اکتساب اور تجرباتی ادراک نے اقبال کو اس نظر فریب تہذیب کے دام میں پھنسنے سے بچالیا۔ برگساں جس قدر ہربرٹ سپنسر کے خیالات کا گہرا مطالعہ کرتا جاتا تھا اسی قدر اس کے دل میں "مادیت" کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اقبال بھی مغربی استادوں کی کتابوں سے جس قدر قریب ہوا اتنا ہی وہ ان نظریاتِ زندگی سے بیزار ہوا جن سے وہ لبریز تھیں۔

مشرق کی اس بیچارگی اور فکرِ صحیح کی اس درماندگی کے احساس نے اقبال کے نہاں خانۂ دماغ میں خیالات

(نوٹ، یہ مضمون اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام "اقبال ڈے" کی تقریب پر پڑھا گیا تھا۔ راقم

ں ایک نئی بستی کی بنیاد رکھی۔ جو اپنی ترکیب اور نوعیت کے لحاظ سے تو خالص اسلامی طرز کی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت
دہ مشرق و مغرب کے افکار کے آزادانہ مقابلے اور موازنے اور امتزاج اور اختلاط کے بعد تیار ہوئی ہے۔ یہ نیا فلسفۂ سیاست
د اقبال کے نغموں اس سے دنیا میں پھیلا وہ صرف افلاطون، ارسطو، مشیاولی، ہابس کانٹ اور روسو کے علم ہی پر مبنی نہ تھا بلکہ
س کی تیاری میں، قرآن وحدیث، غزالی اور رازی، ماوردی اور نظام الملک، ابن حزم اور ابن خلدون کے خیالات
سے بھی مدد لی گئی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ عام انسانی تجربات نے بھی اس کی تعمیر و ترکیب پر خاصا اثر ڈالا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال کی سیاست کا ایک ایسے زمانے میں جب کہ مغربی اندازِ خیال بے حد مقبول ہے
یورپ میں بلکہ خود ہندوستان میں زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا۔ لیکن ہمیں ہرگز یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اقبال جن خیالات
کی تعلیم دے رہا ہے۔ وہ ہوا اور فضا کے بالکل مخالف ہیں جنہیں وہ شاعر فردا ہونے کی حیثیت سے "کل" کی بجائے "آج" ہی
ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ ان تعلیمات کی صداقت کی بعض دلیلیں خود شاعر کی زندگی میں مل
رہی ہیں اور دنیا اُس نصب العین سیاست کی طرف خود بخود کھچی چلی آتی ہے جو اقبال کے نزدیک اصلی اور صحیح ترین
نصب العین ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جہاں اقبال کا نصب العین تقریباً وہی ہے۔ جو اسلام کا عین منشا ہے۔ وہاں خود
مسلمان اس وقت تک طوفانِ مغرب میں اس قدر تیزی اور شدت کے ساتھ بہہ گئے ہیں کہ انہیں یہ نصب العین کچھ
اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔

اقبال کے سیاسی فکر کا نشو و ارتقا۔ اقبال کے بعض مغربی معترضین، عام طور پر یہ اعتراض کیا کرتے
ہیں۔ کہ اقبال کا سیاسی نصب العین اکثر بدلتا رہتا ہے۔ اور اس کے افکار میں اوقات کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی
ہیں۔ چنانچہ اسرارِ خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے، انگریزی رسالہ "اتھینیم" کے ایک مضمون نگار مسٹر فارسٹر نے یہی کہا تھا کہ اقبال
کا قدم کسی ایک راستے پر نہ رہے گا۔" اس اعتراض کی تائید میں عموماً یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اقبال کسی زمانے میں ہندوستانیت
کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت
جیسی قومیت آفریں اور وطنیت سے لبریز نظمیں لکھتا ہے تھوڑے ہی عرصے کے بعد، اس کے خیالات میں انقلاب پیدا ہو
جاتا ہے اور وہ اس وطنی عقیدت سے بیزار ہو کر "بلادِ اسلامیہ" "ترانۂ ملی" "خطاب بہ جوانانِ اسلام"، "شکوہ" اور "جواب شکوہ"
اور اس قسم کی سینکڑوں ملی اور خالص اسلامی نظمیں لکھتا ہے۔ اس اعتراض کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن
اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اقبال کے سیاسی فکر کی پختگی میں ان تجربات کا حصۂ کثیر بھی شامل ہے جو اُسے اوضاع و
اطوارِ عالم کے عمیق مطالعہ سے حاصل ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال ایک زمانے میں وطنیت اور قومیت کے موید
اور حامی تھے۔ لیکن ان کے یہ خیالات زیادہ تر اس کتابی علم اور مطالعہ پر موقوف تھے جو انہیں مغرب کے ایسے مصنفین
کی کتابوں سے حاصل ہوا جو عموماً قومیت اور وطنی عصبیت کو اپنے افکارِ سیاسی کا جزو لاینفک خیال کرتے ہیں۔ آج دنیا

کے اکثر اربابِ علم یورپ کے نظرفریب اور دل کو لبھا لینے والے تمدن سے اس قدر متاثر ہیں کہ یورپ کی ہر حجت کو حجتِ قاطع اور ہر خیال کو وحیِ ناطق سمجھتے ہیں۔ جو خیال یورپ سے اٹھتا ہے۔ قبول کر لیا جاتا ہے۔ جو بات یورپ کی زبان سے نکلتی ہے مشرق میں اس پر درست اور بجا کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ مولانا شبلی فرما گئے ہیں :۔

نکتۂ شرع بافسانہ برابر بہنی ۔۔۔ یورپ ار گپ زند آں نیز مسلم باشد

سچ تو یہ ہے کہ تہذیبِ فرنگ کی تابانی کے سامنے بڑے بڑے خودی آشنا اور خود آشنا بھی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ اقبال بھی چندے اس کے دام میں گرفتار رہے لیکن فلاسفۂ مشرق کے گہرے مطالعۂ اسلام اور مشرقی تمدن کی روح کے صحیح اور ملکِ یورپ کے سفر اور تمدنِ مغرب کے قریبی نظارے نے ان کو بہت جلد اس کی تابانی سے بدظن کر دیا۔

وائے بر سادگیٔ ما کہ فسونش خوردیم ۔۔۔ رہزنے بود کمیں کردو رہِ آدم زد

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اقبال نے جب تک یورپ کو نہ دیکھا تھا ان کے ذہن میں مغربی رجحان زیادہ تھا لیکن جب یورپ کو نزدیک سے دیکھا تو ان کے خیالات میں مغرب سے دُوری پیدا ہو گئی جو اب تک قائم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال ماہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ رائے بدل لیتے ہیں اور زمانے کے معمولی سے انقلاب کے ساتھ نیا راگ گانے لگتے ہیں۔ اقبال نے جب سے اپنے سیاسی افکار کے لئے ایک مرکز و محور تجویز کر لیا ہے اور گرد و پیش کی تمام عامل قوتوں اور ماضی و استقبال کے تمام سیاسی اور تمدنی مسائل پر غائر نظر ڈال کر اپنے لئے دائرۂ فکر معین کر لیا ہے، اس کے بعد ان کی ساری قوت، اُسی کی تبلیغ و اشاعت میں صرف ہو رہی ہے۔ زمانہ ہر لحظہ جو رنگ بدلتا جاتا ہے اور جو نیرنگیاں دکھلاتا ہے، اقبال ان پر اسی ایک زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں جو ان کے نزدیک معقول ترین، مناسب ترین اور صحیح ترین زاویۂ نگاہ ہے۔

اقبال کے سیاسی فکر کے مآخذ۔ اقبال کے سیاسی فکر کے نشو و ارتقا کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے چمنِ فکر کی آبیاری کے لئے کن کن سرچشموں کی جانب التفات کیا ہے اور ان کے تخیل کو موجودہ قالب میں ڈھالنے میں کون کون سے زبردست اثرات کارفرما ہوئے ہیں۔ مغربی نقاد اور بعض مشرقی دوست عموماً فرمایا کرتے ہیں کہ اقبال نے بہت حد تک ولیم بلیک، نیٹشے اور برگساں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے اس قول کی بنیاد صرف اس مفروضے پر ہے۔ کہ اقبال اور نیٹشے، یا اقبال اور برگساں میں، بعض معاملات میں اتحادِ خیال پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف معمولی سی وحدتِ خیال اس امر کے لئے ایک محکم ثبوت نہیں بن سکتی کہ اقبال نے تمام تر خیالات ان فلسفیوں سے لئے ہیں۔ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ اقبال بہت حد تک، مغربی تخیل سے نفور ہیں لیکن اس کے باوجود بعض مغربی مفکرین کے

ساتھ ان کو بعض معاملات میں اتحادِ خیال ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا ایک خاص زاویۂ نگاہ ہے۔ جس کی رو سے انہیں نیٹشے اور برگساں کا اندازِ خیال پسند ہے جس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان دونوں کے افکار میں اقبال کو اپنے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی مزید توضیح اس بات سے ہو سکتی ہے کہ اقبال کو نیٹشے اور برگساں سے بعض اہم معاملات میں اختلاف ہے جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں اور جنہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ اقبال کی کتابوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اقبال پر مولانائے روم کا کتنا زبردست اثر ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی تازہ تصنیف جاوید نامہ میں مولانائے روم کو اپنا اسی طرح رہنما تسلیم کرتے ہیں جس طرح دانتے نے ورجل کو اپنا رہنما تسلیم کیا تھا۔ یہ بات بلا خوف تردید پیش کی جا سکتی ہے کہ اقبال نے پیرِ روم کے فکرِ روشن سے جس قدر روشنی حاصل کی ہے اتنی کسی اور گوشے سے انہیں دستیاب نہیں ہوئی۔

بیا کہ من زخُمِ پیرِ روم آوردم ؎ مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی ست

البتہ یہ ضرور ہے کہ مشرق اور مغرب کے علوم کے امتزاج نے، اقبال کو اپنے لئے ایک نئی اور مستقل شاہراہ اختیار کرنے میں مدد ضرور دی ہے کہ عجمی تفلسف اور تصوف کو مغربی دانش و حکمت کے معیار پر پرکھا اور پھر ان کے مقابلے اور توازن سے ایک معتدل اور زندہ حکمت پیدا کی جس پر مغرب کے بجائے مشرق کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خود اقبال لکھتے ہیں[1]:-

"مقامِ تاسف ہے کہ مغرب اسلامی فلسفہ سے اس قدر ناآشنا ہے کہ مجھے اگر اس بحث پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی فرصت ہوتی تو میں یورپ کے فلاسفہ کو بتلا سکتا کہ ہمارے اور ان کے فلسفہ میں کس بڑی حد تک اشتراک ہے۔ پھر فرماتے ہیں:-

"میرا جو فلسفہ ہے وہ قدیم مسلمان صوفیہ و حکماء ہی کی تعلیمات کا تکملہ ہے۔ بلکہ بالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہیئے کہ یہ جدید تجربات کی روشنی میں قدیم متن کی تفسیر ہے۔"

اقبال کا پیغام سیاسی ہے یا اخلاقی؟ تمہیدی مباحث میں سے اب صرف ایک بحث باقی ہے جس کی طرف اشارہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اقبال کا پیغام، ایک خالص سیاسی حیثیت رکھتا ہے یا اس کی بنیادیں اس سے بھی زیادہ گہری اور عمیق انسانی فطرت پر رکھی گئی ہیں؟ عام طور پر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے "کہ اقبال کا کلام تمام تر ایک جارحانہ سیاسی مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے فلسفیانہ اشعار اور شاعرانہ غزلیات کا مفہوم بھی سیاسی ہے۔ یہ بقول مسٹر ڈکنسن کے ایک شگونِ نحس ہے جو فساد، ہلاکت اور خونریزی کا پتہ دیتا ہے۔"

---

[1] معارف اکتوبر ۱۹۳۱ء ص ۲۰۹ (ماخوذ از رسالہ Quest)

حقیقت یہ ہے کہ استعمار پسند یورپ جب مشرقی اقوام میں زندگی اور احساس کی معمولی سی علامت بھی دیکھ پاتا ہے تو اس کے جسم پر ایک ارتعاش کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن مرعوب ہو جاتا ہے اور مشرق کی مظلومیوں کے ردِ عمل کا تخیل ایک انتقام کا کابوس بن کر اس کے دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے جب مشرق کو متحد ہونے کی دعوت دی تو یورپ نے اس جنبش اور اثرِ زندگی کو ایک خوفناک تحریک کی شکل میں پیش کیا اور خود ہی موہوم خطرے کی خیالی تصویریں بنا بنا کر، اس کو ایک مہیب صورت دے دی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے کہ مغرب ان زنجیروں کو ذرا زیادہ سخت اور گراں کر دے جن سے اس نے مشرق کی جانِ ناتواں کو جکڑ رکھا ہے۔ نکلسن ہوں یا فارسٹر یا ڈکنسن انہیں مشرق سے ایک ایسی گونج سنائی دی جو فطرتِ انسانی کے عمیق اور پختہ ادراک پر مبنی ہے۔ جس کا اثر یقینی طور پر بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ مشرق زندگی کے اس احساس سے بہرہ ور ہوگا۔ جس سے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہونا بے حد یقینی ہے اور جس کے اثرات دُوررس اور جس کے نتائج ہمہ گیر ہوں گے۔ مغرب اپنی کم نگہی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اقبال کا پیام سیاسی ہے۔ لیکن یہ خیال اس کے محدود اور زنگ تخیل کی پیداوار ہے جس کا طول وعرض صرف "مادّیت" ہے۔ حالانکہ اقبال کا منتہائے نظر ربابِ حیات کے ان تاروں کو چھیڑنا ہے جو ارضی نہیں بلکہ آسمانی ہیں۔ جو صرف آب وگِل اور مادہ کی بستی کو متاثر نہ کریں گے بلکہ روح کی اقلیم کو مسخر کریں گے۔ ان کا اثر جغرافیہ اور تاریخ کی زمینی حدبندیوں سے کہیں زیادہ قلوب کی پہنائیوں پر ہوگا۔ اقبال خود اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"میں اس کشمکش کا جو مفہوم لیتا ہوں وہ اصلاً اخلاقی ہے نہ کہ سیاسی۔ درآں حالیکہ نیٹشے کے پیش نظر اس کا سیاسی نصب العین ہے"

پھر پیام مشرق کے دیباچے میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

"اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لایغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنی فارسی تصنیفات میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے" اقبال نے جن اندرونی گہرائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان سے مراد وہ کلچرل اور اخلاقی انقلاب ہے جو اقوام کے شعور کو تبدیل کرتا ہے اور ان کے ضمیر کو ایک ایسے قالب میں ڈھالتا ہے جس سے "خودی" کے راگ نکلتے ہیں۔ اس کے لئے "کش مکش" کا عمل ضروری ہے اس نکتے کی وضاحت کے لئے میں یہ عرض کروں گا کہ اقبال نے مسلسل اور پیہم مغرب کے کلچر اور تمدن

کی اس بنا پر مخالفت کی ہے کہ اس میں عقل "Intellectualism" اور مادّیت کے عناصر اصولی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے اقبال، اپنے تمام کاموں کی بنا عشق پر رکھتے ہیں اور اسی ایک چیز کو کائنات کی ترقی اور صحت کا باعث سمجھتے ہیں۔ مغربی کلچر کے تمام شعبوں کے خلاف اقبال کو جو شکایت ہے وہ یہی ہے کہ اس کے تمام شعبے، اسی مرضِ مادیت و عقلیت کے جراثیم سے متاثر ہیں جن کی بدولت تہذیب یورپ کا وجود روز بروز کمزور ہو رہا ہے۔ مشرق جو خود فراموشی کے عالم میں ہے، جب انہی مہلک جراثیم سے متاثر ہوتا ہے تو اقبال کو رنج ہوتا ہے۔ ان کے دل میں بیقراری اور اضطراب کے طوفان پیدا ہوتے ہیں۔ یہ طوفان کچھ تو اشکوں اور کچھ نالوں کی صورت میں زبان اور آنکھوں سے منظرستانِ عالم میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہی نالے ہیں جو پیامِ مشرق، بانگِ درا، جاوید نامہ اور زبورِ عجم کا محسوس جامہ پہن کر باہر آتے ہیں اور دنیا کو متاثر کرتے ہیں۔ ان سب میں ہم اقبال کو مغرب کی مادہ پرستی اور روحانیت سے بیگانگی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اقبال کی نظر مغرب کے سیاسی استیلا اور ملک گیری پر بھی رہتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اسے مغرب کی روحانی علالتوں اور اس کی تہذیب میں اخلاقی عنصر کی کمی دیکھ کر رنج ہوتا ہے اور اقبال یہ دیکھ کر رنج میں ڈوب جاتا ہے کہ سادہ لوح مشرق بھی مغرب کے روحانی امراض سے متاثر ہو رہا ہے۔

غرض اقبال کے پیغام کا مقصد دوگانہ ہے۔ اولاً یہ کہ وہ مشرق کو اس روحانی بیماری سے بچائے دوم یہ کہ یورپ کو اس مرضِ مہلک سے آگاہ اور خبردار کرے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ پیامِ مشرق کے باب "نقش فرنگ" سے خوب واضح ہوگا جس کے کچھ اشعار یہاں لکھتا ہوں:-

ازمن اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود ست گرفتار ترست
برق را این بجگر می زند آں رام کند — عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار ترست
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تراست
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری — عجب اینست کہ بیمارِ تو بیمار تر است
دانش اندوختۂ دل زکف انداختۂ — آہ ازاں نقد گراں مایہ کہ در باختۂ

زبورِ عجم میں فرماتے ہیں:-

یک ذرّہ و دردِ دل از علم فلاطوں بہ — بر عقلِ فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ

یہ اور اس قسم کے ہزاروں اشعار، اسی ایک امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اقبال کو یورپین کلچر کی روح سے سخت نفرت ہے۔ یہ نفرت لینن، ایچ۔ جی۔ ویلز اور برنارڈ شا کی نفرت سے جداگانہ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہنوز اس نسخۂ شفا

کی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کاش مغرب اقبال کی آواز کو سن سکے۔ لیکن اگر مغربیوں کو اپنی موہوم بلندی اور تفاخر کا خیالِ باطل ایک مشرقی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے مانع آئے تو پھر وہ اپنے ہی ایک ہموطن برگساں سے ان علالتوں اور پریشانیوں کا علاج دریافت کریں جو اقبال کی زبان میں یہ کہتا ہوا سنائی دے گا۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است ۔۔۔ عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

اقبال کے فلسفۂ سیاست کے اہم اجزا

ان گذارشات کے بعد میں اقبال کے فلسفۂ سیاست کے اہم اجزا کی طرف توجہ کرتا ہوں۔

ایک کامل سوسائٹی۔ اقبال کا سب سے بڑا سیاسی تخیل یہ ہے کہ وہ ایک زندہ اور بہمہ وجوہ کامل سوسائٹی کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے جو موجودہ قوانین، موجودہ اندازِ خیال، موجودہ جذبات اور ارادوں سے بالکل جدا ہوگی۔ جس کے سب افراد، مافوق الانسان ہوں گے جو خدائے لم یزل کے زیادہ قریب ہوں گے۔ یہ نئی سوسائٹی، مساوات، اخوت، اور یک جہتی کا زندہ نمونہ ہوگی اور اس میں مادّیت اور عقلیت سے پیدا شدہ خرابیاں بہت کم ہوں گی۔ اقبال کے خیال میں ایسی زندہ اور باعمل جماعت، کسی ایسے نظام کی بنیادوں پر اٹھے گی جو اپنے زاویۂ نگاہ میں مغربی اقوام کی طرح تنگ نظر اور کوتاہ بیں نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا تصور، انسان اور کائنات کے متعلق زیادہ وسیع، زیادہ آزادانہ اور زیادہ روحانی ہوگا۔ اس وقت دنیا میں جس قدر ترقی پذیر نظامِ معاشرت وسیاست موجود ہیں۔ اقبال ان میں اسلامی نظام کو اپنے خاص نصب العین اور اپنے خاص تصورِ ملت کے قریب تر سمجھتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال ایسے فلسفی اور مفکر کا کسی خاص جماعت اور قوم کو یوں سراہنا، بادی النظر میں اکثر لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ یورپ اور ہندوستان کے بعض معترضین کو اقبال کی یہ بات سخت ناپسند بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسٹر ڈکنسن فارسٹر اور نکلسن اس تصور پر بہت چین بجبیں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسا خود اقبال اپنے ایک مقالے میں وضاحت فرما چکے ہیں۔ ان کا یہ تخیل کسی اندھی اور جامد تقلید اور خوش اعتقادی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ عملی سہولتوں اور نظامِ اسلامی کے اندر ترقی پذیر ممکنات کی موجودگی نے انہیں اس یقین پر مجبور کر دیا کہ وہ دنیا کے بے شمار نظام ہائے زندگی میں سے اپنی زندہ اور کامل سوسائٹی کی تعمیر کے لئے صرف اسلام ہی کو بطورِ بنیادِ عمل اپنے پیشِ نظر رکھیں۔ اقبال نے اپنی ساری تصانیف میں "ملتِ اسلام" کو صرف اپنے ہی خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جابجا، اس قوم کو مستقبل کی بہترین قوم قرار دیا ہے۔ سب سے بڑی دلیل جو اس سلسلے میں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں وسیع ترین انسانی برادری اور قوم کا جو خیال "ملتِ اسلام" نے پیش کیا ہے وہ کسی اور نظام اور گروہ میں نہیں ملتا۔ اسلام کی حدود بہت وسیع ہیں۔ اس کی ماہیت غیر محدود اور لاانتہا ہی ہے۔ اس کا

وجود زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہے اور جیسا کہ اقبال خود فرماتے ہیں[۵] "اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے"۔ اسلام کی قومیت کا تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ اس کا اصل اصول مظاہر کائنات کے متعلق ایک ایسا اتحادِ خیال ہے جو سب انسانوں کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو سکتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کے ماننے والے افریقہ کی کالی دنیا سے متعلق ہیں یا ریگستانِ بطحا کے شجاع عرب۔ گنگا کی وادیوں میں بسنے والے آریا ہیں یا پامیر کے بلند کوہساروں کے مکیں۔ کوئی زمینی قید ان میں تفرقہ نہیں ڈال سکتی۔ کوئی مادی جدائی، ان کو جدا نہیں کر سکتی اور کوئی نسل یا زبان کا امتیاز ان میں باہمی امتیاز کا باعث نہیں ہو سکتا یہی معاشری قانون ہے جس کی وسعت اور ہمہ گیری کا اقبال کو یقین ہے اور یہی نکتہ ہے جسے اقبال سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

انہی خیالات کو اقبال رموزِ بیخودی میں اپنے دلکش انداز میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر کہ چونکہ ملتِ اسلام کا دار و مدار توحید و رسالت پر ہے۔ اس لئے مکان (Space) کے نکتۂ نگاہ سے وہ لا انتہا ہے آپ فرماتے ہیں[۶]:-

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست ۔ بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست ۔ رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست ۔ مرز و بومِ او بجز اسلام نیست

از وطن آقائے ما ہجرت نمود ۔ عقدۂ قومیتِ مسلم کشود
بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد ۔ حکمتش یک ملتِ گیتی نورد
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں ۔ تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو ۔ یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

اقبال کے اس خیال کا یورپ میں زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا لیکن با ایں ہمہ عصبیت، یورپ میں ایسے اہل دل موجود ہیں جو ان افکار کی درستی کے قائل ہیں۔ مثلاً پروفیسر ہرگرونجے نے اسلام اور مسئلہ نسل پر مضمون لکھتے ہوئے ان تمام امور کا اعتراف کیا ہے اور ان کے علاوہ بے شمار دوسرے اہلِ قلم نے اسلام کی اس برتری کا اقرار کیا ہے۔

ملتِ اسلام جس طرح مکانی لحاظ سے لامحدود ہے اسی طرح زمانی معیار سے بھی اس کی کوئی مقرر حد نہیں چنانچہ رموز میں لکھتے ہیں[۷]:-

گرچہ ہم ملت بمیرد مثلِ فرد ۔ از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد
امتِ مسلم ز آیاتِ خداست ۔ اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست

---

[۵] ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ص ۹ [۶] رموز۔ ۴۵ [۷] رموز ۔ ۵۳ و مابعد

ازاجل ایں قوم بے پرواستے استوار از نحن نزلنا ستے
ما کہ توحید خدارا حجتیم حافظ رمز کتاب و حکمتیم
آسماں با ما سر پیکار داشت در بغل یک فتنۂ تاتار داشت
خفتہ صد آشوب در آغوش او صبح امروزے نزاید دوش او
سطوت مسلم بخاک و خوں تپید دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخ کج رفتار پرس زاں نو آئین کہن بنیاد پرس
آتش تاتاریاں گلزار کیست شعلہ ہائے او گل دستار کیست؟
گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما گلستان میرد اگر میریم ما

شعلہ ہائے انقلاب روزگار چوں بباغ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست رونق خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند استخوان او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بودست و ہست ملت اسلامیاں بودست و ہست
عشق آئین حیات عالم است امتزاج سالمات عالم است
عشق از سوز دل ما زندہ است از شرار لا الٰہ پایندہ است

یہی حکمت کی باتیں جو آپ نے اشعار میں سنی ہیں۔ اقبال انہیں "مدراس لیکچرز"[لہ] میں پیرایۂ نثر میں ادا کرتے ہیں یہ خیال کہ ملت اسلام کا زمان کے نکتۂ نظر سے کوئی محدود انجام نہیں اس وقت تک صحیح شکل اور قالب نہیں اختیار کرسکتا جب تک اس کے قوانین کی ہر زمانے میں نئی تعبیر و توجیہ نہ کی جائے۔ صرف اصول، اسلامی نظام کو فرسودہ پرانا اور ناقابل عمل ہونے سے بچا سکتا ہے۔ اور اسی کی بدولت اسلام انسانی معاشرت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک، یہ چیز اسلام کا اصول "اجتہاد" ہے" جو مفکرین کو نئے نئے مسائل کے حل اور مختلف معاملات میں اصول شریعت کی زمانی تعبیر کا اختیار دیتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال "عالمان کم نظر" کے اجتہاد کے مخالف اور ہر کہ و مہ کے اجتہاد کو ملت کے لئے بے حد مضر سمجھتے ہیں۔

غرض یہ وہ آئیڈیل سوسائٹی ہے جس کی تعمیر اقبال کی زندگی کا مقصد رہے۔ ڈاکٹر نکلسن جنہوں نے اسرار کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ شکایت کرتے ہیں کہ ان خیالات میں اقبال ایک پرجوش مذہبی مسلمان معلوم ہوتے ہیں نہ کہ فلسفی۔ ادھر ان کا ہر قول و ہر خیال ایک مسلمان کا قول اور خیال معلوم ہوتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ مسٹر نکلسن کے اس قول کی تائید کروں یا تردید۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں مجھے مشکل معلوم ہوتی ہیں حق تو یہ ہے کہ ڈاکٹر نکلسن جب ان خیالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے سامنے یکایک موجودہ زمانے کی مسلمان سوسائٹی آجاتی ہو حالانکہ اقبال کی نگاہ مذہب اسلام کی اُن ممکنات اور ترقی پذیر عناصر پر ہے جو اسلام کی فطرت میں موجود ہیں۔ مگر انہیں پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا اور کوئی تعجب نہیں کہ خود بقول اقبال کے مسلمانوں کی فتوحات ہی اس کے راستے

لہ. Lecture on the "Principles of movement in the Structure of Islam."

میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہوں حقیقت میں "اسلام" کائنات کے ضمیر میں ہنوز ایک تخیل کا درجہ رکھتا ہے اور فطرت کی قوتیں اپنے عمل اور ردِّ عمل سے اس "تخیل" کو وجود کی شکل دے رہی ہیں۔ ع

ہنوز اندر طبیعت مے خلد موزوں شود روزے

اقبال کے اس "تصورِ ملت" پر عموماً اعتراض کیا جاتا ہے کہ اصولی طور پر تو اقبال کا فلسفہ عام ہوتا ہے لیکن اس کو ایک خاص قوم سے وابستہ کر دینا تنگ نظری ہے۔ اس کا جواب خود اقبال کی زبانی سننا چاہئیے:۔

"شاعری اور فلسفہ میں انسانی نصب العین ہمیشہ عالمگیر ہوتا ہے لیکن جب اس کی تحصیل عملی زندگی میں کی جائے گی تو لامحالہ اس کا آغاز کسی مخصوص جماعت سے کرنا ہوگا جو اپنا ایک مستقل اور مخصوص موضوع رکھتی ہو اور جس کے حدود میں تبلیغ عملی و لسانی سے وسعت ہوسکتی ہو۔ یہ جماعت میرے عقیدے میں اسلام ہے۔

طوالت کے خوف سے اس سوسائٹی کے مختلف ترکیبی اجزا پر مفصل تبصرہ نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم مختصراً اہم مباحث کی طرف اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

انسان کامل۔ اقبال کے نزدیک ایسی سوسائٹی کے لئے ویسے ہی آئیڈیل (مثالی) افراد کی ضرورت ہے جو اس نظام کو کامیاب بنائیں گے۔ یہ آئیڈیل افراد ایسے ہوں گے جن میں "خودی" کی تکمیل ہو چکی ہوگی۔ خودی اقبال کے نزدیک ایک "نوری نقطہ" ہے۔ جو محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی محبت، خودی کی تکمیل کا باعث ہوگی اور یہی خودی ان افراد میں بے خوفی اور مردانگی پیدا کرے گی۔ خودی نظامِ عالم کی بنیاد ہے جس کے بغیر عناصر ترکیب نہیں پا سکتے۔

خیزد انگیزد فند تابد دمد سوزد افروزد خرامد پر زند
می شود از بہرِ اغراضِ عمل عامل و معمول و اسباب و علل
خفتہ در ہر ذرۂ یزدی خودی ست
وانمودن خویش را خوئے خودی ست

چونکہ زندگی "خودی" کی تکمیل سے ہے اسی لئے سختی اور سخت کوشی، استواری اور طاقت، زندگی کی ضروریات میں سے ہیں۔ افراد جس قدر کش مکش اور تحمل و برداشت کے عادی ہوں گے اسی قدر ان میں خودی کی تکمیل زیادہ ہوگی لیکن خودی کے تسلسل اور بقا کے لئے مقاصد اور نصب العین کا ہونا ضروری ہے کیونکہ زندگی جستجو میں مسلسل میں پوشیدہ ہے۔ آرزوؤں اور کوششوں کا نام کامیاب زندگی ہے۔ جب تک آرزو اور مقاصد کو حاصل کرنے کا جنون نہ ہوگا زندگی پختہ تر نہ ہوگی [۱]

اصل او در آرزو پوشیدہ است
زندگی در جستجو پوشیدہ است
غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات
چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند
شہپرش بشکست و از پرواز ماند

---

[۱] معارف (محولہ بالا) ماخوذ از Quest ص ۵۴ اسرار ۲۱

اقبال ان سب اثرات کا سخت مخالف ہے جو خودی کو ذرا بھی کمزور کرتے ہیں وہ افلاطون کے گوسفندانہ فلسفہ کو اسی لئے ناپسند کرتا ہے کہ اس نے زندگی کا انجام موت کو قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسی تعلیم خودی کو کمزور کرتی ہے۔ اور خودی کو کمزور کرنے کا حربہ ان اقوام نے ایجاد کیا ہے جو خود کمزور ہیں اس لئے ان کی خواہش ہے کہ طاقتور بھی کمزور ہو جائیں۔ اقبال نے ایسی تعلیم کی قباحتوں کو ایک حکایت کے ضمن میں بیان کیا ہے جس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ ایک شیر نے بکریوں کے اسی قسم کے خودی کُش وعظ سے متاثر ہو کر گوشت کھانا ترک کر دیا تھا جس کے معنی "شیر" کی موت اور تباہی کے بغیر کچھ نہ تھے۔

از علف آں تیز دندان کند شد	آنکہ کردے گوسفنداں را شکار
کرد دینِ گوسفندی اختیار	ہیبت چشم شرر افشاں نماند
آں جنون کوشش کامل نماند	با پلنگاں سازگار آمد علف
گشت آخر گوہر شیرے خزف	آں تقاضائے عمل در دل نماند

شیر بیدار از فسونِ میش خفت | انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

نیٹشے کی طرح اقبال بھی استیلا، قوت اور جہاد کو خودی کی تربیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نیٹشے کہتا ہے "نیکی قوت اور ہمتِ مردانہ کا نام ہے بلکہ ہر اس شے کا نام ہے جو انسانوں میں استیلا اور قوت کے جذبات کو ترقی دے۔ اور بدی ہر وہ چیز ہے جو کمزوری سے پیدا ہو" اقبال جہاد کو زندگی کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں لیکن کونسا جہاد۔ ساری دنیا کو غلام بنانے کے لئے نہیں بلکہ خدائی کلمہ کی تبلیغ کے لئے۔ جوع الارض اور دنیا کی تسخیر کا جہاد اقبال کے نزدیک حرام ہے۔

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید | تیغِ او در سینۂ او آرمید

اس جہاد کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اقبال کا منتہا مادّی قوت نہیں بلکہ روحانی قوت ہے جیسا کہ خود اقبال ایک مقام پر کہتے ہیں :-

"جدید سائنس سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ قوتِ مادّی کا ہر سالمہ ہزار سال کے ارتقا کے بعد اپنی موجودہ ہیئت تک پہنچا ہے۔ اس پر بھی اُسے دوام نہیں اور وہ انحلال قبول کر لیتا ہے بالکل یہی حال روحانی قوت کا ہے یعنی فردِ انسانی بے شمار فرقوں کے تنازع اور جدوجہد کے بعد اس مرتبے تک پہنچا ہے اور پھر بھی آسانی کے ساتھ انحلال قبول کر لیتا ہے۔ . . . . اس لئے اگر اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے تو لازم ہے کہ گذشتہ زندگی میں جو تجربات حاصل ہوئے ہیں اور ماضی میں جو قوتیں اس کے ثبات میں مددگار ہوئی ہیں۔ ان سے مستقبل میں بھی کام لیتا رہے اس سے معلوم ہوگا کہ میں نے تنازع اور جنگ کی ضرورت جس مفہوم میں تسلیم کی ہے اخلاقی ہی ہے"۔

جہاد کے بعد خودی کی تربیت کے لئے تین مرحلے ہیں۔ اطاعت ضبطِ نفس۔ اور نیابتِ الٰہی

قطرہا دریاست از آئینِ وصل | ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل

باطنِ ہر شئے ز آئینِ قوی   تو چرا غافل ازیں ساماں روی

جب ایک فرد اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل طے کر چکتا ہے۔ تو پھر وہ نیابتِ الٰہی کی منزل میں آپہنچتا ہے۔ اقبال اس پختہ عنصر فرد کامل کو نائب حق کا خطاب دیتے ہیں جس کی عقیدت سے ان کا دل سرشار ہے۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است   بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است   ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است   ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است   از جلالِ او نجاتِ عالم است

از رموزِ جزو و کل آگہ بود   در جہاں قائم باَمر اللہ بود   زندگی را مے کند تفسیرِ نو   مے دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر   ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر   طبعِ فطرت عمرہا در خوں تپد   تا دو بیتِ ذاتِ او موزوں شود

مشتِ خاکِ ما سرِ گردوں رسید   زیں غبار آں شہسوار آید پدید

اقبال اس مردِ میدان کا شدت سے انتظار کرتے ہیں جس کا وجود اطاعتِ کامل اور ضبطِ نفس کی تمام قیود اور امتحانوں سے کامیاب ہو کر اس درجے تک پہنچا ہے۔ فرماتے ہیں:-

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا   اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا   خیز و قانونِ اخوت ساز دہ   جامِ صہبائے محبت باز دہ

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو   در سوادِ دیدہ ہا آباد شو   باز در عالم بیار ایامِ صلح   جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

شورشِ اقوام را خاموش کن   نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن   سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر   از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

از وجودِ تو سرافرازیم ما   پس بہ سوزِ ایں جہاں سازیم ما

"یہ نائبِ حق" کا تخیل اقبال کا نیا تخیل نہیں بلکہ مشرق و مغرب کا پرانا تخیل ہے نیٹشے کا "مافوق الانسان" کارلائل کا ہیرو اور گوئٹے کا Superman اسی قسم کے افراد ہیں۔ نیٹشے اور اقبال میں جو وحدت پائی جاتی ہے اس سے بعض مغربی نقادوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اقبال نے انسانِ کامل کا خیال اسی جرمن فلسفی سے مستعار لیا ہے۔ حالانکہ اقبال خود فرماتے ہیں کہ[1]:-

میں نے یہ خیال نیٹشے سے نہیں لیا بلکہ تصوف کا "انسانِ کامل" آج سے بیس سال قبل میرے پیشِ نظر رہا ہے۔ انگریزوں کو اپنے ایک ہموطن فلسفی الیگزینڈر کے خیالات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن ہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ الیگزینڈر کے خیال میں حقیقتِ منتظر ایک خدائے ممکن الوجود کی شکل میں جلوہ گر ہوگی۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ شانِ الٰہی ایک برتر انسان کے قالب میں جلوہ گر ہو کر رہے گی":-

اقبال نے تصوف کے جس انسانِ کامل کی جانب اشارہ کیا ہے وہ محی الدین ابن عربی اور ابراہیم الجیلی

---

[1] معارف (حوالہ بالا) ماخوذ از Quest

کا "انسان کامل" ہے۔ افسوس کہ اندیشۂ طوالت مانع ہے۔ ورنہ یہ بتایا جاتا کہ ابراہیم جیلی کا "انسان کامل" اقبال کے نائبِ حق سے بہت مختلف ہے۔ اس کا مفصل حال اقبال کی کتاب "فلسفۂ عجم" اور نکلسن کی کتاب "Studies in Islamic mysticism" میں ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اجمالاً مگر وضاحت کے ساتھ اقبال کی کامل سوسائٹی اور "کامل انسان" کا حال آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ جس کی بعض تفصیلات کو دانستہ ترک کر دیا گیا ہے۔ ساری کی ساری تصنیفات میں اقبال اس کامل سوسائٹی کے بلند مقاصد کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں نہ صرف تخیل اور فلسفہ ہی میں بلکہ اپنی مختصر سی عملی سیاست کی زندگی میں بھی انہوں نے ایسے خیالات اور افکار کی پرجوش مخالفت کی ہے جو انہیں ذرا بھی اس خاص نصب العین کے لئے مضرت رساں نظر آئے۔ اقبال شروع سے لے کر آج تک اس زندہ سوسائٹی کی کامیابی کے متعلق ایمان اور ایقان رکھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خاکی مگر خودی آشنا افراد ایک دن فرشتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے ۔۔۔ زمین از کوکبِ تقدیر ما گردوں شود روزے
یکے در معنئ آدم نگر از من چہ مے پرسی ۔۔۔ ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے ۔۔۔ کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے

اقبال کا نظریۂ حکومت و خلافت:۔ حکومت اور خلافت کے متعلق اقبال نے بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا تاہم خلافتِ انسانی کے اہم اصول انہوں نے اپنی نظموں میں بیان کر دیے ہیں۔ اقبال ایک عادل اور موثر حکومت کے لئے ایمان اور عشق کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری ۔۔۔ یہ سب کیا ہے فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

حکومت اور سروری اقبال کے خیال میں خدمتگری کا دوسرا نام ہے لیکن انسان میں حقیقی اور بے لوث خدمتِ خلق کا مادہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ تا آنکہ تمام کاموں کی بنیاد عشق پر نہ رکھی جائے اور تمام امور میں یقین اور ایمان کی مشعل سے روشنی نہ حاصل کی جائے۔ گویا دوسرے الفاظ میں درویشی اور سلطانی کا اجتماع ہونا ضروری ہے۔ یہاں بھی اقبال اپنے "انسانِ کامل" کو فراموش نہیں کرتے اور حکمرانی کے لئے عشقِ مصطفےٰ کو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یہی عشق افرادِ قوم کو ایک نقطے پر جمع کر سکتا ہے اور اسی کی ذات کے ساتھ وابستگی اس پریشان شیرازے میں ایک نظم پیدا کر سکتی ہے پیام میں فرماتے ہیں:۔

زبور ۱۵۹

سروری در دینِ ما خدمتگری ست　عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری ست　آں مسلماناں کہ میری کردہ اند　در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در ہجومِ کارہائے ملک و دیں　با دلِ خود یک نفس خلوت گزیں　ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست　بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
روح را جز عشقِ او آرام نیست　عشقِ او روزیست کورا شام نیست

اقبال جس طرح باقی امور میں "عقلی" بنیادِ عمل کے مخالف ہیں اور عقلیت یعنی Intellectualism کو عالمِ انسانیت کے لئے بے حد مضر سمجھتے ہیں اسی طرح "نظریۂ سلطنت" میں بھی انہیں "عقلی" بنیاد سے خاص پرخاش ہے، کیونکہ جو قوانین عقلیت فرسودہ دماغوں سے وضع ہوں گے ان میں انسان کی خود غرضی اور انفرادپسندی کی چاشنی ضرور ہوگی اور ظاہر ہے کہ انسان، سوسائٹی اور اجتماعی امور میں اس لئے نہیں شامل ہوتا کہ اس سے اجتماع کو زیادہ مستحکم کرنا منظور ہوتا ہے بلکہ اس کے پیشِ نظر صرف یہ چیز ہوتی ہے کہ سوسائٹی کے تابع رہنے سے، اس کے خاص مفاد بہتر طریق سے محفوظ ہو سکتے ہیں[1] یہی وجہ ہے کہ آئین سب لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اور جو اقلیت غیر مطمئن ہوتی ہے وہ ان قوانین کے خلاف آواز بلند کرتی ہے پس اقبال کے نزدیک بصورتِ حالات چونکہ عقلیت کی مرہونِ احسان ہے اس لئے اس سے بچنا چاہئے اور اس کے بجائے 'وحی' کے دیئے ہوئے قوانین کی اطاعت کرنی چاہئے۔ جاوید نامہ[2] میں فرماتے ہیں :-

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام　نے غلام او را نہ او کس را غلام　وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس　ملک و آئینش خداداد است و بس　عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف　وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر　حاصلِ آئین و دستورِ ملوک　دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

مذہب اور حکومت۔ "دین اور سلطنت" کی پرانی بحث میں اقبال اسلامی طریقے کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک، مارٹن لوتھر مسیحیت کا سب سے بڑا دشمن تھا جس نے مذہب اور حکومت کو دو مختلف اور مستقل وجود قرار دیا ہے۔ آپ کے خیال میں مذہب اور حکومت کی مثال جسم اور روح کی ہے جن کا ربطِ باہمی، زندگی کے لئے ضروری ہے اور جن کا ایک دوسرے سے قطعِ تعلق، موت کے مرادف ہے۔ اقبال کے اس خیال کی اس زمانے میں شاید زیادہ تائید نہ ہو سکے لیکن خود یورپ میں سیاسیات کے مصنفین نے، سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ان مضامین پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں جن کا کامل اطلاق، ان حالات پر نہیں ہو سکتا جو اقبال کے پیشِ نظر ہیں۔ کیونکہ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کا مسیحی نظامِ حکومت و مذہب بالکل ایک خاص قسم کا نظام تھا جس میں پوپ اور بادشاہ دونوں کو یکساں طور پر جسمانی اور روحانی بزرگ تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن اقبال کی حکومت میں جسمانی اور روحانی کوئی دو جداگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک

1. The Ethical basis of the State, Wilde chapter iii, iv

[2] ص ۷۸

ہی شخص اور ایک ہی نظام میں دونوں ملی ہوئی ہیں۔ گلشن راز جدید[۵۱] میں لکھتے ہیں:۔

تن و جان را دو تا گفتن کلام است | تن و جان را دو تا دیدن حرام است
کلیسا سبحۂ پطرس شمارد | کہ با او حاکمی کارے ندارد
بدن را تا فرنگ از جاں جدا دید | نگاہش ملک و دیں را ہم دو تا دید
خرد را با دلِ خود ہمسفر کن | یکے بر ملتِ ترکاں نظر کن
بہ تقلیدِ فرنگ از خود رمیدند | میانِ ملک و دیں ربطے ندیدند

رموز[۵۲] میں فرماتے ہیں:۔

تا حکومت مسندِ مذہب گرفت | ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت
قصۂ دینِ مسیحائی فسرد | شعلۂ شمع کلیسائی فسرد

دورِ جدید میں ترکوں نے یورپ کی دیکھا دیکھی مذہب اور حکومت کو الگ کر دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ترکوں کی یہ تدبیر صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ اس نظریۂ حکومت کے خلاف ہے جس کی بنیاد عشق اور عشقِ مصطفےٰ پر ہے مصطفےٰ کمال نے یورپ کی اُس چیز کو جسے خود اہلِ یورپ اب پرانا سمجھتے ہیں نیا سمجھ کر اختیار کر لیا ہے حالانکہ مردِ مومن کو اپنی دنیا خود پیدا کرنی چاہیئے۔ مگر یہ قوتِ عمل صرف "عشق" ہی کی کارفرمائیوں سے ممکن ہو سکتی ہے جاوید نامہ میں لکھتے ہیں

ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست | تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

جمہوریت۔ اقبال یورپ کے جمہوری نظام کے متعلق بہت زیادہ حسنِ ظن نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ جمہوریت بھی، استبداد تسلط اور غلبۂ عام کی ایک نئی شکل ہے۔ اصولی طور پر اقبال حکومت میں عوام کی مداخلت کے زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتے اس لئے کہ ان کے نزدیک، عوام میں سے ہر فرد کو قدرت نے مصالحِ حکومت کو سمجھنے کی توفیق نہیں دی۔ آپ نے ایک زمانے میں خلافتِ اسلامیہ کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا تھا جس میں کسی حد تک انتخاب کے طریقے کی تعریف کی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات میں یک گونہ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ ایک نظامِ سیاست میں ایک کامل طور پر حساس فرد Personality کے قائل ہیں اور بیٹھے کی طرح زندہ اور طاقتور Personality کی حکومت کو زیادہ کامیاب اور مناسب خیال کرتے ہیں پیام میں آپ فرماتے ہیں:۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی | ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو | کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

روسو اگرچہ ایسی جمہوریت کا قائل تھا جس میں حریت، اخوت اور مساوات بطورِ اصل الاصول ہوں لیکن

---

[۵۱] ص ۲۱۷ [۵۲] ص ۹۴ [۵۳] جاوید نامہ ۲۷

جمہوریت کے اصولی نقائص کا اسے پورا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ ایسی طرزِ حکومت تو فرشتوں کی دنیا کے لئے مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہم انسان تو اس کے قابل نظر نہیں آتے۔" لیکن اب یورپ میں جمہوریت کے خلاف زبردست رائے پیدا ہوگئی ہے۔ اور بیسیوں کتابیں اس کی خرابیوں کو ظاہر کرنے کے لئے لکھی جا رہی ہیں۔

اقبال کو سب سے بڑی شکایت اس طرزِ حکومت سے یہ ہے کہ اس میں "قابلیت" نہیں بلکہ مقبولیت معیار ہے حالانکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص "قابل" ہونے کے بغیر مقبول ہو۔ اس پر اقبال کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جمہوریت گروہ بندی اور فرقہ پرستی کو ترقی دیتی ہے۔ لاسکی اگرچہ جمہوریت کی خوبیوں کا بے حد معترف ہے لیکن اسے بھی سب سے زیادہ اسی بات کا خطرہ ہے کہ یہ عوام کی مداخلت اور Franchise کی وسعت، فرقوں میں بے حد وسعت اور کثرت کا باعث ہو رہی ہے۔ جمہور کی آزادی کی لاکھ برکات ہوں مگر اس میں شبہ نہیں کہ جمہور کا یہ غلبۂ عام اور مطلق العنانی کسی نظام کو زندہ اور مستحکم نہیں ہونے دے گی۔ اور ارتقا کے فطرتی اور قدرتی طریق سے معاملات کی تکمیل کے بجائے انقلاب اور سریع الوقوع تغیرات، عام اور زیادہ ہو جائیں گے۔ گلشنِ راز[1] میں اقبال نے انہی نکات کی جانب اشارہ کیا ہے:۔

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است ‌‌ رسن از گردنِ دیوے نہاد است
گروہے را گروہے در کمین است ‌‌ خدائش یار اگر کارش چنین است
چو رہزن کاروانے در تگ و تاز ‌‌ شکمہا بہرِ نانے در تگ و تاز
زمن دہ اہلِ مغرب را پیامے ‌‌ کہ جمہور است تیغِ بے نیامے
نہ ماند در غلافِ خود زمانے ‌‌ برد جانِ خود و جانِ جہانے

ان اشعار کے ساتھ "خضرِ راہ" کے ان اشعار کو بھی سُن لیجئے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام ‌‌ جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ‌‌ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق ‌‌ طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں ‌‌ یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو ‌‌ آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

قیصر ولیم اور لینن کے مکالمے میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ انسانی طبیعت اطاعت پر مجبور ہے خواہ وہ ایک طاقتور فرد کی ہو یا ایک پارلیمنٹ کی۔ وہی خرابیاں جو مطلق العنان حکومتوں میں ہیں، وہی جمہوری اداروں میں بھی وارد ہو سکتی ہیں:۔

[1] ص ۲۲۳

گناہِ عشوہ و ناز بتاں چیست ‌ طواف اندر سرشت برہمن ہست
اگر تاجِ کئی جمہور پوشد ‌ ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
نماند ناز شیریں بے خریدار ‌ اگر خسرو نباشد کوہکن ہست[۵]

قومیت کا تصور۔ قومیت یا نیشنلزم کے متعلق اقبال کے عقاید اس قدر واضح اور صاف ہیں کہ ان پر طویل تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ جو لوگ اقبال کے نقطۂ نظر کے مطابق عالمگیر برادری اور وسیع انسانی اخوت کے تخیل کو سمجھتے ہیں وہ اقبال کو نیشنلزم کی اس شدید مخالفت میں ضرور حق بجانب سمجھتے ہوں گے۔ خود یورپ اس فرقہ پسندی سے تنگ آچکا ہے اور اس جماعت تراشی سے بھاگ کر، جمعیۃ الاقوام کی تخئیل میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے اگرچہ اقبال اس کی ان کوششوں کی کامیابی کے متعلق بھی یقین نہیں رکھتے۔ اور اس بظاہر یونیورسل نظام کو کفن چوروں کی انجمن کا خطاب دیتے ہیں، کیونکہ اس کا منتہا بھی وہی "مادّیت" ہے جس کے خلاف اقبال نے اپنی زندگی صرف کر دی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ لیگ آف نیشنز کی پے در پے ناکامیاں اور طاقتور اقوام کا اس کے نظام پر تسلط اقبال کو بدظن کر دیتا ہے اور اس بدظنی کے لئے اس کے پاس وجوہ موجود ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لیگ ابھی تک کمزوروں کی حفاظت نہیں کر سکی اور *Disarmament* یا تخفیفِ اسلحہ کی کوششیں بقول ریمزے میور *Armament* (اسلحہ اندوزی) پر ختم ہو رہی ہیں۔ لیگ کی اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب بھی نیشنلزم ہی ہے جس طرح کہ دورِ جدید کی اکثر لڑائیوں کا اصلی سبب نیشنلزم ہی تھا۔ ہندوستان کے اکثر حضرات جب اقبال کو نیشنلزم کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ بہت برہم ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غلط فہمی کی وجہ سے اقبال کے خیالات کا صحیح اور گہرا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اقبال نیشنلزم کی مخالفت اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں "آزادی" پسند نہیں کیا، یا وہ "غلامی" کو محبوب سمجھتے ہیں بلکہ اس کی محرک بعض اور چیزیں ہیں جن کے متعلق اجمالی طور پر آئیڈیل سوسائٹی کے ضمن میں بحث ہو چکی ہے افسوس کا مقام ہے کہ جس شخص نے عمر بھر افراد اور ملتوں کو "خودی" کا سبق پڑھایا، جس نے بندگی نامہ لکھ کر یہ ثابت کیا کہ بندگی اور زندگی دو مخالف چیزیں ہیں، جس نے انسانوں کو عام حریت، عام اخوت، عام انصاف، اور عام رواداری کا پیغام دیا اس کے متعلق مہربانانِ وطن اپنے دلوں میں یہ خیال جاگزیں کر لیں کہ اسے ان عام انسانی جذبات سے بھی نفرت ہے جو بقول "روسو" کیڑے میں بھی موجود ہیں اور جن کے بغیر کوئی سیرت مکمل نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک یونیورسلسٹ ہیں پس وہ ہر چیز جو اس خاص نصب العین سے ٹکرائے گی وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ یہی "یونیورسلزم" کی عام تبلیغ ہے جسے بعض دوست "پین اسلامزم" کے نام سے

[۵] پیام۔ ۲۵۰

تعبیر کر دیتے ہیں، حالانکہ اقبال ہیں اسلام ازم کو بھی ایک ناقص اور محدود تدبیر سمجھتے ہیں۔ یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ اقبال جابجا مسلمان اقوام کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور وطن اور نسل کے امتیاز سے دوری کی تعلیم دیتے ہیں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی تعلیم و تربیت کے صدقے میں صرف مسلمان اقوام ہی اس تعلیم کو بہ آسانی سمجھ سکتی ہیں۔ باقی اقوام نیشنلزم سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ اس یونیورسل اپیل کو "Utopia" سمجھیں گی یا اسے اپنے تسلط کے منافی سمجھیں گی۔

اقبال نیشنلزم کے ہر اُس تصور کا شدید مخالف ہے جس کا معیار وطن رنگ، نسل اور زبان ہو۔ رینان کا یہ مقولہ کہ "اسلام اور سائنس باہم متناقص ہیں" صحیح نہیں۔ کیونکہ اصل میں "اسلام اور نسلی امتیاز باہم متناقص ہیں" اقبال خود ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

"میں نے جب یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے۔ دنیائے اسلام پر بھی حاوی ہوتا جاتا ہے اور جب مجھے یہ نظر آیا کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت اور قومیت کے پھندے میں پھنستے جاتے ہیں تو بحیثیت ایک مسلمان اور محب نوع انسان کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ارتقائے انسانیت میں انہیں ان کے اصلی فرض کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس سے انکار نہیں کہ اجتماعی زندگی کے ارتقا اور نشوونما میں قبیلے اور قومی نظامات کا وجود بھی ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر ان کی اتنی ہی کائنات تسلیم کی جائے تو میں ان کا مخالف نہیں لیکن جب انہیں انتہائی منزل قرار دیا جائے تو مجھے ان کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں"

اس بحث کو زیادہ طول دینے کے بغیر میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ اقبال کے اُن سینکڑوں اشعار کی طرف مبذول کردوں جن میں اقبال نے نیشنلزم کی مخالفت کی ہے۔ اور دنیا کی سب سے بڑی قوم یعنی انٹرنیشنلزم بلکہ یونیورسلزم میں اعتقاد رکھنے والی قوم کو، ان جغرافیائی اور غیر فطری قیود سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہو۔ وطنیت کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں لکھتے ہیں :-

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔۔۔ تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ۔۔۔ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے ۔۔۔ قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اِن اشعار اور سینکڑوں دوسرے ترانوں کو ریمزے میور کی ایک مختصر سی کتاب The Political Consequences of War کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ان فقرات کی صداقت کا مزید یقین ہو جائے گا سوشلزم اور سرمایہ"۔ کے موضوع پر "اقبال" نے نہایت صاف انداز میں اظہار خیال کیا ہے

اقبال مزدور کا حامی ہے۔ سرمائے کی مضرتوں اور ناانصافیوں کا دردناک حال نہایت شیریں اور دلگداز نغموں میں ظاہر کرتا ہے۔ "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" اور خضر راہ کے معرکتہ آلارا بند میں جہاں سرمایہ دار کی شاخ نبات کا ذکر ہے اس بلیغ پیرایے میں مزدور کی محکومی اور مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں اقبال کو سوشلسٹ سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن اقبال جس طرح باقی تخیلات میں مستقل راہ اور رجحان رکھتا ہے اسی طرح اس معاملے میں بھی وہ اِن مسائل کو اپنے خاص نصب العین کے معیار پر پرکھتا ہے چنانچہ جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی کی زبانی جن اسرار کا اظہار کیا ہے وہ خاص غور کے قابل ہیں۔ افغانی پہلے تو یہ بتلاتے ہیں کہ قیصریت کی شکست، سود کی مذمت، زمین پر خدا کا قبضہ، تمام انسانی برادری کی مساوات وغیرہ میں مسلمان اور رُوسی متحد الخیال ہیں لیکن اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ روسی کے تصور کی بنیاد "شکم" پر ہے اور روح کی ترقی کے بجائے اس کا منتہائے نظر "جسم" ہے۔ روس کی تہذیب لاکھ مدح کے قابل سہی لیکن چونکہ اس میں "ذکرِ حق" کی کمی ہے اس لئے اس سے بھی احتراز لازم ہے۔ کارل مارکس کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۵]:۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
تا اخوت را مقام اندر دل است — بیخِ او در دل نہ در آب و گل است

اقبال سوشلزم کو وسیع انسانی برادری کی تعمیر اور ترکیب کے لئے اتنا مضر نہیں سمجھتے جتنا نیشنلزم کو۔ مگر سوشلزم کو بھی روحانیت کے بغیر ناقص خیال کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اب تک میں یہ ظاہر کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا ہوں کہ اقبال، موجودہ تمدن اور اس کے مختلف شعبوں میں کس قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ فرنگی تہذیب خود اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر رہی ہے اور مغرب خود اپنی ہی تلوار کے زخموں سے گھائل ہو رہا ہے۔ ایشیا تاریخ کے اس زبردست انقلاب کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اہلِ ایشیا کا فرض ہے کہ اس رستخیز میں دیدۂ بینا اور گوشِ شنوا سے کام لیں اور اپنے آپ کو ان مضرتوں سے محفوظ رکھیں جو یورپ کی ہلاکت کا باعث ہو رہی ہیں۔ جس طرح روسو اور والٹیر کا لٹریچر فرانس میں ایک زبردست تبدیلی اور ہیجان کا پیش رو تھا اسی طرح اقبال کا لٹریچر ایشیا میں ایک عظیم الشان ذہنی قیامت کا پیغامبر ثابت ہوگا۔ جس کے آثار روز بروز زیادہ روشن ہوتے جاتے ہیں۔

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک — بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند — جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

سید محمد عبداللہ

نین کٹاری

سُن تو سکھی میں تجھ پر واری مجھ کو دیکھ ہنسیں نر ناری

میں تو تن من دھن سب ہاری

ہردے لاگی نین کٹاری

کل اشنان کیا جو میں نے کوٹھا چھوڑ چڑھی اٹاری[1]

دیکھی صورت سانولی پیاری

ہردے لاگی نین کٹاری

ہاتھ سے میں نے بال نچوڑے کنگھی لے کے مانگ نکاری

پہن رہی تھی صندل ساری

ہردے لاگی نین کٹاری

سکھی بنا کچھ، تو جگ کھیلی نئی نویلی ہیں دکھیاری

مار گیو مو کو گردھاری

ہردے لاگی نین کٹاری

سید مقبول حسین
احمد پوری

[1] اٹاری کوٹھے سے اونچی جگہ زینے کی چھت

مادھوری

شریمتی جی نے ہنس کر کہا "ڈاکیا دو پتر دے گیا ہے۔ ایک بھگوانداس جی کا دوسرا ڈاکٹر ٹنڈن کا۔ میں نے جواب دیا اچھا ہُوا رات کی گاڑی سے ہم مسوری نہیں گئے۔ میں رام کشور کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا اُس کو ریل سے گرے ایک مہینہ ہونے آیا ڈاکٹر ٹنڈن کہتے تھے کہ چوٹ بھی معمولی آئی ہے لیکن وہ ابھی تک کاشی کیوں نہیں لوٹے۔ ڈاکٹر ٹنڈن کا خط یہ تھا:-

(ا)

از لکھنؤ۔ مورخہ ۳ مئی ۱۹۳۱ء

آپ کا خط ملا۔ معاف کیجئے جواب دینے میں دیر ہوئی۔ رام کشور کو زیادہ چوٹ آئی ہے تاہم جلد اچھا ہو جانے کی امید ہے لیکن مجھے سخت تعجب ہے۔ کہ وہ اس عمر میں زندگی سے کیوں اُکتا گیا ہے۔ ایک نامراد عاشق بھی اپنے محبوب کے التفات کے انتظار میں ایک طویل مدت کاٹ دیتا ہے محض اس خیال سے کہ کبھی نہ کبھی اس کے دل کی بات پوری ہوگی لیکن یہ ۲۸ سال کا لونڈا زندگی سے ایسا روٹھ گیا ہے کہ کسی طرح اس کا جی نہیں بہلتا۔ وہ اخبارات سے پنکھے کا کام لیتا ہے اور رسائل بوڑھے ملازم کے سر پر پھینک دیتا ہے۔ خطوط تو کبھی پڑھتا ہی نہیں اگر اس کی یہی حالت رہی تو خدانہ کرے کسی مہلک مرض کے ہو جانے کا اندیشہ ہے آپ از راہِ نوازش اس کو خط لکھتے رہیئے اسے یہ علم نہیں کہ میں اُس کی کیفیت آپ کو لکھ رہا ہوں۔ بسا اوقات تمام دن سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ اکثر الماری کی کتابوں اور رسائل سے غریب ملازم کے سر کی تواضع کرتا ہے اگر للو میرا پرانا ملازم نہ ہوتا تو یقیناً میرے گھر میں ملازم کا رہنا ایک دشوار امر تھا اور کیا لکھوں آج رات کی گاڑی سے میرٹھ جا رہا ہوں۔ واپسی پر ملنے کی کوشش کروں گا

میں نے سوچا کل مسوری جا کر سب سے پہلے رام کشور کو خط لکھوں گا پھر کوئی دوسرا کام کروں گا۔

(۲)

مسوری۔ مورخہ ۴ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

ڈاکٹر ٹنڈن کے خط سے یہ معلوم ہو کر کہ اب تمہاری حالت روبراہ ہے میری فکر دور ہوئی۔ وہ بڑے خلیق اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں تم کو بہت جلد پاؤں چلنا سکھا دیں گے۔ میرے اس خشک اور روکھے پھیکے خط سے تمہارا دل کیا بہلے گا۔ کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوتا تو پریوں کا تذکرہ کرتا۔ لیکن کیا کروں کرائے سے ۔لئے ہوئے اس بنگلے کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوں جس کی مالکہ ایک عیسائی عورت (مسز مکرجی) ہے۔ عمر تقریباً اسّی نوے سال ہوگی۔ آج کل اس کے پاس صرف ایک بھینجا ہے۔ سارا بنگلہ خالی پڑا ہے۔ سنا ہے دو تین دن میں دہلی سے مسز مکرجی کی بہن کی لڑکی جو وہاں کرسچین کالج میں پڑھتی ہے آنے والی ہے۔ اُس کی عمر چودہ سال کی ہے اور نام مادھوری ہے ایف اے میں پڑھتی ہے گذشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں اس کا چوتھا نمبر تھا۔

تمہاری بہن خط نہ لکھنے کے باعث تم سے سخت ناراض ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تم کو ان کا سلام نہ لکھا جائے۔ گو مجھے کاغذ سیاہ کرنے کی عادت ہے جلد اپنی خیریت کی اطلاع دو

شیام چرن

(۳)

از لکھنو مورخہ ۶ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے شیام چرن!

تمہارا خط ملا بھلا میں کیا اور میری ناراضی کیا۔ ٹانگ کا زخم اب مندمل ہوتا جا رہا ہے۔ سیتا جی کے بیاہ کو آج پندرہ برس ہوئے لیکن اس عرصہ میں مجھے پلنگ پر رات دن پڑے رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا البتہ اس سے پہلے بیمار ضرور ہوا تھا۔

لکھنؤ ایسے مقام میں بھی میری طبیعت نہیں لگتی مجھے چاروں طرف ویرانہ نظر آتا ہے۔ اس باغ میں جہنوب کوئی نیا چہرہ دکھائی نہیں دیتا بس للو مالی اور ڈاکٹر روزانہ آتے ہیں اور ہاں قریب کے قدِ آدم آئینہ میں ایک اور چہرہ نظر آتا ہے۔

یہاں شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ تم روز خط لکھا کرو کم از کم دوسرے روز تو ضرور لکھ دیا کرو مس مادھوری کے حالات لکھنا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ ہنوز تمہارا دل حسن کا شیدا ہے۔ سب باتیں تفصیل سے لکھنا، بال کتنے لمبے ہیں دانت کیسے ہیں، کس رنگ کا لباس پہنا کرتی ہیں وغیرہ۔ سیتا کو پیار۔ اگر تمہاری مادھوری دراصل مادھوری ہوئیں تو میں بھی بہت جلد اُن کو دیکھنے آؤں گا۔

رام کیشور

(۴)

مسوری ۔ مورخہ ۹ مئی

مس صاحبہ آگئی ہیں آج صبح درشن ہوئے۔ اُس وقت ہلکی گلابی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں اور پاؤں میں

قیمتی کا مدار ہوتا تھا۔ خانساماں سے میں نے دریافت کیا ہے، والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ گرمیوں میں اکثر مسوری میں رہتی ہیں ٹکٹ جمع کرنے کا بہت شوق ہے کوئی دو ہزار ٹکٹ جمع کرچکی ہیں ملازمین سے بہت اچھا برتاؤ کرتی ہیں ٹینس کھیلتی ہیں ناچ دیکھتی ہیں۔ بائبل پڑھتی ہیں۔ غرض بحیثیت مجموعی ایک حیرت انگیز ہستی ہیں۔

بس آج اسی قدر باقی کل۔ وجہ یہ ہے کہ میں آج مادھوری اور ان کی خالہ کے ساتھ سینما دیکھنے جارہا ہوں

شیام چرن

(۵)

مسوری مورخہ ۱۱ مئی

مادھوری ایک نہایت خوبصورت لڑکی ہے۔ ایشور تمہیں جلد اچھا کردے۔ تم خود دیکھ لوگے۔ جب ہنستی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا پھولوں کی بارش ہورہی ہے۔ ایسی حسین دوشیزہ میری نظر سے پہلے نہیں گذری۔ آنکھوں کی خوبصورتی کے متعلق کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ اُس کے خصائل متعجب کن ہیں۔

چودہ سال کی لڑکی میرے کمرے میں دوڑتی ہوئی آکر پوچھتی ہے "ورماجی آج کچھ ٹکٹ آئے" کبھی نگاہ نہیں اٹھتی حالانکہ میں بہت محتاط ہوں تاہم اگر یہی کیفیت رہی تو تعطیل کسی اور جگہ گذارنی ہوگی اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو جلد بھلے چنگے ہوکر آؤ۔

شیام چرن

(۶)

از لکھنؤ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے شیام چرن جی

بھگوان کے لئے اور دس بارہ دن مسوری ٹھہرو۔ میں بہت جلد اچھا ہوجاؤں گا۔ ٹانگ کا زخم مندمل ہوجانے میں دو تین دن کی کسر ہے۔ لیکن ابھی ڈاکٹر صاحب آٹھ دس روز نہیں اٹھنے دیں گے۔ کیا اس کی کوئی تصویر بھیج سکتے ہو یہ خط میں بہت عجلت میں لکھ رہا ہوں۔

رام کیشور

(۷)

مسوری مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

تار کے پارسل سے رس گلے اور امرتی بھیجو۔ بے تکلفی روز بروز بڑھ رہی ہے اس نے بتایا کہ اُس کا پہلا نام فیلس ہے فیلس مادھوری دت تم یہ معلوم کرکے خوش ہوگے کہ وہ رباب پر بہت عمدگی سے گاسکتی ہے اس سلسلہ میں آج میں نے تمہارا ذکر کردیا۔ کہنے لگی وہ کب تک آئیں گے۔ میں تو مہینے سوا مہینے میں چلی جاؤں گی۔ تمہاری تصویر دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے کل دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ باوجود عیسائی ہونے کے اس کا میلان زیادہ تر ہندو دھرم کی طرف ہے۔ ہندی منظومات سے بہت دلچسپی لیتی ہے کوئی ہندی نظموں کی اچھی سی کتاب اپنے ساتھ لیتے آنا لیکن میری مٹھائی مت بھولنا۔

شیام چرن

(۸)

مسوری مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

صرف شکریہ ادا کرنے سے کیا ہوتا ہے بغیر رس گلے اور رام تی کے کام نہیں چلے گا میں محنت بھی تو خوب کر رہا ہوں ہاں تو بتاؤ تم خود عیسائی ہو جاؤ گے یا اس کو شدھ کر دگے۔ وہ کہتی ہے کہ میں ہندو دھرم کی پرستار ہوں۔ لیکن نانا کے خوف سے اپنا مذہب چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔ یہ کان کھول کر سن لوکہ ایک عیسائی عورت سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔

اس نے تمہاری تصویر دیکھنے کو لی تھی اب کہتی ہے کھو گئی اب میں تم سے اس کی سفارش نہیں کر سکتا۔ مجھے پسند نہیں کہ تمہاری بیوی جھوٹی ہو۔ تمہاری تصویر اس نے بائیبل میں رکھی ہے اور روز بائیبل پڑھنے کے حیلے سے تمہارے درشن کرتی ہے اُف عورت کا دل بھی کس قدر فریب آشنا ہے اگر مجھ سے یوں ہی مانگتی تو کیا میں اس کو نہ دے دیتا۔ تم نے دریافت کیا ہے کہ کیا میں مادھوری کو ایک مختصر مکتوبِ محبت لکھ سکتا ہوں سنو تم ہرگز نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ مسز مکرجی اس کے باہر سے آئے ہوئے خطوط کو بڑے غور سے پڑھتی ہیں دوسرے ابھی اُس کا سن ہی کیا ہے

شیام چرن

(۹)

از مسوری مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کیشور

واضح ہو کہ بنی بنائی بات بگڑ گئی۔ مسز مکرجی نے کل بائیبل میں تمہاری تصویر دیکھ لی۔ وہ مجھ سے بھی منہ پھلائے بیٹھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مادھوری نے بھی خالہ سے کچھ گستاخی کی ہے۔ ایسی حالت میں تمہارا یہاں جلدی کر کے آنا محض بیکار ہے۔ ٹانگ جب بالکل اچھی ہو جائے اور ڈاکٹر صاحب اجازت دیں تو روانہ ہونا۔ ورنہ ابھی ٹھہرو۔

شیام چرن

(۱۰)

از مسوری مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء

جناب ڈاکٹر صاحب

میں نے سوچا تھا کچھ اور ہوا کچھ رام کشور کا یہاں عجلت کر کے آنا یقیناً نامناسب ہے جس طرح ممکن ہو اُس کو اور کچھ دن روکئے آج اُس کا تار ملا ہے کہ میں پرسوں روانہ ہو جاؤں گا۔

شیام چرن

تار ـــــــ ۲۵۔۵۔۳۱

رام کشور معرفت ڈاکٹر ٹنڈن سندر باغ لکھنو

فی الحال آنا بیکار ہے۔ ٹھیک وقت پر اطلاع دوں گا

شیام چرن

تار ——— ۳۱—۵—۳۱

ورما۔ برمی ویلا مسوری

میرا آنا پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے کل روانہ ہو جاؤں گا۔

رام کشور

تار ——— ۳۱—۵—۳۱

رام کشور معرفت ڈاکٹر ٹنڈن سندر باغ لکھنو

پاگل پن نہ کرو۔ تم اس سے مل نہیں سکتے۔ اُس نے اپنی محبت ظاہر کر دی ہے۔ اس سے ہر قسم کی ملاقات بند کر دی گئی ہے۔

شیام چرن

تار ——— ۳۱—۵—۳۱

ورما ابرمی ویلا مسوری

ملاقات بند کر دی گئی ہے؟ بس انتہا ہو گئی آج رات کی اکسپریس سے روانہ ہوتا ہوں۔

رام کشور

مسوری۔ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ تم کو منہ نہیں دکھا سکتا لہذا آج مسوری سے روانہ ہو رہا ہوں۔ ڈاکٹر ٹنڈن سے تمہاری کیفیت معلوم کر کے تمہاری طبیعت بہلانے کے لئے میں نے یہ ترکیب سوچی تھی اور اس لئے اس عیسائی لڑکی کا من گھڑت قصہ چھیڑ دیا تھا میں کیا جانتا تھا کہ تم اتنے بے صبر ہو جاؤ گے۔ ابرمی ویلا ایک کشمیری دوست کا بنگلہ ہے۔ میں نے پورا بنگلہ کرائے پر لے رکھا ہے میں یہاں نہ کسی کرسچین اور نہ کسی ہندو کالج کی لڑکی سے آشنا ہوں امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔

شیام چرن

(ترجمہ از سرسوتی)

تقی علی ہاشمی ناگپور

غزل

فقر کے پردے میں پنہاں ہے غنا میرے لئے
مسندِ شاہی ہے میرا بوریا میرے لئے

اُس نے کی تجویز کچھ ایسی دوا میرے لئے
دوست میرے کر رہے ہیں اب دعا میرے لئے

تو نہ کر افسوس اے جانِ وفا میرے لئے
عشق تھا شرط اور محرومی جزا میرے لئے

کوئے جاناں کے لئے میں ہی نہیں ہوں مضطر
کوئے جاناں بھی ہے آتش زیر پا میرے لئے

وہ نگاہیں کاہے کو ہوں نہیں مروّت آشنا
رہ گئی سر پیٹتی میری وفا میرے لئے

کعبۂ مقصود ہے مجھ کو کسی کی رہگزر!
ہے گُلِ امید ہر ہر نقش پا میرے لئے

اب خفا ہونے لگے ہو مجھ سے ہر ہر بات پر
تم کہ ہو جاتے تھے دشمن سے خفا میرے لئے

دل دھڑکتا ہے ادھر اور تُند اُدھر اُن کا مزاج
کس قدر مشکل ہے عرضِ مُدعا میرے لئے

محفلِ اغیار میں وحشت نہیں میں نامُراد
مضطرب ہے وہ نگاہِ آشنا میرے لئے

رضا علی وحشت

بُدھ اور اُس کا مت

سائنس کی ترقی کے ساتھ جہاں مذہب سے بیگانگی نے ترقی کی وہاں مذہب کے متعلق تاریخی تحقیقات کا ذوق بڑھا۔ اس سلسلے میں مذاہب کا مقابلہ شروع ہوا تو بدھ مت کی جانب دنیا کی توجہ مبذول ہونے لگی۔ جتنی کتاب بدھ اور اس کے مذہب کے متعلق کئی مبسوط کتابیں ممالک غیر میں شائع ہو چکی ہیں۔ حال ہی میں ایک ضخیم کتاب مسز رس ڈیوس نے "ساکیا" کے نام سے شائع کی ہے جس میں درج ہے کہ بدھی مذہبی کتابیں دنیا بھر کی مذہبی کتابوں سے شمار میں کہیں زیادہ ہیں۔ اس کتاب میں بُدھ مت پر نہایت مفصل نکتہ چینی کی گئی ہے۔ گذشتہ چند سال میں بُدھ دھرم کی جاتڑا (ڈاکٹر پریٹ) لائف آف بُدھا (بروسٹر) لائف آف بُدھا (ہرالڈ) اور سرہری سنگھ گوڑ کی کتاب "جوہر بُدھ مت" شائع ہوئی ہیں مختلف کتب کے مطالعہ سے مذہبی تحقیق کے شائق پریشانی میں پڑ جاتے ہیں کہ کس واقعہ کو صحیح اور کس کو غیر صحیح مانا جائے۔ کثرتِ تعبیر خواب ہی کو پریشان کر دیتی ہے۔ آخر کیونکر کتب قدیم کے ذخائر سمندر میں سے اصلی واقعات دریافت ہو سکیں۔

بُدھ مذہب کے مختلف فرقے۔ جب کہ الہامی کتب کے پیروؤں میں کثیر التعداد فرقے ہو گئے ہیں تو بُدھ مذہب میں جو انسانی دماغ کا نتیجہ ہے۔ فرقے کیوں نہ پیدا ہوتے۔ واضح ہو کہ بُدھ دھرم کے دو بڑے فرقے ہیں ایک جو اپنے کو مہایانا کہتا ہے یعنی بڑی سواری۔ اس نے دوسرے فرقے کو ہینایانا یعنی چھوٹی سواری کا نام دے دیا ہے۔ مگر وہ اپنے تئیں تھیراواڈا کہتے ہیں۔ اول الذکر کے اصول میں ویدانت کے فلسفہ کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ آخر الذکر میں لاادریہ یا دہریہ خیالات کا رنگ غالب ہے۔ ان دونوں فرقوں کی کئی اور شاخیں ہیں جن میں کئی موشگافیاں کی گئی ہیں میرا عقیدہ جو تاریخی مطالعہ سے قائم ہوا ہے یہ ہے کہ کوئی مذہب اپنی اصلی سادگی مدت تک قائم نہیں رکھ سکتا یہی صورت بُدھ مت کی ہے۔ یورپین مصنفوں نے بُدھ کو مختلف پیرایوں میں دکھایا ہے۔ اور اس کی تعلیم کو اپنے اپنے خیالات کے مطابق رنگ دے دیا ہے چنانچہ:-

ایک صاحب اس کو دہریہ کہتے ہیں اس کی تعلیم کو بے معنی لکھتے ہیں اور سانکھ فلاسفی کی نقل سمجھتے ہیں۔

دوسرے صاحب اس کو لاادریہ اور اس کی تعلیم کو موجودہ سائنس کے مطابق سمجھتے ہیں۔

تیسرے صاحب اس کو ویدک مذہب کا پیرو اور اُپ نشدوں کا قائل بیان کرتے ہیں۔

چوتھے صاحب۔ اس کو صرف ابنائے جنس کے درد و الم کو محسوس کرنے والا اور اس کا درمان بتانے والا ظاہر کرتے ہیں۔

پانچویں صاحب۔ اس کو انسان وحیوان کا شفیق اور محبت کرنے والا تصور کرتے ہیں اور محبت کا پہلا موجد سمجھتے ہیں۔

چھٹے صاحب بدھ لٹریچر کو بعد کی تحویلیں اور تحریفیں سمجھتے ہیں بقول ان کے صرف پہلا وعظ جو بدھ نے سارناتھ میں کیا حافظوں نے سینہ بہ سینہ صحیح طور پر بدھ کے اپنے لفظوں میں یاد رکھا ہے۔

جو مصنف بدھ مت کے پیرو ہیں انہوں نے اپنے اپنے ایمان کے مطابق اس کے سوانح اور تعلیم بیان کی ہے۔ راقم الحروف کو سنسکرت اور پالی اور دیگر غیر زبانوں کی ناواقفیت کے باعث یہ حوصلہ نہیں کہ کسی وثوق یا اعتماد سے اصلیت کو بعد کی تحریفات سے جدا کر سکے۔ تاہم اکثر ایسے واقعات ہیں اور بہت سا حصہ بدھ کی تعلیم کا ایسا ہی جس میں اختلاف نہیں۔

چنانچہ بدھ کے واعظ بننے سے قبل کے واقعات کتب معتبر میں یوں بیان ہوئے ہیں:۔

بدھ کی پیدائش اور حالات: نیپال کے ترائی میں ایک بڑی زمینداری یا ریاست ہوتی تھی جسے سنسکرت میں کپل وستو اور پالی میں کپل وستھو کہتے ہیں۔ اس کا راجا یا حکمران سدھودھن ساکھیا قوم اور گوتم گوت کا تھا۔ اس نے کولیا قوم کے راجا کی دو بیٹیاں بیاہی تھیں ایک کا نام مایا تھا جس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سدارتھ رکھا گیا۔ کولیا قوم دریائے روہنی کے پار بستی تھی۔ یہ دونوں راجے کشتری تھے۔ دستور تھا کہ رانی اپنے میکے جا کر بچہ جنتی تھی چنانچہ مایا میکے روانہ ہوئی مگر راستے میں ایک جنگل موسوم لمبنی میں اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سدارتھ رکھا گیا۔ اس کا زائچہ تیار ہوا۔ اور ماہران علم جوتش نے پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا چکرورتی یعنی یا تو دنیا کا عظیم الشان بادشاہ ہوگا یا روحانی مملکت پر تسلط کرے گا۔ جب سدارتھ عظمت کے درجے کو پہنچا، تو فرطِ تعظیم سے بہت سے نام اُس کو دیے گئے مثلاً

ساکیا منی۔ قوم ساکھیا کا دانشمند۔

بھگوت۔ محترم۔

ستھا۔ استاد۔

جنا۔ فاتح

بدھ۔ منور۔

علی العموم اس کو بدھ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اپنے تئیں بدھ تتھاگت (یعنی مثل روندگان سابق) کہا کرتا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ اس سے پہلے بھی بہت بدھ گذر چکے ہیں جن کے سلسلہ میں وہ خود کو تصور کرتا تھا۔

بدھ دھرم کا بانی ۵۶۰،۵۵۷ ق م میں پیدا ہوا۔ ساتویں روز اس کی والدہ مایا انتقال کر گئی۔ اس کی ماسی پرجاپتی نے جو سوتیلی والدہ تھی اُسے پرورش کیا۔ انیس سال کی عمر میں اس کی شادی اس کی ایک رشتہ دار وسودھرا سے ہوئی۔ یہ کولیا قوم سے تھی۔ دس سال کے بعد ایک لڑکا اس بیوی سے ہوا جس کا نام راہولا رکھا گیا۔

ترک دنیا۔ سدارتھ کی طبیعت نمایاں طور پر غیر معمولی تھی۔ وہ ثروت و دولت کے مقناطیس کے دام سے آزاد تھا۔ یہ وقت سوچ بچار میں منہمک رہتا اور بے ثباتی عالم پر غور کرتا تھا۔ وہ بنی نوع انسان کے مصائب کا علاج سوچتا رہتا تھا۔ بڈھوں بیماروں اور مُردوں کے نظارے نے اس کے دل پر بے انتہا اثر کیا۔ ایک تارک الدنیا زاہد کے دیکھنے سے اس کو سکونِ خاطر حاصل ہوا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ گھر سے نکل کھڑا ہو اور ابنائے جنس کے آلام کا تدارک سوچے۔ کئی امور مانع تھے لیکن جس دن اس کی بیوی کے لڑکا پیدا ہوا اُس دن اس نے مستحکم عزم کر لیا کہ اس زنجیر سے بھی وہ آزاد ہو جائے گا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور گھر سے نکل پڑا۔ راستہ میں شاہی زیبائش کی سب چیزیں سائیس کے ہاتھ واپس بھیج دیں۔ لمبے بال کٹوائے اور تارک الدنیا کا لباس زیب تن کیا۔ اور مگدھ کی راجدھانی راج گڈھ پہنچا وہاں فقرا، یوگی، برہمن دیا وان غاروں میں مراقبہ اور درس و تدریس میں مشغول پائے۔ آلارا کلاما اور ادکا رام پتا جیسے دیا وانوں سے اس کی تشفی نہ ہوئی چنانچہ وہ ایک جنگل کو جسے اُس زمانہ میں یوروبلا کہتے تھے روانہ ہوا۔ یہ جنگل گیا جی کے نواح میں تھا۔ اس جنگل میں پانچ برہمن تپسیّ دھیان میں مصروف اُس کو ملے۔ جو نفس کشی اور جسمانی تکالیف برداشت کرنے کی ریاضت میں مشغول تھے۔ سدارتھ ریاضت میں ان پانچوں زاہدوں سے بڑھ گیا۔ چھ سال یہاں وہ تپسیا کرتا رہا۔ اس تپسیا کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اس کی شہرت پھیلی کہ یہ شخص راہِ نجات کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن اُس کی اپنی طبیعت پر برعکس اثر ہوا اس کا تنومند جسم اور حسین صورت محض ایک سایہ رہ گئے۔ ایک روز وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ ایک گوالن شوجاتا نے جس کا نام بُدھی کتابوں میں لازوال ہو گیا ہے۔ اُس کو دودھ دیا ہوش میں آیا تو اُس نے غلط راستہ چھوڑنے کا عزم کر لیا۔ اس نے معمولی غذا کھانی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پانچ برہمن اس سے متنفض ہو گئے۔ اور بنارس کو چلے گئے۔ جسے وہ زیادہ مقدس اور مناسب مقام سمجھتے تھے۔

نروان اور دیگر حالات۔ سدھارتھ ایک پیپل کے تلے بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں جذبات کی کشمکش ہوتی رہتی۔ بیان ہوا ہے کہ مارا یعنی بدی کے دیوتا نے اُسے ڈرایا۔ لبھایا مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔ سات ہفتے محویت میں صرف ہوئے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کو نورِ باطن حاصل ہو گیا ہے یعنی بُدھ ہو گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ پھر جنم نہیں لے گا۔ گویا کامل رستگاری اسے حاصل ہو گئی۔ اس نے دردِ الم کا درمان دریافت کر لیا ایک ہفتہ وہ اس دریافت کی مسرت سے محظوظ اور مگن رہا سوچتا تھا کہ اپنی دریافت کا انکشاف کرے یا نہ کرے۔ اسے خیال یہ تھا کہ ممکن ہے کہ اس کا مسلک کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ آخر اس کے دل نے اسے ہدایت دی کہ نہیں خواہ کچھ ہو اس مسلک کو لوگوں پر ظاہر کرنا چاہئے۔ بُدھ مذہب کی کتابوں میں اس کی دماغی کشمکش کی حالت نہایت فصاحت اور بلاغت سے بیان کی گئی ہے۔ راقم الحروف میں وہ زورِ قلم نہیں کہ اس بیان کے تتبع کی جرأت کرے جس پیپل کے نیچے بدھ بیٹھا تھا اس کا بچہ اب تک موجود ہے۔ اس مقام کو بُدھ گیا کہتے ہیں۔ یہاں ایک عظیم الشان بے مثل مندر زمین سے برآمد ہوا ہے جو ایک

شیو ہی ر ما دھو کے زیر اہتمام ہے۔ اس پیپل کی ایک شاخ اشوک کے عہد میں اُس کا فرزند و دختر لنکا لے گئے تھے جہاں وہ درخت ہو گیا۔ اس کا اب تک طواف ہوتا ہے۔

اب سدھارتھ بُدھ کی حیثیت سے بنارس جاتا ہے۔ وہی پانچوں برہمن اُسے مل جاتے ہیں جس مقام پر وہ آ کے ملے تھے سارناتھ میں واقع ہے جو شہر بنارس سے ۷ میل ہے اور جو کسی زمانہ میں کاشی جی (بنارس) کا حصہ تھا۔ اس مقام پر ایک قدیم ستوپا تھا۔ اس پر شہنشاہ ہمایوں تخت پر بیٹھا تھا اس واقعہ کی یادگار میں اکبر نے ایک گنبد بنایا اور اس پر ایک فارسی قطعہ کندہ کیا جس میں اس کے باپ کے یہاں آنے کا ذکر ہے۔ اس کندہ تحریر پر ہجری سنہ مطابق ۱۵۸۸ء کے ہے۔ یہاں بُدھ نے پہلا وعظ سنایا تھا جو بُدھ دھرم کی بنیاد ہے۔ سارناتھ بعد میں یعنی اشوک کے زمانہ میں بارونق اور منقتدر ہو گیا۔ کئی ستوپے، مندر، درگاہیں یہاں بنیں اور تباہ ہوئیں پھر بنیں اور تباہ ہوئیں۔ صدیوں کے انقلاب اور بربادیوں کے بعد اب پھر ایک رفیع اور عظیم الشان بُدھی مندر تیار ہو گیا ہے۔ سارناتھ کے پھر نصیب جاگے ہیں اُس کو حیات تازہ حاصل ہو گئی ہے۔

بُدھ کے وعظ اور قانونِ اخلاق ۔ اگر ہم بُدھ کے وعظوں اور مقالات کو بیان کریں تو کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ بعض پر اعتراضات بھی ہیں کہ وہ بعد کی اختراعات ہیں لیکن کم از کم پہلا وعظ نکتہ چینی سے مُعرا ہے قبل اس کے کہ ہم اس وعظ کو نقل کریں یہ بتانا ضروری ہے کہ بُدھ نے ایک قانونِ اخلاق دنیاداروں کے لئے بھی وضع کیا جس کی اس نے تلقین کی اور ایک فرقہ فقرا قائم کیا جس کے لئے اس نے سخت قواعد مقرر کئے۔ شروع میں یہ فرقہ جو بھکو کہلاتا تھا صرف ذکور پر محدود تھا۔ بعد میں اس نے اپنی ماسی کے اصرار پر اور اپنے شاگرد رشید انند کی سفارش پر اناث کو بھی اس میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ ابتدائی زمانہ میں یہی بھکو اور بھکشنیں تھیں جنہوں نے یہ دھرم دنیا میں پھیلایا۔ بعض نکتہ چینوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بُدھ مت حزن و ملال اور یاس و حرماں کا مجسم نمونہ ہے۔ اس میں نشاط مسرت، اطمینان، امید قطعی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں راگ اور ویراگ دونوں ہیں۔ یہ مت سب زنجیروں سے آزاد ہے۔ کسی کا خوف دخطر نہیں۔ واقعیت اس کی کلید ہے۔ انسانوں کے آلام باعث ملال ہیں۔ اُس کے مدافعت میں کامل مسرت اور بہجت ہے گرہست یعنی دنیاداری کی زندگی کو بدھ دھرم نفرت یا بے اعتنائی سے نہیں دیکھتا بلکہ تفصیل سے بُدھ نے گرہست کے لئے ہدایات دی ہیں۔ بھکوؤں کے لئے تجرد ضروری ہے۔ ان کا فرض ہے "قانونِ بدھ" کا پرچار کریں۔ ملکوں میں پھرنا اور تبلیغ کرنا ان کا کام ہے بھکو نہ تو منک (MONK) ہیں نہ ایسے تارک ہیں کہ پھر دنیادار نہ ہو سکیں۔ ان کو اجازت ہے کہ اگر قواعد کو وہ برداشت نہ کریں تو سنیاسیوں وغیرہ کے برعکس دوبارہ دنیوی زندگی اختیار کر لیں بجائے اس کے کہ حرکات ناشائستہ کریں۔

پہلا وعظ ۔ اب ہم وعظ ادبیں بیان کرتے ہیں۔ بُدھ دھرم سمجھنے کے لئے یہی کافی ہے۔ پالی زبان میں یہ

وعظ من وعن بلاکم وکاست انہیں الفاظ میں جو ذات مبارک کے دہن سے نکلے تھے محفوظ ہے۔ سب مورخوں اور محققوں کا اس بارے میں اتفاق ہے :-

سنو بھکشو! یہ مسلک دکھ نوارنے کے لئے شاہراہ ہے۔ یہ مسلک پہلے کسی نے نہ سنا تھا۔ مجھ میں روشنی علم۔ ادراک عقل پیدا ہوگئی ہے۔ اس مسلک کو سمجھنا چاہئے۔

سُنو بھکشو! ان عالی سچائیوں کو مع ان کے بارہ بابوں کے میں پہلے نہ سمجھ سکا تھا۔ نہ اس دنیا کے دیوتا مارا یا برہما سے۔ نہ تارکوں نہ برہمنوں سے مجھے کچھ حاصل ہوا تھا۔ اب مجھے نورِ باطن حاصل ہوگیا ہے۔ یہ زیست میری آخری زندگانی ہے۔ اب میں دوسرا قالب اختیار نہیں کروں گا۔ مجھے اب رستگاری حاصل ہوگئی ہے۔ رستگاری کے خواستگار کو دو اتوں (Extremes) سے احتراز کرنا چاہئے۔ ایک ات لذّات و خواہشاتِ نفسانی کا پورا کرنا ہے جو رذیل اور ہیچ ہے۔ دوسری ات بیجد نفس کشی اور جسمانی تعزیر ہے جو دکھ دائک اور بے سود ہے۔

مسلکِ درمیانہ جو تتھاگت نے معلوم کیا ہے۔ ان دونوں غلط رستوں سے الگ ہے۔ جو آنکھیں کھول دیتا ہے جو بصیرت بخشتا ہے۔ خردمندی۔ مخلصی۔ بیداری۔ دھیان کی راہ تبلاتا ہے۔ یہ ذیل کا ہشتگانہ مسلک گرامی ہے۔

رائے صحیح۔ تمنائے صحیح۔ کلام صحیح۔ اعمالِ صحیح۔ معاشِ صحیح۔ سعئ صحیح۔ توجہ صحیح۔

اب دُکھ کی حقیقت حسب ذیل ہے :-

پیدائش دکھ ہے۔ عارضہ دکھ ہے۔ موت دکھ ہے۔ اندوہ غم و درد دکھ ہے۔ آہ وزاری دُکھ ہے۔ ناگوار کے ساتھ ملاپ دُکھ ہے۔ پیاری چیزوں سے لگاؤ دُکھ ہے۔ ناکام خواہش دُکھ ہے۔ القصہ لگاؤ کے پانچوں زمرے دُکھ ہیں۔ دُکھ کے اسباب کی حقیقت حسب ذیل ہے۔

سچ جانو یہ تشنگی ہے یعنی زیست کی ہوس اور اس کے لُطف اٹھانے کی تمنا جس سے پُنر جنم ہوتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح خواہشات نفسانی پوری ہوں۔ ہوائے نفسانی کے بھوگنے کی ہوس۔ ہوسِ زیست خواہ زندگیٔ حال یا زندگیٔ آئندہ کی ہو یا آرزوئے فنا۔ دُکھ کے پیدا کرنے والے ہیں۔ دُکھ کے زائل کرنے کی حقیقت یہ ہے :-

اس ہوس کو قطعی نیست و نابود کرنا۔ اس پر فتح پانا۔ اس کا فنا کرنا ہے۔ اب حقیقتِ گرامی اس مسلک کی جس سے دُکھ کا ناش ہوتا ہے یہ ہے :-

سچ جانو یہ ہشتگانہ مسلکِ گرامی ہے یعنی رائے صحیح۔ تمنائے صحیح۔ اعمالِ صحیح۔ معاشِ صحیح۔ سعئ صحیح۔ فکر صحیح توجہ صحیح"

توضیح۔ یہ الفاظ بدھ کے تھے۔ بظاہر یہ بالکل سادہ معلوم ہوتے ہیں بلکہ تقریباً اتنے سادہ کہ حیرت ہوتی ہے کہ کیسے وہ اتنے بڑے مذہب اور فلسفہ کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا پورا مفہوم سمجھنے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے اور یہ

اس طرح ہوسکتا ہے کہ ان کو اکثر پڑھا جائے۔ اور ان پر تعمق سے دھیان کیا جائے۔ ان کی مختصر تشریح کی جاتی ہے (از مسٹر سراس) **حقیقت اوّل** کی زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ زندگی دُکھ سے پُر ہے اور اگر نسبتۃً کبھی کسی موقع پر ہم کو جسمانی یا ذہنی دُکھ نہیں پہنچتا تو یہ صرف دکھ کے وقفے ہیں۔

مثلاً اگر گذشتہ جنگ عظیم کے بے شمار پُر درد اور پُر آشوب نتائج کو خیال میں نہ لائیں کیونکہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا تو ذرا ہسپتالوں۔ جیلخانوں۔ پاگل خانوں۔ غربا کے مساکن۔ ذبح خانوں اور اسی قسم کے مقامات کو دیکھنے تو حقیقتِ اول کی صداقت کا تیقن ہوجاتا ہے۔

وہ شخص بُدھ کے مَت کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کی رائے میں یہی دنیا سب دنیاؤں سے بہتر ہے (مثلاً لیبنٹز) یا جو اتنا اندھا یا خود پرست ہے جسے ہر جگہ جہاں میں بے اندازہ دُکھ نظر ہی نہیں آتا۔ "لگاؤ کے پانچ زمرے" جو اوپر بیان ہوئے محتاج صراحت ہیں۔

بُدھ نے سائنٹیفک طریق پر شخصیت کا پانچ حصوں میں تجزیہ کیا ہے :-

جسم۔ احساس۔ تفہیم۔ تحت شعور۔ شعور۔

بُدھ نے ثابت کیا ہے کہ منفرداً اور مجموعی حالت میں یہ حالتیں عارضی ہیں اور ایسی عارضی حالتوں کی ہوس کا نام شخصیت ہے جو جلد یا دیر سے دکھ پیدا کرتی ہیں۔ لیکن **دوسری حقیقت** کی توضیح زیادہ تفصیل کی محتاج ہے۔ اس سے عالمگیر دُکھ کا سبب دریافت ہوتا ہے یہ ہَوس ہے جو مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔ اس ہوس کے لئے پالی کا لفظ تشنا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی پیاس کے ہیں۔ غالباً یہ لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ گرم ملکوں میں پیاس زیادہ ستاتی ہے۔ (تشنا فارسی لفظ تشنگی کے مترادف ہے)

ہم اپنے طرزِ بیان میں اس کو "ارادۂ زیست" کہہ سکتے ہیں۔ یہ جگت (سمسار) بے آغاز و بے انجام ہے ہستیاں جو مایا میں مبتلا ہیں "ارادۂ زیست" میں گرفتار ہو کر بلا روک نئے جنم اور نئے دکھ پاتی ہیں۔ اس تشنگی کی جڑ ارادہ میں ہے۔ جو ہوسِ زیست میں نمایاں ہوتی ہے۔ اسی سے ہَوسِ جاہ ہوسِ شہرت اور ہوسِ لذات پیدا ہوتی ہے۔ بعض اشخاص کو خودکشی کی تحریک ہوجاتی ہے۔ یہ بھی مثل اور ہوسوں کے ایک قسم کی انانیت ہے جو بشکل تنفر و حقارت نمودار ہوتی ہے۔ **تیسری حقیقت** سادہ اور صاف ہے۔ جب سبب یعنی پیاس ختم ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دکھ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ پس حتی الوسع سارا زور اس پیاس کے فنا کرنے میں صرف کرنا چاہئے۔ **چوتھی حقیقت** ۔ وہ مسلک یعنی راستہ ہے جس سے ہَوس ختم ہوتی ہے۔ لہذا جس سے دُکھ دفع ہوجاتا ہے۔ وہ ہشت گانہ مسلک گرامی ہے۔ اس کے ہر حصہ کے ساتھ لفظ صحیح آتا ہے۔ بُدھ کے مکالمات میں "صحیح" کے معنی وضاحت سے کئے گئے ہیں جو ہم خلاصۃً ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

ہشتگانہ مسلک گرامی

(۱) رائے صحیح یعنی چار گرامی حقیقتوں اور بُدھ کے سارے مت کو بخوبی جاننا وہموں اور تعصبوں سے آزاد ہونا۔

(۲) تمنائے صحیح - بُدھ مت کو درست سمجھ کر مستحکم ارادہ سے اس کی پیروی کرنا۔ ثابت قدمی سے کام کئے جانا جب تک مراد حاصل نہ ہوجائے۔ یہ ارادہ کرلینا ہے کہ کسی کی بدخواہی نہیں کرنی ہے۔ نہ کسی کو رنج پہنچانا ہے۔

(۳) کلام صحیح - جھوٹ نہ بولنا کسی کی بدگوئی نہ کرنا۔ نہ نخوت کلامی کرنا۔ نہ احمقانہ یاوہ گوئی کرنا (بُدھ نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ جب تم مل کر بیٹھو تو دو چیزیں تمہارے لئے مناسب حال ہیں (سبق آموز گفتگو یا متبرک خاموشی)

(۴) اعمال صحیح - ایسے کام کرنا جن میں انسان یا حیوان ہلاک نہ ہوں۔ نہ ایسی شے لینا جو تمہیں بخوشی نہیں دی گئی اور ناپاک افعال سے احتراز کرنا۔

(۵) معاش صحیح - ایسا پیشہ یا کام اختیار نہ کرنا جس سے اوروں کو دُکھ پہنچے۔ مثلاً ذبح کرنا۔ شکار کھیلنا۔ مسکرات کا بیچنا۔ بردہ فروشی وغیرہ۔

(مسلک کے اس حصہ سے پایا جاتا ہے کہ یہ ہدایت سنگھا یعنی بھکوؤں کی جماعت ہی کے لئے مخصوص نہ تھی جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے۔ بلکہ سب انسانوں کے لئے ہے۔ کیونکہ سنگھا خاص قواعد کے مطابق دنیوی کاموں اور پیشوں کے اختیار کرنے سے منع کئے گئے ہیں،

(۶) سعیٔ صحیح - اس سے مراد ہے کہ بُرے خیال اور بُری خواہشیں دل میں نہ آنے دینا اور اگر بُرے خیال اور بری خواہشیں پیدا ہوگئی ہیں تو ان کو دور کرنا۔ نیک خیالوں اور نیک خواہشوں کو جو پیدا نہیں ہوتی ہیں جگانا۔ موجودہ نیک خیالوں اور نیک خواہشوں کو قائم رکھنا اور ان کو ترقی دینا۔ انسان کو چاہئے صالح خیال اور خواہشیں پیدا کرے۔ خواہشوں کی دکھ دائی ماہیت پر غور کرے یا ان کے اجزا کو الگ الگ کرکے تحلیل کرے۔ یعنی ان کی ترکیب ایسی توڑ دے کہ وہ اپنے عنصروں میں واپس چلی جائیں یا اپنی قوت اور ہمت سے ان کو مغلوب کرے۔ پھر ہم کو معلوم ہوجائے گا کہ کس طرح مضر خیالات اور خواہشیں پراگندہ ہو کر خود ہی معدوم ہوجاتی ہیں اور انسان کا دل سکون اور امان پاتا ہے

(۷) فکر صحیح - جسم - حسیات - خیالات اور اشیا کی حقیقت پر عموماً غور و فکر کرنا۔ ان چیزوں پر کامل غور کرنے سے یہ ادراک ہوجاتا ہے کہ ان کا آغاز اور انجام سلسلۂ اسباب پر اور قوانین کے مطابق ہے۔ نیز یہ کہ وہ عارضی ہیں اور کوئی شے نہیں جس کی نسبت کہا جاسکے کہ "یہ میری ہے۔ یہ میں ہوں"۔ بُدھوں کے ہاں دعاؤں کے بجائے بچار ہے۔ کیونکہ کسی بالائی ہستی کے وہ قائل نہیں جو امداد کرسکے یا نقصان پہنچا سکے پس کسی ہستی سے وہ دعا نہیں کرسکتے۔

۸ توجۂ صحیح - من کو استحر کرکے اپنے باطن کا امتحان کرنا ہے۔ اکثر اوقات اس طریق سے ایک حالت وجد پیدا ہوجاتی ہے اور ایسی حالت سے بقول بعض اوکلٹ (occult) یا مافوق الفطرت طاقتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن منزل مراد

یعنی نجات کے حصول کے لئے ان طاقتوں کی حاجت نہیں۔ وہ محض انجام تک پہنچنے کے ذریعے ہیں اور بُدھ نے خود کہا ہے کہ منزلِ مراد کو پہنچنے کے لئے نہ ان کی ضرورت ہے نہ وہ کافی ہیں۔

پانچ پرن ۔ بدھ مت میں داخل ہونے کے واسطے پانچ اقرار کرنے پڑتے ہیں جنہیں پنچ سیلہ کہتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔ پرن بمعنی اقرار ہے۔

(۱) میں پرن کرتا ہوں کہ میں کسی جاندار کو نہ ماروں گا (نہ انسان نہ حیوان کو)

(۲) میں پرن کرتا ہوں کہ میں کوئی شے نہ لوں گا جو مجھے بخوشی نہ دی گئی ہو۔ (اس لئے سرقہ ہی منع نہیں بلکہ کسی حکمت سے کچھ حاصل کرنا مثلاً زیادہ سود لینا یا فریب سے کچھ حاصل کرنا بھی منع ہے)

(۳) میں پرن کرتا ہوں کہ ناجائز حظِ نفس سے اجتناب کروں گا۔

(۴) میں پرن کرتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں گا (جس میں کسی پر تہمت لگانا شامل ہے۔ تہمت سے الفاظ ذیل میں منع کیا گیا ہے: "تاکہ انسانوں میں نفاق پیدا نہ ہو۔ وہاں کا سنا یہاں دُہرانا نہ چاہئے اور یہاں کا سنا وہاں دہرانا نہ چاہئے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ایسے الفاظ منہ سے نکالے جن سے اتفاق بڑھے۔ تاکہ وہ اس کا لطف اٹھائے۔"

(۵) میں پرن کرتا ہوں کہ نشہ آور چیزوں سے احتراز کروں گا۔

بُدھی کلمہ ۔ بدھ مت میں ایک کلمہ پوجا کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کو تین پناہیں کہتے ہیں وہ یہ ہے:۔

بدہم شرنم گچھامی = آتا ہوں میں بُدھ کے قدموں میں۔
دھرمم شرنم گچھامی = آتا ہوں میں دھرم کے قدموں میں۔
سنگھم شرنم گچھامی = آتا ہوں میں سنگت کے قدموں میں۔

گویا اصولِ ایمان کا یہ خلاصہ ہے کہ بُدھ دھرم والا عقلِ سلیم (بُدھ) دھرم (فرائض) سنگھم (انسانی برادری کا قائل ہو۔

بُدھ کے مجسمے ۔ واضح ہو کہ بدھ نے اپنے مجسمے بت یا اور کسی قسم کے اشکال و تصاویر بنانا منع کر دیا تھا تین سو سال تک اس کا کوئی بت نہ بنا۔ لیکن آخر جذباتِ انسانی کو کون روک سکتا ہے۔ اس کی ذاتِ بابرکات کی صفات نے دلوں کو اتنا تسخیر کر لیا تھا کہ لاکھوں بت بن گئے۔ ثنا خوانی اور مدح کی انتہا نہیں رہی اس میں شک نہیں کہ یہ محبوب انسان کروڑوں دلوں پر تسلط رکھتا ہے۔ یورپین اور امریکن بھی اس کے گرویدہ ہوتے جاتے ہیں۔ مگر زاد بوم میں وہی مثل ہے۔ گھر کے جوگی جوگنے باہر کے جوگی سدہ

شمیم

اصلاح

تجھے گماں ہے کہ ہے رات کی جبیں تاریک
مجھے یقیں ہے کہ یہ بھی ہے موجِ گردشِ رنگ

تجھے یہ وہم کہ ہے موت زندگی کا مآل
مجھے یہ علم کہ باطل نہیں زمانہ تنگ

تری نگاہ میں ہستی، رہینِ کیفِ سکوں
مرے خیال میں گیتی محیطِ شورشِ جنگ

تجھے بایں ہمہ دانش غمِ زمانہ تلخ
مجھے بایں ہمہ کاوش سرورِ بادہ رنگ

تجھے خیال کہ قصرِ طرب ہے نقش بر آب
مجھے یقیں کہ صنم آفریں ہے ریزۂ سنگ

تجھے فسانۂ باطل حدیثِ سوز و گداز
مجھے پیامِ حقیقت صدائے بربط و چنگ

سکونِ قلب تری سعیٔ ناتمام کی حد
نشاطِ روح مری ہمتِ بلند کو ننگ

چلا ہے تو کہ ہے دنیا مقامِ حزن و ملال
بڑھا ہوں میں کہ تجھے دوں پیامِ رامش و رنگ

ترا وہ قلب کہ آسودۂ فریبِ جمال
مری وہ روح کہ بیگانۂ حجاب و درنگ

وہ موج تو کہ ہے جس پر گراں روانیٔ سیر
وہ صید میں کہ جسے خود ہی آرزوئے خدنگ

فسردگی سے ہے ظلمت فروش تیرا خیال
شگفتگی سے ضیا آفریں ہے میری امنگ

پھر اس پہ دعویٔ نقد و نظر خدا کی پناہ
کہاں جمالِ حقیقت کہاں ضمیرِ گناہ

علی اختر
(حیدرآباد دکن)

عدنان

عدنان اُسی دن نیلوفر کی طرف متوجہ ہوگیا تھا جب وہ پہلے پہل خادمہ کی حیثیت سے کلب گھر میں داخل ہوئی تھی نیلوفر نے اُس سے پیچھا چھڑانے کی ہزار کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ وہ اُسے کام کے بہانے سے اپنی میز کے پاس بلا لیا کرتا تھا اور مشکل یہ تھی کہ نیلوفر فرمانبرداری کے متعلق بڑی خادمہ کی سخت ہدایات سے روگرداں ہونے کی جرأت نہ کرسکتی تھی۔ بڑی خادمہ جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی ایک پاؤں سے ذرا سا لنگڑاتی تھی۔ وہ نہایت ہوشیار اور جہاں دیدہ عورت تھی اور اگرچہ چھوٹی لڑکیوں سے بہت شفقت کرتی تھی لیکن جب نیلوفر نے اُس سے عدنان کے طرزِ عمل کا ذکر کیا اور بتایا کہ میں اس وجہ سے اُس کی میزبانی کے فرائض انجام دینے سے قاصر ہوں تو اُس عورت نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ میری بچی تم بہت نادان ہو" اور اس کی شکایت رفع کرنے کا کچھ انتظام نہ کیا۔

پرتکلف کھانوں کی فرمائشوں کے ساتھ ہی ساتھ عدنان نیلوفر پر اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا کرتا اور کہتا "کاش تم میری خادمہ ہونے کے بجائے ایک ہی میز پر نفیس کھانوں کی فرمائشوں میں میری شریک بن جاتیں"

نیلوفر زیرِ لب کہتی "زبان سنبھال کر بات کرو" اور پھر بلند آواز سے پوچھتی "ماہی پلاؤ یا نرگسی آفندی؟"

"نرگسی! اور نیلوفر مجھے تم سے محبت ہے۔ گاؤں میں میرا ننھا سا مکان تمہارا انتظار کر رہا ہے"

"میرا انتظار کرتے کرتے اُس کے کھنڈر زمین پر آرہیں گے" (پھر بآوازِ بلند) "مسلّم مرغ یا تیتر آفندی؟"

"تیتر! اور ہاں ننھی سی گڑیا مجھے کبھی کسی سے اتنی محبت نہیں ہوئی اور مجھے کبھی کسی سے اتنی محبت نہ ہوگی نیلوفر کیا تم میری بات نہیں سمجھ سکتیں ...؟" بات ختم ہونے سے پہلے نیلوفر اُس کی فرمائش کی تعمیل کے لئے بھاگ کر سنی ان سُنی ایک کر جاتی تھی۔

دو مرتبہ نیلوفر ملازمت سے کنارہ کش ہوئی لیکن دونوں مرتبہ وہ پھر بلائی گئی اور از بس کہ اُس کا باپ بیمار محتاج اور از کار رفتہ تھا وہ مجبوراً دوبارہ اپنی جگہ پر واپس چلی جاتی۔ کام کی اجرت سے وہ اپنے دو کمروں کا کرایہ ادا کرتے اور انعامات کی رقم سے اُن کے کھانے کا خرچ چلتا۔ انعام دینے میں عدنان سب سے زیادہ فراخ دل تھا۔ کبھی کبھی نیلوفر اپنے خیالات میں کھو جاتی اور سوچتی کہ اگر میں عدنان کی بات مان لوں تو اُس کی دولت سے میرے باپ کو کس قدر راحت ملے۔ اس خیال سے کئی دفعہ وہ اُس مکان کو بھی تصور میں دیکھتی جو عدنان نے

گاؤں میں سیب کے درختوں کے جھنڈ کے درمیان بنا رکھا تھا پھر وہ تھا بھی ایک خوش مزاج اور پسندیدہ خصلت آدمی اور ایک دن جب ناشپاتی کے پنیر ملے رائتہ اور عرق نعناع کی فرمائش کے دوران میں اُس نے کہا "نیلوفر اگر تم ایک ہی دفعہ اپنے محبوب قدموں سے میرے سیاہ خانے کی آبرو بڑھا سکو تو میں تمہیں ہزار طوالرند ردوں۔۔۔"
اُس دن وہ ایک لمحہ کے لئے ہچکچائی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تامل کے اس وقفہ میں اس نے عدنان کی آنکھوں کے درمیان کی گہری شکنیں اُس کی خمدار ٹھوڑی اُس کے ہموار دانت اور اس کی وہ نگاہیں جو فتح مندی کے خیال سے قبل از وقت چمک اٹھی تھیں دیکھیں۔ پھر عدنان نے اُس سے پوچھا تم یہاں سے کس وقت فارغ ہو جاتی ہو لیکن نیلوفر نے ترشروئی سے جواب دیا "میں آپ کے فراغت پانے سے پہلے فارغ ہو جاؤں گی"۔ اس پر وہ افسردہ و رنجیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نیلوفر اس وقت میز کے سرے پر فالی برتنوں کے ایک تشت کو سہارا دئے کھڑی تھی۔ دفعتہً وہ یہ کہتے ہوئے الگ ہٹ گئی کہ "اب کبھی کلب گھر والے مجھے نہ بلائیں گے"۔ اور برتن تمام زمین پر گر کر پاش پاش ہو گئے۔

باپ کے مرنے پر نیلوفر نے ایک محرر سے شادی کر لی اور تیس سال سے زائد مدت تنگی ترشی میں کاٹی۔ اس کا شوہر کبھی بُردبار ہو جاتا کبھی چڑچڑا، وہ کبھی صابر ہو جاتی کبھی شاکی، اور ان کے دو بچے کبھی فرشتے بن جاتے کبھی شیطان زندگی کے دن کسی ایسی بات کے لئے تیاری اور مصروفیت میں گزر رہے تھے جو ہمیشہ ان بوجھی کی ان بوجھی ہی رہی۔ نیلوفر جانتی تھی کہ اس کی چار دیواری کے باہر عظیم الشان اجتماعات ہیں، بڑے بڑے حادثات ہیں، سورج چاند اور ستارے ہیں لیکن وہ اپنے بچوں اور اپنے شوہر کی ضروریات کے خیالوں میں ایسی کھوئی سی رہتی تھی کہ ان چیزوں سے اُسے اپنا کوئی سروکار معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کے لئے آئے دن ایک ہی جھگڑا، نت وہی ٹنٹا تھا۔

نیلوفر پچاس برس کی عمر میں بھی حسین تھی اُن دنوں اسے اپنے ڈاکٹر سے معلوم ہوا کہ ہفتاد سالہ امیر عدنان قریب کے ایک بڑے شفاخانے میں مقیم ہے۔ وہ شریف اور رقیق القلب تھی اس کے علاوہ اس کی زندگی کا ہلانہ بےلطفی میں بسر ہو رہی تھی۔ اس لئے تنہائی میں کئی دن کی سوچ بچار کے بعد ایک دن وہ چپکے سے ہسپتال میں چلی گئی جہاں پہنچتے ہی اُس نے عدنان سے ملاقات کی درخواست کی۔

وہ غسل کا بادامی لبادہ پہنے ہوئے، ایک دریچے کے قریب مطالعہ میں مصروف بیٹھا ہوا خوشرد اور علیل معلوم ہو رہا تھا۔ نیلوفر نے اُس کی آنکھوں کے درمیان گہری شکنیں، اس کی خمدار ٹھوڑی اور اس کی نگاہیں جن میں فتح مندی کی وہی غیرفانی چمک نظر آ رہی تھی، دیکھیں۔ شگفتہ رو پری چہرہ عورت اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی آفندی میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ آپ کو احسان مندی سے یاد کرتی رہی ہوں کیونکہ آپ

ے انعامات کے صدقے ہیں میرے مرحوم باپ کو بہت آرام پہنچا تھا۔ میں وہی نیلوفر ہوں جو شہر کے کلب گھر میں پ کی خدمت گار تھی۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو . . . . "

اُس کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ نیلوفر کا ہاتھ تھام کر بولا "ہاں مجھے خوب یاد ہے اور تم اب بھی حسین ہو"۔

نیلوفر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر آپ کی یہ مدد شریکِ حال نہ ہوتی تو میرا مرحوم باپ کئی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہ جاتا"۔

وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر بولا: "لیکن مجھے سچ بتاؤ کیا تمہارے دل میں کبھی میرا خیال بھی آیا ہے ؟"

"ہاں اور ہمیشہ منت گزاری کے ساتھ"

پھر وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا "کیا وہ دن بھی تمہیں یاد ہے جب سہ پہر کے وقت ہم ایک پرانے باغ میں پھرتے رہے تھے اور پھر ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہری ہری دوب کے فرش پر بیٹھ کر میں نے تمہیں اپنے مہمل سوالوں سے گھبرا دیا تھا . . . . ؟"

نیلوفر نے حیران ہو کر اُس کے چہرے پر مستفسرانہ نگاہیں ڈالیں۔ عدنان کی آنکھوں میں اُس وقت دیوانوں کی سی چمک نظر آتی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دُور، بہت دُور کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ پھر وہ آہ بھر کر کہنے لگا "میں کبھی وہ دن نہیں بھُولا"

نیلوفر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "آفندی میں نیلوفر ہوں، شہر کے کلب گھر والی آپ کی پرانی خادمہ"۔

عدنان نے ملاطفت سے کہا "ہاں تم نیلوفر ہی ہو۔ کیا تمہیں یہ شک ہے کہ مجھے یاد نہیں ؟"

(بہ تصرف از زونا گیل)

حامد علی خاں

---

(۱)

سرخ گلاب ہیجانی کیفیات کا پتہ دیتا ہے، اور سفید پاک محبت کی نشانی ہے۔ گویا احمریں گلاب بمنزلہ شاہباز کے ہے اور بلوریں قمری کی مانند ہے۔

(۲)

اے دلنواز، میں تجھ کو ایک بلوریں کلی بھیجتا ہوں جس کی پتیوں کے سر پر گلابی تاج ہے کیونکہ پاک اور بے لوث محبت کے لبوں پر ہمیشہ بوسۂ آرزو کا نشان ہوتا ہے۔

احمد الدین مارہروی

رخصت!

بہے چلی جا، سرد اور شیریں پانی کی ندی! بے پایاں، نیلے سمندر کی سمت۔ دامن میں اپنی نوخیز موجوں کا نذرانہ لئے ہوئے ―― بہے چلی جا۔

آہ میرے پُرشوق قدم آج تیرے کنارے کی محبوب ریت پر اپنا آخری نقش چھوڑ تے ہیں۔

بہے چلی جا ―― اسی پر سکون رفتار سے، دھیمے، دھیمے ―― مرغزار اور سبز مخملیں خطوں میں سے ہوتی ہوئی۔

جب زمانہ تجھے ―― اے ننھی سی ندی! ایک پُرشور دریا میں تبدیل کر ڈالے۔ کہیں بھی تیری ریت پر پھران تھکے ہوئے قدموں کا نشان نظر نہ آئے گا۔ لیکن بید مجنوں کا درخت سائیں، سائیں کرتے ہوئے جھونکوں کے درمیان یونہی رک رک کر آہیں بھرتا رہے گا اور اس کی کانپتی ہوئی شاخیں یونہی تجھ پر جھکی رہیں گی۔

اور نازک پروں والی شہد کی مکھی ہر موسم بہار میں اسی طرح تیرے آرپار بھنبھناتی ہوئی اڑتی پھرے گی۔

ہاں ہمیشہ یہ سب یونہی رہے گا۔

سالہا سال سورج کی جھلملاتی ہوئی کرنیں تیری سطح پر یونہی آکر تیریں گی اور سالہا سال چاند کا نورانی عکس تیرے سیمیں پانیوں کے اندر لرزتا رہے گا۔

لیکن یہ قدم آج ہمیشہ کے لئے تجھ سے رخصت ہوتے ہیں۔

آہ رخصت ―― ہمیشہ کے لئے۔

(ترجمہ)

"زیب"

اصلاحِ ادب

(۲)

بہ سلسلۂ اشاعتِ مارچ

نثر

فقرہ۔ احسن صاحب بمع جناب انور کے مشاعرے میں گئے تھے۔

اصلاح۔ احسن صاحب مع جنابِ انور (بہ سکونِ عین وکسرۂ باء) کے مشاعرے میں گئے تھے۔

یا

احسن صاحب مِع جنابِ انور (بہ کسرۂ عین و باء) مشاعرے میں گئے تھے۔

وجہ:۔ "بمع" میں "ب" زائد ہے۔

فقرہ۔ اغلباً یہ ڈراما آپ کا شاہکار ہے۔

اصلاح۔ غالباً یہ ڈراما آپ کا شاہکار ہے۔

وجہ۔ عربی میں "افعل التفضیل" پر تنوین نہیں آتی۔ اسی طرح "اوسطاً" بھی غلط ہے۔

فقرہ۔ ہندوستان کے اصلی باشندے جنگلوں میں رہائش رکھتے ہیں۔

اصلاح۔ ہندوستان کے اصلی باشندے جنگلوں میں بودوباش رکھتے ہیں۔

یا

ہندوستان کے اصلی باشندے جنگلوں میں رہتے ہیں۔

وجہ۔ اردو مصدر "رہنا" سے فارسی قاعدے کے مطابق "رہائش" حاصل مصدر بنا لینا صحیح نہیں۔

فقرہ۔ اس خاطر ومدارات کے لئے مشکور ہوں۔

اصلاح۔ اس خاطر مدارات کے لئے ممنون ہوں۔

وجہ:۔ "خاطر" تواضع کے معنی میں ہندی ہے اور مدارات عربی لہٰذا واوِ عطف جائز نہیں۔ (۲) "مشکور" "پسندیدہ" کے معنی ہیں صحیح لیکن "ممنون" کے معنی میں غلط ہے۔

فقرہ۔ چُپ کرو کیا چیخ وپکار لگا رکھی ہے؟

اصلاح۔ چُپ رہو۔ کیا چیخ پکار لگا رکھی ہے؟

وجہ۔ (۱) "چُپ کرنا" "خاموش ہونا" کے معنی میں پنجابی ہے۔ لیکن اردو میں "خاموش کرانا" کے معنی میں مستعمل ہے۔ (۲) "چیخ" اور "پکار" دونوں ہندی ہیں۔ اس لئے واوِ عطف غلط ہے۔

فقرہ۔ اُف۔ آپ نے یہ کیسی سنسنی خیز خبر سنائی۔

اصلاح۔ اُف۔ آپ نے یہ کیسی سنسنی پیدا کر دینے والی خبر سنائی۔

وجہ۔ "سنسنی" ہندی ہے اور "خبر" فارسی اس لئے ترکیب غلط ہے۔ اس کی جگہ کپکپا دینے والی "یا لرزہ خیز" بھی مناسب موقع لکھ سکتے ہیں۔

فقرہ۔ آپ کو اسے زدوکوب کرنے کا مجاز نہیں۔

اصلاح۔ آپ اسے زدوکوب کرنے کے مجاز نہیں۔

وجہ۔ "مجاز" اختیار کے معنی میں غلط ہے

فقرہ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتفاق و یگانگت سے رہنا چاہئے۔

اصلاح۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتفاق و یگانگی سے رہنا چاہئے۔

وجہ۔ "یگانہ" فارسی ہے۔ اس لئے عربی کے قاعدے سے اس کا حاصل مصدر بنانا غلط ہے۔

فقرہ۔ رفیق بیچارہ کئی سالوں سے بیمار ہے

اصلاح۔ رفیق بیچارہ کئی سال سے بیمار ہے

یا

رفیق بیچارہ برسوں سے بیمار ہے

وجہ۔ "سال" کی جمع "سالوں" سے ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

فقرہ۔ میں جناب کے گرامی نامے کے مطالعے کے دوران میں کئی بار ہنسا۔

اصلاح۔ میں جناب کا گرامی نامہ پڑھتے پڑھتے کئی بار ہنسا

وجہ۔ توالیِ اضافات (کے کے کے) ہر زبان میں مکروہ ہے۔

فقرہ۔ آپ کی غزل کے دو اشعار مجھے بہت پسند آئے۔

اصلاح۔ آپ کی غزل کے دو شعر مجھے بہت پسند آئے۔

وجہ۔ "اشعار" دو سے زیادہ کے لئے لکھنا چاہئے۔ اسی طرح "دو احباب" "دو آرار" "دو شعرا" "دو وزرار" وغیرہ بھی صحیح نہیں۔

فقرہ۔ نہ تو آپ جلسے میں خود تشریف لائے اور نہ ہی اپنی نظم ارسال فرمائی

اصلاح۔ نہ تو آپ جلسے میں خود تشریف لائے اور نہ اپنی نظم ہی ارسال فرمائی۔

وجہ۔ "نہ ہی" لکھنا صحیح نہیں۔

فقرہ۔ وہ سطحِ سمندر پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

اصلاح۔ وہ سمندر کی سطح پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

یا

وہ سطحِ بحر پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

وجہ۔ "سطح" عربی ہے اور "سمندر" ہندی۔ اس لئے اضافت غلط ہے۔ اسی طرح "عرصۂ دراز" "عالمِ سنسان" "آغوشِ مچھر" "مینارِ بلند" وغیرہ سب ترکیبیں غلط ہیں

فقرہ۔ اس تازی مٹھائی کے تین جدے جدے حصے کردو۔

اصلاح۔ اس تازہ مٹھائی کے تین جدا جدا حصے کر دو۔

وجہ۔ "تازہ" کی "ہ" اور "جدا" کا الف کسی صورت میں بدلے نہیں جا سکتے۔

فقرہ۔ آپ تاہنوز یہیں ہیں؟

اصلاح۔ آپ ہنوز یہیں ہیں؟

یا

آپ ابھی یہیں ہیں؟

وجہ۔ "تاہنوز" میں "تا" زائد ہے۔

فقرہ۔ دہلی میں متعدد عالی شان عمارتوں کے کھنڈرات زبانِ حال سے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں کی عظمتِ رفتہ کے افسانے سنا رہے ہیں

اصلاح۔ دہلی میں متعدد عالی شان عمارتوں کے کھنڈر زبانِ حال سے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں کی عظمتِ رفتہ کے افسانے سنا رہے ہیں۔

وجہ۔ "کھنڈر" ہندی ہے۔ اس لئے عربی قاعدے سے اس کی جمع بنانا غلط ہے۔

نظم

شعر۔ لاش پر میری پیامی کامیاب آیا تو کیا
بعد میرے میرے نامے کا جواب آیا تو کیا

اصلاح۔ میری میت پر جو قاصد کامیاب آیا تو کیا
بعد میرے، آہ اگر خط کا جواب آیا تو کیا

وجہ۔ "لاش" نہایت مکروہ لفظ ہے۔ "پیامی" بھی اچھا نہیں مصرعِ دوم میں دوسرا "میرے" حشو ہے

شعر پھر یہ فوجِ قہر موج اک حشر برپا کر گئی
برقِ طوفاں تھی۔ جدھر چمکی صفایا کر گئی

اصلاح پھر یہ فوجِ قہر موج اک حشر برپا کر گئی
برقِ خائف تھی کہ گری جس جا صفایا کر گئی

وجہ۔ برق چمک کر نہیں بلکہ گر کر صفایا کرتی ہے۔

شعر۔ دکھانا دل میں رہ کر دل کو شانِ دلنوازی بھی
کہ گھر دل میں مرے اے دردِ عشقِ یار کر لینا

اصلاح دکھانا دل میں رہ کر دل کو شانِ دلنوازی بھی
ہمارے دل میں گھر اے دردِ عشقِ یار کر لینا

وجہ۔ دوسرے مصرع میں "کہ" حشو ہے۔

شعر۔ خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں۔

اصلاح تجھی سے خدا مجھ کو محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں

وجہ (۱) "تجھ سے ہی" غلط اور "تجھی سے" صحیح ہے (۲) "تجھی سے" کو شروع میں لانے سے اس پر زور آ گیا۔ جو شاعر کا اصل مقصد ہے۔

شعر۔ یہ خونِ گشتہ تمنا عالی کی اک روز چمکے گی
بزبانِ غازہ استقبال کے رخسارِ روشن پر

اصلاح یہ خونِ گشتہ تمنا عالی کی اک روز چمکے گی
برنگِ غازہ استقبال کے رخسارِ روشن پر

وجہ۔ "بزبانِ غازہ" سے "برنگِ غازہ" کہیں بہتر ہے جس سے سارا شعر چمک اٹھا۔

شعر۔ پھر گردشِ افلاک سے آزاد رہے گی۔

دنیا ترے کوچے میں گر آباد رہے گی

اصلاح۔ پھر گردشِ افلاک سے آزاد رہے گی
دنیا ترے کوچے میں جو آباد رہے گی

وجہ۔ "گر" بجائے "اگر" بالاتفاق متروک اور "آباد" کا الف تقطیع میں گرتا ہے۔

شعر۔ کیا کریں جا کے مدینے سے کہیں اب ...
کون اب روضۂ سلطانِ عرب سے اٹھے

اصلاح۔ کیا کریں جا کے مدینے سے کہیں اے ...
کون اب روضۂ سلطانِ عرب سے اٹھے

وجہ۔ پہلے مصرع میں "اب" حشو ہے۔

شعر۔ کس طرح ہم کو ہو پتہ کس طرف آپ کا ہے رُخ
ایک ہی نورِ حسن ہے حلقۂ شش جہات میں

اصلاح۔ ہم کو پتہ ہو کس طرح کس طرف آپ کا ہے رخ
ایک ہی نورِ حسن ہے حلقۂ شش جہات میں

وجہ۔ طرح کی "ح" تقطیع میں گرتی ہے۔

شعر۔ کھل گئے عیب و ہنر سب کاتبِ تقدیر کے
رنگ میں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے

اصلاح۔ کھل گئے عیب و ہنر صورت گرِ تقدیر کے
رنگ میں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے

وجہ (۱) پہلے مصرع میں "سب" حشو ہے
(۲) "کاتب" مصور نہیں ہوتا۔

شعر۔ تم ماہ نیم ماہ اگر ہو تو کیا ہوا
میں بھی تو آفتابِ لبِ بام ہو گیا

اصلاح۔ تم بڑھ کے حسن میں جو ہوئے مہرِ نیم روز
میں گھٹ کے آفتابِ لبِ بام ہو گیا

وجہ۔ بڑھنے اور گھٹنے سے معشوق کے خورشیدِ حسن اور عاشق کے آفتابِ لبِ بام ہونے کا پورا پورا ثبوت مل جانے کے علاوہ تقابل کے حسن نے شعر کو چار چاند لگا دیے۔

شعر۔ اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو خوب ہے
زنار ڈالیے ترے پھولوں کے ہار کا

اصلاح۔ اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو گل کھلیں
زنار ہاتھ آئے کسی گل کے ہار کا

وجہ (۱) شاعر کو جو مضمون سوجھا تھا وہ خوبی سے بندھ نہ سکا (۲) "ترے" میں تخصیص ہے اور "کسی" میں تعمیم۔ اور ایسے موقع پر "تعمیم" "تخصیص" سے کہیں پر لطف ہوتی ہے۔

شعر۔ ہو رہا ہے نئے انداز سے زنداں تعمیر
چُن کے دیوانے چنے جاتے ہیں دیواروں میں

غلطی۔ "چن کے" صحیح نہیں۔ "چن چن کے" محاورہ ہے۔

نشتر جالندھری

غزل

جب تک نہ پھر آؤ گے یہی یاد رہے گی
نالہ یہی ہوگا یہی فریاد رہے گی

بتلاؤ کبھی ہوگی عنایت کی نظر بھی
یا ہم پہ ہمیشہ یہی بیداد رہے گی

دل دینے میں مجبور ہی کچھ ہو گئے ورنہ
معلوم تو تھا زندگی برباد رہے گی

جب بیٹھ گئے آن کے غم بھول گئے ہم
سیفی یہ تری زندہ دلی یاد رہے گی

سیفی نوگانوی

غزل

پھر امتحاں ہے دیدۂ حیرت پناہ کا
پھر قصد کر رہا ہوں تری جلوہ گاہ کا

پیغامِ مرگ تھا دلِ حرماں نصیب کو
ملنا وہ اور مل کے پلٹنا نگاہ کا

کہتی ہیں صاف اُن کی پشیماں نگاہیاں
احساس ہو گیا مرے حالِ تباہ کا

طغیانیاں ہیں اشکِ ندامت میں دیکھنا
اُچھلے گا ڈوب کر نہ سفینہ گناہ کا

صدقہ نگاہِ مست کا ساقی وہ مے پلا
احساس بھی رہے نہ ثواب و گناہ کا

پھر جانوں تم کو دعوئ تمکین و ہوش ہو
کیفی جو حسن دیکھو تم اُس رشکِ ماہ کا

محمد علی کیفی

خانم

اللہ جمیل و یحب الجمال

مندرجۂ بالا عنوان کے معنی ہوئے کہ خداوندِ تعالیٰ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہ تو ہوئے اس کے معنی اور اب لگے ہاتھوں میں تفسیر بھی کئے دیتا ہوں ؎

(۱)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اتوار کے دن صبح لڑکے ٹہلنے کی نیت سے گھر سے نکلا۔ پھر سوچا کہ کون دیکھتا ہے ذرا خاں صاحب کے ہاں ہو آئیں۔ میں نے احمد کو پکارا "ادبے"۔ میں نے کچھ دھمکاتے ہوئے کہا "دیکھتا ہے بے" ہم ذرا . . . وہ ہم ذرا . . . ذرا خاں صاحب کے یہاں جا رہے ہیں . . . . . یاد رکھنا چمڑی ادھیڑ دوں گا جو کہیں . . . ."

احمد نے معنی خیز طور پر سر ہلا کر کہا "بہت اچھا سرکار" اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ خانم پوچھے گی تو یہی کہہ دے گا کہ کھیتوں کھیت ٹہلنے گئے ہیں۔ خاں صاحب کے یہاں نہیں گئے ہیں۔ واللہ اعلم یہ بیویاں مردوں کے عزیز دوستوں کے کیوں اس قدر خلاف ہوتی ہیں کہ معلوم بھی ہو جائے کہ ملنے گئے ہیں تو نہ سہی تھوڑی بہت نتھنوں کے ذریعہ سے گرم گرم سانسیں ہی چھوڑیں گی۔

قصہ مختصر کہ میں خاں صاحب کے یہاں پہنچا۔ چوکی پر بیٹھے خضاب دھونے کے لئے ڈھاٹا کھول رہے تھے مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ کس محبت سے انہوں نے کہا ہے "آؤ یار مرزا" میں بیٹھ گیا۔ جلدی جلدی انہوں نے منہ دھویا تولئے سے منہ خشک کیا۔ لڑکے کو اپنے گالی دے کر شطرنج لانے کو کہا اور پھر تیل لگا کر اپنی ڈاڑھی کو چڑھانے بیٹھ گئے۔ ڈاڑھی کے بال دراصل کان تک پہنچ سکتے تھے اور وہ ارادہ کر رہے تھے کہ سر سے ہاتھ بھر اونچے پہنچا دوں۔

ڈاڑھی چڑھانے میں انہوں نے میرے سامنے تجویز پیش کی کہنے لگے کہ پانچ پانچ روپیہ چندہ ہو دریا کنارے چل کر مچھلیاں پکڑیں اور حلوئی پوری رہے۔"

میری باچھیں اس تجویز پر کھل گئیں۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان کی جدت کی داد دی اور اس پُرلطف تحریک کو بے حد پسند کیا۔ ذرا غور کیجئے گا کہ پسند کیسے نہ کرتا۔ دریا کنارے فرش بچھا ہوا ہے۔ حقّہ لگا ہوا ہے۔

بنسیاں پڑی ہوئی ہیں اور شطرنج ہو رہی ہے۔ قصہ مختصر میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے لفظ "مگر" کا استعمال کر کے وعدہ کیا کہ کل تک ہم اس کا جواب دے سکیں گے کہ ہم شرکت کر سکیں گے بھی یا نہیں۔

خاں صاحب تجربہ کار آدمی "کیوں" اور "کیا" سے دو تین جرح کے جو انہوں نے سوال کئے تو تاڑ گئے۔ پھر آخر رازدار میرے ٹھہرے سب جانتے تھے کہنے لگے کہ "تمہاری گھر میں" یوں ٹھیک نہ ہوں گی۔ ہم بتائیں ترکیب؟

میں خوش ہو گیا کہ یہ ماہرِ نسائیات اب مجھے کوئی نسخہ بتاتا ہے۔ چنانچہ میں نے خوش ہو کر کہا۔ "وہ کیا؟"

خاں صاحب نے اپنی انگلی ٹیڑھی کر کے اُس کا ہک بنایا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ "مرزا صاحب۔ میں تو کہہ چکا کہ یہ گھی سیدھی اُنگلی نہیں نکلے گا یہ تو اب ایسے نکلے گا" یہ کہہ کر انگلی کا ہک میری آنکھوں کے سامنے نچایا۔

"لاحول ولاقوۃ" میں نے کہا "کوئی ترکیب تو آپ بتاتے نہیں ہیں یہ تو پچاس دفعہ سُن چکے"

ایک دم سے سنجیدہ ہو کر خاں صاحب نے کہا "سن لو میاں کان کھول کر۔ یہ بیوی ہے بیوی۔ یوں ٹھیک نہ ہو گی۔ اگر قابو میں کرنا چاہتے ہو تو میری بتائی ترکیب پر کل ہی سے چلنا شروع۔ . . . بلکہ آج ہی سے عمل کرنا شروع کر دو۔ اگر نہ ٹھیک ہو جائیں تو میرا ذمہ"۔

میں نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے مایوسانہ لہجہ میں جواب دیا "ہو چکیں"۔

خاں صاحب نے شرط کے لئے ہتھیلی پھیلا کر کہا" اور روپیہ جیتو آنہ ہارو"

میں نے مُسکرا کر کہا" واللہ مذاق گیا چولہے میں قسم کھاتا ہوں آج ہی سے عمل کر دوں گا۔ آپ بتایئے ترکیب"

خاں صاحب نے جوش میں آ کر بیک وقت کئی طرح سے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سن لو کان کھول کر تمہیں اُن سے لڑنا پڑے گا اور ان کی ہر بات کا کاٹ کرنا پڑے گا"۔

میں نے دل میں گذشتہ جنگوں کو معرکہ خیز حالات پر غور کیا۔ ویسے تو میں گھر والی سے اکثر لڑ چکا ہوں مگر ان تمام لڑائیوں کا نتیجہ کچھ امید افزا نہیں رہا کبھی وہ نہ دبی تو میں دب گیا اور کبھی میں نہ دبا تو وہ بھی نہ دبی چنانچہ میں بجائے خاں صاحب کو جواب دینے کے یہی سوچنے لگا "

خاں صاحب نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو عینک کے اوپر سے جھپکا کر گردن ہلا کر کہا۔ ع

سگِ کار دیدہ بسنجد بجنگ ٭ زردیہ رمد شیر نادیدہ جنگ"

میں نے کچھ شرمندہ ہو کر خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ بھلا کیا جواب دیتا اور کیا کہتا۔ خاں صاحب نے مجھے شرمندہ اور قائل پا کر اپنے داہنے ہاتھ کا گھونسا بنایا اور اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلا کر میرے سامنے کر کے یک لخت اپنے مصنوعی دانت نکال دیئے۔ کچھ منہ چڑا کر سخت طنز کے لہجہ میں کہا "تم بڑے بُزدل ہو۔ ارے میاں سچ پوچھتے

کیا ہو۔ لڑ پڑو ...... ہر بات کا اُن کی کاٹ کرو اور لڑ پڑو" لفظ لڑ پڑو پر زور سے داہنے ہاتھ کا گھونسا دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا اور پھر جھوم کر جنگی جوش و خروش سے کہا یہ کہہ دو ع

بجز کامِ من گر بیاید جواب ہمیں گرز و میدان و افراسیاب

یہ کہتے ہوئے لفظ گرز پر پھر ہتھیلی پر زور سے گھونسا مارا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔

میرے دل میں دفعتہً کچھ جنگی جوش آیا۔ دل میں کچھ امنگ اور بہادری کا سا احساس ہوا۔ ہوں نا آخر چنگیز خاں کی اولاد میں)۔ ایک دم سے خونِ تاتار نے میری رگوں میں جوش مارا ...... میں شیر تھا .... بلکہ ہوں ... مگر کیسا؟ ...... شیرِ نادیدہ جنگ"! اور یہی وجہ ہے جو میں خواہ مخواہ خانم سے دبتا ہوں۔ مگر شیر پھر شیر ہے ...... آگے جا کر پھر شیر ٹھہرا ...... اک ذرا سی جنگی تعلیم کی ضرورت ہے اور بس خاں صاحب سے دو چار باتیں پوچھ لوں اس فن کی کہ گھر والی سے کس طرح کامیابی سے لڑتے ہیں میں نے پوچھا:-

کیا جاتے ہی یک دم لڑنا شروع کر دوں۔ آخر کس بات پر شروع کروں"

خاں صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے "تم بھی عجیب آدمی ہو" میاں ذرا تیور پر بل ڈالے رکھا کرو۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ فوراً اُن کی تمام باتوں کا بات بات پر کاٹ کرنا شروع کر دو اور جو ذرا دہ چیں چپڑ کریں تو بس .... وہیں سانپ کا پھن کچل دو۔ مگر ہاں ایک بات ہے بے بات ہرگز نہ لڑنا۔ پہلے بات پیدا کر لو اور پھر لڑو اور خوب لڑو" میں دانتوں تلے غصہ سے ہونٹ دبا کر جنگ کے مختلف پہلوؤں اور امکانات پر غور کرنے لگا۔

خاں صاحب میرے دلولہ کو تاڑ گئے اور انہوں نے اپنا پر زور لکچر شروع کر دیا ؎

لکچر:- ... بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ گھر والی نہ ہوئی دہ ہو گئی۔ تم ہی تو گھر کے کمائی ہو اور تم ہی کو خرچ کرنے کو نہیں ملتا۔ اس کا یہ کاٹ کرو کہ خود اپنے پاس علیحدہ رقم جمع کرو۔ گھر والی کو بس خرچ کے مطابق دو تم کتنے ہو اخبار والا کوئی روزانہ اخبار نہیں دینا بلکہ اسے انہوں نے کچھ ایسا سکھا دیا ہے کہ وہ تصویروں والا ٹائمز ہفتہ کے ہفتہ لاتا ہے اور وہ خود تصویریں دیکھا کرتی ہیں۔ یہ سب واہیات ہے تصویریں ویسے ہی عورتوں کو دیکھنا منع ہیں اس کا یہ کاٹ کرو کہ بند کر دو ایسے لغو اخبار کو جس میں تصویریں ہوں اور ڈانٹ کر اخبار والے سے روزانہ اخبار منگاؤ ورنہ وی۔ پی سے منگوا لو۔ صابن دانی کہتے ہو غسل خانہ سے انگنائی میں لانے کا حکم نہیں۔ اس کا یہ کاٹ ہوا کہ صابن دانی توڑ دو اور صابن پھینک دو۔ یہ بھی واہیات ہے کہ گھڑی کی طرح ایک وقت پر تمہیں کھانا کھانا پڑتا ہے۔ وہ کون احمق ڈاکٹر ہے جو یہ ان سے کہہ گیا۔ وہی ہوگی میم ... ڈاکٹرنی ...... اول نمبر کی حرّافہ ہے ...... مت آنے دو اُسے اپنے یہاں اور مت کھاؤ کھانا وقت پر۔ میز پر چھوڑ آسمان پر لگ جائے کھانا مت کھاؤ یہ کوئی وجہ نہیں کہ اب تو میز پہ کھانا لگ گیا۔ سب واہیات۔ ہر وقت منہ چلتا رہنا چاہئے۔ بیسن کے سیو۔ ریوڑیاں، مونگ پھلیاں۔ بس ایسی چیزیں جیب

بیں رکھا کرد اور کھاتے رہا کرو۔ عمدہ سوٹ نہیں ملتے پہننے کو تو اس کا یہ علاج ہے کہ انہیں روز پہنو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ کیا کیا تم نے کہ جن دکانوں سے تمہارا حساب ہے وہاں تمہیں کوئی قرض نہیں دیتا غضب خدا کا الٹا معاملہ ہے الٹا تمہاری گھر میں" نے دکانداروں سے کہہ رکھا ہے اگر تم قرض مانگو تو نہ دیں! اماں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ کیا واہیات۔ تم اپنا الگ روپیہ رکھوا اپنے پاس۔ مہینے کے مہینے گھر والی کو خرچ کے لئے دو پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ پیئے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے گن گن کر تم سے الجھتی ہیں۔ ڈبہ اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں۔ اس کا یہ کاٹ کرو کہ دگنے سگرٹ پیو۔ ورنہ میں حقہ بھیج دوں گا۔ غرض ہر بات کا ان کی کاٹ کرو اور لڑپڑو۔"

(۲)

خاں صاحب نے اپنا لکچر بڑے زوروں میں ختم کیا۔ میری رگ رگ میں غصہ کی بھڑکن تھی۔ ایسی سرکش بیوی بغیر لڑے زیر نہ ہوگی۔ خاں صاحب کا مشورہ درست ہے لاحول ولاقوۃ میری بھی حالت قابل رحم ہے کہتے ہیں لوگ کہ تمہاری بیوی بڑی اچھی ہے۔ ادھر کچہری سے واپس آنے کا وقت ہوا اور دیکھ لو اسے کمرہ کے دروازے پر کس بے چینی سے انتظار کرتی ہوتی ہے۔ دوسرے ساتھی سنتے ہیں اور رشک کرتے ہیں کہتے ہیں کس طرح پھول کی طرح کھل کر وہ تمہارا استقبال کرتی ہوگی۔ تمام کلفتیں دور ہوجاتی ہوں گی کام کا بار ہلکا ہوجاتا ہوگا۔ دوستوں کا کہنا بالکل درست ہے جیبوں کا بار بھی ہلکا ہوجاتا ہے۔ ادھر پہنچے اور آنکھ سے آنکھ ملتے ہی پہچان جاتی ہے کہ ہے کچھ جیب میں۔ بس پھر کیا تھا مسکرا کر کندھے پر ہاتھ رکھا اور اندر باہر کی سب جیبیں ٹٹول لیں۔ تمام سحر آفرینیاں یہی ختم ہوجاتی ہیں۔ کچہری سے نیت کرکے چلو کہ کچھ رقم نہ دیں گے مگر وہاں تو سحر آفرینیوں کے پھندے اور تبسم کے جال مارے جاتے ہیں اور پوری جامہ تلاشی ہوجاتی ہے۔ بھلا مجال ہے کوڑی رہ جائے۔ ناممکن غرض میں آپ سے کیا عرض کروں جب سے خاں صاحب سے ملاقات ہوئی ہے دراصل میری آنکھوں کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ مجھے علم ہی نہ تھا کہ ایک شوہر کے کیا حقوق ہیں اور یہ کہ میرے کون کون سے حقوق میری شریک زندگی نے ضبط کر رکھے ہیں بقول خاں صاحب کے مجھے چوڑیاں پہن لینا چاہئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ذلت سے ڈوب مرنا بہتر ہے ۔ ۔ ۔ چلو بھر پانی میں ۔ ۔ ۔ بے حیا ہوں۔ بزدل ہوں۔ دن رات بیوی کی جوتیاں کھاتا ہوں اور زندہ ہوں ! شرم نہیں آتی! اصل معنی میں زن مرید ہوں ! یہ سب سچ ہے اور بقول خاں صاحب کے مجھے لطف زندگی بھی نہیں حاصل۔ موت بہتر ہے گھر میں آؤں تو بقول خاں صاحب کے بیوی کو کانپ جانا چاہئے۔ اُسے سانپ سونگھ جانا چاہئے۔ غضب ہے کہ وہ میرے پہنچتے ہی مجسم زندگی ہوجاتی ہے۔ ذرا نہیں ڈرتی۔ مجال نہیں جو شطرنج کھیلتا رہ جاؤں۔ قصہ مختصر میری زندگی دراصل تلخ ہے۔ بقول خاں صاحب کے میرا ناطقہ بند ہے مجھے احساس کرنا چاہئے کہ میری حالت اب وہ ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد۔ قصہ مختصر ان تمام امور پر غور کرتا میں گھر پہنچا۔ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب میں بھی خانم کو ذرا مزہ چکھاؤں

گا۔سختی سے کام لوں گا۔ اب کی لڑائی ہوگی تو انہیں پتہ چلے گا۔ بغیر سختی کے یہ شورہ پشت بیوی قابو میں نہیں آئے گی جب دروازے میں کمرے کے قدم رکھا ہے تو خیال آگیا کہ خاں صاحب نے کچھ تیور چڑھانے اور غصیل صورت بنانے کا بھی مشورہ دیا تھا ایک دم سے میں نے دانت پیس کر تیور چڑھائے اور کچھ بارعب اور غصیل صورت بنانے کی دو تین دفعہ جلدی جلدی مشق کر کے کہا۔ نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب" گھر میں داخل ہوا۔ مگر کمرے سے الٹے پیر لوٹ پڑا۔ غسل خانہ میں آئینہ دیکھا۔ گال بے حد چکنے ہوتے ہیں میرے۔ میں نے دل میں سوچا کہ بس۔ یہی گال باعث مصیبت ہیں یہی تمام خرابی ہے کہ بہتیرا بارعب شکل بناؤ کچھ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ سوکھی ہوئی کھٹائی کی شکل ہو جاتی ہو شاید گال پھلانے سے کام چل جائے۔ گال پھلا کر دیکھئے مگر یہ خیال غلط نکلا۔ ویسے ہی غصہ در چہرہ میں نے بنایا۔ گھونسا تان کر خود کو آئینہ میں دکھا کر اور لڑنے کا سولہ آنہ ارادہ کر کے میں گھر میں آیا۔

(۳)

مگر میرا گھر میں پہنچنا تھا کہ اور ہی معاملہ درپیش آیا۔ ادھر میں داخل ہوا ہوں اور اُدھر وہ مجسم گلاب کا پھول بن کر میرے سامنے تھی۔ اُس کی چمک دار آنکھوں میں محبت کا نور جگمگا رہا تھا۔ باوجودیکہ میں سخت [illegible]دہ خاطر تھا مگر ایک نظر ہی کافی تھی اور جگر کے پار ہوگئی۔ کس طرح جھپٹ کر اس نے مجھے لیا ہے کہ بیان سے باہر! "الماری" اُس کے منہ سے نکلا۔ آواز میں ایک عجیب و غریب ترنم تھا۔ لبوں پر ایک غضب کی سحر آفریں لرزش تھی اور تمام چہرہ پر مسرت اور شگفتگی اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کا دمکتا ہوا شاداب چہرہ عشق و محبت کے جذبات کا آئینہ دار ہو رہا تھا۔ وہ محبت اور عشق جس نے مجھے فنا کر دیا ہے۔ وہی جو میری تمام ذلتوں کا راز ہے!

جیسے ایک جادو تھا کہ تمام خیالات میرے دل سے آنکھوں آنکھوں میں محو ہو گئے۔ وہ جنگی جوش جس کا میں مظہر ہونے کو تھا کافور ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کا احساس بھی نہ کیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کس محبت سے وہ اپنی نئی الماری مجھے دکھانے کے لئے جا رہی تھی جو ابھی ابھی آئی تھی۔ وہ جس کا اُسے بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔

کمرہ میں پہنچتے پہنچتے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میری داہنی طرف تھی اور میں اس کے بائیں طرف اور ہم دونوں میاں بیوی الماری کے بڑے آئینہ کے سامنے کھڑے بجائے الماری دیکھنے کے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے! میں اُس کو۔ . . . . . دنیا کی حسین و خوبصورت ترین چیز یعنی اُس کے پرفسوں چہرہ کو اور وہ مجھے! یعنی واقعی میرے بدصورت اور کھٹائی نما اور چمرخ چہرہ کو۔ آئینہ کیا تھا۔ یوں کہیئے کہ مجمعِ ضدین کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔

غور سے میں نے آئینہ کو دیکھا۔ آئینہ ایک طلسم سا معلوم ہوا۔ . . . ایک لرزش کے ساتھ زیادہ دلچسپ

اور پھر ایک دم سے ہوش رباسا ہو گیا۔ کیونکہ میں نے اپنے کندھے پر ہاتھ کا ایک ہلکا سا دباؤ محسوس کیا اور دفعتہً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھ نہیں بلکہ میرے کندھے پر کسی نے چنگاری رکھ دی!!

آئینہ سے نظر ہٹا کر میں نے اپنے داہنی طرف دیکھا .... عشق و محبت کی بجلیاں لپک رہی تھیں۔ آنکھیں نہیں بلکہ ایک جھپکتا ہوا نور تھا .... سانس نہیں بلکہ بوئے محبت سے مہکتی ہوئی عشقِ حقیقی کی طوفاں خیز رُوح تھی۔ چہرہ تھا کہ "اللہ جمیل ویحب الجمال" کی جیتی جاگتی تفسیر! .... لازوال عشق و محبت کا ایک متلاطم و طوفان خیز بحرِ بیکراں تھا جس نے اپنی موجوں میں مجھے گُم کر دیا .... میں نے اپنے کو سچ مچ ڈوبتے ہوئے محسوس کیا .... تنکے کا سہارا .....

ایک بچے کو جس طرح کان میں گھڑی لگا کر اُس کی ٹِک ٹِک سناتے ہیں بس بالکل اسی طرح میں بھی اپنی پیاری مگر سرکش بیوی کو اپنے دل کی دھڑکن سنا رہا تھا!! اس کا سر میرے سینے پر تھا اور وہ غور سے میرے دل کی دھڑکن یا ٹِک ٹِک کان لگائے سن رہی تھی اور ساتھ ہی اپنا تمام غرور و سرکشی چھوڑ کر کس طرح نہایت ہی بھولے پن سے اپنی نشیلی اور جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی .... یا شاید خود میری آنکھوں میں ہو کر میرے دِل کی گھڑی کی نازک بالکمانی کو چُھو رہی تھی! اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دل کی گھڑی کہیں چلتے چلتے ایک دم رُک نہ جائے!!

ذرا غور کیجیے کہاں ایک مجھ سا گنہگار و احمق بندہ اور کہاں حضرت موسےٰ۔ مگر خدا کی دین تو خدا کی دین ہے۔ خود حضرت موسےٰ ہی اس کے شاہد ہیں .... کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے اُن سے تو خدا نے کہا "لن ترانی ......" اور مجھ سے! .... یہ ایک سوال تھا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے ......"

میں یہ مسائلِ علوی طے کر رہا تھا کہ دفعتہً باہر ملازم لڑکے نے کسی کو پکارا کہ میں گویا چونک پڑا

عظیم بیگ چغتائی

نوائے مضطر

آج تک یاد ہے وہ عیش و طرب کی بارش
ہائے مجبور کوئی آہ وہ شب کی بارش

یا تو افراط محبت کی ہے یا قلتِ مہر
کشتِ اُمید پہ ہوتی نہیں ڈھب کی بارش

بندہ پرور یہ نہ آنے کے بہانے سارے
مجھ کو معلوم نہیں بند ہی کب کی بارش؟

جور دیکھیں گے نرا لطف و کرم جو چاہا
آگ برسے گی اگر ہم نے طلب کی بارش

کیا کہوں ابرِ بہاری کا برسنا کیا ہے
تیرے رنجور پہ ہے رنج و تعب کی بارش

نہ میسر ہے شراب اور نہ ممکن ہی وصال
خون رلواتی ہے مضطر ہمیں اب کی بارش

بزمِ نشاط و محفلِ عشرت نہیں ہے اب
غمہائے روزگار سے فرصت نہیں ہے اب

یہ تو نہیں کہ تجھ کو محبت نہیں رہی
لیکن وہ اضطرابِ محبت نہیں ہے اب

یا لطف پر بھی شکوۂ بے جا تھے بے شمار
یا جور پر بھی کوئی شکایت نہیں ہے اب

غضب کی شوخیاں ہیں اس نگاہِ فتنہ ساماں میں
نہیں ہی صبر کی طاقت مرے دل میں مری جاں میں

تلاطم ہائے دریا سے ہراساں ہو نہیں سکتے
کہ ہم پائے ہوئے ہیں پرورش آغوشِ طوفاں میں

وہی اک رشتہ ہے زنار اور تسبیح میں مضطر
یہ کیا مہمل سی جھگڑے پڑ گئے ہیں کفر و ایماں میں؟

رام رتن مضطر

اسلامی فنِ تعمیر پر ایک نظر

بہترین فنِ تعمیر وہ ہے جو ساخت کی مشکلات حل کرے اور تخلیقِ حسن میں بھی کامیاب ہو۔ یونانیوں کی بہترین عمارات اس معیار پر پوری اترتی ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ انہیں بہت کم مشکلات پیش آتی تھیں ہموار چھتوں کی یک منزلہ عمارتیں بنانے کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ چند ستون مناسب جگہ پر کھڑے کر دئے جائیں۔ اس خیال کے پیشِ نظر ہم یونانی فنِ تعمیر کو بہترین قرار نہیں دے سکتے۔ رومانی صناع اپنے یونانی پیشرؤں سے دو چار قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتیں اور محرابیں بنائیں لیکن ان کے حقیقی اصول وہی تھے جو یونانیوں نے دنیا کے سامنے پیش کئے تھے۔ ان کے بعد یورپ کی باقی اقوام نے بھی وہی اصول کم و بیش تغیر و تبدل کے ساتھ پیشِ نظر رکھے۔ لیکن فنِ تعمیر کو معراجِ کمال پر پہنچانے کی سعادت مسلمانوں کی قسمت میں لکھی تھی۔

وہ ازلی چنگاری جو قدرت نے عرب کے ایک گوشے میں چھپا رکھی تھی جلد ہی شعلۂ جوّالہ بن گئی اور سرحدِ چین سے ہسپانیہ تک تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آگئی۔ مشرق و مغرب عرب جہانداروں کی تہذیب سے آشنا ہوگئے جو دنیا کے لئے آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ جو ساسانیوں، یونانیوں اور رومانیوں کے تخریبی حربوں سے متنفر تھی۔ اور جو محکوم قوموں کے ادب اور فنونِ لطیفہ کو تباہ کرنے نہیں آئی تھی بلکہ انہیں فروغ دینے اور ان کے مردہ اجسام میں نئی روح پھونکنے کے لئے ظاہر ہوئی تھی۔ بخت نصر نے ہیکل کو برباد کیا لیکن عمر فاروق نے مفتوح بیت المقدس میں تاریخی عمارتوں کو برقرار رکھا۔ بلکہ ان میں ایک مسجد کا اضافہ کیا جو سادگی اور خوبصورتی کے لئے تعریف کی مستحق ہے۔

مغربی نقاد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اسلامی فنِ تعمیر میں نقل کا عنصر غالب ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دبی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے رعایا کے فنون کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے بجائے انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ وہ جہاں جہاں گئے اپنی فتح کے شاندار نشانات چھوڑتے گئے۔ جو رہتی دنیا تک اُن کی عظمت کی داستان اہلِ نظر کو سناتے رہیں گے۔ انہوں نے صنّاعی کے ایسے لاجواب نمونے اہلِ عالم کو پیش کئے ہیں جن میں یونانیوں کی سادگی رومانیوں کی شان اور مصریوں کی تحیر انگیزی بیک وقت موجود ہے۔ اس کے علاوہ دل آویز بیل بوٹے بنانے اور رنگ آمیزی کا کمال جیسا مسلمانوں کی عمارتوں میں ہے، اور کہیں نہیں۔ رنگ دار پتھر

استعمال کرنے کا خیال بھی پہلے پہل انہی کو آیا تھا۔ ہسپانیہ کے اسلامی بادشاہوں کا محل "الحمرا" جو سرخ پتھروں کا بنا ہوا ہے اس خیال سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ شاندار محل جو آج تک دنیا کے عظیم ترین عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے چودھویں صدی عیسوی میں بننا شروع ہوا اور نصف صدی تک پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کی تعمیر میں صرف خوبصورتی ہی کا خیال نہیں رکھا گیا بلکہ اس کے ہر نقش میں معمار کی جدتِ طبع کا ثبوت ملتا ہے۔ محل کا جو حصہ بیت الاساد کہلاتا ہے مسلمانوں کی اختراع کی شہادت دیتا ہے۔ یہ ایک صحن ہے جو چاروں طرف نظر فروز منقش محرابوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے وسط میں ایک فوارہ ہے جس سے پانی ایک طشت میں گرتا ہے جو سنگین شیروں نے اٹھا رکھا ہے۔ اور جس سے پانی شیروں کے منہ سے نکلتا ہے۔

شہزادیوں کے غسل خانے مچھلیوں کا تالاب اور بادشاہ کی خواب گاہ بیت الاساد سے کچھ کم حیرت انگیز نہیں اگرچہ موخرالذکر کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی محرابیں بلاضرورت بنائی گئی ہیں کیونکہ چھت کا بوجھ ستونوں نے اٹھا رکھا ہے۔ اس لئے محرابوں کو بنانا تضیع اوقات کے مترادف ہے۔ مگر اسی "تضیع اوقات" کے طفیل انسان کی نظر پر ایسا جادو ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ان محرابوں کو دیکھ کر زندگی کی کلفت سے رہا ہو جاتا ہے۔ اور چند لمحوں کے لئے ہماری غبار آلود فضا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ حسن کا کمال یہی ہے۔ کہ وہ دیکھنے والے کو بیکارِ حیات سے تھوڑی دیر کے لئے بے نیاز کر دے۔ یہی آرٹ کا مقتضا ہے۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی "تضیع اوقات" کے عادی مسلمانوں نے اس مقصد کو نظر انداز نہ کیا۔

زمانہ کے انقلابات سے الحمرا محفوظ نہیں رہا۔ اور جا بجا شکست و ریخت کے آثار اس میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے مغربی نقاد اس کی طرف انگلیاں اٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان صرف وقتی مصلحت کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے شوخ اور جلد مٹ جانے والے رنگ استعمال کئے۔ انہوں نے خوبصورتی کے لئے استحکام کو نظر انداز کیا۔ عمارت تو بنادی۔ لیکن اس کی حفاظت خدا پر چھوڑ دی۔ مگر الحمرا کی قدامت خود اس اعتراض کا جواب دے رہی ہے۔ اور شوخ رنگوں کے استعمال کے مجرم صرف مسلمان ہی نہ تھے۔ یونارڈو دا ونچی بھی تھا۔ اور ٹیشین بھی جبے وہ آسمان پر چڑھا رہے ہیں اس لحاظ سے کچھ کم قصوروار نہ تھا۔

الحمرا کے بعد ہماری نظر قرطبہ کی مسجد جامع پر پڑتی ہے۔ عینی شاہدوں کا قول ہے۔ کہ ایسی مسجد کی نظیر دنیا میں مشکل ہے۔ محرابوں کا ہجوم ایسا ہے کہ دیکھنے والے پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ نقادانِ فن کا فیصلہ ہے کہ مصر کے سوا کوئی ملک اس جیسی مسجد پیش نہیں کر سکتا۔ اس میں عربی رنگینی اور رومانی شان یکجا نظر آتی ہے۔

ہسپانیہ میں اس کے علاوہ کئی اسلامی عمارات ہیں جو اس ملک کی کور ذوقی کا ماتم کر رہی ہیں۔ غرناطہ میں شاہانِ اسلام کا گرمائی محل اور اشبیلیہ میں "القصر" اور منارۂ فتح ہسپانویوں کی دستبرد سے نالاں ہیں۔ انہوں نے

دخرالذکر کو گھنٹہ گھر بنانے میں جو ظلم آرٹ پر کیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔

ہسپانیہ کے بعد ترکی کی عمارات ہماری توجہ منعطف کرتی ہیں۔ ان میں بازنطینی رنگ نمایاں ہے۔ اور عموماً مسجد ایاصوفیہ کے طرز کی ہیں۔ ان میں سلطان احمدؒ سلیمان اور بایزید کی مسجدیں قابلِ ذکر ہیں۔

مصر فلسطین اور ایران بھی خوبصورت عمارتوں پر کم ناز نہیں کر سکتے۔ مصر میں قایدبے کی مسجدؑ فلسطین میں مجدِ عمر اور ایران میں مسجدِ اصفہان قابلِ دید ہیں۔ لیکن ان تمام عمارات سے بھی زیادہ قابلِ ذکر مدینہ کی مسجدِ نبوی ہے جو آرٹ کے شائقین کو سبق دیتی ہے۔ کہ سجاوٹ سے سادگی زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ جو شان ہمیں وینس (حسن کی دیوی) کے یونانی مجسمہ میں نظر آتی ہے اس میں بھی ہے۔

یونانی' رومانی اور بازنطینی عیون کا جو اثر اسلامی فنِ تعمیر پر ہوا اس کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ مصری اصولِ تعمیر اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ اہرام مصر کو دیکھ کر بعض مسلمان بادشاہوں کو بھی شاندار مقبرے بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ ان مقبروں میں سے بہترین وہ ہے۔ جس میں خلیفہ ہارون الرشید کی چہیتی بیگم زبیدہ دائمی نیند میں محو ہے۔ یہ مقبرہ جس کی ساخت ہشت پہلو ہے۔ اور جس کی چھت عجیب اہرام نما ہے۔ الف لیلہ سے بھی زیادہ ہارون کی شہرت کی ضامن ہے۔

ہمارے ہندوستان کا دامن بھی اسلامی تعمیر کے بیش بہا نمونوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ربطِ باہم سے ایک ایسے فنِ تعمیر کا ارتقا ہوا۔ جو اپنی پاکیزگی' موزونیت اور خوبصورتی کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ دہلی کا قطب مینار اور حیدر آباد کے چار مینار قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی عظمت کے پرشکوہ شواہد ہیں۔ ان کے علاوہ مغلوں کے تعمیری آرٹ کے شاہکار ایسے ہیں۔ جن کا شمار ممکن ہے۔ لیکن ان کے اوصاف کا واجبی اور مکمل تذکرہ ممکن نہیں۔ کم و بیش ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں مغلوں کی کوئی نہ کوئی یادگار باقی ہے۔ شاہجہان آباد کا ذرہ ذرہ ان کا مرثیہ خواں ہے۔ آگرہ میں روضۂ تاج محل اور اورنگ آباد' سکندرہ۔ فتحپور سیکری اور دیگر کئی شہروں میں ان کے آثار باقی ہیں۔ ان کا بیان کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ان کی صفات پہلے ہی عالم آشکار ہیں۔

اسلامی عمارتوں پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈالنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ مسلمانوں کا فنِ تعمیر کسی حد تک قابلِ ستائش ہے۔ اور کس حد تک اس کے اصول کامیاب ہوئے ہیں۔ آرٹ سب سے پہلے خوبصورتی کا مطالبہ کرتا ہے اسلامی معمار بھی اسی مطمحِ نظر پر نازاں تھے۔ لیکن وہ استحکام کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں موزونیت درکار تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو ہیرا مٹی کے ڈھیر میں دبا ہوا کام نہیں دیتا۔ وہی انگشتری میں لگ کر اپنی تمام آب و تاب سے چمکنے لگتا ہے اس لئے ہندی معماروں کے برعکس وہ مناسبت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہندو جہاں تل بھر کی جگہ دیکھتے تھے! سے آراستہ کر دیتے تھے۔ ان کی ہر عمارت میں نقش و نگار کی افراط نگاہ کو خیرہ کرتی تھی۔ مگر مسلمان معمار کفایت کا لحاظ رکھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کروڑوں خوبصورت گھونگوں سے پٹا ہوا ساحل سمندر کی سادہ نیلی چادر جتنا جاذبِ نظر نہیں۔

اسلامی معماروں نے فطرت کو اپنا حلیف بنایا۔ وہ اپنی عمارتوں کے مرمریں ہیکل کی خوبصورتی باغات سے دوبالا
کرتے تھے۔ یہ خصوصیت مغلوں کی اکثر عمارتوں میں نظر آتی ہے۔

اسلامی فنِ تعمیر اسلامی تہذیب کا آئینہ ہے۔ ہمیں ہر عمارت میں مسلمانوں کے اخلاق کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آتا ہے۔
ان کا کوہ شگاف عزم ان کی جدت طراز فطرت ان کی سادگی اور ان کی ذہانت ہر نقش دیوار میں دکھائی دیتی ہے۔
ان کی عمارات میں بھڑک اور محض نمود کا نشان تک نہیں۔ انہوں نے موزونیت کو سجاوٹ اور اعتدال کو افراط پر ہمیشہ
ترجیح دی۔ ان کا مطمعِ نگاہ نظر کو فریب دینا ہی نہ تھا بلکہ وہ عقل، روح اور ذوق نگاہ تینوں سے اپنے کمال کی داد
لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے نزاکت کی جگہ شوکت اور وقتی انتفاع کے احترام کی جگہ کمالِ فن کو اپنا مدعا ٹھہرایا۔ ان وجوہ
کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ یونانی، بازنطینی، رومانی اور مصری معماروں کے لائق وارث ثابت ہوئے۔

ہر انسان کی آرزو ہے کہ وہ دنیا میں ایک جنت بنائے، جو اس کو لبھائے اور جس کا روح پر ایک طلسمی اثر ہو
تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان معماروں سے زیادہ کسی کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

عطاء اللہ کلیم

غزل

کیوں عرضِ مدعا کے لئے جا رہا ہوں میں	گویا کسی کی بات میں پھر آ رہا ہوں میں
اے وائے اعتبار! کہ مایوس بھی نہیں	اک عمر سے فریبِ کرم کھا رہا ہوں میں
کچھ بات تھی کہ مجھ سے نگاہیں چُرا گئے	جی کو اسی خیال سے بہلا رہا ہوں میں
جب جانتا ہوں عشق کا انجام جانگداز	کیوں قلبِ نامراد کو بہکا رہا ہوں میں
میری جبیں میں ایک بھی سجدہ نہیں رہا	کس آستاں پہ ناصیہ فرسا رہا ہوں میں
بے سود کیوں ہو میری فغاں بے اثر سہی	تجھ تک پیامِ شوق تو پہنچا رہا ہوں میں

یہ خوب عاشقی ہے کہ جینا حرام ہے
انور! خدا گواہ کہ پچھتا رہا ہوں میں

لطیف انور
گورداسپوری

اردو ادب اور میانہ روی

رسول عربیؐ کا قول ہے کہ سب کاموں میں وہی کام اچھا ہوتا ہے جو درمیانہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو ادب کی چال بھی انیسویں صدی عیسوی کے انجام تک اسی قاعدے پر رہی ہے لیکن اب دس بیس برس سے ایک طرف تو یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ اردو زبان سے فارسی عربی الفاظ کو دور کر دیا جائے اور دوسری طرف سے اس میں عربی اصطلاحات اور محاورات کی ایسی بوچھاڑ ہو رہی ہے کہ اگر سر سید احمد مغفور اور پروفیسر آزاد مرحوم جیسے صاحب علم بھی جی اٹھیں تو اس معرّب اردو کو نہ پہچان سکیں۔ اردو زبان کی بناوٹ ہی عربی فارسی اور سنسکرت کے ملاپ سے ہوئی ہے۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی اس سے نکالی نہیں جا سکتی۔ اگر پہلی دو زبانوں کو اس سے خارج کر دیا جائے تو حساب الجبرہ۔ اقلیدس۔ صرف و نحو۔ طب۔ قانون اور تمام علمی کتابوں کے خزانے جو دو سو سال کی محنت سے جمع ہوئے ہیں، سب ضائع ہو جائیں گے۔ شمالِ ہند سے جنوب تک ان دو زبانوں کے ہزارہا الفاظ اور ترکیبیں زبان زدِ خلائق ہو چکی ہیں۔ جن کو ہر رنگ کے آدمی بلا امتیازِ قوم و مذہب روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور جن کا بدل مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں۔ کہ ہم ایسی اردو ایجاد کریں۔ جس میں جملوں کے جملے استعارات و تشبیہات۔ تلمیحات و کنایات۔ تلازمات و ائتلافات۔ تصورات و توالیعات۔ اشارات و ضمنیات سے پر ہوں۔ یا یہ اسرار حقائق۔ بطن در وں۔ حقیقت الامر۔ الہام و القا۔ اعجاز نما۔ جزالت و نزاکت کے تموج و تلاطم سے مدہوش ہوں یا جذباتِ عالیہ۔ حسیاتِ لطیفہ۔ لزومِ مالا یلزم۔ لا محالہ۔ رندِ لا ابالی۔ سوفیانہ سخیف۔ اساطیر الاولین۔ مناظرہ مرایا۔ مستحضرات و ماضیات۔ عارضی و سرمدی۔ امتدادِ زمانہ۔ پر شکوہ و جزیل۔ سوفیانہ فلسفیانہ حکیمانہ نکات اعلیٰ و ارفع خیالات۔ نیم شعوری اور چشم تخیل کے صنائع بدائع سے ہم حیران ہوں۔ یا تنقید و تعقید۔ تشریح و تشکیل۔ تجرید و تنقیح۔ تفنید و تلمیز کے جارحانہ و مدافعانہ بحرِ ظلمات میں اردو کی کشتی کو چھوڑ دیں۔ جس کے طوفان سے وہ کبھی نکل نہ سکے۔ ایسے معرا۔ عامۃ الورود۔ کیف آور۔ مطلق العنان۔ استبدادی۔ غلو آمیز انفرادی الفاظ سے خدا اہلِ ہند کو محفوظ رکھے۔ آمین

بہتر یہی ہے کہ اردو ادب کے دوست اُس میانہ روی کو جاری رکھیں۔ جس سے اس کی ترقی ہوئی ہے اور جس نے اس کو ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ والسلام

حافظ غلام سرور از پٹانگ ۱۶ مارچ ۱۹۳۲ء

محفلِ ادب

علامہ شبلی مرحوم کا تغزّل

اے خوش آں روز کہ رازم فتد از پردہ بروں ؎ از دو سو طعنۂ دشمن بے زدہ رسوا باشم (شبلی)

قبل اس کے کہ علاّمۂ مرحوم کی غزلوں پر تنقید کروں مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس ماحول کو بیان کر دوں، جس نے شاعر کے جذبات میں ہیجان برپا کر دیا۔ اور اس فضا کی تشریح کر دوں جس میں شاعر کے تخیلاتِ شاعرانہ کی نشو و نما ہوئی۔ ممکن ہے کہ مخصوص طبقہ میرے اس اظہارِ خیالات سے برہم ہو لیکن اب یہ کوئی رازِ سربستہ نہیں رہا ہے بلکہ "خطوطِ شبلیؒ" کے مقدمہ میں مولوی عبد الحق بی۔ اے نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور اب یہ "رازِ عالمِ خلوت" سے نکل کر "منصۂ شہود" پر آشکار ہو چکا ہے۔ بمبئی کی مشہور و محترم خواتین زہرا بیگم فیضیہؒ اور عطیہ بیگم فیضیہ کے اسمائے گرامی سے کون واقف نہیں۔ ان خواتین اور خصوصاً عطیہ بیگم سے مولانا کو جو فرطِ محبت اور ذوق و انبساط تھا وہ اُن خطوط سے نمایاں ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً بیگماتِ مذکورہ کو لکھے تھے۔ علی الخصوص عطیہ بیگم کے نام جو خطوط مولانا نے لکھے ہیں ان سے مولانا کے ایسے ایسے پوشیدہ خیالات ظاہر ہوتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے پبلک میں کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ مولانا کی سیرت کے دو پہلو تھے پبلک اور پرائیویٹ۔ جلوت و خلوت مولانا کو ہرگز یہ امید نہ ہو گی کہ یہ خطوط کبھی شائع بھی ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے ان خطوط میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا یہ مجموعہ جو نوادرِ ادب میں شمار ہونے کے لائق ہے شائع ہو گیا ہے۔ علامہ شبلی نے خود فرمایا تھا ؎

حکایتِ من و او گرچہ رازِ پنہاں بود ؎ بسے نماند کہ ایں حرف داستاں گردد

اس مجموعہ کی ایک جلد میرے پاس بھی ہے اور میں نے ذوق و شوق سے ایک ایک "مکتوبِ محبت" کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر افسوس کہ چند روز ہوئے میرے ایک دوست اس کتاب کو بیدردی سے چھین کر لے بھاگے ورنہ اقتباسات درج کر کے مولانا کے خیالات و جذبات کے نمونے دکھاتا۔ تاہم جو کچھ دماغ میں محفوظ ہیں پیش کرتا ہوں۔ عطیہ بیگم کا ایک خط مولانا کے پاس آیا ہے وہ اس خط کو دیکھ کر اس قدر وارفتہ و بیخود ہو جاتے ہیں کہ سر پہ رکھ لیتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ بمبئی جانے کے تہیہ میں ہیں اور عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں ع "زودی آکہ وایں ہم دیر است"۔ اس مختصر مصرع میں جذبات کی ایک وسیع دنیا مضمر ہے جس کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ عطیہ بیگم ولایت جا رہی ہیں۔ مولانا عالمِ تصور میں

فرماتے ہیں ؎ می روی و گریہ می آید مرا   ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد"

ایک خط میں فرماتے ہیں "اپنی تصویر بھیج دو" ایک نامۂ شوق میں اپنے منتخب فارسی اشعار بیگم کو سناتے ہیں اور ان کی تشریح بھی کرتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ خطوط جن جذبات و کیفیات کے حامل ہیں۔ غالباً کسی اور ادیب کے خطوط کو وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ ان خطوط سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ علامۂ مرحوم طبقۂ نسواں کے متعلق کیا کیا خیالات رکھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ جنسِ لطیف، یہ گلدستۂ جمال، یہ پیکرِ ناز و ادا، یہ صنفِ نازک، یہ جوہرِ نادر، یہ ہستیٔ زیبا، یہ مجسمہ شعر و نغمہ آزادیٔ کامل کی مستحق ہے۔   "ندیم"

بلبلِ ہند سروجنی نیڈو کے چند نغمے

(۱) ہندوستانی جلاہے

طلوعِ صبح کے وقت اے عزیز جلاہو! تم کیا بُن رہے ہو۔ یہ نفیس اور خوبصورت کپڑا جس کا رنگ نیل کنٹھ کے پر کی طرح آسمانی ہے، کیا ہے؟

یہ ایک نوزائیدہ بچے کا جامہ ہے!

غروبِ آفتاب کے وقت اے عزیز جلاہو! تم یہ کون کپڑا بن رہے ہو؟ یہ چمکیلا کپڑا جو نرم اور پرِ طاؤس کی طرح سرخ و قرمزی رنگ کا ہے تم کس لئے بن رہے ہو۔

ہم ایک عروس نو ملکۂ حسن کے روے روشن کے لئے نقاب تیار کر رہے ہیں

اے عزیز جلاہو! ۔ چاند کی خاموش سرد اور غم آگیں کرنوں کی پھیکی روشنی میں تم مغموم و متفکر و سرنگوں بیٹھے ہوئے اس قدر سنجیدگی کے ساتھ یہ کون کپڑا بن رہے ہو؟ ۔ یہ مرغ کے پر کی طرح نرم اور بادل کی طرح سفید رنگ کا کپڑا کس لئے تیار رہے ہو؟

ہم ایک مُردے کا کفن تیار کر رہے ہیں!

(۲) کسترن

مست، تیز اور زود اثر خوشبو دار، لطیف و نازک اور چکیلے پھولو! ۔ تمہاری الجھی ہوئی پنکھڑیاں عطر آلنس کے گہوارے ہیں

ان پنکھڑیوں میں: ۔

سرسوتی   کا غم نہاں ہے
سیتا   کی آرزوئیں چھپی ہیں
دروپدی   کے ارمان پوشیدہ ہیں
دمینتی   کا خوف و ہراس موجود ہے اور
شکنتلا   کے اشک ہائے خونیں ہیں

"زمانہ"

تبصرہ

میکدہ۔ یہ جناب حکیم علی احمد صاحب نیتر واسطی کا مختصر مجموعۂ کلام ہے۔ جس کو انہوں نے پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے (۱) قومی نظمیں (۲) ادبی نظمیں (۳) تغزل (۴) طبی نظمیں (۵) متفرقات۔ کلام صاف اور شستہ ہے اور جو لوگ حکیم صاحب کے طبی کمالات سے واقف ہیں۔ وہ ان کی شاعرانہ نکتہ سنجی کے اس ثبوت کو دلچسپ دیکھیں گے

نمونۂ کلام کے لئے مختلف حصوں سے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

کلفتیں مٹ جائیں گی مشقِ جفا ہونے تو دے
دردِ دل ہونے تو دے یعنی دوا ہونے تو دے

دیکھنا کاشانۂ گلچیں میں لگ جائے گی آگ
بلبلِ خاموش کو آتش نوا ہونے تو دے

معرکۂ حسن و عشق یوں شروع ہوتا ہے:۔

حسن بے پردا ابھی محوِ خود آرائی نہ تھا
عشق اب تک واقفِ آئینِ رسوائی نہ تھا

کاکلِ مشکیں کو پیچ و خم سے آگاہی نہ تھی
حسن کو غمزے سے دل کو غم سے آگاہی نہ تھی

غزل کا نمونہ

بزمِ ساقی ہے، چمن ہے، ابر عالمگیر ہے
پھر دلِ توبہ شکن آمادۂ تقصیر ہے

جنت الفردوس سمجھے ہو جسے تم زاہدو
یہ کسی فرقت زدہ کے خواب کی تعبیر ہے

فصلِ گل آئی ہے اک تازہ جنوں پیدا ہوا
اب نیا صحرا، نیا زنداں نئی زنجیر ہے

حجم ۷۸ صفحات۔ جلد نفیس ہے۔ قیمت ۱۲؍

سید صفات احمد منیجر دلیسی دواخانہ چوک جھنڈے منڈی لاہور سے منگوائیے

رہنمائے سمر یزم۔ مصنفہ جناب مرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی۔ یہ دوسو صفحے کی کتاب ہے۔ جسے حکیم محمد روح اللہ صاحب نے شائع کیا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس فن میں دسترس نہیں۔ لیکن سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کو جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کی زبان بہت اچھی ہے اور یوں بھی دلچسپ لکھی گئی ہے۔ توضیح مطالب کے لئے تصاویر دی گئی ہیں۔ منفعتِ طبی تو ظاہر ہے ان میں قدرتاً موجود ہے لیکن اس کو استعمال میں لانے کے لئے مشق کی ضرورت ہے۔ مشق کرنے کے لئے یہ کتاب بہت مفید تسلیم کی گئی ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ جو زیادہ نہیں۔ حکیم روح اللہ صاحب پتہ وہاپکسٹر لدھیانی کتب خانہ کوچہ ننگراں موچی دروازہ لاہور سے طلب کیجئے

پرچہ نہ پہنچنے کی شکایات

دفتر میں ہر مہینے رسالہ نہ پہنچنے کی شکائتیں آتی ہیں جن کے ازالہ کے لئے فوراً دوسرا پرچہ بھیجا جاتا ہے لیکن بعض حضرات رسالہ نہ پہنچنے کے لئے صرف دفتر "ہمایوں" ہی کو ملزم ٹھہرا لیتے ہیں۔ حالانکہ آج سے نہیں دس سال سے "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نہایت احتیاط سے روانہ کردیا جاتا ہے بات یہ ہے کہ تمام معاصر رسائل کو یہ شکایت ہے۔ کہ ڈاکخانے میں پرچے گم ہوجاتے ہیں اور ہمایوں بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔ اگر کسی مہینے آپ کو پرچہ نہ ملے تو اُس مہینے کی ساتویں تاریخ سے لیکر پندرھویں تاریخ تک آپ ہمیں اطلاع دیکر رسالہ منگوا سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد بھی عموماً ہم پرچہ بھیج دیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ آپ خود متعلقہ ڈاکخانہ کو اپنی ڈاک کی حفاظت کے لئے تاکید کردیں۔ ہم نے خریدار حضرات کی شکائت رفع کرنے کے لئے ڈاک روانہ کرنے میں اس مہینے سے بعض اور احتیاطیں استعمال کرنی شروع کی ہیں۔ اور اب امید ہے کہ ناظرین ہمایوں کو پہلے سے بھی کم شکائت کا موقع ملے گا۔

ہمایوں کے چندے میں رعائت

شائقین "ہمایوں" کی سہولت کے لئے ہم نے رسالہ کا چندہ پانچ روپیہ چھ آنے کے بجائے چار روپے چھ آنے کردیا ہے۔ اس کے علاوہ جنوری ۱۹۳۲ء سے صفحے کی سطریں ۲۲ سے بڑھا کر ۲۵ کردی گئی ہیں۔ اور خط خفی کر دیا گیا ہے۔ اس طرح مواد مطالعہ پہلے سے بہت زیادہ ہوتا ہے منی آرڈر کے ذریعہ سے آپ چار روپے چھ آنے رعائتی چندہ بھیجکر اس بہترین ادبی رسالہ سے سال بھر تک لطف اندوز ہوسکتے ہیں! سال بھر کے بارہ پرچوں کے علاوہ ایک [illegible] مفت [illegible] جائیگا

مینیجر "ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

گنج کی شرطیہ دوا

اور چند حسن و خوبصورتی کے بے نظیر تحفے

تیل نہیں بلکہ سائنٹیفک اصولوں پر تیار شدہ ایک قسم کا خوشبودار میڈیکیٹیڈ لوشن ہے جسکے چند روزہ استعمال سے گنج دور ہوکر سر پر بال جمنے لگتے ہیں۔ بالوں کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ قوت حافظ کو از حد مفید ہے بالوں کو از حد مفید ہے۔ بالوں کو سیاہ کرتا ہے۔ آئندہ بال گھنے اگتے ہیں۔ اگر اس کی آدھی شیشی سے نہ فائدہ ہو باقیماندہ شیشی واپس کرکے پوری قیمت طلب کر لیجئے۔ اس قسم کا دعوےٰ صرف اس لئے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہماری اشیاء سو فیصدی سودمند ثابت ہو چکی ہیں۔ بڑی محنت پوری توجہ اور قیمتی اجزا سے تیار کیجاتی ہیں قیمت فی شیشی (ڈنیش ہیر ٹانک) تین روپے محصولڈاک چھ دو آنے کم ہر

ڈنیش جسٹر یاسمین عورتوں کے بالوں کو لمبا کرنے میں یہ تیل اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ہفتہ کے استعمال سے بال کمر تک بڑھ جاتے ہیں۔ ہندوستان اور یوروپ میں اس کے مقابلہ کی آجتک کوئی چیز [illegible] ایجاد نہیں ہوئی۔ جنہوں نے ایک دفعہ استعمال کیا۔ وہ ہمیشہ کیلئے اسکے گرویدہ ہوگئے۔ قیمت فی بوتل ۲ روپے عام محصولڈاک ۱۲ آنے

ڈنیش گل اندام یہ کریم چہرے کے داغ دھبے کیل چھائیاں دور کرنے کے لئے ایجاد کی گئی ہے۔ اس کے چند روز استعمال سے چہرہ کی سیاہی دور ہوکر گلاب کی پتی کی طرح خوبصورت نکل آتا ہے داغ دھبے اس طرح غائب ہوتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ یورپ کے پوڈر اور پیرس کے غازے اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں۔ فضول اور نکمی چیزیں استعمال کرکے چہرہ نہ بگاڑیئے۔ بلکہ وہ چیزیں استعمال کیجئے جو ہندوستان کی فضا کو مدنظر رکھکر تیار کی گئی ہیں۔ قیمت فی شیشی تین روپے بارہ آنے ۳/۱۲ محصولڈاک دس آنے ۱۰/

دیگر ہر قسم کا [illegible] مثلاً تولیہ۔ بنیان۔ جراب۔ رومال۔ ٹائی۔ ریشمی مال بذریعہ [illegible]

ملنے کا پتہ: — ریاض میڈیکل پرفیومری کمپنی (H) ریاض بلڈنگ لاہور

حضرت علامہ اقبال کا تازہ شاہکار
جاوید نامہ
فارسی نظم میں
چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس عظیم الشان تصنیف میں حضرت علامہ نے
قیمت فی جلد ...

قواعد

۱۔ "ھُمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دِل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئیے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئیے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر رعنہ ۱۲ر۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

بہادر عبد اللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۲

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامۂ فضیلے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامینِ "ہمایوں"

بابت ماہِ جولائی ۱۹۳۲ء

تصویر

بحری سفر سے واپسی:-

یہ ایک قابل امریکن مصور کی تصویر ہے۔ ایک غریب گھرانا ہے۔ پکانے اور کھانے کا کمرہ ایک ہی ہے۔ نوجوان جہازران کی آمد سے جو اپنے پہلے بحری سفر کے بعد واپس آیا ہے گھر بھر خوش ہے۔ اُس کے چھوٹے بھائی اس کے بحری تجربوں کا حال سن کر اس سے مرعوب نظر آ... ہیں۔ وہ شاید بھول گئے ہیں کہ یہ بھی محض ایک لڑکا ہی ہے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے بچے کے چہرے سے یہ بات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔ بڑے بھائی کے دیگ کی تلاشی لینا بھول گیا ہے جس کو اس نے کچھ دیر پہلے شوخی سے اپنے گلے میں لٹکا لیا تھا۔ ننھی بچی اُن عجیب ... کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ جو اس کا بھائی دور دراز ملکوں سے اس کے لئے لایا ہے۔ نوجوان لڑکا اپنی سرد ماں کو سفر کے حالات سنا رہا ہے اور بڑی لڑکی پکانا چھوڑ کر حریصانہ شوق کے ساتھ سفر کی باتیں سننے کو ادھر مڑی ہے۔

ہمایوں کا دسواں سالگرہ نمبر

آنریبل نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری بالقابہٗ

میں اس کامیاب سالگرہ نمبر کی اشاعت پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اردو زبان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اردو سے آپ کی محبت کا ثبوت "ہمایوں" سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے اردو زبان کے بہی خواہوں کو یقیناً آپ کے اس خاموش کام کی قدر کرنی چاہئے۔ ہمایوں کے ذریعہ سے اردو کی ترویج کے سلسلے میں سالہا سال سے آپ جو بے غرضانہ خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ یقیناً شکریے کی مستحق ہیں۔

سر شاہ نواز بھٹو۔ کے ٹی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔ ای۔ ایم۔ ایل سی (سندھ)

ہمایوں کا سالگرہ نمبر ملا۔ یہ اعلیٰ درجہ کا ادبی رسالہ ہے۔ اس کی ادارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دئے جاتے ہیں اور اس کی ظاہری صورت بھی قابلِ تعریف ہے مضامین نظموں اور افسانوں کا معیار بلند ہے۔ اس کے گزشتہ و موجودہ مضمون نگاروں میں شرر، راشد الخیری، سر عبد القادر، حسن نظامی، اکبر، اقبال، جوش ملیح آبادی وغیرہ جیسے اساتذۂ فن کے نام شامل ہیں۔ یہ نام ہمایوں کے شاندار ماضی اور کامیاب مستقبل کے کفیل ہیں۔ میں آپ کو اردو زبان کی اس مفید خدمت کے انجام دینے پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسا بلند مرتبہ علمی رسالہ جاری کر رکھا ہے

ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ ایم اے بیرسٹر ایٹ لا وزیر بلدیات پنجاب

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ میں ہمایوں کے باقاعدہ پڑھنے والوں میں سے ہوں آپ کا سالگرہ نمبر نہایت دلچسپ اور بیش قیمت مجموعۂ علم و ادب ہے۔ مضامین مختلف النوع ہیں اور ان میں سے اکثر بہت بلند مرتبہ ہیں۔ ہمایوں کی نظمیں عموماً حقیقی شاعری کا عمدہ نمونہ ہوتی ہیں۔

میر غلام بھیک صاحب نیرنگ وکیل انبالہ

میں نے ہمایوں کی دہ سالہ خدمات کے متعلق آپ کا تبصرہ پڑھا اور آپ کو سچے دل سے اس مفید ادبی خدمت

بحری سفر ـ واپسی پر

پر مبارک کا مستحق سمجھتا ہوں، ہمایوں نے گذشتہ دس سال کے اندر اردو نظم و نثر میں دلچسپ نفیس اور سبق آموز مضامین کا اضافہ کیا ہے حسن و پاکیزگی کا یہ بلند معیار قائم رکھنا اور سستی ذوق کا بازیچہ نہ بن جانا فی الحقیقت قابلِ تعریف ہے، بالخصوص ایک ایسے زمانے میں جب اس قسم کی ترغیبات کثرت سے موجود ہیں۔ وہ رسالہ جو ہمارے عظیم الشان رہبر، دوست اور فلاسفر کے محبوب و محترم نام سے وابستہ ہو ہمایوں ہی کی طرح کا ہونا چاہئے تھا۔

میاں عبد العزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لا صدر بلدیہ لاہور

میرے دل میں ہمیشہ سے ہمایوں کی قدر ہے۔ ظاہری محاسن کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ بے نظیر ہے مضامین سبق آموز اور بلند پایہ ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ دل آزار مضامین سے آلودہ نہیں ہوتا اور میرے دل میں اس کی بہت قدر ہے۔ میں ہمیشہ اس رسالہ کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھتا ہوں اور ہر مہینے اس کا منتظر رہتا ہوں۔ اس دفعہ کا سالگرہ نمبر بلا شبہ لاجواب تھا۔ میں ہمایوں کا باقاعدہ خریدار ہوں۔

جسٹس جے لال صاحب جج ہائی کورٹ پنجاب

ہمایوں بہت مفید رسالہ ہے اور ظاہری محاسن کے اعتبار سے بھی بہت نفیس ہے۔ آپ کی قابلیت سے یہی توقع تھی۔ میں اس کامیاب سالگرہ نمبر پر آپ کو اور آپ کے شرکائے کار کو مبارکباد دیتا ہوں۔

آنریبل حاجی عبد اللہ ہارون ایم ایل اے (کراچی)

آپ ملک کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں، اس میں خدا آپ کا مددگار ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یہ ہمایوں کا دسواں سالگرہ نمبر ہے۔ فی الحقیقت آپ کا یہ استقلال قابلِ تعریف ہے، میری خواہش ہے کہ ہمایوں ہر مہینے میرے نام آتا رہے۔

آنریبل ملک فیروز خاں صاحب نون وزیر تعلیم پنجاب

ہمایوں کا سالگرہ نمبر ملا اور اسے دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔

جہاں نما

میاں بیوی کے حقوق کا مسئلہ

پچھلے دنوں ایک انگریزی اخبار نے شوہروں اور بیویوں کو شادی کے متعلق اظہار خیال کی دعوت دی۔ ذیل میں مشہور انگریزی ادیب رابرٹ لنڈ اور مسز سلویا لنڈ کے خیالات درج کیے جاتے ہیں

میاں کا مسئلہ

از رابرٹ لنڈ

سوال

کیا آپ کو اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر آپ کی بیوی آپ سے خوش نہ ہو تو وہ حسب مرضی آپ سے قطع تعلق کر لینے کا حق رکھتی ہے۔

کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قسم کا کاروبار کرنے سیاسی مجالس میں شامل ہونے اور اپنے حسب پسند مذہب اختیار کرنے کا اسے حق حاصل ہے۔

جواب

اگر میری بیوی مجھے چھوڑ دے تو میں اس سے یہ نتیجہ نکالوں گا کہ یا تو میں ایک ایسا کندۂ ناتراش شوہر ہوں جس کو ہر بیوی چھوڑ کر بھاگ جائے گی اور یا وہ اتنی احمق بیوی ہے کہ وہ کسی شوہر کے پاس بھی نہ رہ سکے گی

دونوں صورتوں میں شادی کے تعلقات قائم رکھنا میں فضول سمجھوں گا۔

بیوی کا مسئلہ

از سلویا لنڈ

سوال

کیا آپ کے خیال میں بیوی اپنے ہر فعل میں آزاد اور مختار ہے۔

جواب

بیوی اُسی طرح آزاد ہے جس طرح کسی قسم کے اشتراک میں دو حصہ دار آزاد ہو سکتے ہیں۔ اگر دور اندیشی کے لئے نہیں تو کم از کم از راہ مروّت اُسے ہر ایسی بات میں اپنے شریک یا حصّہ دار کی رائے اور مشورہ طلب کرنا چاہیئے جو حصہ دار پر اثر انداز ہوتی ہو۔ اگر مرد ایک جگہ جانا چاہے تو بیوی کو دوسری جگہ جانے پر اصرار نہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح بیوی کی کوئی سہیلی گھر پر آنے والی ہو اور شوہر اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے باہر جانا چاہے تو اسے نہ روکنا چاہیئے۔ بعض باتوں میں شوہر کی رائے کا حصول محض برائے نام ہوتا ہے۔ ایسی باتوں میں اس

باقی رہا بیوی کا شوہر کو چھوڑنے کا حق اس کے
لق (مذہبی نقطۂ نظر سے الگ ہو کر بھی) میرا خیال یہ
کہ اس بات کا فیصلہ بیوی کے اس فعل کے اُن نتائج
ہے جو دوسروں پر مثلاً اس کے بچوں پر (اگر بچے
تو) اور شوہر پر اثر انداز ہونگے ظاہر ہے کہ کوئی انسان
ج سے بے پرواہ ہو کر خوش رہنے کا حق نہیں رکھتا
معیشت، مذہب اور سیاست میں بیوی کے
حقوق ہیں جو شوہر کو حاصل ہیں۔

ایک "شاہ پسند" شوہر کے لئے یہ بات سخت
ن دہ ہوگی کہ اس کی بیوی لوگوں کو بولشوزم کی
م دیتی پھرے۔ اسی طرح ایک بولشویک عورت
ئے صبح صبح چائے کی میز پر ماسکو کے متعلق اپنے
پسند شوہر کے تبصرے باعث کلفت ثابت
گے۔

مذہب کے معاملہ میں میاں بیوی کا اختلاف
بلاشبہ ایک مصیبت ہے لیکن اگر یہ ایک دوسرے
اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرنے لگیں
زیادہ فتنہ پیدا ہو جائے گا۔

سوال

کیا آپ کی بیوی کو حق حاصل ہے کہ وہ خود اپنے
توں کا انتخاب کرے بالخصوص آپ کی مرضی
لاف، یا آپ کا خیال اس کے برعکس ہے یعنی اسے
کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کر دینا چاہئے۔

جواب

بیوی کو یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ شوہر کے اختلاف

کی بہتری کے لئے اس کی رائے نظر انداز کی جا سکتی ہے
مثلاً گھر کی آرائش کی تجدید وغیرہ کا وہ ہمیشہ مخالف ہوگا
ایسی صورت میں اس سے بحث وغیرہ نہیں کرنی چاہئے
بلکہ اسے پرسکون غفلت میں پڑا رہنے دینا چاہئے یہاں
تک کہ کام کرنے والے آکر دروازہ کھٹکھٹانے لگیں۔

سوال

کیا آپ کے خیال میں آپ کے شوہر کو حق
حاصل ہے کہ وہ خاتون دوستوں کا انتخاب آپ کی طرف
سے کسی اعتراض کے بغیر کرلے اور آپ کے علم کے بغیر
تھیٹروں اور ہوٹلوں میں اُن کو تفریح کے لئے لے جائے

جواب

جب شوہر خاتون دوستوں کو انتخاب کرنے
لگے اور ان کو ہوٹلوں میں کھانا کھلانے لگے اس کے دل
میں اپنی بیوی کی محبت باقی موجود نہیں ہوتی۔ ایسی صورت
میں بیوی یا تو اپنے رشک و حسد کا نہایت جوش کے
ساتھ اظہار کرے گی اور شادی کا تعلق جلد منقطع ہو جائے
گا۔ اور یا خاموشی سے مصیبت برداشت کرے گی اور شاید ان کا تعلق اور بھی زیادہ سرعت سے
منقطع ہو جائیگا میرے خیال میں اگر کوئی شوہر اپنی کسی دوست
کو ہوٹل میں دعوت دینا چاہے تو ایسی صورت میں بہتر
یہ ہے کہ یہ بات بیوی کو معلوم نہ ہو یہاں کامل فریب کی
ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنے آپ
کو ذلیل محسوس کرنے اور تکلیف برداشت کرنے پر طیار
ہو جائے۔

بعض اوقات بیوی میاں کی اس قدر گرویدہ
ہوتی ہے کہ وہ اُس کی خوشی کو اپنی خوشی پر ترجیح دیتی

کے باوجود مردوں اور عورتوں میں سے اپنی مرضی کے مطابق دوستوں کا انتخاب کرے لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ ایک معمولی کامیاب شادی میں بھی عورت یہ طرزِ عمل اختیار کرنا مناسب سمجھے۔ اگر کسی میاں بیوی کو محسوس ہوگا کہ دوستوں کی پسند میں ان کے درمیان زیادہ اشتراک نہیں رہا۔ تو انہیں جلد ہی یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ اب ایک دوسرے کو بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اس بات کا جواب کہ بیوی کو مرد دوستوں کے انتخاب میں میاں کے فیصلوں پر سرِ تسلیم خم کرنا چاہئے یا نہیں اس بات پر منحصر ہے کہ بیوی احمق ہے یا نہیں اگر وہ احمق ہے تو وہ شوہر کا فیصلہ نہ مانے گی حالانکہ اسے ماننا چاہئے۔ اگر وہ احمق نہیں تو اس صورت میں وہ خود بھی شوہر کی طرح فیصلہ کرنے کی اتنی ہی اہل ہوگی جتنا شوہر

سوال

کیا آپ کے خیال میں صرف مرد ہی گھر کا مالک ہوتا ہے اور گھر کے تمام معاملات کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ مثلاً گھر میں کتنا خرچ ہو۔ بیوی کپڑوں پر کتنی رقم صرف کرے وغیرہ

جواب

مجھے یقین ہے کہ میں کبھی اپنے گھر کا مالک نہ ہوں گا اگر اس کے لئے خانہ داری کے خرچ کے فیصلے بھی ضروری ہیں۔ مجھے ان باتوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ میں تو شکر اور آٹے کا بھاؤ بھی نہیں جانتا۔ اگر کوئی غیر معمولی صبر و تحمل والی عورت ان باتوں کا ذمہ لینے پر آمادہ ہو تو سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بنک میں م

شترک حساب کھولا جائے اور بیوی بھی چک پر دستخط کرنے کا اسی طرح حق رکھتی ہو جس طرح شوہر۔ میرا خیال ہے کہ روپیہ ختم ہونے پر بنک کے مینجر کا انتباہ اس سے قبل پہنچ جائے گا کہ سنبھلنے کا وقت گذر جائے۔

ہے۔ اس صورت میں تعلقات نہایت ہموار رہتے ہیں اور شوہر کو اخفا یا بیوی کے سامنے ندامت کا اظہار نہیں کرنا پڑتا۔

اگر (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) بیوی کے دل میں شوہر کی محبت باقی نہ رہی ہو تو اسے کچھ پروا نہیں ہوتی کہ شوہر نے کس کو ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ وہ یہ خبر خندہ پیشانی سے سن سکتی ہے۔ مگر اس صورت میں بھی خاتون دوست کے لئے لنچ کی دعوت ڈنر کی دعوت سے زیادہ آرام دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

سوال

کیا آپ کے خیال میں شوہر گھر کا مالک ہے اور اس کے ہر فیصلے کو ماننا آپ کا فرض ہے۔

جواب

یہ سوال کہ مالک کون ہو اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ تمام عورتیں گڑیاں یا کھلونے بن کر رہنے کی آرزومند ہوتی ہیں لیکن شومئی اتفاق سے مردوں کی بھی یہی آرزو ہوتی ہے۔

بچوں کو آزار دینے والے

جانداروں پر تجربات کرنے کا سب سے بُرا پہلو یہی ہو سکتا تھا کہ نام نہاد علمی اغراض کے لئے انسانوں کو عقوبت دی جائے خدا ترس ڈاکٹروں کو مدت سے اس بات کا اندیشہ تھا چنانچہ اب واقعی بعض محققوں نے اپنی یہ مجنونانہ مہم بیکس بچوں کو نہایت جرأت سے آزار دینے کے ساتھ شروع کی ہے۔ علم النفس کے ایک بہت بڑے پروفیسر ڈاکٹر جان واٹسن نے اس کے متعلق حسب ذیل بیان دیا ہے۔

"ابتدا میں ہم اس قسم کے تجربے کرنے سے گریزاں تھے لیکن مطالعہ و تحقیق کی ضرورت اتنی اہم تھی کہ آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک بچے کے دل میں خوف پیدا کر کے دیکھیں سب سے پہلے ہم نے تجربہ کے لئے البرٹ نامی ایک بچہ لیا جس کا وزن ۱۱ مہینے کی عمر میں ۲۱ پاؤنڈ تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز طور پر اچھا بچہ تھا جتنے مہینے ہم اس پر تجربے کرتے رہے ہم نے اسے کبھی روتے نہ دیکھا، البتہ ہمارے تجربوں کے بعد وہ رونے لگا۔"

ان لوگوں نے البرٹ کو کیسے رلایا۔ یہ ایک دلخراش داستان ہے۔ ایک سفید چوہا جس سے البرٹ ہفتوں کھیلتا رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھا گیا وہ گھٹنیوں چل کر چوہے کے پاس آیا۔ جونہی البرٹ نے چوہے پر ہاتھ ڈالا اس کے سر کے پیچھے لوہے کی ایک سلاخ سے ضرب لگائی گئی۔ بچہ خوف سے یکدم اچھل کر نیچے گر پڑا اور چٹائی میں اپنا سر چھپانے لگا، مگر اس وقت بھی وہ نہ رویا البتہ دوسرے تجربے کے وقت وہ سسکیاں لینے لگا اور بالآخر رونے لگا۔ پانچویں دن وہ ہر اُس چیز سے خوف زدہ ہو جاتا تھا جس کے ساتھ وہ پہلے کھیلتا رہا تھا البرٹ پر اس سے زیادہ تجربے نہ ہو سکے کیونکہ اسے مضافاتی علاقے کے کسی خاندان نے لے پالک بنا لیا۔ اُس بچے کا خیال کرو جو اِن خدا ناترس سائنسدانوں نے بچے کی فطرت میں پیدا کرنے کی کوشش کی خوف کے جذبات کا یہ نشو و نما اُس کی ساری زندگی کو غارت کر دینے والا تھا۔

اس کے بعد اور بچوں پر تجربے کئے گئے جن کی عمر تین مہینے سے لے کر سات سال تک کی تھیں بچوں کو دق کرنے والے تجربوں میں سانپوں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ واٹسن کہتا ہے کہ جونہی میں بچے کو سانپ دکھاتا ساتھ ہی میں ایک نہایت خوفناک آواز نکالتا جس سے بچہ پوری طرح سہم کر پیچھے گر جاتا مطلب یہ تھا کہ آئندہ بچے سانپ کی صورت دیکھتے ہی اس طرح سہم جائیں۔

اس کے علاوہ آگ سے بھی تجربے کئے جاتے ہیں۔ بچے کی انگلیاں آگ سے جلائی جاتی ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کا بچہ آگ سے ڈرنے لگتا ہے لیکن کسی شیطان سیرت کے سوا ایک ننھے بچے پر اور کون تجربے کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نوزائیدہ بچوں کے ذریعہ سے خوف کے ردِ عمل کا مطالعہ بہت اچھی طرح سے ہو سکتا ہے، بالخصوص جب وہ سو رہے ہوں۔ اگر اس وقت وہ گرا دئے جائیں تو ردِ عمل عموماً ظاہر ہو گا۔"

خوش قسمتی سے اب اکثر سائنسدان ان ظالمانہ تجربوں کو بے سود خیال کرنے لگے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے تجربوں سے کبھی کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ بہتر یہ ہے کہ انسان بصیرت، فکر اور دماغی قوتوں سے کام لے، لنڈن کے ایک مضمون نگار نے سنڈے ایکسپریس میں ان تجربوں کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:۔

"میں ان بچوں کو آزار دینے والوں سے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بچوں کو ستانے کے بجائے ہمیں اپنے آپ کو ستانے کی اجازت دیں۔ اگر لوہے کی ایک سلاخ ہو اور واٹسن پر مجھے پورا اختیار مل جائے تو میں ایک ہفتہ میں اس کا مرض دور کر دوں گا پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ بے بس بچے سے زیادہ دُور اچھل کر جاتا ہے۔ میں اس پر اس زور کے تجربے کروں گا کہ وہ خود سوچ میں پڑ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تجربہ خانے میں جو نوٹ میں لکھوں گا وہ اُس کے ہذیانات سے زیادہ دلچسپ ہوں گے۔"

کیا مذہب غیر ضروری ہے

لاہوری معاصر "سن رائز" نے بعض اکابر سے عنوانِ بالا کے متعلق اظہار رائے کی درخواست کی۔ ذیل میں ہم ان کے جوابات کے اقتباس درج کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ای۔ ڈی لوکس پرنسپل ایف سی کالج لاہور

مسیح کے قول کے مطابق مذہب خدا کی اور انسان کی محبت کا نام ہے۔ اگر خدا نہ ہو تو اخلاقی قوانین کی پابندی پر کوئی مجبور نہیں رہ سکتا۔ اس صورت میں انسان کی آئندہ ترقی کی کوئی امید نہیں۔ آخر کیوں کوئی صداقت نیکی اور ضمیر کی خاطر مصیبتیں جھیلے۔ اس ضمن میں روس کی مثال پیش کی جاتی ہے لیکن یہ تجربہ ابھی اتنی ابتدائی حالت میں ہے کہ اس کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس ترقی یافتہ دور میں مذہب کو غیر ضروری قرار دینے والوں کی مثال وہی ہے کہ کوئی شخص چھت پر پہنچ کر زینہ کو غیر ضروری چیز سمجھنے لگے۔ آج کل کی تمام ذہنی اور اخلاقی ترقیاں مذہب ہی کی شرمندۂ احسان ہیں اب تک ہمارے سامنے کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی ملحد جماعت نے دیر تک زندہ رہ کر ترقی کی ہو بلاشبہ بعض نہایت قابل اور قوی سیرت لوگ مذہب کے منکر ہیں لیکن ان کی پرورش اور تربیت بھی مذہب پرست سوسائٹی ہی میں ہوتی رہی ہے۔ خدا کا خیال انسان کے دل سے نکال کر دیکھو یکدم تمام زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور اخلاق اور تہذیب کا نام و نشان نہ رہے گا۔

سر جوگندر سنگھ وزیر زراعت پنجاب

مذہب کا مفہوم مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف ہے مذہب خدا کے ساتھ بلا واسطہ تعلق روح کی بقا اور اعمال نیک و بد کے مطابق دوسری دنیا میں زندگی کے تسلسل کا نام ہے جب تک انسان کی فطرت کلیتہً منقلب نہ ہو جائے مذہب کی ضرورت ساقط نہیں ہو سکتی۔ سائنس کی ترقی کے ابتدائی دور میں مذہب سے بیگانگی کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن موجودہ دور میں جب سائنس بہت ترقی کر چکا ہے بڑے بڑے سائنس دان مذہب کی حقانیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ سائنس کو محدود علم سمجھتے ہیں اور اس سے ماورا کوئی روشنی تلاش کرتے ہیں جب تک انسان ہے مذہب اس کے ساتھ رہے گا کیونکہ یہ انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ ایم ایل سی

مذہب کا لفظ یا یہ الفاظ صحیح تر اس کے مفہوم کی تشریحات گمراہ کن ہیں۔ میرے نزدیک اخلاقیات کا ہر دستور مذہب ہے۔ کوئی اخلاقی دستور جو انسانی جماعتوں کے درمیان صلح و آشتی اور امن کے قیام کا ضامن ہو مذہب ہے اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے اور اپنے ملک و قوم کے جائز حقوق کو پامال نہ ہونے دے وہ تمام احکام و قوانین خواہ وہ کسی بادشاہ کی طرف سے نافذ ہوں یا کسی پیغمبر کی طرف سے جن پر سوسائٹی کی رضامندی کی مہر ثبت ہو ایک ہی مقصد رکھتے ہیں اور یہ مقصد ذاتی اور جماعتی مفاد کی حفاظت ہے جب تک انسان میں تفوق پرستی زر اندوزی عیش طلبی اور ہوسناکی باقی ہے اس پر کسی نہ کسی قسم کی قید کا رہنا ضروری ہے یہ قید کہیں خدا کی صورت میں ہوتی ہے اور کہیں قانون کی صورت میں۔ دوسری صورت میں وہ روحانی تسکین نہیں ہوتی جو پہلی صورت میں ہے واشنگٹن نے سچ کہا ہے کہ مذہب عقل و استدلال کے لیے ویسا ہی ضروری ہے، جیسی مذہب کے لیے عقل و استدلال یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو بھی انسان ایک نہ ایک خدا کا تصور کرنے پر مجبور ہوتا۔ انسان مذہب کو مٹانے کی کوشش کرلے کچھ حرج نہیں وہ صرف ان اوہام کو مٹا لے گا جو مذہب کے نام سے پھیلے ہوئے ہیں اصلی چیز یعنی حق پرستی اور دیانت دارانہ زندگی کبھی مٹ نہیں سکتی۔

مس رشیدہ ذکاء اللہ بی۔ اے

مذہب رسم پرستی کا نام نہیں۔ خدا اور بقائے روح کے سچے اعتقاد کا نام مذہب ہے۔ انسان مذہب کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہے جس طرح زندگی کے ساتھ چشم بصیرت کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔ جو لوگ مذہب کے منکر ہیں فی الحقیقت وہ بھی سچے مذہب پرست ہیں۔

مستقبل کا مذہب کیا ہوگا؟

گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصے میں مادّی و روحانی حیثیت سے دنیا نے ایک انقلابِ عظیم دیکھا۔
اور تقریباً دس سال سے تو ایسی ایسی تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے کہیں
کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن ابھی اس جادۂ انقلاب کی منزل نہیں آئی۔ ابھی ہم برابر بڑھتے چلے جا رہے ہیں،ا
ہر قدم پر ہماری رفتار پہلے سے تیز تر ہو رہی ہے۔ مفکّرین آئے دن ہماری تعلیم، ہمارے مذہب، ہماری
ہماری ایجادات کے متعلق بڑی بڑی پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس صدی کے اختتام سے پہلے
ہم چاند میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے وہ زمانہ دور نہیں جب ہمارے ملک کے ایک ایک گھر میں بجا
قدر عام ہو جائے گی کہ تمام خانگی کام اس کے ذریعہ سے سر انجام ہو سکیں گے۔ ہم دنیا بھر کے گانے اپنے
بیٹھے سنیں گے، اور اپنے ٹیلیفونوں پر اپنے دُور افتادہ عزیزوں کے پیغامات وصول کرتے ہوئے اُن کو دیکھ بھی
گے۔ ہماری عمریں بڑھ جائیں گی اور مرض کا نام شاذ و نادر ہی کہیں سنائی دے گا۔ مرد اور عورتیں ایک
آزادی کے ساتھ آپس میں ملیں جلیں گے جو علم اور توازنِ دماغ سے پیدا ہوگی۔ انسان پرندوں کی طرح آ
کی فضا میں اُڑتے پھریں گے۔ آج دولت کو اور اُس طاقت کو جو دولت سے حاصل ہوتی ہے امتیاز کا نش
جاتا ہے لیکن وہ دن آ رہا ہے جب عقل، مروت اور جسمانی کمال کو بلند ترین درجہ حاصل ہوگا۔ ملکی حدود ا
کی دوسری رسموں کو لوگ بھول جائیں گے، کیونکہ تمام دنیا ایک ہی ملکِ عظیم بن جائے گی۔

ایک انگریز مصنف مسٹر لیونارڈ ہینیلو نے انہیں تبدیلیوں کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس میں ا
نے اپنے چند سوالات پر موجودہ زمانے کے پچاس کے قریب نوجوان مشاہیر کے اقوال درج کئے ہیں،
کا پہلا سوال ہے "مستقبل کا مذہب کیا ہوگا؟" اُن کی کتاب میں سے فی الحال ہم اسی موضوع پر کچھ انتخاب
ہیں۔ جوابات کو پڑھ کر ناظرین خود اندازہ کریں گے کہ وہ کیسے آزاد، پُر امید، لطیف اور زندگی و مستقبل
سمجھ کر دئے گئے ہیں۔

مسٹر بیورے نکوس:-

میرا خیال ہے کہ آئندہ مذہب حفظانِ صحت کا مذہب ہوگا۔ ہم ؟ مانی امراض کو گناہ اور جسمانی صح،

میں گئے۔ غذا، ورزش اور سورج کی روشنی میں جس زبردست دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے اُس کا مطلب ہے۔ آج کل جو لوگ غذا کے مسئلے پر زور دے رہے ہیں اُن کا درجہ کل پیغمبروں کے قریب قریب ہوگا۔
اس کی وجہ کہ آج تک یہ مذہب کامیاب کیوں نہیں ہوگیا یہ ہے کہ ابھی ہم نے خوف کے چنگل سے ت حاصل نہیں کی۔ اگر ہم دوسری دنیا کے عیش و عشرت کی امید کو دل سے نکال سکیں تو یہ دنیا رہنے کے لئے بہترین جگہ بن سکتی ہے۔
مجھے پختہ یقین ہے کہ مستقبل کے مبلغ کی تعلیم یہ ہوگی کہ پھل کثرت سے کھاؤ"۔
مس سٹارم جیمس :۔
مجھے امید ہے کہ آئندہ مذہب کا مطمح نظر انسانیت ہوگا۔ اس میں آدمی پر دو پابندیاں عائد ہونگی۔ اپنے یہ کہ وہ اپنے آپ کو ایسے طرزِ عمل سے روکے جو اسے انسان کی پاکیزگی کے عقیدے سے منحرف کرنے والا ہو دوسروں کے لئے یہ کہ "اگر ہمارا ہمسایہ اپنے آپ کو اپنے طریق پر مسرت اندوز کرنا چاہے تو ہم اسے عیب چین دل سے نہ دیکھیں اور نہ بُرے الفاظ سے یاد کریں"۔ اختیار مذہب کا نچوڑ ہے، مجھے امید ہے کہ آئندہ ب کا اختیار اپنی ذات کے لئے اپنا عائد کیا ہوا ہوگا۔
مارکوئیس آف ٹڈونیگال :۔
جس طرح آج منکرین بعض مذہبی عقاید کو انسانی عقل و فکر کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک ایسے زمانے وضع کئے گئے تھے جب دنیا نے ابھی زیادہ ترقی نہ کی تھی، اسی طرح آئندہ مذہب انسان کے وضع کئے ہوئے تمام اوہام سے مبرا ہوگا جن کا آج دور دورہ ہے۔ موجودہ زمانے میں مذہب کا اعتقاد اوہام میں اس لئے کہ عوام نے اپنے آپ سوچنا ابھی شروع ہی کیا ہے۔ مسیح اور دوسرے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی م کی بنیادی صداقتیں ہر زمانے کی ذہنیت پر راست آسکتی ہیں اور آئیں گی، لیکن پادریوں اور ملّاؤں صدیوں سے انہیں تصنع اور تصرف کے جس پردے میں لپیٹ رکھا ہے وہ عام روشنی کے زمانے میں اٹھ ہے گا۔ ہم مسیح کی پیدائش، قیامت اور معجزات کے فوائد و نقصانات پر بحث کرنا چھوڑ دیں گے ایسے مسائل نہیں سمجھے جائیں گے، اور آئندہ مذہب صرف بنیادی سچائیوں اور اُن اعیان پر مشتمل ہوگا جن پر دنیا کے ے بڑے مذاہب کی تعمیر کی گئی ہے۔
مسٹر سیسل ہیٹن :۔
اگر یہ حقیقت نہ ہوتی کہ اکثر لوگ بڑے بے ہمت واقع ہوتے ہیں اور حفاظت جماعت ہی میں مضمر ے تو میرا خیال یہ ہوتا کہ آئندہ ہر شخص کا اپنا مذہب اور اپنا اخلاقی مسلک اور قانون ہوگا، لیکن یوں شاید معین

کے اوقات میں اُن پر ایسی ہیبت چھا جایا کرے گی کہ وہ اپنے بے مہار معیاروں کے مطابق ایک عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مس دلفنے دمور یمے:۔

میرا خیال ہے کہ آہستہ آہستہ مذہب ایک شخصی معاملہ ہو جائے گا، جس کا دستور اور روایت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مذہب کے دستور اور اقتدار کی جگہ انفرادیت کا عالمگیر عقیدہ لے لے گا۔ انسان جماعت وارانہ تعلیم کے خلاف بغاوت کرے گا اور اپنے ضمیر کی ہدایت پر جادہ پیما ہوگا۔ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرے گا، عقوبت کے قدیم خیال سے ڈر کر نہیں بلکہ اپنے اُس حاصل کردہ علم سے جو بتاتا ہے کہ اُس کے لئے کونسی بات بہتر ہے۔

لارڈ برنز:۔

آئندہ خواہ کوئی مذہب بھی ہو ایک بات یقینی ہے۔ یہ دانشمند انسان کا مذہب نہ ہوگا۔ جدید مذہب عوام کے لئے بنے گا۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ عوام کے لئے کس قماش کی چیزیں وضع کی جاتی ہیں۔

مسٹر انتھونی ایم لوڈووسیی:۔

یہ حسبِ دستور عوام کے لئے ایک قسم کا مجموعۂ اوہام ہوگا، اور تعلیم یافتہ طبقے کے لئے ایک ایسے خدا کی پرستش پر مبنی ہوگا جس کی تعریف کائنات اور فطرت کے اُن تمام مسائل پر حاوی ہو جائے گی جسے اُس زمانے کی سائنس حل نہ کرسکی ہو جس سُرعت سے سائنس اسرار کا پردہ ہٹاتی جاتی ہے قائلینِ خدا معمول کے مطابق اپنی اللہیت کی تائید کے لئے زندگی اور کائنات میں نئے اسرار معلوم کرتے جاتے ہیں۔

مسٹر ڈبی جی اے لو:۔

انسان کی فطرتی خواہش یہ ہے کہ وہ کسی خدا کی پرستش کرے بتشکک سالہا سال کے دیانت دارانہ شک کے بعد جسے علمی تحقیق و تفتیش نے پیدا کیا ہو۔ اکثر خدا کا قائل ہو جاتا ہے۔ مذہب پرتباہی اُن سست اور کاہل لوگوں کی طرف سے آتی ہے جو سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرسکتے اور جو عموماً گوسالۂ سامری کے پرستار ہوتے ہیں، لیکن اُن کے دل میں بھی اکثر یہ فطرتی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس اللہیت کے ہم قائل ہیں آنے والی صدیوں کے لئے اُس کی شکل بدلنی ضروری ہے۔

مسٹر جان سٹریچی، ممبر پارلیمنٹ:۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں، ممکن ہے کہ بیسیوں مذہب ہوں، لیکن ایک رجائی ہونے کی حیثیت سے میں اُس وقت کا منتظر ہوں جب انسان فوق فطرتی التباسات کے بغیر زندگی کو برداشت کرنے کے قابل ہوگا۔

مس آئیرس بیری :-

لفظِ مذہب کے اگر عام معنی لئے جائیں تو میں یہ خیال کرنے کو ترجیح دوں گی کہ آئندہ کوئی مذہب نہ ہوگا، اور یہ کہ انسان نادیدہ اور ڈراونے ہوؤں سے نیکی کا سودا کرنا چھوڑ دے گا۔

مسٹر مارس لین نارکاٹ :-

پاپ پوجا، میرا خیال ہے۔

جے اے بائڈ کارپنٹر (صدر آکسفورڈ یونین)

اشیا بہت کم تبدیل ہوا کرتی ہیں، لوگ اُسی شے پر قائم رہنا چاہتے ہیں جو ان کے قبضے میں ہو مستقبل کے مذہب کے معنی صرف مذہب کا مستقبل ہیں، اور یہ ایک روز بروز کے ارتقا کا معاملہ ہے۔

مس وایولٹ کارڈری :-

چونکہ ہزارہا سال سے مذہب میں خفیف تبدیلیوں کے سوا کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آئندہ کوئی تغیر واقع ہوگا۔

مسٹر ریمنڈ بیسے :-

نوعِ انسان کے اخلاق اور روحانیت پر منظم مذہب کے اقتدار کی کامل ناکامی صاف ثابت کرتی ہے کہ اس کا اظہار جماعت کی بجائے فرد کی روحانی ترقی میں ہونا چاہئے۔ پس سوال یہ ہونا چاہئے کہ مستقبل کے مذاہب کیا ہوں گے اور اس کا کوئی جواب نہیں۔

مسٹر سیویل سٹوکس :-

یہ ممکن نہیں کہ کوئی مذہب کبھی عالمگیر طور پر قبول کر لیا جائے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شخصی بقا کا جاہلانہ طور پر قبول کیا ہوا نظریہ آئندہ چند ہی نسلوں کے بعد اپنے آخری پیرو بھی کھو بیٹھے گا، اور تخلیقی ارتقا میں یقین رکھنے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

مس کیتھلین نسبٹ :-

یہ مجھے نہایت غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک مذہب "مستقبل کا مذہب" قرار پائے گا۔ ممکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح زندگی مادی پہلو سے فرد کے لئے کم جدوجہد کا مقام بن گئی ہے، اسی طرح زندگی روحانی پہلو سے زیادہ شخصی حیثیت حاصل کرے گی۔ مجھے شک ہے کہ سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے پھر کبھی کوئی مذہب اتنی عظمت اور قوت حاصل کر سکے گا جتنی اسلام اور مسیحیت نے اپنے وقت میں حاصل کی۔

مسٹر اوئن نیرز :-

ماضی کا مذہب! کیونکہ مستقبل ماضی کے عکس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مس آرنٹ رابرٹسن:۔

میرا خیال ہے کہ آئندہ مذہب بہت کچھ موجودہ مذہب کی طرح ہوگا۔ اکثریت جو چاہتی ہے کہ تفکر و تدبر اُس کے لئے دوسرے کیا کریں کبھی کسی منظم مذہب کا دامن نہ چھوڑے گی، اور اکثریت ہمیشہ موجود رہے گی۔ فہیم اور معقول لوگ بدستور روحانی تنشاکک بنے رہیں گے۔ لیکن جس طرح آج کل لوگ وہم پرست ہونے پر معذرت خواہ ہوتے ہیں اسی طرح مذہبی ہونے پر معذرت خواہ ہوا کریں گے، اور آثار ایسے نظر آرہے ہیں کہ طلاق اور تحدید نسل وغیرہ کے معاملہ میں مذہب کو قانون میں زیادہ دیر تک دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

لیڈی ڈورنڈ:۔

انسان اور حیوان کے لئے رواداری، انسانیت، رحم اور مہربانی کا مذہب مستقبل کا مذہب ہوگا۔ میرے نزدیک دانستہ طور پر نامہربانی کرنا سب سے بڑھ کر ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ بہشت بھی ایک ایسی دنیا کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے جہاں مہربانی کی حکومت ہو۔

مسٹر جے جیفرسن فارجیون:۔

اگر دنیا نے ترقی کی تو مستقبل کا مذہب ایک ایسا مذہب ہوگا جس کی بنا انسانیت اخوت اور انسانی ضروریات کے احساس پر ہوگی۔ اگر دنیا نے ترقی نہ کی تو یہ کسی نہ کسی شکل میں اُسی مذہب کا استقرار ہوگا جو نیکوں کے لئے نعائم اور بدوں کے لئے سزا کے اصول پر مبنی ہے۔ ہماری حقیقی جزا اور سزا وہ رنج یا راحت ہوگی جو ہمارے افعال کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوگی۔ زندگی کے بعد کیا ہوگا؟ یہ ہمیشہ قیاس کا معاملہ رہے گا۔ اور امید کا۔

مسٹر ایچ ایم ہارووڈ:۔

کیا اس مسئلہ پر کسی کی رائے کچھ وقعت رکھتی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ میری رائے کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ انسان کو شاید یہ امید کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ مستقبل کا مذہب۔ یا مذاہب ـــــ خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن وہ زمانۂ ماضی کے مذاہب سے زیادہ قابلِ تسلیم اور کم تباہ کن ہوں گے۔

مس ازبیل جینز:۔

اوہام پرستی کی کوئی دوسری شکل ـــــ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

مسٹر آیور نوبلو:۔

دوسرے مذاہب کی رواداری، آفتاب پرستی کی آمیزش کے ساتھ۔

منصو،

درسِ عبرت

میکشِ صہبائے غفلت کون ؟ ہم
ساکنِ دنیائے ظلمت کون ؟ ہم

جس کو دیکھو، شکوہ سنجِ روزگار
جامعِ افلاس و نکبت کون ؟ ہم

جس کو پوچھو، غافل از انجامِ کار
فارغِ ادبار و ذلت کون ؟ ہم

غفلتوں پر عظمتوں کی آرزو!
قائلِ مافوقِ عادت کون ؟ ہم

پستیوں میں رفعتوں کی جستجو!
منکرِ قانونِ قدرت کون ؟ ہم

آنکھ ہے اور منظرِ عبرت فزا
سوگوارِ نعشِ عزت کون ؟ ہم

کان ہیں اور طعنۂ ماؤشما
نوحہ خوانِ شرم و غیرت کون ؟ ہم

کیا غرض، کیوں بخت کو الزام دیں
اپنے مٹ جانے کی علت کون ؟ ہم

کیا ضرورت، کیوں کسی کا نام لیں
اپنی بربادی کی غایت کون ؟ ہم

لیکن اس پر بھی ہمیں سو ناز ہیں
مخبرِ صادق کی امت کون ؟ ہم

مٹ کے بھی ممتاز سے ممتاز ہیں
رحمتِ باری کی آیت کون ؟ ہم

ہم نے کفر و شرک کا گھر ڈھا دیا!
خانہ بر اندازِ کثرت کون ؟ ہم

ہم نے آنکھوں سے خدا دکھلا دیا
کاشفِ اسرارِ وحدت کون ؟ ہم

ہم نے دنیا میں اجالا کر دیا
شمع افروزِ ہدایت کون ؟ ہم

ہم نے حق کا بول بالا کر دیا
خرمن اندوزِ سعادت کون ؟ ہم

ہستیٔ عرفاں ہمارے دم سے ہے
محرمِ رازِ حقیقت کون ؟ ہم

عالمِ امکاں ہمارے دم سے ہے
حاملِ بارِ امانت کون ؟ ہم

حال کی تہذیب نو پیدا نہیں
دافعِ اسبابِ وحشت کون ؟ ہم

ہم اگر دعوے کریں، بے جا نہیں
ماحئ آثارِ ظلمت کون؟ ہم

عِلم کو ترویج کامل ہم نے دی
قاطعِ بیخِ جہالت کون؟ ہم

ہستئ اوہام باطل ہم نے کی
قابضِ روحِ کہانت کون؟ ہم

ہم نے ہر خطے کو یوناں کر دیا
باعثِ تدوینِ حکمت کون؟ ہم

ہم نے ہر گوشہ گلستاں کر دیا
موجبِ تعمیمِ صنعت کون؟ ہم

ہم نے ہفت اقلیم سے جزیے لیے
حاملِ شمشیرِ ملت کون؟ ہم

ہم نے دنیا کو کنویں جھنکوا دیے
فاتحِ ابوابِ عظمت کون؟ ہم

شانِ پامردی سوا ہم سے ہوئی
چہرہ آرائے جلادت کون؟ ہم

ملک داری کو جلا ہم سے ہوئی
طرحِ اندازِ سیاست کون؟ ہم

آؤ، مل کر ہمتوں سے کام لیں
وارثانِ اہلِ ہمت کون؟ ہم

آؤ، بڑھ کر عزتیں حاصل کریں
مستحقِ گوئے عزت کون؟ ہم

ہم کو نچلا بیٹھنا زیبا نہیں
ضامنِ اصلاحِ خلقت کون؟ ہم

ہم کو بخل ناروا پھبتا نہیں
ابرِ پر بارانِ رحمت کون؟ ہم

منظرِ عبرت فزا ہے یا نہیں
پائے بندِ دامِ عسرت کون؟ ہم

ماجرائے جانگزا ہے یا نہیں؟
بستۂ زنجیرِ نکبت کون؟ ہم

یا تو اٹھ کر چارۂ ذلت کرو
حیف ہے پامالِ ذلت کون؟ ہم

ورنہ مٹنے کے لیے تیار ہو
عادئ اتمامِ حجت کون؟ ہم

حضرتِ آزاد جائے شکر ہے
خادمِ ناچیزِ ملت کون؟ ہم

آزاد انصاری

شاہنشاہ ہمایوںؒ کے مقبرے میں

اے شاہنشاہ!

تیری کشش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ کیا کشش؟ یہ کہ تو اچھا بیٹا تھا۔

اے شاہنشاہ!

دلی کے مغل کہ لنڈن کے مغل، سلطنتیں لٹانے والے کہ سلطنتیں بنانے والے مغل، ساری دنیا کے آنے والے جانے والے مغل اُس چیز سے جو تجھے حاصل ہوئی بے نصیب رہے یعنی یہ کہ ظہیرالدین نے نصیرالدین کی بیماری لے لی اپنی جان دے دی۔ تو بیٹا تھا بھی اس قابل کہ دنیا کے ناموروں میں سے بالاترین نامور بابر نے تیری خاطر بادشاہی کو ٹھکرا دیا۔ بادشاہی چھوڑ کر ایک غمزدہ باپ بن گیا۔

کس قدر وہ بڑا تھا۔ کس قدر تو پیارا تھا۔

اے شاہنشاہ! غمزدہ باپ تین دفعہ بیٹے کی چارپائی کے گرد پھرتا ہے۔ لوگوں کو طواف کعبہ سے کچھ نہیں ملتا۔ بابر کی اولاد کو تیری چارپائی کے تصدق ہندسا ملک کھلونا مل گیا۔

اے نصیرالدین! ظہیرالدین باپ نے دعا پہلے نہیں مانگی۔ جان کی ضرورت تھی دعا کا وقت نہ تھا اس نے جان پہلے رکھ دی۔ موت سے تجھے مول لے لیا۔ ظہیرالدین کو سستا سودا خریدنے کی عادت نہ تھی۔

اے نصیرالدین!

تیرے دم سے زندگی نفع میں رہی موت کو گھاٹا نہ ہوا۔ باپ بیٹے کی یہ بات چارسو سال سے نہ چار ہزار سال سے پرانی نہ ہوگی، بے لطف نہ ہوگی۔

اے نصیرالدین! ایک تنہائی کا مارا غریب الوطن تیری یاد میں اپنی دنیا سے چارسو سال پیچھے ہٹ گیا ہے۔ آ، اُس غریب سے مل۔ تو جو مرتے مرتے بچا اور ڈوبتے ڈوبتے نظام کو بادشاہی دے گیا! تو جسے جنگل میں اکبر جیسا بیٹا ملا، تو جسے پردیس میں فوج ملی اور دیس میں یہ مقبرہ، تو کس قدر پیارا تھا۔ اب کہ تجھے نہ دنیا کے دھندے ہیں نہ سلطنت کے جنجال، تو چارسو سال آگے کو قدم بڑھا، آ اور ایک غریب کی رفاقت کر۔

اے نصیرالدین! میں قبر پرست نہیں ہوں۔ خدا پرست ہوتا۔ تو شاید قبروں کو بھی پوج لیتا۔ تیری

قبر پر زائر بن کر نہیں آیا شاعر بن کر نہیں آیا۔ زائر ہوتا تو یہاں سے قریب ایک اولیا کی درگاہ ہے وہاں کچھ مانگتا مگر میں تو وہاں جا کر بھی تیرے پوتے کی پوتی جہاں آرا کی قبر کو تکا کرتا ہوں۔ وہ اپنے باپ کی خدمت گزار تھی۔ تجھ سے جہاں آرا تک دِتی آگرے کی زندگی میں شانِ سعادت تھی۔ پھر وہ ہوا جس نے باپ کو قید . . . . .

اے نصیر الدین! معاف کر دے یہ ذکر مجھے نہ لانا تھا۔ تو اچھا بیٹا تھا اور مجھے اچھا بیٹا بننے کی امنگ ہے۔ سن! اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس سب کچھ ہے۔ نہیں ہے تو اچھا بیٹا نہیں ہے۔

اے نصیر الدین! تیرے مقبرے پر تفریح کے لئے نہیں آیا۔ چاندنی رات خوشگوار موسم کے لئے نہیں آیا۔ پھول نہیں لایا۔ آندھی ہے چبھنے والی دھوپ ہے مگر میرے لئے دل کو ساری دُنیا کے خیالوں سے خالی کر کے وہ خلوص لایا ہوں جو ظہیر الدین کے دل میں بہت تھا۔ باپ کی خاطر تو بسترِ مرگ سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ باپ کی اسی محبت کی یاد میں میرے دل میں سما جا۔

اے نصیر الدین!

وقت آتا رہتا ہے جاتا رہتا ہے دل نہیں بدلتے، جو دل کہ دل ہیں آ اور زمانے کی قید سے آزاد ہو۔ کیا تیری ماں کبھی تجھے کلیجے سے لگا کر "نصیر" کہہ کر بھینچ لیتی تھی؟ کیا وہ اتنی بڑی تھی کہ ماں بننے کو ملکہ بننے پر ترجیح دیتی تھی؟ کہتی رہتی ہوگی "نصیر! میرے نصیر!!"

کہتی رہتی ہوگی۔

"میرے نصیر! تیرا خدا ناصر

آسمان کے تارے یوں بنتے ہیں۔

خدا بچہ عطا کرتا ہے۔

ماں دعا دیتی ہے

باپ جان دیتا ہے

. . . .

نصیر! خدا حافظ۔

فلک پیما

راحت کدہ

اس نظم میں حضرتِ اثر صہبائی نے اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات سے عالمِ تصور میں باتیں کی ہیں۔

میناۓ دل میں رقصاں صہباۓ آرزو ہے
وہ جانِ رنگ و مستی پھر میرے روبرو ہے

چھایا ہوا ہے دل پر رنگِ بہار گویا
ہر راگ نغمہ زا ہے ہر سانس مشکبو ہے

وہ مدھ بھری نگاہیں مستی لٹا رہی ہیں
پھر دل کے میکدے میں اک شورِ ہاؤ ہو ہے

بدمست ہو رہا ہے گلشن کا ذرّہ ذرّہ
ہر شاخ ایک ساقی ہر پھول اک سبو ہے

رنگینیاں تمہارے جلووں کی گلفشاں ہیں
بے خود ہے بزمِ ہستی سرشارِ رنگ و بو ہے

ہر ساز میں تمہارے نغمے بسے ہوئے ہیں
ہر پھول میں تمہاری تصویر ہو بہو ہے

اک نور کا تلاطم اک گلشن تبسّم
میرے حریمِ دل میں یہ کون خوبرو ہے

دیر و حرم کے جھگڑے ہر سو چھڑے ہوئے ہیں
لیکن مرے لبوں پر تیری ہی گفتگو ہے

جانے کہاں ہیں، کیا ہیں، حور و بہشت و کوثر
میرے لئے تو سب کچھ اے جان تو ہی تو ہے

دنیا سے گوشہ گیری عقبیٰ سے بے نیازی
"راحت" ترے گدا کی یہ بھی عجیب خو ہے

اصلاحِ ادب

(۳)

بہ سلسلۂ اشاعت مئی

نثر

فقرہ۔ مشاعرے میں مجھے سوائے آپ کے کسی کی غزل پسند نہیں آئی۔

اصلاح۔ مشاعرے میں مجھے آپ کے سوا کسی کی غزل پسند نہیں آئی۔

وجہ: "سوائے" جب صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے آگے فارسی یا عربی کا کوئی لفظ آئے اس صورت میں "کے" نہیں لکھا جائے گا مثلاً سوائے دل۔

فقرہ۔ وہ بیچارہ دائم المریض ہے

اصلاح۔ وہ بیچارہ دائم المرض ہے۔

وجہ: "دائم المریض" قواعد کی رُو سے غلط ہے۔

فقرہ۔ دہلی قدیم الایام سے ہندوستان کا پایۂ تخت چلی آتی تھی۔

اصلاح۔ دہلی قدیم زمانے سے ہندوستان کا پایۂ تخت چلی آتی ہے۔

وجہ: "قدیم الایام" قواعد کے لحاظ سے صحیح نہیں

فقرہ۔ سرسید احمد خاںؒ علی گڑھ کالج کی روحِ رواں تھے۔

اصلاح۔ سرسید احمد خاںؒ علی گڑھ کالج کی روح و رواں تھے۔

وجہ۔ روحِ رواں بے معنی ترکیب ہے

فقرہ۔ اگرچہ سلیمہ خود بھی غضب کی لڑاکی ہے لیکن نعیمہ کی شرارتیں دیکھ کر وہ بھی ہکی بکی رہ گئی۔

اصلاح۔ اگرچہ سلیمہ خود بھی غضب کی لڑاکا ہے۔ لیکن نعیمہ کی شرارتیں دیکھ کر وہ بھی ہکا بکا رہ گئی

وجہ: "لڑاکا" اور "ہکا بکا" مذکر و مونث دونوں کے لئے یکساں آتے ہیں۔

فقرہ۔ ترقی اور تنزلی خدا کے ہاتھ ہیں۔

اصلاح۔ ترقی اور تنزّل خدا کے ہاتھ ہے

وجہ (۱) تنزلی کوئی لفظ نہیں۔ تنزُّل بروزنِ تفعُّل صحیح ہے۔

(۲) بے جان چیزوں کے لئے فعلِ واحد

لانا فصیح ہے۔

فقرہ۔ انسپکٹر صاحب نے مجھ سے دو سوال پوچھے میں نے دونوں کا صحیح صحیح جواب دے دیا۔

اصلاح۔ انسپکٹر صاحب نے مجھ سے دو سوال کئے میں نے دونوں کا صحیح صحیح جواب دے دیا۔

وجہ۔ "سوال پوچھنا" نہیں بلکہ "سوال کرنا" صحیح و فصیح ہے

فقرہ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی منافرت نہ پھیلاؤ۔

اصلاح۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت نہ پھیلاؤ۔

وجہ۔ "منافرت" (باب مفاعلہ) میں خود "باہمی" کے معنی موجود ہیں۔

فقرہ۔ ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی۔

اصلاح۔ ہر چمکیلی چیز سونا نہیں ہوتی۔

وجہ۔ "چمک" ہندی اور "دار" فارسی ہے۔ لہٰذا ترکیب درست نہیں۔ اسی طرح سمجھ دار، لچکدار وغیرہ بھی غلط ہیں۔

فقرہ۔ اُسے سرھانے کے بغیر نیند نہیں آتی

اصلاح۔ اسے تکیے کے بغیر نیند نہیں آتی۔

وجہ۔ "سرھانا" "پائنتی" کی ضد ہے "تکیے" کا محل ہے۔

فقرہ۔ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

اصلاح۔ کیا آپ بیاہے ہوئے ہیں؟

یا

کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے۔

وجہ۔ "شادی" بیاہ کے معنی میں فارسی میں مستعمل نہیں۔ اس لئے "شادی شدہ" کی ترکیب غلط ہے۔

فقرہ۔ جلسے میں بے شمار مسلمان۔ اہل ہنود اور سکھ شریک ہوئے۔

اصلاح۔ جلسے میں بے شمار مسلمان ہندو اور سکھ شریک ہوئے

وجہ۔ "اہل ہنود" کی ترکیب غلط ہے۔

فقرہ۔ یہ کتاب طلبا اور عام شائقین اردو کے لئے یکساں مفید و دلچسپ ہے۔

اصلاح۔ یہ کتاب طَلَبہ اور عام شائقینِ اردو کیلئے یکساں مفید و دلچسپ ہے۔

وجہ۔ طالب کی جمع طَلَبہ صحیح اور "طُلبا" غلط ہے

فقرہ۔ آج کل بیسوں ایم اے اور سینکڑوں بی اے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اصلاح۔ آج کل بیسیوں ایم اے اور سینکڑوں بی اے مارے مارے پھر رہے ہیں

وجہ۔ یہ "بیسوں" کا نہیں بلکہ "بیسیوں" کا محل ہے۔ بیسوں یوں استعمال کرتے ہیں: امتحان کے لئے نصاب کی بیس کتابیں مقرر تھیں۔ میں نے بیسوں (بیس کی بیس ہی) اچھی طرح دیکھ ڈالیں۔

فقرہ۔ افسوس ہے کہ بمبئی کے ہندو مسلمانوں میں فساد ہو گیا۔

اصلاح۔ افسوس ہے کہ بمبئی کے ہندؤوں
سلمانوں میں فساد ہوگیا۔
وجہ۔ "ہندو مسلمانوں" سے یہ معنی بھی پیدا ہوتے
۔کہ وہ مسلمان جو ہندو ہیں"۔
فقرہ۔ لاہور اردو کا ٹکسال بن گیا۔
اصلاح۔ لاہور اردو کی ٹکسال بن گیا۔
وجہ۔ "ٹکسال" مؤنث ہے اور حرفِ اضافت
کے مطابق آئے گا نہ کہ لاہور کے۔
فقرہ۔ تم خود اپنی کرتوتوں سے تباہ ہوئے
اصلاح۔ تم خود اپنے کرتوت سے تباہ
ئے۔
وجہ۔ "کرتوت" لفظاً و معناً دونوں طرح مذکر
ر جمع ہے۔
فقرہ۔ ہم سب کو قوم و ملک کی خدمت اور
ح و بہبودی میں حصہ لینا چاہئے۔
اصلاح۔ ہم سب کو قوم و ملک کی خدمت
ر اصلاح و بہبود میں حصہ لینا چاہئے۔
وجہ۔ بہبودی غلط اور "بہبود" صحیح ہے۔
فقرہ۔ وہ افسر بہت راشی ہے۔
اصلاح۔ وہ افسر بہت رشوت خوار ہے۔
وجہ۔ "راشی" کے معنی ہیں رشوت دینے والا
یسے موقع پر رشوت خوار۔ رشوت ستاں یا مرتشی
ہنا چاہئے۔
فقرہ۔ تمہاری یہ لاپرواہی کسی دن رنگ
کر رہے گی۔

اصلاح۔ تمہاری یہ بے پروائی کسی دن
رنگ لاکر رہے گی۔
وجہ۔ "پرواہ" غلط اور "پروا" صحیح ہے۔ چونکہ "پروا"
فارسی ہے۔ اس لئے "بے پروائی" ہی درست و
فصیح ہے۔

نظم

شعر۔ تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا جو جہاں کو امیدوار کیا
اصلاح۔ تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا
وجہ۔ "جو جہاں" میں تنافر ہے۔
شعر۔ اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہبان نکلا
اصلاح۔ اجل سے بڑھ کے محافظ کوئی نہیں اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہبان نکلا
وجہ۔ "نہیں کوئی" سے "کوئی نہیں" بہتر ہے
اس سے "کوئی" پر زور آگیا۔ جو شاعر کا اصل مقصد ہے
شعر۔ کعبہ نیا بناؤ مرے دل کو توڑ کر
اے مہرباں اب آپ کے قابل یہ گھر نہیں
اصلاح۔ کعبہ نیا بنائیے اس دل کو توڑ کر
اے مہرباں اب آپ کے قابل یہ گھر نہیں
وجہ۔ "بناؤ" اور "آپ" میں شتر گربہ ہے۔
مصرع۔ پندرہ روزہ یہ رسالہ ہے۔
اصلاح۔ پانزدہ روزہ یہ رسالہ ہے۔
وجہ۔ "پندرہ" ہندی اور "روزہ" فارسی ہے

لہٰذا ترکیب درست نہیں۔

شعر تم سراسر رنج دینے پر جب آمادہ ہوئے
میں سراپا درد سہنے کے لئے دل ہو گیا

اصلاح تم سراسر رنج دینے پر جو آمادہ ہوئے
میں سراپا درد سہنے کے لئے دل ہو گیا

وجہ۔ "جب" سے "جو" بہتر ہے۔ اس سے "آمادہ" کا ایک الف گرنے کی خامی بھی رفع ہو گئی۔

شعر کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی
مرا اتنا خیال اے دیدۂ خونبار کر لینا

اصلاح کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی
ذرا اتنا خیال اے دیدۂ خونبار کر لینا

وجہ۔ دوسرے مصرع میں "مرا" حشو ہے اور "مرا اتنا" سے ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

شعر۔ سر نہیں اٹھتا ہے .... پائے ساقی سے کبھی
پھر بھی ہیں ناقابلِ یک سجدۂ مے خانہ ہم

اصلاح سر جھکا رہتا ہے .... پائے ساقی پہ مدام
پھر بھی ہیں ناقابلِ یک سجدۂ مے خانہ ہم

وجہ۔ "نہیں اٹھتا ہے" میں "ہے" حشو ہے۔ "نہیں" میں تو خود "ہے" کا جزو شامل ہے۔ اس لئے اس کے بعد "ہے" نہیں لکھنا چاہئے۔ اور پھر شعر میں جہاں الفاظ ناپ تول کر رکھنے پڑتے ہیں "مدام" کا لفظ نہایت بے تکلفی سے آ گیا ہے جس نے شعر کو بے کیف کر دینے کی بجائے بادۂ شعریت سے لبریز کر دیا۔

شعر پھر کسی کی انتظاری نے بنایا بُت مجھے
پھر بزنگِ چشم روزنِ چشم کا حلقہ ہوا۔

غلطی - "انتظاری" صحیح نہیں۔ انتظار باندھنا چاہئے۔

شعر۔ دیکھ بزمِ رنگ و بو کو غور کی آنکھوں سے دیکھ
کیا عیاں ہوتا ہے ان بکھرے ہوئے جلووں سے دیکھ

غلطی۔ "آنکھوں" اور "جلووں" میں ایطاء جلی ہے لہٰذا قافیے غلط ہیں

شعر:-
میں وہ اک سوختہ دل ہوں کہ میری آہ سوزاں سے
بھڑک اٹھتی ہے آتش سارے جنگل کے چناروں میں

غلطی۔ (۱) "آگ" کی جگہ "آتش" (ترکیب فارسی کے بغیر) شعر میں باندھنا صرف خلاف محاورہ ہی نہیں بلکہ غلط ہے۔

(۲) پہلے مصرع میں "اک" اور دوسرے میں "سارے" حشو ہے۔

مصرع شادیانے طیور گاتے ہیں۔

غلطی۔ شادیانے گائے نہیں بلکہ بجائے جاتے ہیں۔

شعر۔ ہر برس ہو خوشی سے سالگرہ
یونہی جلسے رہیں سدا یعنی

غلطی (۱) اس نظم کے تمام قافیوں کے اخیر میں "آنی" کا جزو شامل ہے۔ یعنی "ثانی" اور "ربانی" وغیرہ قوافی لکھے گئے ہیں۔ لہٰذا "یعنی" کا قافیہ غلط ہے

شعر۔ منزلِ الفت میں تو اک رہنمائے دہر ہے
عشق کی ملت کا تو بے شک امام عصر ہے

غلطی (۱) دہر اور عصر کا قافیہ غلط ہے

(۲) پہلے مصرع میں "اک" اور دوسرے میں "تو" حشو ہے۔ "بے شک" کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔

شعر:۔

زندگی اک باغ ہے اس باغ کا مالی ہوں میں
زندگی ہے اک خزانہ جس کا رکھوالی ہوں میں

غلطی:۔ "رکھوالی" "رکھوالا" (محافظ) کے معنی میں غلط ہے۔

شعر:۔

قسم ہے جھومتا رہتا ہوں میں جوشِ مسرت سے
مرے ساغر میں جب تک بادۂ انگور رہتی ہے

غلطی (۱) پہلے مصرع میں "میں" حشو ہے۔

(۲) "بادہ" مذکر ہے۔

شعر: نیرِ برجِ شرف مہرِ سپہر انور
جلوۂ صبح ازل شعشۂ حسنِ معیار

غلطی (۱) "شعشعہ" کی جگہ "شعشہ" لکھنا صحیح نہیں۔

(۲) شعشعۂ حسنِ معیار کی ترکیب بے معنی ہے۔

شعر:۔

گو گلستانِ جہاں پر میری نظریں کم پڑیں
اور پڑیں بھی تو خدا شاہد بچشمِ نم پڑیں

خامی (۱) "گو گلستان" کی ترکیب میں ثقالت اور تنافر ہے

(۲) "اور" کو "اُر" باندھنا خلافِ فصاحت ہے

(۳) "چشم نم" بالاتفاق متروک ہے۔ اس کی جگہ "چشم پُرنم" لکھنا چاہئے۔

شعر:۔

وہی سر ہے کہ اب سنگِ حوادث کا نشانہ ہے۔
یہی سر تھا کہ جس پر سایۂ دیوارِ جاناں تھا۔

خامی:۔

دوسرے مصرع میں "کہ" حشو ہے۔

بڑے آدمیوں کی بری حالت

نشتر جالندھری

ہمدردی کی صرف انہیں کو ضرورت نہیں جو دنیا میں ناکام وگمنام ہیں بلکہ انہیں بھی اس کی حاجت ہے جو شہرت وکامرانی کی چوٹیوں پر پہنچ چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسولینی دنیا کا سب سے زیادہ تنہا آدمی ہے ہوور (صدر جمہوریہ امریکہ) سب سے زیادہ پریشان آدمی سٹیلن (روسی حکمران) سب سے زیادہ خوف زدہ آدمی۔ ریمزے میکڈانلڈ سب سے زیادہ خستہ دماغ آدمی۔ کمال پاشا سب سے زیادہ بے خواب آدمی۔ گاندھی سب سے زیادہ حیران آدمی اور موسیو بریاں سیاست دانوں میں سب سے زیادہ ناخوش آدمی ہے۔

گپیں

ہوں آرزوؤں کا ایک تابوت زندگی کا مزار ہوں میں
جنازہ بردار آپ اپنا ہوں آپ ہی سوگوار ہوں میں

نہ کیوں نہالِ امید کے سینچنے کو خوں نابہ بار ہوں میں
جو بجلیوں سے ہوا ہے شاداب اُس چمن کی بہار ہوں میں

یہ انقلابِ زمانہ میری تڑپ کا اک زندہ معجزہ ہے
قرار جس کے لئے پیامِ اجل ہے وہ بیقرار ہوں میں

بلا کی آغوش میں پلا ہوں۔ ہے شامِ غم صبحِ عید مجھ کو
گہر بکف ہوں اگرچہ موج و نہنگ سے ہمکنار ہوں میں

مرے خرابات کی جو منظور سیر ہے۔ ظرف لا کہیں سے
کہ خون دل پی رہا ہوں امرت سمجھ کے وہ میگسار ہوں میں

سنائی دیتے ہیں جس کی ہر لہر سے انا البحر کے ترانے
ہیں کوثر و سلسبیل بھی جس کے تشنہ وہ جوئبار ہوں میں

جو دیکھنا ہو کہ عشق میں دل پہ کیا گزرتی ہے۔ مجھ کو دیکھو
زمانہ بھر کے بلاکشوں کی مٹی ہوئی یادگار ہوں میں

نئے نئے مضامیں کے پھول نشتر ورق ورق پر مہک رہے ہیں
بہارِ معنی ہے میرا دیواں وہ شاعرِ تازہ کار ہوں میں

نشتر جالندھری

حسین بن منصور حلّاج

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ حسین بن منصور الحلاج جو عوام میں نہیں بلکہ خواص میں بھی اپنے باپ منصور حلّاج کے نام سے مشہور ہیں اور جن کے نعرۂ انا الحق کی صدائے بازگشت شریعت کے سربفلک ٹیلوں اور تصوف و سلوک کے آسماں بوس میناروں سے ٹکراتی ہوئی آتی ہے۔ آج اکثر لوگ تاریخی حیثیت سے اُن کے حالات سے بے خبر ہیں۔ میں نے اکثر مدعیانِ تصوف سے حسین کے متعلق دریافت کیا لیکن بجز چند مشہور عوام قصوں اور مستبعد واقعات کے کوئی ایسی چیز جو ان کی سیرت اور سوانح حیات پر روشنی ڈال سکے نہیں مل سکی ہیں ان واقعات کے ابطال کی خدانخواستہ یہاں جرأت نہیں کر سکتا کہ آہنیں سلاخوں اور وزنی بیڑیوں کو حسین نے ایک اشارے میں توڑ کر رکھ دیا اور قتل کے بعد اُن کے خون کے ہر قطرہ نے "انا الحق" کی صدائیں بلند کیں، بلکہ میں حسین کو بہ حیثیت ایک انسان کے منظر عام پر لانا چاہتا ہوں۔ افسوس ہے کہ تفحص و تحقیق کے بعد بھی حسین کی حیات کے اکثر پہلو تاریکی میں رہے۔ تاہم جو مختصر واقعات درج ذیل ہیں ان میں سے ایک خاکا کم از کم انسانی تخیل مرتب کر سکتا ہے۔

سب سے بڑی غلط فہمی حسین کے متعلق یہ پھیلی ہوئی ہے کہ لوگ ان کو منصور حلّاج کے نام سے پکارتے ہیں حالانکہ ان کا صحیح نام حسین تھا اور منصور حلّاج اُن کے باپ کا نام تھا۔ اُس کے متعلق کوئی صحیح قیاس قائم نہیں کیا جا سکتا کہ حسین کے نام کو دنیا نے اُن کے پدر بزرگوار کے نام میں اس شدت سے ضم کیوں کر دیا کہ آج دُنیا حسین کو منصور کہہ کر پکارتی ہے۔ میرا مطلب اس تشریح سے یہ نہیں ہے کہ دنیا اس اجتہادی غلطی کو یک لخت ترک کر دے بلکہ مقصد یہ ہے کہ منصور حلاج کا نام لیتے ہوئے ذہن و دماغ میں یہ چیز ضرور محفوظ رہے کہ ہم حسین کو اس نام سے مخاطب کر رہے ہیں۔

دوسری شدید غلط فہمی نے حسین کے متعلق اس عام خیال کو ایک حقیقت کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ زبردست مغالطہ پیدا کیا ہے کہ دنیا ان کو ایک زاہد خشک تصور کرتی ہے جن کو دنیوی حالات نہ معاملات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی گویا ان کی منزل تقشف کی سرحد دنیائے رہبانیت سے جا ملی تھی۔ ان فہمیوں کا ازالہ ذیل کے واقعات سے اچھی طرح ہو سکتا ہے۔

حسین شیراز کے قریب مقام بیضا میں ۱۵ رجب ۲۶۲ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے باپ بہت بڑے عالم فاضل تھے وہ ابتدا میں ملاحی کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے بزازی کا کام شروع کر دیا تھا حسین نے مقام واسط میں تربیت پائی۔ چونکہ فطرتاً ذہین اور طباع تھے۔ لہذا تھوڑے ہی دنوں میں غیر معمولی علمی قابلیت پیدا کر لی۔ نصاب کے طور پر حسین نے فلسفہ۔ منطق۔ معقول و منقول سب ہی کچھ پڑھا۔ لیکن تصوف سے ان کو ایک ایک خاص لگاؤ اور گہرا تعلق تھا۔

اسی وجہ سے ایام طالب علمی ہی میں ان پر ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ رنگ اتنا تیز ہو گیا کہ ان کے دل و دماغ نہیں بلکہ روح پر مکمل بے خودی مستولی ہو گئی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ہوش آیا تو صاحب طریقت کی تلاش شروع کی۔ چنانچہ اسی درد کے علاج کی خاطر متعدد مقامات میں سرگرداں پھرتے رہے۔ آخر کار تستر میں پہنچ کر حضرت خواجہ عبد اللہ تستری سے جو اس عہد کے ایک مشہور باخدا بزرگ تھے شرف بیعت حاصل کیا۔ حضرت خواجہ تستری قدس سرہٗ کی نظر کیمیا اثر نے اس سونے کو کندن بنا دیا۔ وہاں سے بغداد شریف میں آکر حضرت خواجہ سری سقطی۔ خواجہ جنید بغدادی۔ ابوبکر شبلی وغیرہ قدس اللہ اسرارہم جیسے اکابرِ ملت اور شیوخِ روزگار کے حلقۂ صحبت میں رہ کر استفادہ کیا۔ اس کے بعد خواجہ یعقوب کی صاحبزادی سے حسین نے نکاح کیا جن سے دو فرزند تولد ہوئے۔ حسین نے اگرچہ اپنی زندگی گوشۂ گمنامی میں گزاری تھی اور نام و نمود سے وہ قطعاً احتراز و اجتناب کرتے تھے لیکن جامۂ فانوس شعلہ کو عریاں ہونے سے نہیں روک سکتا۔ اسی طرح ان کے آفتابِ کمال کی کرنوں نے وہ جہاں افروز صورت اختیار کر لی کہ عقیدت مند نگاہوں کو اکتسابِ تجلی کے لئے بے تاب کر دیا۔ چنانچہ حسین کی ذات عوام الناس کی توجہات کا مرکز بن گئی۔

حسین چونکہ ابتدائے شباب سے ایک مست صوفی تھے لہذا ان کے "شطحیات" نے عقیدت مندوں کے دلوں میں عظمت و ہر دلعزیزی کے دریا موجزن کر دیئے۔ یہاں تک کہ خلیفہ مقتدر باللہ بھی حسین کے ارادت کیشوں میں داخل ہو گیا۔ خلیفہ کا رجحانِ طبع حامد بن عباس کو جو ایک چالاک وزیر تھا ناگوار گزرا اور حسین کی تنقیص کے لئے وہ موقع تلاش کرنے لگا۔ سوئے اتفاق سے وہ جلد اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا۔ حامد بن عباس کی مجلس گرم تھی۔ اس میں علاوہ دیگر اعیانِ سلطنت کے حسین بھی موجود تھے مختلف موضوعات پر مباحث ہو رہے تھے۔ کسی شخص کے استفسار پر حسین نے یہ کہہ دیا کہ اگر کسی پر حج واجب ہو اور وہ جانہ سکے تو چاہئے کہ اپنے گھر کو پاک کرے اور ایام حج میں یتیموں کو کھانا کھلائے اور ان کی خدمت کرے۔ ابی بکر نے جو قاضئ بغداد تھے یہ سن کر حسین سے دریافت کیا کہ کس کتاب میں انہوں نے یہ مسئلہ دیکھا ہے۔ حسین نے جواب دیا کہ حسن بصری کی کتاب اخلاص میں۔ اس پر قاضی صاحب نے برہم ہو کر کہا کہ او کشتنی! میں نے وہ کتاب دیکھی ہے۔ اس میں یہ مسئلہ

گرمیوں کا زمانہ

۸ بجے صبح

خدا ہے تو اور خدا نہیں ہے تو بھی دُنیا خوب ہے خوبصورت بستی، دلچسپ مقام، کوشش کا آرام، جیسا کرو ویسا بھرو، بیج بوؤ پودا اگے، پھول سونگھو، پھل کھاؤ، ٹھنڈا میٹھا پانی پیئے جاؤ اور جیسے محنت کرو، عزت پاؤ، اپنے ملک کو بڑھاؤ، دوسرے ملکوں کی سیر کرو اور ہر روز نئے سے نیا تماشا آدمیوں سے ملو ملاؤ، لوگوں میں ہنسو ہنساؤ۔ میل جول کی محفلیں، تعلیم و ترقی کی انجمنیں ان میں چاند سے سیکھو، علوم کی معلومات سے فنون کی حسن آرائیوں سے اپنا دامن مالامال کرو۔ بچوں کی ہنسی، بیوی کی محبت، ماں بہنوں کی محبت، دوستوں کی الفت ہمارے ہر طرف کیسی کیسی خوشبوؤں کے رنگارنگ پھول کھلے ہیں سہ

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم کن نعمتوں کو حکم ملا ہے جواز کا

میں یہ کروں گا، میں یہ بنوں گا، میں یوں جیوں گا!

---

۲ بجے سہ پہر

خدا ہے خواہ نہیں ہے اس دنیا کا نظام انتظام دونوں ابتر ہیں۔ کہیں نیکی کا بدلہ بدی کہیں بے کوشش کے عزت و احترام، کبھی لاکھ سر کو پٹکو مگر نتیجہ صفر یعنی کبھی تو کوشش کا پھل لیکن کبھی محض کورا جواب، نیک و بد دونوں کے لئے آرام، اذیتیں، عشرتیں، بے چینیاں کوئی فرقِ مراتب نہیں تلوار چل رہی ہے جو سامنے آگیا اس کا سر قلم، سیم و زر لٹ رہا ہے کسی مار کر کسی نے گھر بیٹھ کر جو پالیا سو پالیا۔ ایک افراتفری۔ ایک ہلڑ، کبھی اس میں ناچ کھیل، کبھی کبھی شور و غل اور کبھی قبر کی سی خاموشی۔ حب الوطنی، قوم پرستی، خلق پروری عموماً خود غرضی

خودنمائی، خود آرائی کی صورتیں اور بس۔ مجلسیں اسفل جذبات کی شکلیں، مصروفیتیں بیزاری سے بچنے کی راہیں۔ محفلیں انجمنیں، باہمی ستائش وخوشامد کے جمگھٹے۔ قدیم دستور جماعتی سازشوں کے نتیجے، جدید تجربات فقط ذاتی لطف اندوزی کے طریقے، اور کچھ بھی نہیں۔ بے قاعدہ مصروفیت، بے فائدہ محنت، جھوٹی خالی سی مسرت، ان کا بازار دن رات گرم۔ خوشیوں میں ہر کوئی شریک۔ غم و رنج میں شاذونادر ہی کوئی دوست، بے اعتنائی، سرد مہری۔ بے رحمی، زندگی کی راحتیں دوسروں کی کلفتیں بھول جانے سے قائم، دنیا کے لطف بے مروتی اور بے فکرے پن کے زور سے برقرار سے

دُنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں — یہ دوست ہے وہ دوست مُرّت نہیں جس میں
یہ شہد ہے وہ شہد حلاوت نہیں جس میں — وغیرہ وغیرہ

برباد ہو جائے یہ دنیا، بھاڑ میں جائے یہ زندگی، کوئی کب تک جئے اور کس لئے اور کیوں؟؟؟

---

۸ بجے دُنیا ایک بہشت، ۲ بجے کائنات ایک جہنم ... ... اور یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ صبح ۸ بجے میں باغ میں ٹہل رہا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، پھولوں کی خوشبو پرندوں کے چہچہوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی، جسم میں طاقت تھی، دماغ میں تازگی، دل میں جوش۔ اور سہ پہر کو ۲ بجے گرمی نے نڈھال کر دیا تھا، سستی جسم پر سوار تھی اور نیند نہ آتی تھی کہ کسی کم بخت نوکر نے بستر پر پلنگ پوش کے نیچے ایک موٹا کمبل بچھا رکھا تھا جس نے جسم کو بے چین اور دل و رُوح کو تھوڑی دیر کے لئے قطعاً مضمحل کر دیا!

یہ آسان نہیں

بشیر احمد

کہ ہم اپنی غلطی پر شرمسار ہوں۔
یا پھر از سرِ نو اپنا کام شروع کر دیں
یا درگذر کر دیں اور بھلا دیں
یا اپنی طبیعت پر پورا قابو پالیں
یا ایک بلند معیار قائم کئے رکھیں
یا یقین کئے رکھیں کہ ہر تنگی کے بعد آسانی ہے۔
لیکن
ایسے ہی مشکل کاموں میں صحیح زندگی کا جلوہ ہے۔

گلچیں

زبیدہ

اُس دن بہت گرمی تھی۔ یوں تو روز ہی مکان تنور بن جاتا تھا مگر اُس دن دھوپ بہت ہی تیز تھی اور پھر اس بلا کا حبس تھا کہ بدن پر کپڑا نہیں ٹھہرتا تھا۔ شہر میں بجلی کہیں نہ تھی اور پنکھا ہاتھ سے دیر تک جھلا نہیں جاتا تھا۔ سلیم اپنے کمرے میں مُردے کی طرح پڑا تھا۔ دروازے کھُلے تھے کہ شاید اگر ہوا چل پڑے تو کچھ ادھر سے بھی گذر جائے۔ مگر اس دن معلوم نہیں ہوا کہاں بندھی پڑی تھی۔ کیا مجال جو کوئی پتہ تک ہل جاتے۔

سلیم پہلے تو سونے کی کوشش میں پلنگ پر لیٹا رہا کبھی اس کروٹ کبھی اُس کروٹ۔ مگر نیند نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ اور کسی دن آئے تو آئے اس دن تو بالکل نہیں آنے کی۔ اس لئے حسبِ عادت ایک علمی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ ایک صفحہ، دو صفحے سوا دو؛ دو لکیر اور، اور بس لفظ آنکھوں سے مٹنے ہی لگے تھے کہ کھٹ کھٹ کسی آنے والے کے قدموں کی چاپ سنائی دی سلیم چونک پڑا۔ غصہ بھی آیا کہ اس وقت اور پھر اس قدر شور مچا کر آنے سے فائدہ اور یہ ہے کون اور یہ کہ اب تو ضرور وہ اپنی ممانی جان سے جن کے گھر میں وہ رہتا تھا کہے گا کہ دوپہر کے وقت کسی کو اس کے کمرے میں یا کمرے کی طرف بھی نہ آنے دیا کریں اور سخت تیوری چڑھا کر اس نے اپنی گردن پھرائی کہ دروازہ کی طرف دیکھے کہ یکدم دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ کھلے پائچوں کا پیازی چھکے کا پاجامہ اور سفید بوسکی کا قمیص اور سفید دوپٹہ، مگر کہاں کا دوپٹہ، اور کہاں کا قرینہ، بھویں تنی ہوئیں، ہونٹ بھنچے ہوئے، سانس چڑھی ہوئی، چہرہ بیر بہوٹی بنا ہوا آتے ہی بولی "بھائی جان آپ کو سونے کے سوا اور بھی کچھ آتا ہے؟" مگر الفاظ ایسی تیزی اور جوش میں کہے گئے تھے کہ سلیم ایک لمحہ کے لئے اپنے غصہ کو بھول گیا۔

"کیوں کیا ہو گیا؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"کیا کیا ہے! آپ تو کچھ کرتے ہی نہیں، سوئے رہتے ہیں، یا پڑھتے رہتے ہیں اور کوئی کام ہی نہیں۔"

"تو اور کیا کروں؟"

اور کیا کروں یہ خوب ہے! کتاب لی اور کونے میں گھس گئے۔ یہ بھی کیا جیسے دُنیا بستی ہی نہیں۔"

"تو آخر کہو نا ہے کیا بات، یوں جلال کیسے آ گیا۔ بیٹھ تو جاؤ نا، آخر میری تو طبیعت ہی ایسی ہے

"اسی بات پہ تو مجھے غصہ آتا ہے۔ لاکھ سر ٹپکو آپ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا . . . . ."

"پہلے بیٹھ تو جاؤ نا، زبیدہ آخر بات کیا ہے، کوئی خاص بات ہے کیا، کہیں کسی کو وہ جو سیڑھیوں میں بھڑ دل کا چھتہ ہے، وہاں کسی بھڑ نے کاٹ کھایا ہے؟ میں نے آج کہا جو تھا کہ شام کو اسے ضرور جلا دوں گا، واقعی بہت تکلیف دیتے ہیں بدتمیز . . . ."

جی آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتے ہیں، میں نہیں بیٹھتی وبیٹھتی کوئی جانے میں تو باؤلی ہوگئی ہوں۔

"نہیں نہیں میں کب کہتا ہوں" مسکراتے ہوئے۔ "دیکھو زبیدہ بیٹھ جاؤ اور پھر سب کہانی کہہ دو۔"

"توبہ توبہ بھائی جان خدا آپ کو عقل دے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں سب باتیں کہانیاں قصے ہیں کوئی سروکار ہی نہیں، چچا جان کے لڑکوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے . . . . ."

"بس وہی !!" سلیم اب چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ "خدا کے لئے مجھے ایسے فضول جھگڑوں میں مت ڈالو تمہیں تو شاید ان باتوں میں مزا آتا ہے مجھے تو مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں۔"

"جی آپ کو کیوں ہونے لگی تھی۔ آپ باہر نکلیں تو آپ کو پتہ چلے۔"

"تو تم ہی کیا باہر پھرتی رہتی ہو؟"

"میں نہیں پھرتی کہ اور بھی کوئی نہیں پھرتا، انور نہیں پھرتا، احمد نہیں پھرتا، سلمیٰ نہیں پھرتی۔ نوکر نہیں پھرتا!"

"تو میں کیا کروں؟"

"آپ کیوں کریں، آپ کی بلا کرے۔ آپ کتابیں لیں اور اپنے بل میں گھس جائیں"

"دیکھو زبیدہ" سلیم نے جھنجھلا کے کہا "تم ناحق مجھے تنگ کرتی ہو آخر اس تکرار سے فائدہ، اپنا مطلب کہو اب کیا ہوگیا؟ انہوں نے بلوہ کر دیا ہے؟ کسی کو مار دیا ہے؟"

"آپ کو بھی مزا آئے جو کسی کو مار دیں۔ ہے نا؟"

"خدا کی قسم کج بحثی بھی تم پر ختم ہے۔ بتاتی نہیں ہو کیا ہوگیا ہے۔ تم ہی اُن کی باتیں کم کیا کرو نا جو آکے تمہیں ایک بات اُن کی سناتا ہے تم اس کو چار سنا دیتی ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ عورت کیا نام ہے اس کا . . . . وہ . . . . . ار . . . . ربدر، وہ اپنے دل سے بناتی ہے۔ اُن کی چغلیاں کھائیں تمہیں جلایا، تمہاری باتیں اُن سے کہیں، اُن سے بکوایا خود مزا لوٹا"

"جی ہاں آپ کے بس میں ہو تو ساری دنیا کو دھو ڈالیں۔ وہ تو سب معصوم ہیں۔ ہم ہی لڑاکا ہیں، ہم ہی . . . . . . اور کہہ لو . . . . ."

"میں کیا کہتا ہوں۔ تمہارا تو لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ آخر ممانی جان بھی تو ہیں وہ کیوں نہیں مجھے کچھ کہتیں۔۔۔۔"

"ہاں جی! وہ کیا کہیں۔ جب انہوں نے کہہ کہہ کے دیکھ لیا کہ آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے تو وہ بھی چپ ہو بیٹھیں۔ آپ تو ہمیں کو گھر کنا جانتے ہیں۔ دل تو چڑیا کا سا ہے نا، اس دن بھی یونہی بے عزتی کرا آئے۔ یہ بھی کہہ دیں نے زیادتی کی ہے۔"

"بس آ گئی ہو نا طعنوں پر۔ یہ تو تم لڑکیوں کی اوقات ہے۔ ادھر کی ہو ادھر کی جھٹ طعنہ۔ یہی وجہ ہے نا وہ اس قدر مخالف ہو گئے ہیں معمولی سی بات تھی۔ یہ پاس ہی رہتے تھے سگے چچا کا خاندان۔ اتنا میل جول۔ توبہ توبہ! تم میں سے تو سوئی نہیں نکلتی تھی۔ ایک جگہ کھانا ایک ساتھ سیر۔ رات دن گانا کہ الامان۔ یہ اُودھم مچا کرتا تھا کہ جینا مشکل ہو گیا تھا۔ اب ان کے خون کی پیاسی ہو۔ بس ان کی وہ خورشید یہاں سو گئی تو کیا ہو گیا۔ آگے نہیں کبھی سوئی تھی؛ تمہاری چچی نے منہ پُھلا لیا۔ تمہاری دادی جان تو ہیں ہی ان کی طرف کی، وہ کب بات چھوڑیں۔ ادھر تم! ایک دفعہ جو شروع ہو گئی ہو گی تو کون ختم کرے۔۔۔۔"

"جی آپ کو شرم بھی تو نہ آتی ہو گی قصور سارا میرا ہو گیا۔ سونے کی بات ہی کیا تھی وہ تو اکثر یہاں سوتی تھی، پتہ نہ کچھ نہیں یے دوڑے یونہی۔ آپ تو ان دنوں کالج میں تھے۔ آپ کو کیا معلوم؟"

"تو تم نے بتا دیا ہوتا! نہ مجھے کسی نے بتایا؟ اور نہ میں اپنا دماغ خراب کرتا پھرتا ہوں ان باتوں پر۔ جہنم میں جائیں وہ سب مجھے کیا۔۔۔۔۔"

"آپ کو کون بتاتا پھرے۔ آپ تو رہتے ہیں آسمان پر دماغ رہتا ہے عرش پر، جب کبھی زمین پر آئے بے عزتی کرا آئے۔"

"پھر وہی بات! زبیدہ سچ جانو میں بہت جلتا ہوں اس میں بے عزتی کیا تھی۔ ان کا وہ چھوٹا لونڈا قاسم تو ہے فتنہ۔ میں گلی سے گزر رہا تھا بس منہ چڑا کے بھاگ گیا۔ میں کیا کرتا؟ اس کے پیچھے بھاگتا پھرتا؟ میرے ٹھنے جتنا اونچا ہے وہ بہت اچھا لگتا اس کے پیچھے بھاگتا، ہے نا؟ اس میں بے عزتی کیا ہو گئی؟ جب لڑکے ہوتے ہی بدتمیز تو کوئی کیا کرے۔ ہمارا انور کیا کم ہے اس سے؟ میں تو کبھی نہ مانوں!"

"بس آپ کا زور تو اپنوں ہی پر چلتا ہے اور کچھ نہ ہو سکا گھر والوں کو بُرا بھلا کہہ لیا۔ لڑائی ہم نے شروع کی تھی، روز گلی کوچوں میں ہم لڑتے ہیں؟ منہ ہم چڑاتے ہیں؟ میں تو کہتی ہوں آپ خورشید کی خاطر ان سب کو بتاتے ہیں۔"

"خورشید! کیوں؟ اس کا اس سے واسطہ۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ تم بھی عجیب لغو باتیں کرتی ہو، جب کوئی اور ہو تو کبھی نہ سنوں! خورشید کا یہاں کیا واسطہ۔۔۔۔"

"جی ہاں! ننھے ہی بنے جاتے ہو۔ چچی جان نے تو وہ تقاضے کیئے کہ الاماں اور آپ کو کوئی واسطہ ہی نہیں"۔
"تو کس بات کے تقاضے کیئے؟ کچھ بتاؤ تو سہی"
"یہی خورشید کے رشتے کے لیئے"
"خورشید کے رشتے کے لیئے؟ کس کے ساتھ"
"کس کے ساتھ؟ واہ کوئی اور بھی ہے! میرے ساتھ ہو گا نا؟" اس پر تو بمشکل زبیدہ اپنی ہنسی روک سکی۔
"لاحول ولاقوۃ تو کیا میرے ساتھ؟"
"جی نہیں میرے ساتھ!"
"لاحول ولا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"کیوں لاحول کیسی؟ اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ خورشید کتنی کامنی سی ہے ایسی دلہن بنے کہ سب کچھ بھول جاؤ"
"میں نہیں مانتا۔ تمہیں تو مذاق کرنے کی علت ہے، اور خورشید توبہ! انہیں بھی کیا سوجھی ہے!"
"کیوں اس میں کیا کیڑے پڑے ہیں، تمہیں کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ ۔ ۔ ۔"
"اس میں کیڑوں کا سوال ہی کیا، اپنی اپنی طبیعت ہے مگر ممانی جان نے کیا کہا"
"کیا کہا اور کیا کہتیں! میں کیا جانوں؟ ان سے پوچھتے پھرو"
"کیوں اب کیا ہو گیا! بھئی زبیدہ، تم لڑکی ہو یا پارہ ہو؟ کبھی یوں کبھی یوں۔ ۔ ۔ ۔"
"جی یونہی کہتے ہیں! اپنی تو سناؤ! آپ کیسے ہیں، جوگی! سنیاسی! بن باسی!!"
"اب پھر شروع ہوئی ہو نا۔ پہلے بتاؤ ممانی جان نے کیا کہا۔"
"جی آپ کو اپنی سوجھی ہے انہوں نے آفت بپا کر دی ہے"
"تو بتاؤ بھی نا۔ میں ایسے کسی کی گردن جاوں کہ کیوں بے میرا منہ کیوں چڑایا تھا۔ یہ چاہتی ہو؟"
"میں کیا کہتی ہوں، مجھے کیا، یہی ہے، احمد کو ان کے فتنے نے لہو لہان کر دیا ہے"
"کیا!!!"
"کچھ نہیں آپ کو کیا! بیٹھیئے کہاں دوڑے جاتے ہیں، میں یونہی ٹہلنے آ گئی تھی آپ سوئیں، یونہی آپ کو جگا دیا۔ ۔ ۔ ۔" اور خود دروازے کی طرف چلتی ہے
"زبیدہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں" خود پھر پکڑ لاتا ہے " ابھی لال بھبوکا تھیں اب بے وجہ روٹھی جاتی ہو"
"بے وجہ! جی بے وجہ!! بس آپ رہنے دیں، بیٹھے رہیں اپنے پاس!"

"زیب! ذرا ٹھہرو تو سہی بات تو سنو کیا ہو گیا"

"ہو گیا! کچھ نہیں آپ ہی پتھر کے ہوں تو مجھے کیا ہو۔ آپ پر کسی بات کا اثر بھی ہوتا ہے۔ امی جان کتنی دفعہ کہہ چکی ہیں نیچے آیا کرو۔ دالان میں کبھی آ بیٹھا کرو مگر کیوں آپ کی بلا آئے، وہاں تو ہوتی ہوں میں، وہاں تو ہوتا ہے خورشید کا چچی جان کا اُس فتنے کا ذکر، آپ کیوں آنے لگے اب میں جاؤں نا دیکھوں احمد کا اب کیا حال ہے آپ کی بلا جانے، ابا جان دفتر سے آئیں تو کہوں ان سے۔ میں تو یونہی چلی آئی معاف کیجئے؟"

"بھئی غضب ہے! تم کسی طرح بھی مانتی ہو۔ اب احمد کی چوٹ کا غصہ ہے! میرے پڑھنے کا غصہ ہے، نیچے نہ آنے کا غصہ ہے؟ تمہارا پتہ نہیں چلتا . . . . . ."

"نیچے آئیں نہ آئیں مجھے کیا غرض!"

"تمہیں تو غرض ہے ہی نہیں، تمہیں کیوں ہو۔ پھر میں ہی نیچے کیوں آؤں۔ یہیں پڑا رہتا ہوں۔ ابھی دو مہینے چھٹیوں کے اور ہیں . . . . گذر جائیں گے . . . ."

"جی ہاں ایک مہینہ بھی آپ نے گذار ہی لیا ہے نا . . . . . . واقعی میں یونہی آئی اور آپ کو پریشان کیا . . . . ."

"اب پھر الٹی میرے سر، میں نے کب کہا میں پریشان ہوا ہوں۔ سب کچھ دل سے بنا لیتی ہو۔ چلو میں چلتا ہوں۔ دیکھوں تو احمد کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی"

سلیم ابھی اٹھ کے سلیپر پہننے ہی لگا تھا کہ پھر قدموں کی آہٹ ہوئی اور ایک چھوٹا سا لڑکا کوئی آٹھ نو سال کا سر پہ پٹی بندھی ہوئی آ داخل ہوا۔

"او ہو تم خود ہی آ گئے احمد ادھر آؤ نا"

"ادھر آ جاؤ ننھے ادھر" زبیدہ جو جانے جانے رک گئی تھی بولی۔

"اب کیوں ضد کرتی ہو زبیدہ! میں اسے پیٹوں گا نہیں" سلیم نے یہ کہہ کر احمد کو جو اس کے پاس آ گیا تھا پکڑ لیا اور زبیدہ سے کہا "زبیدہ اب بیٹھ جاؤ، کیوں ناحق مجھ سے خفا ہوئی جاتی ہو بیٹھ جاؤ تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ پھر نیچے چلتے ہیں" نیچے چلنے کا سُن کر زبیدہ کے چہرے پر ایک گلابی لہر ایک لمحے کے لئے دوڑ گئی مگر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں احمد کہاں چوٹ لگی۔ زیادہ تو نہیں لگی؟" سلیم نے احمد کو پیار کرتے ہوئے پوچھا

"بھائی جان بہت ہی لہو گیا ہے۔ امی جان نے اکنی دی ہے تب چپ ہوا ہوں"

"او چور! تب تو چوٹ بالکل نہیں لگی" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا

"ہاں جی بالکل نہیں لگی! اتنے زور سے لگی تھی لہولہان تو ہو گیا۔ نیا قمیص پہن کے آیا ہوں"

"کہاں چوٹ لگی تھی بتاؤ تو سہی، ماتھے پر؟ پیچھے، کہاں لگی ہے؟ کس نے مارا یہ تو بتاؤ؟"

"ماتھے پر لگی ہے اور کہاں لگی ہے۔ اتنے زور سے تو گرا تھا"

"گرا تھا کیسے؟"

"بھائی جان وہ جو ہے نا حرامی . . . ."

"دیکھ احمد گالیاں نہ دیا کر۔ میں نے تجھ سے کتنی دفعہ کہا ہے۔"

"تو بھائی جان امی جان کہتی تھیں میں نے آپ تھوڑا ہی کہا ہے"

"ان کا کیا ہے وہ تو امی جان ہیں۔ بڑی ہیں تو تو بچہ ہے پھر گالی بکتے ہیں نہ سنوں"

"اچھا جی"

"ہاں تو بتا نا پھر کیسے گرا؟"

"احمد بتا نا کیوں نہیں اس قاسم فتنے نے دھکا دیا تھا اینٹ ماتھے میں گھس گئی" زبیدہ نے کہا۔

"جی"

"کہاں دھکا دیا تھا احمد" سلیم نے پوچھا

"نند کی دکان کے پاس"

"مگر کس طرح؟ تو نے اسے چھیڑا تھا، منہ چڑایا تھا کیا کیا تھا؟"

"ہاں بس قصور اسی کا ہے۔ چپ احمد جاہیں نیچے" زبیدہ نے کہا

"اب بات بھی کرنے دیتی ہو کہ نہیں" سلیم نے جھنجھلا کے کہا" احمد بتا نا کیوں نہیں؟"

". . . . ."

"ارے بتا نا کیوں نہیں تو نے ہی چھیڑا ہوگا بس معلوم ہوگیا"

"جی! میں نے! میں نے"

"تو پھر کس نے؟ قاسم نے؟ کس طرح بات ہوئی بتا تو سہی نہیں تو میں نند سے جا کر پوچھتا ہوں"

"بھائی جان قاسم ایک آنے کی شکر لینے آیا تھا میں بھی اپنے لئے نارنگی کی مٹھائی لینے گیا تھا اُس نے دکان پر شور مچا رکھا تھا۔ میں نے نند سے کہا پہلے مجھے دے، قاسم کہتا تھا پہلے مجھے دے اور ساری دوکان سنبھالے کھڑا تھا۔ میں نے ذرا پرے کیا اس نے اس زور سے دھکا دیا کہ . . . ."

"اچھا تو یہ بات ہے" سلیم نے کہا۔

"جی سارا ماتھا پھوٹ گیا" احمد نے پٹی کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ زبیدہ مسکرا پڑی
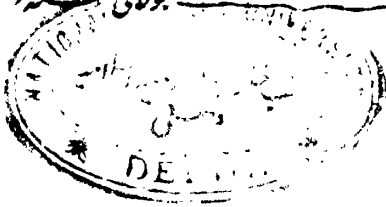
"ہوں! تو پھر تو نے کیا کیا؟" سلیم نے پوچھا

"جی میں نے تو کچھ نہیں کیا"

"پھر بھی! میں تجھے جانتا ہوں، تو بھی کم نہیں کرنے والا۔ اچھا بتا پھر تو بھاگ آیا یا تجھے کوئی پہنچانے آیا؟"

"کوئی نہیں"

"اور قاسم کو کیا ہوا"

"وہ رو پڑا اور کیا ہوا"

"رو پڑا وہ کیسے؟"

"میں نے اس کی شکر کی پڑیا اس کے دے ماری۔ ساری بکھر گئی بس رو ہی تو پڑا"

"ارے! واقعی! یہ تو برا کیا"

"تو بھائی جان اس نے بھی تو مجھے دھکا دیا تھا"

"احمد سچ سچ؟" زبیدہ نے بھی پوچھا

"جی! سارا کرتا لہولہان ہو گیا تھا جب میں گھر پہنچا"

"میں شکر کو پوچھتی ہوں، کرتا تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ دونی سا زخم آیا ہے اور اُس کی شکر؟ وہ کون بھرے گا؟ یہ تو بتا"

"پھر دیں گے ہم" سلیم نے کہا "تم بس اس کو رہنے دو۔ مجھے کہو تو ہو آؤں اُن کے گھر کہ لڑکے کو کیوں مارا ہے"

"جی اب آپ کی بھی بن آئی ہے۔ آپ کو خدا دے! وہ ہوئی نا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"

"نہیں نہیں اُن سے جا کر کہتا ہوں کہ اس قاسم نے اُس دن میرا منہ چڑایا تھا آج لڑکے کا سر پھوڑ دیا ہے۔ میں اُس کی کھال ادھیڑ دوں گا" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا

"بس کیجئے! بس! میں جانتی ہوں آپ کو اب شیر ہوئے ہیں۔ چلو احمد چلیں اب بہت بیٹھ لیا"

"نہیں نہیں ٹھہرو میں نیچے چلتا ہوں۔ اچھا وہ بات تو بتاتی جاؤ زبیدہ ذرا ٹھہرو اب بھاگنی کیوں جاتی ہو زبیدہ . . . . زبیدہ . . . ."

فیاض محمود

چھائی گھٹا گھنگھور

کالے کالے بادل آئے، چھائے چاریوں اور
سکھی ری، چھائے چاریوں اور
ہوا چلے اور بوندا برسیں، بن میں ناچے مور
سکھی ری، بن میں ناچے مور
چھائی گھٹا گھنگھور، سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

اندر لوک میں باجا باجے، ہوا مچاوے شور
سکھی ری، ہوا مچاوے شور
کالی کالی رات ڈراوے، جیا گھبراوے مور
سکھی ری، جیا گھبراوے مور
چھائی گھٹا گھنگھور، سکھی ری، چھائی گھٹا گھنگھور

رات اندھیری پاٹے کھاوے، کیسے ہوئے بھور
سکھی ری کیسے ہوئے بھور؟
مور سکھی کوئی گیت سناوے، گلا سُہانا تور
سکھی ری، گلا سہانا تور
چھائی گھٹا گھنگھور، سکھی ری، چھائی گھٹا گھنگھور

سید مقبول حسین

(از کاؤنٹ ٹالسٹائی)

شہباز نام کا ایک کسان ایک قصبہ میں رہا کرتا تھا اور رہتا بھی اچھی طرح تھا۔ اُس کی صحت بہت اچھی تھی وہ گاؤں بھر میں سب سے اچھا کام کرنے والا تھا۔ اس کے تین جوان بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک کی شادی ہو چکی تھی۔ دوسرے کی بات ٹھہر چکی تھی تیسرا ابھی نسبتہً کم عمر تھا کہ اس نے ابھی گھوڑوں کی رکھوالی اور ہل چلانے کا کام سنبھالا ہی تھا۔ شہباز کی بوڑھی بیوی امیرن بڑی ہوشیار اور اچھی منتظم اور سگھڑ عورت تھی۔ اور بہو بھی امن پسند اور خاموش اور محنتی تھی۔ بس شہباز کا اب یہی کام تھا کہ وہ اپنے خاندان میں مزے سے رہے سہے۔ اس کے گھر میں اگر کوئی بیکار آدمی تھا تو صرف اس کا بوڑھا ناتوان باپ تھا کہ متواتر چھ برس سے وہ گھر کے چولھے کے سامنے دمہ کا دُکھ پڑا برداشت کر رہا تھا۔ شہباز کے گھر میں خدا کا دیا سبھی کچھ تھا۔ اور بمقدار کثیر۔ تین گھوڑے، ایک بچھیرا، ایک گائے ایک بچھڑا اور پندرہ بھیڑیں اس کی ملک تھیں۔ گھر کی عورتیں نہ صرف اپنے مردوں کے کپڑوں میں پیوند ہی لگا دیا کرتی تھیں بلکہ ان کے علاوہ کھیتوں میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں۔ گھر کے مرد بھی کھیتوں میں سخت مشقت کا کام کرتے تھے پہلی فصل کا اناج نئی فصل آنے تک رہتا تھا۔ وہ اپنی جئی کی فصل سے سرکاری لگان باقاعدہ ادا کرتے اور اپنی تمام واجبی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ شہباز کا یہی کام تھا کہ وہ اپنے خاندان میں امن اور چین سے رہے سہے۔

شہباز کے پڑوس میں بلکہ اس کے گھر سے ملتی ہوئی دوسری جھونپڑی میں جلال بن غنی نام کا ایک اپاہج بھی رہا کرتا تھا۔ بدقسمتی سے ان میں ایک بات کا بتنگڑ بن کر لڑائی شروع ہو گئی۔

جب تک جلال کا باپ غنی زندہ رہا اور ادھر شہباز کا باپ اپنے گھر کا منتظم تھا یہ کسان ایسے اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے تھے کہ دوسروں کے لئے نظیر تھے اگر ان کی عورتوں میں سے کسی کو چھلنی، پیپے کی اور مردوں کو جھول، بورے یا نئے پہئے کی ضرورت پڑتی تو وہ خوشی سے ایک کے آنگن یا کھیت سے دوسرے کے آنگن یا کھیت میں بھیج دیا کرتے تھے۔ اور اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے اور ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرنے کا خیال رکھا کرتے تھے۔ اگر اتفاقاً کسی کا بچھڑا دوسرے کے کھلیان میں گھس جاتا تو وہ خاموشی سے نکال دیتا ہے اور کہتا بھی تو صرف اتنا کہ "دیکھو بھائی پھر اسے ادھر نہ آنے دینا" ابھی ہم نے غلہ اور بھوسا اٹھایا نہیں، ورنہ جہاں تک چیزوں کے چھپانے تالے میں رکھنے اور کھلیان اور باڑے کو بند رکھنے کا تعلق ہے یا آپس کا جھگڑا۔ ایسی باتیں کبھی ظہور میں نہ آتی تھیں۔ جب تک

بڑے بوڑھوں کا سایہ سر پر رہا یہ لوگ اسی طرح امن چین سے رہے لیکن جب نئی پود نے سر اٹھایا اور کاروبار ان کے ہاتھ میں آیا تو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا۔ پہلی بساط ہی تلپٹ ہو گئی۔ یہ ساری بلا آئی کہاں سے محض ایک ادنیٰ سی بات سے کہیں شہباز کی بہو کی ایک چھوٹی سی مرغی نے موسم سے پہلے ہی انڈے دینا شروع کر دئے تھے۔ نوجوان دلہن نے آنے والی ایک خوشی کی تقریب کے لئے انہیں جمع کرنا شروع کر دیا حسب معمول ہر روز انڈے کے لئے وہ مرغیوں کے دڑبے کی طرف جاتی جو باڑے ہی میں تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی دن کہیں مرغی کو بچوں نے ڈرا کر وہاں سے بھگا دیا اور مرغی ہمسائے کی باڑ پھاند کر ان کے ہاں انڈے دینے لگی۔ نوجوان دلہن نے کبھی مرغی کے کڑکڑانے کی آواز سن لی تھی۔ اس نے دل میں سوچا " کہ میرے پاس وقت نہیں۔ ابھی کچھ فرصت ملے تو پہلے مجھے گھر میں صفائی ستھرائی کرنی ہے کام کر کے پھر جاؤں گی اور انڈے لے آؤں گی۔ جب شام ہوئی تو وہ باڑے میں گئی۔ دڑبے کو اس نے دیکھا بھالا مگر انڈا وہاں کہاں تھا۔ نوجوان دلہن نے اپنی ساس اور دیور سے پوچھا کہ کہیں انہوں نے انڈا تو نہیں اٹھایا۔ انہوں نے کہا " نہیں ہم نے تو اٹھایا نہیں "۔ لیکن طفیل اس کے سب سے چھوٹے دیور نے کہا کہ تمہاری مرغی نے ہمسائے کے باڑے میں انڈے دینے شروع کر دئے ہیں۔ وہیں سے اس کے کڑکڑانے کی آواز آتی تھی اور وہ وہیں سے اڑتی ہوئی ادھر آتی بھی ہے۔

نوجوان عورت نے اپنی ننھی مرغی کی طرف دیکھا۔ وہ قریب ہی ایک مرغ چھٹے کے پاس بیٹھی اونگھ رہی تھی آنکھیں اس کی بند تھیں۔ اگر مرغی کے زبان ہوتی اور وہ اس کے سوال کا جواب دے سکتی تو وہ اس سے ضرور پوچھ لیتی کہ انڈا کہاں ہے۔ اس لئے نوجوان عورت ہمسایہ کے ہاں گئی۔ بوڑھی ہمسائی دروازہ کے باہر آگئی اور بولی "بہن پڑوسن کیا چاہتی ہو ؟"

"پھپھی! میری مرغی اڑ کر آپ کے باڑے میں آگئی تھی ممکن ہے اس نے ادھر انڈا بھی دے دیا ہو"

"ہم نے تو مطلق نہیں دیکھا اور یوں بھی خدا کا شکر ہے ہماری اپنی مرغیاں ہی کب سے انڈے دے رہی ہیں۔ ہم اپنی مرغیوں کے انڈے تو البتہ اکٹھے کرتے ہیں لیکن ہمیں دوسروں کے انڈوں کی ضرورت نہیں اور ہم دوسروں کے باڑوں میں اپنی مرغیوں کے انڈے کبھی اکٹھے کرنے نہیں جاتے۔

یہ تو نوجوان عورت کی ہتک تھی۔ اس لئے اس نے بھی وہ وہ سنائیں جو کہنی زیبا نہ تھیں۔ بی ہمسائی کیا کم تھیں انہوں نے اسی انداز سے جواب دئے۔ اب تو عورتیں ایک دوسرے پر گرجنے برسنے لگیں۔ شہباز کی بیوی پانی لینے آئی تو اس نے بھی ایک آدھ بات کہی یہ سن کر جلال کی بیوی اپنے مکان سے جھپٹ کر نکلی اور اس نے اپنی ہمسائی کو ملزم بنانا شروع کیا۔ اس نے گڑے مُردے اکھاڑے پرانے بکھیڑے جو کبھی کے فراموش ہو چکے تھے اور نئی باتیں جن کا کبھی ظہور نہ ہوا افشا بیان کیں اور اب تو باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ محاذ قائم ہو گیا اور طوفان جوش میں آگیا

سب کی سب چلاتی تھیں چیختی تھیں اور کوشش کرتی تھیں کہ ان کی زبانیں ایک وقت میں دو دو الفاظ کہہ ڈالیں اور لفظ بھی وہ! کہ خدا کی پناہ! بے اور گندے۔ "تم ایسے اور تم ایسے"۔ "تم چور ہو"۔ "تم پھوہڑ ہو"۔ "تم اپنے بوڑھے سسر کو بھوکا مارتی ہو"۔ "اری چڑیل میں تجھے پہچانتی ہوں تو نے تو میری چھلنی میں اور سوراخ بنا ڈالے تھے اور تو نے ہمارا مشکیزہ چرا لیا تھا۔ کرو واپس اب اگر شرم والی ہو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے"۔ باتوں باتوں میں مشکیزے پر قبضہ کیا۔ اس کا پانی گرا دیا۔ ایک دوسری کی شال کی دھجیاں اڑا دیں اور لگیں ہاتھا پائی کرنے۔

اس وقت جلال بھی کھیت سے گھر میں داخل ہوا۔ تو اس نے اپنی بیوی کی طرف داری شروع کر دی۔ اتنے میں شہباز اور اس کے بیٹے بھی آن پہنچے اور آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ شہباز شہ زور کسان تھا۔ اس نے ایک ایک کو اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینک دیا اور جلال کی داڑھی نوچ لی۔ لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے مگر ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل کام تھا۔

بس یہ تھی تباہی کی ابتدا۔ جلال نے اپنی نچی ہوئی داڑھی کے بال ایک کاغذ میں لپیٹ لئے اور ضلع کی عدالت میں شہباز کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت میں بیان دیتے ہوئے اس نے کہا "میں نے یہ داڑھی اس لئے نہیں بڑھائی تھی کہ وہ خنزیر کے سے سر والا شہباز اسے نوچ ڈالے"۔

جلال کی بیوی نے ہمسایوں میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا کہ اب شہباز ہمارے پیچ میں آجائے گا اور اسے نیس نکالا نہ دلایا تو ہمارا نام نہیں۔ اسی طرح باہمی منافست روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

جھگڑے کے پہلے دن ہی سے بوڑھے نے اندر پڑے پڑے ہی صلح صفائی کرانا چاہی، لیکن نوجوان اس کی بات کہاں سنتے تھے۔

اس نے ان سے کہا "میرے بچو تم نادانی کر رہے ہو۔ اور یہ بڑی نادانی کی بات تھی جس پہ لڑائی شروع ہوئی تم سوچو تو سہی۔ ارے یہ ساری لڑائی کیا صرف ایک حقیر سے انڈے پر نہیں شروع ہوئی۔ چلو فرض کر لو کہ ان کے بچوں نے انڈا اٹھا ہی لیا تھا تو تم نے کیوں نہ ان کے پاس رہنے دیا۔ ایک انڈے کی بھی کوئی بساط ہے۔ یہ بھی کوئی بڑی متاع ہے۔ خدا سب کو بکثرت دے رہا ہے۔ مانا کہ ہمسائی نے تمہیں کوئی برا لفظ کہا تھا۔ تم اس کی اصلاح کر دیتے۔ تم اس کے بجائے بہتر باتیں اس کو کہتے۔ خیر لڑائی تو ہو چکی اور ہم سب گناہ کار ہیں۔ ایسی باتیں بھی ہو ہی جایا کرتی ہیں لیکن اب بھی اگر تم جھگڑے کو طول دیتے جاؤ گے تو نتیجہ تمہارے لئے بد سے بدتر ثابت ہوگا۔

نوجوانوں نے اس کی بات پر قطعاً توجہ نہ کی۔ بلکہ انہوں نے کہا کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے اور بیکار باتیں کر رہا ہے یونہی بک رہا ہے اور بوڑھوں سے اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے۔

شہباز اپنے پڑوسی سے دبنے والا یا اپنی بھول ماننے والا کب تھا بولا کہ میں نے اس کی داڑھی نہیں نوچی خود

اس نے نوچی اور نام میرا بدنام کیا لیکن اس کے بیٹوں نے تو میری آنکھیں تک حلقوں سے نکال ڈالیں اور میرا قمیص پیچھے سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ لو یہ دیکھو تو۔"

شہباز نے بھی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمہ کی سماعت حاکم ضلع کی عدالت میں ہونے لگی۔ ابھی جب کہ مقدمہ جاری تھا کہیں۔ جلال کے چھکڑے کی ایک ڈھبری گم ہو گئی اور جلال کے گھر کی عورتوں نے شہباز کے بیٹے پر اس کے چرائے جانے کا الزام لگا دیا۔

وہ بولیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اسے کھڑکی میں سے اندر آتے دیکھا ہے اور جب وہ چوری کر کے واپس آ رہا تھا تو اسے فقیرنی نے شراب خانے کے پاس رکھتے دیکھا اور وہ شراب فروش کے ہاتھ بیچنا چاہتا تھا۔

اب ایک اور مقدمہ شروع ہو گیا اور ادھر گھر میں ہر روز ایک نہ ایک نئی تکرار اور لڑائی ہو ہی جاتی تھی۔ چھوٹے بچوں نے بھی اپنے ماں باپ کی دیکھا دیکھی آپس میں لڑنا شروع کیا۔ عورتیں جب گھاٹ پر پانی لینے جاتیں تو وہ پانی نکالنے کے لئے اتنے ہاتھ نہ چلاتی تھیں جس قدر ان کی زبانیں چلتی تھیں مگر سب بے کار۔

پہلے پہلے تو مرد زبانی ہی ایک دوسرے پر الزام دھرا کرتے تھے مگر پھر تو یوں ہوا کہ جو جس کے ہاتھ لگتا وہ اس کو غائب کر دیتا تھا۔ عورتوں اور بچوں نے بھی اس اڑن چھو کرنے والے فن میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگی بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

شہباز اور جلال کے مقدمے پنچایت میں ہوئے۔ حاکم ضلع کی عدالت اور جسٹس آف دی پیس کے سامنے ہوئے حتیٰ کہ حکام اور عدالتیں ان کے مقدمات کی سماعت کرتے کرتے تنگ آ گئیں مقدمہ یا جلال کے حق میں ہوتا تھا اور شہباز کو سزائے قید و جرمانہ ہوتی تھی یا جلال سزا پاتا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے جاتے تھے وہ ایک دوسرے کے زیادہ دشمن ہوتے چلے جاتے تھے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب کتے آپس میں لڑنے لگتے ہیں تو جتنا وہ ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں اُسی قدر وہ اور بپھرتے اور تند خو ہو کر لڑنے لگتے ہیں۔ اگر لڑتے ہوئے کتوں میں سے کسی ایک کی پیٹھ پر کوئی اور شخص کچھ مار دے تو کتا خیال کرتا ہے کہ مجھے دوسرے کتے ہی نے کاٹا ہے۔ اس پر وہ اور غصے میں آ جاتا ہے۔ یہی حال ان کسانوں کا تھا۔ ان کی مقدمہ بازی جاری رہی جب ان میں سے کبھی کسی کو سزائے جرمانہ یا گرفتاری ملتی تو ان کے دل پہلے سے زیادہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے تھے۔ ہر ایک یہی کہا کرتا تھا کہ "ٹھہرو ابھی تو مجھے تم سے اور سمجھنا ہے۔"

یونہی ان کے مقدمات نے چھ سال تک طول کھینچا اور ابھی تک جھونپڑی میں پڑا رہنے والا بوڑھا معذور کچھ نہ کچھ کہتا چلا جاتا تھا اور ان کو قائل و معقول کرنے کی فکر کیا کرتا تھا۔ "میرے بچو! تم کیا کر رہے ہو؟ ان سب جھگڑوں کو چھوڑو اور اپنے کام دھندوں سے بے پروائی نہ کرو اور کسی کے خلاف کینہ کپٹ اپنے دل میں نہ رکھو یہ تمہارے لئے ان مقدمہ بازیوں

سے کہیں بہتر ہوگا کیونکہ جس قدر غصہ میں آگ سے شعلہ ہوتے چلے جاؤ گے نتیجہ خراب سے خراب تر اور برباد ہوتا جائے گا مگر وہ لوگ بوڑھے کی بات پر کان ہی نہ دھرتے تھے۔

ان جھگڑوں پر ساتواں برس گذر رہا تھا کہ ایک دن بھرے مجمع میں ایک شادی کے موقع پر شہباز کی بہو نے جلال کی ہتک کر ڈالی۔ اُس نے جلال پر گھوڑوں کی چوری کا الزام لگایا۔ جلال بدقسمتی سے نشہ میں تھا۔ وہ اپنا غصہ قابو میں نہ رکھ سکا اور اس نے عورت ذات کو پیٹ ڈالا اور اس سختی سے پیٹا کہ وہ ہفتہ بھر بستر پر پڑی رہی۔ شہباز اس حادثہ پر خوش ہوا اور ایک مجسٹریٹ کے پاس جلال کی گرفتاری کے وارنٹ نکلوانے کے لئے جا پہنچا۔

اس نے دل میں خیال کیا کہ "اب تو میں اپنے اس پڑوسی سے حساب صاف ہی کر کے رہوں گا۔ اب یہ جیل یا کالے پانی سے نہیں بچ سکتا" لیکن شہباز مقدمہ ہار گیا۔ مجسٹریٹ نے اس کی عرضداشت قبول نہ کی عورت کا بھی معائنہ کیا گیا۔ جب وہ عدالت میں کھڑی ہوئی تو اس کے جسم پر کسی قسم کے زدوکوب کے نشانات نہ پائے گئے۔ آخر شہباز کو عدالت گردی سے پریشانی ہوئی۔ اس نے جج کے سیکرٹری کے ساتھ ساز باز کیا۔ آخر اس رشوت خورانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اتنی کامیابی ہوئی کہ جلال کے لئے سزائے تازیانہ کا فیصلہ کیا گیا۔

جلال کو عدالت کا فیصلہ مثل خوان نے پڑھ کر سنا دیا۔ جو یوں تھا کہ "عدالت حکم دیتی ہے کہ جلال مزارع عدالت کے سامنے بیس کوڑے کی سزا پائے"۔ شہباز نے بھی فیصلہ سنا اور جلال کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا کہ "اب اس پر کیسی بنے گی" جلال نے بھی سنا۔ فیصلہ سن کر اس کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ مڑا اور ساتھ کے کمرے میں چلا گیا۔ شہباز بھی اس کے پیچھے داخل ہوا۔ کہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو۔ لیکن اس نے سنا کہ جلال کہہ رہا تھا۔ "بہت اچھا یہ میری پیٹھ پر کوڑے لگوا سکتا ہے۔ کیا ہوگا یہی نا کہ میری پیٹھ جلنے لگے گی۔ لیکن اسے اس سے بھی زیادہ خرابی کا منتظر رہنا چاہئے"۔

شہباز نے یہ الفاظ سن لئے۔ سنتے ہی فوراً حکام کی طرف مخاطب ہو کر بولا "منصف جج۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میرے گھر میں آگ لگا دے گا سن لیجئے۔ اس نے یہ بات اور گواہوں کے سامنے کی ہے"۔

جلال واپس بلایا گیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا؟"

میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میری پشت پر کوڑے لگائیے کہ آپ کے ہاتھ میں آج طاقت اور حکومت ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ میں حق بجانب ہوں مگر دکھ اٹھانے کے لئے میں ہی تنہا رہ گیا ہوں اور اسے من مانی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے"

جلال کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹوں اور رخساروں میں کپکپی شروع ہوگئی۔ اس لئے اُس نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ جب ججوں نے جلال کی یہ حالت دیکھی تو وہ بھی اس کے انداز سے گھبرا گئے۔

انہوں نے خیال کیا کہ اب فرض کرو کہ یہ شخص واقعی اپنے ہمسایہ کو کچھ گزند پہنچانے کے لئے ٹھان ہی لے تو؟" اس خیال کے زیر اثر بوڑھے جج نے کہنا شروع کیا کہ بھائیو! دیکھو تو سہی کیا ہی بہتر ہو تاکہ تم لوگ اپنے دلوں سے غصہ نکال کر پھر سے آپس میں دوستانہ کر لو۔ بھیا جلال کیا تم نے حاملہ عورت پر دست درازی کر کے کچھ اچھا کام کیا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ خدا نے اس کی جان بچالی۔ ورنہ یہ کتنا بڑا گناہ ہوتا۔ اور پھر حق کیا ہے۔ اقبال کر لو اور اپنے پڑوسی سے معافی مانگ لو اور یہ بھی تمہیں معاف کر دے گا تو ہم بھی اپنا فیصلہ بدل دیں گے۔"

جب کلرک نے یہ سُنا تو بولا" یہ نہیں ہو سکتا۔ دفعہ ۷۱ کے مطابق یہ کوئی آپس کا پرامن سمجھوتا نہ تھا۔ جج کا فیصلہ صادر ہو گیا اور جج کے فتوٰی کی ضرور تعمیل ہو کر رہے گی۔"

جج نے کلرک کی بات پر کچھ توجہ نہ کی۔ غالباً بولنے کے لئے تمہاری زبان میں کھجلی ہو رہی تھی۔ ہمارے نزدیک ایک ہی دفعہ ہے اور وہ پہلی ہی دفعہ ہے کہ خدا کو یاد رکھو اور خدا نے حکم دیا ہے کہ تم آپس میں میل ملاپ کر لیا کرو۔" اس کے بعد جج نے کسانوں کو ہر چند سمجھونے کے لئے آمادہ کیا۔ مگر بے کار۔ جلال نے اس کے الفاظ پر کچھ توجہ نہ کی۔

اس نے کہا میری عمر تقریباً پچاس سال کی ہے۔ میرا ایک بیٹا بیاہا ہوا ہے۔ بیس عمر بھر میں کبھی پٹیا نہیں گیا تھا لیکن اب اس خنزیر صفت شہباز کی بدولت میری پیٹھ پر کوڑے بھی لگائے گئے۔ اس پر بھی مجھ سے کہا جاتا ہے کہ میں معافی مانگوں۔ اچھا اگر یہ بھی ہو گا تو چاہیئے کہ شہباز میرا انتظار کرے۔

جلال کی آواز میں پھر تھرتھری تھی۔ وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔ وہ مڑا اور باہر چلا گیا۔

عدالت سے مکان کسی قدر فاصلہ پر تھا۔ اس لئے شہباز مکان پر دیر سے پہنچا۔ عورتیں ریوڑ کو باہر سے لانے کے لئے جا چکی تھیں۔ اس نے اپنے گھوڑے کا ساز اتارا اور سامان کو مناسب جگہوں پر رکھ کر گھر کے اندر داخل ہوا۔ بچے کھیتوں سے ابھی واپس نہ آئے تھے۔ عورتیں بھی ابھی جانوروں کے ساتھ ہی میدانوں میں تھیں۔ شہباز مکان میں داخل ہوا ایک تپائی پر بیٹھ کر اپنے ہی خیالات کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اسے یاد آیا کہ کس طرح جلال کے سامنے مقدمہ کا فیصلہ پڑھا گیا اور وہ کس طرح سن کر زرد پڑ گیا اور اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل ڈوب گیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کی جگہ خیال کیا کہ گویا اسی کو کوڑے کھانا تھا۔ اب اسے جلال پر ترس آنے لگا۔ اس نے سنا کہ اس کا بوڑھا باپ اپنے جھونپڑے میں کھانس رہا تھا۔ اور ایک طرف سے دوسری طرف کو کھسک رہا تھا۔ اس نے اپنے پیر پھیلا دئے۔ پھر زمین پر آ رہا۔ پھر اور کھسکا اور گھسٹتا ہوا تپائی تک آیا اور نیچے بیٹھ گیا۔ اب اس کے لئے مشکل تھا کہ وہ تپائی کے اور قریب ہو سکے کھانسی اٹھی وہ کھانستا رہا اور جب اس کی کھانسی کا دورہ ختم ہو چکا تو اس نے اپنی باہیں تپائی کے کناروں پر رکھ دیں اور کہا

"اچھا! تو کیا اسے سزا دے دی گئی ہے؟"

"ہاں اسے بیس بیس درّے لگائے گئے"۔

"بوڑھے آدمی نے اپنا سر ہلایا"

"شہباز! تم برا کر رہے تھے۔ اس کے لئے نہیں اپنے لئے۔ اب فرض کرو کہ حکام نے بیس بیس درّے اس کی کمر پر لگا دئے تو کیا اس سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل ہوگا؟

"شہباز نے کہا۔ وہ پھر کبھی ایسا نہیں کرے گا"۔

"وہ پھر کیسا نہ کرے گا۔ کیا اس نے کوئی بات اس سے زیادہ خراب کی ہے جو تم خود کر چکے ہو؟"

"شہباز نے پوچھا کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ اُس نے کیا کیا کیا ہے؟ اس نے غریب عورت کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا اور اب وہ ہمارے گھر کو پھونک دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ تو پھر میں کیوں اس سے معافی مانگوں"۔

بڈھے نے آہ بھری اور کہا "شہباز۔ تمہارے لئے تمام دنیا کھلی پڑی ہے۔ جہاں آنا چاہو آؤ جہاں سے جانا چاہو جاؤ۔ اور چونکہ میں جھونپڑے کے ایک کونے میں پڑا رہا کرتا تھا تم خیال کرتے تھے کہ تم سب کچھ دیکھتے ہو اور میں کچھ نہیں دیکھتا۔

نہیں میرے جوان نہیں۔ بلکہ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ غصّے نے تمہاری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے دوسروں کی غلطیاں تو تمہاری نگاہ کے سامنے ہیں اور اپنی خطائیں اور کوتاہیاں تمہاری پیٹھ کے پیچھے ہیں تم کہتے ہو کہ اس نے خطا کی گناہ کیا جرم کیا۔ اگر صرف وہی اکیلا خطاوار۔ گناہگار اور مجرم ہوتا تو گناہ اور جرم کا وجود ہی دنیا میں نہ ہونا چاہئے تھا۔ کیا دنیا میں بدی ایک ہی آدمی کی وجہ سے پھیل جاتی ہے اور تالی ایک ہی ہاتھ سے بجتی ہے۔ نہیں بلکہ لڑائی تو ہوتی ہی تب ہے جب دو آدمی ہوں۔ تم اس کے جرائم دیکھ سکتے ہو لیکن تم اپنے جرائم نہیں دیکھ سکتے۔ اگر تنہا وہی برائی کا ذمہ دار ہوتا اور تم نے ہمیشہ بھلائی کی ہوتی۔ تو پھر مطلق اس لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آتی کہو کس نے اس کی داڑھی نوچی؟ کس نے اس کے سوکھے گھاس کے ذخیرہ کو کوڑا کرکٹ بنایا۔ کون اسے عدالتوں میں گھسیٹتا پھرا۔ اس پر بھی تم سب الزام اسی پر دھرتے ہو۔ تمہاری زندگی ہی برائی ہے جو بڑی بری بات ہے۔ میرے بچے میں نے اس طریقہ سے اپنی زندگی نہ گذاری تھی۔ یہ وہ باتیں نہیں جو میں نے تمہیں سکھائی تھیں۔ کیا میں اور اس کا بوڑھا باپ بھی ایک دوسرے سے ایسا ہی سلوک روا رکھتے تھے؟ نہیں ہم تو ایک دوسرے کے اچھے پڑوسی تھے۔ اگر کبھی ان کے گھر میں آٹا نہ ہوتا تھا تو ان کے گھر کی کوئی عورت ہمارے ہاں آتی اور کہتی چچا فاروق ہمارے ہاں آٹا نہیں۔ میں کہتا "جاؤ بیٹی کوٹھڑی میں جاؤ جتنا آٹا چاہیئے لے لو۔ ان کے ہاں گھوڑے پھرانے والا کوئی نہ تھا تو میں تمہیں سے کہا کرتا تھا جاؤ شہباز بیٹے ان کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرو اور اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو میں ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ وہ کس خوشی سے کہتے "لے لو چچا فاروق"۔ یہ تو تھا ہمارا میل ملاپ اور آپس کا برتاؤ

لیکن اب کیا رنگ ہیں۔ ایک سپاہی یورپ کی جنگ کے حالات سنا رہا تھا۔ سچ پوچھو تو تمہاری لڑائی کچھ یورپ کی لڑائی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ کیا یہی زندگی ہے یہ تو ایک گناہ ہے۔ تم کسان ہو اور اپنے گھر کے مالک بھی۔ تم کو ان سب باتوں کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ تم اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو کیا سکھا رہے ہو۔ کیا یہی کہ وہ کتوں کی طرح آپس میں لڑا کریں۔ ابھی شاید کل کی بات ہے کہ اور تو اور یہی تمہارا طفیل جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے اپنی پھوپھی عارفہ اور اس کی ماں کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ اور اس کی ماں بجائے اس کے کہ اسے روکتی کھڑی ہنس رہی تھی۔ کیا یہ اچھے لچھن ہیں۔ ان سب باتوں کی ذمہ داری تم پر ہے اور فقط تم پر۔ تم اپنے دل میں غور تو کرو۔ کیا معاملات یونہی رہیں گے۔ تم جو ایک بات کہتے ہو اور میں اس کے جواب میں دو کہتا ہوں۔ تم ایک گھونسا لگاتے ہو میں دو لگاتا ہوں نہیں میرے بچے نہیں کیا خدا کے نیک بندے اس کے پیغمبر یہی باتیں سکھانے کے لئے زمین پر آئے تھے نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تمہیں کوئی نالائم بات کہی جائے تم ضبط کرو۔ صبر سے کام لو۔ خود بدگو کا ضمیر اسے ملامت کرے گا۔ شہباز یہی آسمانی تعلیم ہے۔ یہی روحانی سبق ہے کہ اگر کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال پھیر دو کہ لو بھائی اگر میں مستحق ہوں تو ایک اور لگاؤ۔ اس سے خود تھپڑ مارنے والے کے دل میں کانٹے چبھنے لگیں گے۔ اس کے غصہ کے ہتھیار اس کے جسم سے اتر جائیں گے اور وہ تمہاری بات سننے لگے گا۔ ہمیں تو یہ روحانی تعلیم دی گئی ہے ہمیں غرور و تکبر کی راہوں سے روکا گیا ہے۔ تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں؟

شہباز خاموش بیٹھا بوڑھے باپ کی باتیں سنا کیا۔

بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورا ہوا۔ کچھ بلغم نکلا تو اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ آسمانی تعلیم روحانی پیغام غلط ہے۔ اس سے تو ہماری ہی بہتری مقصود تھی اپنی زندگی پر غور کرو۔ کیا یہ اچھی رہی ہے یا بری۔ جب سے تم میں یہ "جنگ عظیم" برپا ہوئی ہے۔ ذرا حساب تو لگاؤ کہ ان مقدمہ بازیوں میں تم کس قدر روپیہ ضائع کر چکے ہو۔ پھر اپنے مقدموں کی پیروی کے لئے جو سفر تمہیں کرنا پڑے ان میں کیا کچھ صرف ہوا جو پچھلی جمع جتھا تھی وہ بھی کھا پی کر برابر کر چکے۔ یہ تمہارے چھوکرے بھڑئیے بنتے چلے جا رہے ہیں ضرورت تھی کہ اب تم زندگی کا لطف اٹھا رہے ہوتے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جو کچھ پاس تھا برباد کر رہے ہو۔ اور یہ سب ہے کیوں؟ ایک بکمی اور بے حاصل بات کے لئے۔ یہ سب تمہارے تکبر و فرعونیت کا نتیجہ ہے ضرورت تھی کہ تم خود اپنے بچوں کے ہمراہ اپنے کھیتوں میں جاتے اور کھیتوں میں کام کرتے اور اپنے ہاتھ سے پودا لگاتے اور کھدائی نلائی کرتے لیکن شیطان نے تمہیں تمہارے اس فرض سے ہٹا دیا اور تم کبھی ججوں اور کبھی مختاروں کے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہو تم گھر آتے ہو تو دیر سے اور چونکہ تخم ریزی تم مناسب وقت پر نہیں کرتے۔ زمین بھی اپنے خزانے نکال کر تمہارے سامنے نہیں رکھ دیتی معلوم ہے کہ کیوں اس دفعہ جیسی پیدا نہیں ہوئی۔ تم نے اسے کب بویا تھا۔ تم شہر سے کب واپس آئے تھے اور

پھر تم نے کیا کیا تھا۔ اپنی گردن کے لئے ایک اور طوق اور اپنی کمر کے لئے ایک اور بوجھ تیار کیا۔ ارے سمجھ بوجھ سے بیگانے اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے کام دھندے کی طرف دھیان دے کھیتوں اور گھر کے کام میں اپنے بیٹوں کا ہاتھ بٹا۔ اگر کوئی تیری ہتک کرے خدا کے نام پر اسے معاف کر تیرے لئے کہیں بہتر ہوگا اور اس سے تیرے دل کو بھی سکھ ملے گا۔"

شہباز نے کچھ نہ کہا

میری بات سنو کہ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ جاؤ اپنے گھوڑے پر ساز ڈالو اور سیدھے عدالت میں پہنچو اور اپنے تمام مقدمات سے دست برداری داخل کر دو اور پھر صبح کے وقت جلال کے ہاں جاؤ اور اس سے معافی مانگو۔ اسے اپنے گھر پر دعوت دو۔ کل تعطیل بھی ہے (کہ کل عید ہے) شیر خرما اور شربت شیرے سے اس کی تواضع کرو۔ سب معاملے کو صاف کرو اس طریق سے کہ ایسا واقعہ پھر کبھی پیش نہ آئے۔ اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی تاکید کر دو۔

شہباز نے آہ بھری اور دل میں خیال کیا بوڑھا کہتا تو سچ ہے۔ اس کا دل بھی نرم ہو گیا لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ اب کس طرح آغاز کرے اور کس طرح صفائی اور صلح کر ڈالے۔

بوڑھے نے پھر بات شروع کی گویا وہ اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔

جاؤ۔ شہباز۔ جاؤ۔ اس میں دیر نہ کرو۔ آگ کو ابتدا ہی میں بجھا دینا چاہیئے ورنہ جب وہ بھڑک اُٹھے تو اس کا بجھانا مشکل ہوتا ہے۔

بوڑھے نے کچھ اور بھی کہنا شروع کیا تھا لیکن اُس نے بات پوری نہ کی کہ عورتیں جھونپڑی میں آ پہنچیں اب تو یوں نظر آنے لگا کہ کوتوں نے سبھا بھری ہے۔ عدالت کی سب خبریں ان کو پہنچ چکی تھیں کہ کس طرح جلال کو دُرّوں کی سزا دی گئی اور کس طرح اس نے گھر کو آگ لگا دینے کی دھمکی دی۔ انہوں نے سب کچھ سن لیا تھا مگر اس میں بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی کر دیا تھا اور واپسی میں انہیں اس بات میں بھی کامیابی حاصل ہو گئی تھی کہ انہوں نے جلال کے گھر کی عورتوں سے لڑائی چھیڑ دی تھی۔

چنانچہ وہ آتے ہی بتانے لگیں کہ جلال کی بہو نے کس طرح ان کو دھمکی دی کہ وہ گاؤں کے مکھیا کو ان کے خلاف بھڑکا دے گی۔ یہ بھی بظاہر ان کو نظر آ رہا تھا کہ مکھیا جلال کی جانب داری کر رہا تھا۔ وہ سارے معاملہ کو زیر و زبر کر ڈالے گا۔ سکول ماسٹر صاحب نے بادشاہ کے حضور میں شہباز کے خلاف ایک عرضداشت بھیجی ہے جس میں باغ کا معاملہ اور دوسری چھوٹی موٹی باتیں سب لکھی ہیں۔ اب ہمارا کھیت ان (جلال والوں) کو دے دیا جائے گا۔ جب شہباز نے عورتوں کے یہ لیکچر سنے اس نے پھر اپنا دل سخت بنا لیا اور جلال سے صلح کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

ایک کسان کے لئے کھیت میں کرنے کے بہت سے کام ہوتے ہیں۔ شہباز نہیں چاہتا تھا کہ عورتوں سے باتیں کرے۔ سو وہ اٹھا اور جھونپڑے سے باہر نکلا اور چلتے چلتے وہاں پہنچا جہاں اس کے کھلیان پڑے تھے قبل اس کے کہ وہ اپنا کام ختم کرکے گھر واپس آتا سورج غروب ہوچکا تھا۔ اس کے لڑکے بھی کھیتوں سے واپس گھر میں آگئے تھے۔ وہ فصلِ ربیع کے لئے ہل جوتنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

شہباز ان سے ملا۔ اس نے ان سے ان کے کام کے متعلق دریافت کیا۔ اُس نے آلاتِ کشاورزی کو اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھنے میں اُن کی مدد کی۔ اس نے سراؤں کے گھوڑے کا سامان الگ رکھا۔ وہ بلیاں اور ڈنڈے وغیرہ چھپّر کے اندر رکھنے کے لئے جانے ہی کو تھا لیکن چونکہ کافی اندھیرا ہوچکا تھا اس لئے اس نے اس کام کو دوسرے دن پر اٹھا رکھا۔ لیکن اس نے جانوروں کو خوب کھلایا اور پھاٹک کھولا کہ طفیل جانوروں کو رات کو چرانے کے لئے باہر لے جائے۔ جانوروں کے نکل جانے کے بعد اُس نے باڑے کا پھاٹک پھر بند کردیا اور مزید احتیاط کے لئے بانس بھی ادھر ادھر اٹکا دیئے۔ اتنے کاموں کے بعد اُس نے جی میں کہا کہ اب کھانے اور سونے کے لئے گھر جانا چاہیئے۔

اس وقت تک وہ جلال کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا حتیٰ کہ وہ بھی جو اس کے باپ نے کہا تھا۔ ابھی مشکل گھر کے دروازہ کی زنجیر کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ اس نے سنا کہ اس کا ہمسایہ باڑ کے پیچھے سے بھرائی ہوئی آواز میں کسی کو گالیاں دے رہا تھا کہ یہ شیطان کس کام کا ہے مستحق ہے کہ اسے جان سے مار ڈالا جائے۔

جب شہباز نے یہ الفاظ سنے تو اس کا وہی پچھلا غصہ لوٹ آیا جس وقت جلال گالیاں دے رہا تھا وہ تھوڑی دیر تک سنتا رہا اور جب جلال خاموش ہوا تو شہباز بھی اپنے جھونپڑے میں داخل ہوگیا۔ جھونپڑے میں روشنی تھی اور اس کی بہو بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ اور اس کی بیوی کھانا نکال رہی تھی اور بڑا بیٹا اپنے موزے پر کپڑا لپیٹ رہا تھا اور بڑے سے چھوٹا ایک تپائی کے قریب چھوٹی سی کتاب لئے بیٹھا تھا اور طفیل باہر گھوڑوں کو چرانے کے لئے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ غرض جھونپڑی میں ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی۔ اگر ان کا ایسا برا پڑوسی نہ ہوتا۔

شہباز داخل ہوا تو غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے بنچ پر بیٹھی ہوئی بلی کو پرے دھکیل دیا اور عورتوں کو برا بھلا کہنا شروع کردیا کہ نادمناسب موقع پر کیوں نہیں رکھی گئی۔ شہباز کو بہت غصہ آرہا تھا۔ وہ بیٹھ کر گھوڑے کی کاٹھی وغیرہ درست کرنے لگا۔ جلال کے الفاظ اس کے دل و دماغ میں طوفان بپا کئے ہوئے تھے کہ کس طرح برسرِ عدالت اس نے اسے دھمکی دی اور اب کس طرح کسی کے متعلق کہہ رہا تھا کہ "اسے مار ڈالنا چاہیئے"۔

گھر کی بڑی بوڑھی نے طفیل کے لئے کھانا تیار کیا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے پوستین اور اس پر ایک اوور کوٹ پہنا اور اس پر کمر کو پیٹی باندھی اور تھوڑی سی روٹی ساتھ لی اور اپنے گھوڑے کے پاس چلا گیا۔ اس کا بڑا بھائی چاہتا تھا کہ وہ اس کو باہر پہنچا دے کیونکہ باہر کافی اندھیرا ہوچکا تھا بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا اور سخت

تذبذب میں رہا تھا۔ مگر شہباز اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اور اس نے اپنے بیٹے کو گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دی پھر وہ کھڑا طفیل کے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سنتا رہا حتیٰ کہ وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں سے جا ملا اور یہ سب لوگ بہت دور نکل گئے۔ پھر شہباز دروازے پر دیر تک کھڑا رہا۔ جلال کے یہ الفاظ اس کے دل سے دور نہ ہوتے تھے۔ "کہ ممکن ہے کوئی بہت ہی بڑا حادثہ تم کو پیش آئے"

شہباز نے دل میں خیال کیا وہ مایوس ہو چکا ہے۔ تمام فصل خشک ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہوا کا بھی زور ہے وہ پچھلی طرف سے احاطہ کے اندر داخل ہو کر آگ لگا سکتا ہے اور یہ ہمارے لئے آفت ہوگی۔ یہ ناپاک شخص ہمیں پھونک ڈالے گا۔ اور پھر پکڑا بھی نہ جائے گا۔ اب اگر کسی طرح میں اس پر قابو پا سکتا تو وہ بچ کر نکل نہیں سکتا"۔

اس وقت شہباز کے دل میں یہی آیا کہ اسے گھر کے سامنے کے دروازے سے اندر نہیں جانا چاہئے اس لئے وہ سیدھا گلی میں گیا اور دروازہ کے پچھواڑے ایک گوشے میں چھپ رہا۔

"نہیں مجھے احاطہ کی طرف جانا چاہئے۔ کون جانتا ہے کہ اس کے دل میں کیا کیا شرارتیں بھری ہیں" شہباز آہستگی سے کھسکتا ہوا دروازوں کے باہر کی طرف بڑھا جونہی کہ وہ نکڑ کی طرف مڑا اور اس نے باڑ کی طرف دیکھا اسے معلوم ہوا کہ گویا اس نے سامنے کی نکڑ سے کسی چیز کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور یہ کہ کسی نے تاریکی سے سر اٹھایا اور پھر تاریکی میں چھپ گیا۔

شہباز ابھی کھڑا رہا۔ اس نے اپنا سانس روک لیا۔ وہ سن رہا تھا اور اس کی نگاہ سامنے جمی ہوئی تھی۔ سب طرف خاموشی تھی۔ صرف ہوا کا ذرا ذرا اور پتوں اور شاخوں کے آپس میں ٹکرانے کا شور تھا۔ اور غلے کے انباروں میں سے ہوا کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ اب جب کہ اس کی نگاہیں تاریکی میں کچھ دیکھنے لگیں۔ تو شہباز کو سب چیزیں ہل چھپر وغیرہ نظر آنے لگیں۔ وہ نظر جما کر دیکھتا رہا لیکن کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ "یہ غلطی ہوگی" شہباز نے خیال کیا۔ "مجھے ایک چکر ضرور لگانا چاہئے۔ وہ چھپرے کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلتا رہا۔ شہباز آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اپنے ٹپو کے جوتوں کی آواز وہ خود بھی نہ سن سکتا تھا۔ وہ نکڑ پر پہنچ گیا تو اس نے پرے کنارے پر دیکھا کہ ہل کے نزدیک ایک چمک سی پیدا ہوئی اور لمحہ بھر میں غائب ہو گئی۔ شہباز کے دل میں ٹیس سی اٹھی اور وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ دوسرا قدم اٹھاتا پہلی جگہ آگ کی چمک پہلے سے زیادہ زور سے پیدا ہوئی اور اس نے ایک آدمی کو بھی دیکھا جس کے سر پر ٹوپی تھی اور اس کی پیٹھ اس کی طرف کو تھی۔ وہ نیچے کو جھکا ہوا تھا اور گھاس کے ایک مٹھے میں جو اس کے ہاتھ میں تھا آگ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

شہباز کا دل اس کے سینہ میں ایک پرندے کی طرح پھڑکنے لگا۔ وہ حواس جمع کر کے آگے بڑھا۔ لیکن اس احتیاط سے کہ اسے اپنے قدم کی آواز خود سنائی نہ دیتی تھی۔

"اب" اس نے دل میں کہا "اب یہ میرے قابو میں ہے اور میں نے اسے آگ لگاتے ہوئے پکڑا لیا ہے"۔
لیکن قبل اس کے شہباز دو قدم اور آگے بڑھاتا کوئی چیز مشتعل سے مشتعل تر ہوگئی تھی لیکن پہلے سے قطعاً مختلف مقام پر۔ یہ کوئی معمولی آگ نہ تھی۔ اب جو آگ لگی تھی وہ چھپر کے اندر کے کھلیان میں لگی تھی۔ اس کے شعلے گھر کی طرف لپک رہے تھے۔ اور جلال اس کی روشنی میں صاف صاف کھڑا نظر آتا تھا۔
باز کی طرح جو چڑیا پر حملہ کرتا ہے شہباز لنگڑے جلال کی طرف جھپٹا۔
"میں اس کی گردن دبا ڈالوں گا۔ وہ اب میرے پنجے سے بچ کر نہیں جاسکتا"۔ اس نے دل میں کہا لیکن غالباً لنگڑے جلال نے اس کے قدموں کی آہٹ سُن لی تھی۔ اس نے پھر کر دیکھا اور باوجود اپنے لنگڑے پن کے وہ ایک خرگوش کی طرح پھلانگتا ہوا اچھاؤ کی طرف چلتا گیا۔
"تم بچ کر جانے نہ پاؤ گے"۔ شہباز نے پکار کر کہا اور اس کے پیچھے اُڑتا ہوا گیا۔
قریب تھا کہ وہ اس کو گلے سے پکڑے۔ مگر جلال اس کے ہاتھ میں سے نکل گیا۔ البتہ اس کے کوٹ کا ایک کنارا اس کے ہاتھ میں آگیا جو پھٹ کر الگ ہوگیا اور شہباز زمین پر گر پڑا۔ "مدد۔ مدد۔ اسے پکڑلو" گرنے کے ساتھ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ گر کر اٹھا اور پھر اس کے تعاقب میں دوڑا۔ لیکن اب جب کہ وہ دوبارہ سنبھل کر دوڑا تو اتنے عرصہ میں جلال تقریباً اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ شہباز جلال کو پکڑ لینا مگر اتنے میں کیا ہوا کہ کسی چیز کی سخت چوٹ شہباز کے سر پر پڑی۔ گویا کہ کوئی پتھر تھا جو اس کی کھوپری پر آن کر لگا۔ یہ جلال ہی کا کام تھا کہ اس نے قریب پڑا ہوا ایک ڈنڈا اٹھایا اور جب شہباز اس کے قریب آیا تو اس نے اپنے پورے زور سے اس کے سر پر مار دیا۔
شہباز کو تارے نظر آنے لگے۔ دنیا اُس کی نگاہ میں تاریک ہوگئی۔ وہ چکرایا۔ اور بے ہوش ہوکر زمین پر آرہا جب ہوش میں آیا تو جلال وہاں سے جاچکا تھا اور دن کی سی روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے اپنے کھیت کی طرف شور برپا تھا۔ چیزیں لوٹ رہی تھیں اور چیزوں کے جلنے اور گرنے سے آواز پیدا ہو رہی تھی۔ شہباز نے دیکھا کہ چھپر کا پچھلا حصہ تو رخصت ہوچکا تھا اور چھپر کے بازوؤں میں آگ اپنا کام کر رہی تھی۔ آگ کے شعلے اور دھواں اور جلتا ہوا گھاس پھونس جھونپڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"اس کا کیا مطلب بھائیو خدا کے لئے کہو" شہباز نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے چلا کر کہا۔ اس کی ضرورت ہے کہ چھت گرادی جائے۔ آگ کو پامال کردیا جائے۔ بھائیو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس نے پھر دہرایا۔
اس نے چلانے کی کوشش کی لیکن اُس کی آواز گلوگیر تھی۔ اس نے دوڑنا چاہا۔ لیکن اس کے پاؤں نے جنبش سے جواب دے دیا تھا اور وہ ایک دوسرے میں پھنستے اور الجھتے تھے۔ اس لئے وہ صرف چل سکا جب کہ

وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ آخر اس کا سانس سینہ میں اٹکنے لگا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھہرا جب اس کا سانس برابر ہوا تو وہ چلا جد
وہ ذخیرہ کے چھپر کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت چھپر کے کنارے بھی آگ کی نذر ہو کر زمین پر گر پڑے تھے اور جھونپڑ
کے ایک گوشہ اور دروازے کو بھی آگ لگ گئی تھی۔ جھونپڑے سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دروازے کی
سب راہیں کٹ چکی تھیں۔ وہاں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا لیکن کسی کے بنائے کچھ نہ بن سکتا تھا۔ پڑوسی آگ کے ڈر سے
اپنے اپنے کھلیانوں کو آگ سے پرے لے جانے میں لگے تھے اور اپنے اپنے احاطوں اور باڑوں سے اپنے جانوروں
کو باہر نکال رہے تھے۔

جب شہباز کا گھر جل چکا تو جلال کے گھر کی باری آئی جھکڑ چلا اور آگ گلیوں میں پھیل گئی۔ اور آدھا گاؤں
راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

شہباز کے گھر سے بوڑھا آدمی (شہباز کا اپاہج باپ) بڑی مشکلوں سے نکال لیا گیا اور اس کے گھر کے لوگ تن
سر کے کپڑے ہی لے کر باہر نکل سکے۔ باقی سب چیزیں جل چکی تھیں سوائے گھوڑوں کے جو رات کی چرائی کے لئے باہر
گئے ہوئے تھے باقی سب چوپائے تباہ ہو گئے۔ مرغی خانے اپنے اڈوں سمیت جھکڑے اور ہل اور سراؤں وغیرہ وغیرہ
سب چیزوں کو آگ بھسم کر چکی تھی۔

جلال کے چوپائے بچائے گئے تھے اور اس کی کچھ فصل بھی حفاظت کی جگہ پہنچا دی گئی تھی۔

رات بھر آگ کا دردورہ رہا۔ شہباز اپنے رہنے کی جگہ کے قریب کھڑا دیکھتا رہا اور یہی کہتا رہا "خدایا اس کا کیا
مطلب ہے۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو گرا کر مسل ڈالا جائے" لیکن جب اس کے جھونپڑے کی چھت
گر پڑی وہ آگ کے قریب گیا اور اس نے جلتی ہوئی ایک بلی کو پکڑ لیا۔ اور چاہا کہ اسے کھینچ لے۔ عورتوں نے اسے دیکھ
لیا اور اسے پیچھے بلانے لگیں۔ اس نے جلتی ہوئی شہتیری کو نکال لیا اور دوسری کو نکالنے کے لئے پھر گیا لیکن چکر کھا
کر آگ ہی میں گر پڑا۔

تب اس کا بیٹا اس کے پیچھے لپکا اور اسے باہر گھسیٹ لایا شہباز کی ڈاڑھی اور سر کے بال جل چکے تھے اس
کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اس کے ہاتھ زخمی تھے مگر ان چیزوں کی طرف اس کا دھیان نہ تھا

مجمع میں لوگ کہہ رہے تھے "غم کے مارے اس کے ہوش بجا نہیں رہے"

آگ ٹھنڈی ہونے لگی تھی شہباز اپنی ہی جگہ کھڑا تھا اور یہی کہے جا رہا تھا "اے خدا کے لئے اس کو گرا ڈالو"

صبح کے وقت گاؤں کے مکھیا نے اپنے بیٹے کو اسے بلانے کے لئے بھیجا۔

"چچا شہباز تمہارے باپ کا آخری وقت ہے۔ وہ تمہیں بلا کر خدا حافظ کہنا چاہتا ہے۔

شہباز اپنے باپ کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کہا کیا جا رہا تھا۔

"کون باپ" اس نے کہا "کسے چاہتا ہے؟"

"وہ تمہیں بلاتا ہے کہ خدا حافظ کہے۔ وہ ہماری جھونپڑی میں دم توڑ رہا ہے۔ آؤ ہم چلیں چچا شہباز"
مکھیا کے بیٹے نے یہ الفاظ کہے اور اسے ہاتھ سے پکڑ لیا شہباز لڑکے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

بوڑھا آدمی (شہباز کا باپ) جب آگ سے نکالا گیا تو جلتے ہوئے گھانس سے گھرا ہوا تھا اور بُری طرح جلا ہوا تھا۔ وہ گاؤں کے مکھیا کے گھر پہنچا دیا گیا تھا جو گاؤں کے سب سے پرلے سرے پر واقع تھا اور گاؤں کا یہی حصہ تھا جو آگ سے بھی محفوظ رہا تھا۔

شہباز اپنے باپ کے پاس پہنچا۔ تو وہاں مکھیا کی بوڑھی بیوی کے سوا اور کوئی شخص موجود نہ تھا البتہ چند بچے تھے۔ اور باقی سب لوگ آگ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ بوڑھا آدمی ایک چھوٹی بتی اپنے ہاتھ میں لئے ایک تخت پر آخری سانس گن رہا تھا اور دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بڑھیا مرنے والے کے پاس گئی اور اس سے کہا تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ بوڑھے نے اپنے بیٹے سے قریب آنے کو کہا۔ جب شہباز قریب پہنچ گیا تو بوڑھے نے کہا۔

"ہاں شہباز میں نے تمہیں کیا کہا تھا۔ بتاؤں گاؤں کو کس نے جلایا؟"

"اُس نے جلایا۔ باواجی" میں نے خود اسے آگ لگاتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اُس نے آگ لگا دی۔ میں صرف اتنا چاہتا تھا کہ جلتے ہوئے گھانس کے مٹھے کو باہر نکال کر پامال کر دیا جاتا اگر ایسا ہوتا تو سب کچھ کبھی نہ ہوتا۔

بوڑھے آدمی نے کہا "شہباز میری موت کا وقت آگیا۔ تمہیں بھی مرنا ہے۔ بولو یہ کس کا گناہ ہے؟"

شہباز نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اور کچھ نہ کہا وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔

"تم خدا کو حاضر ناظر جان کر بولو کس کا گناہ تھا؟"

اس موقع پر شہباز گویا آپ میں آیا اور لنسوارے کر بولا۔

"باواجی میرا گناہ تھا" وہ اپنے باپ کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولا باواجی مجھے معاف کیجئے۔ میں آپ کے سامنے بھی اور خدا کے حضور میں بھی خطاوار ہوں"

بوڑھے آدمی نے اپنا ہاتھ ہلایا اور اس نے شمع اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں تھام لی اور اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا گویا وہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنے ہاتھ کو پورے طور پر نہ اٹھا سکا اور رک گیا۔

"الحمد اللہ الحمد اللہ" کہہ کر پھر اس نے سختی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا

"لیکن شہباز! شہباز"

"کیا ہے باواجی ؟"

"اب تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ نہیں کیا زیبا ہے"۔

شہباز سسکیاں لیتا رہا۔

"اس نے کہا۔ باواجی میں نہیں جانتا۔ اب ہماری زندگی کیسے بسر ہوگی"۔

بوڑھے نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ لبوں کو حرکت دی گویا وہ اپنی طاقت مجتمع کر رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور کہا "تمہاری زندگی خوب بسر ہوگی۔ اگر تم خدا سے صلح کرو تو تمہاری خوب بسر ہوگی"

بوڑھا بولتے بولتے رکا مسکرایا اور بولا

"یاد رکھو شہباز کسی کو مت بتاؤ کہ آگ کس نے لگائی اپنے پڑوسی کا گناہ چھپاؤ اور خدا تم دونوں کو معاف کر دے گا۔

بوڑھے نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بتی پکڑلی اور چھاتی پر نشان سا بنایا۔ پاؤں پھیلا کر لیٹا اور مر گیا۔

شہباز نے جلال کا راز ظاہر نہ کیا اور کوئی نہ جان سکا کہ کس نے آگ لگائی تھی۔ اور شہباز کا دل بھی جلال کی طرف سے صاف ہوگیا اور جلال کو بہت حیرت ہوئی کہ شہباز نے اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دنوں تک تو جلال کو شہباز سے ڈر لگتا رہا۔ لیکن پھر یہ بات جاتی رہی۔ جب مردوں نے لڑنا چھوڑا تو ان کی گھر والیوں نے بھی لڑائی بند کردی۔ جب دوبارہ تعمیر جاری ہوئی تو دونوں گھرانے ایک ہی چھت کے نیچے رہا کرتے تھے اور جب گاؤں بن چکا اور لوگوں کے گھر کھیتوں سے فاصلہ پر چلے گئے تو بھی شہباز اور جلال پہلے کی طرح پڑوسی تھے۔

اب شہباز اور جلال ایسے ہی رہا کرتے تھے جیسے پڑوسیوں کو رہنا چاہیئے جیسا کہ بڑے بوڑھے رہا کرتے تھے۔ شہباز کو ہمیشہ بوڑھے کی نصیحت یاد رہی اور خدا کا یہ قانون بھی کہ آگ کو پہلی ہی چنگاری پر بجھا دینا چاہیئے۔ اگر کسی کو کوئی نقصان پہنچائے تو وہ بدلہ لینے کی کبھی کوشش نہ کرے۔ اگر کسی کو کوئی برا نام دے تو وہ اس کا پلٹ کر جواب نہ دے بلکہ کوشش کرے کہ اسے سکھائے کہ وہ برے الفاظ کو زبان پر نہ لائے۔ یوں وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی اچھی تعلیم دے گا۔ اور یونہی شہباز نے اپنی اصلاح کی اور وہ پہلے کے مقابلہ میں بھلے آدمیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا

مہر محمد خاں شہاب

غزل

ترے حسن کو دلرُبا کر دیا
مرے دل نے کیا جانے کیا کر دیا

بہت بے تکلف تھا تیرا مزاج
تجھے ناز سے آشنا کر دیا

تری تو بتو شوخیوں نے مجھے
تلوّن سے ناآشنا کر دیا

ترے اک تبسم نے جانِ جہاں
محبّت کو لا اِنتہا کر دیا

قیامت تھی تیری وہ دھیمی نظر
مرا زہد جس نے ریا کر دیا

یہی سوچتا ہوں ترے عشق نے
بس کیا تھا مجھے کیا سے کیا کر دیا

ممتاز حسن

بیتال پچیسی

تقریباً پانچویں صدی میں دو کتابیں سنسکرت زبان میں مرتب ہوئیں۔ ایک کا نام بیتال پچیسی (یعنی ال سے متعلق ۲۵ کہانیاں) تھا۔ دوسری کو اسی کا ضمیمہ سمجھنا چاہئیے۔ اس کا نام سنگھاسن بتیسی ہے (تخت کے متعلق ۳۲ حکایات) ان کتابوں کا ترجمہ تقریباً ہندوستان کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سر رچرڈ برٹن نے بیتال پچیسی میں سے گیارہ کہانیوں کا ترجمہ Vikrama & The Vampire کے نام سے انگریزی میں کیا۔ اور The Tales of King Vikrama کو تمام کتاب کو C. A. Kincaid. C.V.O. نے تمام کتاب کو The Tales of King Vikrama کے نام سے انگریزی میں منتقل کر لیا (مطبوعہ اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی)

میرے خیال میں سنگھاسن بتیسی اب تک انگریزی زبان میں منتقل ہو کر ارباب ذوق کے ہاتھوں میں نہیں پہنچی تھی۔ لیکن اب یہ پوری کتاب انگریزی میں موجود ہے۔ معلوم نہیں ہماری اردو نے بھی پچھلی پانچ صدی کی اس یادگار سے کچھ حاصل کیا یا نہیں۔

ضمیمہ اس قدر دلچسپ نہیں ہے جس قدر اصل کتاب ہے۔ ان دلچسپ کہانیوں میں سے ہم فی الحال دو کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

بیتال پچیسی کا ہیرو راجہ وکرم یا وکرماجیت ہے جو ہندوؤں میں اوتار مانا گیا ہے۔ اس کا کیرکٹر انگریزی تاریخ میں انگلستان کے شاہ آرتھر سے کسی قدر ملتا جلتا ہے۔ سنگھاسن کا ہیرو زیادہ پرانے زمانہ کا انسان نہیں ہے مالوے کا راجہ بھوج اس کہانی کا ہیرو ہے۔ قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:-

راجہ بھوج دھرم نگر یا اُجین کا حکمراں تھا۔ اُس کے عہد میں ایک برہمن نے اونتی قصبہ کے پاس ایک قطعۂ اراضی زراعت کے لئے خریدا۔ کھیت کے وسط میں اس نے ایک چبوترا سا چھوڑ دیا تھا جہاں سے وہ جانوروں کو بھگایا کرتا تھا۔ چند روز بعد وہ اس چبوترے میں ایک عجیب وغریب بات محسوس کرنے لگا۔ جب وہ اس پر بیٹھتا تو اُس کے خیالات بے انتہا بلند و وسیع ہو جاتے۔ اُس کے اخلاق اور اُس کی ذہنیت پر ایسا عجیب اثر طاری ہونے لگا کہ وہ عام سطحِ انسانی سے دفعتہً بہت بلند ہو جاتا۔ رموزِ حیات کا انکشاف، آئینِ حکومت کی باریکیاں اور تصوف کے اسرارِ نہفتہ برافگندہ نقاب ہو جاتے اور وہ محسوس کرنے لگتا کہ تمام دنیا اس کے زیرنگیں ہے۔ لیکن جب اس

چبوترے پر سے اتر جاتا تو پھر وہی ایک پست ہمت برہمن تھا اور وہی اس کے گداگری کے خیالات!

آخر ایک روز اُس نے جرأت کر کے راجہ بھوج سے اس تمام واقعے کو بیان کیا۔ وہ بھی سن کر سخت متعجب ہؤا اور بکمال اشتیاق اس سحر بند چبوترہ کی آزمائش کے لئے اس کے ساتھ ہولیا۔ جونہی راجہ نے اس پر قدم رکھا۔ معاً اس پر ایک کیفیت سی طاری ہوئی اور اس کے دماغ میں بھی بلند تریں خیالات، اور مدبرانہ باتیں وارد ہونی شروع ہوئیں۔ اُس نے اس راز کو معلوم کرنا چاہا۔ چنانچہ زرِ کثیر دے کر کھیت برہمن سے خرید لیا اور چبوترے کو کھدوانا شروع کیا۔ آخر کار ایک تختِ زرنگار برآمد ہؤا جس کے چاروں طرف طلائی مورتیاں آویزاں تھیں۔ راجہ اس کو اپنے محل میں لے گیا۔ اشنان کیا اور دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کر کے تخت پر متمکن ہؤا۔ دفعتہً "جادہ" دیوتا کی چھوٹی سی مورتی جو تخت میں آویزاں تھی راجہ سے بولی "راجہ بھوج یہ تخت صرف درویش صفت لوگوں کے لئے ہے۔ عام لوگوں کو اس پر بیٹھنا نہیں چاہئے"۔ راجہ متحیر ہو کر بولا۔ میں ہر سال ہزاروں روپے خیرات کرتا ہوں۔ میرے برابر کوئی کیا دیالو اور دان کرنے والا ہو سکتا ہے"۔ جادہ نے جواب دیا "برخود غلط لوگ اسی طرح اپنی تعریف اپنے منہ سے کیا کرتے ہیں۔ دوسروں کی تعریف کرنا گناہ نہیں لیکن خودستائی پاپ ہے جس کا پھل اندر پاچ کا ہے"۔ راجہ بھوج شرمندہ ہؤا اور مؤدبانہ خواستگارِ عفو ہو کر بولا "اس متبرک تخت کا وارث کون درویش صفت شخص تھا؟"

مورتی نے اس طرح حکایت بیان کرنی شروع کی:۔

جس زمانہ میں راجہ بھرتری اوجین میں حکومت کرتا تھا ایک برہمن نے پروتی دیوی کی تپشا کر کے اس کو بہت خوش کر لیا تھا۔ اس نے ایک روز بکمالِ خوشنودی برہمن سے کہا کہ کوئی انعام طلب کرے۔ برہمن نے اس سے استدعا کی کہ اس کو حیاتِ ابدی بخش دی جائے۔ دیوی نے اس کو ایک سیب عطا کیا اور کہا کہ اس کو کھا لینے سے تم ابدالآباد تک زندہ رہو گے"۔ برہمن نے سیب لے لیا اور مکان پر جا کر سوچنے لگا کہ اگر سیب کھا کر اُس نے حیاتِ ابدی حاصل کر لی تو اس کو مدت العمر تک بھیک مانگتے ہی گذارہ کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ سیب راجہ کو دے دوں۔ ممکن ہے کہ وہ خوش ہو کر اس کے صلہ میں مجھ کو نہال کر دے۔ یہ سوچ کر وہ راجہ بھرتری کے دربار میں پہنچا اور سیب کی خاصیت بیان کی۔ راجہ بہت خوش ہؤا اور خوب انعام و اکرام دے کر وہ سیب اس سے لے لیا۔

وہ سیب راجہ نے اپنی چہیتی بیوی کو دے دیا۔ لیکن بیوی نے خود نہیں کھایا بلکہ اپنے ایک اور عاشق کو دے دیا۔ اس عاشق نے ایک اور کسبی کو دے دیا۔ اس طرح سیب کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ یہ کسبی راجہ کی بہی خواہ تھی چنانچہ اس نے ایک روز حاضرِ خدمت ہو کر وہ سیب راجہ کے نذر کر دیا۔ بھرتری کو جب تمام واقعات کا علم ہوا تو اس کو دنیا و مافیہا سے سخت نفرت ہو گئی۔ اس نے حکومت سے دست کشی اختیار کر لی اور سیب کھا کر

عبادت کے لئے صحرا و بیابان میں نکل گیا۔

لوگوں نے ایک اور شخص کو تخت نشین کر دیا۔ مگر اس کو شیطان نے مار ڈالا۔ اس کے بعد دوسرا آدمی سریر آرائے مملکت ہوا لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے بہت سے لوگ گدی پر بیٹھے اور سب مارے گئے حتیٰ کہ شاہی نسل سے کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ صرف بھرتری کا سب سے چھوٹا بھائی وکرما رہ گیا تھا جب اُس نے تمام واقعات سُنے تو عام حیثیت کے انسان کی طرح اوجین میں وارد ہوا اور تخت نشینی کی آرزو ظاہر کی۔ تمام لوگ اُس کی اس تمنائے مرگ پر متعجب ہوئے اور اس کو سمجھانے لگے لیکن اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بالآخر انہوں نے اُس کو بادشاہ بنا لیا۔

وکرما دن بھر شاہی فرائض انجام دیتا اور شب کو کھانا بستر کے قریب رکھ کر شمشیر بکف تخت کی نگرانی کرتا۔ اس طرح وہ بہت دنوں تک حکومت کرتا رہا۔

پھر یہاں سے دوسری کہانی چھڑ جاتی ہے۔ اسی طرح افسانہ از افسانہ می خیزد و الامضمون جاری ہے اگر اس قسط کو پسند کیا گیا تو انشاء اللہ باقی اجزاء پھر کبھی فراہم کر کے پیش کر دیئے جائیں گے۔

قیسی

محبّت اور عزّت

یہ مانا اک زمانے سے مجھے تجھ سے محبت ہے
یہ مانا تیرا نظّارہ مجھے سامانِ راحت ہے

یہ مانا میں نے پیارے ایسے جذباتِ پریشاں کی
تری صورت سے دل ہی تیرے جلووں سے زینت ہے

یہ مانا مجھ کو بھی جنت بھی دوزخ ہجر میں تیرے
اگر تو ہو تو دوزخ بھی مری نظروں میں جنت ہے

یہ مانا میں غزل خواں ہوں تری تعریف میں ہر دم
یہ مانا مجھ کو خدمت سے تری دیرینہ نسبت ہے

مگر معلوم ہو تجھ کو کہ میں خوددار عاشق ہوں
مجھے تیری محبت سے زیادہ اپنی عزت ہے

جاذب دہلوی

نواہائے راز

کس روز مری موت کا ساماں نہیں ہوتا
کس دن وہ مری جان کا خواہاں نہیں ہوتا

روئے ترے ہر پھول پہ اے گلشنِ فانی
اس طرح کوئی آپ پہ خنداں نہیں ہوتا

ایمان میں شک، کفر میں شک وائے تذبذب
کافر ہی بنے دل جو مسلماں نہیں ہوتا

ایماں مجھے محبوب ہے مشکل ہے تو یہ ہے
ناصح مرا ایماں، ترا ایماں نہیں ہوتا

کس دل سے یہ کہتے ہو، مجھے بھول نہ جانا
بھولے ہو نہیں، بھولنا آساں نہیں ہوتا

یاد

کلفت میں بھی بہانۂ راحت ہے تیری یاد
دوزخ میں بھی مرے لئے جنّت ہے تیری یاد

پھر روتے روتے یاد ہنسی آ گئی تری
تاریک دل میں نورِ مسرت ہے تیری یاد

دونوں جہاں بھی کھو کے نہ بے مایہ میں ہوا
اے رُوحِ دو جہاں مری دولت ہے تیری یاد

دل سے فسانۂ غمِ عالم بھلا دیا!
سحرِ وفا، فسونِ محبّت ہے تیری یاد

پایا تجھے تو غایتِ ہستی کو پا لیا
آئینِ دو جہاں سے فراغت ہے تیری یاد

مجھ سے الم نصیب پہ، اور یہ نوازشیں
مہر و وفا و لُطف و مروّت ہے تیری یاد

حامد علی خاں

گیٹے جرمنی کا ایک مشہور فلسفی، مشہور شاعر، مشہور انشا پرداز اور مشہور ناولسٹ تھا اور اہل جرمنی نے موت و زندگی دونوں حالتوں میں اُس کی نہایت قدر کی۔ اب جب کہ اس کی وفات پر ایک پوری صدی گذر چکی ہے۔ اہلِ جرمنی نے اس کی صد سالہ برسی مناکر اپنی عام عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے اور اس تقریب سے اپریل سنہ ۱۹۳۲ء کے مقتطف نے ایک طویل مضمون گیٹے کے سوانح زندگی پر شائع کیا ہے، جس کا خلاصہ ہم ناظرین معارف کی دلچسپی کے لئے درج کرتے ہیں، وہ لکھتا ہے:-

گیٹے ۲۸ مارچ سنہ ۱۷۴۹ء کو شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوا، جو جرمنی کا ایک عظیم الشان تجارتی شہر ہے، اس کا باپ اگرچہ ایک دولتمند شخص تھا، تاہم وہ کسی شریف خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کا دادا جولاہا تھا اور فرینکفرٹ میں اپنا پیشہ کرتا تھا، پھر بعد کو ایک ہوٹل کا منیجر بن گیا لیکن چونکہ وہ اپنی خاندانی پستی سے واقف تھا اس لئے اُس نے اپنے بیٹے یعنی گیٹے کے باپ کو عمدہ تعلیم دلائی تاکہ خاندانی پستی کی تلافی علمی ذریعہ سے ہوجائے، چنانچہ اس نے تعلیم میں اس قدر ترقی کر لی کہ فرینکفرٹ کے متوسط طبقہ کے بہترین لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا، یہاں تک کہ اس نے سنہ ۱۷۴۸ء میں ایک شریف خاندان میں شادی کر لی، اور شادی کے بعد جو سب سے پہلا لڑکا پیدا ہوا وہ یہی گیٹے تھا

خوش قسمتی سے گیٹے نے تعلیم میں اپنے باپ سے زیادہ ترقی کر لی اور دولت مندی نے اس کی تعلیم کی راہ میں ہر قسم کی آسانیاں پیدا کیں چنانچہ اس نے بچپن کی خانگی تعلیم میں مختلف زبانیں مثلاً لیٹن، یونانی، انگریزی اور فرنچ سیکھیں زبان کے علاوہ علوم و فنون میں اس نے ریاضی، موسیقی اور تصویر کشی کی تعلیم بھی گھر ہی پر پائی، گو وہ ریاضی اور تصویر کشی میں کوئی امتیاز نہ کر سکا، تاہم تصویر کشی میں ایک متوسط درجہ کی مہارت پیدا کر لی، فرینکفرٹ میں بہت سے یہودی بھی رہتے تھے جن کی زبان جرمن اور عبرانی زبان سے مخلوط تھی، اس تعلق سے گیٹے نے عبرانی زبان سیکھ لی اور اس میں اس قدر مہارت بہم پہنچائی، کہ توراۃ کو اس کی اصلی زبان میں پڑھ سکتا تھا، جرمن قوم کی ایک عام اخلاقی خصوصیت صبر و استقلال و تفرد

تو مد ہے اور اسی اخلاقی خصوصیت نے جرمنوں میں اسپشلسٹ یعنی کسی علمی یا عملی شعبے میں خصوصی بننے کی قابلیت اور قوموں سے زیادہ پیدا کر دی ہے۔ لیکن گیٹے میں اس کے بخلاف تلون مزاجی پائی جاتی تھی۔ اس لئے وہ مستقلاً کسی ایک موضوع ایک علم اور ایک شعبے پر قناعت نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اس کا دماغ علم و فن کے ہر دائرے میں چکر لگاتا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے مختلف موضوع کو اپنا جولانگاہ بنایا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ صرف شعر یا ادب پر اکتفا کرتا تو اس سے زیادہ کمال پیدا کرتا جتنا اس نے اس علمی دشت گردی میں پیدا کیا،

بہرحال گھر کی تعلیم سے فارغ ہو کر وہ اکتوبر سنہ ۱۷۶۵ء میں سولہ سال کی عمر میں لیپزگ کی یونیورسٹی میں داخل ہوا گیٹے کے والد نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی، اس لئے اس کی خواہش یہ تھی کہ اس کا بیٹا بھی سب سے پہلے قانون ہی کی تعلیم حاصل کرے لیکن گیٹے بالطبع علم ادب کا شائق تھا اور اس نے قانون کے پروفیسر سے اپنے اس ذوق کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ "ادب ایک سطحی علم ہے عمیق النظر طلبہ اُس کی طرف توجہ نہیں کرتے، اس بنا پر اس نے کچھ دنوں قانونی لکچروں میں شرکت کی لیکن بعد کو دل برداشتہ ہو کر قانون کی تعلیم کو چھوڑ دیا، اس نے اپنی کتاب فاوسٹ میں طالب العلم اور ابلیس کا جو مکالمہ لکھا ہے، وہ غالباً انہی طالب العلمانہ تجربات کا نتیجہ ہے بہرحال وہ قانون کو چھوڑ کر اپنے ذوق کے مطابق دوسرے علوم کی تکمیل میں مشغول ہوا۔ اور علم ادب کے ساتھ تاریخ طبعی اور علم طب سے بھی دلچسپی پیدا کی لیکن اس نے لیپزگ یونیورسٹی میں اپنی زندگی کا بہت کم حصہ بسر کیا، وہ اپنے اوقات زیادہ تر فنون لطیفہ کے معابد میں صرف کرتا تھا، اور جس کے ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا اس کی لڑکی کے وصف میں عاشقانہ اشعار کہتا تھا، اسی زمانے میں اس نے دو ناول "مزاج عشاق" (DIELAUNE DESUEYLIEBTEN) اور "شرکائے جرم" (DIE MILSCHULDIGEW) لکھے اور گیٹے کی تصنیفات میں سب سے قدیم تصنیف یہی دونوں ہیں، اس کے پہلے اس نے جو کچھ لکھا تھا وہ ضائع ہو گیا، بلکہ اُس کا زیادہ تر حصہ اس نے خود جلا ڈالا۔

لیپزگ میں تین سال بسر کرنے کے بعد وہ سنہ ۱۷۶۸ء میں سخت بیمار ہو کر فرینکفورٹ واپس آیا اور سنہ ۱۷۷۰ء کی ابتدا میں کامل شفا پائی۔ اب اس کے باپ نے اس کے غیر مطبوع موضوع یعنی قانون کی تعلیم کے لئے پھر بھیجنا چاہا اور اپریل سنہ ۱۷۷۰ء میں اس کو اسٹراسبرگ کی یونیورسٹی میں بھیجا یہاں اُس نے قانون کی تعلیم تو جبراً حاصل کی، لیکن اپنے وقت کا بڑا حصہ تشریح، علم النباتات، کیمیا اور علم ادب کی تحصیل میں صرف کرتا رہا، غرض اس کی تعلیم کا زمانہ اس طرح گذرا کہ اس نے کبھی ایک علم پر قناعت نہیں کی، بلکہ ہمیشہ زبان کا ذائقہ بدلتا رہا۔

اسٹراسبرگ کا تعلیمی زمانہ گیٹے کے سوانح حیات میں خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے، اسی زمانہ میں اُس نے قانون میں ڈاکٹری کی سند حاصل کر کے اپنے باپ کی آنکھیں ٹھنڈی کیں اور اسی یونیورسٹی میں وہ ہرڈر (HERDER) سے ملا، اور اُس سے مستفید ہوتا رہا۔ ہرڈر نے اصولِ علم ادب میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں، اور وہ گیٹے کو اپنی خاص

تعلیمات سے متاثر کرتا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گیٹے کی توجہ ہومر اور شکسپیر وغیرہ کی طرح قومی شعر و ادب کی طرف مبذول ہو گئی اور اس نے جرمنی کی تاریخ میں جرمن رُوح اور ٹیوٹن قوم کی سپتھالوجی کی جستجو شروع کردی اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی میں ایک نیا ادبی دور شروع ہوگیا جو ان تمام قیود سے آزاد تھا جو ادبِ قدیم دفنِ قدیم کے ذوق و شغف نے عائد کردی تھیں۔

اس جدید تحریک کا نام (STURM UND DRANG) ہے جس کا ترجمہ تو مشکل ہے، البتہ لفظ "شورش" و اضطراب سے کسی قدر یہ مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔ گیٹے کے مشہور ڈرامہ گوٹز (GOTZ) میں اسی رُوح کی جلوہ گری پائی جاتی ہے۔

اسٹراسبرگ کے قریب ہی ایک گاؤں میں ایک پادری رہتا تھا، اور اسی سلسلہ میں اس سے گیٹے کی شناسائی ہو گئی اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگیا، رفتہ رفتہ وہ اس کی لڑکی پر فریفتہ ہوگیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عقد کے متعلق غور و فکر ہونے لگا لیکن پھر گیٹے نے اس کو اپنی آئندہ زندگی کے اعمالِ جلیلہ کے لئے ایک بیڑی سمجھا، اس لئے اُس نے اس تخیل سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور اگست ۱۷۷۱ء میں ڈاکٹر اور وکیل بن کر فرینکفورٹ واپس آیا۔ اور وطن میں واپس آنے کے بعد اس نے اپنا مشہور ناول "گوٹ" لکھنا شروع کیا۔ جو ۱۷۷۳ء میں شائع ہوا۔ لیکن اس کے شائع ہونے سے ایک سال پہلے گیٹے وتسلار میں جہاں ہائیکورٹ تھا، قانونی مشاغل کی مہارت بہم پہنچانے کے لئے چلا گیا اور وہاں جاکر شرلوٹ بوف پر جو کیسنر کی منگیتر تھی، فریفتہ ہوگیا اور چند مہینوں کے بعد فرینکفورٹ میں واپس آکر اس عشق کا نتیجہ ایک کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا نام "آلام ورتر" تھا، یہ کتاب اگرچہ جرمن علمِ ادب میں کوئی بلند پایہ کتاب نہ تھی، تاہم اس سے گیٹے کی شہرت میں خاص اضافہ ہوا اور اس کا اثر اس کی آئندہ زندگی پر پڑا، اس کتاب کے شائع ہونے کے چند دنوں کے بعد وہ فرینکفورٹ میں پھر ایک دولتمند شخص کی لڑکی پر فریفتہ ہوا جس کا نام "انا شونمان" تھا، اس کا نام اس نے لیلی رکھا، اور اس سے قانونی عقد بھی کرلیا، لیکن وہ اُس کو قائم نہ رکھ سکا، اور چند دنوں کے بعد فسخ کردیا، ۱۷۷۵ء میں جب کہ اُس کا سن ۲۶ سال کا تھا اور اپنے اشعار اور تصنیفات کی بدولت جرمنی بلکہ تمام یورپ میں کافی شہرت حاصل کرچکا تھا۔ اس کی ملاقات کارل اوگسٹ ڈیوک ویمر سے کارلسروہے میں ہوئی جس نے اس کو سیر ویمر کی دعوت دی، پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد یہ ڈیوک خود فرانکفورٹ میں آیا، اور گیٹے سے دوبارہ ملاقات کی، اور ویمر آنے پر سخت اصرار کیا، گیٹے کا باپ اگرچہ امرا کے تعلقات کا مخالف تھا۔ تاہم مجبوراً چند ہفتے کی اجازت دی لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ یہ مقام گیٹے کا دوسرا وطن ہوجائے گا۔ اور اس کی قبر کا گنبد نہیں بنے گا۔

اس وقت جرمنی کی حکومت جن مختلف حصوں میں منقسم تھی ویمر اس کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا، اس کے باشندوں کی تعداد بہت کم تھی جو تمامتر زراعت پیشہ تھی، اس حصہ کی آمدنی بھی اگرچہ بہت کم تھی۔ تاہم اس کے رئیس کی قدردانی

سے وہ علماء و فضلاء کا مرکز بن گیا تھا، اور اس حیثیت سے پوٹسڈم کے سوا اس کا کوئی دوسرا حریف نہ تھا، البتہ دونو میں یہ فرق تھا کہ فرڈرک اعظم صرف لیٹن علم و فن کی قدردانی کرتا تھا اور فرانسیسی زبان کا شیدائی تھا، لیکن اس کے بخلاف ویمر کے تمام باشندے جرمن تھے اور وہاں صرف جرمن علوم و فنون کی فرمانروائی تھی اور اس لحاظ سے جرمن علم ادب پر اس کا خوشگوار و پائدار اثر پڑتا تھا۔

ویمر اپنے مناظر طبعی کے لحاظ سے بھی ایک عمدہ مقام تھا، اس لئے گیٹے اپنے دوست ڈیوک کے ساتھ سیر و تفریح کے بھی لطف اٹھاتا تھا علمی گفتگو بھی کرتا تھا، اور ویمر کے سیاسی معاملات پر بھی بحث ہوتی تھی۔ دونوں میں سخت بے تکلفی تھی اور کاشتکاروں اور مزدوروں سے ملتے جلتے رہتے تھے، یہاں تک کہ رات رات بھر مزدوروں کی لڑکیوں کے ساتھ رقص و سرود میں مصروف رہتے تھے، اگرچہ اس زندگی نے ان کے اصلی مشاغل پر کوئی اثر نہ ڈالا تاہم ویمر کے ابتدائی سالوں میں گیٹے کسی قابل ذکر تصنیف کی حیثیت سے نمایاں نہ ہوسکا ڈیوک ویمر نے گیٹے کو بمشاہرہ ۱۲۰۰ ڈالر ایک سرکاری عہدے پر بھی سرفراز کیا جو ویمر میں ایک معزز عہدہ خیال کیا جاتا تھا لیکن ڈیوک کا یہ تقرب اور دفعتہً اتنے بڑے عہدے پر یہ تقرر قدیم ملازمین کے لئے باعث رشک ہوا اور ان لوگوں نے یہ شکایت کی کہ نیچے کے درجوں سے ترقی کئے بغیر وہ اس عہدے کا مستحق نہیں ہوسکتا، اس لئے جو لوگ اس کے مستحق تھے، ان کی حق تلفی ہوگی لیکن ڈیوک نے گیٹے کی قابلیت کی بنا پر اس کو اس عہدے کا سب سے زیادہ مستحق قرار دیا۔

اب اس تعلق سے ڈیوک اور گیٹے کے دوستانہ تعلقات اور بڑھ گئے اور بڑے بڑے انتظامی معاملات اس کے متعلق کئے گئے، ڈیوک نے گیٹے کو مستقل قیام کے لئے نہر آلم پر ایک چھوٹا سا خوشنما گھر بھی عنایت کیا، اور گیٹے نے ویمر میں قیام کرکے مستقل دس برس تک نہایت اہم اصلاحی اور سیاسی خدمتیں انجام دیں۔ ادبی اور علمی خدمات کا سلسلہ اس سے الگ تھا، اور ایک تجربہ کار لیڈی شارلوٹ فان شتائن کی محبت کے رشتۂ دراز کا سلسلہ اس پر مستزاد تھا، ان تمام اعمال شاقہ کو دیکھ کر ڈیوک کی خواہش تھی کہ گیٹے تھوڑا سا وقت آرام کے لئے بھی نکالے لیکن گیٹے نے ۱۷۸۶ء سے پہلے کبھی آرام و اطمینان کی طرف رُخ نہیں کیا، البتہ اس سن میں جب اُس نے اٹلی کا سفر کیا اور مستقل بیس مہینے کی سیاحت میں اس کو رومن قوم کی تہذیب کے عظیم الشان آثار نظر آئے تو ویمر کے سیاسی اور انتظامی امور کے انصرام سے وہ دل برداشتہ ہوگیا۔ علمی و ادبی خدمت کے انجام دینے کا شوق بہت زیادہ بڑھ گیا۔ چنانچہ اس نے اٹلی سے ڈیوک کی خدمت میں استعفا بھیج دیا اور ڈیوک نے دوستانہ تعلقات کی بنا پر اس کو منظور کرلیا۔ البتہ گیٹے نے خود اپنی خواہش سے ان علمی اور فنی خدمات کو اپنے ہاتھ میں رکھا جو تھیٹر سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے بعد گیٹے ۱۷۸۸ء میں ویمر واپس آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا، میڈم فان شتائن نے بھی اس کی خشک مزاجی کو محسوس کیا اور رفتہ رفتہ دونوں کے عاشقانہ تعلقات منقطع ہوگئے، لیکن یہ طوق اس کے گلے سے جدا نہ ہوا بلکہ ۱۷۸۸ء میں ویمر کے ایک باغ میں اس کو ایک نوخیز لڑکی ملی، جس کا نام کرسٹیان تھا۔ یہ لڑکی اگرچہ ادنیٰ درجہ سی تعلق

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامۂ فضیلۂ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی وادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامینِ "ہمایوں"

جلد:- ۲۲

بابت ماہِ اگست ۱۹۳۲ء

نمبر ۲

تصاویر { زخمی انگلی — بچوں کا ہفتہ }

چندہ سالانہ چار روپے چھ آنے مع محصول فی پرچہ ۶/ ویلر بک سٹال پر ۸/

جہاں نما

جاپان میں شادی کی رسم

جاپان کی رسمِ شادی کو جاپانی زبان میں "یومیری" کہتے ہیں جس کا ترجمہ "دلہن کی آمد" ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ شادی کے ذریعہ سے مرد اور عورت کے اتحاد ہی کی رسم نہیں ہوتی بلکہ فی الحقیقت یہ دلہن کو پہلے پہل دولہا کے خاندان میں داخل کرنے کی تقریب ہوتی ہے۔ یہ رسم ہمیشہ رات کو ادا کی جاتی تھی لیکن بڑے بڑے شہروں میں دوپہر کے بعد بلکہ صبح کو بھی اس رسم کے ادا کرنے کا رواج ہوگیا ہے۔ اس رسم میں مذہب کو کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔

دلہن کو اس کے ماں باپ اور مشاطہ وغیرہ دولہا کے گھر لے جاتے ہیں۔ دلہن کو ایک خاص عروسی جوڑا پہنایا جاتا ہے اور ایک سفید تکونی پٹی اس کے سر پر باندھ دی جاتی ہے جسے "سونو کاکوشی" یعنی سینگوں کی توش کہتے ہیں یہ ایک قدیم جاپانی عقیدہ ہے کہ ہر عورت کے حسد کے سینگ ہوتے ہیں۔ جو اس تکونی نقاب کے پہننے سے چھپ جاتے ہیں مغربی تہذیب کے اثرات سے یہ چیزیں مفقود ہوتی جارہی ہیں۔ مکان کے بہترین کمرے میں دلہن دولہا کے بالمقابل بٹھادی جاتی ہے۔ اس وقت وہاں صرف لڑکی کے ماں باپ دولہا مشاطہ اور چند کمسن خادمائیں موجود ہوتی ہیں جب یہ سب لوگ اطمینان سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں تو دولہا کے پاس تین پیالوں کا ایک سٹ لایا جاتا ہے وہ سب سے اوپر کا پیالہ اٹھالیتا ہے جس کو خادمہ تین دفعہ تھوڑی تھوڑی سیک (پینے کی چیز) کی مقدار ڈال کر بھر دیتی ہے اور وہ اُسے تین گھونٹوں میں ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہی پیالہ دلہن کے پاس لایا جاتا ہے۔ جسے وہ اسی طریقہ سے خالی کردیتی ہے۔ دوسرا پیالہ پہلے دلہن کو اور پھر دولہا کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور آخری پیالہ پہلے دولہا کو اور پھر دلہن کو پلایا جاتا ہے۔ یہ تینوں پیالے اسی طریقے سے تین دفعہ بھرے جاتے ہیں اور پھر اسی طریقے سے خالی کردئے جاتے ہیں۔ سیک پینے کی یہ رسم جاپانی شادی کا اہم ترین لازمہ ہے۔ اس کے بعد شادی کا تقدس قائم ہوجاتا ہے

اس رسم کے بعد فوراً شادی کی دعوت کی رسم منائی جاتی ہے جس میں بہت سے رشتہ دار اور دوست مدعو ہوتے ہیں اس موقع پر عموماً دلہن اپنا عروسی جوڑا تبدیل کر ڈالتی ہے۔

اسی طرح دونوں گھرانوں کا رشتۂ اتحاد جوڑنے کی رسم بھی سیک پی پی کر ادا کی جاتی ہے۔ دونوں خاندانوں کے ارکین دو قطاروں میں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں ہر قطار کا معتبر آدمی قطار کے ایک سرے پر اپنی

بیوی کے ہمراہ بیٹھ جاتا ہے۔ بعد ازاں دولہا اور دلہن لائے جاتے ہیں۔ پہلے تو دولہا کا باپ سیک کا ایک پیالہ پیتا ہے، اس کے بعد اسی پیالے میں دلہن کو سیک دی جاتی ہے اور آخر کار وہ دولہا کی ماں تک جا پہنچتا ہے دوسرے پیالہ میں پہلے دلہن کے باپ کو سیک پلائی جاتی ہے پھر دولہا کو اور آخر کار دلہن کی ماں کو۔ اخیر کا پیالہ دلہن کے باپ سے ہوتا ہوا دولہا کے باپ، دلہن کی ماں، دولہا کی ماں، دلہن اور دولہا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کے تعارف کی رسم کو مکمل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور دعوت دی جاتی ہے جس کا مقصد نئے شادی شدہ جوڑے کا دوستوں اور رشتہ داروں سے تعارف کرانا ہوتا ہے۔ لیکن یہ رسم اکثر کسی دوسری شام کو ادا کی جاتی ہے۔

شادی کی رسم کے بعد کا دن قدیم رسم و رواج کے مطابق نہایت پر تکلف دعوت سے منایا جاتا ہے اور دوسرے دن دلہن کو دولہا کے رشتہ داروں اور دوستوں کے گھر باقاعدہ تعارف کے لئے لے جاتے ہیں۔

تیسرے دن دلہن اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ دولہا اس کے ساتھ نہیں جاتا۔ دلہن دو راتیں وہاں رہ کر پھر دولہا کے گھر جاتی ہے۔ اس موقع پر وہ اپنے میکے والوں کے سامنے دولہا اور اس کے تمام رشتہ داروں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر سکتی ہے۔ دولہا سے شادی کی شام سے پہلے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہوتی۔

چوتھے دن دولہا دلہن کے گھر جاتا ہے اور اپنے ساتھ اُس کے گھرانے کے لئے بہت سے تحائف لے جاتا ہے دلہن تو پہلے ہی اپنی سسرال والوں کے لئے بہت سے تحائف لے جاتی ہے۔ اس لئے دولہا کے تحائف ایک طرح ان کا بدلہ ہی خیال کئے جا سکتے ہیں۔

دولہا کی آمد پر ایک اور دعوت ہوتی ہے جس میں دولہا کو دلہن کے رشتہ داروں اور دیگر متعلقین سے متعارف کیا جاتا ہے۔ دولہا ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کے گھر میں بھی جاتا ہے۔ وہ ایک رات وہیں بسر کرتا ہے اور صبح کو دولہا دلہن دونوں اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی متاہل زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

پرانے زمانے میں شادی کے بعد شاذ و نادر ہی بیوی کبھی اپنے میکے جا سکتی تھی۔ مگر اب یہ دستور مٹتے جاتے ہیں

جیک بوکانن کا ایک جلیل القدر مدّاح

جیک بوکانن لنڈن کے ایک بازار میں سے گزر رہا تھا کہ ایک تیز رو چھوٹے سے آدمی کا شانہ اس کے شانے سے ٹکرایا۔ وہ آدمی مُنہ پھیر کر مسکرایا اور بولا "جیک مجھے افسوس ہے"۔ اس کے بعد آگے بڑھ گیا۔

کچھ دن کے بعد ایک رات کسی پارٹی کے موقع پر جیک نے اس چھوٹے سے آدمی کو پھر دیکھا وہ کمرے کے دوسرے سرے پر بیٹھا ہوا جیک کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیک فوراً اُٹھ کر اُس کے پاس گیا اور معذرت

کرنے لگا کہ مجھے آپ کا نام یاد نہیں۔

جواب ملا کچھ مضائقہ نہیں۔ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔ مگر میں سینما میں آپ کے کمالات سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ دیکھئے نا! مجھے بہت فرصت ہوتی ہے۔ میں ایک زمانے میں امان اللہ شاہِ افغانستان ہوتا تھا"

جنگ اور ڈکیتی

کوئی ایسی بات نہیں جس کا فیصلہ صلح و امن کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ اس لئے جنگ کا آغاز کرنے والے جنگ کے جواز کے لئے جو وجوہ پیش کرتے ہیں، وہ معقول نہیں سمجھی جا سکتیں۔ مہذب لوگ ہر بات کا فیصلہ صلح و آشتی سے کر سکتے ہیں۔ اگر جنگ و جدال جائز ہے تو ڈکیتی اور لوٹ مار بھی جائز ہے۔ لڑائی سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ خاک بھی نہیں۔ اس سے حق و باطل کے درمیان کسی قسم کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ لڑائی سے اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ بہتر لڑنے والا کون ہے۔

ایک زمانے میں یورپ میں ڈوئل کا عام دستور تھا اگر کوئی شخص کسی کو جھوٹا کہتا ہو تو وہ اُسے مجادلہ کی صلا دیتا اور اسے تلوار سے مار ڈالتا تھا۔ اس کے خیال میں اس طرح اس کی "صداقت" ثابت ہو جاتی تھی۔ حالانکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص تلوار کا دھنی ہونے کے باوجود سخت جھوٹا ہے۔

برنارڈ شا کی شادی

برنارڈ شا دراصل رسم و رواج اور معاشرت کی قیود سے اتنا آزاد نہیں جتنا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس بیان کی تصدیق اس کی شادی کی دلچسپ داستان سے ہوتی ہے

مس شارلوٹ پین ٹاؤنشنڈ سے برنارڈ شا کی ملاقات پہلے پہل مسٹر اور مسز سڈنی ویب کے ہاں ہوئی شا کے یہ میزبان دونوں ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھے اس لئے شا اور مس ٹاؤنشنڈ کو تنہائی کی ملاقاتوں کا کافی وقت ملتا رہا۔ چند ہی ہفتوں کے بعد برنارڈ شا نے مرحومہ مس ایلن ٹیری کو ایک خط میں لکھا کہ "مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دل میں مس ٹاؤنشنڈ کی محبت پیدا ہو رہی ہے۔"

لنڈن آنیکے بعد بھی شا مس ٹاؤنشنڈ کی اقامت گاہ پر جاتا رہا اور ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن ان دونوں کا تعلق پوری طرح اسوقت استوار ہوا جب برنارڈ شا سالہا سال کی شدید محنت کی وجہ سے سخت بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کا سلسلہ اٹھارہ مہینے تک رہا۔ شا کی والدہ اور مس ٹاؤنشنڈ نے یہ مدت نہایت بیقراری اور پریشانی میں گذاری انہوں نے کوشش کی کہ شا مس ٹاؤنشنڈ کے دیہاتی مکان میں چلا جائے تاکہ کھلی ہوا اس کی صحت کی ترقی میں مدد کرے اسوقت دفعۃً معلوم ہوا کہ شا رسم و رواج کا نہایت کٹر پابند ہے اس نے "ایک کنواری لڑکی" کے مکان میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔

ادھر مس ٹاؤنشنڈ اس کے ہے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی آخر شا نے ہار مان لی لیکن ایک شرط کیساتھ اس نے کہا "جاؤ شادی کی ایک انگشتری اور لائسنس لے آؤ" اس طرح دونوں کی شادی ہو گئی۔

جب بعد میں شا سے اس کی شادی کے متعلق تذکرہ ہوا تو اس نے کہا کہ "میں نے محبت یا دولت کے لئے شادی نہیں کی میں نے محض اس لئے شادی کی

کہ ایک دوسرے کے لئے ہمارا وجود ناگزیر ہوگیا تھا

مسز شا کی اپنی جگہ بالکل ایک الگ شخصیت ہے یہ بات اسکی شادی کے مذکورۂ بالا واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے لیکن وہ اس قدر دوراندیش ہے کہ اس نے کبھی اس شخصیت کو اپنے جلیل القدر شوہر کی شخصیت کے مقابلہ میں مساوی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ شا کی شادی کو تیس سال گزر چکے ہیں اور اس کی خانگی زندگی بالکل عام رسمی زندگی کے مطابق ہے وہ محض اپنی تحریروں میں رسم و رواج سے آزاد نظر آتا ہے عملی طور پر اس کی زندگی ایک عام کاروباری آدمی کی سی ہے۔ برنارڈ شا اور ہے اور برنارڈ شا ڈراما نویس اور ہے۔

ٹرکی میں متاہل زندگی

سنہ ۱۹۳۰ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کی بے شمار درخواستوں کے باوجود عدالتوں نے صرف ۲۱۲۷ درخواستیں منظور کیں اسی سال شادیوں کی تعداد ۵۰۶۸۹ تھی حقیقت یہ ہے کہ طلاق لینا آسان نہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عدالتیں طلاق منظور کرنے کے خلاف ہوتی ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات کی سماعت بہت طول کھینچتی ہے۔ ۱۳۱ مقدمات ایسے پیش ہوئے جن میں طلاق تین سال کی سماعت کے بعد منظور ہوئی۔ تقریباً ۶۰ فیصدی طلاقیں مزاجوں کی ناموافقت کی بنا پر منظور ہوئیں۔ ۲۰۶ مقدموں میں بیوی کی بیوفائی اور ۲۶ مقدموں میں شوہر کی بیوفائی طلاق کا باعث ہوئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترک شوہر ترک بیویوں سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں بلکہ شوہر کی ہنگامی اور اتفاقی بیوفائی نظر انداز کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر بیویاں عدالت میں نہیں جاتیں، حالانکہ ان کے پاس اپنے شوہر کی بیوفائی کا ثبوت ہوتا ہے بیویوں کی یہ رواداری تعددِ ازدواج کی قدیم رسم کا نتیجہ ہے جس کے اثرات نئے قوانین ابھی محو نہیں کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیس مقدمات میں تعددِ ازدواج کا بھی ثبوت ملا۔ لیکن یہ تعداد اصلی تعداد سے بہت کم ہے بالخصوص دیہات میں تعددِ ازدواج کی رسم ابھی کافی ہے۔

باوجودیکہ دیہات میں شادی کم عمری کے زمانہ میں کی جاتی ہے۔ رجسٹروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئے قوانین کے ماتحت صرف ۲۹۳۶۵ شادیوں کا اندراج ہوا۔ اس بات کے پیش نظر حکام اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صرف "سوس سول کوڈ" (SWISS CIVIL CODE) تعددِ ازدواج کی روک تھام کے لئے کافی نہیں۔ یہ رسم اس قدر گہرے اثرات پیدا کر چکی ہے کہ امام اور خود عہدہ داران حکومت بھی بعض اوقات غیر قانونی شادی میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے مجلس ملیہ اس بات پر مجبور ہوتی ہے کہ ایسے اماموں۔ سرپنچوں اور حکام کے لئے قانونی سزا مقرر کرنے پر غور کرے جو اس باب میں قوانین حکومت کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں۔

اُردو بک سٹال لاہور

کتابوں کی یہ دکان لوہاری دروازہ کے باہر قائم ہوئی ہے اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ تمام اچھے کتب خانوں کی کتابیں اس سے مل سکتی ہیں۔

جامعۂ ملیہ، دارالمصنفین، ایوانِ اشاعت، مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عالی بک ڈپو، انجمن ترقی اردو اور دارالاشاعت پنجاب وغیرہ کی کتابیں اس دکان میں موجود ہیں۔

ہم ناظرینِ ہمایوں سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس دکان کی سرپرستی کریں کیونکہ اس کا مقصد معقول علم ادب کی اشاعت ہے۔

نواہائے راز

دو دل یکجانہ ہوں گے، دل کو تڑپانے سے کیا حاصل
ازل سے ہے یہی افسانہ، دُہرانے سے کیا حاصل

فنا ہونے بھی دے، مٹنے بھی دے، اے ناصحِ ناداں
سمجھنا ہو جو سب کچھ اُس کو سمجھانے سے کیا حاصل

وہ مجنوں دو جہاں ٹھکرا دیئے ہوں جس نے اے لیلیٰ
تجھے خاطر میں کب لائے گا دیوانے سے کیا حاصل

مرا دل بھی وہیں، جاں بھی وہیں، سب کچھ وہیں یارب
یہ جبر اُس انجمن سے مجھ کو لے جانے سے کیا حاصل

یونہی دل میں رہو گے عمر بھر داغِ نہاں ہو کر
خدا حافظ تمہارا، جاؤ! اب جانے سے کیا حاصل

جو پھول نہ نکلے ترے گلزار کے قابل
وہ داغ بنے، باغِ دلِ زار کے قابل

سب راز کھلے، پر نہ کھلا راز ہمارا
حالانکہ وہی راز تھا اظہار کے قابل

وہ بے سبب آزار ہے، بدنام نہ ہو جائے
اس خوف سے ہم بن گئے آزار کے قابل

ہر چند کہ گلزار ہے داغوں سے مرا دل
یہ نذر کہاں ہے نگۂ یار کے قابل

اے خسروِ اقلیمِ سخن بار مجھے دے
حالانکہ نہیں ہیں ترے دربار کے قابل

حامد علی خاں

"ہمایوں" کا دسواں "سالگرہ نمبر"

مسٹر رام چند منچندہ بی اے۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور

مضامین کا انتخاب اور اُن کا تنوع لاجواب ہے۔ مضامین دلچسپ اور مفید ہیں اور اُن کا ادبی معیار بھی بہت بلند ہے۔ ہمایوں کو "مخزنِ علم" کہا جائے تو بجا ہے۔ اس دور کے اُس عظیم الشان انسان کی یادگار قائم رکھنے پر جس کی دوستی کا فخر مجھے بھی اس کی زندگی میں حاصل تھا میں آپ کو سچے دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

ایک بات دیکھ کر مجھے افسوس ہُوا۔ وہ یہ کہ ہمایوں کی فہرستِ مضامین میں مجھے کسی ہندو مضمون نگار کا نام نظر نہیں آیا۔

مسٹر غلام حسین ایڈووکیٹ لکھنؤ

میں نے سالگرہ نمبر کے بعض مضامین بار بار پڑھے۔ ہمایوں تنوعِ مضامین اور بلندیٔ معیار کے اعتبار سے ادبی رسائل میں بلند مرتبہ کا مستحق ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ لکھنؤ اور دہلی اردو زبان و ادب کی وہ خدمات انجام دینے سے قاصر ہیں جس کی اُن سے اُردو کا مرکز ہونے کی حیثیت سے توقع تھی۔ پنجاب اور اہلِ پنجاب نے زبان کی ترقی کے لئے تحقیق و تدقیق کی جو نئی راہیں تلاش کی ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں دلی استحسان کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کسی تجارتی مقصد کے بغیر آپ نے یہ رسالہ محض اردو زبان کے ذریعہ سے علمی خدمت انجام دینے کے لئے جاری کر رکھا ہے۔ آنریبل جسٹس میاں شاہدین مرحوم کی یاد میں ایک ایسے رسالہ سے بہتر کوئی یادگار قائم نہ کی جا سکتی تھی جو اس زبان میں شائع ہو جس سے انہیں بے انتہا محبت تھی اور جس کی انہوں نے اپنے استادانہ مضامینِ نظم و نثر سے بیش بہا خدمت انجام دی۔

تصاویر۔ زخمی انگلی: یہ ایک فرانسیسی مصور (F-D VOR AK) کی تصویر ہے۔ بچے نے ماں کے منع کرنے کے باوجود چاقو اٹھا لیا اور چپکے سے باغ میں جا کر درختوں کی ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ انگلی کٹنے پر اس کے ہمجولی ہمدردی کیلئے جمع ہو رہے ہیں۔ یہ تصویر حقیقی زندگی کا ایک دلچسپ باب پیش کر رہی ہے۔

بچوں کا ہفتہ: پانچوں بچے ناخوش معلوم ہوتے ہیں کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے جو انہیں ناگوار ہے۔ انکی دنیا ہی بدل گئی ہے ماں ذہن میں موجود ہے لیکن یہاں نہایت اطمینان کیساتھ انہیں دیکھ رہی ہے سب بچے ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہیں اور سہمے ہوئے تین بڑے بچے کمرے میں کبھی نہیں آئے انہوں نے کبھی اتنے بچے دیکھے ہیں نہ کبھی اتنی ماں تین بڑے بچوں کو سخت اعتراض ہے ننھی بی بی جو منہ میں انگوٹھا ڈالے چوس رہی ہے اس واقعہ پر حیران ہیں لیکن ابھی انہیں رونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی وہ اماں کو دیکھ رہی ہیں اپنے ساتھ والی کا استغنا بھی قابل ملاحظہ ہے۔ تیسرا بچہ موجودہ صورتِ حال سے سخت ناخوش معلوم ہوتا ہے۔ چوتھا بچہ ذرا زیادہ نازک مزاج ہے اسکا خیال ہے کہ ایک چیختی ہوئی بچی کو اسکے ماں کے پہلو میں لا بٹھانا ظلم کیساتھ توہین کا اضافہ ہے چنانچہ وہ طیش میں آگیا ہے چھوٹی لڑکی اپنی جگہ بہت تنگ ہے اُسے بچے کے طیش کی پروا نہیں۔ وہ اس جگہ سے جلد نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

زخمی انگلی

بچوں کا هفته
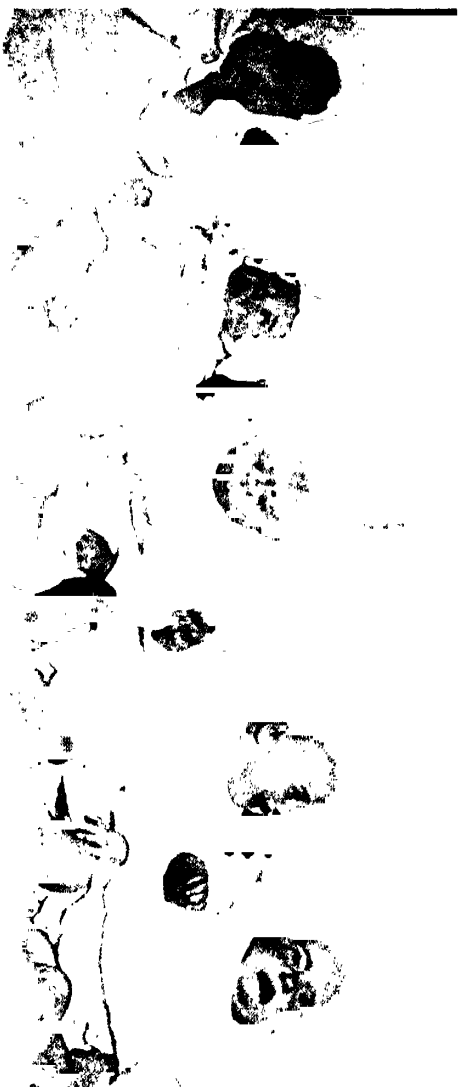
جذبِ محبّت

ڈراما کے افراد

پائیرو ــــ پائیرٹ ــــ پائیرو کی ماں

مقام: پائیرو کے قدیم مکان میں نشست کا کمرہ۔

وقت: موسم سرما کی ایک رات۔

کمرہ صاف ستھرا اور معمولی ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ بائیں طرف اوپر کے کمروں میں جانے کے لئے ایک زینہ ہے۔ ایک میز اور دو کرسیاں کمرے کے وسط میں رکھی ہیں۔ زینے کے قریب دیوار سے کلاک لٹک رہا ہے دائیں طرف آتشدان ہے۔ ایک کیتلی اور ایک چائے دانی چولھے کے قریب پڑی ہیں۔ انگیٹھی کے اوپر اور زینے کے قریب شمعدان میں موم بتیاں روشن ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے تو پائیرو کی بڑھیا ماں جس کے بال سفید ہیں اور جس کے چہرے سے نیکی ظاہر ہوتی ہے دائیں جانب کی کھڑکی کے پردے ڈالتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد وہ آتشدان کی طرف آکر کیتلی کو چولھے پر رکھ دیتی ہے اور پھر وہاں سے ہٹ کر کچھ بُننے لگ جاتی ہے بُنتے ہوتے اُس کا جسم آہستہ آہستہ ہلتا ہے اور ایک آہ اُس کے مُنہ سے نکل جاتی ہے۔ ایک لمحے کے بعد بیرونی دروازے پر ایک کمزور سی دستک سنائی دیتی ہے۔ بڑھیا اپنی عینک اتار کر رکھ دیتی ہے اور سننے لگتی ہے۔ دستک پھر سنائی دیتی ہے۔ بڑھیا اٹھ بیٹھتی ہے اور جا کر دروازہ کھولتی ہے۔ کمرے کی زرد روشنی باہر کی تاریکی میں سے گذر کر ایک غمگین صورت پر پڑتی ہے۔ یہ بے چاری پائیرٹ ہے جس کے کپڑے کسی قدر بھیگے ہوئے ہیں۔ روشنی کی طرف دیکھ کر وہ ایک دو دفعہ آنکھیں جھپکتی ہے۔ پھر ایک ایسے بچے کی طرح باتیں کرنے لگتی ہے جو راہ بھول گیا ہو۔

پائیرٹ۔ بیگم صاحبہ، آداب۔ خبر نہیں آپ مجھے . . . .

ماں۔ (ذرا حیران ہو کر) کون ہے؟ مجھے نظر نہیں آتا۔ روشنی میں آجاؤ۔

پائیرٹ۔ (نہایت احتیاط سے آگے بڑھ کر) باہر ایسی تاریکی اور سردی ہے اور یہ مکان مجھے ایسا آرام دہ اور گرم معلوم ہوا کہ میں اس کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر نہ رہ سکی۔ خبر نہیں آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں گی یا نہیں

لیکن ....

ماں (فوراً اپنی فیاضی سے متاثر ہو کر) ٹھیرو میری بچی! ٹھیرو میں دروازہ بند کردوں ورنہ ہم سردی سے اکڑ جائیں گے۔ تم بڑی خوشی سے آؤ۔ آؤ آگ کے سامنے اپنے آپ کو گرم کرلو۔ لیکن یہ کیا بات ہے، تم اس تاریک رات میں کہاں بھٹک رہی ہو؟ تمہارا کوئی گھر گھاٹ نہیں؟

پائیرٹ۔ (ملول ہو کر) اب کوئی گھر نہیں۔

ماں۔ افسوس! کوئی روپیہ پیسہ؟

پائیرٹ۔ کچھ نہیں۔

ماں۔ ہائے ہائے! پھر تم صرف سردی سے بچنے کے لئے آوارہ پھر رہی تھیں؟

پائیرٹ۔ ہاں (رونے لگتی ہے)

ماں۔ (اسے اپنی آغوش میں لے کر اور آگ کے قریب لے جا کر) بس بس بچی! اب جانے دو، مت رو میری جان۔ رفتہ رفتہ تمہاری حالت اچھی ہو جائے گی۔ تم بڑی کرسی پر بیٹھ کر مزے سے آگ تاپو، میں تمہارے لئے ایک پل میں چائے تیار کر کے لاتی ہوں۔ وہ پک ہی رہی ہے۔ تم دیکھو میں تمہارے لئے کیسی اچھی چائے بناتی ہوں۔

پائیرٹ۔ میں بہت تھک گئی ہوں اور سخت بھوکی ہوں۔ میں کوسوں چلی ہوں، اور مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کروں گی۔

ماں۔ لیکن تم کہاں سے آئی ہو؟

پائیرٹ۔ ایک جگہ جو یہاں سے بہت دُور ہے۔

ماں۔ اچھا! تو اُس جگہ کا نام کیا تھا؟

پائیرٹ۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں نے کبھی اُن مقامات کے ناموں کی طرف توجہ نہیں کی جہاں ہم جایا کرتے تھے۔ مجھے صرف اُن کی شکل یاد ہے، یا اُن کے باشندوں کی وضع قطع بس اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں۔

ماں (چائے تیار کرتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے تم نے بہت سے سفر کئے ہیں۔

پائیرٹ (آہ بھر کر) ہاں۔ ہم کبھی زیادہ دیر تک ایک جگہ نہیں رہے اور بعض اوقات تو ہم کئی کئی دن چلتے رہتے تھے۔

ماں۔ لیکن تم لوگ سفر میں کیا کیا کرتے تھے؟

پائیرٹ۔ ناچتے تھے اور گاتے تھے۔

ماں۔ اوہ!

پائیرٹ۔ ہاں ہاں، ہم ناچتے تھے اور گاتے تھے، اور دنیا کو خوش رہنے کا سبق دیتے تھے۔

ماں۔ لیکن کیا تم خود بھی ہمیشہ خوش رہتے تھے؟

پائیرٹ۔ ہاں پہلے پہل ہم خوش تھے لیکن اس کے بعد جب ہم اچھی طرح ایک دوسرے سے واقف ہو گئے . . . . آہ وہ کیسا بُرا وقت تھا! . . . . مجھے کچھ علم نہ تھا کہ انسان پر اس درجہ ہولناک مصیبت بھی آسکتی ہے۔

ماں۔ آہ غریب لڑکی۔ مجھے ساری بات سناؤ۔ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔

پائیرٹ۔ نہیں، آپ میری مدد نہیں کر سکتیں۔ آپ میری بات نہیں سمجھیں۔ قصور سب میرا تھا، اور اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب وقت گذر چکا ہے۔

ماں۔ شاید یہ درست نہیں۔ وقت کبھی نہیں گزرا۔ یہ لو چائے۔ دیکھنا کہیں اپنے اوپر نہ گرا لینا۔ بہت گرم ہے اور یہ کیک بھی اس کے ساتھ کھاؤ یہ نارنجی کیک ہے۔

پائیرٹ۔ آہ کیسا اچھا ہے! میں نے کبھی ایسا مزیدار کیک نہیں کھایا۔

ماں۔ سو تم رقاصہ ہو؟

پائیرٹ۔ ہمم (اُس کا منہ کیک سے بھرا ہُوا ہے)

ماں۔ بڑی مصیبت کی زندگی ہو گی۔

پائیرٹ (لقمہ نگل کر) بعض اوقات۔

ماں۔ لیکن تم مصیبت سے گھبراتی تو نہ ہو گی؟

پائیرٹ۔ کبھی نہیں مصیبت میں بھی ایک مسرت ہے جس سے ہر بات کی تلافی ہو جاتی ہے، لیکن . . . .

ماں۔ لیکن کیا؟

پائیرٹ۔ میں نہیں بتا سکتی، ورنہ میں رونے لگوں گی۔ (اپنی پیالی میں بقیہ چائے پر حسرتانہ نظر ڈال کر) میں روتے روتے چائے نہیں پی سکتی۔

ماں۔ تو پھر چائے ختم کر لو۔ (وہ مشفقانہ انداز میں مسکراتی ہے) اور یہ لو ایک اور کیک کھاؤ۔ چھوٹے چھوٹے ہی تو ہیں۔

پائیرٹ۔ آہ آپ کتنی مہربان ہیں! میں حیران ہوں اگر آپ مجھے اندر نہ آنے دیتیں تو میرا کیا حال ہوتا

ماں۔ اب اِن باتوں کی طرف خیال ہی نہ کرو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اکیلی کیسے رہ گئیں۔ تمہارے وہ ساتھی کہاں ہیں جو تمہارے ساتھ پھرا کرتے تھے۔

پائیرٹ (پیالی نیچے رکھتے ہوئے) ہم جدا ہو گئے۔ ہم لڑ پڑے، اور دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔

ماں۔ تم دو ہی تھے؟

پائیرٹ۔ نہیں، لیکن قابلِ ذکر ہم دو ہی تھے۔

ماں۔ اور دوسرا کون تھا؟

پائیرٹ۔ پائیرو

ماں۔ پائیرو؟

پائیرٹ۔ ہاں میں اُسے یہی کہہ کر بلاتی تھی۔

ماں۔ اور تمہارا نام........؟

پائیرٹ۔ پائیرٹ۔

ماں۔ پائیرٹ؟

پائیرٹ۔ ہاں وہ مجھے یہی کہہ کر بلاتا تھا۔

ماں۔ سو پائیرو اور پائیرٹ کی لڑائی ہو گئی۔

پائیرٹ۔ سب میرا قصور تھا۔ اوّل اوّل ہمیں ایک دوسرے سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ کوئی چیز اُس میں مخل نہ ہو سکتی تھی۔ ہم ناچتے تھے اور گاتے تھے اور لوگوں کا دل خوش کرتے تھے، لیکن اس کا ہمیں خیال ہی نہ آتا تھا کہ کس کو زیادہ داد ملی۔ ہم ہر بات میں ایک دوسرے کے شریک تھے اور ہر ایک دوسرے کو کامل سمجھتا تھا لیکن کچھ دیر کے بعد جب ہم زیادہ محبت سے کچھ تنگ آ گئے تو ہم نے یہ دیکھنا شروع کیا کہ لوگ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں پائیرو سے زیادہ مغرور تھی، اور۔ مجھے اپنے رقص پر اتنا ناز تھا کہ پائیرو کو اپنے گانے پر نہ تھا، اِس لئے اگر اُسے داد ملتی تھی تو مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ میں اس خیال کو برداشت ہی نہ کر سکتی تھی کہ میں لوگوں کی محبوب نہیں ہوں۔ چنانچہ میں نے پائیرو سے کہنا شروع کیا کہ اگر میں نہ ہوں تو تمہیں کون پوچھے۔ میں اُس کے گانے پر ہنستی تھی اور اُس کا مذاق اُڑاتی تھی۔ بہت دیر تک وہ یہ سمجھتا رہا کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں میرا مطلب وہ نہیں ہے۔ پھر ایک دن اُسے غصّہ آگیا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ تم ایسی باتیں کہہ کہہ کر مجھے دیوانہ کر دو گی۔ اور اگر پھر تم نے کبھی کوئی ایسی بات کی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ میں مغرور تھی، اور میں نہ سمجھی کہ وہ مجھے سچ مچ سچ مچ چھوڑ دے گا۔ میں اُس سے اپنی تعریف کرانا چاہتی تھی۔

ماں (ملائمت سے) کیسی سخت غلطی ہے!

پائیرٹ۔ اپنی تعریف کرانے کی خواہش ؟
ماں۔ نہیں، نہیں۔ بلکہ اُس کو اِس بات پر مجبور کرنا کیسی غلطی تھی! تم کیسی ننھی اور ناتجربہ کار ہو!
پائیرٹ۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے غلطی کی مگر اور میں کر ہی کیا سکتی تھی۔
ماں۔ کیوں تم اُس کے لئے ماں بن جاتیں۔ تمام مرد دل کے بچے ہیں، اور اگرچہ وہ محبت بڑے بہادرانہ انداز میں کرتے ہیں اور اپنی محبوبوں کو بڑے دم خم دکھاتے ہیں، لیکن دل سے وہ یہی چاہتے ہیں کہ کوئی ہو جو اُن کے بالوں کو کنگھی کرے اور اُن کی زخمی انگلیوں پر بوسے دے۔ کیا تم نے پائیرو کے لئے یہ باتیں کی تھیں؟
پائیرٹ۔ قطعاً نہیں! وہ اور ناراض ہو جاتا۔
ماں۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا تم اس خیال سے ڈرتی رہیں؟ لیکن عقلمند عورت وہ ہے جو اُوپر سے تو اپنے محبوب کی معشوقہ بنی رہے لیکن جو دل میں یہ سمجھے کہ وہ اُس کا چھوٹا بچہ ہے جس کی تفریح اور آرام کا خیال رکھنا اُس کا فرض ہے۔
پائیرٹ۔ (اُٹھ کر ذرا اُور جلتے ہوئے) میں یہ کبھی نہیں مان سکتی۔ اور اس کے علاوہ میں کسی چھوٹے بچے سے محبت کرنا نہیں چاہتی۔ پائیرو ایک مرد تھا!
ماں۔ اور تم نے اُس کو کھو دیا۔
پائیرٹ۔ (ایک دھکا سا محسوس کرتے ہوئے) لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی۔ سب میرا قصور تھا . . . . آہ میں جانتی ہوں سب میرا قصور تھا . . . . وہ اِس لئے خفا ہو گیا کہ میں اُس سے جلتی تھی اور اُس کا مذاق اڑاتی تھی۔

ماں۔ پائیرٹ میرا خیال ہے کہ تم غلطی پر ہو۔
پائیرٹ۔ مگر اُس نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہی وجہ ہے۔ کاش میں اتنی مغرور نہ ہوتی!
ماں۔ یہ صرف اُس کا بہانہ تھا۔ ممکن ہے کہ حقیقی وجہ اُسے خود بھی معلوم نہ ہو۔ ہم سب ایسے ہی ہیں پہلے ہم کوئی بات کر لیتے ہیں پھر بعد میں اس کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔
پائیرٹ۔ آہ میں سخت غمگین ہوں! کاش میں سب کچھ کھو دیتی لیکن پائیرو مجھ سے جدا نہ ہوتا! (وہ ماں کے قریب فرش پر بیٹھ جاتی ہے)
ماں۔ اور کیا تمہارے خیال میں وہ بھی غمگین نہیں ہوگا؟
پائیرٹ۔ (اپنے سر کو ایک مایوسانہ جنبش دے کر) نہیں، وہ غمگین نہیں ہوگا۔ وہ نہایت زندہ دل اور خوش رہنے والا آدمی ہے۔ وہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی غمگین نہیں ہوا۔

ماں۔ (مسکراتے ہوئے) کیا تمہیں یقین ہے

پائیرٹ۔ ہاں پختہ یقین۔ جتنا عرصہ ہم اکٹھے رہے ہیں میں نے اُسے ایک آنسو بہاتے بھی نہیں دیکھا۔

ماں۔ یہ اس لئے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم اُسے آنسو بہاتے دیکھو۔ مرد اسی قسم کے ہوتے ہیں جب تک اُن کی تربیت نہ کی جائے۔

پائیرٹ۔ پائیرو روتا ہوگا؟ میں اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتی۔ اگر وہ رو ہی دیا ہوتا تو میں اُس کے ساتھ روتی اور ہم پھر خوش ہو گئے ہوتے۔

ماں۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں تم اُس کی اس حرکت کو بچپن نہ سمجھو۔

پائیرٹ۔ شاید آپ ہی درست کہتی ہوں۔ ممکن ہے اُسے شفقت ہی کی ضرورت ہو جو اُسے مجھ میں نہ ملی لیکن یہ کیسی نادانوں کی سی اور پرانی طرز کی بات ہے۔

ماں۔ ہاں، پرانی طرز کی۔ محبّت بھی تو میری جان پرانی طرز کی بات ہے۔

پائیرٹ۔ کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے! اگر میں ایک دفعہ اُس سے پھر جا ملوں اور وہ مجھے معاف کردے تو میں کبھی اُس کے دل کو اپنی ذات سے منحرف نہ ہونے دوں (وہ ایک پُر اضطراب انداز سے اُٹھ بیٹھتی ہے)

ماں۔ تم یقیناً اُس سے جا ملوگی ــــ یا وہی تم سے آملے گا۔

پائیرٹ۔ وہ مجھے تلاش نہیں کرے گا۔ وہ اِس وقت بھی کہیں گا رہا ہوگا۔ ناچ رہا ہوگا ــ مجھے معلوم ہے، اور میں یہاں . . . . . (رونے لگتی ہے)

ماں (اُٹھ کر اُسے گلے لگالیتی ہے) اب رونے دھونے کو چھوڑ دو۔ اِس سے وہ کہیں واپس تو نہیں آجائے گلاب۔ تمہیں سو رہنا چاہئے۔ صبح تک پائیرو کو بالکل بھول جاؤ۔ اس طرح تمہیں کچھ سکون نصیب ہوگا تو تم سوچ سکوگی کہ اُسے کیوں کر تلاش کیا جائے۔

پائیرٹ۔ کیا آپ سچ مچ مجھے اپنے مکان میں سونے دیں گی۔

ماں۔ کیا تم یہ خیال کر رہی تھیں کہ میں تمہیں ایسی سخت سردی میں گھر سے نکال دوں گی؟

پائیرٹ۔ بعض لوگ ایسا ہی کرتے خصوصاً مجھ سی بے خانماں کو دیکھ کر۔

ماں۔ پاگل! دنیا اتنی بُری نہیں ہے بچی۔ آؤ میں تمہیں اوپر ایک بہت بڑے پلنگ پر سُلا آؤں جس پر پروں والا نرم نرم بستر بچھا ہُوا ہے۔

پائیرٹ۔ (ہونٹوں پر ایک خواب آلود تبسّم لاکر) اوہ، نرم نرم پروں والا بستر! شاید اس میں تو خوشی سے مجھے نیند بھی نہ آئے۔

ماں۔ نیند کا فکر نہ کرو۔ تمہاری آنکھیں آدھی بند تو پہلے ہی ہو رہی ہیں۔ اور چائے بھی تمہیں نندیا پور تک پہنچانے میں مدد دے گی۔

پائیرٹ۔ (انگڑائی لیتے ہوئے) چائے نے تو مجھے .... واقعی ...... بیہوش سا کر دیا ہے۔

ماں۔ (شمعدان سے ایک جلتی ہوئی موم بتی لے کر سیڑھیوں کا راستہ دکھاتے ہوئے) آؤ، میری بچی سنبھل کر آنا کہیں سیڑھیوں سے پاؤں نہ پھسل جائے۔ یہ بہت سیدھی ہیں۔

پائیرٹ۔ میں آ رہی ہوں۔ آہ میں اتنی تھک گئی ہوں کہ بہ مشکل اوپر پہنچ سکوں گی۔

ماں۔ (سیڑھیوں کو طے کر کے اور نظروں سے اوجھل ہو کر) یہ ہے تمہارا کمرہ پائیرٹ۔

(دونوں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ آگ میں سے تڑتڑ کی آواز آتی ہے اور کیتلی میں سے چائے کے ابلنے سے ایک نغمہ سا پیدا ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے بعد باہر کچھ کھٹکا سنائی دیتا ہے۔ پاؤں دروازے کی سیڑھیوں پر پڑتے معلوم ہوتے ہیں، دروازے کی چٹخنی اٹھائی جاتی ہے اور تھوڑا سا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ پائیرو کا سر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، پھر کسی کو نہ پاکر سارا دروازہ کھول دیتا ہے اور دبے پاؤں اندر آجاتا ہے۔ اُس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے ہیں اور اس کے چہرے پر رنگ کے کچھ نشان ہیں۔ اُس کی آنکھیں مرجھائی ہوئی ہیں اور اس کا سر غم سے جھکا ہوا ہے۔ وہ آگ کے قریب جاکر بڑی شکستہ دلی سے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ماں سیڑھیوں کے اوپر ظاہر ہوتی ہے اور چپ چاپ نیچے آجاتی ہے۔ پائیرو کو اُس کے آنے کی خبر نہیں ہوتی، نہ وہ اُسے دیکھتی ہے۔ وہ خوش ہے اور مسکرا رہی ہے، پھر بیرونی دروازے کی چٹخنی لگانے کے لئے بڑھتی ہے۔ پائیرو چونک اُٹھتا ہے مڑ کر دیکھتا ہے اور اٹھ بیٹھتا ہے۔)

پائیرو۔ (ٹوٹی ہوئی آواز میں) اماں! تم مجھے نہیں پہچانتیں، اماں؟

ماں۔ (چونک کر اور اُس کی طرف حیرانی سے دیکھ کر) ہیں .... تم .... ؟

پائیرو۔ (اُس کی طرف جاکر) ہاں یہ میں ہوں۔ اور تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں جانتا ہوں، ایک عرصہ ہوگیا اور میں کچھ بدل بھی گیا ہوں۔ لیکن امی، میں اب بھی تمہارا پیارا بچہ ہوں۔

ماں۔ (باہیں پھیلا کر۔ بیٹے کو پہچان کر اُس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگتا ہے) پطرس!

پائیرو۔ (ماں سے بغل گیر ہو کر) پیاری امی! کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ میں کبھی واپس نہیں آؤں گا؟

ماں۔ میرے دل میں ابھی یہ خوف پیدا ہونا شروع ہی ہوا تھا، پطرس۔

پائیرو۔ (ماں کو چھوڑ کر) اماں، میں کیسا احمق تھا کہ اتنی دیر باہر رہا، جب کہ تم سی مہربان ماں گھر میں میرے انتظار کا دُکھ اٹھا رہی تھی۔

ماں۔ (اس کے سارے جسم پر ایک نگاہ ڈال کر) یہ عجیب وغریب کپڑے تم نے کہاں سے لئے؟ اور یہ تمہارے منہ پر زنگ کے دھبے کیسے ہیں؟ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے!

پائیرو۔ (ایک اداس مسکراہٹ لبوں پر لاکر) میں غمزدہ اور بیمار ہوں، اماں میں ایک مسرور پرندہ تھا، لیکن اب میرے پر مرجھا گئے ہیں...... مجھے کچھ کھانے کو دو، اس کے بعد میں تمہیں ساری کہانی سناؤں گا۔

(وہ چائے کے سامان کی طرف بھوکی نگاہوں سے دیکھتا ہے)

ماں۔ (چولھے کی طرف جاکر) ضرور! خبر نہیں مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہ آیا کہ تمہیں سخت بھوک لگ رہی ہوگی اور آج کیسی ہولناک رات ہے! تم کس طرح آئے ہو؟

پائیرو۔ (بلا تامل) پیدل

ماں۔ ہائے میں صدقے! تمہیں بڑی سخت سردی لگی ہوگی؟

پائیرو۔ لگی تو تھی، لیکن ابھی گرم ہوا جاتا ہوں۔ مگر چائے جلدی تیار کرو، امی۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔ او ہو، تمہارے پاس تو نارنجی کیک بھی ہیں۔ اب ان کو کھائے مدتیں ہی ہوگئیں۔ اماں تمہیں یاد ہے جب میں نے آخری دفعہ تمہارے نارنجی کیک کھائے تھے؟

(وہ ایک پورا کیک منہ میں رکھ لیتا ہے)

ماں۔ (کیتلی کو چولھے سے اتار کر) جس دن تم یہاں سے گئے تھے، پطرس۔ اور میں چاہتی تھی کہ تم اور کھاؤ اور کھاؤ.......

پائیرو۔ اور میں نے اپنی تمام جیبیں بھر لیں تھیں۔ خدا کی قسم وہ کتنے اچھے کیک تھے! اور دیکھو، میں پھر یہیں ہوں، اپنی پیاری امی کے پاس، اور وہی لطیف نارنجی کیک کھا رہا ہوں!

ماں (خوش ہوکر) چلو آؤ۔ اس آرام کرسی میں بیٹھ جاؤ اور میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔ یہاں تمہارے سر کے لئے تکیہ اور تمہارے پاؤں کے لئے چوکی بھی رکھ دیتی ہوں۔ (کہنے کے مطابق دونوں چیزیں رکھ دیتی ہے) اسے ہے تمہارا جوتا تو بالکل پھٹ چکا ہے۔ تم کتنے بے پروا ہوگئے ہو!

پائیرو۔ اماں، تم کیا جانو، میرا تو دل بھی پھٹ چکا ہے (چائے کا ایک گھونٹ پیتا ہے) آہ، کیسی عمدہ چائے ہے۔ میں نے تو سالہا سال سے ایسی چائے نہیں پی۔

ماں۔ پطرس، میری جان پطرس! تم نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہوں گی۔ اس طویل عرصے میں تم کیا کرتے رہے؟ تم نے کبھی خط تک بھی نہ لکھا۔ تمہارے اس تغافل نے میرا دل توڑ دیا۔ آہ پطرس تم اتنے ظالم کیسے ہوگئے جب تم جانتے تھے کہ تمہارے فکر سے میری جان پر بن جائے گی؟ (اُس کی آواز کانپنے لگتی ہے۔ وہ اپنے

آپ کو پائیرو کے ساتھ والی کرسی میں ڈال دیتی ہے اور متفکرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

پائیرو۔ (متانت سے) امّی، میں تمہاری طرف ضرور خط لکھتا، لیکن ...... لیکن ...... میں چاہتا تھا کہ میں سونے کی ایک تھیلی کما کر یکایک گھر واپس آؤں اور تمہیں حیران کر دوں۔ میں نے دولت اور شہرت کے لئے سخت کوشش کی اور ہر روز میں یہی سمجھتا رہا کہ کل میں ضرور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اسی طرح دن گذرتے گئے، اور میں تمہاری طرف خط لکھنا ملتوی کرتا رہا اور آخر کار مجھے تم سے شرمندہ ہونا پڑا...... شرمندہ.....

ماں۔ اور پطرس کیا تم سے ہمدردی کرنے والا کوئی نہ تھا؟

پائیرو۔ نہیں، میں ...... لیکن اُس کا اب ذکر ہی کیا ہے۔ میں دلیر بننا چاہتا تھا۔ اگر میں مر بھی رہا ہوتا تو میں کسی سے ہمدردی کی درخواست نہ کرتا۔ کچھ عرصے تک میں بہت اچھا رہا ...... اور میں بہت دیر تک خوش بھی رہا ...... یہاں تک کہ ...... یہاں تک کہ ...... (وہ آہ بھرتا ہے اور پھر چائے کا ایک گھونٹ لیتا ہے)

ماں۔ لیکن تم گزرِ اوقات کے لئے کیا کرتے تھے بیٹا؟

پائیرو۔ مسخرہ پن۔

ماں۔ (صدمہ محسوس کرکے) مسخرہ پن! آہ تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟

پائیرو۔ اماں، امیر ہونے کا یہی ایک یقینی طریقہ ہے۔

ماں۔ تم مذاق کر رہے ہو۔

پائیرو۔ نہیں یہ بالکل درست ہے۔ کسی دنیادار سے پوچھ لو۔

ماں۔ پھر تم کیوں امیر نہ ہوگئے؟

پائیرو۔ کیونکہ میں ایک ادنےٰ درجے کا مسخرہ تھا۔ جانتی ہو یہ بھی ایک فن ہے ـــــ ایک زبردست فن، اور اس کے لئے ایک بڑے ہوشیار آدمی کی ضرورت ہے۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔

ماں۔ پطرس، تم ہمیشہ ایسی ہی واہی تباہی باتیں کرنے کے عادی ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم اب سیانے ہوگئے ہوگے۔

پائیرو۔ ہاں سچ ہے۔ میں جتنا بڑا ہوا اتنا ہی غمگین ہوگیا۔

ماں۔ لیکن تمہیں غمگین نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں مصائب میں بھی خوش......

پائیرو۔ (آہ بھرتے ہوئے اور آخری نارنجی کیک لیتے ہو۔

ماں۔ لیکن تم نے امید ہی کو کھو دیا تو باقی کیا رہا۔

پائیرو۔ (کیک سامنے کرکے) نارنجی کیک۔

ماں۔ (اُس کے مسخرہ پن پر ہنس کر) شریر لڑکے، تمہاری موجودگی میں نارنجی کیک بھی کہاں رہتے ہیں۔ کل مجھے ایک اور گھان نکالنا پڑے گا۔

پائیرو۔ (کھاتے ہوئے) امی، ضرور۔ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

ماں۔ اچھا، اچھا، میں تمہیں ہر وہ چیز دوں گی جس سے تمہیں مسرت ہو۔

پائیرو۔ (کرسی سے اٹھ کر اور ایک طرف جاکر) نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی مسرت کھو چکا ہوں۔

ماں۔ کیسی بے معنی بات کرتے ہو۔ دنیا میں کامیاب ہونے کے لئے ابھی تمہارے پاس ایک عمر پڑی ہے

پائیرو (سنجیدگی سے) آہ مجھے کامیابی کی فکر نہیں ہے۔ کامیابی حاصل کئے مجھے مدتیں ہوگئیں۔

ماں۔ پھر تمہیں اور کیا فکر ہے؟

پائیرو۔ (آگ کی طرف مڑتے ہوئے اور نہایت غمگین ہوکر) اماں، اگر میں تمہیں بتاؤں گا تو تم کہو گی کیسا احمق ہے!

ماں۔ (ایک ہاتھ اُس کے بازو پر رکھ کر) میں کیوں کہنے لگی۔ پطرس، میں تمہاری ماں ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے۔ میں تمہارے جذبات کو سمجھوں گی۔

پائیرو۔ (کچھ تامل کے بعد دھیمی آواز میں) آہ یہ ایک لمبی کہانی ہے، اور مجھے تو تمام کی تمام یاد بھی نہیں لیکن ـــ مجھے ایک حسین، نازک اندام، رسیلی آنکھوں والی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ وہ مجھے ایک باغ میں ملی جو یہاں سے دور بہت دور ہے۔ وہ ایک چار دیواری کے اندر اُس پھول کی طرح پلی تھی جس نے آفتاب کی روشنی اور پتوں کی آغوش کے سوا دنیا کی اور کوئی چیز نہ دیکھی ہو۔ اُس کی محبت ابھی نہاں خانۂ دل ہی میں پوشیدہ تھی کہ میں نے ایک دن ایک پھول توڑنے کے لئے جاکر اُس دیوار کو پھاندا اور دیکھا کہ وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ایک کنج میں چھپی بیٹھی ہے۔ میں نے اُس کے سامنے اپنا ایک حسین ترین نغمہ گایا اور وہ اُسے سُن کر مجھ سے محبت کرنے لگی۔ ہم دونوں دیوار کو پھاند کر سڑک پر آگئے، اور ہاتھ میں ہاتھ اور دل میں دل دئے ہوئے ناچتے گاتے اُس سرزمین کو چلے گئے جہاں محبت کے سوا اور کسی چیز کی حکومت نہیں (وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے پھر کہتا ہے) اُس نے وہ تمام کرتب سیکھ لئے جو مجھے یاد تھے بلکہ کچھ زیادہ بھی۔ ہم دونوں اپنے فن میں بڑے ماہر تھے اور لوگ ہمارے شیدا تھے۔ جلد ہی کچھ اور مغنی بھی ہم سے آملے اور ہم اکٹھے سفر کرنے لگے۔ آہ یہ کتنی زندہ دلی تھی ہمارے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ اس زندہ دلی کا انجام بھی کچھ ہوگا۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئے جب

ا

تھی اور اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔ لیکن آخر کار حالات بدل گئے۔ ہماری محبت فرسودہ ہوگئی۔ یہ ایک قدیم کہانی معلوم ہونے لگی اور ہم میں سے کسی نے بھی اس کی تجدید کی کوشش نہ کی۔ میں اس کی تجدید کرسکتا تھا لیکن میرے غرور نے اسے گوارا نہ کیا۔ کاش میں اُس کے پاس جاتا اور اُس سے کہتا کہ مجھے معاف کردو! کاش میں اپنا سر اُس کے آگے خم کردیتا اور کہتا کہ میں دیوانہ ہوگیا تھا! اس کی بجائے میں نے یہ کیا کہ میں ہمیشہ کسی ایسی جگہ چھپ چھپ کر روتا رہا جہاں وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ پھر میں اُس سے بدمزاجی کرتا رہا اور دل میں یہ سمجھتا رہا کہ مجھے کیا پروا ہے کہ وہ میری نسبت کیا خیال کرے گی۔ میرے اس طرزِ عمل نے اُس کے دل میں سخت نفرت پیدا کردی۔ مجھے معلوم ہے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اُس نے کئی بار مجھ سے یہ کہا بھی تھا اور میں اتنا مغرور تھا کہ میں نے اُسے اپنا دل کھول کر نہ دکھادیا کہ اُس کے کتنے ٹکڑے ہوگئے ہیں۔

ماں۔ (اُس کے پاس جاکر اور ہاتھ اس کے گلے میں ڈال کر) میرے بچے پطرس! تم نے واقعی بڑا دکھ اُٹھایا ہے، میری جان۔

پائیرو۔ اور اب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوچکی ہے! (وہ اپنا منہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے)

ماں۔ یہ تم کیسے جانتے ہو؟ ممکن ہے وہ بھی تمہاری تلاش کررہی ہو اور تمہارے لئے بیقرار ہو۔

پائیرو۔ نہیں! نہیں! میں نے اُس کے دل سے محبت کا ایک ایک ذرہ فنا کردیا تھا۔ جب وہ مجھے چھوڑ کر جارہی تھی تو وہ خوش تھی۔ غالباً وہ اب بھی کہیں . . . . اپنے سُرور نغمے گارہی ہوگی، مگر میں . . . . میں . . . .

ماں۔ پطرس، اُس کا نام کیا تھا؟

پائیرو۔ اُس کا نام پائیرٹ تھا۔

ماں۔ (اپنی جگہ خوشی سے مسکراکر) پائیرٹ؟ کیسا پیارا نام ہے! اور وہ تمہیں پطرس کہا کرتی تھی؟

پائیرو۔ نہیں، وہ مجھے پائیرو کہا کرتی تھی۔

ماں۔ پائیرو! پطرس سے اس نام کو کتنی مناسبت ہے، اور تمہارے لئے موزوں بھی کتنا ہے![1]

پائیرو۔ اب میں کبھی یہ نام نہیں سنوں گا۔

ماں۔ اتنے مایوس نہ ہو۔ ممکن ہے وہ تمہیں مل جائے۔ لیکن اس وقت، پطرس، بہتر ہے کہ تم سو رہو صبح جب تم اچھی طرح نیند کرکے اٹھوگے تو تمہارا یہ سب غم کافور ہو جائے گا۔

پائیرو۔ اچھا اماں۔ مجھے کچھ نیند بھی آرہی ہے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔

ماں۔ آؤ پھر، اب تو بہت دیر ہورہی ہے۔

---

[1] پائیرو اُس خانہ بدوش مُغنّی کو کہتے ہیں جس کا چہرہ رنگا ہوا ہو اور لمبے سفید لباس میں ملبوس ہو۔

پائیرو۔ کیا مجھے اوپر اپنے قدیم بستر میں سونا ہے؟

ماں۔ نہیں پطرس۔ وہ اِس وقت تیار نہیں ہے۔ آج رات تم یہیں سو رہو (وہ انگیٹھی سے ایک بتی اُٹھاتی ہے اور پائیرو کے آگے آگے دائیں جانب کے دروازے کی طرف روانہ ہوتی ہے)

پائیرو۔ لیکن یہ تو تمہارا کمرہ ہے۔

ماں۔ پھر کیا ہے۔ تم میرا فکر نہ کرو۔ جس طرح میں کہتی ہوں تم اُس طرح کرو۔

پائیرو۔ جیسے تم کہو، امّی۔ آہ کتنی نیند آرہی ہے! (اُس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے)

ماں۔ (دروازہ کھول کر) یہ دیکھو، سب سامان تمہارے لئے تیار ہے۔ شب بخیر، پطرس۔

پائیرو۔ (اندر سے) شب بخیر، امّی۔

(وہ دروازہ بند کر دیتی ہے، اور ایک لمحے تک کھڑی اُس کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر آگ کے پاس آتی ہے۔ سرخ کوئلوں کو راکھ میں سے کرید کر آرام کرسی میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور دوبارہ بُننے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُونگھنے لگتی ہے۔ آگ بجھنی شروع ہوتی ہے۔ بڑھیا سو جاتی ہے۔

یکایک کہیں سے مگر گھر کے باہر سے موسیقی کی دلکش آوازیں آنی شروع ہوتی ہیں۔ ابتدا میں یہ آوازیں دھیمی ہوتی ہیں اور کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ قریب آتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کمرہ اُن کے شور سے بھر جاتا ہے۔ ہوا میں ایک سحر پیدا ہو جاتا ہے۔ موسیقی کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

زینے کے سر پر ایک از سرتاپا سفید صورت نظر آتی ہے۔ یہ پائیرٹ ہے، جس کی ہیئت تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ شگفتگی اور لطافت کا ایک خواب معلوم ہو رہی ہے۔ اُس کے کان موسیقی پر لگے ہیں، اور وہ نہایت سبک رفتار کے ساتھ نصف سیڑھیاں طے کر جاتی ہے، جہاں آکر وہ ٹھہر جاتی ہے اور منتظر نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے۔

بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور اس میں سے پائیرو کا سر ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہ بالکل سامنے آجاتا ہے۔ اُس کی ہیئت بھی بدل چکی ہے۔ چیتھڑوں کے بجائے اب اُس کے بدن پر بھی سفید لباس ہے۔ اُس کی نظر پائیرٹ پر پڑتی ہے اور اُسی لمحہ پائیرٹ کی نظر اُس پر پڑتی ہے۔ دونوں حیران و ششدر رہ جاتے ہیں)

پائیرو۔ (متحیّر سرگوشی کی آواز میں) پائیرٹ!

پائیرٹ۔ (اسی لہجے میں) پائیرو!

(موسیقی جاری ہے لیکن اُس کے سُر بہت دھیمے ہو چکے ہیں۔ پائیرو دوڑ کر سیڑھیوں کے نیچے جا کھڑا ہوتا ہے اور اوپر پائیرٹ کی طرف دیکھتا ہے جس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں)

پائیرو۔ تم مجھے بُلا رہی تھیں ؟
پائیرٹ۔ میں سمجھی تم مجھے بُلا رہے تھے۔
پائیرو۔ ابھی میں نے تمہاری آواز سنی تھی۔
پائیرٹ۔ میں خواب دیکھ رہی تھی اور تمہاری آواز نے مجھے جگا دیا۔
پائیرو۔ نیچے آجاؤ، پیاری۔ میں تمہیں دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔
پائیرٹ۔ او پائیرو! میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔
پائیرو۔ نیچے آؤ، پیاری!
پائیرٹ۔ ہش۔ ش ش! (وہ اپنی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتی ہے اور نیچے اُتر کر اُس کی آغوش میں چلی جاتی ہے)
پائیرو۔ مجھے چھوڑ کر تم کہاں چلی گئی تھیں ؟
پائیرٹ۔ آہ میں نے تمہاری تلاش میں ایک دنیا چھان ماری۔ لیکن تمہیں یاد ہے تم نے مجھے چھوڑا تھا۔
پائیرو۔ اچھا! میں سمجھتا تھا تم نے چھوڑا تھا۔
پائیرٹ۔ ہم دونوں کو مغالطہ ہوا۔ ہم دونوں چھوڑ گئے تھے۔
پائیرو۔ اور اب ہم دونوں واپس آگئے ہیں۔
پائیرٹ۔ ہم بھول جائیں گے کہ ہم جدا ہوئے تھے۔
پائیرو۔ کیا تمہیں اب تک مجھ سے محبّت ہے ؟
پائیرٹ۔ پہلے سے زیادہ۔
پائیرو۔ اور اسی طرح میری محبّت بھی تمہارے لئے پہلے سے بہت زیادہ ہے۔
پائیرٹ۔ کیوں ؟
پائیرو۔ کیونکہ میں نے تمہیں کھو دیا تھا۔
پائیرٹ۔ مگر میری محبّت کی وجہ یہ نہیں ہے۔
پائیرو۔ وہ کیا ہے ؟
پائیرٹ۔ کیونکہ میں نے تمہیں پا لیا ہے
پائیرو۔ کھونا، پانا، پانا کھونا ایک ہی بات ہے۔ کھونے اور پانے ہی میں محبّت کی زندگی ہے۔
پائیرٹ۔ تم یہاں کیسے آگئے ؟

پائیرو۔ یہ کسی زمانے میں میرا گھر تھا۔
پائیرٹ۔ (دوسری طرف دیکھتے ہوئے) تمہارا گھر؟ پھر یہ بیگم . . . .
پائیرو۔ میری ماں ہے۔
پائیرٹ۔ اوہ پائیرو، مجھے تو یہ معلوم ہی نہ تھا۔
(موسیقی رُک جاتی ہے۔ وہ ماں کی طرف دیکھتے ہیں)
پائیرو۔ یہ بڑی ہی مہربان ماں ہے اور میں نے اس سے بڑی ہی بے رُخی برتی ہے (یکایک) پائیرٹ، ہم اماں کے ساتھ یہیں رہیں؟
پائیرٹ۔ ہمیشہ یہیں رہیں؟
پائیرو۔ ہاں، اماں کے ساتھ۔ یہاں رہیں جہاں ہر طرف امن اور سکوت ہے، اور ظلم اور حماقت نام کو نہیں۔
پائیرٹ۔ وہ ہم سے بڑی محبت کرے گی، اور ہم اُس کی خدمت کریں گے۔ اور شام کے وقت ہم سب مل کر آگ کے سامنے بیٹھا کریں گے اور . . . .
پائیرو۔ کیتلی میں چائے پک رہی ہوگی، اور پاس . . . .
پائیرٹ۔ بہت سے نارنجی کیک پڑے رہا کریں گے . . . . . .
پائیرو۔ ہاں ہاں، بہشت سے اترے ہوئے نارنجی کیک!
پائیرٹ۔ اور نرم نرم پروں والے گرم بستر سونے کو!
پائیرو۔ پائیرٹ ہم یہیں رہ جائیں؟
(وہ اُس کا ہاتھ مستفسرانہ انداز میں پکڑ لیتا ہے، اور وہ دونوں خوش ہو کر مسکراتے ہیں لیکن موسیقی پھر شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک جادو ہے، دل کو موہ لینے والا جادو۔ یہ اُن کے تصورات کو اس پُرامن و سکون مقام سے کھینچ کر کہیں دور لے جاتا ہے۔ اُن کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور اُن کے جسم موسیقی کی رَو میں بہنے لگتے ہیں)
پائیرٹ (بائیں طرف رقص کرتے ہوئے) کیا تمہیں وہ طویل سڑک یاد ہے۔ جو ایک پہاڑی کے گرد پیچ و خم کھاتی ہوئی اُس شہر کو چلی گئی ہے جہاں شام کے وقت دھیمی دھیمی تنیاں روشن ہو کر ستاروں کی طرح ٹمٹماتی ہیں؟
پائیرو۔ (اس کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے) کیا تمہیں سمندر کے کنارے وہ مقام یاد ہے جہاں ریشمی سائبانوں میں سے موسیقی کی تانیں اُٹھتی تھیں اور چاندنی رات کے سنہری پانیوں پر سوار ہو کر خدا جانے کہاں چلی گئی تھیں؟
پائیرٹ۔ (تیز تر حرکات اور بڑھتے ہوئے جوش کے ساتھ) مجھے وہ پُر رونق بازار اب تک یاد ہے۔ جہاں

ایک دوپہر کو ہزاروں چمکتے ہوئے چہرے ہماری نظروں کے سامنے سے گزر گئے تھے اور جہاں لوگوں کے مختلف الالوان لباسوں سے ایک موجِ رنگ پیدا ہوگئی تھی!

پائیرو۔ (پُرجوش انداز میں) مجھے ہزاروں آوازوں کا وہ نشاط انگیز شور وغل ابھی تک یاد ہے جب گھُپ اندھیرے میں نیلے اور پیلے رنگ کے آسمانی گولے فضا میں چھوڑے جا رہے تھے!

(موسیقی تیز تر اور بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ اُس میں ایک کیفِ نشاط پیدا ہو جاتا ہے)

پائیرٹ۔ اور رقص میں مَیں کس طرح چکر کھاتی گئی، کھاتی گئی، کھاتی گئی، یہاں تک کہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے آسمان نیچے گر رہا ہے . . . . . . گر رہا ہے . . . .

پائیرو۔ اور میں نے کس طرح گایا کہ میری رُوح اُڑ کر تاروں سے جا ملی، جو آسمان کی بساط پر رقص کر رہے تھے، ناچ رہے تھے . . . .

پائیرٹ۔ پائیرو! موسیقی ہم کو بلا رہی ہے!

پائیرو۔ (مخمور ہو کر) ہاں، بلا رہی ہے، پائیرٹ، اور ہم جواب دے رہے ہیں!

(وہ اُسے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور دروازے کی طرف بڑھتا ہے، چٹخنی اُٹھا کر دروازہ کھولتا ہے اور اُسے نیچے رکھ دیتا ہے۔ تھوڑی دیر وہ تامل کرتے ہیں اور مڑ کر ماں کی طرف ایک نگاہ ڈالتے ہیں، جو چُپ چاپ سو رہی ہے۔ پائیرو دوڑ کر واپس جاتا ہے اور اُس کے بالوں کو آہستہ سے ایک بوسہ دیتا ہے۔ وہ دروازے میں واپس آجاتا ہے تو پائیرٹ ماں کے پاس جا کر اُس کا تتبع کرتی ہے۔ پھر وہ دوڑ کر پائیرو کی آغوش میں آجاتی ہے۔ موسیقی کی آواز دور بہت دور گم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے)

پائیرو۔ (ہاتھ کی ایک محبت آمیز حرکت سے) خدا حافظ، پیارے گھر!

پائیرٹ۔ خدا حافظ، پروں کے نرم نرم بستر!

پائیرو۔ خدا حافظ، نارنجی کیکو!

(وہ یکایک دروازہ بند کر کے اور پائیرٹ کو ساتھ لے کر باہر نکل آتا ہے)

ترجمہ منصور احمد

میگھ ملہار

لاگ اساڑھ چلی پُرَوّیا[1] بھورے بدرا چھائے

(۱)

کرے کلیل پپیہرا بَن میں، گوالا شور مچائے

جھیل کنارے بگلا ڈولے سارس دوڑ لگائے

چھائیں مائیں کھیلیں بالک گوراڈھول بجائے

بوندا برسیں ہوا چلے اور برچھ جھکولے کھائے

لاگ اساڑھ چلی پُرَوّیا بھورے بدرا چھائے

(۲)

چمک چمک بج[2] پلکیں مارے میگھ[3] گھور آدھارے

ٹھنڈ لگے دِینہا تن کانپے سکھی اساڑھ جوڑا ئے

---

[1] پُرَوّیا - پُروا ہوا۔ بادِ صبا

[2] بج یعنی بجلی۔ [3] میگھ یعنی بادل

ٹھنڈے ٹھنڈے بوند گریں ہرواہا تان لگائے

شیام بنا سونی ہے برکھا ہر دے کچھو نہ بھائے

لاگ اساڑھ چلی پُروَیا بھورے بدرا چھائے

(۳)

راج باغ میں پڑا ہنڈولا سب کوئی جھولن جائے

دھیرے دھیرے جھولے کوئی، کوئی پینگ لگائے

کوئی ہنسے کوئی چھیڑ کرے، اور کوئی کجلی گائے

جیا للچاوے شیام بنا کچھو میگھ ملہار نہ بھائے

لاگ اساڑھ چلی پُروَیا بھورے بدرا چھائے

سید مقبول حسین

(احمد پوری)

قرونِ وسطیٰ

میں

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

اس عنوان سے "اسلامک کلچر" کے جولائی ۱۹۲۷ء نمبر میں ایس خدا بخش کے قلم سے یہ آرٹکل شائع ہوا تھا، ذیل کا مضمون اسی کی تلخیص ہے۔

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، اسلامی تاریخ کی اہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ان تخیلات کے اثرات ونتائج پر غور کیا جائے، جن کے ذریعہ سے اسلام نے صدیوں تک ایشیا، افریقہ، اور مغربی یورپ کی مختلف قوموں کو باوجود ان کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کے باہم متحد کر رکھا تھا، اس حیرت انگیز اتحاد اور شیرازہ بندی کا راز صرف مسلمانوں کے طرزِ تعلیم میں پنہاں تھا، جو دو درجوں پر مشتمل تھی ایک ابتدائی مدارس اور دوسرے اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں، لیکن دونوں جگہ موجودہ زمانے کے نظام تعلیم کے برخلاف نہ تو حکومت کو کوئی دخل و اختیار تھا اور نہ قواعد وضوابط کی سختیاں تھیں، بلکہ پورا نظام صرف غیر سرکاری سعی وعمل پر قائم تھا، اور اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا قدیم نظامِ تعلیم درس وتدریس کی آزادی کا ایک شاندار نمونہ تھا۔

درس وتدریس کا یہ ذوق وشوق زیادہ تر مذہب سے وابستہ تھا، موجودہ تعلیم مدارس کی قیدیں اس وقت ناپید تھیں، قرآن مجید نے قوموں پر جو روحانی اثر ڈالا تھا، اس نے بلا کسی خارجی دباؤ کے ان میں تحصیل علم کی تحریک پیدا کر دی تھی جو خود بخود رفتہ رفتہ تمام دنیائے اسلام میں پھیل گئی،

ابتدائی مدارس بلا کسی قسم کے بالائی جبر واثر کے خود بخود قائم ہوگئے تھے، زمانہ مابعد ہی میں صرف یہ حالت نہ تھی کہ ہر گاؤں میں یا ہر مسجد سے متعلق ایک مدرسہ موجود تھا، بلکہ ابتدائی دور میں بھی اس طرح کے تعلیمی انتظامات موجود تھے، جن کی نگرانی خود عوام کے ہاتھ میں تھی چنانچہ حکومت عباسیہ کے بانی ابو مسلم نے خراساں کے اسی قسم کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، دوسری صدی کے آخر میں ایران میں ایک مدرسہ موجود تھا جہاں بلا کسی سرکاری مداخلت کے بچوں کی باضابطہ حاضری کی پابندی کی جاتی تھی، ان مکاتب کے فیضِ تعلیم سے غربا بھی مستفید ہوتے تھے یہاں تک

کہ اکثر غلام بچے بھی حلقۂ درس میں داخل کرئے جاتے تھے، متعدد ممالک میں جیسا کہ سعدی کی گلستاں سے ظاہر ہو ہے۔ لڑکوں کے ساتھ ساتھ اکثر لڑکیاں بھی تعلیم پاتی تھیں۔

ان ابتدائی مدارس میں زیادہ تر قرآن خوانی کی تعلیم ہوتی تھی تاکہ لوگ اپنے مذہبی فرائض کو احکام شریعت کے مطابق انجام دے سکیں، لیکن رفتہ رفتہ نصاب تعلیم میں علوم صرف و نحو بھی شامل کر دئے گئے، جس کی وجہ سے مذہبی اثر بہت زیادہ محدود ہو گیا۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں میں یہ اثر اور زیادہ قوی ہو گیا"

اعلیٰ تعلیم ابتداء فقہ تک محدود تھی جس کے اصول و آئین قرآن مجید اور احادیث وغیرہ سے مستنبط کئے گئے تھے، اس فن سے اس قدر شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا گیا کہ اور علوم نظر انداز ہو گئے، چنانچہ آٹھویں صدی کے ایک مسلّم الثبوت استادِ فن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر فقہ کے مقابلہ میں جو روح اور دماغ کے لئے صحت بخش ہے کسی فن کا نام لیا جا سکتا ہے، تو وہ صرف علم طب ہے، جو جسمِ انسانی کو صحیح اور تندرست رکھتا ہے بقیہ فنون بالکل لغو ہیں۔

لیکن اس قسم کی تنگ نظری اور کوتہ خیالی علوم کی رفتارِ ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی تھی چنانچہ رفتہ رفتہ علم اللسان اور دیگر علوم کی تحصیل و سرپرستی کی طرف اکثر اربابِ فن کی توجہ مبذول ہوئی۔ اگرچہ اب بھی علومِ مذہبی کا اقتدار قائم رہا، یہ کہنا انصاف سے بعید ہوگا کہ مذہب نے نقطۂ نظر کو محدود کر دیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں میں تحصیلِ علم درس و تدریس، اور آزادئ خیال کی جو غیر معمولی عالمگیر تحریک پیدا ہو گئی تھی، وہ زیادہ تر مذہب ہی کے جوش و اثر کا نتیجۂ عمل تھی،

ابتدا ہی سے اعلیٰ تعلیم کے اغراض کے لئے مسجدوں سے کام لیا جاتا تھا، بخلاف عیسائیوں کے مسجد مسلمانوں کے لئے صرف عبادت گاہ نہ تھی، بلکہ دیگر امور خیر کے لئے بھی مستعمل تھی، غریب مسافر اس میں ٹھہرتے تھے، بیماروں کے لئے شفاخانہ کا کام دیتی تھی، اکثر اس سے عدالت گاہ کا کام لیا جاتا تھا، عبادت کے بعد علم سب سے زیادہ مقدس چیز سمجھا جاتا تھا، اس بنا پر اسلامی مساجد کے دروازے علمی بحث و ذکر کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ علم فقہ کی غیر معمولی اشاعت و ترقی نے اور بہت سے ایسے مباحث کے لئے دروازہ کھول دیا تھا جن کو مذہب سے تعلق نہ تھا، چنانچہ حریری نے جو مغرب میں بہت زیادہ مشہور ہے، بصرہ کی ایک مسجد میں فنِ شاعری پر اکثر خطبے دئے۔

اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو جو خطبوں کے ذریعہ سے دی جاتی تھی، نہ صرف علمی درسگاہوں کے قیام سے، بلکہ مذہب کی فیاضانہ امداد اور ہمدردی کی وجہ سے کس قدر اشاعت اور ترقی ہوئی، اس غرض کے لئے اکثر مسجدوں سے متعلق علیحدہ کمرے ہوتے تھے، جہاں علمی تقریریں ہوتی تھیں، جن سے خاص و عام یکساں مستفید ہونے تھے کسی کے لئے کوئی ممانعت نہ تھی، اگرچہ رفعِ فساد کی غرض سے اکثر سامعین کا داخلہ خطیب کی مرضی اور اجازت

پر منحصر ہوتا تھا، لیکن اکثر ارباب فن اس قید کو پسند نہیں کرتے تھے، سامعین خطیب کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے، اور جس موضوع پر خطیب چاہتا تھا تقریر کرتا تھا، تقریر ختم ہونے پر بحث و تنقید کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور چونکہ اکثر اربابِ فہم اس میں شریک رہتے تھے، اس لئے خطیب کو اپنے موضوعِ کلام پر پہلے سے غیر معمولی توجہ اور احتیاط کے ساتھ تیار ہونا پڑتا تھا، چونکہ ان درسگاہوں کا تعلق مساجد سے ہوتا تھا جہاں کسی قسم کی ممانعت نہ تھی، اس لئے تحصیلِ علم کا ذوق عام ہوگیا، لیکن اسلام نے اس میں اپنی ایک خاص خصوصیت کا اضافہ کیا، یعنی تنوع اور وسعت جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔

مسلمانوں میں سیر و سیاحت کا ایک عام ذوق تھا جس کی وجہ سے مشہور درسگاہوں میں مختلف ممالک کے طالبانِ علم کا مجمع رہتا تھا، علم و فن کی تحقیق و جستجو میں لوگ دور و دراز ملکوں کا سفر کرتے تھے، اس علمی جدوجہد کی تحریک میں مذہب کو خاص دخل تھا، حج کے فرض ہونے کی وجہ سے مکہ معظمہ میں مشتاقانِ علم اور اکثر اربابِ فن دور و دراز ملکوں سے جمع ہوتے تھے، اور بغداد، دمشق، مصر وغیرہ کی درسگاہوں کی سیر کرتے تھے اور وہاں کی علمی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے تھے، اس علمی سیر و سیاحت میں فنِ حدیث کے ذوقِ تحصیل نے خاص تحریک پیدا کی، احادیث کی تحقیق و جستجو میں اربابِ فن نہایت دشوار مسافتیں طے کرتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے اسی غرض سے ترکستان، بغداد، عرب، مصر شام وغیرہ کا سفر کیا، اور سولہ سال کے سفر اور تلاش و کاوش کے بعد ساٹھ ہزار حدیثیں جمع کیں، اسی طور پر ابوالقاسم نے نے تیرہ سو حدیثوں کی مختلف وسائل سے تحقیق کی، ان واقعات سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی تحقیقات کے لئے سیر و سیاحت کا جوش کس حد تک موجود تھا۔

ادبی اور علمی تحقیقات کے لئے بھی سیر و سیاحت کا جوش ابتداءً مذہبی اغراض سے وابستہ تھا، قرآن مجید نے حجاز کی زبان کو عربوں کی مستند زبان بنا دیا تھا، اس بنا پر قدیم فقہائے علم اللسان جتنی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ بدوؤں سے راہ و رسم پیدا کریں، ان کے گیت اور اشعار کو یاد کریں، اُن کی تقریریں سنیں اور ان کے محاوروں کی امتیازی خصوصیات سے واقفیت پیدا کریں، ہندوستان سے بھی اس قسم کے پرستارانِ علم آتے تھے، اِن ساکنانِ صحرا کے ساتھ رہنے کا شوق اس قدر غالب تھا کہ ان کے لوٹ مار کے حملے خوش نصیبی کی دلیل سمجھے جاتے تھے چنانچہ جب مشہور فقیہ علم اللسان اظہری کو کسی سفر کے دوران میں بدوؤں نے گرفتار کر لیا، تو اس پر وہ نہایت خوش ہوا کہ اسی حیلے سے کچھ روز ان کی صحبتوں سے ادبی استفادہ اٹھانے کا موقع ملے گا، زمانہ مابعد میں بھی یہ ذوقِ سفر مذہبی خیال سے وابستہ رہا کیونکہ بجز قرآنِ مجید کے اور کوئی چیز عرب کو اس قسم کی سیر و سیاحت کا مرکز نہیں بنا سکتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ بدوؤں کے علم ادب کے مطالعہ کا ایک مستقل ذوق پیدا ہوگیا، اس قسم کی ادبی تحقیقات نے مسلم طلبہ اور اساتذہ کی زندگی میں سیر و سیاحت کا وہ غیر معمولی جوش پیدا کر دیا تھا جو مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کی ایک نمایاں خصوصیت ہے، سولہ سال کی عمر میں نوجوان طلبہ اپنے

وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کرکے مزید تحصیل علم کی غرض سے بڑے بڑے شہروں کا عموماً سفر کرتے تھے، اکثر سن رسیدہ اشخاص اور اربابِ فن بھی توسیع معلومات کے لئے اس زحمت کو گوارا کرتے تھے، ان میں سے بعض خود اساتذہ تھے، جو دور و دراز ملکوں میں جاکر مشہور علما کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے، اس علمی تحقیق و کاوش اور سیر و سیاحت نے اسلام کے نظامِ تعلیم میں غیر معمولی تنوع اور وسعت پیدا کر دی، اُس زمانہ میں جدید خیالات کی اشاعت کے لئے علمی رسائل و اخبارات کی ضرورت نہ تھی، یہی علمی مسافر تھے، جو ان علمی خطبات کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھیلا دیتے تھے، اس طور پر نویں صدی میں بغداد میں یونانی فلسفہ کے مطالعہ نے جو جدید مذہبی اور عقلی مسائل پیدا کر دئے تھے۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ چاروں طرف پھیل گئے۔

ان سفر کردہ علما کے باہمی اختلاط اور راہ و رسم کا ایک فوری اثر یہ ہوا کہ بحث و تنقید کا ایک عام ذوق پیدا ہو گیا، جو اکثر یاوہ گوئی کی حد تک پہنچ جاتا تھا، بعض اوقات کشت و خون کی نوبت آجاتی تھی، اور ایک فریق دوسرے فریق کی اہانت اور دلآزاری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا، چنانچہ حنبلیوں یعنی پیروانِ امام حنبل کی مذہبی سختی او تقشف کی بدولت گیارھویں صدی تک بغداد میں اکثر معرکہ کارزار خون سے رنگین ہو جاتا تھا، یہ واقعات اگرچہ اسلام کے نظامِ تعلیم کے دامنِ آزادی کے بدنما داغ ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلامی علوم و فنون کے ائمہ ثلاثہ حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی نے باوجود اپنے شدید علمی اختلافات کے معقول پسندی اور سلامت روی کی ایک نہایت شاندار مثال پیش کی، یہ فرقے اگرچہ ہمیشہ حریفانہ جوش سے لبریز رہتے تھے، لیکن متانت اور سنجیدگی کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا تھا، ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی تھی، کہ وہ بحث و استدلال کی قوت سے دوسری جماعت کے با اثر علمائے فن کو اپنا ہم آہنگ اور حامی بنائے، چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر فریق کو اپنے دلائل و براہین کے ساتھ ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا، تاکہ شکست کی ذلت برداشت نہ کرنی پڑے، اس قسم کے علمی مناظروں اور بحث آرائیوں کی وجہ سے قوتِ حافظہ کو خاص ترقی ہوئی، اور لوگوں کو علمی معلومات کے زبانی حفظ کرنے کا شوق پیدا ہو گیا، لیکن اس شوق کی وجہ یہ نہیں ہو سکتی، کہ اس زمانہ میں کتابوں کی کمی تھی، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو زمانہ مابعد میں اس میں تنزل آجاتا، کتابوں کی کبھی کمی نہ تھی، چنانچہ پہلی صدی ہجری میں بھی اکثر واقعات ایسے ملتے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے، کہ کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود تھا،

مسجدوں اور مدرسوں سے متعلق کتب خانے بھی تھے، جن میں سے اکثر تعدادِ کُتب کی کثرت کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور تھے، ان علمی خزائن کا وجود زیادہ تر علم پرست اصحاب کی فیاضی اور سرپرستی پر منحصر تھا، ابنِ حاجب النعمان کے پاس نہایت شاندار کُتب خانہ تھا، خلیل بغدادی نے اپنی تمام کتابوں کو مسلمانوں کے حق میں وقف کر دیا تھا، الواقدی جو نویں صدی میں گذرا ہے، اس کا اتنا بڑا کتب خانہ تھا کہ ۱۲۰ اونٹوں پر کتابیں بار کی جاتی تھیں، فتح بن خاقان نے بھی ایک شاندار کتب خانہ

قائم کیا تھا، غرض اسلامی ممالک میں کتابوں کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن باوجود اس کے علمی مناظروں اور بحث آرائیوں میں امتیاز اور کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے لوگ زیادہ تر قوتِ حافظہ پر اعتماد کرتے تھے۔

قوتِ حافظہ کی تربیت کا یہ ذوق دراصل اسلامی نظامِ تعلیم کی آزادی اور عمومیت کا نتیجہ تھا، جس طرح معلم کا حلقۂ درس ہر خاص و عام کے لئے کھلا رہتا تھا، اسی طرح مُعلم کے لئے بھی کوئی قید نہ تھی، چنانچہ ہر ممتاز مسلمان جس کو اپنی قابلیت پر اعتماد ہوتا تھا بحیثیت مدرس کے منبر پر کھڑے ہونے کا حق رکھتا تھا، حکومت کو ان خطیبوں اور معلموں کے انتخاب و تقرر میں گیارھویں صدی تک جب کہ باضابطہ مدارس قائم ہوئے، کوئی دخل نہ تھا، اور نہ موجودہ طرزِ امتحان کا کوئی رواج تھا، غلاموں تک کے لئے بھی تعلیم و تعلّم کی کوئی قید نہ تھی۔

کتابوں کے استعمال و استفادہ کے متعلق یہ قاعدہ تھا، کہ کوئی شخص بلا مصنف کی تحریری اجازت کے اس کی تصنیف سے خطبہ دیتے وقت کام نہیں لے سکتا تھا، مصنف کی وفات کے بعد بھی اس کے ورثاء سے اجازت لینی پڑتی تھی، خطبات کے متعلق بھی یہی قید تھی، اس قید سے دو فائدے تھے، ایک تو مصنف کے حقوق کا تحفظ اور دوسرے جس کو اجازت ملتی تھی اس کی اہلیت کی سند ہوتی تھی۔

باضابطہ مدارس کے قیام کے بعد اگرچہ بانیوں اور ان کے اہلِ خاندان کو معلموں کے تقرر اور موقوفی کا اختیار حاصل تھا، لیکن طریقۂ تعلیم اور انتخابِ مضامین میں اساتذہ کو کامل آزادی حاصل تھی، حکومت صرف اسی وقت مداخلت کرتی تھی، جب مذہب کو کسی قسم کا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تھا، اس طور پر ایک بڑی حد تک اسلام کے نظامِ تعلیم میں تنوع، اور وسعت پیدا ہو گئی تھی، لیکن یہ آزادی محض بے راہ روی نہ تھی۔

اس نظام کی خاص خصوصیات یہ تھیں، درس و تدریس کے اوقات کے متعلق کوئی مستقل قاعدہ نہ تھا، یہ صرف خطیب کی خواہش اور مرضی پر منحصر تھا، کچھ روزانہ خطبہ دیتے تھے اور دوسرے ہفتہ میں ایک بار خصوصاً دوشنبہ کے دن نماز کے وقت خطبہ بند کر دیا جاتا تھا، سال میں مستقل تعطیلات کا کوئی رواج نہ تھا، تعطیل کا دارومدار خطبات کے اختتام پر تھا یہاں خطیب کو کامل آزادی حاصل تھی وہ عام طور پر خود اپنی یا دوسروں کی تصانیف سے کام لیتا تھا، تجربہ کار خطیبوں کو اپنی درسی کتابیں زبانی یاد رہتی تھیں۔ اس لئے اگر کبھی کتاب لانا بھول جاتے تھے، تو ان کو خطبہ دینے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، خطیب محض تقریر پر اکتفا نہیں کرتا تھا، وہ اس کا اطمینان کر لیتا تھا کہ طلبہ نے اس کے مفہوم کو بخوبی سمجھ لیا ہے یا نہیں، اس غرض کے لئے وہ طلبہ کے ساتھ بحث و سوال کرتا تھا اور ان کو خود سوالات کرنے کی ہمت دلاتا تھا، اکثر معلمین کا یہ دستور تھا کہ بحث و سوال کے وقت اپنی جگہ چھوڑ کر طلبہ کے حلقہ میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ مجمع میں خطیب ہمیشہ سامنے بیٹھتا تھا۔ وہ کسی طالب العلم کو بغیر سوالات کئے ہوئے جانے نہیں دیتا تھا۔ صرف مسجد ہی تک یہ فرض محدود نہ تھا بلکہ اکثر طلبہ کے گھروں پر بھی جا کر ان سے بحث و سوال کرتا تھا، اس طور پر اعلیٰ مدارس کی تعلیم صرف تقریروں کے سننے تک محدود نہ

تھی بلکہ اس کا مقصد طلبہ کی مکمل دماغی تربیت تھا تاکہ ان کو اس خاص فن پر کامل عبور حاصل ہو جائے۔

تعلم و تعلیم کا یہ سلسلہ درسگاہوں سے باہر بھی جاری رہتا تھا۔ طلبہ استاد سے ذاتی تعلقات قائم رکھتے تھے اور اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مشکلات اور شکوک کو رفع کیا کرتے تھے۔ دسویں صدی سے یہ دستور قائم ہو گیا کہ سن رسیدہ اساتذہ طلبہ کی جماعت میں سے جو ممتاز اور قابل ہوتا تھا، اپنی اعانت کے لئے اس کو منتخب کر لیتے تھے جس کو معید کہتے تھے۔

چونکہ استاد مجمعِ عام میں خطبے دیتا تھا جس میں ہر قسم کے خیال کے لوگ شریک رہتے تھے، اس لئے اس سے مختلف قسم کے سوالات بکثرت ہوتے تھے، جن کا جواب دینا اس کا فرض تھا، ابتدا میں علوم و فنون کی شاخیں ایک دوسرے سے الگ نہ تھیں، اس لئے استاد کو اس بارے میں غیر معمولی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ بعد کو علوم کے مستقل شعبے قائم ہو جانے کی وجہ سے یہ بارِ گراں کسی قدر ہلکا ہو گیا، تاہم عوام کے ساتھ بحث و مکالمہ اسلام کے نظامِ تعلیمی کا ایک وقت طلب پہلو تھا۔

چونکہ استاد کسی مستقل نظام کے ماتحت نہ تھا، اس لئے اس کی آمدنی پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑتا تھا گیارہویں صدی تک یہ استاد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ جو ذریعۂ معاش ممکن ہو اس کو اختیار کرے۔ جو لوگ اپنے کو خدمتِ علم کے لئے وقف کر دیتے تھے، وہ یا تو خود خوشحال ہوتے تھے یا مربیانِ فن کی نگاہِ فیض ان پر ہوتی تھی، یا کوئی تجارت کرتے تھے، یا مفتی اور قاضی کے فرائض سرانجام دیتے تھے، آخر الذکر ذریعۂ معاش زیادہ تر وہ لوگ اختیار کرتے تھے جو علمِ فقہ کے معلم تھے۔ پندرہ سال تک امام شافعی نے درسِ فقہ کے ساتھ ساتھ بحیثیت مفتی کے کام کیا، اکثر اساتذہ مثلاً امام الحرمین وغیرہ ایک ہی وقت میں مختلف عہدوں پر مامور تھے، ان عہدوں کی آمدنی بعض اوقات بہت زیادہ ہوتی تھی، لیکن جو لوگ زیادہ محتاط اور متقی ہوتے تھے وہ اس قسم کے ذریعۂ معاش کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام ابو یوسف ایسے اربابِ کمال نے کبھی اس قسم کے عہدوں کی پروا نہیں کی، امام ابو حنیفہ نے عسرت اور تنگی میں زندگی بسر کی لیکن ان کی شانِ خودداری نے بغداد کے اعلیٰ ترین عہدۂ قضا کو قبول کرنا گوارا نہ کیا۔

ماہرینِ علم اللسان کی مالی حالت سب سے بدتر تھی، کیونکہ ان کو کسی سرکاری عہدے کے ملنے کی مشکل سے توقع ہو سکتی تھی، معدودے چند مستثنیات میں سب سے مشہور ابو تمام جامع حماسہ کی ذات تھی، جو موصل کا گورنر مقرر ہوا تھا، اس لئے جو لوگ علم اللسان اور علمِ ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے، ان کو اپنے کسبِ معاش کے لئے دیگر وسائل سے کام لینا پڑتا تھا۔ لیکن شاعری اور خصوصاً مدحیہ نظمیں کسبِ معاش کا بہترین ذریعہ تھیں، اسلامی فرمانرواؤں میں بہت کم ایسے تھے، جن کی سرپرستی میں کوئی شاعر نہ رہتا ہو، دسویں صدی تک خلفاء کا دربار سخن گو ماہرینِ علم اللسان سے بھرا رہتا تھا، جو ہر طرح کے شاہانہ عنایات و انعامات سے فیض یاب ہوتے تھے، چونکہ ان لوگوں کا قیام بادشاہ کی

خوشی پر منحصر تھا جس کے لئے خوشامد و تملق اور مدح سرائی کی ضرورت تھی، اس لئے ان کی زندگی میں پستی اور ابتذال آگیا تھا لیکن اس کا نتیجہ اتنا ضرور ہوا کہ افسانوں اور مختلف قسم کے شعرا کے کلام کے انتخابات کا ایک معتد بہ ذخیرہ عالم وجود میں آگیا۔

البتہ ان فقہائے علم اللسان کی حیثیت زیادہ معزز اور وقیع تھی جن کے سپرد شہزادوں کی تعلیم ہوتی تھی جیسا کہ مشرق میں عباسیوں کے اور اندلس میں بنو امیہ کے درباروں میں عام دستور تھا، اس کے علاوہ ایک اور ذریعہ تھا، جس سے اساتذہ اور علمائے فن کو کسی حد تک مدد ملتی تھی، وزرا حکومت کے قبضہ میں ایک مستقل سرمایہ رہتا تھا جس سے وہ اربابِ علم و فن کی امداد کیا کرتے تھے لیکن اس میں ذلت اور ابتذال کا شائبہ تھا اور جو کچھ ان علما کو ملتا تھا اس کی مقدار نہایت کم ہوتی تھی، چنانچہ مشہور مصنف ترمذی کو صرف چار درہم ماہوار ملتے تھے۔

استادوں کی یہ قلیل تنخواہ ان مدارس میں بھی قائم رہی جو گیارھویں صدی میں قائم ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ اکثر اساتذہ نے تقرر کے بعد فوراً ہی استعفا دے دیا اور جو لوگ رہ گئے تھے وہ کسی اور ذریعہ سے کسبِ معاش کرتے تھے، جس طرح ان مدارس نے نظام تعلیم کے عام اصول و آئین میں کوئی تغیر پیدا نہیں کیا، اسی طرح ان کی زندگی کی ابتدائی صدیوں میں اساتذہ کی تنخواہ کے متعلق کوئی معتد بہ مالی ترقی نہیں ہوئی۔

بہر حال ان مدارس کے وجود نے فقہائے علم اللسان کی مالی حالت کو کوئی ترقی نہیں دی، کیونکہ بڑے بڑے مدرسوں مثلاً نظامیہ بغداد میں بھی اس فن کے لئے صرف ایک جگہ تھی لیکن اس پر بھی قلتِ تنخواہ کی شکایت تھی۔

صرف ایک قسم کے اساتذہ کسبِ معاش کی فکر سے آزاد تھے یعنی وہ لوگ جو نوجوان طلبہ کو اپنے ساتھ رکھ کر پورے طور پر ان کی تعلیم کی نگرانی کرتے تھے، جو شخص اپنے بیٹے کو استاد کے سپرد کر دیتا تھا، وہ اس کے خور و نوش کا ذمہ دار ہوتا تھا، شاگرد استاد کی ہر طرح کی خدمت کرتا تھا، بازار سے ضروری چیزیں خرید کر لاتا تھا، یہاں تک کہ استاد کے لئے کھانا بھی پکاتا تھا، ان طلبہ میں سے جو سب سے زیادہ قابل ہوتا تھا، بعض اوقات استاد اس سے اپنی بیٹی کا عقد بھی کر دیتا تھا،

قدیم زمانہ میں طلبہ کی کفالت اور پرورش کا سامان نہایت کم تھا، عموماً اہل خاندان ان کے مصارف کے ذمہ دار ہوتے تھے، اس لئے اکثر طلبہ خوشحال اور دولتمند خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مدارس کے آغاز و قیام ہی کے زمانہ سے طلبہ کی اقامت کا سامان ہو گیا تھا لیکن تیرہویں صدی کے بعد اس قسم کا انتظام یقینی طور پر موجود تھا، استادوں کی تنخواہ کی ترقی کے ساتھ طلبہ کے سامان قیام و طعام میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا، مغل اور ترکی نسل کے بادشاہوں نے علاوہ شاہی عطیات کے بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں مرنے کے بعد بھی خادمانِ علم و فن کے لئے ان کا سرچشمۂ فیض و کرم جاری رہا، کیونکہ سلاطین و وزرا کے مزاروں

پر قرآن خوانوں کے لئے گراں بہا جائدادیں وقف تھیں جن کے محاصل سے نوجوان طلبہ اور اساتذہ بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

قدیم زمانہ میں اساتذہ کی غیر معمولی قدر و عزت تھی، لوگ عموماً جھک کر سلام کرتے تھے، اکثر ان کے جلو میں چلتے تھے، اور جب استاد خچر یا گھوڑے پر سوار ہوتا تھا تو اس کی رکاب تھام لیتے تھے، کوئی استاد مرجاتا تھا تو تمام شہر اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتا تھا، چنانچہ جب ۴۷۸ھ میں نیشاپور میں امام الحرمین کا انتقال ہوا تو نہ صرف شعرا نے ان کی تعریف میں زمزمہ سنجیاں کیں بلکہ تمام تاجروں نے اپنی دکانیں بند کر دیں، مسجد کا منبر ڈھاکر گرادیا گیا اور شاگردوں نے اپنے قلم اور دواتیں توڑ ڈالیں۔

اس زمانہ کے اہل علم کا لباس بھی خاص ہوتا تھا، یہ ایجاد امام ابو یوسف نے کی تھی، رفتہ رفتہ ہر فن کے علما کا لباس علیحدہ ہوگیا، جس سے یہ پتہ چل جاتا تھا کہ فلاں شخص فلاں فن کا عالم ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ زمانۂ مابعد میں ترکی حکومت کے حدود کے اندر علوم و فنون کو بہت کچھ ترقی ہوئی اور سلاطین نے ارباب علم و فن کی سرپرستی میں بہت زیادہ فیاضی اور دریادلی سے کام لیا، لیکن باوجود اس شان و شوکت اور تزک و احتشام کے علم و تہذیب کی وہ بہار دوبارہ زندہ نہ ہوسکی، جس نے نویں، دسویں اور گیارہویں صدی میں دنیائے اسلام کو مختلف قسم کی رنگینیوں سے معمور کردیا تھا"

مرزا احسان احمد بی اے ایل ایل بی

فردِ مستثنیٰ

نظروں سے نہاں ہے سرسید
ہیں پیشِ نظر اکثر سید

زر دار نہ تھا سرسید بھی! | کہتے نہیں مال و زر سید
تھا شر سے جدا سرسید بھی | کرتے نہیں شور و شر سید
تحقیق ہوئی سرسید سے | سردار بنے کیونکر سید
تصدیق ہوئی سرسید سے | کس طرح بنے رہبر سید
تھا جانِ وفا سرسید بھی | ہوتے ہیں وفا پرور سید
تھا کانِ سخا سرسید بھی | ہوتے ہیں کرم گستر سید

اس پر بھی جہاں میں ہر سید
کہلا نہیں سکتا سرسید

سید منظور علی
(حیدرآباد دکن)

کیفِ تصوّر

شبِ سیاہ کی مانند زندگانی ہے ۔۔۔ مرے لبوں پہ محبّت کی اک کہانی ہے
تمہاری یاد مری رُوح کی ہے سرمستی ۔۔۔ تمہارا ذکر مرے دل کی شادمانی ہے
یہ میرا سینۂ تاریک جگمگا اُٹھا ۔۔۔ تمہاری شمعِ محبت کی ضوفشانی ہے
تمہارا پیکرِ رنگیں ہے سامنے میرے ۔۔۔ یہ میری چشمِ تصور کی کامرانی ہے
تمہارا جلوۂ سرشار ہے نشاط انگیز ۔۔۔ مری رگوں میں رواں موجِ ارغوانی ہے
وہی تمہاری نگاہوں کی شرمگیں مستی ۔۔۔ وہی تمہارے تبسّم کی گلفشانی ہے
وہی ہیں پیار کی رازونیاز کی باتیں ۔۔۔ وہی تمہاری محبت بھری جوانی ہے
وہی ہیں زمزمہ ہائے ربابِ عیش ونشاط ۔۔۔ وہی ریاضِ محبت کی گلفشانی ہے
وہی ہیں چاندنی راتیں وہی بہار کے دن ۔۔۔ وہی شباب کی جادو بھری کہانی ہے
وہی ہے نغمۂ سازِ عبودیت تیرا ۔۔۔ وہی نیاز وہی نازِ مدح خوانی ہے

طرب فروز ہے کیفِ تصوّر "راحت"
مرے لئے یہی فردوسِ جاودانی ہے

اثر صہبائی

اور

کلامِ درد

پھولے گی اس زبان میں گلزارِ معرفت   یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا   دردؔ

قدیم اردو شاعری میں مثنوی اور غزل کے ذریعہ سے حقیقت و مجاز کی تفسیر بیان کی جاتی تھی اور مسائل اخلاق کی تعلیم عموماً رباعیوں کے ذریعہ سے ہوا کرتی تھی۔ قصیدہ لکھنے کی مشق شعرا مجبوراً کرتے تھے جیسے آج کل تعلیم یافتہ اصحاب عموماً قانون پڑھنے پر خواہ مخواہ مجبور ہوتے ہیں۔ غزل ہر حالت میں پسند کی جاتی تھی۔ کیونکہ ہر قسم کے مضمون سے اس کا تعلق ممکن ہے لیکن چونکہ غزلوں کے مجموعے یعنی "دیوان" میں سوائے ردیف و قافیہ کی ترتیب کے کسی قسم کی "انڈکس" ممکن نہیں ہو سکتی، جو مضمون کی امتیازی خصوصیتوں کو علیحدہ علیحدہ ظاہر کر سکے اس لئے عہدِ حال کے اہلِ علم کا یہ قول کہ "اردو شاعری میں بے ترتیبی بہت ہے" زیادتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی قدیم اردو شاعری میں اشعار کی حیثیت سطحِ قرطاس پر بکھرنے والی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے زیادہ نہیں البتہ جوہر شناسوں کو انہیں کنکریوں میں جواہر ریزے بھی مل سکتے ہیں بشرطیکہ تلاش اور چھان بین کی زحمت برداشت کی جائے اور بعض شاعر تو ایسے بھی گزرے ہیں جن کے اشعار عموماً کسی خاص رنگ میں رنگے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو ایک قسم کا امتیاز حاصل ہے مثلاً میرؔ صاحب میں کیفِ حرمان ہے، غالبؔ میں اجتماعِ اضداد اور اکبرؔ میں تنقید، خواجہ میرؔ درد رحمتہ اللہ علیہ بھی ایسے ہی شعرا میں شمار کئے جا سکتے ہیں کیونکہ معرفت و حقیقت پر اشعار لکھنے والا اردو شعرا میں خواجہ صاحب سے بڑھ کر کوئی نظر نہیں آتا اگرچہ ان کا فلسفہ ایرانی فلسفۂ تصوف پر مبنی ہے، جس کا موضوع عموماً دو پہلوؤں میں منقسم ہے ایک "ہمہ اوست" دوسرے "دنیا کی بے ثباتی"۔ موخر الذکر پہلو کا موضوع ہنود کے "مسئلۂ مایا" سے بھی ملتا جلتا ہے۔

خواجہ میر درد نے علاوہ فلسفہ کے "اخلاق" پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر انہوں نے "پندنامۂ سعدی" کا رنگ اختیار کرنے کے بجائے تنقیدی پہلو اختیار کیا ہے۔ تنقید بھی ایسی جس میں نصیحت آموز طنز شامل ہو جس کی مثال

خواجہ صاحب کا یہ شعر ہے ؎

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول　　دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

خواجہ صاحب کی شاعری کو تین پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے:-

۱۔ بہ اعتبارِ معانی

۲۔ بہ اعتبارِ بیان

۳۔ بہ اعتبارِ زبان

ان تین پہلوؤں میں سے پہلا خواجہ صاحب کی شاعری میں زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اور بحقیقت معانی ہی کلام کی جان ہیں اور باقی سب آرائش۔ قدیم علما کا بھی یہی قول ہے کہ ؎

ساغرِ زرّین ہو یا مٹی کا ہو اک ٹھیکرا　　تو نظر کر اُس پہ جو کچھ اُس کے اندر ہے بھرا

اس اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خواجہ میر درد کے کلام کو پرانے لوگوں کی باتیں سمجھ کر ٹال دینا ایک بڑی ادبی غفلت ہوگی۔ اس غفلت سے احتراز کرنے کے لئے ذیل میں خواجہ صاحب کی غزل کے تینوں پہلوؤں پر ایک سرسری تبصرہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ خواجہ صاحب اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ فلسفہ میں عموماً یہی تین مسئلے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یعنی

۱۔ عالم کیا ہے؟

۲۔ انسان کیا ہے؟

۳۔ خدا کیا ہے؟

یہی تین سوالات ایسے ہیں جن کی تشریح میں فلسفیوں نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے اور آخر میں میر صاحب کی زبان سے نیوٹن کے اس قول کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے　　سو بھی اک عمر میں ہُوا معلوم

مگر جس طرح طولِ کلام سے طبیعت بہلتی ہے اور تشریح و تفسیر سے تسکین حاصل ہوتی ہے اسی طرح فلسفہ کی پیچیدگیوں میں پڑنے سے اگر کچھ نہیں تو ایک قسم کی دماغی ورزش ہی حاصل ہوتی ہے۔

فلاسفۂ قدیم کائنات و موجودات کو دوقت، سبب، اور قیام و مقام کا ماخذ بتاتے ہیں۔ جس پر فلاسفۂ ہنود کے مسئلۂ "مایا" کی بنیاد قائم ہے۔ اُن کے نزدیک دنیا کا وجود ہی نہیں یعنی اس کا کوئی ایسا وجود جس کا اطلاق خود اسی وجود پر ہو سکے نہیں ہے۔ موجودات کی نمود تو متعلق حیثیت رکھتی ہے نہ کہ مطلق۔ ہر شے جو نظر آتی ہے اس کی بنیاد دماغوں کی حالت پر مبنی ہے۔ اگر حواسِ خمسہ کی پانچ قوتوں کے علاوہ کوئی چھٹی قوت بھی

ہوتی تو شاید دنیا ہم کو کچھ اور ہی نظر آتی۔ اسی طرح ساتویں یا ایک اور قدم بڑھ کر آٹھویں قوت ہوتی تو نہیں معلوم دنیا ہمارے سامنے کیا ہوتی، علیٰ ہذا القیاس، اس سے ظاہر ہے کہ موجودات کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں بجز اس کے کہ ہمارے خیال کی رنگینیاں "سرچ لائٹ" کا کام کر رہی ہیں۔ تاہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ موجودات کچھ نہیں۔ بقول سوامی رام تیرتھ "یا تو رسّی سانپ ہے یا سانپ رسّی ہے" کچھ ہے ضرور سا دریہی ہو نا فلاسفۂ ہنود کے نزدیک "مایا" کہا گیا ہے جس کی بنیاد وقت، سبب اور قیام و مقام پر ہے اور چونکہ ان کا وجود ہمارے دماغوں کی حالت سے متعلق ہے اس لئے ان کی الگ الگ تشریح کر دینا چاہتے۔

ان میں سے پہلے "وقت" کو لیجئے۔ وقت کا انحصار دماغی کیفیتوں پر ہے۔ خواب میں انسان برسوں گذار دیتا ہے لیکن بیداری پر اس کی حیثیت "سناٹو" سے زیادہ نہیں رہتی۔ امتحان کے کمرے میں تین گھنٹے مشغولیت کی وجہ سے تین لمحے معلوم ہوتے ہیں۔ غرض وقت کا وجود بھی متعلق ہے مطلق نہیں۔ اس حقیقت کی نہایت مختصر تفسیر خواجہ میر درد نے کسی مغربی شاعر کی پوری کتاب سے بھی زیادہ عام فہم طریقہ سے صرف ایک شعر میں کس طرح کی ہے ؎

لے کر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے گر درمیاں حساب نہ ہو ماہ و سال کا

یہ شعر محض شعر نہیں بلکہ فن ریاضی یعنی "الجبر والمقابلہ" میں مساوات کا ایک جواب ظاہر کرنے والا سوال یا "فارمولا" ہے جو الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ اس سے بڑھ کر "وقت" کی تشریح نہیں ہو سکتی واقعی وقت محض ایک قسم کا "حساب" ہے۔ اس کی "تنگی" و "فراخی" اس کی کمی و زیادتی صرف اس حساب کا کرشمہ ہے۔ اس کا بڑھنا گھٹنے کی دلیل ہے۔ اگر خیال کے ساتھ وقت کو نسبت نہ ہو تو در اصل وہ کوئی چیز نہیں۔ خیال کے ساتھ وقت کے تعلق کا ایک پہلو "بڑھنا" ہے اور دوسرا "گھٹنا" اور یہی وقت کا فلسفہ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ اس کی نسبت لکھا گیا ہے محض توضیح و تشریح ہے۔ وقت کے اس فلسفہ کو خواجہ صاحب کیا ہی سلجھے ہوئے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے

غرض وقت کا وجود کسی واقعہ کی ابتدا و انتہا سے متعلق ہے۔ ابتدا و انتہا کو الگ کر کے بذاتِ خود وقت کی کوئی تخیل نہیں جس طرح پیدائش اور موت کو الگ کر کے زندگی یا عمر کو خیال میں نہیں لایا جا سکتا۔

اب عناصرِ خیال کی دوسری قسم یعنی "سبب" کو لیجئے۔ سبب کیا ہے؟ ایک قسم کا علم جس کے ذریعہ سے دوسرے اسباب کا سراغ ممکن ہو سکے۔ حوادث کی بنیاد سبب پر ہے۔ ہر وہ واقعہ جو کسی دوسرے واقعہ کو حادث کر سکے سبب ہے اس طرح سبب کا وجود بھی تعلق سے خالی نہیں کیونکہ قانونِ اسباب کی بنیاد بھی ادراک و فہم

ہی پر ہے اور چونکہ نتیجہ وسبب کا خیال کئے بغیر واقعات وحوادث کا خیال ممکن نہیں اور واقعات وحوادث کی مختلف صورتیں ادراک وفہم سے متعلق ہیں۔ اس لئے سبب کو بھی محض کرشمۂ خیال سمجھنا چاہئے۔ اسی کرشمۂ خیال یعنی ادراک وفہم پر خواجہ صاحب نے کیا ہی محققانہ انداز میں اظہار تعجب کیا ہے ؎

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک وفہم یاں　　　دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

یہ دوسری بات ہے کہ ایک فلسفی کا ادراک وفہم عوام الناس کے ادراک وفہم سے نسبتہً کہیں زیادہ ہواور اس زیادتی کا راز صرف یہ ہے کہ عوام الناس نے فلسفیوں کی طرح دماغی ورزش نہیں کی اس لئے ان کا دماغ کمزور ہے۔

اسباب وحوادث سے متعلق خواجہ صاحب نے سب سے بڑی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ ہمارا وجود ہی امر ایسا ہے جو طلسم کائنات میں طلسم بند ہونے کے باوجود الگ بھی خیال میں آسکتا ہے اور علیحدگی کا یہ خیال ہی اک بات کا ثبوت ہے کہ سنگلاخ میں ہماری ہستی کنکر پتھر نہیں بلکہ ایک "جوہر مخفی" کی طرح ہے۔ کیونکہ اگر ہم ہیں تو دنیا جہان سب کچھ ہے، ہم نہیں تو کچھ نہیں۔ اس لئے ہر وجود کا سبب اعلیٰ ہم ہی ہیں۔ بقول خواجہ صاحب ؎

عالم ہو قدیم یا کہ حادث　　　جس دم نہیں ہم جہاں نہیں ہے

اور یہ سبب اعلیٰ یعنی "تخیل" ما ومن" "وصل جان وتن" کی صورت میں کچھ ایسی طرح محدود ہے کہ حدود کی طرف لوگوں کا خیال مائل ہی نہیں ہوتا نہ حدود کو نمایاں طور پر حدود سمجھا جاتا ہے۔ ہم مصائب عالم کا شکوہ کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ مصائب کیوں ہیں۔ ہم قید ہیں لیکن "قید خانہ" کا خیال تک نہیں، ہم طوق وسلاسل میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن زنجیروں کی آواز نہیں سنتے بقول خواجہ صاحب ؎

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز　　　ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

اس وقت ہنود کی کتاب مہابھارت کا ایک چٹکلا یاد آیا۔ وہ یہ کہ یودھسٹر سے یکش دیوتا نے پوچھا کہ "راج کنور بھلا تم کو دنیا میں ایسی بات بھی معلوم ہوتی ہے جو بدرجۂ غایت حیرت انگیز ہو"؟ یودھسٹر نے کہا "بھگوان صرف ایک بات وہ یہ کہ روزانہ آدمی مرتے جاتے ہیں مگر موت کا یقین کسی کو نہیں"۔ "عالم میں ہونے اور "عالم سے جدا ہونے" کی تفسیر اس حکایت سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وجود جو "واقعات وحوادث" کی ایک شکل ہے نتیجہ وسبب اور آغاز وانجام کا ایک درمیانی طلسم ہے اور یہ طلسم بھی محض ایک کرشمۂ خیال ہے اور چونکہ خیال کا وجود کسی بڑے سبب کا ایک ادنیٰ اظہار کمال ہے۔ اس لئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ؎

نہ ہم غافل ہی رہتے ہیں نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں　　　انہیں طرحوں میں ہم ہر دم فنا فی اللہ ہوتے ہیں

تقید گاہ امکاں میں ہے وہ کچھ بخشش مطلق　　　کہ ہر واحد کو لاکھوں دام یاں تنخواہ ہوتے ہیں

"اور تقیدگاہِ امکان" میں "بخششِ مطلق" پر بھروسا کرکے انسان کو شکوہ و شکایت کی گنجائش ہی نہیں اس لئے لازم ہے کہ ؎

پر بھا درد کچھ مت رکھ ترقی او تنزل کا ۔۔۔ کہ اپنے ذہن میں تو یاں گدا بھی شاہ ہوتے ہیں

طلسمِ عالم کی تیسری بنیاد یعنی "قیام و مقام" پر قدیم فلاسفہ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں محض ہمارے خیال کی رنگینیوں کا مظہر ہیں مگر ان کی حیثیت بالکل "وہمی" نہیں ہر چیز کا قیام و مقام جتنے کہ اس کا نام ایک قسم کی مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو بغیر کسی "حد" یا بغیر ابتدا و انتہا یا شروع اور اخیر کے خیال میں نہیں آسکتی۔ "ناک" کا تصور ہمیشہ دو کانوں اور دو آنکھوں کے بیچ میں منہ سے اوپر ہی ممکن ہو سکے گا پس پشت یا بالائے سر اس کا خیال ہی نہیں ہو سکتا۔ غرض مسئلۂ تناسب و تعلق کو ہر بات میں دخل ہے لیکن چونکہ یہ مسئلہ بھی خیال سے متعلق ہے اس لئے قیام و مقام کا امتیاز بھی محض ایک صوری امتیاز ہے معنوی اہمیت اس کو بالکل نہیں۔ نہ اس کا اطلاق حدود سے پرے ہو سکتا ہے۔ حدود کی نسبت سے نام و قیام کا وجود ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کی تمثیل سمندر کی موج سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ موج کیا ہے؟ محض سمندر کی تبدیل شدہ صورت یعنی سمندر اور موج میں جو امتیاز ہے۔ اس کا راز صرف نام و قیام کی تشکیل پر مبنی ہے۔ اگر موج غائب ہو جائے تو تشکیل باقی نہیں رہتی۔ مگر "موج" تھی کوئی چیز ضرور۔ محض "چھلاوا" یا "وہم" نہ تھی۔ اس سے لمبائی چوڑائی غرض ایک قسم کی تشکیل نمایاں تھی اور یہی شکل قیام و مقام کی دلیل ہے۔ اور چونکہ وجودِ انسانی پابندِ قیام و مقام ہے اس لئے خواجہ صاحب کا یہ قول بھی اظہارِ حقیقت سمجھنا چاہئے کہ ؎

ہستی ہے جب تلک[1] ہم ہیں اسی اضطراب میں ۔۔۔ جوں موج آپھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں

اور اسی خیال کو خواجہ صاحب مصائبِ عالم کا شکوہ کرتے ہوئے نہایت عام شاعرانہ انداز میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

کیوں نہ ڈوبے رہیں یہ دیدۂ تر پانی میں ۔۔۔ ہے بنا مثلِ حباب اپنا تو گھر پانی میں

متذکرۂ بالا حقائق یعنی وقت، سبب، اور قیام و مقام یا بالفاظِ دیگر وجودِ عالم کا راز "پردہ ہائے تعینات" پر مبنی ہے اور تماشا گاہِ عالم میں خیالات کی رنگ آمیزیوں نے ان پردوں کو اور بھی رنگ برنگ نمونوں میں پیش کیا ہے۔ اِن سب باتوں کا خلاصہ خواجہ صاحب اپنی ایک غزل میں اس طرح بیان فرماتے ہیں[1]

ہستی ہے سفر، عدم وطن ہے ۔۔۔ دل خلوت و چشم انجمن ہے

---

[1] اکثر قدیم اساتذہ "ہ" کا ادغام جائز سمجھتے تھے۔

دیکھا تو یہ شورشِ من وما — ہنگامۂ وصلِ جان و تن ہے
مت جا تر و تازگی پہ اس کی — عالم تو خیال کا چمن ہے

اب فلسفۂ تصوف کے دوسرے سوال پر غور کرنا چاہئے جو انسان سے متعلق ہے۔ انسان کیا ہے؟ سمندر کی ابھری ہوئی موج یا سازِ انا البحر پر نغمہ نواز ہونے والا ایک قطرہ۔ لیکن کُل کے مقابلہ میں اس جزو کی کوئی امتیازی حیثیت بھی ہے یا نہیں۔ جان و تن یا بالفاظِ دیگر روح و جسم اس کی امتیازی حیثیتیں ہیں اگرچہ روح بذاتِ خود کسی قسم کی تفریق ظاہر نہیں کرتی جب تک کہ جسم کے ساتھ اس کے تعلق کا خیال نہ کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جسم اپنی ظاہری حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ اس کو خود اپنا علم ہے نہ اپنے مکین کا۔ رہا دماغ و خیال کا درمیانی تعلق تو دماغ و خیال کو جسم و جان کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہے جو آنکھ اور نگاہ کے درمیان عینک کو ہے۔ نیند میں ہم اس عینک کو اتار ڈالتے ہیں۔ مرنے کے بعد شائد اس عینک کی بالکل ضرورت ہی نہ ہوتی ہو۔ غرض جو کچھ ہے روح ہے۔ بقولِ مشرقی فقیہہ سری شنکرا چاریہ کے "روح کا کوئی وجود نہیں بلکہ وہ خود وجود ہے، روح کو کوئی علم نہیں بلکہ وہ خود علم ہے"۔ وہ ہر قسم کے تعینات سے پرے ہے۔ تعینات کی حیثیت اس کے سامنے عینک وغیرہ سے زیادہ نہیں۔ اور یہیں سے انسان کی حقیقی انسانیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی بنا پر خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ؎

میں گو نہیں ازل سے پرتا ابد ہوں باقی — میرا حدوث آخر جا ہی پڑا قدم سے

اس اعتبار سے دنیا میں جو کچھ ہے وہ یہی حقیقی انسانیت ہے جو وجودِ مطلق سے وابستہ ہے۔ اس لئے خواجہ صاحب نہایت انبساط و مسرت کے ساتھ لکھتے ہیں ؎

باغِ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں — گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں
دریائے معرفت کے دیکھا تو ہم ہیں ساحل — گرداب ہیں تو ہم ہیں اور پار ہیں تو ہم ہیں
وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے وگر قدر — مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں
الفاظ خلق ہم بن سب مہملات سے تھے — معنی کی طرح ربطِ گفتار ہیں تو ہم ہیں

ان اشعار کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ تعینات میں ظاہر و پنہاں ہم ہی ہیں۔ یہیں سے فلسفہ کا تیسرا سوال جو خدا سے متعلق ہے حل ہو جاتا ہے۔ خدا کیا ہے؟ یکتائے مطلق یا "مسبب کل" جس نے لفظِ کُن سے نظمِ "فیکون" کو قائم کیا ہے۔ وہ برتر از قیاس و گمان و خیال ہے۔ خواجہ صاحب نے بالکل سچ کہا ہے ؎

وہ مرتبہ ہے اور ہی فہمید سے پرے — ہم جس کو پوجتے ہیں وہ اللہ ہی نہیں

یوں لکھنے کو بھی خواجہ صاحب نے اور شاعروں کی طرح ہمہ اوست کا دم بھرتے ہوئے لکھا ہے کہ ؎

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے — پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے

نیز یہ کہ ؎

جوں نورِ نظر ترا تصور — تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم

اور یہ کہ ؎

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اس لئے اربابِ توحید کا یہ کہنا بھی حقیقت سے خالی نہیں کہ ؎

رکھ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِی کو یاد — جب تلک اے درد دَم میں دَم رہے

بہ اعتبارِ معانی ہم خواجہ صاحب کے کلام پر تبصرہ کر چکے اب دیکھنا چاہئیے کہ

بہ اعتبارِ بیان اپنے ہمعصروں میں خواجہ صاحب کہاں تک نمایاں ہیں۔ اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے خواجہ صاحب کے کلام میں تین خصوصیتیں پائی جاتی ہیں :- کیفِ غم، کیفِ عشق اور زندہ دلی۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم اردو شاعری میں یاس وحرماں کا بہت کچھ عنصر رہا اور یہیں سے کیفِ غم کی ابتدا ہوتی ہے مثلاً خواجہ صاحب کے یہ اشعار ؎

اگر یونہی یہ دل ستاتا رہے گا — تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے — مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

قفس میں کوئی تم سے اے ہمصفیرو — خبر گُل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تھا — کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

لیکن ذیل کے اشعار سے بڑھ کر میر صاحب بھی کیفِ غم کی مثال بہم پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوئے ان اشعار کو پڑھنے سے خواجہ صاحب کے پرحرماں اور نازک شاعرانہ جذبات کا بہت اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے ؎

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے ہی رو دیا ہوگا

ان نے قصداً بھی میرے نالے کو — نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

حال مجھ غمزدے کا جس جس نے — جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

یک بیک نام لے اٹھا میرا — جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا

میرے نالوں پہ کوئی دنیا میں　　ق　　بے کئے آہ کم رہا ہوگا
لیکن اس کو اثر خدا جانے　　نہ ہوا ہوگا گر ہوا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا　　کسی بدخواہ نے کہا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا　　آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

مندرجۂ بالا غزل میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک شعر دل میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ ان اشعار سے بڑھ کر کیفِ غم کی مثال شاید ہی کہیں ملے اور جب زمانہ کے ہاتھوں سے تنگ آ کر خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ :۔
"ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے" تو مجسّم کیفِ غم معلوم ہوتے ہیں۔

اندازِ بیان کے دوسرے پہلو یعنی کیفِ عشق کو بھی مندرجۂ بالا خصوصیت کی ایک قسم سمجھنا چاہئیے صرف فرق اتنا ہے کہ اس میں حسن و عشق پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا　　پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری　　جی میں یہ کس کا تصوّر آ گیا

لیکن شاید مندرجۂ ذیل اشعار سے بڑھ کر کیفِ عشق کی مثال ممکن نہ ہو سکے۔ دیکھئے اندازِ بیان کیسا پیارا ہے ؎

دل مرا پھر دکھا دیا کس نے　　سو گیا تھا جگا دیا کس نے
میں کہاں اور خیالِ بوسہ کہاں　　مُنہ سے مُنہ یوں بھڑا دیا کس نے
وہ مرے چاہنے کو کیا جانے　　یہ سندیسا سنا دیا کس نے
ہم بھی کچھ دیکھتے سمجھتے تھے　　سب یکایک چھپا دیا کس نے

اور شاید کیفِ عشق میں شکوے کا پہلو لئے ہوئے مثالیں ان اشعار سے بڑھ کر مشکل سے ملیں ؎

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے　　تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے　　آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے حال مرا　　دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

مگر چونکہ زندہ دلی لازمۂ شعر و شاعری ہے اس لئے خواجہ صاحب کے اکثر اشعار ایسے بھی ہیں جن کو پڑھ کر کہتے ہوئے اشعار کہہ سکتے ہیں اور ایک سالک سے زندہ دلی کا اظہار ہونا حیرت انگیز نہیں بلکہ لازمۂ معاشرت ہے۔ شعرائے ایران میں حافظ محض اپنی زندہ دلی کی وجہ سے مشہور ہیں اور یہ رنگ خواجہ صاحب میں بھی ہے مثلاً ؎

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا　　بھڑا دے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

لیکن اس سے بڑھ کر زندہ دلی ذیل کے شعر سے ظاہر ہو گی یعنی ؎

کہا جب میں ترا بوسہ تو جیسے قند ہے پیارے　　لگا تب کہنے پر قند مکرر ہو نہیں سکتا

لیکن اس شعر میں الفاظ "دیکھوں ہوں" نے خواجہ صاحب کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے ؎

کیونکہ گذرے گی بھلا دیکھوں ہوں　　گر اسی طرح سے شرمائیے گا

اور ان اشعار میں شگفتگی کے علاوہ زبان کے کمال کو بھی ظاہر کیا ہے ؎

دو نگاہیں جو چار ہوتی ہیں　　برچھیاں دل کے پار ہوتی ہیں

بے وفائی پہ اُس کی دل مت جا　　ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

نیز یہ شعر ہے ؎

تمہارے وعدے بتاں خوب میں سمجھتا ہوں　　رہا ہے ایسے ہی لوگوں سے کاروبار مجھے

خواجہ صاحب کے کلام کی تیسری خصوصیت زبان ہے۔ زبان سے یہاں مطلب خاص ان کے وقت کی زبان ہے کیونکہ خواجہ صاحب کے کلام میں برج بھاشا کے اکثر الفاظ ہو بہو پائے جاتے ہیں جو اس وقت زبان زد عام تھے مگر اب متروک ہیں۔ ذیل کے اشعار تو ٹھیٹھ ہندی میں ہیں ؎

کیسی تم کو بھاوت ہے اور کیسی تو سکھ پاوت ہر　　یہ پھلواری درد ہیں کچھ اور سمو دکھلاوت ہر

کلیاں من میں سمٹ چیت میں جو پھول کوئی کملاوت ہر　　جو دن واکو بیت گیو ہے وادن مونکو آوت ہر

ایسے اشعار جن سے خواجہ صاحب کے عہد کی اردو ظاہر ہوتی ہے ذیل میں لکھے جاتے ہیں ؎

دو مرے چاہنے کو کیا جانے　　یہ سند لسا سنا دیا کس نے

ترچھی نظروں سے دیکھنا ہر دم　　یہ بھی اِک بانکپن کا بانا ہے

دل تجھے کیوں ہے بیکلی ایسی　　کون دیکھی ہے اچپلی ایسی

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاج دہر　　میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا

پرکھانت ہی رہتا ہے مجھ کو درد کیا کہیئے　　کہ ایسی زندگی سی چیز یونہی مفت جاتی ہے

اسی طرح الفاظ سنگھ، ایدھر، جیدھر، کبھو، ٹک، نت وغیرہ قدیم اردو زبان کا آئینہ ہیں جو میر صاحب اور خواجہ صاحب کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام کی تینوں خصوصیتوں پر اظہارِ خیال کرنے کے بعد ذیل میں اُن کے چند منتخب اشعار بلا تبصرہ کئے لکھے جاتے ہیں تاکہ میر و مرزا کے اشعار کی طرح یہ بھی ادبی فارمولا ہو سکیں ؎

اے درد منبسط ہے ہر سو کمال اُس کا　　نقصان گر تو دیکھے تو ہے قصور تیرا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اکسیر پر ہوس اتنا نہ ناز کرنا　　بہتر ہے کیمیا سے دل کو گداز کرنا

اندازہ وہی سمجھے مرے دل کی آہ کا　　زخمی جو ہو چکا ہو کسی کی نگاہ کا

زلف میں دل کو تو الجھاتے ہو　　پھر اسے آپ ہی سلجھائیے گا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا　　بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے　　اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

اے گُل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں　　گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں　　اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

ان لبوں نے کی نہ مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

گل و گلزار خوش نہیں آتا　　باغ بے یار خوش نہیں آتا ٭ اے جنوں جیب میں ترے ہاتھوں　　ایک بھی تار خوش نہیں آتا

کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور　　اے ستمگار خوش نہیں آتا ٭ دردؔ ہم کو یہ رات دن تیرا　　نالۂ زار خوش نہیں آتا

آخر میں اخلاق سے متعلق چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں شکوہ و شکایت کے ذریعہ سے خواجہ صاحب نے موعظت کی خشکی کو بہت کچھ معتدل کر دیا ہے مثلاً یہ شعر ؎

اے دردؔ کہوں کس سے بتا رازِ محبت　　عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

شاید اہلِ دنیا کے اخلاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہی خواجہ صاحب نے یہ شعر لکھا تھا ؎

واقف نہ یاں کسو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے　　یعنی کہ آ گئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے

ذیل کے دو اشعار کو خواہ معیارِ اخلاق سے دیکھا جائے خواہ محض حسن عشق سمجھا جائے ان کا لطف صاحبِ کیف ہی کو حاصل ہو سکتا ہے

جو ملنا ہو مل پھر کہاں زندگانی　　کہاں میں کہاں تو کہاں نوجوانی
عجب خواب درپیش ہے پھر تو سب کو　　سنا لو کہ اب اپنی اپنی کہانی

خواجہ صاحب کا کلام قدیم خط و خال کی برائے نام کہانی سنانے والے شعرا کے کلام سے صرف اس بات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں بجائے عشوہ و شوخی بجائے یاس و حرماں، اور اربابِ شریعت کی تنقید کے ایک قسم کی تقدیس ظاہر ہے یعنی طرزِ بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ ہر شعر سے اس متبرک ہستی کے دل کی محبت، اس کے اخلاصِ قلب در پردۂ شکوہ و شکایت کا اظہار ہوتا ہے بقولِ جنابِ شررانی خواجہ صاحب اپنے عہد کے اولیائے کبار میں سے تھے۔ اپنی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود میر صاحب نے لکھا ہے کہ "واللہ بذاتِ ہمیں بزرگ است" اور شاید یہ حضرت امام عسکری اور حضرت غوث الصمدانی رضی اللہ عنہم ہی کے فیض کا اثر تھا کہ خواجہ صاحب اردو زبان پر اتنا بڑا احسان کر گئے کہ ان کا ایک دریا امنڈتا ہوا نظر آتا ہے۔

سید مقبول حسین (احمد پوری)

نشاطِ سرمدی

پھر زندگی کا حُسن نظر آزما ہے آج
ہر ذرّہ کیف و رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے آج

رگ رگ میں ہے لہو کے عوض بجلیوں کا رقص
کتنی لطیف جنبشِ موجِ صبا ہے آج

دنیا ہے یا زمیں پہ اتر آئی ہے بہشت
کتنا حسین جلوۂ حسنِ فضا ہے آج

دوڑی ہوئی ہے خاک کے سینے میں رُوحِ ناز
تاریکیوں میں لرزشِ موجِ صبا ہے آج

بکھرے ہوئے ہیں سطح پر اسرارِ زندگی
دل جادۂ آشنائے مقامِ فنا ہے آج

تھم تھم کے آسماں سے برستی ہیں نعمتیں
کافر بھی ہو تو دل میں یقینِ خدا ہے آج

اک وہم ہے کشاکشِ فردا کا اعتبار
یہ اشتباہ صرف یقیں ہو چلا ہے آج

وہ سامنے ہیں حسنِ تبسم ہے گلفروش
دیوار و در پہ نور سا چھایا ہُوا ہے آج

طے ہو چکے مراحلِ ضبط و سکون و صبر
بے چینیوں کی قلب میں پھر ابتدا ہے آج

مہکی ہوئی ہے زلف کی خوشبو سے بزمِ ناز
ہر سانس عطر بیز و طرب آشنا ہے آج

چمکا ہُوا ہے کیفِ رسائی سے رنگِ شوق
ڈوبی ہوئی نشاطِ اثر میں دُعا ہے آج

خم ہو چکا ہے فرطِ محبت سے فرقِ ناز
ہر جنبشِ نظر میں سرودِ وفا ہے آج

وہ شوقِ وصل و شکوۂ جورِ شبِ فراق
مُدّت سے تھا جو دل میں نہاں برملا ہے آج

وہ جلوہ حیات، وہ راہِ ہجومِ درد
برسوں سے تھا جو صبر شکن دلربا ہے آج

ہر نقش دلپذیر ہے۔ ہر رنگ دلفریب
عشرت کی اے ندیم کوئی انتہا ہے آج

اختر خدا کی شان، کہ وہ نوبہارِ ناز!
مجھ سے سیاہ روز کا مہماں ہوا ہے آج

علی اختر (حیدرآباد دکن)

برکھا رُت

سبزہ ہی سبزہ بن میں ہر سُو   جس پہ خراماں سیکڑوں آہو
مست ہوا میں پھولوں کی خوشبو   اس پہ قیامت "پیہو پیہو"
ہائے پپیہے تیرا جادو

گاؤں کے کمسن بھولے بھالے   تیکھی ترچھی چتون والے
کانوں میں پہنے بندے بالے   بال بکھیرے کالے کالے
جھول رہے ہیں جُھولا ڈالے

سر پر ڈالے دھانی آنچل   جھولے پہ بیٹھی ہے اک چنچل
کمسن، الھڑ، اُٹھتی کونپل   مانگ میں سیندور آنکھ میں کاجل
ترچھی نظریں زہر ہلاہل

ندی نالے زور کریں گے   جھینگر سارس شور کریں گے
خوب گھٹا گھنگھور کریں گے   رقص چمن میں مور کریں گے
رو رو عاشق بھور کریں گے

ذوقی

یہ افسانہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ سات بھائیوں اور ان کے عجیب وغریب بہنوئی کا واقعہ سچا ہے اور میں نے کسی اخبار میں دیکھا تھا چنانچہ اس واقعہ کے پیش نظر یہ افسانہ میں نے غازی عبدالکریم کی جنگ سے متاثر ہو کر لکھا۔ افسانہ کا آخری پیراگراف خیالی ہے۔

سمندر کے کنارے دور تک فوجی کیمپ چلا گیا تھا۔ جگہ جگہ پختہ بارکیں اور عمارتیں بنی ہوئی تھیں اور پھر موقع بہ موقع خیمے بھی نصب تھے۔ کچھ فاصلے پر ہسپانیہ کے چند جنگی جہاز لنگر انداز تھے اور سمندر کے کنارے کی چہل پہل بتا رہی تھی کہ عنقریب سرزمینِ مراقش میں کیا کچھ ہونے والا ہے ـــــــ وہی کچھ جو ہم سب نے آخر دیکھ لیا اور سن لیا کہ کس طرح غازی عبدالکریم نے ہسپانیہ کے بہادروں کو اپنے مٹھی بھر جانبازوں کی امداد سے پے در پے شکستیں دیں۔

جنگ وجدال کا ایک طرح کوئی احتمال نہ تھا کیونکہ اس کے لئے بظاہر کوئی وجہ نہ تھی لیکن پردے ہی پردے میں ہسپانیہ کی خودسرانہ حکمتِ عملی سے رعایا تنگ آ چکی تھی اور کوئی گل کھلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال بعد جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔

(۱)

عبداللہ بن علی ریف کا ایک غریب مزدور تھا جو سمندر کے کنارے کی بستیوں میں محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالنے آیا تھا۔ اُس نے اس سے قبل ہسپانوی سپاہیوں کا نام تو سنا تھا مگر انہیں دیکھا نہ تھا۔ وہ اب تک اُن آداب سے ناواقف تھا جو ریف کے ایک معمولی باشندے کو ہسپانیہ کے سپاہیوں اور افسروں کے ساتھ ملحوظ رکھنے چاہئیں تھے۔ اگر وہ ایک غریب مگر مضبوط اور طاقتور پہاڑی تھا تو ساتھ ہی اپنے سینہ میں ایک مضبوط دل بھی رکھتا تھا۔ اس کا قوی دل اور اُس کی ہمت دراصل غرناطہ کے سورماؤں کی یادگار تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ڈیوک آف میڈینا سڈونیا کی فوج اور افسر سمندر کے کنارے پر اترے ہوئے ہیں۔ اور نہ اسے یہ معلوم تھا کہ یہ اُسی میڈینا سڈونیا کے ڈیوک ہیں جس میڈینا سڈونیا کے میدانِ جنگ پر اُس کے آبا و اجداد نے ڈیوک موصوف کے آبا و اجداد کو شکست دے کر قدیم ہسپانیہ کی عظمت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

عبداللہ کو ساحل کی چھاؤنیوں کی بستیاں بھی پیرس و لندن سے کم نہ معلوم ہوتی تھیں کیونکہ یہاں کی تمام چیزیں اس کے لئے نئی تھیں۔ اس قسم کے مقام پر تمام گرد و پیش کی چیزیں عموماً ایک اجنبی پر رعب طاری کر دیتی ہیں مگر شاید یہ معلوم کر کے ناظرین کو تعجب ہو کہ ریف والوں کے پہلو میں اور قسم کا دل ہوتا ہے۔

عبداللہ ایک مختصر سے بازار میں کھڑا تھا جب اُس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک فوجی افسر پورے طمطراق کے ساتھ آرہا ہے۔ اس کی جلو میں بہت سے آدمی تھے اور آگے آگے فوجی چپراسی تھے۔ اُس کو معلوم بھی نہ تھا کہ ایسے موقع پر ایک ریفی کا فرض یہ ہے کہ وہ سامنے سے ہٹ جائے اور سڑک کے کنارے مودّب کھڑا رہے۔

وہ اس افسر اور اس کے ساتھیوں کو حقارت آمیز تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑا رہا حتیٰ کہ فوجی چپراسی اس کے قریب آ گئے۔ فوجی چپراسی نے عبداللہ کی گستاخی پر برافروختہ ہو کر نہایت ہی بدتمیزی سے اس کو دھکا دیا۔ عبداللہ کو طیش آ گیا اور اس نے چپراسی پر حملہ کرنا چاہا کہ اچانک اس کی پشت پر ایک رائفل کا کندا پڑا۔ بل کھا کر اُس نے مڑ کر دیکھا کہ ایک یورپین سپاہی نے اس کو مارا ہے۔ طیش میں آ کر اُس نے صاحب بہادر کی کنپٹی پر اس زور سے مکا مارا کہ وہ زمین پر دراز ہو گئے۔ قبل اس کے کہ وہ بھاگ سکے چار پانچ آدمیوں نے جھپٹ کر اُس کو دبا لیا اور لاتیں اور ٹھوکریں اور رائفل کے کندے مار مار کر اُس کو بے حال کر دیا۔

دنیا کے قوانین جُدا ہیں اور وہ قوانین جدا ہیں جن کا اجرا ہسپانوی فوج غریب ریف والوں پر کرتی ہے اگر کوئی ریف والا ہسپانوی فوجی سپاہی یا افسر کی توہین کرے تو کم از کم سزا جو دی جا سکتی ہے وہ سزائے موت ہے

عبداللہ کو جب فوجی حوالات سے نکالا گیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ عمارت سے باہر سنتری کے ساتھ آ رہا تھا کہ اس کے کانوں تک کچھ خوفناک الفاظ پہنچے۔ اس نے پورا جملہ نہ سُنا مگر لفظ "قتل" صاف سُنا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے اور ایک دم سے حقیقت اس کو معلوم ہو گئی . . . . . .

وہ قتل کرنے کے لئے اس کو کہیں لے جا رہے تھے! بجائے ناامید اور مایوس ہونے کے اُس کو سخت غصہ آیا۔ اُس کی آنکھیں غیظ و غضب کے مارے سُرخ ہو گئیں اور وہ سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ جیسے ہی وہ پھاٹک کے باہر نکلا اس نے ایک ہسپانوی سوار کو پہرہ پر متعین پایا۔ چشم زدن میں اس نے کچھ طے کر لیا۔ بڑھ کر اُس نے ایک دوہتڑ ہسپانوی کے سر پر دیا جو اس کو گویا کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ اس سنتری کے سر پر دونوں ہتھکڑیاں پوری طاقت سے ایسی پڑیں کہ وہ گر پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھل سکے اُس نے لپک کر ہسپانوی پہرہ دار سوار کو ٹانگ سے پکڑ کر گھوڑے پر سے لوٹ دیا۔ گھوڑے کی زین پکڑ کر ایک زقند مار کر سوار ہو جانا ایک چشم زدن کا کام تھا۔ وہی ہتھکڑی کا ایک ہاتھ اُس نے گھوڑے پر مارا اور گھوڑا بے تحاشا لے کر اُس کو بھاگا۔

فوجی بارکوں سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ مگر جس کو اللہ رکھے اُس کو کون چکھے۔ گھوڑے کا رُخ اُس نے

پہاڑوں کی طرف کردیا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ سیاہی اُجالے پر غالب آتی جاتی تھی اور جس وقت فوجی رسالے کے جوان پہاڑیوں کے دامن میں پہونچے سورج ڈوب چکا تھا اور عبداللہ کا پتہ تک نہ چلتا تھا

(۲)

عبداللہ جب پہاڑیوں کا پہلا سلسلہ پار کر گیا تو اس کو اطمینان ہُوا۔ ہتھکڑی توڑنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ رات بھر چلتا رہا کہ مبادا کوئی دشمن آ پہونچے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کو معلوم تھا کہ کوئی دوراندیش شخص فوجی دستہ نہیں لائے گا۔ یہاں پہنچ کر خودبخود اس کی زبان سے اپنی فرضی محبوبہ (جس کا کہیں کے دل تک میں بھی وجود نہ تھا) کی شان میں اشعار نکلنے لگے۔

اس نے آبادی میں پہنچ کر ایک لوہار سے اپنی ہتھکڑیاں کٹوائیں۔ اب جو اُس نے غور کیا تو مارے خوشی کے اُس کا کلیجہ کھنچا جا رہا تھا۔ کیا وہ بہترین سودا کر کے نہیں آرہا تھا؟ تھوڑی بہت مار کے عوض میں ایک قیمتی گھوڑا مع زین اور دیگر سامان کے . . . . وہ اب ایک طرح سے رئیس آدمی تھا۔

دو پہاڑوں کے بیچ میں اونچی نیچی زمین پر دو چار جھونپڑیاں تھیں اور یہی کل آبادی تھی جہاں وہ آیا تھا سامنے اُس نے دیکھا کہ ایک پہاڑ کی ٹیکری پر عمدہ سا مکان ہے جس کے ارد گرد نشیب میں دور تک کھیت چلے گئے ہیں وہ آگے بڑھا اور اس نے دیکھا کہ آدمی غلّہ کاٹکر جمع کر رہے ہیں۔ وہ تیزی سے اُسی طرف بڑھا کیونکہ لوہار نے تو جواب دے ہی دیا تھا کہ میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور اس کو امید اب اسی طرف سے تھی۔ وہ بہت بھوکا تھا اور پہلا آدمی جو اسے ملا اس سے اس نے کہا "میں بھوکا ہوں" اس نے جواب میں کچھ فاصلہ پر ایک شخص کی طرف انگلی اٹھا دی۔ یہ شخص ایک درخت کے سایہ میں زمین پر چٹائی بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس اس کی رائفل رکھی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کھیتوں کا مالک یہی ہے۔ عبداللہ نے اس کے پاس پہنچ کر سلام کے بعد اپنا سوال دُہرایا۔

اس نے جواب دیا "اترو اور اطمینان سے بیٹھو"۔ عبداللہ یہ کہتا ہُوا کہ میں بہت بھوکا ہوں گھوڑے پر سے اُترا اور اُس کو درخت سے باندھ دیا۔ اس شخص نے زور سے آواز دی "صالحہ۔ صالحہ" اور سامنے کی بلندی پر مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ آواز سن کر عبداللہ نے دیکھا کہ ایک حسین اور نوجوان لڑکی دوڑی آرہی ہے۔ وہ بلندی سے پتھریلے اور اونچے نیچے راستہ پر سے ایسی تیزی سے اتر رہی تھی کہ جیسے کوئی ہموار راستہ پر سے آرہا ہو۔ یہ اُس شخص کی بہن تھی اس نے عبداللہ کی طرف اشارہ کر کے اُس کے لئے کچھ کھانا لانے کو کہا۔ اُس نے عبداللہ کی طرف غور سے دیکھا اور اسی مکان کی طرف چلی گئی۔

عبداللہ کا بھوک کے مارے بُرا حال تھا تمام رات اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر گذاری تھی۔ کھانا نہ ہوتا تو ممکن ہے وہ اپنی بے تابی ظاہر نہ ہونے دیتا۔ مگر کھانے کی موجودگی اور پھر دیر!. . . . . . یہ اُسے مارے ڈال رہی تھی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ کسی جگہ آگ لگی تھی۔ وہاں اور لوگوں کے علاوہ کوئی بھوکے صاحب بھی تھے مضمون یہ ہؤا

لے ع ے رکابی یہ دوڑے کھانے کو اور دوڑے اُسے بجھانے کو

مختصر لڑکی کو جب غیر معمولی دیر ہوئی اور تین چار تقاضے بھوک کے اور عبداللہ نے کر لئے اور لڑکی پھر بھی نہ آئی تو اس شخص نے مسکرا کر کہا "جاؤ گھر پر ہی کھا آؤ"

عبداللہ اصلی بھوکے کی طرح گھر پر پہنچا۔ لڑکی کھانا لے کر نکل ہی رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر رُک گئی اور مُسکرا کر بولی بہت بھوکا معلوم ہوتا ہے۔ عبداللہ نے کھانے کی صورت دیکھ کر بے تاب ہو کر کہا "بہت بھوکا ہوں"

جَو کی روٹیاں تھیں۔ تھوڑا سا پنیر تھا اور پیاز۔ عبداللہ اس کھانے پر بدحواس ہو کر گرا۔ وہ کھانا کھانے میں اس طرح مشغول تھا کہ اُس کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی بدحواسی کو لڑکی دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔ جب کھانا ختم ہونے لگا تو عبداللہ نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور لڑکی سے پوچھا "تو کیوں ہنستی ہے؟"

لڑکی نے کہا "میں نے اتنا بھوکا آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ شاید تو اور کھانا کھائے گا"

عبداللہ نے آخری لقمہ سنبھالتے ہوئے کہا "ہاں۔ اور لا"

لڑکی اٹھی اور اس نے اتنی ہی مقدار کھانے کی عبداللہ کے سامنے اور لا کر رکھ دی۔ عبداللہ کی بدحواسی کچھ دور ہو گئی تھی اور اب وہ باتیں کرتا جاتا تھا اور کھاتا جاتا تھا۔

اس کو معلوم ہؤا کہ اس گھر کے مالک سات بھائی ہیں جن کی یہ اکیلی بہن ہے۔ وہ شخص جو درخت کے نیچے بیٹھا تھا سب سے بڑا بھائی تھا۔ دوسرے بھائی آس پاس کے کھیتوں میں کام دیکھ رہے تھے اور خود بھی کر رہے تھے۔ باقی دو سے تھے۔ مزدوروں کی اکثر ضرورت رہتی ہے۔ وہ سب بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ شاید عبداللہ کو بھی مزدوری مل گئی تھی۔

عبداللہ نے اپنا قصہ بھی شروع سے اخیر تک تفصیل کے ساتھ سنایا۔ لڑکی کو سخت تعجب ہؤا اور اُس نے عبداللہ کو تعریف کی نظر سے دیکھا۔ قصہ بیان کرنے میں عبداللہ کا سینہ دب دب کر اُبھر رہا تھا کیونکہ دورانِ گفتگو میں اپنے دشمنوں کے ذکر کے ساتھ اس کو غصہ بھی آتا تھا۔

یہ لڑکی عبداللہ کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اُس سے پہلے سیکڑوں لڑکیاں دیکھی تھیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ روپیہ پیسہ والی اور شکل صورت والی مگر اس نظر سے اُس نے کبھی کسی کو نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی اس سے پیشتر کوئی لڑکی اس کو ایسی اچھی معلوم ہوتی جیسی یہ۔ لہذا جب لڑکی نے اس کا قصہ سننے کے بعد کہا "تو بڑا بہادر اور ہمت والا ہے" تو لڑکھڑاتی زبان سے رُک رُک کر عبداللہ نے بھی کہہ دیا "تو بڑی اچھی لڑکی ہے"۔ لڑکی نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور عبداللہ نے اپنے کو کچھ بے چین سا پایا۔

عبداللہ کو وہ گھر ہی پر چھوڑ کر اپنے بھائیوں کے پاس چلی گئی کیونکہ عبداللہ کو بے حد نیند آرہی تھی۔ وہ ایسا بے خبر سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

دوپہر ہونے آئی اور لڑکی اس دوران میں دو مرتبہ اس کو دیکھنے آئی کیونکہ بھائی نے بار بار بھیجا کہ دیکھ آؤ کہ سوتا ہے کہ جاگتا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ عبداللہ رات بھر کا جاگا ہے اور اس نے بھائی سے کہا نہ تھا۔ وہ ایک مرتبہ آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ عبداللہ چت لیٹا ہے۔ ایک ہاتھ اس کا اس کے سینہ پر ہے اور وہ سوتے میں کچھ لفظ چبا چبا کر بول رہا ہے۔ اس کو کچھ شبہ سا ہوا اور وہ قریب آئی تا کہ سُن سکے۔ اس کا شبہ یقین کو پہنچ گیا کیونکہ اس نے سن لیا عبداللہ کہہ رہا تھا "یا صالحہ۔ صالحہ۔ یا صالحہ" وہ چپ ہو جاتا تھا اور پھر اسی طرح کہتا تھا اور دوران خاموشی میں جو اُس کے چہرہ کی حالت تھی وہ نہ معلوم کیا تھی مگر ایسی تھی کہ سادہ لوح صالحہ بھی شاید سمجھ گئی کہ اس کے بے خبر سونے والے کے چوڑے چکلے سینہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ واپس جانے والی ہی تھی۔ کہ صالحہ۔ صالحہ کہتے کہتے وہ ایک دم سے "یا صالحہ" زور سے کہہ کر چونک پڑا۔ اس کی آنکھیں صالحہ پر جو پڑیں وہ اچھل پڑا۔ گھبرا کر وہ آنکھیں ملنے لگا۔ صالحہ شرمندہ ہو کر یہ کہہ کر چلی گئی کہ بھائی نے بلایا ہے۔

(۳)

عبداللہ محنتی ہی نہیں تھا بلکہ کام کرنے میں گویا جن تھا۔ اُسے کام بتا دینا کافی تھا اور وہ یہ نہیں دیکھتا تھا کہ کام کا وقت گذر گیا اور اب اگر وہ کام کرے گا تو اُس کی مزدوری کسی طرف بھی شمار نہ ہوگی۔ وہ کام کام کے لئے کرتا تھا نہ کہ دام کے واسطے۔ حالانکہ اُس کو کام کرتے پندرہ بیس ہی دن ہوئے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سات بھائی نہیں ہیں بلکہ آٹھواں عبداللہ بھی ہے۔

اس تن دہی سے کام کرنے کے ساتھ ہی ساتھ عبداللہ کی طبیعت کا میلان صالحہ کی طرف بھی بڑھتا جاتا تھا۔ وہ جانتا بھی نہ تھا کہ عشق یا محبت کیا چیز ہے اور یہی حال صالحہ کا تھا مگر عبداللہ خواہ مخواہ اپنے کو صالحہ سے کام کی ہی باتوں میں دلچسپی لیتے پاتا تھا۔ ایک روز اُس نے بغیر تمہید یا تکلف کے صالحہ سے کہہ دیا کہ میں تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ سوائے کام کی باتوں کے کبھی اس نے صالحہ سے کوئی بات ہی نہ کی تھی۔ مگر پھر رجحان طبع ایسی چیز نہیں کہ چھپائے سے چھپ سکے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ صالحہ کے بھائیوں نے تاڑ لیا۔ چونکہ عبداللہ اپنی عسرت کی وجہ سے اُن کو نامناسب معلوم ہوتا تھا اور وہ عبداللہ سے خوش تھے اور اس کی دل شکنی بھی نہ کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے بہتر خیال کیا کہ اس معاملہ کو یہیں کا یہیں روک دینا مناسب ہے۔ بڑے بھائی نے پہلے تو صالحہ کو بلایا اور حال دریافت کیا جن کے دل صاف ہیں اور ٹھیک ہیں ان کے دل میں کوئی وجہ نہیں کہ چور ہو۔ چنانچہ صالحہ نے بھائیوں سے صاف کہہ دیا کہ مجھ سے ایک مرتبہ عبداللہ نے نکاح کے لئے کہا تھا جس کا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ علاوہ اس کے اُس نے کبھی مجھ سے کوئی غیر معمولی بات بھی

نہیں کی بڑے بھائی نے بہن کو گلے سے لگا کر کہا "اب تم عبداللہ سے بات نہ کرنا۔ وہ اچھا آدمی ہے مگر مزدور اور مفلس ہے۔" صالحہ کے دل میں بھائی کی زبان سے عبداللہ کے بارے میں لفظ "اچھا" جو نکلا وہ گڑ کر رہ گیا۔ نہ معلوم کیوں یہ قدرتی امر ہے کہ اگر کسی کے بارے میں میرا خیال ہو جائے کہ اچھا آدمی ہے اور کوئی اس کی تصدیق کرے تو طبیعت کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہی حال صالحہ کا تھا؟ . . . . . شاید اس کے بعد اس نے عبداللہ کو بلا کر علیحدہ منع کر دیا کہ صالحہ کے عقد کا خیال چھوڑ دے۔ یلف ہندوستان نہیں ہے اور وہاں جھوٹے بھی کم ہوتے ہیں۔ عبداللہ چونکہ اس خیال کو چھوڑنے والا نہ تھا اس لئے کوئی وجہ اس کو نہ معلوم ہوئی کہ خواہ مخواہ وہ اس کا خیال چھوڑ دینے کا اقرار کرے۔ وہ مناسب پیرایہ میں حجت اور بحث کرنے لگا۔ تنگ آ کر بڑے بھائی نے تیز ہو کر عبداللہ سے پوچھا "تو عقد کیسے کرنا چاہتا ہے۔ کیا تیرے پاس مکان ہے؟"

عبداللہ نے کہا "نہیں"۔

"مویشی ہیں؟"

"ایک گھوڑا ہے جو میں زمین کے مہر میں دوں گا"

طعنہ دے کر "وہ بھی چرایا ہوا"

عبداللہ تن کر بولا "بندے ہاتھوں سے چوری نہیں ہوتی۔ میں اپنے زورِ بازو سے لایا ہوں"۔

"علاوہ گھوڑے کے کچھ زمین تیرے پاس ہے یا نہیں؟"

"نہیں"

"علاوہ تن پر کے کپڑوں کے اور بھی نہیں؟"

"نہیں"۔

بھائی نے جل کر کہا "تو پھر آخر تیرے پاس ہے کیا؟ جو تو میری خوبصورت بہن کی قسمت پھوڑنا چاہتا ہے تیرے پاس رائفل تک نہیں ہے"

عبداللہ نے کہا "اس سے تمہیں کیا مطلب وہ قطعی مجھ سے راضی ہے اور میں اس کو آرام سے رکھوں گا"

"وہ نادان ہے" بھائی نے کہا "وہ ابھی کم عمر ہے" "اپنا بھلا برا نہیں جانتی۔ یا تو تو وعدہ کر کہ اب اس سے بات نہ کرے گا اور عقد کے خیال کو چھوڑ دے گا ورنہ یہاں سے دور ہو"

"میں جاتا ہوں۔ مگر اچھی طرح سمجھ لو کہ میں عقد کے خیال کو ترک نہیں کر سکتا" یہ عبداللہ کا قطعی جواب تھا بھائی نے ایک طنزیہ "ہوں" سے کام لیا۔ عبداللہ نے اپنی بقایا مزدوری بھی نہ مانگی۔ اور وہاں سے چل دیا۔

(۴)

عبداللہ کو مفت میں گھوڑا کیا ملا کہ شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ اسے اپنی فلاح اسی میں معلوم ہوئی کہ ہسپانیوں

کو مارو اور لوٹو یہ دشمن دین ہیں اور ان کا مال حلال ہے۔ دو چار ہم خیال بہت ہی جلد مل گئے اور ہسپانی کیمپ میں شبخون مارنا ان کا معزز پیشہ ہوگیا۔ بہت جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ بڑی عمدہ تجارت ہے۔ کچھ اور ساتھی مل گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے انہیں سب کچھ دے دیا۔ عمدہ عمدہ رائفلیں کارتوس سامانِ حرب عمدہ عمدہ کپڑے اور روپیہ پیسہ سب ہی کچھ ہوگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں ایک باحیثیت سردار ہوں تو وہ نہایت ہی شان سے صالحہ کے بھائیوں کے یہاں پہنچا۔ مگر بھائیوں نے پھر بھی انکار کر دیا اور کہا کہ ہم صالحہ کی شادی ایک رئیس شیخ سے طے کر رہے ہیں۔ عبداللہ بھائیوں کے لئے کچھ تحفے لایا تھا جو انہوں نے قبول نہ کئے مگر انہوں نے کہا کہ کم از کم کھانا کھا کر جانا۔ عبداللہ شام تک وہاں رہا۔ اور اس اثنا میں خوش قسمتی سے اس کو صالحہ سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ عبداللہ نے صرف اس سے اتنا پوچھا "شیخ اچھا ہے یا میں"؟ صالحہ نے کہا "تو اچھا ہے"۔

یہ الفاظ بمشکل صالحہ کے زبان سے نکلے تھے کہ منجھلا بھائی رائفل لے کر غلہ کے انبار کے پیچھے سے نکلا۔ اس نے عبداللہ کو ڈانٹا تو عبداللہ نے بھی تیز ہو کر کہا "مجھ سے زیادہ اچھی طرح تیری بہن کو دنیا میں کوئی نہیں رکھ سکتا" اس کا جواب بھائی نے کچھ نہ دیا۔ صالحہ کا ہاتھ پکڑ کر اس نے گھسیٹا اور بڑے بھائی کے پاس لے گیا۔ صالحہ کو بڑے بھائی نے بھی ڈانٹا اور بطور سزا یا حفاظت کے اس کو غلہ کی ایک چوڑی مگر گہری کھتی میں قید کر دیا جو کھیتوں میں ایک اونچے مقام پہ تھی اس کے بعد عبداللہ سے بھائیوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ "تم اب یہاں سے قطعی چلے جاؤ ورنہ وعدہ کرو کہ صالحہ سے عقد کا خیال چھوڑ دو گے" عبداللہ نے کہا "یہ ناممکن ہے۔ تو انہوں نے کہا "تو پھر چلے جاؤ ورنہ اگر کھیتوں کے آس پاس ہم نے دیکھ پایا تو گولی مار دیں گے۔ عبداللہ چلا گیا۔

وہاں سے تو وہ چلا گیا مگر اب اُس کے پاس روپیہ تھا اور اس نے بآسانی ایک مزدور سے معلوم کر لیا کہ صالحہ صبح سے شام تک دو چار روز کے لئے اُسی غلہ کی کھتی میں قید رہے گی کیونکہ انہیں احتمال تھا کہ شاید عبداللہ آس پاس ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کھتی پر کوئی ڈھکنا نہیں۔ مگر نیچی ہونے کی وجہ سے صالحہ بغیر سیڑھی کے اوپر نہ آسکتی تھی۔ اتنا پتہ کافی تھا۔

عبداللہ تاک میں تھا دو تین روز بعد موقع پا کر جھٹپٹے شام کے وقت جب تمام مزدور وغیرہ بھائیوں سے مزدوری لینے میں مصروف تھے وہ اس کھتی پر پہنچا۔ رسی ڈال کر اس نے صالحہ سے پکڑنے کو کہا۔ صالحہ نے تامل کیا اور رسی کی طرف توجہ نہ کی تو اُس نے رائفل نکال کر کہا کہ "تیرے گولی مار کر ابھی اپنے بھی مار لوں گا" صالحہ کو کسی طرح منظور نہ تھا کہ اپنے بھائیوں کی مرضی کے خلاف جائے اور اس نے اس دھمکی کی پروا نہ کی تو عبداللہ نے سچ مچ رائفل مارنے کے لئے سیدھی کی۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اُس نے رسی پکڑ لی نہ اس وجہ سے کہ اس کو اپنی جان پیاری تھی بلکہ اسے عبداللہ کی جان کا بھی خیال تھا جس کو وہ اپنی وجہ سے خودکشی کرانا ہرگز نہ چاہتی تھی۔

صالحہ کو عبداللہ نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے چشم زدن میں اوپر لے لیا کیونکہ کھنٹی زیادہ گہری نہ تھی۔ اس کو گھوڑے پر بٹھا کر اس نے سیدھا ان پہاڑوں کی طرف رُخ کیا جن کا سلسلہ دور سمندر کے کنارے تک چلا گیا تھا۔

عبداللہ کو زیادہ وقفہ نہ مل سکا۔ بھائیوں کو معلوم ہو گیا۔ پہاڑوں کے رہنے والے، وہ خوب جانتے تھے کہ عبداللہ کس طرف جا سکتا ہے۔ بھائیوں نے اپنے تیز گھوڑے دوڑا دئے اور عبداللہ کو اندھیرے ہی میں پہاڑ کے دامن میں جا لیا۔ فوراً گولی چلنے لگی۔ اندھیرا بالکل نہ ہوا تھا اور عبداللہ نے اپنے دشمنوں کو دیکھا۔ دو رُکا اور جو سب سے آگے تھا اُس کی طرف رائفل اٹھا کر فیر کیا۔ صالحہ سے اس نے کہا تھا کہ گولی گھوڑے کے ماروں گا۔ اور گھوڑے ہی کے لگی۔ مگر وہاں تو اب بھی آدھی درجن تھے۔ چشم زدن میں عبداللہ نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں میں گھر اجا رہا ہوں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ اتنے میں ایک گولی اس کے گھوڑے کے لگی اور وہ مع صالحہ کے گرا۔ مزدور آدمی تھا صالحہ کو بوجھ کی طرح اُس نے اپنے طاقتور ہاتھوں سے سنبھالا اور گھوڑا چھوڑ پہاڑ کی طرف بھاگا۔ اب اندھیرا ہو گیا تھا جس سے اُس نے فائدہ اٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی سنگلاخ زمین میں جو پہاڑیوں تک چلی گئی تھی صالحہ کو لے کر ایسا غائب ہوا کہ بھائیوں نے بہت کچھ ڈھونڈا مگر نشان تک نہ پایا۔ صالحہ کی حالت عجیب تھی وہ ایک مردہ کی طرح تھی۔ صالحہ کے بھائی اپنی بہن کو ایسے بھلا کاہے کو چھوڑ دیتے وہ تلاش میں مشغول ہو گئے۔ اب وہ بھی پیدل تھے۔ وہ بھائی جس کا گھوڑا مارا گیا تھا گھوڑوں کو ایک جگہ لے کر بیٹھ گیا اور بقیہ نے پہاڑ کی گھاٹیاں اور جھاڑیاں دیکھنا شروع کیں۔

(۵)

عبداللہ صالحہ کو لئے ہوئے ایک ٹیکری پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایسی ایسی سینکڑوں ہی ٹیکریاں تھیں۔ تارے نکلے ہوئے تھے اور ایک سناٹے کا عالم تھا۔ عبداللہ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ چاروں طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ فاصلہ پر دھندلکے میں اس کو کچھ نظر آیا تو اُس نے فوراً رائفل اٹھایا۔ "مت مارو" بدقسمت بہن نے گڑگڑا کر کہا "مت مارو" اور عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عبداللہ نے اس کو بچوں کی طرح لٹا کر خاموش کر دیا۔ رائفل کی آواز پہاڑوں میں گونجتی ہوئی سمندر تک چلی گئی اور عبداللہ کے منہ سے نکلا "وہ مارا" صالحہ بیشتر ہی سے ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رائفل کی آواز پر بقیہ بھائی آئیں گے لہٰذا فوراً اس نے صالحہ کو ساتھ لیا اور تیزی سے ٹیکری پر سے اتر کر پہاڑیوں کا دوسرا سلسلہ پکڑ لیا اسے بھی اس نے پار کیا اور نکل کر صاف میدان میں پہنچا۔ اس نے تیزی سے یہ حصہ پار کیا اور پہاڑیوں کا تیسرا سلسلہ پکڑ لیا جن کو اُس نے بڑی دشواری مگر تیزی سے پار کیا۔ لیکن صالحہ کے بھائی عبداللہ سے بھی چالاک نکلے۔ بجائے اس کے کہ وہ رائفل کی آواز پر جاتے وہ جان گئے کہ وہاں سے عبداللہ سرک گیا ہوگا۔ کہاں جائے گا؟ یہ وہ خوب جانتے تھے کیونکہ آگے کے دونوں پہاڑی سلسلے چھپنے کے کام کے ہی نہ تھے۔ فوراً انہوں نے تیزی سے راستہ کاٹ کر ایسا رُخ کیا کہ عبداللہ پہاڑی پار نہ کرنے پائے۔ عبداللہ نے مشکل سے دم لیا تھا کہ اس نے فاصلہ پر آسمان کی صاف وشفاف نیلگوں سطح میں متحرک چیزیں دیکھیں

جو ایک پہاڑ کی چوٹی پر تقیں۔ وہ بھائیوں کی تیزی اور چالاکی کا قائل ہوگیا کیونکہ وہ اب تیزی سے اتر کر نیچے سامنے سے اُسے گھیرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ وہ تیزی سے صالحہ کو لے کر نیچے اترا تو اس نے ایک بڑی سرنگ کا دہانہ دیکھا۔ یہ راستہ ہسپانوی گورنمنٹ پہاڑ کاٹ کر نکال رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس میں گھس کر پار نکل جاؤں کیونکہ اس کے سوا کوئی مفر ہی نہ تھا۔ اُس نے یہی کیا اور تیزی سے اُس پار نکل گیا۔ کچھ فاصلہ پر سمندر کی جانب اس کو روشنی نظر پڑی۔ جس کو وہ خود بچانا چاہتا تھا۔ وہ بائیں طرف مڑا اور تیزی سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ چار پانچ آدمیوں نے بے خبری میں اس کو اس طرح پیچھے سے آ لیا کہ وہ گرفتار ہوگیا۔ یہ لوگ ہسپانی تھے اور مزدور معلوم ہوتے تھے۔ شاید سرنگ پر کام کرنے والے تھے عبد اللہ کو تن بہ تقدیر ان کے اشارے پر چلنا پڑا کیونکہ اس کی گردن پر ایک پستول کی نالی رکھی ہوئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ انگلی کے ایک اشارے سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

عبد اللہ اور صالحہ کو یہ لوگ اسی روشنی کی طرف لے گئے۔ ایک سیاہ دروازہ کے مکان میں عبد اللہ کو ایک آدمی کے سامنے پیش کیا گیا جو کرسی پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا گو عبد اللہ کے ہاتھ پیر آزاد تھے لیکن دونوں بازو دونوں آدمی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے ہسپانوی زبان میں ان لوگوں نے کچھ باتیں کیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ صالحہ کو کسی دوسری جگہ علیحدہ لے جانے لگے۔ صالحہ نے زور لگایا اور اس طرح اپنے کو بچانے کی کوشش کی کہ تین آدمی اس کو کھینچ گھسیٹ کر بمشکل تمام لے جاسکے وہ عبد اللہ کو مدد کے لئے پکار رہی تھی مگر عبد اللہ جانتا تھا کہ ایسے موقع پر امداد کی کوشش کرنا دراصل ہمیشہ کے لئے امداد کی توقع کھونا ہے لہذا وہ چپ رہا گو وہ اسی طرح کھڑا تھا لیکن اب اس کی حالت ہی دوسری تھی۔ یکایک اُس کو خیال آیا کہ صالحہ مجھ پر بھروسا کر کے آئی تھی اور ان ناشائستہ لوگوں کے سامنے وہ فریاد کر رہی تھی اور مجھ سے مدد مانگ رہی تھی وہ خوب جانتا تھا کہ صالحہ کو کیوں وہ علیحدہ لے گئے ہیں۔ اس کے دل میں ایک چوٹ سی لگی تھی اور معاً خیال گذرا کہ کہیں میری امداد بے وقت ہو کر بیکار نہ جائے۔ وقت تھا تو یہی تھا۔ وقت پر مدد نہ کی تو بیکار ہے اور وقت پر مدد کرنے کے لئے اگر جان دے دی تو صالحہ کو لاکر ظالموں کے پنجوں میں پھنسا دینے کا کفارہ۔ یا اب یا کبھی نہیں۔ یہ سوچ کر اس نے دیکھا تو یہاں اب صرف تین آدمی تھے دو تو اس کو پکڑے تھے اور ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے دل میں کہا دو کے لئے تو میں کافی ہوں کہ اتنے میں اُس کو بھی کہیں لے جانے کے لئے موڑنے لگے۔ چشم زدن میں اس نے جھٹکا دے کر غوطہ مارا۔ پستول کے فائر کی آواز ہوئی۔ گولی اس کے گلے کو چاٹتی ہوئی چلی گئی اور قسمت کی خوبی کہ سامنے کرسی والے آدمی کے لگی جو وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اُٹھتے اُٹھتے عبد اللہ نے دشمن کا پستول والا ہاتھ پکڑ لیا اور پستول چھین کر بجائے اس کے کہ استعمال کرتا اس نے جیب میں رکھ لیا کیونکہ وہ فیر کر کے دوسروں کو اس طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا قبل اس کے کہ اس کے دشمن کوئی کارروائی کر سکیں عبد اللہ نے دونوں کو گرا کر دبا لیا اور دونوں کے سر لڑا لڑا دئے اور ایک خنجر سے جو اُس کے پاس تھا دونوں کو ذبح کر کے رکھ دیا۔

یہ لوگ جو صالحہ کو پکڑ کر دوسری جگہ لے گئے تھے ہسپانی مزدور تھے آوارہ بدچلن اور بزدل جس نیت سے صالحہ کو

علیحدہ رہ گئے تھے وہ خوب جانتی تھی۔ فی الحال انہوں نے صالحہ کو بالکل ایک ویسی ہی کھتی میں ڈال دیا جیسی کہ اُس کے کھیت پر تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ جو کوٹھا رنجتہ تھی اور اس کے اوپر لکڑی کا ایک بھاری تختہ رکھا تھا۔ یہ تینوں شیطان کسی دوسری جگہ سے شراب پینے گئے تھے۔

صالحہ نے جب اندر اپنے کو مقید پایا تو ادھر ادھر دیکھا۔ ایک لمبی سی بنچ اور ایک میز رکھی ہوئی پائی۔ فوراً اس کی سمجھ میں ایک تدبیر آگئی۔ میز پر اُس نے بنچ رکھی اور اس طرح بنچ کی اُس نے ایک خطرناک سیڑھی بنائی۔ اس پر چڑھنا کچھ آسان نہ تھا۔ مگر وہ کامیابی سے ڈگمگاتی ہوئی اوپر تک پہنچ گئی۔ اوپر کے کنارے کو ہاتھوں سے پکڑ کر اس نے بیٹھ کا زور لگا کر تختہ کو اٹھا کر سر باہر نکالا اور رینگ کر باہر نکل آئی۔ چاروں طرف سناٹا تھا وہ ادھر ادھر گھومی۔ جس دروازے سے وہ لائی گئی تھی اس طرف تو وہ جانا نہ چاہتی تھی۔ دوسرے راستے کو تلاش کرنے لگی۔ ایک دوسرا دروازہ اسے نظر آیا اس نے کھولا۔ سامنے صاف کھلا میدان تھا وہ بے تحاشا سر پر پیر رکھ کر بھاگی۔

(۶)

عبداللہ دونوں مردوں کو ٹھنڈا کر کے منتظر تھا کہ اب کوئی اور آتا ہوگا لیکن اس کو چاروں طرف سناٹا معلوم ہئوا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کوئی نہیں ہے اور پھر صالحہ کو ڈھونڈنے کے لئے روانہ ہوگیا اتنے میں اس نے پیر کی آہٹ سنی اور وہ ایک جگہ چھپ گیا۔ وہ اس جگہ پہنچا جہاں صالحہ مقید تھی۔ اس نے روشنی میں دیکھا کہ ایک شخص نے قید خانہ کا تختہ اٹھایا اور حیران سا ہو کر ہسپانوی زبان میں تعجب کے لہجہ میں چلایا۔ وہ سیدھا دروازے کی طرف بھاگا۔ ادھر وہ گیا اور ادھر عبداللہ نے تختہ اٹھا کر اندر جھانکا اور حقیقت معلوم کر لی کہ صالحہ بھاگ چکی ہے۔ اتنے میں اس کمرے سے ایک ہولناک چیخ آئی جہاں تین لاشے پڑے ہوئے تھے۔ عبداللہ نے موقع کو غنیمت خیال کیا اُس نے وہ دروازہ کھلا پایا جس سے صالحہ گئی تھی اور وہ بھی نکل بھاگا۔ اب اس کے پاس اپنی رائفل اور خنجر تھا اور وہ کھلی ہوا میں آزادی کا سانس لے رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا کہ اس نے فاصلہ پر دیکھا کہ اندھیرے میں کوئی جا رہا ہے۔ یہ صالحہ تھی اور تیزی سے بڑھ کر اُس نے اندھیرے میں سلام کیا۔ صالحہ دوڑ کر اُس کے پاس آگئی۔ تفصیل بتانے کا وقت نہ تھا۔ عبداللہ صالحہ کو لے کر تیزی سے پہاڑوں میں گھس گیا۔

بہت دیر کی دیکھ بھال کے بعد عبداللہ ایک عافیت کے مقام پر پہنچا۔ یہ ایک اونچی ٹیکری تھی اور اس میں ایک غار نما کھوہ تھی۔ یہاں اس نے صالحہ کو بٹھا دیا اور دیر تک ادگرد دیکھتا رہا مگر سناٹا رہا۔ جب اس کا اطمینان ہوگیا تو وہ غار میں آیا اور اس نے اپنا توشہ دان اور پانی کی بوتل نکالی۔ خود کھایا اور صالحہ کو کھلایا۔ وہ بالکل تھکا ہئوا تھا اور صالحہ بھی تھک کر چور ہو رہی تھی سردی اپنا زور باندھ رہی تھی۔ عبداللہ دیوار سے تکیہ لگا کر اس طرح بیٹھ گیا کہ سامنے باہر کا منظر تھا۔ صالحہ کو اس نے اپنے زانو کا تکیہ لگا کر سلا دیا۔ رائفل ہاتھ میں لے کر دیوار سے سر ٹکا کر گویا سونے کا پورا انتظام کر کے

وہ جاگتے رہنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں نیند نے غلبہ کیا اور دنیا ومافیہا کی خبر نہ رہی۔

صبح عبداللہ کی آنکھ جو کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا تو صالحہ کو روتے پایا۔ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور رو رہی تھی۔ وہ باہر نکل کر بلندی پر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ صالحہ غار میں رو رو کر نماز پڑھ کر دعائیں مانگ رہی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے صالحہ سے کہا "آج رات کو ہم اپنے گاؤں میں پہنچ جائیں گے" وہ چپہ چپہ سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں۔ دراصل یہاں سے بمشکل دن بھر کا راستہ تھا۔ مگر چونکہ صالحہ ساتھ تھی لہٰذا اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھی رات تک پہنچ جائے گا۔ وہ صالحہ کو بلا کر اترنے ہی کو تھا کہ ایک گولی سناتی ہوئی اس کے سر پر سے نکل گئی اور رائفل کی آواز پہاڑوں میں دور تک گونجتی ہوئی چلی گئی۔ اُس نے گھبرا کر دیکھا۔ فاصلہ پر صالحہ کے بھائی تھے قبل اس کے کہ وہ گردن پھیرے دو گولیاں اور آئیں اور وہ زمین پر لیٹ گیا۔ صالحہ بھی لیٹ گئی۔ سرکتے سرکتے صالحہ کو لئے ہوئے وہ تیزی سے نیچے اترا۔ وہ چپہ چپہ سے واقف تھا۔ وہ لوگ پیدل تھے اور وہ جانتا تھا کہ ان پہاڑیوں میں داخل ہونے کے لئے انہوں نے اپنے گھوڑے کہاں چھوڑے ہوں گے۔ وہ صالحہ کو لے کر تیزی سے الٹا لوٹا۔ پہاڑوں کی سنگلاخ زمین پر آدھ گھنٹے کی دوش کے بعد وہ ایک جگہ پہنچا۔ یہاں اس نے صالحہ کو بٹھا دیا اور کہا تیار رہنا۔ دبے پاؤں وہ جھکا جھکا جا رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے ایک پتھر کی آڑ سے دیکھا کہ ایک آدمی محفوظ جگہ بیٹھا ہے اور سامنے اُس کے چھ گھوڑے کھڑے ہیں ایک دوسرا آدمی ایک خون آلود چادر اوڑھے یا تو سو رہا تھا یا مردہ تھا۔ وہ جان گیا کہ یہ اس بھائی کا لاشہ ہے جس کو اس نے کل گولی سے مارا تھا۔ اس نے رائفل اٹھائی اور نشانہ باندھ کر فائر کر دیا۔ لپک کر پہنچا اور ایک اور بھائی کو خون میں مُرغِ بسمل کی طرح تڑپتا چھوڑا۔ سب سے اچھا گھوڑا اُس نے لیا اور چڑھ کر سیدھا صالحہ کی طرف بھاگا۔ اس نے مڑ کر تعجب سے دیکھا کہ وہ بھائی جو خونیں چادر اوڑھے پڑا تھا مردہ نہ تھا بلکہ زندہ تھا۔ صالحہ سو رہی تھی۔ عبداللہ نے اس سے کچھ نہ کہا صرف چمکار کر تسلی دی اور گھوڑے پر جلدی سے بٹھا کر خود بھی سوار ہوگیا۔ یہ جا وہ جا

(۷)

لیکن صالحہ کے بھائی بھی آخر انہی پہاڑیوں کے رہنے والے تھے۔ فائر کی آواز پر دوڑے ہوئے آئے اور ایک اور بھائی کو خون میں تڑپتا پایا۔ اس کو تو وہیں چھوڑا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر پانچوں کے پانچوں عبداللہ کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔

عبداللہ کا گھوڑا سب سے بہتر تھا اور اس کو موقعہ بھی مل گیا تھا مگر اس پر ایک کے بجائے دو سوار تھے۔ بار بار وہ مڑ کر دیکھتا تھا اور سوائے دشت وجبل کے کچھ اس کو دکھائی نہ دیتا تھا۔ گھوڑا صالحہ کی آواز پا پا کر طرارہ مار مار کر زمین سے نکلا جاتا تھا۔ اس کے سات بھائی تھے اور سات گھوڑے تھے۔ سب بھائی گھوڑوں کو "اخی" کہتے تھے اور یہ بھی "اخی" کہتی تھی تاکہ گھوڑا جان جائے کہ کون سوار ہے۔ عبداللہ کو خیال تھا کہ اب اس

کی گرد پا کو بھی صالحہ کے بھائی نہیں پا سکتے اور اس نے دیر سے مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا اور گھوڑا اڑائے چلا جا رہا تھا کہ گولی کی آواز آئی جو سنسناتی ہوئی اس کے سر پر سے نکل گئی۔ عبداللہ نے مڑ کر دیکھا اور غصہ میں آ کر گھوڑا مقابلہ کے لئے پھیرا نشانہ باندھ کر تین فائر کئے جو سب خالی گئے اور وہ دیکھ رہا تھا کہ پانچوں بھائی گھوڑے جھونکے چلے آ رہے ہیں۔ صالحہ اپنے ہاتھوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے رو رہی تھی۔ عبداللہ کے سر پر سے گولیاں اُڑی چلی جا رہی تھیں کیونکہ پانچوں بھائی بے محابا فیر کرتے چڑھتے چلے آ رہے تھے۔ عبداللہ نے سانس روک کر ہاتھ سادھ کر پھر نشانہ باندھا اور فیر کر دیا۔ اس کے منہ سے نکلا وہ مارا۔ صالحہ نے ہاتھ ہٹا کر فاصلہ پر ایک اور بھائی کو گرتے دیکھا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ عبداللہ بھاگا۔ "یا اخی" کہہ کر اس نے جنگی گیت گانا شروع کر دیا۔ واہ کیا سماں تھا! گویا اس کے سر پر سے گیت گاتی سنسناتی چلی جا رہی تھیں اور اس کے راگ کے ساتھ مل کر پہاڑ کی صدائے بازگشت کیا ہی متناسب آوازوں کا سلسلہ پیدا کر رہی تھی۔ گاتے گاتے وہ مڑ کر دیکھتا اور "یا اخی" کا نعرہ سن کر فرسِ طرار سے بھرنے لگتا۔ وہ جھومتا گیت گاتا اور گولیوں کا راگ سنتا اڑا جا رہا تھا کہ ایک گولی اس کی ران میں لگی جو پار ہو کر صالحہ کی پنڈلی کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے بدن میں ایک برقی جھٹکا سا محسوس ہوا اور بس! پھر ایک سنسنی خیز لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اگر صالحہ نہ چیختی تو شاید اس کو علم بھی نہ ہوتا کہ میرے گولی لگی ہے۔ یہ گولی بس تازیانہ کا کام کر گئی۔ ٹانگ کو اس نے جھٹکا دے کر کہا "شکر ہے کہ ہڈی بچ گئی"۔ گھوما اور نشانہ باندھ کر متواتر چار فیر کئے اور ایک بھائی اور کم ہوا۔ "یا اخی" کہہ کر گھوڑا پھیر کر پھر اسی طرح اپنے قبیلے کے جنگی گیت گاتا اور گولیوں کے شیریں راگ سنتا اڑا چلا جا رہا تھا۔

دراصل صالحہ کے بھائی بیوقوف تھے جو بھاگتے ہی میں فیر کرتے تھے۔ عبداللہ اپنے کو خطرے میں ڈال کر گھوڑا روک کر فیر کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب صرف تین بھائی رہ گئے تھے۔

عبداللہ کو اگر خیال تھا تو صالحہ کا کہ وہ زخمی ہو گئی ہے۔ گو زخم بہت معمولی تھا۔ وہ اسی طرح گولیوں کے سائے میں اڑا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک گولی اس کے بائیں بازو پر پڑی۔ خوش قسمتی سے وہ بھی پار نکل گئی مگر اس کا ہاتھ جھول گیا۔ غصہ کے مارے اس کے دل کا خون پیشانی پر پہنچا۔ خشمگین ہو کر اس نے گھوڑا پھیرا۔ صالحہ سر جھکائے عبداللہ کی گود میں ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ بیکار تھا لہٰذا اس نے صالحہ کے کندھے پر رائفل ٹکا کر تین فیر کئے "وہ مارا"۔ اب صرف دو بھائی رہ گئے۔ وہ عنقریب ختم ہونے والی جنگ کی فتح کے خیال سے خوش ہو رہا تھا اور گھوڑے کو "یا اخی" "یا اخی" کہہ کر صاف نکال لے جانا چاہتا تھا کہ اتنے میں اُس کے ساتھ ہی ساتھ دو گولیاں لگیں۔ ایک بایاں شانہ توڑتی ہوئی نکل گئی اور دوسری نے بائیں پیر کی پنڈلی کا قیمہ کر دیا۔ وہ جل کر پھر گھوما۔ اُس کا ہاتھ کام نہ کرتا تھا۔ مگر صالحہ کا کندھا اس کے بھائیوں کے قتل کے لئے موجود تھا۔ اُس نے اُس پر رائفل ٹکا کر لگاتار چار فیر کئے اور اب صرف ایک بھائی رہ گیا۔ اس نے پھر گھوڑا دوڑایا اور بھاگا۔

اب عبداللہ کی حالت خراب تھی۔ چار گولیاں کھا چکا تھا۔ اور خون کے فوارے بدن سے چھوٹ رہے تھے۔ پیاس کی شدت سے الگ بے تاب تھا مگر وہاں بھلا پانی پینے کی مہلت کہاں۔ وہ غیر معمولی طاقت کا جوان پہاڑی تھا ورنہ اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو گھوڑے سے گر جاتا۔ لیکن اس کو اب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں گر رہا ہوں اور اس نے صالحہ سے کہا کہ مجھے سنبھالے رہنا۔ گھوڑا "یا اخی" کی آواز پر طرارے بھرتا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک گولی اس کے پٹھے پر پڑی۔ گھوڑا بدک کر دولتیاں مار کر بری طرح بھاگا اور "یا اخی" کے لفظ نے اور بھی تازیانہ کا کام کیا۔ گولیاں بدستور اپنا خوشگوار راگ سنا رہی تھیں گو کم تھیں۔ لنتے میں گھوڑے میں جو غیر معمولی تیزی گولی کھا کر آگئی تھی وہ کم ہوتی معلوم ہوئی اور عبداللہ نے گھوڑے کو جھڑکی دی کہ "او نامرد ایک گولی میں تیرا یہ حال ہے" مگر وہاں گھوڑے کی حالت ہی خراب تھی۔ اب موت عبداللہ کے سامنے تھی۔ اس نے اپنا آخری کارتوس بہت نشانہ سادھ کر استعمال کیا۔ یہ اس کا آخری کارتوس اور آخری فیر تھا۔ رائفل اب گویا لٹھ تھی جس کو اس نے پھینک دیا بجائے سید ھے راستے کے اس نے گھوڑے کو اب ایک طرف کر دیا۔ گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔ "کیا صالحہ کے بھائی کے پاس بھی کارتوس ختم ہو گئے!" عبداللہ نے دل میں سوچا مگر پھر دل ہی نے جواب دے دیا کہ اب صالحہ کے بھائی کو اپنے کارتوس خراب کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ وہ اس کا نہ تو کچھ بگاڑ سکتا تھا اور نہ بھاگ کر جا سکتا تھا۔ گھوڑا ہلکا مگر تیز قدم چال جا رہا تھا اور عبداللہ کو تکلیف سی ہو رہی تھی کہ ایک دم سے گھوڑے نے گردن ڈال کر پھریری سی لی اور صالحہ اور عبداللہ کو لے کر منہ کے بل گرا۔ عبداللہ نے سنبھلنا چاہا مگر اپنے کو قطعی بیکار پایا۔ اس نے بمشکل گھٹنوں کے بل رینگ کر گھوڑے کے ماتھے پر شکریہ کا بوسہ دیا جو اب دم توڑ رہا تھا"۔

صالحہ کا بھائی اب قریب آ گیا تھا۔ عبداللہ نے صالحہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا جو اپنا منہ ہاتھوں میں چھپائے ہوئے رو رہی تھی۔ عبداللہ نے صالحہ کے بھائی کو قریب آتا دیکھ کر اپنا خنجر نکال لیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا جھوم رہا تھا۔ بھائی نے دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر گھوڑا روک لیا۔ وہ اس عبرتناک منظر کو بھلا کن نظروں سے دیکھ رہا ہو گا۔ بدقسمت بھائی! قبل اس کے کہ وہ کچھ بولے عبداللہ بولا "بخدا جب تک میں زندہ ہوں اور میرے بدن میں ایک رمق جان بھی باقی ہے تو اپنی بہن کو مجھ سے نہیں لے سکتا۔ گولی میرے سینہ میں مارنا ورنہ تجھے بھی زندہ نہ چھوڑوں گا"۔

صالحہ نے اپنے روتے ہوئے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر عبداللہ کی بغل میں سے جھانک کر دیکھا کہ بھائی نے کندھے پر رائفل لگا لیا ہے اور فائر کرنا ہی چاہتا ہے۔ وہ کھڑی ہو گئی اور بھائی کو رائفل ہٹانا پڑا کہ کہیں صالحہ کے نہ لگ جائے کیونکہ عبداللہ جھوم رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ عبداللہ نے مڑ کر صالحہ کو بٹھا دیا اور پھر بھائی کی طرف مخاطب ہو کر کہا "میں کہہ چکا کہ جب تک زندہ ہوں میں تیری بہن کو نہ چھوڑوں گا میں نے کل سے اس وقت تک" عبداللہ نے اپنا خشک حلق تھوک سے تر کرتے ہوئے کہا "آٹھ قتل اس کی خاطر کئے ہیں جن میں سے چھ تیرے بھائی ہیں"

"وہ دو اور کون ہیں"؟ یہ کہتا ہوا صالحہ کا بھائی گھوڑے پر سے اتر پڑا۔

عبداللہ نے صالحہ کو اس طرح بغل میں دبا کر قابو میں کیا کہ گویا مالِ عرب پیشِ عرب" گویا صالحہ کا بھائی اسے چھیننے آرہا ہے۔ وہ بولا "جب تک میری جان میں جان ہے کہیں صالحہ کو واپس لینے کا خیال بھی دل میں نہ لانا" یہ کہہ کر اس نے خنجر کو چمکایا لیکن بھائی رک گیا اور اس نے پھر پوچھا تو عبداللہ نے ان دونوں سپاہی مزدوروں کے قتل کا قصہ سنایا۔

صالحہ کا بھائی کچھ فاصلہ پر بیٹھ کر اس دردناک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے نہ معلوم کس سوچ میں پڑا تھا۔ عبداللہ پر کمزوری غالب آ رہی تھی اور اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں میں بیہوش نہ ہو جاؤں اور صالحہ کا بھائی موت سے پہلے گویا زندگی ہی میں صالحہ کو نہ لے لے۔ اس نے کمزور مگر بلند آواز میں کہا "اگر تو مرد ہے تو مجھے جلدی مار دے اور میرے بیہوش ہونے کا مت انتظار کر"۔

بھائی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا بلکہ اپنی بہن کو پکارا "صالحہ۔ صالحہ۔ میرے ساتھ چلتی ہے"؟

عبداللہ نے نہ معلوم کس انداز سے صالحہ کی طرف دیکھ کر کہا "تیرا جی چاہتا ہے تو جا" کہ صالحہ بیقرار سی ہو گئی اور اس نے بجائے جانے یا جواب دینے کے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا کر رونا شروع کیا۔ صالحہ کا بھائی ایک عجیب پریشانی کے عالم میں تھا اور یہ سین اس کو بے تاب کئے ہوئے تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے کہا "صالحہ۔ صالحہ میرے ساتھ چل" عبداللہ نے کہا "بخدا اگر وہ جائے تو میں نہ روکوں گا" صالحہ اسی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ عبداللہ نے پھر صالحہ کے بھائی سے بطور آخری اپیل کے کہا "مجھے مارنا ہے تو جلد مار کہ مجھ پر بیہوشی کا غلبہ ہو رہا ہے۔ عبداللہ صالحہ کے بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا جو سر جھکائے خدا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ اس نے عبداللہ کے بار بار کے تقاضے پر عبداللہ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور ایک عجیب لہجہ میں کہا "عبداللہ . . . . . . میں تجھ کو نہیں مار سکتا"

عبداللہ نے ناامید اور متعجب ہو کر پوچھا "کیوں"؟

صالحہ کے بھائی نے کہا "اس لئے . . . . اس لئے کہ مجھے تیرا وہ جملہ یاد آ رہا ہے"۔

"کون سا جملہ"؟

"وہ جو تو نے اس روز مجھ سے کہا تھا جب میں نے تجھے اور صالحہ کو جھڑکا تھا"۔

عبداللہ پر کمزوری کے غلبہ کی وجہ سے بیہوشی طاری ہوا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں وہ کس طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کا دماغ کام نہ کرتا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کا دماغ بیکار سا ہو رہا تھا۔ اس کو یہ بھی یاد آیا کہ اس نے کب جھڑکا تھا۔ اس نے کہا "وہ کیا جملہ تھا مجھے نہیں معلوم"

صالحہ کے بھائی نے کہا "تو نے کہا تھا . . . . . سچ کہا تھا . . . . . اس نے رک رک کر کہا "تو نے مجھ سے کہا تھا کہ تیری بہن کو مجھ سے زیادہ کوئی آرام سے نہیں رکھ سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ تو نے سچ کہا تھا اور میں مان گیا کہ

تجھ سے زیادہ کوئی دوسرا میری بہن کی قدر نہیں کر سکتا۔"

یہ وہی بھائی تھا جس سے عبداللہ نے یہ الفاظ کہے تھے اور اب اس نے خود دیکھ لیا کہ عبداللہ اُس کی بہن کے لیئے کیا کچھ نہ کر چکا تھا اور کیا کچھ نہ کرنے کو تیار تھا۔

عبداللہ نے خنجر پھینک کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور صالحہ کے بھائی نے رائفل پھینک کر دوڑ کر اپنے زخمی بہنوئی کو گلے سے لگا لیا۔ بیہوش ہو کر گرتے گرتے عبداللہ نے صالحہ کے بھائی کی پیشانی چوم لی۔ صالحہ کا بھائی رو رہا تھا اور بوتل سے پانی لے کر عبداللہ کے گلے میں ٹپکا کر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

(۸)

اس واقعہ کے تین سال بعد کا قصہ ہے کہ حج کے موقعہ پر آٹھ آدمی ایک عورت اور ایک بچہ مکہ معظمہ میں میں نے دیکھے۔ اِدھر اُدھر کی چہل پہل میں دیکھا تو عجیب دلکش نظارہ تھا۔ دو برس کے بچہ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آٹھوں فدا تھے۔ دورانِ طواف میں بچہ کبھی ایک کے کاندھے پر تھا تو کبھی دوسرے کے کاندھے پر۔ ان میں سے دو لنگڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ مغرب الاقصیٰ کے باشندے ہیں۔ ان کے چہرے کس قدر اچھے تھے اور کس قدر جاذب نگاہ تھے۔ اس گروہ کے گروہ میں ایک عجیب کشش تھی۔ اگر ان میں سے کوئی بھی ذرا سا بچھڑ جاتا تھا تو دوسرے پریشان سے ہو جاتے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی گوارا نہ تھا کہ ایک دوسرے کی نظروں سے لمحہ بھر کے لیئے بھی اوجھل ہو جائے۔ عورت عربی یا بالفاظ دیگر مغربی حسن کی تصویر تھی۔ اس کا چہرہ خاموش اور سنجیدہ تھا مگر اس وقت اس کا خاموش اور متین چہرہ بھی اندرونی جذبات کو چھپا نہ سکتا تھا جب اس کا تندرست اور خوبصورت بچہ اس کندھے سے اُس کندھے پر جاتا تھا اور پیار کے بوسوں سے اس کا معصوم چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ طرز و انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک کشیدہ قامت جوان جو اپنے ساتھ والوں سے ذرا مختلف ہے اس خاتون کا شوہر ہے۔

اس کے بعد میں نے مدینہ میں اس ٹولی کو گنبدِ خضرا کی چوکھٹ پر عقیدت کے پھول چڑھاتے دیکھا اور وہاں کا منظر ایسا تھا جو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ مجبوراً میں نے اپنے گائڈ کی امداد سے ان اچھے لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور پھر شام کو ان کی جائے قیام پر جا کر یہ قصہ جو بیان کیا گیا ہے سب کی زبانی سُنا۔ ایک ہی وقت میں بعض اوقات دو تین بھائی بولنے لگتے تھے اور کبھی کوئی واقعہ رہ جاتا تو دوسرا بتا دیتا۔

سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا مگر نہ سمجھ میں آیا تو یہ کہ آخر اتنی گولیاں چلیں اور کوئی نہ مرا۔ گولیوں کے نشان دیکھے جن میں سے دو کے داہنے سینہ کو توڑ کر عبداللہ کی گولی نکل گئی تھی۔ کسی کے شانہ میں لگ کر پشت کو توڑ کر نکل گئی تھی۔ ایک کے داہنی جانب پسلیوں کے نیچے عین کھال کی سطح پر گولی ایسی رکھی ہوئی تھی کہ ہاتھ سے پکڑ لو۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش یہ میرے پڑوسی ہوتے۔ وہ سب ایک ہی جگہ رہتے تھے اور بہت خوش تھے۔

جب ریف کی جنگ مجاہد اعظم عبدالکریم نے شروع کی تو بار بار مجھے ان بھائیوں کا اور عبداللہ کا خیال آتا تھا اور لوگ ہسپانوی شکست پر تعجب کرتے تھے اور میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے جنگ ہوئی تھی اور ختم بھی ہوگئی لیکن پھر بھی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ کس طرح اتنی گولیاں چلیں اور ایسی ایسی جگہ لگیں لیکن کوئی نہ مرا۔

خوش قسمتی سے یہ معما بھی حل ہوگیا ہسپانوی اور فرانسیسی طبی کمیشن کی رپورٹ کا حسب ذیل اقتباس قابل غور ہے جو ہسپانوی نمائندے نے فرانسیسی جرنیل سے جنگی مشاورت کے دوران میں کیا تھا اور جو اس کمیشن کے روبرو بطور شہادت کے پیش کیا گیا:۔

"......... عموماً ریفی ایک گولی سے نہیں مرتے تاوقتیکہ وہ پھٹ جانے والی نہ ہو۔ ستر فی صدی ریف کے پہاڑی لوگ سینہ پر گولی کھا کر بھی بچ جاتے ہیں۔ بشرطیکہ دل محفوظ رہے۔ لیکن فرانسیسی یا ہسپانوی زخمیوں میں سے ستر فیصدی اس قسم کے زخمی ضرور مرجاتے ہیں۔"

عظیم بیگ چغتائی

فرشتے

مریض کے افسردہ بالیں کے قریب فرشتے استادہ ہیں کس قدر شیریں اور نرم ہی انکا لہجہ اور کتنے بے آواز ہیں انکے قدم اور اُس مقدس جگہ کو اپنی آمد کا شرف بخش رہے ہیں جہاں ٹوٹے ہوئے دل بید مجنوں کی طرح سرنگوں ہیں وہ کھڑے ہیں مردوں اور زندوں کے درمیان! فرشتے اپنی سہیں آرامگاہوں کو چھوڑ کر ہماری امداد کو آموجود ہوتے ہیں ہم کہ ہر وقت امداد کے طالب ہیں وہ اپنے پر سے برق رفتار قاصد کی مانند افلاک دوار کی دور دراز کی مسافت طے کرتے ہوئے ہمیں خبیث ارواح کی شیطنت سے بچاتے ہیں وہ ہمیں مامون و مصون رکھنے کیلئے مشغول جنگ ہوتے ہیں وقت معین تک ہماری حفاظت کرتے ہیں اور ان کی فوج کا کثیر حصہ پہرہ دیتا ہے تاکہ ہم بلاؤں سے محفوظ رہیں! یہ سب کچھ محبت کے صدقے میں انجام ہوتا ہے انعام کے لالچ سے نہیں!

مالک ارض وسما اپنے ارضی بیٹوں کی کس قدر توقیر کرتا ہے۔

خدائے قدوس نے ہر ایک جسم خاکی میں نورانی جسم فرشتہ ودیعت کر رکھا ہے جب تم برائی پر آمادہ ہو اور گناہ کے ارتکاب کا خیال ہو تو تم اسکے سہیں پروں کی سرسراہٹ کی آواز سے لذت یاب ہوگے، اگر تم نے التفات نہ کیا تو تمہاری خواہشات نفسانی اس فرشتے کے مسکن تعمیر کریں گی اور وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کی گہری نیند سو جائے گا، مگر اس کی روح پاک عرش کی طرف پرواز کرتی ہوئی خلاق دو عالم کی گود میں جا بیٹھے گی۔ وہی خلاق دو عالم جس نے اُس پاکیزہ ودیعت سے تمہیں موقر کیا تھا! (ترجمہ)

عبدالرحیم

محفلِ ادب

اللہ

نزولِ قرآن سے پہلے عربی میں اللہ کا لفظ خدا کے لئے بطور اسمِ ذات کے مستعمل تھا جیسا کہ شعرائے جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے۔ یعنی خدا کی تمام صفتیں اس کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ کسی خاص صفت کے لئے نہیں بولا جاتا تھا۔ قرآن نے بھی یہی لفظ بطور اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا (۷: ۱۷۹) اور اللہ کے لئے حسن و خوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہئے کہ ان صفتوں کے ساتھ اُسے پکارو۔

کیا قرآن نے یہ لفظ محض اس لئے اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا مقتضا یہی تھا یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے؟

جب ہم اس لفظ کی معنوی دلالت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض کے لئے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

نوعِ انسانی کے ذہنی تصورات کا سب سے زیادہ قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لئے پیدا ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصور بھی کم و بیش ہمیشہ موجود رہا اور اس لئے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لئے پیدا ہو گئے وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے اُس اَن دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

چنانچہ سامی زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت

کے معنی میں مستعمل یہی ہے اور عبرانی، سریانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف لام اور ہ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے کلدانی و سریانی کا "الاھیا" عبرانی کا "الوۃ" اور عربی کا "الٰہ" اسی سے ہے اور بلاشبہ یہی "الٰہ" ہے جو حرف تعریف کے اضافہ کے بعد اللّٰہ ہوگیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔

لیکن اگر "اللہ" "الٰہ" سے ہے تو "الٰہ" کے معنی کیا ہیں، علماء لغت و اشتقاق کے مختلف اقوال ہیں مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل "الٰہ" ہے اور "الٰہ" کے معنی تحیّر اور درماندگی کے ہیں بعضوں نے اسے "ولہ" سے ماخوذ بتلایا ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس خالق کائنات کے لئے یہ لفظ اس لئے اسم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وہ معلوم کرلے گا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے،

اے بروں از وہم و قال و قیل من — خاک بر فرقِ من و تمثیل من

اب غور کرو خدا کی ذات کے لئے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں میں اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کونسا ہوسکتا ہے؟ اگر خدا کو اس کی صفتوں میں پکارتا ہے تو بلاشبہ اس کی صفتیں بیشمار ہیں لیکن اگر صفات سے الگ ہوکر اسکی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ ایک متحیّر کردینے والی ذات ہے اور جو کچھ اسکی نسبت کہا جاسکتا ہے؟ وہ عجز و درماندگی کے سوا کچھ نہیں ہے فرض کرو نوع انسانی نے اسوقت تک خدا کی ہستی یا خلقتِ کائنات کی اصلیت کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے وہ سب کچھ سامنے رکھ کر ہم ایک موزوں سے موزوں لفظ تجویز کرنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ کیا اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کوئی بات کہی جاسکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی تو وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رفتگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہی مرتبہ ہمیشہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہوجائے۔ عرفاء کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ "رَبِّ زِدْنِی فِیْکَ تَحَیُّرًا"۔ "زدنی بفرط الحب فیک تحیرا — وارحم حشا بلظی ھواک تسعرا"

اور حکما کی حکمت و دانش کا بھی فیصلہ ہمیشہ یہی ہوا۔ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

چونکہ یہ اسم خدا کے لئے بطور اسم ذات کے استعمال میں آیا اس لئے قدرتی طور پر ان تمام صفتوں پر حاوی ہوگیا جن کا خدا کی ذات کے لئے تصوّر کیا جاسکتا ہے اگر ہم خدا کا تصور اسکی کسی صفت کے ساتھ کریں مثلاً الرب یا الرحیم کہیں تو یہ تصور صرف ایک خاص صفت ہی میں محدود ہوگا یعنی ہمارے ذہن میں ایک ہستی کا تصور پیدا ہوجائے گا جس میں ربوبیت یا رحمت ہے لیکن جب ہم اللّٰہ کا لفظ بولتے ہیں تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو اُن تمام صفاتِ حسن و کمال سے متصف ہے جو اس کی نسبت بیان کئے گئے ہیں اور جو اس میں ہونے چاہئیں۔

یہ مضمون مولینا ابوالکلام کے ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔

شیطان کا رحم و کرم

برائی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے اگر وہ نہ ہوتی تو اچھائی بھی نہ ہوتی۔ اچھائی کا وجود ہی برائی کے وجود پر مبنی ہے۔ اگر خوف نہ ہو تو بہادری ایک بے معنی خیال ہے، اگر مصیبت اور غم نہ ہوں تو ترس اور ہمدردی کا ہونا بھی ممکن نہیں جس دنیا میں خوشی ہی خوشی ہو وہاں خدمت اور ایثار کے کیا معنی، جب تک بدی نہ ہو نیکی ایک مہمل لفظ ہے، بغیر نفرت کے محبت ناممکن ہے۔ خوبصورتی کا خیال بدصورتی کے خیال سے الگ نہیں کیا جا سکتا محض برائی کا صدقہ ہے کہ دنیا رہنے کے قابل ہے۔ غم ہی کی بدولت زندگی قابلِ برداشت ہے۔ لہٰذا شیطان کو بجائے برا بھلا کہنے کے ہم کو اس کا احسان ماننا چاہئے اور اس کی صناعی اور دانشمندی کی داد دینا چاہئے۔ کم از کم آدھی دنیا تو اسی کی کاریگری ہے اور اس آدھی اور دوسری آدھی کا اس طرح گوشت اور ناخن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو چھیڑا تو دوسری کو صدمہ پہنچنا لازمی ہے ہر بدی کے ساتھ کوئی نہ کوئی نیکی لگی ہوئی ہے اور بغیر اس نیکی کو مٹائے بدی کو فنا کرنا ممکن نہیں۔

کچھ عرصہ ہوا میں دیہات کے ایک میلے میں گیا اور وہاں کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ حضرت آنتھونی[1] کی نقل ہو رہی تھی۔ یہ وہ تماشا ہے جس کے فلسفہ کے سامنے شیکسپیئر کے تمام المیئے اور ہمارے ڈینیری صاحب کے تمام ڈرامے سب ہیچ ہیں۔ خدا اور شیطان دونوں کے رحم و کرم کو کس قدر واضح طور پر اکٹھا دکھایا ہے!

جب پردہ اٹھا تو تماشاگاہ (اسٹیج پر) ایک بھیانک ریگستان نظر آیا مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ فرشتوں اور شیطانوں سے بھر گیا۔ کچھ تو ان فرشتوں اور شیطانوں کے تماشاگاہ پر باری باری آنے سے اور کچھ کٹھ پتلیوں کی چال ڈھال سے یہ شروع ہی سے خیال ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ یا یوں کہئے کہ قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ پھر بھی جب حضرت آنتھونی نے حمد اور دعا ختم کی اور سجدے سے سر اٹھایا ان کی پیشانی بے شمار سجدوں سے اونٹ کی پیٹھ کی طرح سخت اور گھٹے دار ہو گئی تھی اور ان کی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے ملکۂ سبا اپنے سنہرے لباس میں ناز و انداز سے ہنستی اور دونوں ہاتھ پھیلاتے دکھائی دی تو ہمارے بدن میں سنسنی پھر گئی اور ہمارا دل اس اندیشے سے دھڑکنے لگا کہ کہیں حضرت آنتھونی ملکۂ سبا کے جال میں پھنس نہ جائیں۔ اسی طرح

---

[1] تیسری صدی عیسوی کے آخر [illegible]

آج ہی
فرمائش
بھیج دیجئے
جوبلی نمبر آٹھ آنے میں
ہمایوں

اُردو بک سٹال لاہور

لوہاری دروازہ سے باہر نکلتے ہی بائیں جانب میونسپل کمیٹی کی چھوٹی دکان میں آراستہ کیا گیا ہے یہ پنجاب بلکہ ہندوستان بھر میں اپنی وضع کا شاید پہلا سٹال ہوگا جسمیں ہندستان بھر کے چیدہ مصنفین کی کتابیں جمع کیگئی ہیں جامعہ ملیہ دہلی۔ دار المصنفین اعظم گڈھ ایوان اشاعت گورکھپور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ دار الاشاعت پنجاب شیخ مبارک علی لاہور نسیم بکڈپو لکھنؤ عالی بکڈپو پلی بھیت وغیرہ ہندستان کے مشہور علمی اداروں کی کتابیں اردو بک سٹال میں موجود ہیں مقامی اصحاب کو اُردو بک سٹال سے کتابیں خریدنے میں یہ فائدہ ہے کہ وہ دکان کے اندر گھوم پھر کر ہر ایک مضمون کی کتابیں یکجا دیکھ سکتے یا ایک ہی مصنف کی تمام تصنیفات ملاحظہ فرما کر اپنی پسند کے مطابق خرید سکتے ہیں بیرونجات کے علم دوست اصحاب جو ہر ادارے سے کتابیں خریدتے ہیں اور ہر جگہ علیحدہ محصول اور وی پی کا خرچ برداشت کرتے ہیں اردو بک سٹال ہی کو مختلف کتابوں کا آرڈر دیا کریں تو فائدہ میں رہیں گے اور بیک وقت انہیں ہر قسم کی کتابیں گھر بیٹھے کم خرچ میں مل جایا کریں گی امید ہے کہ علم دوست اصحاب اردو کی ترقی کے لئے اردو بک سٹال کی سرپرستی اختیار کریں گے۔

فہرست کتب مفت طلب کریں

اُردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم چوسٹھ صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۳؍ (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۶؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

چھاپنے والے:۔ درگا آرٹ پریس، انارکلی لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

جلد ۲۲

نمبر ۳

فہرستِ مضامین ہمایوں

بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء

تصویر: ملک الشعرا المانیہ

مشاہیر کے ارادے

جارج برنارڈ شا:-

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ارادہ نہیں کیا۔ نہ کبھی کسی سے میرا مقابلہ ہُوا اور نہ کبھی کسی سے میں نے اپنی زندگی کے متعلق رائے لی جب کوئی موقع آیا میں نے اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق اس کا استعمال کیا میرے اعمال و اقوال کا مقصد کسی خاص قسم کی کامیابی حاصل کرنا نہ تھا ہیملیٹ کی طرح میرے دل میں ترقی کی ہوس کا جذبہ مفقود ہے میں غیر ارادی طور پر یہ کوشش کرتا ہوں کہ دنیا کو اپنی فطرت کا ہم آہنگ بنالوں میں اس حقیقت کا اظہار اس لئے کر رہا ہوں کہ میں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ مشاہدہ ایسا ہی ہے جیسے میں آئینے میں اپنے بالوں کا رنگ دیکھتا ہوں دراں حالیکہ میرے دل میں مستقل طور پر اس کے متعلق کوئی احساس موجود نہیں ہوتا"

جان گالزوردی:-

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں نے کبھی عمداً کوئی خاص ہیجان انگیز فیصلہ یا ارادہ کیا ہو۔ مجھے یہ سب بالکل قدرتی اور میری طبیعت ہی کے اقتضا کا نتیجہ معلوم ہوتے رہے ہیں۔

برٹرینڈ رسل:-

میری زندگی فاوسٹ کی زندگی کی طرح نمایاں طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک زندگی اگست ۱۹۱۴ء سے پہلے کی اور دوسری اس کے بعد کی۔ زندگی کے پہلے حصے کے لئے میں اُس وقت ایک فیصلے پر پہنچا جب میں نے اقلیدس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ اس نے اپنی ہر بات کی صداقت کے ثبوت پیش کئے ہیں لیکن اس انکشاف کے بعد میں سخت مایوس ہُوا کہ اُس نے اپنے پیش کردہ حقائق کے ثبوت میں بعض ایسے مفروضات سے ابتدا کی ہے جن کی صداقت کی کوئی دلیل اس کے پاس موجود نہیں۔ چنانچہ میں نے اس بات کی تحقیق کرنے کا اُس وقت فیصلہ کر لیا کہ ریاضی کی صداقت کو مسلّم سمجھنے کی کوئی وجہ بھی ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے آئندہ سنتائیس سال اسی کوشش کی نذر کئے۔ بالآخر مجھے احساس ہُوا کہ اس باب میں جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ میں کر چکا ہوں۔

میری زندگی کا دوسرا اہم ارادہ جنگِ عظیم کے ابتدائی دنوں سے تعلق رکھتا ہے جب میں نے تمام مولِ مستخا ہیمہ

کے طرزِ عمل پر کھلے طور سے غیر جانب دارانہ تنقید کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں میں نے جنگ کے سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی اسباب کی تحقیق کی، اور آخر مسئلۂ تعلیم سے دلچسپی لینی شروع کی۔

میرے پہلے ارادے کی محرک میری یہ زبردست خواہش تھی کہ مجھ پر کسی ایسے علم کا انکشاف ہو جس کی صداقت یقینی طور پر غیر مشتبہ ثابت ہو جائے۔

میرا یہ خیال نہیں کہ مادی ترقی یا اخلاقیات کا خیال میرے ان مقاصد کی تخلیق کا باعث ہُوا تھا۔

دوسرے فیصلے میں ایک طرف تو میں تحقیقِ حق کے جذبے سے متاثر ہُوا کیونکہ تمام حکومتوں کا پروپیگنڈا زیادہ تر دروغگوئیوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ میں رنج و غم کے اُس احساس سے متاثر ہُوا جو میرے دل میں اُن نوجوانوں کے خیال سے پیدا ہُوا تھا جن کی محض بے بنیاد وجوہ کے لئے قربانی دی جانے والی تھی"

رابندر ناتھ ٹیگور:۔

"جو باتیں میرے اقوال و اعمال کی محرک ہوئیں ان میں سے اہم ترین باتیں یا تو بالکل غیر متوقع طور پر میرے دل میں پیدا ہوئیں یا اُن کی تخلیق ایسی کوششوں کے دوران میں ہوئی جو ہمیشہ طبیعت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے انکشاف کا باعث ہوتی رہی ہیں"۔

دروغ گوئی میں عورتوں کی فوقیت

کولمبیا یونیورسٹی کی تجربہ گاہ کے پروفیسر میلر نے ثابت کیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں جھوٹ بولنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ پروفیسر میلر پیشین گوئی کرتے ہیں کہ عورتوں کی آئندہ نسلیں بھی بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں اسی طرح بددیانت رہیں گی جس طرح کہ آج کل کی بڑی بوڑھیاں یا نوجوان عورتیں یا چھوٹی بچیاں ہیں۔

یہ عموماً زمانہ شناس اور چالاک بننے کے لئے یا کسی دوسرے شخص کے جذبات کی پاسداری کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بلاتکلف سفید جھوٹ بولتی ہیں۔ عورتوں کا یہ طرزِ عمل اُن کے نسوانی جذبات اور ان جذبات کے ردِ عمل سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

پروفیسر میلر نے بیان کیا ہے کہ وہ ان نتائج پر اُس وقت پہنچے جب انھوں نے پانچ سو سترہ گریجوایٹ طلبہ کی ایک مخلوط جماعت کے سامنے ستر مختلف مسائل پیش کئے۔ ان مسئلوں کے وہ حل جو مرد طلبہ نے پیش کئے بالکل ناکارہ ہونے پر بھی زیادہ دیانت دارانہ معلوم ہوتے تھے لیکن وہ حل جو لڑکیوں نے پیش کئے تقریباً ان تمام میں چالاکی اور غیر دیانت دارانہ غور و فکر کا شائبہ موجود تھا۔

ڈاکٹر میلر کے قول کے مطابق عورتیں ایسا جواب دینے کو ترجیح دیتی ہیں جس میں حقیقت کو کُلی یا جزو طور پر دبانے کی کوشش کی گئی ہو۔

مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا رجحان اس قسم کے پُرفن جواب دینے کی طرف زیادہ ہے جن کا مقصد کسی دوسرے شخص کے جذبات کی پاسداری ہو۔

تصویروں سے عشق

جین ویلزل نے جو قطبِ جنوبی کا ایک سیّاح ہے اپنی کتاب "قطبِ جنوبی کی سی سالہ زندگی" میں بعض اس قسم کی حکایات درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قطبوں کے تنہا آباد کار اور تاجر بعض اوقات عورتوں کی تصویروں کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک آباد کار نے اپنے جھونپڑے کی دیوار پر ایک خوبصورت امریکن لڑکی کی تصویر لٹکا رکھی تھی، اور وہ اس پر اپنی پر اشتیاق نگاہیں جمائے ہوئے جھونپڑے میں مضطربانہ انداز سے ٹہلا کرتا تھا، پھر وہ بے اختیار اس تصویر کے ساتھ چمٹ جاتا، اسے بوسے دیتا، سسکیاں بھرتا اور کہتا "میری جان، میری پیاری!"

مصنف کہتا ہے کہ میں وہاں کھڑے ہوئے اُس کی یہ حرکات دیکھتا رہتا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اس دوران میں بڈھا آدمی برابر چیختا چلاتا اور واویلا کرتا رہتا۔ اس کے بعد وہ آہیں بھرتے ہوئے آگ کے نزدیک بیٹھ جاتا اور اپنا کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتا۔

مصنف لکھتا ہے کہ قطبِ شمالی کے بعض "راہب" کسی خیالی عورت کے متعلق خود بخود اپنے دل سے باتیں کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ وہ اس عورت کی طرف محبت بھرے خط بھی لکھتے تھے۔ بعض اور لوگ مختلف قسم کی عورتوں کو محبت آمیز خط لکھتے رہتے تھے۔ لیکن ان عورتوں کا فی الحقیقت کوئی وجود نہ تھا۔ یہ ان غریب الوطنوں کے اپنے ہی دماغی تصوّرات کا نتیجہ تھیں۔

امریکا کی نئی بائیبل

امریکا میں کتابِ مقدس کا ایک مستند نسخہ ۱۹۴۱ء میں چھپے گا۔ ڈین لوتھر اے ویگل جو امریکن سٹینڈرڈ بائیبل کمیٹی کے صدر ہیں کہتے ہیں کہ نیویارک میں کمیٹی کے ایک اجلاس میں نظرِ ثانی کی غرض سے کتابِ مقدس کے دہ سالہ مطالعے کا فیصلہ ہؤا۔

ڈین ویگل نے بتایا کہ ۱۸۷۰ء میں ۷۷ انگریز فضلا نے جو تیس امریکن فضلا کی شرکت سے کنگ جیمز بائیبل پر نظرِ ثانی کی۔ ان لوگوں نے نئے عہد نامے کی نظرِ ثانی پر تقریباً گیارہ برس اور پرانے عہد نامے پر چودہ برس

صرف کئے۔

اس بات پر اتفاق کیا گیا تھا کہ متن کے متعلق اختلافات کی صورت میں انگریزی کمیٹی کا فیصلہ ناطق سمجھا جائے گا لیکن چودہ سال کے بعد امریکن کمیٹی اس بات کی مجاز قرار دے دی گئی کہ وہ متن کے متعلق اپنی ترجیحات کے مطابق کتاب مقدس کا ایک نسخہ شائع کرے چنانچہ امریکا کے مستند صحیح شدہ نسخے کا جو ۱۹۲۱ء میں چھپا متن وہی ہے۔

ڈین وینگل کے قول کے مطابق انگریزی محاورے کے تغیر اور مذہبی مسائل کی جدید تحقیق نے مزید نظرِ ثانی کی ضرورت پیدا کر دی ہے۔ انگریزی کمیٹی کی کوشش محض یہ تھی کہ لغت اور محاورے کو بدلے بغیر کنگ جیمز بائیبل کے متن کو انگریزی زبان کی موجودہ حالت کے مطابق کر دیا جائے۔

تصویری زبان کی نشأۃ الثانیہ

یہ عجیب بات ہے کہ ترقی کے اس زمانے میں ہم قدیم ترین دنیا کی بعض باتوں کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ ریلوے کی بین الاقوامی انجمن نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ تصویری نشانات استعمال میں لائے جائیں۔ یہ فیصلہ ہزار ہا سال کی ایک پرانی رسم کی طرف لوٹنا ہے کیونکہ تحریر کی ابتدا حروف کے بجائے تصویری علامات سے ہوئی تھی۔ بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں پر غیر ملکی مسافروں کو عموماً جو دقتیں پیش آتی ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ٹکٹ گھر، کھانے کا کمرہ اور باہر نکلنے کا راستہ انہیں آسانی سے نہیں مل سکتا۔ لنڈن کے اُن اسٹیشنوں پر جہاں "بوٹ ٹرین" چلتی ہے انگریزی، فرانسیسی اور بعض اوقات جرمن اور ولندیزی زبان میں اعلانات لگے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود زیک اور پول مسافر "جو گم شدہ اسباب کا دفتر" وغیرہ "تلاش کرنا چاہتے ہیں پریشان نظر آتے ہیں۔ جب تصویری نشانات کا استعمال عام ہو جائے گا تو اس قسم کے مسافر بھی پریشان نظر نہ آئیں گے وہ نظر اُٹھا کر دیکھیں گے، یہاں تک کہ انہیں کسی دروازہ پر چھتری اور چھڑی کی ایک چلیپا نما شکل دکھائی دے گی۔ یہ گم شدہ مال کے دفتر کا دروازہ ہوگا۔ ٹکٹ گھر پر ایک بڑے ریلوے ٹکٹ کی تصویر لگی ہوگی اور باہر کا راستہ کھلے دروازے کی تصویر سے ظاہر ہوگا۔ اسی طرح کھانے کے کمرے پر ایک گرانڈیل چھری کانٹے کی صورت نظر آئے گی۔

"پھندستان"

کیا واقعی کوئی دنیا ایسی ہو سکتی ہے کہ بیوی ہے تو میاں پرنثار ہے، لیڈر ہے تو ملک کی بھینٹ ہے۔ بیٹا ہے تو باپ کا فرماں بردار، خدا ہے تو بندے کا غمگسار۔ اگر ہو سکتی ہے تو دنیا کیا ہو گی، اچھی خاصی قتل گاہ ہو گی۔ جہاں ہر کس و ناکس کا صبح و شام کا شغل یہ ہو گا کہ اور کچھ ہو نہ ہو اپنے آپ کو قتل ضرور کرلیں عجب نفسا نفسی کی دنیا ہو گی۔ ہر شخص اس ذلیل خود غرضی میں گرفتار ہو گا کہ سوائے اپنے اور سب کے کام آجائے حالانکہ ع بہت مشکل ہے مشکل میں کسی کا کام آجانا

ان خیالات کی اُدھیڑ بُن میں تھا اور سیر کرتے کرتے ایک کھیت کے قریب پہنچ چکا تھا کہ کچھ شور سنائی دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مضبوط مگر ننگا جنگلی سا انسان اچک کر ایکھ کے کھیت میں گھس گیا اور نہایت وحشیانہ طریقے سے ایکھ کو چبانے لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کھیت کی مالکہ جو کہ ایک معزز گائے تھی آنکلی۔ گائے نے آتے ہی اس جنگلی کو دبوچا۔ قریب تھا کہ جنگلی بھاگ نکلے مگر ساتھ کے کھیت سے جو ایک اونٹ کی ملکیت تھا اونٹ صاحب نمودار ہوئے۔ دونوں نے مارتے مارتے پہلے تو اس جنگلی کو ادھ موا سا کر دیا اور پھر رسّا باندھ اپنی آبادی کی طرف اس جنگلی کو لے چلے۔ محوِ حیرت میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا کہ اس تمام ماجرے کا انجام تو دیکھوں۔

گاؤں میں وہ جنگلی ایک پنچایت کے روبرو پیش کیا گیا۔ پنچایت ایک کافی بڑی پنچایت تھی۔ گھوڑے بیل، کتے، مرغے سؤر ہر جماعت کے نمائندے اس پنچایت میں شامل تھے۔ پہلے گائے نے اپنا قصہ بیان کیا۔ پھر اونٹ نے شہادت دی اور پھر پنچایت نے ایک دوسرے سے مشورہ شروع کیا۔

سؤر "بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہ جنگلی کسی زمانے میں اس سرزمین میں بہت ظلم کیا کرتے تھے۔ میری رائے میں اس جنگلی کی سزا موت ہے ہمیں دریافت کرنا چاہئے کہ کیا اس جنگلی کی لاش کسی کام آسکتی ہے یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس جنگلی کے بودار گوشت کو غذا کے کام میں لانا قطعی نامناسب ہے۔"

گھوڑا "نہایت ادب سے پنچایت سے التماس ہے کہ حسبِ ضابطہ سزا دی جائے۔ ہمارے بزرگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ سخت سے سخت جرم کی پاداش میں بھی ظلم ناجائز ہے ہم اس جنگلی کے بزرگوں کی طرح خونخوار نہیں۔"

مرغا "سچا، درست۔ مگر کب تک ہمارے خوبصورت کھیت ان وحشیوں کی دستبرد سے محفوظ نہ ہوں گے؟"

آہو "میری رائے یہ ہے کہ اس جنگلی کو پھاڑ کر دیکھا جائے کہ ان کے جسم کے کس حصہ میں نافہ شرارت ہے اگر ہو سکے تو ہمیں عملِ جراحی سے اس تمام جماعت کو اس نافہ سے محروم کر دینا چاہیئے۔"

بندر "جو سزا بزرگوں نے تجویز کی ہے اس میں رد و بدل قطعی لازمی ہے۔ بندر قوم قدرے ضعیف ہو رہی ہے کیا وجہ ہے کہ ان جنگلی لوگوں کے دماغ سے بندروں کے دماغ میں پیوند نہ لگایا جائے۔"

صدر پنچایت (شیر) "ہماری قوم نے اپنے زمانۂ جہالت میں اس جنگلی کے چند بزرگوں کو چکھا تھا میری رائے بطور ماہر یہ ہے کہ اس جنگلی کا ہر قسم کا استعمال غیر مناسب ہے۔ یہ جنگلی فطرت کی غلطی مجسم ہے اس لئے حکم ہے کہ وہی پرانی سزا اسے دی جائے یعنی نہایت گہرے سمندر میں ہر قسم کی خشکی سے دس میل دور اس جنگلی کو چھوڑ دیا جائے۔ پنچایت برخاست۔"

پنچایت والے ادھر ادھر جو چلنے لگے تو محض اتفاق سے میں کتے اور بیل کے پیچھے پیچھے ہو لیا خیال یہ تھا کہ سنوں یہ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں۔

کتا۔ "جب اس قسم کے جنگلی کا مقدمہ پیش ہو تو مجھے ضرور رنج ہوتا ہے۔"

بیل۔ "کیوں؟"

کتا "بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے ایام جاہلیت میں ان جنگلیوں کا کتوں سے سلوک اچھا تھا۔"

بیل "بالکل غلط۔ محض ان جنگلیوں کی بدولت کتوں اور بیلوں میں بے انتہا مخاصمت تھی۔ تمہیں تاریخ سے مس نہیں ورنہ تمہیں ضرور پتہ ہوتا کہ محض ان جنگلیوں کے ظلم سے مجبور ہو کر شریف ترین کتے بھی ہرن اور گیدڑ کا شکار کرنے لگ گئے تھے۔ یہ جنگلی درندے نہ صرف خود خونخوار تھے بلکہ باقی جانداروں کو بھی ذلیل عادات پر مجبور کرتے تھے۔"

کتا "میری لاعلمی واقعی قابلِ رحم ہے مگر اس بات میں تو آپ مجھ سے ضرور متفق ہوں گے کہ ہماری پنچایت میں جب کبھی سؤر تقریر کرتا ہے تو نہایت ہی بے معنی تقریر کرتا ہے۔"

بیل "ہاں مگر اس کا قصور نہیں۔ اس سؤر کا مورثِ اعلیٰ ہندستان کا رہنے والا تھا۔"

لاحول ولاقوۃ۔ مچھلی اچھی نہ بنی ہو تو کس کس قسم کے خواب آتے ہیں۔ ہندستان! ہندستان! ہندستان!!! شکر ہے ہماری دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں۔

فلک پیما

رُباعیات

(۱)

فطرت کا سخن ہے ہمہ تن گوش رہو
گر ذوقِ حقیقت ہے تو مدہوش رہو
مضطرب ہے خدارا کہ یہ اُس کا دنیا
یہ راگ جو سُنتا ہے تو خاموش رہو

(۲)

یہ بھی نہ کہو کہ یہ ہی لاثانی ہے
یہ بھی نہ کہو کہ وہ ہی ربانی ہے
حیرت کدۂ دہر میں دل والوں کو
یہ بات یہ حیرانی ہی حیرانی ہے

(۳)

بارانِ کرم ہر دل پہ برس جانے دو
اس دشت میں ایثار کو بس جانے دو
ایثار کے تصرف میں کرو سب کو شریک
زیبائی بنانے کی ہوس جانے دو

(۴)

اے زینتِ اشعاعِ آسمانی ہے تو
فانی بھی ہے پھر بھی جاودانی ہے تو
جس نے کیا ظلماتِ جہاں کو روشن
انوارِ خدا کی وہ نشانی ہے تو

ب

قصّہ نویسی و قصّہ خوانی

ہر انسان کے دل میں قصے کا فطری شوق پایا جاتا ہے۔ مرد ہو یا عورت۔ بچہ ہو یا بوڑھا عالم ہو یا جاہل وحشی ہو یا مہذب جسے دیکھو قصہ کا گرویدہ نظر آتا ہے۔ قصہ کا طلسمی اثر مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کی سحر کاری کبھی ہمیں مختلف اقطاعِ عالم کی سیر کراتی ہے اور کبھی مختلف زمانوں سے گذار کر زمانۂ ماقبلِ تاریخ کے کھنڈروں میں گم کر دیتی ہے۔ بعض خشک مزاج لوگ قصہ خوانی کو تضیعِ اوقات کا موجب خیال کرتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو قصے کی جگہ اور کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی۔ اعلیٰ درجہ کے قصے علمی و ادبی و تمدنی و معاشرتی اور اخلاقی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ صرف بے انتہا بصیرت افروز ہوتے ہیں بلکہ جو کام باتوں ہی باتوں میں ان سے لیا جا سکتا ہے وہ ادب کے کسی اور شعبے سے نہیں لیا جا سکتا۔ یہاں یہ لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اچھے قصے اچھا اثر پیدا کرنے پر قادر ہیں وہاں بُرے قصوں کے اثرات بھی بعض اوقات نہایت مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

قصہ کی عالمگیر دلچسپی کے مختلف اسباب ہیں۔ بچوں کو قصہ اس لئے مرغوب ہے کہ وہ اس میں اپنے جذبۂ عجوبہ پسندی کی آسودگی کے لئے وافر سامان موجود پاتے ہیں۔ قصہ سے نوجوانوں کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سنسنی پیدا کرنے والے واقعات اور پُرخطر مہمات کا بیان ان کی جوشیلی طبیعت میں ولولہ و ہیجان پیدا کرتا ہے۔ معمر کاروباری لوگ قصوں کا مطالعہ اس غرض سے کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے اُن کو دنیاوی مخمصوں اور بکھیڑوں سے نجات ملے اور وہ کچھ دیر کے لئے کاروباری پریشانیوں کو بھول جائیں۔ بہرکیف جو چیز ان میں بطورِ قدرِ مشترک شامل ہے وہ یہ ہے کہ قصہ خوانی سے زندگی کے چند لمحے بےفکری اور خوشی و خرمی کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔ اسی غرض کی تکمیل کے لئے قدیم مشرقی درباروں میں داستان گو مقرر کئے جاتے تھے۔ قصہ کا یہ عام تفریحی مقصد اگرچہ بُرا نہیں کہلا سکتا تاہم اس کے ادنیٰ اور پست ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ جو قصہ تفننِ طبع کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ اور کوئی اعلیٰ مقصد پیشِ نظر نہیں رکھتا اس کی حیثیت گنجفہ و شطرنج یا دوسرے تفریحی مشاغل سے کسی طرح بڑھ کر نہیں ہو سکتی لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہر زمانے میں قصّوں سے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام انجام پاتا رہا ہے۔ قصہ گوئی سب سے قدیم صنفِ ادب ہے جس کا دامن ابتدائے تمدن کے ساتھ وابستہ ہے۔ شاعری کی طرح قصہ گوئی بھی اسی وقت معرضِ وجود میں آئی تھی، جبکہ انسان طرزِ تحریر سے بالکل ناآشنا تھا۔ لیکن قدیم زمانے میں بھی قصہ کے دو مقصد تھے ایک ادنیٰ دوسرا

محض لطف و دلچسپی کا سامان فراہم کرنا اس کا ادنیٰ مقصد تھا اور اخلاق کی درستی اور معاشرت کی اصلاح کا زبردست آلہ بننا اس کا اعلیٰ مقصد تھا۔

تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور میں تین قسم کے قصے رائج تھے۔ اول وہ قصے جن میں قومی بہادروں اور قبائلی سورماؤں کے کارنامے نہایت مبالغے کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے۔ ان قصوں سے فرزندانِ قوم کو اپنے نامور اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے اور میدانِ جنگ میں جوانمردی اور شجاعت کے جوہر دکھانے کی ترغیب ہوتی تھی دوسرے وہ قصے جن میں بزرگانِ دین اور شہیدانِ ملت کی مقدس زندگی کے واقعات بیان کئے جاتے تھے تاکہ سننے والے کے مذہبی عبادات میں گرمی و اشتغال اور ان کے ایمان و یقین میں جوش و استواری پیدا ہو تیسرے وہ قصے جو حسن و عشق کی دلچسپ داستان پر مشتمل ہوتے تھے۔ وحشی سے وحشی انسان کے دل میں بھی عشق و محبت کی گرمی پائی جاتی ہے اس لئے ہر زمانہ میں عشقیہ قصے قلوبِ انسانی کو تڑپاتے رہے ہیں۔ یہی قصے سب سے زیادہ پُرلطف اور دلچسپ ہوتے ہیں۔

لیکن تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قصے کے مقاصد میں بھی وسعت اور بلندی پیدا ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ قصہ اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا ایک زبردست آلہ بن گیا۔ اس میں حکمت و فلسفہ، الٰہیات و مذہب، مدن و سیاست اور دوسرے علوم و فنون کے نکات بھی بیان کئے جانے لگے۔ یہاں تک کہ قصے انسان کو رنج و غم میں تسلی دینے، اس کے اعتقاد و ایمان کو تقویت پہنچانے اور اس کی ہمدردی و شرافت کے جذبات کو اُبھارنے کا کام بھی انجام دینے لگے۔ آج کل کوئی بلند پایہ ادیب صرف لطف و دلچسپی پیدا کرنے کے لئے قصے تصنیف نہیں کرتا بلکہ چند اعلیٰ مقاصد بھی پیش نظر رکھتا ہے۔

سر والٹر ریلے کا بیان ہے کہ عہدِ الزبتھ کے لوگوں کو جدال و قتال کے واقعات سے بڑی دلچسپی تھی لیکن شیکسپیئر نے ان کی تشفی کے لئے ان کے آگے "ہیملٹ" پیش کیا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ "ہیملٹ" کا ڈراما صرف کشت و خون کے واقعات ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں سبق آموزی و عبرت انگیزی کے سامان بھی موجود ہیں۔ شیکسپیئر نے حیاتِ انسانی کے بہت سے رموز و اسرار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غرض کہ وہی قصہ نویس صاحبِ کمال کہلانے کا مستحق ہے جس کی پیش کش لوگوں کی توقعات و مطالبات سے بڑھ کر ہوتی وہ ہے جس کی بخشش کا بارِ دستِ سوال سے اُٹھ نہ سکے اور قصہ نویس وہ ہے جس کے فسانوی چمن کے گلوں کی فراوانی قاری کی گلچینی سے درازِ دامنی کا مطالبہ کرے۔

جو پرانے قصے اور افسانے زمانے کا سرد و گرم دیکھنے کے بعد باقی رہ گئے ہیں ان میں سامانِ دلچسپی کے علاوہ بعض ایسی اعلیٰ خصوصیتیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جو ان کی بقا و ثبات کا موجب ہیں۔ ہر بلند پایہ افسانوی تصنیف پڑھنے والے کی نظر میں وسعت اور معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے وافر مواد اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس میں مشاطگی اور افادت دونوں مضمر ہوتی ہیں۔ چنانچہ الف لیلہ، داستانِ امیر حمزہ، طلسمِ ہوشربا وغیرہ بھی جن میں زیادہ تر خلافِ عادت و فوق الفطرت واقعات بیان کئے گئے ہیں سبق آموزی و بصیرت افروزی کے عناصر سے خالی نہیں ہیں

کیا یہ غیر فانی افسانے صرف ہمارے جذباتِ عجائب پسندی کے محرک یا مسکن ہیں؟ کیا ان کے مطالعہ سے بجز تفریح و تفنن کے اور کوئی مفید مطلب پورا نہیں ہوتا؟ کیا وہ زندگی کے مختلف شعبوں پر روشنی نہیں ڈالتے؟ کیا ان سے حیاتِ انسانی کے گوناگوں معاملات کی تشریح نہیں ہوتی؟ اگر ان کی دوسری اہم خصوصیتوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو ایک یہی خصوصیت کیا کم ہے کہ وہ اپنے زمانۂ تصنیف کی اخلاقی و معاشرتی کیفیتوں کی نہایت تفصیل کے ساتھ آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے قدما کے اخلاق و عادات، معتقدات و مزعومات، خیالات و توہمات، رسم و رواج، لباس و پوشاک، آدابِ مجلس، اصولِ معیشت، طرزِ معاشرت وغیرہ کی ایسی واضح و روشن تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے جو تاریخ کے صفحات میں کبھی نظر نہیں آسکتی۔" الف لیلہ میں جنوں، دیووں، پریوں اور ساحروں کا ذکر اس کثرت سے آتا ہے کہ بعض سطح آشنا نقاد ان قصوں کو محض طفلانہ دلچسپی کا سامان تصور کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت" الف لیلہ" کا باکمال مصنف قصہ نویسی کے اعلیٰ مقاصد سے بے خبر نہ تھا چنانچہ وہ اپنی عجیب و غریب تصنیف کے دیباچہ یا تمہید میں حمد و نعت کے بعد رقمطراز ہے کہ" اسلاف کے روشن کارنامے اور قدما کے سوانح حیات اخلاف کے لئے سراجِ منہاج ثابت ہوتے ہیں۔ مللِ سابقہ کی تاریخ اربابِ نظر کو فروغِ بینائی عطا کرتی ہے انسان کو چاہیئے کہ دوسروں کے واقعاتِ زندگی پر غور کرکے ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرے۔ حمد و ستائش کے لائق ہے وہ بزرگ و برتر ہستی جس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے اساطیر الاولین کو آنے والی نسلوں کے لئے شمعِ ہدایت بنایا۔ الف لیلہ بھی اخلاقی تعلیم کا بہترین مکتب ہے۔ اس کے ہر قصے میں حقیقت نگر آنکھوں کے لئے عبرت کا درس اور معرفت کا سبق موجود ہے"۔ اسی طرح وہ تمام قدیم افسانے جن کی بقائے دوام کی مہر جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکی ہے۔ سبق آموزی کا وافر سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص محض دلچسپی اور وقت گذاری کے لئے قصے پڑھے اور کسی بلند تر چیز کی تلاش نہ کرے تو اس میں مصنف کا کیا قصور؟ تمام مشہور قصوں اور افسانوں میں کچھ نہ کچھ مفید باتیں ضرور ہوتی ہیں لیکن جب قاری کی سہل انگاری اور بے پروائی ان کی تلاش سے قاصر رہتی ہے تو وہ اپنے نقصِ بصر کا اعتراف کرنے کے بجائے مصنف کی کم لیاقتی کی شکایت کرنے لگتا ہے۔ اگر قصہ نویس مسلمہ قابلیت کا مالک دار ہو اور ہیئتِ اجتماعیہ سے اپنے کمال کا لوہا منوا چکا ہو لیکن قاری کی کوتاہ نظر اس کی تصنیف کے نازک پہلوؤں اور باریک نکتوں تک نہ پہنچ سکے تو اسے اپنے ذہن کی نارسائی اور ذوقِ جستجو کے فقدان پر ماتم کرنا چاہیئے لیکن یہاں بھی پڑھنے والے کا غرورِ ہمہ دانی اپنے ضعف و عجز کا اقرار نہیں کرتا بلکہ مصنف ہی کے سر مشکل گوئی و تعقید معنوی کا الزام تھوپ دیتا ہے۔ قاری میں اس قسم کی کمزوریاں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ افسانہ نگار کو تو اپنے فن کا ماہر ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن ادبیات کے مطالعہ کے لئے بھی قواعد و ضوابط مقرر ہیں جن سے ہر قاری کو واقف ہونا ضروری ہے۔ تفریح و تفنن کا شوق بُری چیز نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنی تمام تگ و دو محض تفریحی مقصد

تکمیل کے لئے وقف کر دے اور مفید باتوں کی تلاش سے جی چرائے تو اربابِ بصیرت کے نزدیک وہ کور مذاق سمجھا جائے گا۔ افسانوی ادبیات سے لذت اندوز ہونے اور اس سے کماحقہٗ استفادہ کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت اور اصلاحِ مذاق درکار ہے۔ ایک مغربی نقاد کا قول ہے کہ ہمیں کسی بلند پایہ افسانہ کا کم از کم دس بار مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ عجائب پسندی کے جذبات کی کامل سیر پذیری اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کے اشتیاق کی قطعی آسودگی کے بعد ہمیں قصہ کی گہرائیوں میں غوطے لگا کر حکمت و فلسفہ اور علم و اخلاق کے آبدار موتی نکالنے کا کافی موقع اور وقت ملے۔

اربابِ نظر کا خیال ہے کہ فنونِ لطیفہ کی ہر پیداوار میں قصے کا عنصر مضمر ہوتا ہے ہم کسی اختراعِ فنی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتے جب تک ہمیں ان قصوں کا کامل ادراک و احساس نہ ہو جو اس کے اجزائے ترکیبی میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ ارسطو کا بیان ہے کہ تمام فنونِ لطیفہ کی بنیاد محاکات پر قائم ہے۔ محاکات صرف عالمِ خارجی کی مادّی و مقرون اشیا کے استقصا تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ قلبی وارداتوں اور ذہنی کیفیتوں کی مصوری بھی محاکات میں شامل ہے۔ قصہ کے عام و محدود مفہوم سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن وسیع معنوں میں اس کا اطلاق ان نقوشِ تاثر پر بھی ہوتا ہے جو انسان کے آئینۂ قلب یا لوحِ دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں۔ قصہ کا خاص موضوع انسانی زندگی کے واقعات و معاملات ہیں لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ احساسات و تاثرات بھی حیاتِ بشری کا اہم جزو ہیں۔ اس لئے ان کا استقصا بھی قصہ گوئی کے دائرہ میں شامل ہے۔ البتہ جو قصہ جذبات کی گہرائیوں میں پوشیدہ رہتا ہے اس پر ہر کس و ناکس کی نظر نہیں پڑ سکتی بلکہ اس کی تلاش و دریافت کے لئے ژرف نگاہی کی ضرورت ہے۔ ہر انسان میں لٹریچر اور آرٹ یعنی ادب و فن کاری کی قدر شناسی کا مادّہ اس کی ذاتی لیاقت و صلاحیت کے متناسب ہوتا ہے کسی شخص کی معلومات جتنی وسیع اور ذہنی تربیت جس قدر اعلیٰ ہو گی اتنا ہی زیادہ وہ فنونِ لطیفہ سے محظوظ و متاثر ہو گا بہترین فنونِ لطیفہ میں معماری۔ سنگ تراشی۔ نقاشی۔ موسیقی اور شاعری کا شمار ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک فن کو قصہ سے خاص لگاؤ ہے۔ مثلاً مانڈو کی عالیشان عمارتوں کے کھنڈر زبانِ حال سے مالوہ کی قدیم عظمت و شوکت کی داستان سناتے ہیں۔ باز بہادر خاں اور روپ متی کے سرفروشانہ و جاں نثارانہ عشق و محبت کی یاد ان کھنڈروں میں رومانی اور ڈرامائی دلچسپی پیدا کر دیتی ہے جس سے دیکھنے والا محوِ حیرت بن جاتا ہے۔ کیا غار ہائے ایلورا کی بت تراشیوں اور کندہ کاریوں میں برہمنی، بودھی اور جینی دیومالا کے قصے خوابیدہ نہیں ہیں؟ کیا اجنٹا کے مغاری منادر کے در و دیوار جن تصاویر سے بسے ہوئے ہیں وہ بودھی جاتک کے قصوں کی ترجمانی نہیں کرتیں؟ ان نادر یادگار فن کی آفاق گیر شہرت و مقبولیت کا راز ان کے ضمنیاتی قصوں ہی میں تو مضمر ہے ورنہ ایک عامی شخص کے لئے جس کی علمی کم مائگی ان معنی خیز قصوں کی تعبیر و تشریح سے قاصر ہو قدیم صناعی و فن کاری کے یہ نادر نمونے کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اس کی

قدرشناس آنکھوں کو مانڈو کے عمارتی کھنڈر سے قصبہ کا مسافرخانہ زیادہ بارونق ایلورا کے مغاری مندر سے گاؤں کا دیسی استھان زیادہ آباد اور اجنٹا کی نقاشیوں سے کپڑے کے تھان پر کی تصویریں زیادہ بھڑکیلی نظر آتی ہیں۔

موسیقی بھی خوابیدہ قصوں کو بیدار کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف مطرب کی نواپیرائیاں فرحت و انبساط کے گذرے لمحوں کی یاد تازہ کرتی ہیں تو دوسری طرف مغنی آتش نفس کی دردسرائیوں سے غم والم کے بیسیوں گزشتہ واقعات پیش نظر ہوجاتے ہیں۔ اب ذرا شاعری پر غور کیجئے۔ رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں میں جنگ وجدال اور حسن وعشق کے قصے تو بیان ہوتے ہی ہیں لیکن داخلی شاعری بھی جس کی بہترین نمائندہ غزل ہے قصوی عنصر سے خالی نہیں ہوتی۔ غزل کے اشعار میں دردِ دل کی کہانی کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے؟ شاعر کا گوش شنوا نہ صرف بزم طرب کی ہنگامہ آرائیوں، عنادل کی نغمہ پیرائیوں اور گلی کوچوں کے شوروغل میں بلکہ رات کی خاموشی، قبر کے سناٹے اور صحرا کی سکوں پرور فضا میں بھی حسن و عشق کی حکایتیں سنتا ہے اگر اس کے تخیل کی پرواز ذرا اور بلند ہوئی تو اسے عالمِ ہُو میں بھی کسی کا فسانۂ دل سنائی دیتا ہے جس کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے۔

عالمِ ہُو میں کچھ آواز سنی جاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہی فسانہ دل کا

لیکن ایسے قصے اور افسانے جسمانی کان سے نہیں سنے جاسکتے بلکہ ان کے لئے گوش حقیقت نیوش کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں قدیم زمانے سے یہ مقولہ چلا آرہا ہے کہ شعر فہمی شعر گوئی سے زیادہ مشکل ہے۔ کوئی شخص نکات شعری کا اداشناس نہیں بن سکتا جب تک اُسے خداداد صلاحیت، مذاقِ سلیم اور گہری تنقیدی نظر حاصل نہ ہو کچھ اشعار ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر اختراعِ فنی کی قدرشناسی ان قصوں اور روایتوں کے علم وادراک کی رہینِ منت ہوتی ہے جو اس کی تہ میں پائی جاتی ہے۔ ایک عامی شخص کے لئے بھی کوئی خوبصورت تصویر یا مجسمہ جنتِ نگاہ اور کوئی دلپذیر نغمہ یا شعر فردوسِ گوش بن سکتا ہے لیکن جن روایات و تلمیحات کے وہ حامل ہوتے ہیں۔ ان کو پوری طرح سمجھے بغیر قلب میں اہتزازی وارتعاشی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ بغیر کسی اہتمام و تیاری کے ادبی کتابوں کو پڑھ لینا آسان بات ہے لیکن ان سے کماحقہٗ حظ اندوز ومستفید ہونے کے لئے خاص قسم کی ذہنی تربیت اور اصلاحِ مذاق کی ضرورت ہے۔ اگر مصنف بننا ٹیڑھی کھیر ہے تو متعلم بننا بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ اسی طرح قصہ خوانی بھی قصہ نویسی سے کم دشوار نہیں ہے۔ ممالکِ متمدنہ میں مطالعۂ ادبیات اور فنِ تنقید پر سیکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ قاری کو اصولِ مطالعہ سے اچھی طرح واقف ہونا چاہئے۔

منظوم قصوں اور حکایتوں سے تو ہر شخص واقف ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ غزل کے منفرد اشعار کو جن میں وارداتِ قلبیہ وامورِ ذہنیہ کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ قصوں اور افسانوں سے کیا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے

کہ ہر قسم کی داخلی و خارجی شاعری میں قصہ ہی عنصر شامل رہتا ہے جس کا انکشاف شعر کی اثر آفرینی کو المضاعف اور اس کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے بعض اشعار کے توصرف مضامین ہی نہیں بلکہ الفاظ اور فقرے بھی مختلف روایات تلمیحات حکایات یا تاریخی واقعات کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر سامع کا ذہن ان کی طرف منتقل نہ ہو تو اشعار کا گہرا اثر اس کے دل پر نقش نہ ہوگا۔ مثلاً مرزا غالب کا ایک شعر ہے کہ

ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

اس کا ظاہر مفہوم توصرف اس قدر ہے کہ شاعر ایک ایسے خوشنوا مغنی کی تلاش میں ہے جس کی شیریں آواز اس کے لئے پیامِ موت ثابت ہو لیکن صرف اتنا مطلب جان لینے سے کوئی شخص اس شعر کا پورا لطف اٹھا نہیں سکتا نکتہ فہمی و بلاغت شناسی کا تقاضا ہے کہ ان قصوں اور روایتوں پر بھی عبور حاصل کیا جائے جن کی طرف اس شعر کے الفاظ جو فی الحقیقت "گنجینۂ معنی کا طلسم" ہیں اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں غور طلب امور یہ ہیں کہ مغنی کو آتش نفس کیوں کہا گیا ہے؟ موسیقی کو آگ یا گرمی سے کیا مناسبت ہے؟ طرب کی آگ کیونکر پیامِ مرگ بن سکتی ہے؟ روایت ہے کہ موسیقی کی ابتدا ققنس یا موسیقار نامی ایک عجیب الخلقت پرندے کی نواسنجی سے ہوئی ہے۔ اس کی چونچ میں تین سو ساٹھ سوراخ ہوتے ہیں۔ جب یہ پرندہ ہوا کے رُخ پر بیٹھتا ہے تو اس کی چونچ کے ہر سوراخ سے ہوا کے داخل اور خارج ہونے کے وقت نیا نیا راگ نکلتا ہے۔ جب پرندے کی عمر ایک ہزار سال کی ہو جاتی ہے تو وہ بہت سے تنکے اور گھاس جمع کرتا ہے اور اُن پر بیٹھ کر گانے لگتا ہے۔ جب اس کی چونچ سے سب سے زیادہ سُریلا نغمہ یعنی دیپک راگ نکلتا ہے تو اس کے اثر سے تنکوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ پرندہ جل کر خاکستر بن جاتا ہے۔ جب اس کی خاک پر پانی برستا ہے تو ایک نیا ققنس یا موسیقار پیدا ہوتا ہے۔ بعض قومیں سورج دیوتا کو موسیقی کا موجد خیال کرتی ہیں۔ آفتاب کو نور و حرارت سے جو تعلق ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ "جلوۂ برقِ فنا" سے گوش آشنا ہوتے ہی کوہِ طور پر تجلیِ ربانی کے نمودار ہونے، پہاڑ کے جل جانے اور حضرتِ موسیٰ کے غش کھانے کے قصہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مغنی کی صدا کے پیامِ اجل ثابت ہونے کے متعلق بھی بیسیوں قصے زبان زدِ خلائق ہیں۔ مجلسِ سماع میں بہت سے بزرگ قوال کے نغموں سے متاثر ہو کر جاں بحق تسلیم ہو چکے ہیں۔ ان بزرگوں کے حالات تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں درج ہیں۔ کیا ان تمام قصوں سے واقف ہونے پر مذکورۂ بالا شعر کی دلچسپی و تاثیر میں بیحد اضافہ نہیں ہو جاتا؟

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ قصے کے نہایت وسیع مفہوم سے تعلق رکھتا ہے لیکن عام طور پر قصے کے متعارف اصناف افسانہ، داستان، اساطیر، ناول اور ڈراما وغیرہ ہیں۔ اربابِ ذوق کے نزدیک وہ قصہ بالکل لغو اور بیکار ہے جس میں سنسنی اور تعجب انگیزی کی قربان گاہ پر صداقت و حقیقت کا بھینٹ چڑھا دیا گیا ہو۔ بعض نا اہل افسانہ نگار سنسنی

پیدا کرنے کے لئے ہیرو یعنی باطل قصہ سے بڑی بڑی مہمات سر کراتے ہیں لیکن جب اس کا موقف نہایت کمزور ہو جاتا ہے اور وہ ہر طرف سے خطروں سے گھر جاتا ہے جن سے نکلنے کی کوئی معقول تدبیر نہیں سوجھتی تو خواہ مخواہ خواجہ خضر یا کرشن جی یا کسی اور دیبی یا دیوتا کو امداد کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں سے استمداد و استعانت بُری چیز نہیں ہے لیکن غیر مرئی ہستیوں کو انسانی روپ دھارن کرا کے انہیں ہیرو کے محافظ دستہ کا سپاہی بنا دینا سخت مضحکہ خیز امر ہے بعض چالاک قصہ نویس ابتدا ہی میں ہیرو کو کسی ولی یا فقیر سے بالِ سیمرغ یا طلسمی تعویذ دلا دیتے ہیں کہ وقتِ ضرورت کام آئے اس کے بعد وہ اپنے اشہبِ قلم کو صحرائے طلسم میں ہر قسم کی جولانی دکھانے کے لئے بے لگام چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وزیر دار السلطنت سرور نگر میں ہے اور بادشاہ سلامت ہزاروں میل کے فاصلہ پر سندر بن میں شکار کھیل رہے ہیں۔ شکار گاہ میں کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ معاً وزیر ایک دستۂ فوج کے ساتھ ہزاروں میل کا فاصلہ آن کی آن میں طے کر کے موقع واردات پر آ دھمکتا ہے۔ بعض وقت نوعمر و نازک شہزادہ ایسے پرخطر ہفت خوان طے کرتے نظر آتا ہے جو رستم اور ہرقل سے بھی طے نہ ہو سکے۔ کبھی مکالمہ میں ایک بھولی بھالی لڑکی کی زبان سے ایسے ادق فلسفیانہ نکتے بیان کرائے جاتے ہیں جنہیں سن کر ارسطو اور افلاطون کی روحیں بھی پھڑک اٹھیں۔ اسی قسم کے فوق الفطرت و خلافِ عادت واقعات نے افسانہ کو اس قدر بدنام کر دیا کہ افسانہ کا لفظ ہی جھوٹ اور غلط بیانی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ جب قصے یا افسانے کا صحیح موضوع انسان اور اس کے اعمال و افعال ہیں تو قصہ میں جو واقعات بیان ہوں انہیں ضرور حقائقِ زندگی کے مطابق ہونا چاہیئے یعنی ان میں صداقت پائی جانی چاہیئے۔ لیکن صداقت کا ہرگز یہ اقتضا نہیں ہے کہ روزمرہ زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں انہیں من و عن بیان کر دیا جائے یا افسانہ نگار اپنی ساری تگ و دو صرف ذاتی تجربات و مشاہدات کے تنگ حلقہ میں محدود رکھے۔ اور تخیل سے کام نہ لے جیسا کہ آج کل ناول نویسوں کے ایک گروہ کا خیال ہے جو حقیقیین (رئیلسٹ) کہلاتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان کی مشہور مصنفہ جارج ایلیٹ کا قول ہے کہ "افسانہ نویس کو اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے آگے قدم بڑھانا نہیں چاہیئے۔ دیہات کی پلی ہوئی لڑکی کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ شہری زندگی و معاشرت کی تصویر کشی کی کوشش کرے اسی طرح صنفِ نازک سے تعلق رکھنے والی مصنفہ کو ایسے کلبوں کے درج کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے جو صرف مردوں کی سوسائٹی سے مخصوص ہوں" لیکن جارج ایلیٹ کا یہ قول انتہا درجہ کی تنگ خیالی پر مبنی ہے۔ یہ صداقت نہیں بلکہ صداقت کی توہین ہے۔ اس پر عمل کرنا گویا تخیل کے پر و بازو کو توڑ دینا ہے۔ اس قسم کی صداقت کی ضرورت تاریخ اور سائنس میں ہو تو ہو لیکن افسانہ میں اُس وسیع و عالمگیر صداقت کی ضرورت ہے۔ جسے ارسطو نے "شعری صداقت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ شاعری، ادب اور افسانہ کی صداقت تاریخ فلسفہ اور سائنس کی صداقت سے کہیں بالاتر ہے۔ ہر جدید دریافت یا انکشاف سائنس کے مسلمات پر ایک ضرب کاری لگاتا ہے۔ اس لئے فلسفہ اور سائنس کے اصول و نظریات آئے دن بدلتے رہتے

ہیں بلکہ تاریخ پر بھی نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ لیکن صداقتِ شعری میں جس کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات، اس کے فطری رجحانات اور طبعی خصائص سے ہے کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ خارجی عالم میں بڑے بڑے انقلابات و تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں لیکن انسان کی جذباتی و روحانی دنیا کے اصول و قوانین کبھی نہیں بدلتے۔ افلاطون نے اپنی مثالی جمہوریت" (آئیڈیل ریپبلک) سے "دروغ باف" شاعروں اور افسانہ نویسوں کو خارج کر دیا تھا لیکن آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ افلاطون کی مثالی جمہوریت" باوجود اپنی بلند بانگ فلسفیانہ صداقتوں کے صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی لیکن ہومر کی "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" اپنی لازوال حقیقتِ شعری" کی بنا پر آج تک قلوبِ انسانی کو گرما رہی ہیں اور ان کا جوش و اثر ابدالآباد تک یونہی قائم رہے گا،

غرض کہ افسانہ نویس کو حسابی صداقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن اسے لازم ہے کہ "شعری صداقت" کا سرشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ زندگی کے واقعات فطری و فن کارانہ اصول کے مطابق بیان کرلے اور اس امر کا خاص لحاظ رکھے کہ اشخاصِ قصہ کا کوئی قول و عمل یا کسی وقت کسی مقام پر ان کی موجودگی خلافِ عادت و غیر متوقع نہ معلوم ہو ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ تمام فنونِ لطیفہ کی رونق اور چہل پہل تخیل و مبالغہ کی کارفرمائی کی منت پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے افسانہ نویس کو بھی تخیل و مبالغہ سے کام لینے کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیئے بشرطیکہ وہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ پروفیسر رچارڈس کا خیال ہے کہ "قصہ میں حقیقت و صداقت کی نمکینی کے ساتھ تخیل اور مبالغہ کی شیرینی بھی پائی جانی چاہیئے۔ جوش اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کے پہلو بہ پہلو ایسی سنجیدہ و پرمغز باتیں بھی بیان ہونی چاہیئں جو قاری کو غور و خوض کی دعوت دیں بعض چیزیں صرف جذبات کو برانگیختہ اور بعض خاموشی کے ساتھ تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان دونوں قسم کے عناصر کی یکجائی پر افسانہ کی عظمت کا انحصار ہے"۔ جس طرح تماشا گاہ میں ممثل دائیلاگ (خط پڑھنے کے معمولی کام کو اعضاء و جوارح کی حرکت، چشم و ابرو کے اشارے اور لب و لہجہ کے مبالغہ آمیز تغیر سے نہایت دلچسپ اور ڈرامائی بنا دیتا ہے اسی طرح افسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ واقعات کو تخیل و مبالغہ کی آمیزش سے تصوری و مثالی بنادے اور اپنی جادو بیانی سے ان میں اور زور پیدا کر دے۔ یہ ضروری نہیں کہ قصہ میں جو واقعات بیان کئے جائیں وہ اصلی و حقیقی ہوں۔ قصے محض فرضی و خیالی بھی ہو سکتے ہیں۔ قصہ نویس کو اختیار ہے کہ شروع میں وہ جو کچھ چاہے فرض کرے۔ ہمیں احتجاج کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن واقعات منتخب اور اصول مقرر کر لینے کے بعد وہ پابند ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر ہم اس سے یہ مطالبہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ وہ اپنے مقررہ حدود سے باہر قدم نہ رکھے نہ اپنے اصول موضوعہ کی خلاف ورزی کرے۔

قصہ میں تناسب و توازن کا قائم رکھنا ضروری امر ہے۔ واقعاتِ قصہ پر ان کی اہمیت و ضرورت کے لحاظ سے اجمالی یا تفصیلی بحث ہونی چاہیئے۔ انسان کی وہ تصویر کس قدر بدہئیت اور بدشکل ہو گی جس میں ایک ہاتھ

کاکان اور بالشت بھر کے پاؤں بنائے گئے ہوں۔ اہم عناصر پر پوری توجہ نہ دینے اور ضمنی و جزئی باتوں کو خوب پھیلا پھیلا کر بیان کرنے سے قصہ بھی ویسا ہی کریہ المنظر بن جاتا ہے۔ بہت سے قصہ نویس تناسب و توازن کے مسئلہ کی اہمیت سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سر والٹر اسکاٹ جیسے زبردست افسانہ نگار کا دامن بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے۔ کسی منظر یا مقام کا بیان قصہ کی علتِ غائی نہیں بلکہ محض ضمنی شے ہے۔ اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی تصویر میں "عقبی منظر" (بیک گراؤنڈ) کی ہوتی ہے۔ لیکن سر والٹر اسکاٹ بعض موقعوں پر کسی منظر یا مقام کی تصویر کشی کے لیئے صفحے کے صفحے سیاہ کرتا چلا جاتا ہے جس سے قاری بیزاری اور تکان محسوس کرنے لگتا ہے اور کبھی تو قصہ کا سلسلہ ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ ترتیب واقعات میں موقع و محل کا بھی خاص لحاظ رکھنا چاہیئے ورنہ قصہ ایک ایسی تصویر کے مانند ہوگا جس میں منہ کی جگہ ناک اور آنکھ کی جگہ کان بنائے گئے ہوں۔ افسانہ نویس کو کوئی خاص پیمانہ اختیار کر لینا چاہیئے۔ ابتدا میں وہ جو پیمانہ چاہے اختیار کر سکتا ہے لیکن ایک بار پیمانہ انتخاب کر لینے کے بعد اخیر تک اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

بلند پایہ افسانہ وہ ہے جس میں حیاتِ انسانی اور نظامِ دہر کے متعلق غور و فکر کے شواہد پائے جائیں۔ قصہ کا موضوع بحث انسان ہے۔ اس لیئے افسانہ نویس کو لامحالہ انسان کے باہمی تعلقات، اس کے خیالات و جذبات، میلانات و رجحانات، عزائم و مقاصد، رنج و خوشی، کشمکشِ حیات، اس کی جد و جہد، کامیابیوں اور ناکامیوں سے بحث کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی باکمال ادیب زندگی کے واقعات و معاملات کے متعلق اپنے ذاتی خیالات اور نقطۂ نظر کا اظہار نہ کرے۔ البتہ وہ براہِ راست اخلاقی مسائل، فلسفیانہ نظریات اور حکیمانہ نکات کی تشریح نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنا صناعی و حسن کاری کے اصول کے منافی ہے تاہم اشخاصِ قصہ کی سیرت پر روشنی ڈالنے اور ان کے افعال و اعمال بیان کرنے کے ضمن میں وہ ایسی باریک باتیں بھی کہتا جاتا ہے جن کی اخلاقی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان باریک باتوں اور نازک نکتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا اور انہیں ایک نظام کے تحت لانا قاری یا نقاد کا کام ہے۔ شکسپیر کو معلمِ اخلاق ہونے کا نہ کبھی دعوے تھا اور نہ اس نے کوئی اخلاقی اصول یا فلسفیانہ مسئلہ پیش نظر رکھ کر اپنے ڈرامے تصنیف کیئے تھے۔ لیکن پروفیسر مولٹن کا ذوقِ تلاش قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے شکسپیر کے ضخیم کلیات کے گوشہ گوشہ سے حکمت و اخلاق کے منتشر موتی چن کر انہیں ایک سلک میں پرویا اور اپنی غیر معمولی کاوش و کاہش کے نتائج کو ایک مبسوط کتاب موسومہ "شکسپیر کا نظامِ اخلاق" کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسی طرح ہر بلند پایہ افسانے یا قصے میں اخلاقی تعلیم یا معاملاتِ حیات کے متعلق بصیرت افروز نکتے مضمر ہوتے ہیں جن کی تلاش و تفحص کے لیئے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ہر عظیم الشان قصہ ہیجان خیز واقعات کے ذریعہ سے ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے علاوہ اپنے سینے میں حکمت و اخلاق کے انمول موتی بھی پوشیدہ

رکھتا ہے جو ہر وقت جوہریانِ سخن کو دریائے فکر میں غواصی کی دعوت دیتے رہتے ہیں لیکن قاریوں کی کثیر تعداد آرام طلبی وسہل انگاری کی عادی ہے۔ وہ بحرِ فکر کی تاریک گہرائیوں میں غوطے لگانے کی ہامی نہیں بھرتے۔ وہ تو بندھا بندھایا لقمہ چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ خود قصہ نویس ہر شے کو واضح طور پر ان کے آگے پیش کر دیا کرے۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے کسی قسم کے محذوفات یا کھانچوں کو پُر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے حالانکہ تمام نقاد پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ قاری کی حیثیت محض انفعالی نہیں ہے بلکہ ہر ادبی مہم میں اسے فاعلی حصہ لینا چاہئے۔ قاری اور مصنف کے درمیان ایک قسم کا ذہنی اتحاد پایا جانا چاہئے تاکہ ایک کے کام یا خیال کی دوسرے کا ذہنی تجربہ آسانی سے تعبیر و تشریح کر سکے۔ البتہ اس کے لئے قاری میں ایک خاص دماغی قابلیت کی ضرورت ہے جو بالعموم مفقود ہوتی ہے۔ قاری کی یہی تعبیری صلاحیت تمام ادبی قدردانیوں اور نکتہ فہمیوں کی کنجی ہے۔ اسی قابلیت کی کمی بیشی سے ایک ہی فنی پیداوار مختلف قاریوں پر مختلف اثر پیدا کرتی ہے۔ ورڈس ورتھ جو ذہنیتِ عامہ کا زبردست نبض شناس تھا قاری سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

"اے عزیز قاری تم نے صبر کے ساتھ اتنی دیر تک انتظار کیا۔ اب تم شاید یہ توقع کرتے ہو گے کہ میں کوئی دلچسپ قصہ بیان کروں گا۔ لیکن کون سی بات قصہ سے خالی ہوتی ہے۔ اگر تمہارے دماغ میں ان قوتوں کا ذخیرہ جمع ہوتا جو خاموش غور و فکر سے پیدا ہوتی ہیں تو تم ہر چیز سے ایک دلچسپ وسبق آموز قصہ اخذ کر سکتے تھے۔ اب بہت ہی کم باتیں کہنے کی رہ گئی ہیں لیکن اگر تم سوچ بچار سے کام لو تو انہیں منتشر اور مختصر باتوں سے ایک باضابطہ اور سلسلہ وار قصہ مرتب ہو سکتا ہے۔"

مشرقی شعرا کا بھی یہی خیال ہے کہ مجمل اشاروں سے قصہ کی تفصیل تیار کرنا قاری کا کام ہے۔ ورڈس ورتھ نے اپنی طول طویل عبارت میں قاری کو جس امر کی ہدایت کی ہے اسے مشرق کا ایک باکمال شاعر صرف ایک مصرع میں یوں ادا کرتا ہے کہ

"تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل"

غرض کہ اصل قصہ کتاب کے صفحات میں نہیں بلکہ خود قاری کے دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ کوئی بڑا ادیب یا شاعر صرف خام مواد فراہم کرتا ہے۔ اس مواد کے صحیح استعمال سے قصہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ بہترین قصے وہی ہیں جنہیں خود قاری اپنے غور و فکر سے مرتب کرے۔ آج کل فنونِ لطیفہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ امور کی تشریح و توضیح کا کام قاری پر چھوڑ دینا چاہئے۔ صناع کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ اشارے اور کنائے بہم پہنچا کر قاری کی رہبری کرے۔

لیکن یہ باریک باتیں صرف اُن قصوں سے تعلق رکھتی ہیں جو فنونِ لطیفہ کی پیداوار اور خصوصاً شاعری میں مضمر رہتے ہیں۔ لیکن افسانوں ناولوں اور ڈراموں میں جو قصے کی عام اور متعارف صورتیں ہیں خود مصنف تمام واقعات کو ایسی صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے کہ قاری کو مزید تفصیل و تطویل کی مطلق فکر نہیں کرنی پڑتی بلکہ اس کے برعکس وہ ایجاز و اختصار کا جویا ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کل مغربی دنیا میں مشہور و معروف افسانوں اور ناولوں کے مختصر ایڈیشن آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ ضخیم افسانوی کتب کے مطالعہ کی زحمت برداشت کرتے ہیں عام طور پر مختصر ایڈیشن ہی شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور مدرسوں میں وہی شریکِ نصاب بھی ہوا کرتے ہیں۔ بہرکیف متعارف قصوں کے اہم عناصر "پلاٹ" (ڈھانچ) اور کردار ہیں۔ پلاٹ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے تمام اجزا کی تنظیم و ترتیب میں تناسب و توازن پایا جائے۔ واقعات کی رفتار مسلسل ہو تاکہ بات سے بات پیدا ہوتی جائے۔ قصہ میں کہیں کھانچیں نظر نہ آئیں اور نہ کہیں متضاد باتیں بیان ہوئی ہوں۔ واقعات اگر فرضی و خیالی ہوں تو مضائقہ نہیں لیکن ان میں ربط ترتیب اور تسلسل کا پایا جانا ضروری امر ہے۔ پلاٹ کے ضمن میں سب سے مہتم بالشان مسئلہ انتخابِ واقعات کا ہے لیکن موجودہ افسانہ نویسوں کی ایک جماعت مسئلہ انتخاب کو لغو اور بے معنی قرار دیتی ہے۔ یہ جماعت "حقیقیئین" (رئیلسٹ) کی ہے حقیقیئین کا خیال ہے کہ چونکہ افسانہ یا قصہ حیاتِ انسانی کے کسی جزو کی محاکات ہے اس لئے چند واقعات کا انتخاب کرنا اور بقیہ کو غیر اہم و غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دینا مناسب نہیں ہے۔ قصہ میں کسی جزوِ زندگی کا ٹھیک اور صحیح چربہ اسی وقت اتارا جا سکتا ہے جب کہ اس جزو کے متعلق تمام واقعات مع تفصیلات و جزئیات کے بیان کئے جائیں۔ زندگی یا جزوِ زندگی کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی جب تک تمام جزئی اور ضمنی باتوں کا بھی استقصا نہ کیا جائے خواہ وہ کتنی ہی پیچیدہ و نازک کیوں نہ ہوں۔ اصولِ انتخاب پر عمل کرنے سے تصویر ناقص و ناتمام رہے گی لیکن "حقیقیئین" کی یہ تجویز نہ صرف فن کارانہ نقطۂ نظر سے معیوب ہے بلکہ ناممکن العمل بھی ہے کیونکہ حقیقی زندگی ایک سرمدی سرچشمہ ہے جس کا پانی ہمیشہ بہتا رہتا ہے اور جس کی نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ جس طرح دریا کا پانی الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح زندگی کے واقعات ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے زندگی کو اجزا میں تقسیم کرنا بھی ناممکن ہے کیونکہ ہر جز یا حصہ کے لئے ایک مقام سے شروع ہو کر دوسرے مقام پر ختم ہونا لازمی امر ہے لیکن واقعاتِ زندگی کا آغاز و انجام نامعلوم ہے۔ مثلاً امان اللہ خاں کی تخت سے معزولی ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن بچہ سقہ کی کامیاب بغاوت کو اس کا سبب اور نادر خاں کے برسرِ حکومت آنے کو اس کا نتیجہ قرار دینا محض طفلانہ خیال ہے۔ ایک ہوشیار مورخ اس واقعہ کو ہزاروں اسبابِ قریبہ و بعیدہ سے منسوب کرے گا۔ اسی طرح اربابِ نظر کے نزدیک اس کے نتائج کی کثرت بھی محیر العقول ثابت ہو گی۔ مورخ جتنا زیادہ غور و فکر کرے گا اتنا ہی اس واقعہ کے علل و اسباب اور عواقب و نتائج کا سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔ یہی حال ہر قسم کے واقعاتِ زندگی کا ہے۔ سچ پوچھو تو ہم

محض اپنی کم عقلی و کوتہ فہمی کی بنا پر کسی واقعہ کے آغاز و انجام کی حدیں مقرر کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں زندگی کا ہر واقعہ اپنے اثر و تاثر اور عمل و تعامل کے لحاظ سے بے پایان ولا محدود ہے۔ علاوہ بریں پارچۂ حیات میں واقعات کا تانا بانا اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی خاص واقعہ کے دھاگے کو الگ کرنا اور اس کے اور چھور کا پتہ لگانا سخت دشوار کام ہے۔ کامل زندگی تو درکنار کسی جزوِ زندگی کے واقعات بھی اپنی کثرت کے لحاظ سے احصاد شمار کے باہر ہیں ان سب کا جائزہ لینا انسان کے بس کی چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی پیچیدہ گتھی کے سلجھانے سے بڑے بڑے مفکروں اور فلسفیوں کا ناخنِ تدبر بھی ہمیشہ قاصر رہا کیا ہے۔ بہر کیف انسانی زندگی کی ہو بہو محاکات کی جتنی دشواریاں اب تک بیان ہوئی ہیں وہ محض انفرادی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابھی اجتماعی زندگی کی مشکلات پر غور کرنا باقی ہے۔ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے وہ معاشرہ سے الگ رہ کر شائستہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہر شخص اپنے معاشری ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور زبردست شخصیتیں سوسائٹی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں کسی شخص کے واقعاتِ زندگی بیان کرنے کے ضمن میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس نے کس حد تک سوسائٹی کے خیالات وجذبات اخذ کئے ہیں اور دوسروں پر اس کے قول و فعل کا کیا اثر پڑا ہے۔ مثلاً امان اللہ خاں کی معزولی کے اسباب و نتائج پر بحث کرتے وقت مورخ کو غور کرنا ہوگا کہ مختلف مشرقی و مغربی سوسائٹیوں کے خیالات و رسوم سے وہ کس حد تک متاثر ہوئے تھے اور خود ان کے رویہ اور کردار نے افغانستان کے عوام و خواص پر کیا موافق یا مخالف اثرات پیدا کئے۔ معاملاتِ حیات کی تصویر کشی کے ضمن میں بحث کا ایک اور اہم پہلو باقی ہے جو شخصی رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی واقعہ پر ہر شخص اپنے ذاتی مذاق و میلانِ طبع کے مطابق حکم لگاتا اور فیصلہ صادر کرتا ہے۔ مشاہدہ کرنے والوں کے نقطہ ہائے نظر جداگانہ اور ان کی رائیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک ہی واقعہ کو ایک فریق اچھا اور دوسرا بُرا خیال کرتا ہے۔ امان اللہ خاں کی معزولی پر باغی قبائل کو بے حد خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن ہندوستان کے اکثر اخبار و جرائد خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ کیا "حقیقیئن" بتا سکتے ہیں کہ جب کسی واقعہ کو ہر شخص اپنے مذاق و میلان کے رنگ میں دیکھتا ہے تو اس کا اصلی رنگ کیا ہوگا؟ علاوہ بریں انسان کا علم محدود اور زندگی کے مظاہر لامحدود ہیں۔ محدود سے لامحدود کا احاطہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایک مغربی نقاد کا قول ہے کہ جب انسان کی محدود نظر ایک مختصر سے کمرے کی ساری کائنات کا بھی پورا جائزہ لینے سے قاصر رہتی ہے تو وہ حقائقِ زندگی کا مشاہدہ کیا خاک کر سکتی ہے۔ ان تمام امور کے پیش نظر "حقیقیئن" کا بلند بانگ دعویٰ کہ وہ انسان کی زندگی یا کسی جزوِ زندگی کا ہو بہو چربہ اتار سکتے ہیں کس قدر لغو اور بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ نویسوں اور سوانح نگاروں کے لئے مذکورۂ بالا مسائل نہایت مفید اور دلچسپ ثابت ہوں گے کیونکہ ان کو حقائقِ واقعہ کی تلاش رہتی ہے۔ لیکن اگر افسانہ نگار ان میں الجھے تو کوئی عظیم الشان قصہ معرضِ وجود میں آ ہی

نہیں سکتا۔ "حقیقیین" کے بالمقابل افسانہ نگاروں کا دوسرا گروہ "صناعین" کا ہے۔ "صناعین" قصہ کو دوسرے فنی اختراعات کی طرح تخیل کی پیداوار خیال کرتے ہیں۔ وہ اُن تمام اصول وضوابط پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو فنونِ لطیفہ سے مخصوص ہیں۔ وہ زندگی یا جزوِ زندگی کی عکسی تصویر پیش کرنے کا دعوےٰ نہیں کرتے بلکہ وہ چند امتیازی نمایاں واقعات لے کر ان کی معیّن ابتدا و انتہا اور قطعی سبب و نتیجہ فرض کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذہن میں قصہ کا خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔ وہ غیر ضروری تفصیلات و جزئیات کو جن سے پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ترک کر دیتے ہیں لیکن ضرورت کے وقت ربط و تسلسل کی خاطر اپنے دل سے نئے نئے واقعات گھڑ بھی لیتے ہیں۔ اس ترکیب سے پورا قصہ واضح، روشن اور سہل الفہم بن جاتا ہے۔ زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے وہ قصہ میں حرکت اور روانی دکھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ حرکت اور زندگی لازم وملزوم ہیں حرکت ہی زندگی کی روح و رواں ہے ورنہ سکون جمود و موت کا مترادف ہے۔ کوئی قصہ زندگی کی نمائندگی نہیں کر سکتا جب تک اس میں حرکت نہ پائی جائے۔ لیکن یہ حرکت پانی کے بہاؤ کی سی نہیں ہوتی۔ بہتے پانی کے سالمات یا اجزائے ترکیبی ایک دوسرے پر پھسلتے جاتے ہیں لیکن قصہ کے تمام واقعات باہم منسلک و مربوط ہوتے ہیں۔ گویا قصوی واقعات یکجا منجمد ہو کر برف کے مستقل تودے کی طرح زندگی کے بے پایاں سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ بلکہ ان کی زیادہ صحیح مثال گراموفون (مرمقوال) کے ریکارڈ سے دی سکتی ہے جسے ہم جب چاہیں مشین پر چڑھا کر اس کا نغمہ سن سکتے ہیں۔ انگلستان کے مشہور ادیب و نقاد چارلس لیسم کا قول ہے کہ "باکمال افسانہ نویس حیاتِ انسانی کے لامتناہی واقعات و معاملات کے پیہم چکر سے تنگ آکر اپنا زبردست ہاتھ زندگی کے متحرک چاک کے کسی ڈنڈے پر رکھ دیتا ہے جس سے تھوڑی دیر کے لئے اس کی رفتار تھم جاتی ہے۔ تمام کاروبار رُک جاتے ہیں اور وہ اپنی ضرورت کے مطابق قصہ کا مواد و سامان جمع کر لیتا ہے"۔ یقیناً عظیم الشان چرخِ حیات کو انسانی ہاتھ روک نہیں سکتا۔ چارلس لیسم نے افسانہ نویس کے تخیل کی کارفرمائی بیان کی ہے۔ البتہ تخیل کی زبردست قوت ہر شئے پر غالب آسکتی ہے۔ جماعتِ "صناعین" سے تعلق رکھنے والا قصہ نویس زندگی یا جزوِ زندگی کی عکسی نہیں بلکہ مطمحی و مثالی (آئیڈیل) تصویر پیش کرتا ہے۔

محمد حسین ادیب

نعت

پریم پنتھ[۱] پھیلانے والے کوثر[۲] ساگر پانے والے
وحدت کتھا سنانے والے بیڑا پار لگانے والے
پریم گسائیں سُندر سائیں
آپ ہی ہیں بخشانے والے
ہم نے جگ میں پاپ کئے ہیں سر نہیں اُٹھتا شرم کے مارے
کسے دکھائیں اپنی دُسا ہم جائیں کہاں ہم دُکھ کے مارے
پریم گسائیں سندر سائیں
دُکھی دِلوں کے آپ سہارے
سُن لو، سُن لو، بپت ہماری آؤ پاپی من کو سنوارو
ایشور کے درشن دکھلاؤ ہر سُو نور دیا کو بارو[۳]
پریم گسائیں سُندر سائیں
پاپی جگ سے پار اُتارو

سید مقبول حسین
(احمد پوری)

۱۔ دینِ محبت یعنی اسلام۔ ۲۔ انا اعطینٰک الکوثر ۳۔ روشن کرد۔
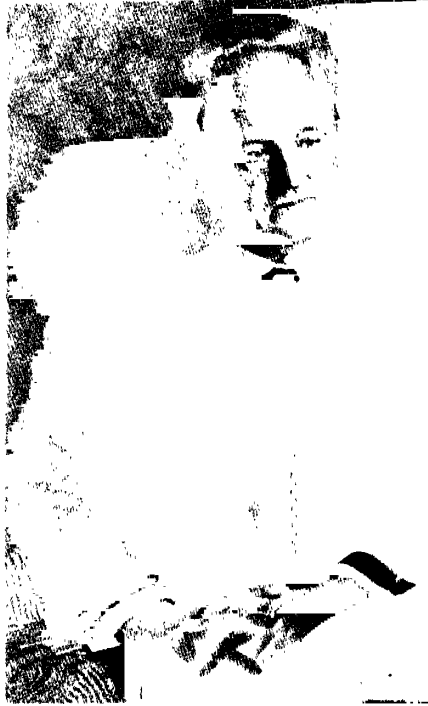
ملک الشعراء المانیہ

ملک الشعراء المانیہ

جرہارٹ ہاپٹمین

ہنڈن برگ کی طرح ہاپٹمین بھی جرمنی کی ایک نمایاں شخصیت ہے۔ مجھے کئی دفعہ اُس کا مہمان ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے اور ایک دفعہ میں نے پورا ایک ہفتہ اُس کے خوبصورت دہاتی مکان میں گذارا ہے جو سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ جارج سلوسٹر ویرک

جرمنی کی صرف چند شخصیتیں ایسی ہیں جن کی شہرت شہنشاہی کے خاتمے کے بعد بھی قائم رہی ان میں سے دو ایسی ہیں کہ قدیم جرمنی کی بہ نسبت جدید جرمنی میں انہیں زیادہ عروج نصیب ہوا ہے ایک ان میں سے سپاہی ہے اور دوسرا شاعر۔ ایک کا نام ہنڈن برگ ہے اور دوسرے کا ہاپٹمین۔

دونوں غریب خاندانوں میں پیدا ہوئے۔ ہنڈن برگ کا باپ ایک معمولی دہاتی تھا۔ ہاپٹمین کا باپ کوہستانِ سلیشیا میں ایک سرائے دار تھا۔ اس کا دادا ایک جلاہا تھا جس کی مصیبت بھری کہانی اس نے اپنے زمانۂ جوانی کے بہترین ناٹک میں لکھی ہے۔

جمہوریۂ جرمنی کے ملک الشعراء نے کہا "ہم جرمن اس لئے مضبوط ہیں کہ جس سرزمین میں ہم پیدا ہوئے اُس کی خاک میں ہماری جڑیں بڑی گہرائی تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ جب تک ہم اس خاک سے چپٹے رہیں گے ہم مستحکم ہیں، ہمیں کوئی تباہ نہیں کرسکتا۔ خاکِ وطن ہر لحہ ہمارے وجود میں قوت بڑھا رہی ہے۔ تھوڑی بہت جتنی قوت بھی مجھ میں موجود ہے میں اُس کی وجہ اسی خاک کے قرب کو قرار دیتا ہوں۔"

ہم ہاپٹمین کے سلیشیا والے گھر کے قریب جنگل میں سیر کر رہے تھے۔ ہاپٹمین نے چلتے چلتے اپنا قدم احتیاط سے ایک طرف کر لیا کیونکہ اس کے نیچے ایک جنگلی پھول آچلا تھا۔ پھر اسی طرح اُس نے ایک چیونٹیوں کے بنائے ہوئے مٹی کے ننھے سے ٹیلے کو بھی پامال ہونے سے بچالیا۔

ہاپٹمین نے کہا "آپ کو تو جرمنی چیونٹیوں کے اس ننھے سے ٹیلے سے کچھ بڑا معلوم نہ ہوتا ہوگا لیکن وہ ایک نہایت قابلِ احترام ٹیلا ہے۔ اس میں بڑی شاندار چیونٹیاں آباد ہیں۔ اگر یہ ٹیلا گر جائے تو چیونٹیاں اسے ایک پل میں پھر کھڑا کر دیں گی!

"جرمن قوم کی فطرت میں بے نظیر استقلال اور بے نظیر عین پرستی ہے۔ جب تک جنگِ عظیم جاری رہی ہمیں ایک سنگدل تباہ کار ظاہر کیا جاتا رہا۔ یہ ہماری قوم پر ایک الزام ہے۔ ہماری سب سے بڑی خواہش تعمیر ہے تخریب نہیں۔

"گوئٹے کا فاؤسٹ" تاریکی مصیبت اور موت کے منہ میں پہنچ کر بھی ایک نئی دنیا کی تخلیق اور ایک نئی تہذیب کی تشکیل کی کوشش کرتا ہے۔ گوئٹے محض ایک محبِ وطن ہی نہ تھا بلکہ اُس نے اپنی تصنیف "فاوسٹ" میں جرمن رُوح کی ایک نہایت کامل تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی۔

"جرمن روح میں تنوع کے ساتھ ہی گہرائی بھی ہے۔ اس حیثیت سے یہ جرمنی کا آئینہ ہے۔ جرمنی میں اتنے ہی مختلف النوع خطے ہیں جتنے کہ ریاستہائے متحدہ میں ہیں حالانکہ جرمنی ایک چھوٹا سا ملک ہے اور ریاستہائے متحدہ آدھا براعظم ہے۔"

ہاپٹمین جنگل کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ اُس نے نہایت مسرت کے ساتھ خوشبودار ہوا سے اپنے سینے کو بھر لیا اور کہنے لگا میں اپنے ٹیوٹنی آباو اجداد کی طرح درختوں کی پرستش کرتا ہوں۔ اگر درختوں کے کسی جھنڈ میں خدا سے میری ملاقات ہوجائے تو مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہو!

"میں خوش ہوں کہ بسمارک سے میری پہلی ملاقات جنگل میں ہوئی۔ میں اپنے عہد کے اس عظیم ترین جرمن سے اُس کے زوال کے تھوڑی ہی دیر بعد ملا۔ اُن دنوں میں اُس کا مخالف تھا۔ میں اُس کی عظمت سے واقف تھا، لیکن مجھے اس کی کمزوریوں کا بھی علم تھا۔

"میں گرون والڈ کے جنگل میں پھر رہا تھا جو برلن سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے کہ یکایک ایک چھوٹی سی گاڑی میں بسمارک نمودار ہوا، اور شاید سیر کرنے کے لئے یا شاید اپنی ذات اور فطرت کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ درختوں میں وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے بلوطوں میں ایک بلوط کھڑا ہو۔

"میں اُس کے عظیم قدوقامت اور اُس کی عظیم شخصیت کو دیکھ کر نوجوانی کے سارے تعصبات کو بھول گیا۔ ایسے آدمی سے رُودررُو ملنا ایک بات تھی۔ آہ وہ سر، وہ آنکھیں، وہ بال! میری چشمِ تصور اب بھی اُن کو دیکھ رہی ہے۔ یہ ایک مسحور کر دینے والا نظارہ تھا۔

"اُس کی موجودگی میں دوسرے آدمی بونے معلوم ہوتے تھے۔ اُس کی معزولی کے تھوڑے ہی دن بعد میونچ کے بڑے بڑے مصوّروں نے جمع ہو کر اس کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ غلطی سے کہیں بسمارک وقتِ مقرّرہ سے پہلے ہی دعوت کے کمرے میں آداخل ہوا۔ اُس کے پُررعب قدوقامت کو دیکھ کر میزبان ایسے گھبرائے کہ اس کو تعظیم دینا بھی بھول گئے۔

ہنڈن برگ کی طرح ہاپٹمین بھی اپنی طرز کا ایک خاص انسان ہے، ایک بلند و بالاقامت، گہری نیلی آنکھیں، ترچھے سپید سے خطوط سے بھرا ہوا چہرہ۔ اُس کی چال میں لچک ہے، اُس کے ہاتھوں میں قوت ہے اور اُس کا دل جوان ہے۔ چہرہ اور دل دونوں یکساں بے قرار ہیں۔ اُس کی صورت دل کو ایسی موہ لینے والی ہے کہ جب وہ بازار میں سے گزرتا ہے تو لوگ اُس کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی یونانی دیوتا ہے جس نے بھیس بدل رکھا ہے۔

"جرہارٹ" ہاپٹمین محض ایک شاعر ہی نہیں۔ اُسے ملکی معاملات سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ گوئٹے ایک مختصر سی جرمن مملکت کا وزیرِ اعظم تھا۔ ہاپٹمین کا نام واقعی طور پر جمہوریۂ جرمنی کی صدارت کے امیدواروں کے ساتھ لیا گیا تھا۔ لیکن اُس نے اِس تجویز کو مسترد کر دیا۔

۲

ہاپٹمین نے کہا "میں اپنے معاصرین کی نسبت کوئی فتویٰ صادر کرنا نہیں چاہتا۔ طائرِ حقیقت کا دام میں آنا سخت مشکل ہے"

میں نے کہا کیا یہ علم آپ کے احساس کو مُردہ کر دیتا ہے کہ ہم اکثر حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے؟

ہاپٹمین نے جواب دیا "نہیں، زندگی کی پیچیدگیوں کا علم میرے احساس کو مردہ نہیں کرتا یہ صرف مجھے دوسروں کے حق میں زیادہ رواداری برتنے پر مجبور کرتا ہے"۔

"کیا آپ کی رواداری کے حلقے میں سوویٹ روس بھی شامل ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"کیا آپ بالشویت کے عروج میں دنیا کے لئے کوئی امید دیکھتے ہیں؟"

"نہیں میں بالشویت کو زیادہ پسند نہیں کرتا، کیونکہ یہ شخصیت کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔ لینن کے جنازے پر ایک مقرر نے کہا تھا "وہ ایک شخصیت تھا، لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ یہ ضروری نہیں سمجھا جائے گا" کہ ہم شخصیتیں پیدا کریں"۔

میں نے کہا "آپ کے خیال میں امریکا کا مستقبل کیا ہوگا؟"

شاعرِ المانیہ نے جواب دیا "اس بات کو تیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں جب میں امریکا گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالشویک روس کی طرح امریکا کے لئے بھی تہذیب کے ایک مشینی تصور کی غلامی کا خطرہ ہے انسان مشین کو صرف اس لئے قبضے میں لاتا ہے کہ اُس کا غلام بنے۔ وہ خود ایک مشین بن جاتا ہے۔ بعض

وقات ہنری فورڈ مجھے انسان کے بجائے ایک عظیم الہیئت مشین معلوم ہوتا ہے۔
"بعض لوگ کہتے ہیں کہ تہذیب کے لئے امریکا کا سب سے بڑا تحفہ کثرتِ پیداوار ہے۔ مثلاً فورڈ کاریں او
دوسری موٹریں۔ میں کہتا ہوں نہیں۔ امریکہ والوں نے اپنی انسانیت کو قائم رکھا ہے۔ خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے
وہ سچے انسان ہیں، تہذیب کے سچے حامل۔ تلاش اور سہو، سہو اور تلاش، اس پر اُن کا عمل ہے۔ لیکن وہ بے خطا
سادگی اور وحدتِ مقصد کے مالک ہیں، جس میں سے عظیم الشان ایجادات اور عظیم الشان خیالات ظہور میں
آتے ہیں۔

"امریکا نے دو عجیب چیزیں دنیا کو دی ہیں: ایڈگر ایلن پو کی تصنیفات اور جدید رقص۔
"امریکا کے رقص اتنے ہی دلکش ہیں جتنی کہ پو کی شاعری۔ میں ان دونوں کے بُت پرستانہ اوصاف کا
دلدادہ ہوں۔ رُوح کو بچانا ضروری ہے لیکن جسم کو آزادی دلانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ رقص جسم کو اپنی ذات سے
حظ حاصل کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ اس کو قیود اور روایات سے آزادی دلاتے ہیں"۔
"امریکا کو اگر اپنی طاقت کا علم ہو جائے اور وہ اس طاقت کو استعمال کرے تو وہ ساری دنیا پر حکومت کر سکتا
ہے۔ لیکن لاعلمی شاید بہتر ہے۔ طاقت ایک دو دھاری تلوار ہے۔ اس کا مالک بھی غلام ہے۔
"اس ملک کے راک فیلر اور مارگن اپنی مشینوں اور اپنی دولت کے غلام ہیں۔ دولت سے وہ کیا کام لے
سکتے ہیں؟ وہ لائبریریاں اور کالج کھول سکتے ہیں، لیکن تعلیم ہمیں خوش نہیں کر سکتی، کتابیں ہمارے دکھ کا علاج
نہیں کر سکتیں۔ حکمت شاید ہماری صحت کو بہتر بنا سکتی ہے، لیکن ہمیں یہ خوش نہیں کر سکتی۔
میں نے پوچھا" ہمیں کونسی چیز خوش کر سکتی ہے؟"
شاعر نے کہا "حسن! ایک وحشی جانور اور ایک مہذب انسان میں جو بات مشترک ہے وہ خواہشِ حسن ہے۔ ہمیں
اپنی نئی پود کی تربیت حسن کے ماحول میں کرنی چاہیئے۔ حسن مادی آرام و آسائش سے زیادہ ضروری ہے۔ یہی میرا
پیغام ہے"۔

میں نے اُن سرسبز درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے جو دنیا کو ہماری نظروں سے چھپائے ہوئے تھے افسوس
آمیز لہجے میں کہا" امریکہ والوں کو جنگل تباہ کر دینے کی عادت ہے۔ لیکن وہ اب جرمنی سے اُن کی حفاظت کرنا
بھی سیکھ رہے ہیں"۔
ہاپٹمین نے کہا "نشو و نما اور قدرتی مناظر کے فطرتی احترام نے ہمیں درختوں کی حفاظت کرنا سکھایا ہے
میرے گھر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر شہزادہ پکلر مسکاؤ کی خوبصورت جاگیر ہے۔ پکلر نپولین اوّل کا ہمعصر تھا
ایک سپاہی اور ایک مصنف تھا۔ لیکن اس کی شہرت کی اصلی وجہ وہ سلیقہ ہے جس سے اُس نے یہ باغ لگایا

تھا۔ باغ لگانے کے فن میں وہ جرمنی کا استاد تھا۔

"شہزادے نے چار شادیاں کیں اور ان چار شادیوں سے جو دولت حاصل ہوئی اُسے اُس نے ایک ایسا باغ لگانے میں صرف کیا جس کی نظیر سارے ملک جرمنی میں نہیں ملتی۔ اگر اُسے کسی سرائے کے سامنے کوئی خوبصورت درخت لگا ہوا نظر آیا تو اُس نے اُسے خرید لیا اور وہاں سے اکھڑوا کر اپنے باغ میں نصب کرایا جو درخت لگوانے کا ایک نہایت بھدا طریق ہے۔ اگرچہ اُس زمانے میں باغبانی کے فن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی لیکن وہ ہمیشہ اپنے تجربات میں کامیاب ہو جایا کرتا تھا۔"

میں نے کہا "یہ حیرانی کی بات ہے کہ کوئی شخص ایک باغ کی تکمیل کے لئے اپنی اور اپنی چار بیویوں کی زندگیاں قربان کر دے۔"

ہاپٹمین نے جواب دیا "جو شخص درختوں سے محبت کرتا ہے درخت اُسے اپنا ہمراز بنا لیتے ہیں۔ مجھے اُن سے ایک دلی لگاؤ ہے۔ میں اُن کی زبان سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسی طرح مائیں بھی بچوں کے دل کی بات سمجھ جاتی ہیں۔

"وہ ماں جو اپنے بچے کی طرف دیکھ رہی ہو اُس ٹہنی کی طرح ہے جو اپنے پھول کی طرف دیکھ رہی ہو۔ اگر ٹہنی اپنے پھول کا مقصد اور اس کی خواہشات نہیں سمجھ سکتی، نہ سمجھے اس کے باوجود اِن دونوں کے درمیان الفت کا ایک ایسا گہرا رابطہ ہے جس کی مثال فطرت کی اور کسی شے میں نہیں ملتی۔

"پکلر نے جو درخت لگوائے تھے انہوں نے اُس کے دل میں ایک احساس بقا پیدا کر دیا تھا اس کے علاوہ اسے درختوں سے بھی ایک دلبستگی تھی۔ ہر شخص اپنے لئے ایک ارضی جنت بنانے کی کوشش کرتا ہے پکلر کی جنت اُس کا باغ تھا۔ شاید وہ آخر تک اپنے مطمح نظر کو حاصل نہ کر سکا، ورنہ وہ اِس جنت کو چھوڑ کر ایک اور جنت کی تخلیق میں مصروف ہو جاتا۔ اِس حیثیت سے پکلر ایک پکا جرمن تھا۔ فاؤسٹ کا ہم وطن۔ جب ہم اپنے مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں تو ہم ضرور ایک نیا خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

۳

ہاپٹمین نے کہا "زندگی کے پرے بھی کوئی چیز موجود ہے، زندگی سے برتر، ایک اسرار، ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں ---- بدھ، مسیح، روح کائنات، تخلیقی ارتقا وغیرہ۔ میں اِس کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا، میں اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ زندگی کے غیر فانی لمحوں میں اور آرٹ کی مسرتوں کے غیر فانی لمحوں میں ہمیں اس کی ایک جھلک نظر آ سکتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کہاں ہے۔ میں نہیں جانتا

کہ یہ کیا ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ ہے۔"

سمندر کی موجوں کا جادو دانی نغمہ موجودہ جرمنی کے بہترین شاعر کا ہم آہنگ معلوم ہوتا تھا۔

ہاپٹمین نے مجھے ایک ہفتے کے لئے اپنے ہاں ہڈن سی میں مدعو کر رکھا تھا۔ یہ چھوٹا سا جرمن قصبہ جہاں لوگ گرمیوں کا موسم گزارنے جاتے ہیں اور جو ایک چھوٹے سے جزیرے پر واقع ہے ایک لحاظ سے ہاپٹمین کا اپنا دریافت کیا ہوا ہے۔ گرمیوں کے ہر موسم میں یہ مقام اُسے چند ماہ کے لئے اپنے ہاں کھینچ لاتا ہے۔

ایک سیر کے دوران میں ہم بارش سے بالکل بھیگ گئے۔ اس سے میرے جوش وخروش میں کچھ فرق آ گیا لیکن ہاپٹمین کی شگفتگی اور مسرت جوں کی توں قائم رہی۔ اُس نے بارش کو رحمتِ خداوندی کا نزول سمجھا۔

اُس نے کہا "جب میں دو تین گھنٹے کی طویل سیر کرتا ہوں تو بارش اکثر میرے کپڑوں سے گذر کر میرے جسم تک پہنچ جاتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تو اس قدر بھیگنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔"

اُس نے کہا "لیکن جب بارش آجاتی ہے تو آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "میں ٹیکسی لے لیتا ہوں"۔

یہ بات ہاپٹمین کو بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ یہ عقدہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ فطرت سے اس قدر دُور بھی کوئی مقام ہو سکتا ہے جہاں ٹیکسی ہمیشہ اور ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہو۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں بھی فطرت کی قوتوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں میں نے جھٹ ایک ایسی بحث شروع کر دی جسے فلسفے کی جان کہنا چاہئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بارش کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا "کیا زندگی بسر کرنے کے قابل ہے؟"

شاعرِ المانیہ نے میرے ناگہانی سوال پر کوئی تعجب ظاہر نہ کیا اور کہنے لگا!

"میری عمر پینسٹھ برس کی ہے، لیکن اس عرصے میں میں کبھی زندگی کی مسرت سے محروم نہیں ہوا۔ صرف مرغزار کی دھوپ سے لطف اندوز ہونا مجھے راضی بہ رضا رکھتا ہے۔ مجھے اپنے کسان آباد اجداد سے زندگی کی ایک نباتاتی مسرت ورثے میں ملی ہے جسے میں نے آج تک ضائع نہیں کیا۔

"زندگی اُس وقت تک غنیمت ہے جب تک اُس کا غم اُس کی خوشی سے بڑھ نہ جائے۔ ممکن ہے کہ جب غم بہت بڑھ جاتا ہو تو زندگی بسر کرنے کے قابل نہ رہتی ہو، لیکن اس کا مجھے علم نہیں۔ میں صرف زندگی کے کیف ونشاط کو جانتا ہوں۔ میں زندگی سے اِس طرح لطف اندوز ہوا ہوں جس طرح ایک بچہ آندھی میں بے تحاشا دوڑ رہا ہو۔ میں آج بھی اس سے اسی طرح لطف اٹھاتا ہوں ـــــ تقریباً اسی طرح۔

"زندگی سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے اگر ہم تھوڑے سے اعتدال اور تھوڑی سی عقل کو کام میں لائیں۔ ممکن ہے کسی اور چیز سے زندگی سے بھی زیادہ لطف اٹھایا جاسکے۔ ممکن ہے کہ نہ ہونا ہونے سے بھی زیادہ قابل ترجیح ہو۔ ممکن ہے کہ نروان میں دنیاوی زندگی سے بھی زیادہ برکات پوشیدہ ہوں۔ میں آئندہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ مجھے صرف اب کا علم ہے۔

"دنیا میرا صدف ہے۔ زمین میرا گھر ہے۔

"میں سفر اس لئے کرتا ہوں کہ ہر نیا ملک ہمیں ایک نئی روح عطا کرتا ہے۔ کسی دن میں اپنی بیوی مارگریٹ کو ساتھ لے کر تمام دنیا کا سفر کروں گا۔ روح کی نشو ونما کے لئے تنوع اور وسعت کی ضرورت ہے۔ کسی مکان میں یا کسی ہوٹل کے کمرے میں انسان آفاقی ساز کے تال پر رقص نہیں کرسکتا۔

"ایک دفعہ پینتیس برس کی عمر میں میں نے اپنے بھائی کارل سے کہا تھا کہ آؤ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور تمام جھگڑوں بکھیڑوں کو الوداع کہہ کر یہاں سے نکل چلیں اور امریکا میں جاکر نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کریں۔ میری خواہش تھی کہ میں لوگوں میں مل جاؤں، جتنی زندگیاں بھی ممکن ہوں بسر کروں اور جتنے پیشے بھی ممکن ہوں اختیار کروں۔

"بعض اوقات مجھے سانپ پر رشک آتا ہے۔ ایک بڑے سانپ کو اپنی کینچلی اتارتے وقت کتنا لطف آتا ہوگا! میں اپنی رُوح کو اتار پھینکنا چاہتا تھا اور کسی نئے ولولے کی دُھن میں ایک نئی شخصیت کا جامہ لوٹھ لینا چاہتا تھا۔

"میرے بھائی نے انکار کر دیا۔ اور اب ایسا تجربہ کرنے کا وقت نہیں رہا!

"مجھے ہر وہ چیز حاصل رہی ہے جس کی ایک انسان کو خواہش ہوسکتی ہے۔ محبت۔ شہرت۔ آرام آسائش طاقت۔ مجھے سلیشیا کے پہاڑوں سے محبت ہے۔ مجھے سمندر سے محبت ہے۔ ریلو کی دھوپ میرے خیالات میں تیز شراب کی طرح حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن مجھے اب بھی اُن بلندیوں پر چڑھنے اور اُن گہرائیوں تک پہنچنے کی آرزو ہے جن کو میں نے اب تک نہیں دیکھا۔

"تاہم میری خواہشات میں پیچیدگی نہیں ہے۔ مجھے سادہ چیزوں سے انتہائی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میں خوب کھانا اور خوب پینا چاہتا ہوں۔ شراب سے مجھے رغبت ہے۔ کیونکہ شراب زبان کا عقدہ کھولتی ہے اور ہمیں بندشوں سے آزاد کرتی ہے۔ اب میں اُس وقت تک امریکا جانا نہیں چاہتا جب تک وہاں شراب کی ممانعت ہے

"تاہم میری اکثر مسرتیں سادہ ہیں۔ میں فطرت کا قرب، دھوپ اور بارش چاہتا ہوں۔ ایک سرسبز میدان جس میں جابجا پھول بھی اُگے ہوتے ہوں میری دلی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

"انسان کو رفاقت کی ضرورت ہے لیکن اُسے خلوت کی بھی ضرورت ہے۔ میں دونوں سے آشنا ہوں۔ آپ میری سیرت اور میرا افسانۂ حیات میری تصانیف میں سے پڑھ سکتے ہیں۔ میری تصانیف میری اپنی ذات کا مظہر ہیں۔"

میں نے دریافت کیا "کیا آپ مسیحیت کو مانتے ہیں؟"

ٹاہیمین نے جواب دیا "دینیات میں ایک ناقابلِ بیان گہرائی ہے جہاں تمام مذاہب جاکر مل جاتے ہیں۔ مسیحیت اور بدھ مذہب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لیکن بدھ مذہب خدا کے تشبیہی تصور کے ترک کرنے میں مسیحیت سے بڑھا ہوا ہے۔ ہندو زندگی کو دائرۂ تعریف میں مقید نہیں رکھتا۔

"تاہم یہ ایک ناقابلِ فہم عقدہ ہے کہ ہندوستان نے ہزاروں خدا پیدا کئے اور فطرت کی ہر قوت کو ایک انسانی شکل میں پیش کیا۔"

"میں نے کہا "لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب بالکل نہیں دیا۔ میرے سوال کا مطلب یہ تھا کہ کیا آپ حضرتِ مسیح کے تاریخی وجود کے قائل ہیں اور کیا آپ انہیں خدا مانتے ہیں؟"

شاعرِ المانیہ کی آنکھوں میں ایک پُراسرار روشنی چمکنے لگی۔ اُس نے کہا "میں حضرتِ مسیح کی تاریخی ہستی کا قائل ہوں۔ مجھے مسیحیت میں خدا نظر آتا ہے۔ میں اُسے بُدھ مذہب میں بھی دیکھتا ہوں۔ میں اُسے ایک پھول میں بھی پاتا ہوں۔ خدا کا وجود ضروری ہے۔ اگر وہ موجود نہیں تو قلبِ انسانی اُسے پیدا کرے گا"

میں نے پوچھا "کیا ہم کبھی معمائے حیات کو حل کر سکیں گے؟ اگر ہم اسے حل نہیں کر سکتے تو فلسفے کا کیا مقصد ہے؟"

ٹاہیمین نے جواب دیا "اگر ہم معمائے حیات کو حل نہ بھی کر سکیں پھر بھی اپنی زندگی ہی میں خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو ہم اُس کی تناقض صورتوں کا جو ہمیں ضغطے میں مبتلا رکھتی ہیں کم از کم ایک تصور سا قائم کر لیتے ہیں۔ حیات ہمارے قلب میں سے ہو کر گذرتی ہے ——— تمام کائنات ہمارے قلب میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ ہر چیز جو موجود ہے دل کے آئینے میں اپنا عکس ڈالتی ہے۔ اس سے انسانی علم کے نامکمل ہونے کی تلافی ہو جاتی ہے۔

"شاید ہر ایک چیز میں ہر دوسری چیز کی خاصیت موجود ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے اندر ایک عالم رکھتا ہے آرٹ کا ہر کام فی نفسہ تمام آرٹ ہو سکتا ہے لیکن انسان کو ایسے مسائل کے بیان میں زیادہ لفاظی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ یہ سے ادنیٰ لفظ پرست الفاظ کا پرستار ہے۔"

میں نے کہا "آپ کے خیالات کی اتنی مختلف توضیحات ہو سکتی ہیں کہ اکثر اُن کے مفہوم تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

ہاپٹمین نے کہا "زندگی خدا کا سانس ہے۔ وہی اندر جاتا ہے اور وہی باہر آتا ہے۔ پو نے اسی خیال کو "یوریکا" میں بیان کیا ہے۔ شاعر بھی مصنفِ کائنات کی طرح سانس لیتا ہے۔ اُس کا نفس بھی خدا کے نفس کی طرح ہزاروں شکلیں اختیار کرتا ہے لیکن اُس کی تہ میں ہمیشہ توحید چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

" میری تصانیف میں بعض مشکلات میرے اس متصوفانہ عقیدے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز کامل نہیں ہے اور کسی بات کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔"

اس اثنا میں بارش تھم چکی تھی۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ پانی میرے جسم تک پہنچ چکا ہے۔ ہاپٹمین کا چہرہ ایک پھول کی طرح شگفتہ تھا۔

جب ہم گھر کے قریب پہنچے تو ہاپٹمین کا کتّا موگلی دوڑ کر اُس کے پاس آگیا۔ ہاپٹمین اُس کے ساتھ اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے وہ کوئی انسان ہو۔

میں نے کہا "کیا آپ کا خیال ہے کہ کتّا آپ کی باتیں سمجھتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں سمجھتا ہوں کہ کتے اپنے مالکوں کے خیالات کو سمجھ لیتے ہیں۔ شاید روح ایک بُو ہے جیگر کا بھی نظریہ تھا ــــــ جیگر جس کے بنیان وغیرہ مشہور ہیں۔ شاید میرا کتا خیالات کو سونگھ لیتا ہے۔

" میرے پاس ایک اور کتا تھا۔ وہ بڈھا ہو گیا تو جب کبھی میں سیر کو جاتا تھا وہ شرمسار نگاہوں سے میری طرف دیکھا کرتا تھا، لیکن کبھی اٹھ کر میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے ایک ایسے ہمسائے کے ہاں جانے کا ارادہ کیا جس سے ملے مجھے تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔

" کتے نے شاید میرے خیالات کو پا لیا۔ وہ اپنی دُم ہلاتا ہوا اٹھا اور میرے آگے آگے چل کر مجھ سے پہلے میرے ہمسائے کے مکان پر پہنچ گیا۔ میرے ارادے کو بھانپ کر غالباً اُس نے سوچا ہو گا کہ چلو، اتنی دُور تو میں جا سکتا ہوں۔ اپنے آقا کے دوست کے گھر جانا اور دیکھنا کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے پُر لطف رہے گا۔

مجھے یقین ہے کہ حیوان سوچتے ہیں۔ اگر فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کا یہ قول صحیح ہو "چونکہ میں سوچ سکتا ہوں اس لئے میں ہوں" تو حیوانات میں ضرور روح موجود ہے۔"

" کیا آپ روح کی بقا کے قائل ہیں؟"

ہاپٹمین نے متفکرانہ جواب دیا "ہر چیز جس کا آغاز ہے ایک انجام بھی رکھتی ہے۔ زندگی کا کوئی انجام نہ ہو گا کیونکہ اس کا کوئی آغاز نہیں۔ ہم سرمدیت سے بچ نہیں سکتے۔ ہم سرمدیت کے شعور سے صرف اس لئے بچ جاتے ہیں کہ انسانی حافظہ ایک نامکمل آلہ ہے۔"

" کیا آپ شخصیت کی بقا کے قائل ہیں؟"

"میں تناسخ کا قائل ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہم پہلے بھی موجود تھے۔ اگر ہم پہلے موجود تھے تو ضرور ہے کہ ہم آیندہ بھی موجود ہوں گے۔ لیکن میں بقا کو شخصی نہیں سمجھتا۔ یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ کوئی ایسی ظالم طاقت بھی ہو گی جو ہمیں ہمارے عرفانات کی سرمدیت میں مبتلا کر دے گی۔

"روح کو اپنے ہی زندان میں اسیر کر دینے سے بڑھ کر سزا میرے تصور میں نہیں آسکتی۔ اس کا مطلب جہنم ہے جنت نہیں۔ زندگی اپنی مخلوق پر اس سے زیادہ سخت کوئی عذاب نازل نہیں کر سکتی۔ ہم زندہ تو رہتے ہیں لیکن ہم بدل جاتے ہیں۔ روحِ کائنات ہم کو جذب کر لیتی ہے۔ صرف زندگی جاودانی ہے۔"

"اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

ہاپٹمین نے کہا "میں نہیں جانتا۔ ایک جرمن مثل ہے کہ تقدیر خیال رکھتی ہے کہ کوئی درخت اتنا اونچا نہ ہو جائے کہ آسمان کو چھونے لگے۔ مجھے اب معلوم ہو چکا ہے کہ واقعی وہ بہت بلند نہیں ہوتے۔ میرا فلسفہ مجھے صبر و قناعت کا سبق دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود خدا کا شعار بھی قناعت ہے۔"

"میں نے کہا "آپ جد و جہد اور کام کس لئے کرتے ہیں؟"

"میں صرف ایک اندرونی تقاضا کو پورا کرتا ہوں۔ میں شطرنج کسی جزا کے خیال سے نہیں کھیلتا بلکہ صرف کھیل سمجھ کر کھیلتا ہوں۔ زندگی اور آرٹ کے مسائل میں کسی جزا کی خاطر عمل نہیں کرتا بلکہ اُس مسرت کی خاطر جو عمل پر حاصل ہوتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ یہی تقاضا ہو گا جو خدا کو تخلیق پر مجبور کرتا ہے۔ بھگوت گیتا میں دیوتاؤں کا بادشاہ ارجن سے کہتا ہے اے پارتھا کے بیٹے تینوں دنیاؤں میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ابھی مجھے تکمیل کرنی ہو کوئی نامکمل مقصد نہیں جسے میں حاصل کروں، لیکن میں پھر بھی سرگرمِ عمل ہوں۔"

منصور احمد

رباعی

وقفِ تپشِ شمع ہے جدائی میری
پروانہ ہوں آرزو برآئی میری
دیکھا ہے میں نے اونچی اونچی میں یہاں
اس بزم سے جب سے بن آئی میری

حامد

راحت کدہ

اگر ضو افگن اس میں جلوۂ جانانہ ہو جائے
طرب زار و نشاط آگیں مرا غمخانہ ہو جائے

بلائیں لے رہی ہے دو جہاں کی عقل و نادانی
خوشا وہ دل! کہ تیرے شوق میں دیوانہ ہو جائے

صبا! اس کو اٹھا کر دوش پر فردوس پہنچا دے
کہیں ویراں نہ یہ خاکستر پروانہ ہو جائے

خدا معلوم کیا لذت ہے رودادِ محبت میں!
کہ جب چھیڑو اسے اک مستقل افسانہ ہو جائے

الٰہی خیر! پھر طوفانِ غم سینے میں برپا ہے
کہیں میرا لبِ خاموش بھی اب وا نہ ہو جائے

مری آنکھوں سے اشکِ خوں کا اک سیلاب جاری ہے
نہ رازِ محبت بھی کہیں افشا نہ ہو جائے

سبق آموز ہے تقدیر کی غارتگری ہمدم
کہ دم بھر میں دلِ عشرت نشاں ویرانہ ہو جائے

دلِ برباد پہ سنسان تنہائی برستی ہے
ذرا اس پر نگاہیں ڈال دو میخانہ ہو جائے

وہ میرا کعبۂ عشق و محبت جلوہ فرما ہے
نگاہِ شوق! اب اک سجدۂ شکرانہ ہو جائے

اثر! اب شکوۂ اغیار کس منہ سے کرے کوئی
کچھ ایسی آپڑی اپنا بھی جب بیگانہ ہو جائے

اثر صہبائی

ممالکِ متحرکہ

آفتاب سے جُدا ہو کر زمین پر کیا گذری؟

نظریۂ تخلیق ارض میں علماء کے درمیان کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں ہے۔ ان کی قریب قریب متفقہ رائے یہ ہے کہ ایک عظیم الشان جسیم ستارہ آفتاب کے قریب سے گزرا جس نے اپنی غیر معمولی جاذبیت کی وجہ سے سطح آفتاب میں بہت زیادہ "مد" پیدا کر دیا اور اس میں سے متعدد قطعات جدا کر لئے۔ ان قطعات نے فضا میں اپنی طبعی حرکت جاری رکھی اور انہی قطعات میں سے ایک قطعہ نے آگے چل کر زمین کی موجودہ صورت اختیار کر لی[۱]۔ جرم زمین ابتداءً بخارات[۲] اور پگھلی ہوئی معدنیات کا ایک مجموعہ تھا جس میں آفتاب کی طرح غیر معمولی حرارت موجود تھی کروڑوں سال گذرنے پر یہ ٹکڑا سرد ہونے اور سمٹنے لگا۔ یہاں تک کہ مرورِ ایام سے انجماد ہو کر وہ خول پیدا ہو گیا جسے "خشکی" کہتے ہیں۔ دوسرے اطراف میں یہی بخارات کثیف ہو کر پانی کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ اس پانی نے جھیلوں، دریاؤں اور سمندر کی وہ صورت اختیار کر لی جو آج تک دیکھی جاتی ہے۔

لیکن زمین نے موجودہ صورت کیوں اختیار کی اور بعض اطراف میں پہاڑ اور بعض میں سمندر اور دریا وغیرہ جغرافیائی مظاہر کیوں کر پیدا ہو گئے؟

قدیم ترین زمانے سے علما کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس کی توجیہہ مختلف طریقوں سے کی گئی ہے اور اس میں متعدد مذاہب رونما ہو گئے ہیں۔ جدید ترین نظریہ کا ماحصل (جو ویگنر کا نظریہ کہلاتا ہے) یہ ہے کہ جب کرۂ زمین منجمد ہونے لگا تو اس میں وہ حالات رونما ہو گئے جو پختگی کے قریب سیب میں رونما ہوتے ہیں۔ یعنی جس طرح سیب میں جابجا ابھار پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی گولائی جاتی رہتی ہے اسی طرح زمین میں بھی نشیب و فراز پیدا ہو گئے اور کثرت سے شکنیں پڑ گئیں۔ اور یہیں سے پہاڑوں دریاؤں، جھیلوں، اور سمندر کی بنیاد پڑتی ہے۔ انہی کے منجملہ شمالی ہندوستان میں سلسلۂ کوہ ہمالیہ اور امریکہ

---

[۱] دیکھئے قرآن ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کیا کہتا ہے:- اِنّ السمواتِ والارض کانتا رتقاً ففتقنٰہما ط

[۲] GASES

وغیرہ میں دوسرے کوہستانی سلسلے وجود پذیر ہوئے۔

زمین کے طبقات ثلٰثہ۔ کرۂ زمین کی نشوونما کے دوران میں تین طبقات پیدا ہو گئے جو ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) بالائی طبقہ "یا قشر" اس کی دبازت تقریباً ۲۷ میل یا ۴۴ کیلومیٹر ہے،

(۲) طبقہ اوسط، اس کی دبازت تقریباً ۸۰۰ میل ہے،

(۳) طبقۂ اسفل، اور وہ قلب کرۂ زمین ہے۔

پہلا طبقہ یعنی قشر" ان عناصر سے مرکب ہے جو سلیکن[۱] اور ایلومینیم کے امتزاج سے پیدا ہوئے ہیں اسے ماہرینِ علمِ طبقات الارض طبقۂ سیال[۲] کہتے ہیں یہ طبقہ ٹھوس ہے اور اپنے نیچے والے طبقہ (درمیانی طبقہ) کی بہ نسبت سبک ہے۔

دوسرا طبقہ جس کی دبازت ایک ہزار آٹھ سو میل بتائی گئی ہے۔ علماء طبقات الارض کی اصطلاح میں طبقۂ سیما[۳] کے نام سے مشہور ہے، اس میں سلیکن اور مگنیشیم کے اجزا بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ طبقہ بہت زیادہ لزاجت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی وزنی اور نہایت ٹھوس بھی ہے

طبقۂ اسفل "یا قلبِ زمین" ——— جسے طبقۂ نیف[۴] کہتے ہیں ——— پگھلے ہوئے نکل اور لوہے سے مرکب ہے۔ یہ دو توپانی سے آٹھ گنا زیادہ وزنی اور فولاد سے بدرجہا زیادہ سخت ہیں۔

عقلِ انسانی درمیانی طبقہ کے تصور سے عاجز ہے۔ وہ ایک چپچپے مادے سے بنا ہے جو کسی بہت گرم بہنے والے مادے سے مشابہ ہے۔ اس اعتبار سے بعض لوگ اس کو کاک" سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جب اُس پر کسی ایسے مادے کا دباؤ پڑتا ہے جو اس سے زیادہ سخت ہو تو یہ اس سے سہارا لیتا ہے اور چوں چرا نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

---

[۱] ایک جدید دریافت شدہ دھات کا نام ہے۔

[۲] (Sial) چونکہ یہ طبقہ سلیکن اور ایلومینیم کے اجزا سے بنا ہے اس لئے سلیکن اور ایلومینیم کے ابتدائی دو دو حروف لے کر لفظ "سیال" بنا لیا گیا (Sial) سروش

[۳] (Sima) یہ طبقہ سلیکن اور مگنیشیم کے عناصر سے مرکب ہے اس لئے ان دونوں لفظوں کے ابتدائی دو دو حروف لے کر "سیما" وضع کیا گیا، Sima (سروش)

[۴] مذکورہ بالا اصول کے مطابق نکل اور فیرم (Ferrum) کے دو دو ابتدائی حروف لے کر اس لفظ کی ترکیب کی گئی ہے۔ فیرم (Ferrum) یونانی میں لوہے کو کہتے ہیں (سروش)

کہ وہ کوئی راستہ پاکر قشر کو چیرتا ہوا سطح زمین پر ظاہر ہوجاتا ہے۔

بعض لوگوں نے اندازہ کیا ہے کہ درمیانی طبقہ ــــ یا طبقہ سیما ــــ کی لزاجت (چپچپاہٹ) ڈامر (تارکول) کی لزاجت سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اس سے اس طبقہ کی شدت کثافت کا اندازہ ہوسکتا ہے یہاں تک کہ وہ بالائی طبقہ (یعنی سطح زمین) کا بوجھ برداشت کرلیتا ہے جو اس پر تیر رہا ہے حالانکہ وہ (یعنی بالائی طبقہ) اس سے بہت زیادہ سخت ہے۔

ویگنر کا نظریہ۔ گذشتہ بیان ذہن نشین کر لینے کے بعد ویگنر کا نظریہ اچھی طرح سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ نظریہ کرۂ زمین کے یوم پیدائش سے بحث کی ابتدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زمین اس وقت کرہ نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ محض ایک ایک "ٹکڑا" تھا جس کی کوئی صورت معین نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے فضا میں گردش کرنے سے کروی شکل پیدا ہوگئی

(۱)
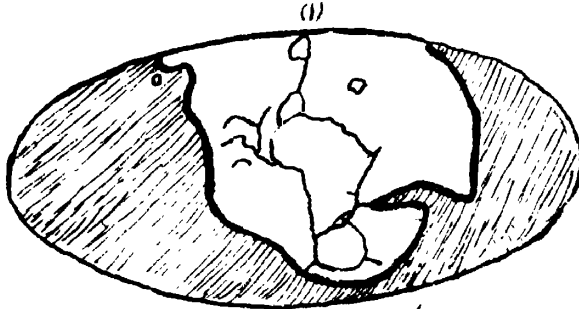
زمین جبکہ گردش نے اس کی شکل کروی بنادی تھی!
(خشکی تمامتر قطب کے پاس ایک قطعہ کی شکل میں مجتمع نظر آتی ہے)

قطب جنوبی کو چھوڑ کر جو خشکی سے گھرا ہوا تھا اس کی سطح کا اکثر حصہ پانی سے چھپا ہوا تھا۔ درحقیقت خشکی تمام کی تمام قطب کے قریب ایک قطعہ کی شکل میں مجتمع تھی جن ممالک کو اب جنوبی امریکہ کہتے ہیں یہ افریقہ کے مغربی ساحل سے ملے ہوئے تھے۔ شمالی امریکہ اور گرین لینڈ یورپ سے ملحق تھے۔ افریقہ کا مشرقی ساحل ہندوستان کے ساحل سے ملتا تھا اور ہندوستان کا رقبہ اس زمانہ میں موجودہ رقبہ سے بہت زیادہ تھا۔ اسی سے ملا ہوا مدغاسکر واقع تھا انٹارکٹا (بلاد قطب جنوبی) اور آسٹریلیا ایک دوسرے سے متصل تھے اور ایک قطعہ کی صورت میں جنوبی افریقہ کے پہلو میں واقع تھے

اس بعید ترین زمانہ میں تمام خشکی اسی قدر تھی جیسا کہ شکل نمبرا دیکھنے سے معلوم ہوگا، یہ اس نقطہ کے اردگرد واقع تھی جسے اب قطب جنوبی کہتے ہیں اور جو موجودہ کیپ ٹاؤن کے قریب واقع ہے۔

لیکن خشکی کا یہ بڑا قطعہ گردش میں زمین کی اندفاعی قوت کی وجہ سے منقطع ہونے اور ایک دوسرے سے جدا ہونے لگا۔ زمین کے اس انقطاع کی وجہ سے براعظم اور جزائر رونما ہوئے جو قطب جنوبی سے دور ہو کر موجودہ مواقع کی جانب ہٹنے لگے۔

مختلف و متعدد اطراف میں بعض ممالک نے ایک دوسرے کو ہٹانے اور دھکیلنے کی کوشش کی، پہاڑ اسی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ اس کا نمونہ شمالی ہند میں موجود ہے۔ کیونکہ ان ممالک نے شمال کی جانب ہٹانا شروع کیا۔ لیکن جو ممالک شمال کی جانب واقع تھے انہوں نے جنوب کی طرف ہٹانا چاہا اور اس کشمکش اور باہمی تدافع کی وجہ سے خط اتصال پر وہ عظیم الشان جغرافیائی مظہر رونما ہوا۔ جسے سلسلہ کوہ ہمالیہ کہتے ہیں دنیا کے اکثر بڑے بڑے پہاڑوں کی نشوونما کی یہی توجیہہ ہوسکتی ہے۔

خشکی کے مرکز سے جدا ہو کر شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے قطعات نے مغرب کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ چونکہ شمالی امریکہ جنوبی امریکہ کی بہ نسبت نقطۂ مرکزیہ سے زیادہ دور تھا اس لئے اُس کا اندفاع زیادہ تیز اور اس کی حرکت زیادہ سریع تھی، وسطی امریکہ اور گرین لینڈ[۱] نے بھی انہی کا اتباع کیا لیکن جنوبی امریکہ کی رفتار تیز نہ تھی اور وہ طبقہ سیما پر اطمینان اور وقار کے ساتھ تیر رہا تھا۔

(۲)
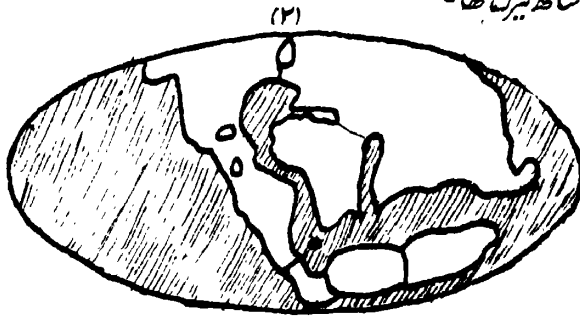
گردش کے دوران میں کرۂ ارض کی قوتِ اندفاع کے سبب سے خشکی شق ہوگئی ہے اور اس کے اجزا ایک دوسرے سے منفصل ہو گئے ہیں!

گذشتہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ویگنر کا نظریہ اکثر جغرافیائی مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔ اور خشکی کے وجود اور اس کی نشوونما کی دل نشین توجیہات پیش کرتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کے اثبات کے لئے قطعی دلائل کی ضرورت ہے۔

کیا ایسی ادلہ موجود ہیں؟

نظریۂ ویگنر کی صحت کے دلائل۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر ویگنر کا نظریہ صحیح ہے اور تمام خشکی درحقیقت ایک ہی جگہ جمع تھی تو اُن ممالک میں جو پہلے باہم متصل تھے اور اب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے

---

[۱] یہ ظاہر کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت ان ممالک کا کوئی نام نہیں تھا، اسما کا تعین بعد کے زمانہ میں ہوا ہے (سروش)

ہیں تشابہ ہونا چاہئے خصوصاً نقطۂ اتصال پر۔

یہاں اس نظریہ کی واقعیت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ جب ہم جنوبی امریکہ کے مشرقی سواحل کا مغربی افریقہ کے سواحل سے مقابلہ کرتے ہیں تو مٹی کی ترکیب کو اس درجہ متماثل پاتے ہیں گویا ایک ہی ہے۔ آثار مدفونہ اور حیوانات متحجرہ کے بقایا میں بھی یہ تشابہ اتنا ہی مکمل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونو ساحل آپس میں ملے ہوئے تھے صرف یہی نہیں بلکہ افریقہ کے مغربی ساحل اور جنوبی امریکہ کے مشرقی ساحل کی ظاہری شکل وصورت میں بھی اتنی مطابقت پائی جاتی ہے کہ اگر پہلے کی طرح ان دونوں کا مگر غیم کر دینا ممکن ہوتا تو اس میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔

مشرقی امریکہ اور مغربی افریقہ کے سواحل!

سواحل کے کٹاؤ پر غور کیجئے، گویا ٹوٹی ہوئی طشتری ہے جس کے ٹکڑوں کو جوڑ کر پھر سالم طشتری تیار ہوسکتی ہے۔

بجنسہ یہی اصول دوسرے براعظموں پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وہ شکل ظاہری اور سواحل کے موادِ ترکیبی میں اس طرح متماثل ہیں کہ اگر ان کا وجود جوڑ دینا ممکن ہو تو ان کی سطح، ان کی مٹی کی ترکیبی ہیئت ساحلِ بحر سے ان کے ارتفاع اور دوسرے اعتبارات میں مطلق کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔

یا مثلاً برازیل میں سیرا گیرال اور جنوبی افریقہ میں ڈرکنبرگ کے پہاڑوں کو لے لیجئے۔

۴
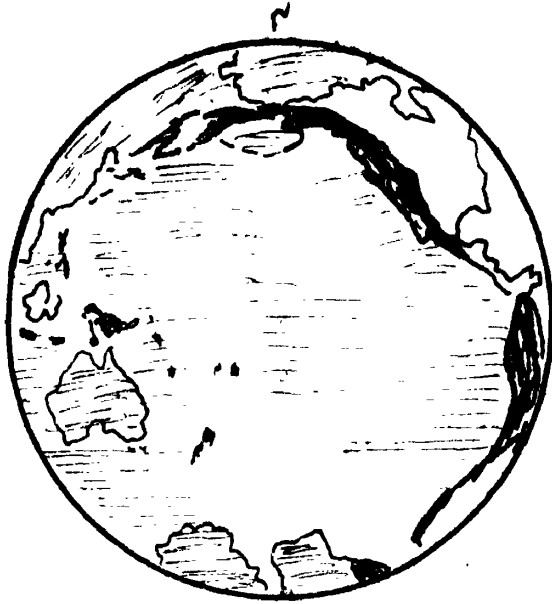
مشرقی ایشیا اور مغربی امریکہ کے سواحلی پہاڑ

صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں وجوہ مشابہت قطعاً مکمل ہیں۔ گویا دونوں ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ اس کے علاوہ برازیل اور جنوبی افریقہ میں ایک ہی قسم کی الماس کی کانیں پائی جاتی ہیں بلکہ ان میں سے جو الماس نکلتا ہے وہ بھی دونوں جگہ کا تقریباً یکساں ہوتا ہے۔

ان دلائل پر اس دلیل کا اور اضافہ کر لیجئے کہ عصر حجری میں ملحقہ قطعات کی آب وہوا اور موسم میں بہت زیادہ مشابہت بلکہ مماثلت تھی۔ اگرچہ آج کل ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ان کے تماثل کا ثبوت یہ ہے کہ جو اقالیم باہم متلاصق تھیں ان میں قدیم حجری زمانہ کے حیوانات اور مدفونہ آثار ایک دوسرے سے کامل مماثلت رکھتے ہیں۔ ان حیوانات کا مختلف منطقوں میں زندہ رہنا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب یہ منطقے آب وہوا اور موسم کے اعتبار سے متماثل ہوں۔ مثلاً جب ہم جنوبی افریقہ میں ایسے حیوانات کے ڈھانچ پائیں جو صرف سرد ممالک میں زندہ رہ سکتے ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں گے کہ جن ممالک میں یہ آثار پائے گئے ہیں حقیقتاً ان کی آب وہوا سرد تھی۔

اس نظریہ کی صحت کی ایک دلیل اور ہے۔ جو ممالک و اقالیم دراصل ایک دوسرے سے ملحق تھے ان میں حجری زمانہ کے نباتاتی بقایا بھی باہم بہت مشابہ ہیں۔ اگر یہ ممالک زمانہ ماقبل تاریخ میں ایک ہی قطعہ کی صورت میں نہ رہے ہوتے تو ان کی نباتات کا متماثل ہونا غیر ممکن تھا۔ اس لئے کہ متماثل نباتات ــــ متماثل حیوانات کی طرح ــــ ایک قسم

کی زمین اور ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں نشو و نما پاسکتی ہیں چونکہ ان متعدد ممالک میں جو آج ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں نباتات کے آثارِ مدفونہ متشابہ ہیں اس لئے درحقیقت ان ممالک کا باہم متصل و ملحق ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔

دوسرے دلائل۔ نظریۂ وگیز کی صحت پر دوسرے دلائل بھی قائم کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے منجملہ ایک "ارصادِ فلکی" کی دلیل ہے جو اگرچہ قطعی نہیں کہی جاسکتی تاہم اس سے پتا چلتا ہے کہ خشکی کا انقسام اور اس کے حصص کا جزیروں اور براعظموں کی صورت میں ایک دوسرے سے انفصال ضرور اصلیت رکھتا ہے۔

یہ ظاہر کرنا غیر ضروری ہوگا کہ اگر مذکورہ ممالک ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہیں اور مرورِ ایام کے ساتھ دور دور جا پڑے ہیں تو یقیناً وہ اب بھی حرکت کرتے ہے اور دور ہو رہے ہونگے یعنی وہ ایک جگہ پر قائم نہیں ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ارصادِ فلکیہ کی امداد سے بہ آسانی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ان ممالک کے "بُعد الفصالی" اور ان کی سرعتِ رفتار کے اوسط کا اندازہ کرسکیں تو یہ ممکن ہے کہ تقریبی طور پر ابتدائے انفصال کا زمانہ متعین کیا جا سکے۔ اس اصول پر ہمارے خیال میں وہ ممالک جو گرین لینڈ کے نام سے مشہور ہیں ناروے سے تقریباً ایک لاکھ سال پہلے جدا ہوئے تھے کیونکہ گرین لینڈ کم از کم ۶۰ فٹ سالانہ کے اوسط سے مغربی جانب ہٹ گیا ہے۔ ارصادِ فلکی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۶۳ء سے ۱۹۲۲ء تک گرین لینڈ کی رفتار مغربی سمت میں ۶۰ فٹ سالانہ کے اوسط سے رہی ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ خشکی کے انفصال و انقسام کا سبب گردش میں کرۂ زمین کا اندفاع تھا زمین کے اس انقسام کی وجہ سے موجودہ براعظم و جزائر پیدا ہوئے اور نقطۂ قطب جنوبی سے اپنے موجودہ مواقع کی طرف ہٹنے لگے لیکن اس انتقالِ مکانی کے لئے کسی دوسری قوت کی معاونت و مساعدت لازمی تھی یہ قوت ——— ڈبلن (Dublin) (آئرلینڈ) کے ایک عالم سٹرگول کے نظریہ کے مطابق ——— طبقۂ سیما کی وہ قوت ہے جسے برقی عملیت (Radio action) کہتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ وہ تمام عناصر جن میں "برقی عملیت" پائی جاتی ہے۔ حرارت پیدا کرتے ہیں جب اوپر والے سنگین طبقات بہت دبیز ہوتے ہیں اور اس کی حرارت کو خارج ہونے سے روک دیتے ہیں تو طبقۂ سیما میں جمع شدہ حرارت بے انتہا بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ ان مادوں کو جن پر یہ طبقہ مشتمل ہے پگھلا دیتی ہے اس کی وجہ سے طبقۂ سیال یا قشرِ زمین اپنے نیچے والے طبقہ (سیما) سے بالکل علیحدہ ہوجاتا ہے اور وہ ایک متحرک جزیرے کی طرح بآسانی حرکت کرسکتا ہے اور مدوجزر کی تاثیر سے انتقالِ مکانی رونما ہوجاتا ہے!

منظور سروش

(بھوپالی)

تجلّیات

کس کے فروغِ نور سے گلنار ہے بہار؟ کس کی تجلیوں کی پرستار ہے بہار؟
کس کی صباحتوں سے گل افشاں ہے کائنات؟ کس کی لطافتوں سے شفق زار ہے بہار؟
کس کی بہارِ حسن سے رنگیں ہیں باغ و راغ؟ کس نقشبندِ ناز کا شہکار ہے بہار؟
کس کی ضیائے رُخ سے درخشاں ہے آفتاب؟ کس کی جبیں سے مخزنِ انوار ہے بہار؟
کس کی نظر سے دل ہے صنم خانۂ نشاط؟ کس کے اثر سے غیرتِ فرخار ہے بہار؟

تعریف سے بلند ہے وہ پیکرِ جمال؟ کیا حسن ہے کہ نقش بدیوار ہے بہار؟
جلووں نے تیرے آگ لگا دی بہار کو؟ یہ لالہ زار ہے کہ شرر بار ہے بہار؟
میرے غمِ وفا کے لئے درد ہے نشاط؟ میری رگِ جنوں کے لئے خار ہے بہار؟
صحنِ چمن میں جھوم رہے ہیں گل و سمن؟ میخانۂ حیات میں سرشار ہے بہار؟
جوشِ بہار ہے کہ فریبِ خیال ہے آئینۂ نگاہ کا زنگار ہے بہار؟
آزاد ہے جمال ترا قیدِ رنگ سے زندانِ رنگ و بو میں گرفتار ہے بہار؟
اک لرزشِ حیات ہی اک ساعتِ نشاط برقِ نظر گداز کی رفتار ہے بہار؟
موجِ نسیم سے نہ بجھے گا چراغِ گل گلزار کی فضا میں فسوں کار ہے بہار؟
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل،
عابد شہیدِ حسرتِ دیدار ہے بہار

عابد

گم شدہ رومال

شملہ میں یوں تو عموماً غروبِ آفتاب کا منظر دلفریب ہوتا ہے۔ لیکن آج مطلع ابرآلود ہونے کی وجہ سے اور بھی دلکش تھا۔ نریمان سہراب اور مس جمشید اپنے چند دوستوں کے ہمراہ جاکھو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔

پہاڑ کی بلند چوٹی اور شام کی ٹھنڈی ہوا نے اپنا کام کیا۔ مس جمشید کو جس نے ایک ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی سردی محسوس ہونے لگی۔

مس جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ نریمان لاؤ تو میں اپنا کوٹ پہن لوں"

نریمان نے اپنے کندھے سے کوٹ اتارا اور مس جمشید کو پہنا دیا۔

"شکریہ۔ میں نے بہت اچھا کیا جو اپنے ساتھ کوٹ بھی لے آئی ...... ہیں؟ کیا؟ میرا ریشمی رومال کہاں ہے" مس جمشید نے کوٹ کی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

نریمان نے متعجب ہو کر کہا "تو کیا۔ اس میں رومال بھی تھا؟"

مس جمشید نے جھنجھلاتے ہوئے کہا "ہاں میں نے چلتے وقت کوٹ کی دائیں جیب میں رکھا تھا۔ لیکن اب گم ہے۔ تم بڑے بے پرواہ ہو نریمان! کہیں راستے میں گرا دیا ہوگا"

سہراب نے موقع پا کر کہا "تم بھی بڑی عقلمند ہو جو اپنی چیزیں نریمان کے سپرد کر دیتی ہو یہ تو سکول میں بھی بڑا غیر محتاط مشہور تھا"

نریمان متاسف ہو کر بولا "مس جمشید مجھے افسوس ہے"

مس جمشید نے بات کاٹ کر کہا "اور تھا بھی بالکل نیا" واقعی سہراب۔ میں آج صبح ہی ہیل سے خرید کر لائی تھی۔ بڑا خوبصورت تھا"

نریمان نے ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا "وقت تو ہے میں ابھی واپس جاتا ہوں اور اس کی تلاش کرتا ہوں۔ راستے میں کہیں کوٹ کی جیب سے گر گیا ہوگا"

مس جمشید نے کہا "ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ دونوں مل کر جلد تلاش کریں گے اور پھر غروبِ آفتاب سے پہلے واپس بھی آسکیں گے"

ان کے ہمراہیوں میں سے ایک نے بآوازِ بلند کہا "شاباش جلدی کرو۔ ورنہ شام ہوجائے گی اور ہمارا پہاڑ پر چڑھنا یونہی رائیگاں جائے گا۔"

مس جمشید اور نریمان پہاڑ سے نیچے اترنے لگے۔ انہوں نے اس جگہ کو جہاں رومال گرنے کا شبہ ہوسکتا تھا دو حصوں میں تقسیم کرلیا ایک حصہ میں مس جمشید اور دوسرے میں نریمان مصروف تلاش ہوگئے تھوڑی دور جاکر نریمان ایک جھاڑی کے پاس جھکا اور اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک ریشمی رومال نکال کر وہاں رکھا اور آگے کو چل دیا۔ تلاش کے بعد ملنے کی مقرر کردہ جگہ پر دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی ناکامی کی خبر سنائی۔

مس جمشید نے کہا "نہیں مل سکا تو نہ سہی۔ چلو ہم واپس چلیں اور غروب آفتاب کے دلچسپ منظر کے مشاہدے سے لطف اندوز ہوں"۔

نریمان نے کہا "جانے سے پیشتر تم میرے حصہ میں دوبارہ تلاش کرو اور میں تمہارے حصہ میں ڈھونڈتا ہوں۔ ممکن ہے کہ ہم میں سے کسی کی نظر چوک گئی ہو"۔

اس طریق پر دوبارہ تلاش شروع ہوئی۔ مس جمشید کو ایک جھاڑی کے پاس اپنا ریشمی رومال زمین پر پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے نریمان کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا مس جمشید نے جلدی سے جھک کر رومال اٹھا لیا اور پھر اسی طرح تلاش میں مصروف ہوگئی۔

اس نے نریمان سے تھوڑی دیر بعد بلند آواز سے کہا "وہ تو کہیں نظر نہیں آیا"۔ میرا خیال ہے کہ کہیں گم ہوگیا ہے خیر کوئی مضائقہ نہیں میں تمہیں معاف کرتی ہوں"

نریمان اس طرف آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جھاڑی کے پاس سے گذر چکی ہے۔

مس جمشید نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارے پیچھے آنے والے کسی شخص نے اٹھا لیا ہوگا۔ اب اس کی تلاش فضول ہے۔ ہم . . . ."

نریمان نے متحیر ہوکر جواب دیا "یہ ناممکن ہے وہ ضرور کہیں یہاں ہی پڑا ہوگا" ابھی تین منٹ بھی نہیں گذرے کہ میں نے . . . .

مس جمشید نے کہا "ہاں۔ ہاں۔ کہو نریمان! چُپ کیوں ہوگئے؟"

"میں . . . . میرا یہ مطلب ہے کہ یہاں سے کوئی بھی نہیں گذرا . . . . نریمان نے سنبھل کر جواب دیا۔

مس جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا "نریمان تم نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا ہے میرا رومال تمہارے ہی پاس تھا"

نریمان نے منفعل ہو کر کہا "کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مس جمشید نے نریمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ہاں۔ ہاں تمہارے پاس۔ اور تم نے ہی پہلی تلاش کے دوران میں جھاڑی کے پاس رکھ دیا تھا۔ اب انکار کیوں کرتے ہو؟ یہ تو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے"

"خیر! میں ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میرا خیال نہیں تھا کہ تم ایک رومال کے لئے مجھ سے اس طرح خفا ہو جاؤ گی میں نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے تمہیں تمہارا رومال دے دوں اور بعد میں تم سے دریافت کروں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مس جمشید نے مضطربانہ انداز میں پوچھا "مجھ سے دریافت کرو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مس جمشید تمہیں معلوم ہے کہ میرے لئے یہ آخری موقع ہے۔ کل میری رخصت ختم ہو جائے گی سہراب ابھی ایک ہفتہ اور یہاں رہے گا میں تمہیں تنہا ملنا چاہتا تھا اور تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے تم سے محبت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" نریمان نے بے تاب ہو کر کہا۔

نریمان جوش محبت میں مس جمشید کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا پیچھے ہوئی ہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ نریمان نے اسے گرتے ہوئے کو تھام لیا لیکن اس ذرا سی حرکت میں مس جمشید کی بغل میں سے کچھ۔۔۔ ریشمی رومال۔۔۔ زمین پر گر پڑا

"اوہ نریمان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نریمان نے زمین پر سے رومال اٹھا لیا۔

"خوب تم نے تو رومال وہاں سے اٹھا لیا تھا۔ جہاں میں نے رکھا تھا اور مجھے نہیں بتایا ۔ ۔ ۔ ٹھہرو ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نریمان نے اس کی نازک کلائی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا "تم تو کہتی تھیں کہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مس جمشید نے متبسم ہو کر کہا "لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اسے اس خیال سے اٹھا لیا تھا کہ اگر میں نے اسے وہاں رہنے دیا اور تم نے ڈھونڈ لیا تو تم مجھے جلد واپس لوٹنے کو کہو گے۔ بغیر اس کے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ بغیر ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں۔ تو نریمان تم کل جا رہے ہو۔ میں خود دل سے اس بات کی خواہشمند تھی کہ تم مجھ سے یہ بات کہو جو تم نے ابھی کہی ہے۔ میں برابر پندرہ روز سے اس کے انتظار میں تھی۔"

"اوہ نریمان" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُس روز غروب آفتاب کا منظر نہایت دلفریب اور روح پرور تھا لیکن نریمان اور مس جمشید نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا۔

اختر (امرتسری)

واردات

راتوں کو تصور ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا انجام مرا کیا ہونا ہے

ان نورس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے
برسے ہوئے سچے موتی ہیں بہتا ہوا خالص سونا ہے

تو یہ نہ سمجھ للہ کہ ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا دراصل ہمارا رونا ہے

تمییز کمال و نقص اٹھا یہ تو ہے روشن دنیا پر
میں چندن ہوں، تو کندن ہے میں مٹی ہوں تو سونا ہے

ہر آنسو بحرِ گوہر ہے ہر موجِ تبسم اِک آنسو!
رونا بھی تمہارا ہنسنا ہے ہنسنا بھی ہمارا رونا ہے

دل کو کھویا، جاں کو کھویا، دنیا کھوئی دیں بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن اے دوست تجھے بھی کھونا ہے

ماتم ہے مری آوازِ شکستِ سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغرؔ میرا نغمہ گویا دیپک کے سروں میں رونا ہے

ساغر نظامی (علیگ)

کلوپیٹرا کی زندگی کے آخری لمحات

کلوپیٹرا اپنی خوابگاہ میں بستر پر عجیب ذہنی انتشار کی حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ ناخنوں کی مسلسل رگڑ سے نُچ گیا تھا۔ آواز نحیف اور لرزاں تھی۔ آنکھیں وہ دُرِ شہوار لُٹا رہی تھیں جو اُس کے غمِ نہاں کے واحد ترجمان تھے۔

جب اُس نے "سیزر" کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہُوئے دیکھا تو وہ بے تابانہ اُٹھی اور ایک مجنونانہ انداز کے ساتھ اس کے قدموں پر گر پڑی۔

کلوپیٹرا گنہگار تھی محبت کی۔ اس نے انٹونیس سے محبت کی تھی اور پھر بے پایاں محبت۔ ایسی محبت جس میں ان دونوں کی رُوحوں کا اِتصال ہوگیا تھا لیکن خدا نے اس کے محبوب کو چھین لیا۔ اب وہ سیزر کے ہاتھوں میں قید تھی اور شدید سزا پانے والی تھی۔

کلوپیٹرا اپنے اُن مجرمانہ افعال کے لئے معافی مانگ رہی تھی جو انٹونیس کی محبت میں سرزد ہوئے تھے۔ وہ بار بار معافی کی طالب ہو رہی تھی۔ سیزر ظاہراً اور بناوٹ سے اس کے جرائم کی تردید کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کا ارادہ کچھ اور ہی تھا مگر پھر بھی جب کلوپیٹرا نے اس کو مہربان ہوتے دیکھا تو امید بھرے دل کے ساتھ سیزر سے ملتجی ہوئی کہ مجھے موت سے بچالیا جائے۔ کیونکہ کچھ دن اور میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

باوجود اس کی اس قابلِ رحم حالت کے اس کا حُسن ...... متاعِ دل کو لوٹ لینے والا حُسن .... سیزر سے اس کی سفارش کر رہا تھا!

آخرکار کلوپیٹرا نے سیزر کو لالچ دیتے ہوئے کہا کہ "میں اپنے تمام جواہرات اور خزانے تمہاری خدمت میں پیش کرنے کے لئے طیار ہوں بشرطیکہ تم مجھے معاف کر دو" لیکن اُسی وقت اتفاقاً اُس کا خزانچی سیلوکس سیزر کے سامنے حاضر ہُوا اور سیزر کو آگاہ کیا کہ وہ کلوپیٹرا کی تمام گفتگو کو محض گپ سے بڑھ کر اہمیت نہ دے۔

کلوپیٹرا غصہ میں کانپ اٹھی۔ اس کے دماغ میں اشتعال سے آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے خزانچی کو سر کے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

"سیزر۔ کیا کلوپیٹرا بدبخت کے لئے یہ باعثِ ننگ نہیں ہے کہ وہ شاہی وقار سے بھی محروم کر دی

جائے؟ کیا کلوپٹرا کے لئے یہ روحانی اذیت کا باعث نہ ہوگا کہ اس کا ادنیٰ خادم جو کل زبان ہلانے کی جرات نہ کرتا تھا آج اس کے آگے زبان درازی کرے چغلی کھائے اور اس کے منہ پر اس کو جھوٹا کہے۔ اس کے بعد اس نے خزانچی کو دھکے دے کر نکال دیا۔ سیزر نے اس کو تسلی دی کہ میں تمہاری زندگی اور تمہارے وقار کی حفاظت کے لئے حتی الوسع کوشش کروں گا لیکن یہ تسلیاں اوپری دل سے تھیں۔

(۲)

کارناس ڈولابیلا نے جو سیزر کا بہترین رفیق اور کلوپٹرا کا چاہنے والا تھا خفیہ طور پر کلوپٹرا کو لکھ بھیجا کہ سیزر سیریا کے سفر پر جانے والا ہے اور پھر تین دن کے اندر وہ تمہیں مع تمہارے بچوں کے جلاوطن کر دے گا جب کلوپٹرا نے یہ روح فرسا خبر سُنی تو اس نے سیزر سے التجا کی کہ مجھے آخری مرتبہ اپنے عاشق انٹونیس کی قبر کی زیارت کی اجازت دو۔ اس کو اجازت دے دی گئی۔ کلوپٹرا مع چند مسلح فوجیوں اور سہیلیوں کے انٹونیس کی قبر کی طرف روانہ ہوئی۔ قبر پر پہنچتے ہی اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہوگیا اور وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور قبر کو مخاطب کرتے ہوئے بولی" انٹونیس۔ اے میرے آقا۔ میں نے ہی تجھ کو اپنے ہاتھوں سے اس قبر میں سلایا اور دنیوی تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لئے اس دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ میں یہاں ایک قیدی کی زندگی بسر کر رہی ہوں، حتیٰ کہ اپنی زندگی کا خود خاتمہ نہیں کر سکتی۔ اے آرام کرنے والے! تو خود سمجھ سکتا ہے کہ میں کن الجھنوں اور مخمصوں میں گرفتار ہوں جب تک کہ تو زندہ تھا کوئی طاقت ہمیں جُدا نہ کر سکی۔ اب جب کہ تو آغوش لحد میں سو رہا ہے مجھ بیکس پر طرح طرح کے مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ قدرت کی نیرنگیاں دیکھ! تو ایک رومن ہے لیکن مصر میں مدفون ہے میں ایک مصری ہوں۔ لیکن اٹلی میں دفن کی جاؤں گی۔

میں اس مفلسی کے عالم میں تجھے کچھ نذر نہیں کر سکتی۔ ہاں کلوپٹرا اپنی زندگی اور اپنا جسم تجھ کو دے سکتی ہے۔ معزز آقا! کلوپٹرا کے دل میں صرف ایک تمنا باقی رہ گئی ہے اور وہ آخری تمنا ہے۔ وہ یہ کہ میرے مرنے کے بعد ہم دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا جائے۔

اپنے اس غمناک نوحہ کے بعد کلوپٹرا نے اپنا قیمتی ہار اور چند گلدستے قبر کی نذر چڑھائے اور ایک مرتبہ قبر کو کھینچ کر لپٹنے کے بعد اپنے اشک ہائے گرانمایہ کو لے کر رخصت ہو گئی!

اس کے بعد اس نے غسل کیا اور بہترین لباس زیب تن کیا اور کھانے کی میز پر بیٹھ گئی۔ وہ بعینہٖ ایک فردوسی حور معلوم ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے چند خطوط سیزر کو لکھے اور روانہ کر دئے۔ باقی نوکروں اور پہرے والے سپاہیوں

کو اس نے تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جانے کا حکم دیا صرف وہ اور اُس کی دو سہیلیاں اراس او رشارمین اس کے ساتھ باقی رہ گئی تھیں۔ اس کے بعد ان تینوں نے اپنے کمرہ کو خوب مضبوط بند کر لیا۔

سیزر نے کلوپٹرا کے روانہ شدہ خطوط کو پڑھا جو شدید رنج و الم میں اس کو لکھے گئے تھے۔ ان میں اس سے الحاح وزاری کے ساتھ درخواست کی گئی تھی کہ کلوپیٹرا کو اس کی موت کے بعد انٹونیس کے ساتھ دفن کیا جائے۔

سیزر نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں کلوپیٹرا نے خودکشی نہ کر لی ہو۔ چند آدمیوں کو فوراً اس کے محل کی طرف روانہ کیا۔ ان لوگوں نے پہرے دار سپاہیوں کو حالات سے بے خبر پہرہ دیتے دیکھا۔ کلوپیٹرا کا کمرہ توڑا گیا۔ لیکن وہاں کیا دھرا تھا؟ کلوپیٹرا کا بے جان مجسمہ جس کی روح موت کے ابدی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی کہتے ہیں کہ اس کی دو سہیلیاں ایک افعی کو کلوپیٹرا کے حکم سے زندہ پکڑ لائی تھیں جس سے ان تینوں نے اپنے آپ کو ڈسوالیا۔

اس کی ایک سہیلی تو اُس کے قدموں پر پڑی ہوئی تھی اور دوسری کلوپیٹرا کے تاج کو سنبھالے ہوئے تھی جس کو اُس نے آخری مرتبہ سر پر رکھا تھا۔ اس طرح غریب کلوپیٹرا کی زندگی ختم ہوئی۔

ترجمہ **منیر الدین**
حیدرآبادی

ہوشیار!

رنگیں خیالیوں پہ اگر ناز ہے تجھے ۔۔۔ پھولوں کا رنگ دیکھ چمن کی بہار دیکھ
فیاضیاں تجھے ہیں اگر باعثِ غرور ۔۔۔ گنگ و جمن کو دیکھ کے ابرِ بہار دیکھ
ہے جوہرِ خرد کی اگر خواہشِ نمود ۔۔۔ لعل و زمرد و گہرِ آبدار دیکھ
ہو مرتبہ میں تجھ کو بلندی اگر نصیب ۔۔۔ کوہِ ہمالیہ کا عروج و وقار دیکھ
خوش قامتی و حسن سے گر بہرہ یاب ہے ۔۔۔ سروِ چمن کو دیکھ گلوں کا نکھار دیکھ

کرتی ہے قدرِ زیست تو کسبِ کمال کر
رہ خود فروشیوں سے مگر ہوشیار دیکھ

جگر بریلوی

سرودِ نشاط

چھایا ہوا بہشتِ بریں کا سماں ہے آج | اِک نوبہارِ نازِ مرا میہماں ہے آج
ہر سمت گرمِ رقص ہے اک زندگی کی لہر | جاں بخش بوئے کاکلِ عنبر فشاں ہے آج
ہر ذرہ ہے ہجومِ تجلی سے مہر و ماہ | یہ عرصۂ زمیں تو نہیں آسماں ہے آج
دیتی ہے ہر شگفتہ کلی دعوتِ سکوں | موجِ ہوا میں نغمۂ امن و اماں ہے آج
آنکھوں سے اُٹھ رہے ہیں نظر آزما حجاب | بے پردہ رازِ ہستی کون و مکاں ہے آج
طے ہو رہے ہیں معرفتِ عشق کے مقام | لعلِ فسوں طراز خود افسانہ خواں ہے آج
ٹکڑا ہے کوئی خلدِ بریں کا جہانِ تنگ | ہر سانس موجِ زندگیِ جاوداں ہے آج
دھندلی سی اک ضیا ہے جہاں عیشِ سرمدی | آسودہ اُس مقام پہ عمرِ رواں ہے آج
لیتے ہیں مہر و ماہ کی تزئین کے لئے | ہر ذرۂ حقیر وہ جنسِ گراں ہے آج
سب ختم ہو رہے ہیں مقاماتِ وجد و ذوق | منزل شناس راہبرِ کارواں ہے آج
آنکھوں میں ہو رہا ہے بیانِ حدیثِ عشق | صرف ایک قلب ہی کہ مرا رازداں ہے آج
اللہ رے ذوقِ بادہ کشی جام کے عوض | ہر رند محوِ خواہشِ رطلِ گراں ہے آج
بےخوف جا رہی ہے مری کشتیٔ مراد | وہ ناخدا ہیں پرتوِ مے بادباں ہے آج
ہے وہ فضا کہ خاکِ چمن بھی ہے گلفروش | ہے وہ سماں کہ پیرِ دوتا بھی جواں ہے آج

اختر یہ بزمِ عیش، یہ ساقی، یہ دورِ جام
زندہ ہوں میں ابھی، یہ مجھے بھی گماں ہے آج

علی اختر
حیدرآباد دکن

"آپ ہی حیراں ہونا"

چچا جان "آزاد خیال" تھے ــــــ یعنی مائل بہ دہریت۔ اگلے زمانے کے لوگ تو کسی قدر سریع الاعتقاد ہونے کی وجہ سے مذہب کی غرض وغایت سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اپنے آبائی دین پر مرتے دم تک قائم رہا کرتے تھے۔ اُس وقت کسی پیش پا اُفتادہ مذہب کا پیرو ہونا ایک دلپسند فرسودگی تھی اور دہریت اور لامذہبیت جدت۔ موجودہ صدی میں ہمارے جذبات ومحسوسات میں منطقیت اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ ہم کسی چیز کو دیکھے سنے، چکھے، سونگھے یا چھوئے بغیر اس کے وجود کے قائل نہیں ہوسکتے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں لامذہبیت آسان ترین چیز ہے۔ اسی لئے عام ترین اور مذہب کی روحانی اہمیت کا اندازہ لگانا اور اس پر یقین واثق اسی تناسب سے دشوار۔ چچا جان آزاد خیال تھے ــــــ محض حماقت کی وجہ سے، اسی طرح جیسے پچھلے زمانہ کے لوگ مذہبی ہوا کرتے تھے۔ کسی مُلّا یا پنڈت کی محض شکل دیکھ لینا ہی ان کے واسطے ناقابل برداشت تھا۔ وہ اکثر مولویوں پر لوہے "جلال صادق" کے ساتھ کُلّے اٹھایا اور دانت پیسا کرتے تھے، کبھی کبھی ان کے منہ سے کوسنے بھی نکل جاتے ــــــ "خدا ان مردودوں کو غارت کرے"! ــــــ اس کوسنے میں جو ستم ظریفی پنہاں ہے اس کا احساس ان غریب کو نہ ہوا۔ مگر میں کبھی ان کی اس حرکت پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، جیسے وہ غالباً اپنی اس مردانگی کا خاموش اور حیرت آمیز اقبال تصور فرمایا کرتے تھے۔

مذہب کے معاملات میں میں خود آزاد خیال ہوں۔ مگر مجھ میں اور چچا جان میں فرق صرف اس قدر ہی کہ وہ دشمن ہیں لفظ "مذہب" اور اس کے لوازمات کے اور میں محض بدعت و وہم کا۔ مقاماتِ پرستش خواہ کسی مذہب کے ہوں چچا جان کو دائرۂ اختیار سے باہر کر دینے پر مجبور ہیں میں نے انہیں بارہا سمجھایا کہ حضرت مسجدیں اور مندر تو محض "قبلہ نما" ہیں ــــــ قبلہ تو وہ "عظیم نامعلوم" ہے جسے بے نقاب کرنے میں آپ کی سائنس نہایت شدت سے مصروف ہے۔ ہمارا دائرہ علم رفتہ رفتہ وسیع ہو رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقاماتِ پرستش روز بروز معدوم ہوتے جاتے ہیں یقین رکھئے وہ زمانہ قریب ہے جب مسجدیں اور مندر بوریے، گھنٹیوں اور بدنیوں کی بجائے، خوردبینوں، دوربینوں اور برقی آلاتِ مطالعہ سے آراستہ ہوا کریں گے۔ مگر چچا جان عادی تھے کہ تقریباً ہر شئے میں مجھ سے اختلاف کریں۔

وہ وطن پرست تھے۔ میں کچھ نہ تھا۔ وطن پرستی بھی تو ایک قسم کا مذہب ہے اور غالباً دنیا کے نصف تعصب اور اختلاف کا ذمہ دار۔

اس کے علاوہ چچاجان ایک ایسی انجمن کے فرد بھی تھے، جس کا مقصد تمام دنیا کے مذاہب کی اندھی مخالفت کرنا ہے۔ مگر جو اپنی اس تنگ نظری کو "امداد باہمی" اور اسی وضع کے "فوق البھڑک" اصولوں میں چھپا کر اسے عوام کے لئے جاذبِ توجہ بنا رہے تھے۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا "چچاجان! آپ کی جماعت کے تمام افراد اُن جاہل عورتوں سے بھی بدتر ہیں جو بے امتیاز ہر ایسی قبر پر ماتھا ٹیکنے کو تیار ہیں جس پر گنبد بنا ہوا ہو۔ اگر آپ کسی نہ کسی مذہب کا سہارا لینے پر مجبور ہیں تو پرانا مذہب اس سے بدرجہا بہتر ہے۔

"آپ کی انجمن کا سب سے بڑا مقصد امداد باہمی ہے۔ بہت دل کش اصول ہے۔ مگر غالباً آپ حضرت محمد سے کے مشہور اصول کو بھولے جا رہے ہیں ـــــــ "کُلُّ مُؤمِنٌ اِخْوَۃٌ" اس تمام قدر طویل اور تکلیف دہ استدلال کے جواب میں ہمیشہ چچاجان کہتے "ہم لوگ مذہب کے خلاف ایک مذہب کھڑا کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے مقاصد بارور ہوئے تو یہ لفظ بہت جلد دنیا سے نابود ہو جائے گا۔ دراصل ہماری انجمن ایسے افراد کا مرکز ہے۔ جو خدائیت سے عاجز آ چکے ہیں"۔

"بہت خوب" میں جواب دیتا "مگر قبلہ یہی تو وہ چیز ہے جس کے باعث میں آپ کو اخلاق اور معاشرت کے واسطے عظیم ترین مصیبت خیال کرتا ہوں۔ اگر آپ حضرات کا مقصد ہوتا تخریب ـــــــ مجرد تخریب ـــــــ تب تو خیریت تھی۔ مگر بدقسمتی سے آپ کا مقصد تو صرف مجادلہ ہے۔ آپ ایک جنس کی قیمت محض اس لئے گھٹا رہے ہیں کہ آپ کا حریف دیوالیہ ہو جائے اور یہ صریح مقابلہ ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی انجمن محدود ہوتی آپ جیسے آزاد خیال حضرات تک تب تو خیر، مگر کیفیت یہ ہے کہ آپ نے چند غیر معمولی قسم کے وعدے کر کے بہت سے ایسے سادہ لوحوں کے واسطے بھی جال بچھایا ہے۔ جن کا اعتقادِ مذہبی آپ سے یکسر مختلف ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ مولینا عبد الحیٔ "مجلس العلماء" کے صدر بننے سے قبل آپ کی انجمن کے فرد تھے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود اگر آپ اپنی انجمن کو مذہبیت کے خلاف ایک قلعہ کہیں تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کا قلعہ گارے کا بنا ہوا ہے"۔

چچاجان ایک اندازِ برتری کے ساتھ اپنی آنکھوں کو جنبش دے کر فرماتے "صاحبزادے ہمارے اہم ترین مقاصد تو سیاسی ہیں تم جانتے ہو مذہب بھی تو آخر سیاست ہے اور ہم لوگ ملوکیت کے استیصال میں بھی اسی اہتمام کے ساتھ مصروف ہیں جس کے ساتھ مذہب کے استیصال میں"۔

میں ہنسی ضبط نہ کر سکا "بے شک آپ لوگ بہت ذہین ہیں" پھر سنجیدگی سے "اگر آپ فرمانے کہ ہماری

انجمن ایک آلۂ انتخاب ہے تو مجھے مان لینے میں تامل نہ تھا اگر آپ کہتے کہ ہم تو محض لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں تب بھی مجھے اس کے باور کر لینے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر جب آپ پوری متانت کے ساتھ اس امر کا اعلان فرماتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو ملوکیت کی بیخ کنی کرنا ہے تو میں وہی حرکت کرنے پر مجبور ہوں جو ابھی کی ——"

جب کبھی چچا جان اپنی انجمن کے کسی فرد کو کھانے پر مدعو کرتے تو منظر قابل دید ہوتا تھا۔ ملاقات ہونے پر پہلے تو وہ ایسے انداز میں مصافحہ کرتے کہ دیکھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا۔ تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ہاتھوں کو نہایت پُراسرار انداز میں آہستہ آہستہ دباتے رہنے کے بعد وہ علیحدہ ہو جاتے۔ پھر چچا جان کو یکایک کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتی اور وہ اپنے دوست کو "چند ضروری امور" پر گفتگو کرنے کے لئے ایک محفوظ کونے میں لے جاتے۔ کھانا کھانے کے دوران میں بھی وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب بے حد متوجہ رہتے اور ان کا طرزِ عمل زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا "سمجھ گئے نا، ہاں!"

ہمارے قصبہ میں ایک مولینار ہتے تھے جن سے چچا کو طبعی نفرت تھی جب کبھی وہ ان غریب کو دیکھتے اُن کے غصہ کی انتہا نہ رہتی ایک روز میں اور وہ تفریحاً باغ میں جانکلے مولوی صاحب اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ چچا جان نے ان کی طرف نہایت غیض آلود نظروں سے دیکھا اور میرے بازو کو زور سے جھٹکا دے کر فرمایا "اِس شخص کو جانتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے کسی نہ کسی دن دھوکا ضرور دے گا"

آج میں چچا جان کی اس پیغمبرانہ پیشگوئی پر حیرت میں پڑا ہوا ہوں۔

رمضان شریف کا مہینہ تھا، اور چچا جان نے بزعمِ خود محض اس مہینہ کے تقدس کو برباد کرنے کے لئے دوپہر کی دعوت دی تھی۔ میں نے مقدور بھر عُذر کیا۔

رمضان شریف میں کھانا کھانے کو تو میں تیار ہوں۔ مگر اس مظاہرہ میں کوئی ذہانت نہیں پاتا اگر لوگ رمضان میں روزے رکھتے ہیں تو اس میں آپ کا نقصان؟

مگر چچا جان اس قسم کی گفتگو پر اپنی توجہ ضائع نہیں کیا کرتے۔ ان کے تین دوست بھی مدعو تھے اور چونکہ مجھے یقین تھا کہ کھانے کا بل چچا جان ہی ادا کریں گے اس لئے میں اس مظاہرۂ آزاد خیالی کے واسطے بھی تیار تھا۔

گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں سب سے زیادہ عام جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئے اور چچاجان نے نہایت بلند آواز سے حکم دیا کہ کھانا بارہ بجے حاضر کیا جائے۔

دعوت وقت پر شروع ہوئی یعنی بارہ بجے۔ اور جب ہوٹل کے گھنٹہ نے تین بجائے تو ابھی تک ہم لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ بل آنے پر معلوم ہوا کہ محض لیمونیڈ کی بوتلیں دو درجن سے کچھ زیادہ پی گئی تھیں۔

چار بجے کے قریب ہم ہوٹل سے اس کیفیت میں نکلے کہ ہر شخص کا پیٹ اپنی معمولی وسعت سے کم و بیش دو انچ زیادہ جگہ گھیر رہا تھا۔ چچاجان کی حالت خصوصاً بہت خراب تھی۔ ایسی صورت میں ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ٹیکسی کرایہ پر لینا ایک ایسا سماجی فرض تھا جس کی انجام دہی کا ہم میں سے ہر شخص بے حد مشتاق تھا۔

جب میں اپنے مکان کے قریب پہنچا تو شام رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میرا دماغ قدرے مخمور تھا لیکن خیالات میں ایک غیر فطری شگفتگی تھی۔ بجلی کی طرح ایک بات میرے ذہن میں آئی۔

میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑے صاف کئے اور چہرہ پر آثارِ حزن و ملال طاری کر کے مولوی صاحب کے مکان پر جا کر بڑے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹائی۔ مولینا صاحب قدرے اونچا سنتے تھے اس لئے میری پیہم پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد محلہ میں آخری جاگنے والے شخص غالباً وہ خود تھے۔

میں پوری طاقت کے ساتھ چیخا" مولینا جلدی کیجئے ؛ ایک مایوس مریض آپ کی روحانی مدد کا محتاج ہے"۔

مولینا نے جلدی جلدی تہ بند اتار کر پاجامہ زیب تن کیا اور اپنی روئی کی ٹوپی اور سیاہ لبادے سے آراستہ ہو کر باہر تشریف لائے۔ میں نے نہایت فکرمند لہجے میں انہیں بتایا کہ چچاجان یکایک سخت علیل ہو گئے ہیں اور چند ہی گھنٹے میں مرض نے اس قدر تشویش خیز صورت اختیار کر لی ہے کہ انہیں خود اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ اس وقت آپ سے ملنے کے بہت آرزومند ہیں۔ ان کا مقصد ہے کہ اپنے گذشتہ گناہوں کی معافی مانگیں اور اگر بچ جائیں تو آیندہ خدا کے نیک بندوں کی سی زندگی گذاریں"۔

مولوی صاحب پہلے تو قدرے چونکے۔ مگر پھر جلد ہی ان کے چہرہ پر مسرت و طمانیت کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے "ایک منٹ توقف کیجئے، میں ابھی چلتا ہوں" انہوں نے اشتیاق سے کانپ کر کہا۔

میں نے لہجے میں لجاجت پیدا کر کے کہا" مولانا معاف فرمائیے گا۔ میں آپ کے ہمراہ نہیں چل سکوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے عقاید اس کی اجازت نہیں دیتے اس لئے مہربانی فرما کر اُن کے سامنے میرا تذکرہ

نہ کیجے گا۔ کہئے کہ آپ کو اس کی اطلاع کشف کے ذریعہ ہوئی ہے"۔

مولوی صاحب راضی ہو گئے اور لپکے ہوئے چچا جان کے مکان پر پہنچے۔

میں قریب ہی ایک مکان کے برآمدہ کے پیچھے چھپ کر واقعات کا انتظار کرنے لگا۔ اگر چچا جان معمولی حالت میں ہوتے تو غریب مولوی کے قتل ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا مگر مجھے یقین تھا کہ آج کی دعوت کے بعد وہ اس قدر لت پت ہو کر لیٹے ہونگے کہ انگلی بھی نہ ہلا سکیں گے اس لئے نتیجہ کا اندازہ لگانا قدرے دشوار معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ انجام "حزنیہ" ہوگا۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی مولوی صاحب ابھی اندر تھے۔ میں نے سوچا کہ بحث ہو رہی ہوگی۔ بار بار مجھے اس نادر اختراع پر ہنسی آ رہی تھی۔

ایک گھنٹہ گذرا، دو گھنٹے، تین گھنٹے ابھی دروازہ بند تھا اور مولوی صاحب اندر۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مولینا اور چچا جان کے مابین واقعات کیا صورت اختیار کر رہے ہیں۔ ایک امکان تھا کہ مولینا اپنے غصہ کی شدت سے خود ہی وفات پا گئے ہوں دوسرا یہ کہ مولینا کو ناکردہ کوئی آزار پہنچا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں بزرگ "اکل باہمی" کے مرتکب ہوئے ہوں۔ مگر آج کی دعوت کے بعد کم از کم چچا جان اس کے قطعاً ناقابل تھے۔

دو بج گئے آسمان پر سپیدی ہلکی پڑنے لگی۔ صبح کاذب کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ نیند کے مارے میرا برا حال ہوا جا رہا تھا۔ چچا جان کے مکان میں جا کر صورت حالات کا اندازہ لگانا بے وقت اور نامناسب تھا۔ اس لئے میں قریب ہی ایک دوست کے گھر چلا گیا وہ اس بے وقت کی تشریف آوری سے قدرے سراسیمہ ہوئے مگر جب میں نے واقعات بتائے تو بہت ہنسے۔ مکان کی کھڑکی میں بیٹھ کر میں مولینا کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ تین بجے کے قریب میں نے اپنے دوست کو جگا کر اپنی جگہ بٹھایا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کی نیت کر کے لیٹ رہا۔ صبح سات بجے میری آنکھ کھلی تو میرے دوست بیچارے ابھی تک انتہائی انہماک کے ساتھ چچا جان کے دروازے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھے اور مولوی صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

آخر آٹھ بجے کے قریب دروازہ کھلا اور مولینا نہایت اطمینان و مسرت کے انداز میں برآمد ہوئے ان کی چال میں اعتماد تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں شرمندہ ہو کر چچا جان کے مکان پہنچا۔ وہ ابھی تک بستر میں ہی تھے۔ چہرہ پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھوں میں تھکن اور بے خوابی کے آثار تھے ایک چھوٹی سی حمائل ان کے تکیے کے پاس رکھی تھی "کیوں چچا جان خیریت؟ ابھی تک بستر میں لیٹے رہنا کیا معنی؟" انہوں نے نہایت نحیف آواز میں جواب دیا "عزیزی خیریت کہاں؟ آج تو گویا ہم قبر کے منہ سے واپس ہوئے ہیں"۔

"یعنی؟ ـــــ" میں قدرے متحیر ہوا۔ چچا جان کے منہ پر سرخی کا نام نہ تھا۔ چچا جان نے میرے سوال کی طرف بالکل توجہ نہ کر کے کہا "مگر سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہوا کہ وہ مولوی صاحب جو ابھی تشریف لے گئے ہیں۔ ــــــ تم ان مولینا کو جانتے ہو نا جن کا ہم اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے؟ ـــــ انہیں میری علالت کے متعلق کشف ہوا اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے"

میری ہنسی کے مارے بری کیفیت تھی۔ مگر بڑی دشواری سے سنجیدہ صورت بنا کر کہا "واقعی؟ ہاں وہ تشریف لائے تھے انہوں نے ایک آواز بہ کہتی ہوئی سنی اے خدا کے بندے اٹھ اور فلاں شخص کی مدد کر" میں نے چھینکنے کا بہانہ کیا۔ پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑے جا رہے تھے۔ تقریباً ایک منٹ کے بعد میں نے نہایت برافروختگی کے لہجہ میں کہا۔

"اور آپ نے۔ آپ جیسے آزاد خیال، فاخر علی الدہریت شخص نے انہیں گھر سے نہ نکلوا دیا۔ چچا جان سراسیمہ سے تھے "میاں سنو تو سہی۔ تمام واقعات اس قدر حیرت انگیز ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مولوی صاحب نے مجھ سے والد صاحب کا تذکرہ بھی تو کیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ ان کے دوست تھے ـــــ"

"مگر آپ کے والد کا تذکرہ کرنا تو ایک مولوی کو مکان پر رکھنے کا کوئی معقول عذر نہیں"

"ہاں ہاں! مگر میں سخت بیمار تھا اور وہ تمام شب نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ میری تیمار داری کرتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج اسی شخص نے میری جان بچائی ہے۔

میں نے طنزاً کہا "او ہو تو کیا مولینا ابھی تشریف لے گئے ہیں؟"

"ہاں تمام شب کی کوفت کے بعد میں نے انہیں بمشکل ناشتہ کرنے پر راضی کر لیا تھا ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے پندرہ منٹ قبل"

"اور انہوں نے رمضان میں ناشتہ کیا؟"

چچا جان قدرے گھبرائے۔ گویا میں نے کوئی بہت بے تکی بات کہی ہو۔

"مذاق کرتے ہو اس غریب نے میرے ساتھ اس قدر محبت اور شفقت کا سلوک کیا ہے کہ اپنے عزیزوں سے بھی توقع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں اس کے عقائد و اعمال کی عزت کرنے اور کرانے پر مصر ہوں"

مجھے یقین ہو گیا کہ صورت حال قابو سے باہر ہو چکی ہے "اچھا چچا جان، خدا حافظ معلوم ہو گیا کہ آپ آزاد خیالی ترک کر رہے ہیں۔ انہوں نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا "مگر مذہب بھی تو آزاد خیالی ہے"۔

دوسرے روز مجھے اپنے مذاق کا نتیجہ معلوم ہو گیا۔ چچا جان لامذہبیت چھوڑ کر پکے مسلمان بن چکے تھے اور اگر یہیں معاملہ رفع دفع ہو جاتا تو ہرج نہ تھا مگر ہوا یہ کہ دوسرے روز ہی انہوں نے اپنی وصیت لکھ لی اور مجھے اس مردود مولوی کے حق میں عاق کر دیا!

(ملخص از موپساں)

معین الحق جعفی

میں تو وہیں تھا

اک شخص چلا گھر سے نکل کر سوئے صحرا
مولا کی طلب میں زن و فرزند کو چھوڑا
سمجھا، زن و فرزند ہی ہیں مانعِ دیدار
ہے منزلِ مقصود میں حائل، یہی دیوار
صحرا میں، سمندر میں، اُسے ڈھونڈ رہا تھا
ہر بحر میں، ہر بر میں اُسے ڈھونڈ رہا تھا
کھویا گیا، خود آپ، مگر اُس کو نہ پایا
سب کھو کے بھی بیچارے کو کچھ ہاتھ نہ آیا
مایوسی سے دل ٹوٹ گیا، پاؤں کے مانند
ڈھلتی رہی عمر اس کی یونہی چھاؤں کے مانند
بیچارے پہ جب وقت گھٹا موت کی چھائی
اُس وقت کسی کی یہ صدا کانوں میں آئی
اے طالبِ حق! حق تو ترے گھر میں مکیں تھا
جس جا سے تو نکلا تھا، ارے میں تو وہیں تھا

ترجمہ ——— سید احمد حسین امجد

یتیم

(پہلی صدی قبلِ مسیح کی یہ ایک چینی نظم ہے۔ شاعر کا نام معلوم نہیں)

یتیم ہونا،
قسمت میں یتیمی لکھی ہونی،
کیسی تلخ زندگی ہے!
جب میرے والدین زندہ تھے
میں گاڑی پر سوار ہوا کرتا تھا
جس میں چار نفیس گھوڑے لگے ہوتے تھے۔
مگر جب والدین کا انتقال ہوگیا
میرے بھائی اور بھابی نے
مجھے تجارت کرنے کے لئے باہر بھیج دیا
میں نے جنوب میں نو دریاؤں تک سفر کیا
اور مشرق میں چی اور لُو تک گیا
سال ختم ہونے پر جب میں گھر واپس آیا
تو مجھے اُن کو یہ بتانے کی ہمت نہ ہوئی کہ میں نے کیا کیا مصیبتیں جھیلی تھیں۔
سر میں جوئیں۔ منہ پر اور آنکھوں میں گرد و غبار۔
میرے بھائی نے مجھے کھانا تیار کرنے کے لئے حکم دیا
اور بھابی نے گھوڑوں کی نگہداشت میرے سپرد کی۔
میں اوپر کے کمرے میں جاتا تھا
اور پھر دوڑ کر نیچے کے دالان میں واپس آتا تھا،
میری آنکھوں سے مسلسل آنسوؤں کے قطرے گر رہے تھے،
صبح کے وقت انہوں نے مجھے پانی لانے کے لئے بھیجا،
میں شام سے قبل واپس نہ آسکا
میرے ہاتھ ٹھٹھرے جا رہے تھے،
میرے پاس جوتا نہیں تھا،
میں سرد و یخ زمین پر چل رہا تھا

کانٹوں اور جھاڑیوں کو روندتا ہُوا،
جب میں کہ نٹوں کو اپنے تلووں سے نکالنے کے لئے رک جاتا،
آہ! اس وقت میں کیسی بے کسی محسُوس کرتا!
میرے آنسو بہے جاتے تھے
اور میں سسکیاں لیتا ہُوا جارہا تھا۔
موسم سرما میں میرے پاس کوٹ نہیں ہوتا
اور گرمی میں باریک کپڑے!
زندہ رہنے میں کوئی لطف بھی نہیں ہے
کاش میں اس زمین کو جلد چھوڑ دیتا
اور زرد چشموں[1] کے نیچے چلا جاتا
اپریل کی ہوائیں بہ رہی ہیں
سبزہ اگ رہا ہے،
تیسرے مہینہ میں ریشم کے کیڑے اور شہتوت،
چھٹے مہینہ میں خربوزے کا موسم
میں خربوزوں کی گاڑی کے ساتھ گیا
اور جب میں گھر واپس آرہا تھا،
گاڑی الٹ گئی۔
جن لوگوں نے میری مدد کی اُن کی تعداد کم تھی
مگر جو میرے خربوزے کھا گئے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی
انہوں نے صرف چھلکے چھوڑ دیئے،
کہ انہیں لے کر میں جلد سے جلد مکان پہنچ جاؤں۔
میرے بھائی اور بھابی میرے ساتھ سختی سے پیش آئے،
انہوں نے مجھ سے پریشان کن سوالات کئے۔
دیہات میں ہر شخص مجھ سے کیوں نفرت کرتا ہے؟
میں ایک خط لکھنا چاہتا ہوں اور اس کو بھیج دینا چاہتا ہوں
زمین کے نیچے اپنے والدین کے پاس،
اور اُن کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اب
اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ ایک لحظہ بھی رہنا نہیں چاہتا۔

آرزو جمیلی

[1] yellow springs چینیوں کا خیال ہے کہ زرد چشموں کے نیچے پردۂ ظلمات ہے۔ زرد چشموں کے نیچے چلے جانے سے مراد مر جانے سے ہے۔

جب میں چھ برس کا تھا

اور تم چار برس کی تھیں

(ایک انگریزی نظم)

تم اور میں مرغزاروں میں بہار کے شگفتہ پھولوں کے درمیان کھیلا کرتے تھے،
اُن دنوں جب میں چھ برس کا تھا، اور تم چار برس کی تھیں۔
ہم ہار گوندھتے تھے اور ایک دوسرے پر پھولوں کے گوے پھینکتے تھے۔
آہ یہ سادہ مسرتیں اتنی ہی گریز پا نکلیں جتنے بچپن کے دن۔
درختوں کے گھنے جھنڈوں اور مرغزاروں میں،
ہری ہری دوب اور جنگلی پھولوں کے فرش پر،
ننھے ننھے ہمجولیوں کے ساتھ، ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہم اِدھر اُدھر گھومتے تھے۔
مگر یہ ساٹھ سال کی بات ہے

رفتہ رفتہ تم ایک گل رُو دوشیزہ بن گئیں،
ہماری پہلی محبت اب بھی اسی طرح تر و تازہ تھی۔
ہمارے آسمان پر تاریکی کا کوئی دھبّا نہ تھا،
زندگی کے دن مسرت کے نور سے جگمگاتے تھے
اور میں جان و دل سے تمہارا شیدا تھا۔
آہ یہ محبت کتنی گہری کتنی پاکیزہ تھی، الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔
اُن دنوں میں خیال کرتا تھا کہ تمہیں بھی مجھ سے ایسی ہی محبت ہو گی
مگر یہ پچاس سال کی بات ہے

پھر تمہارے گرد والہانِ محبت کے گروہ حلقہ زن رہنے لگے،
اور تمہارا روز افزوں حسن سیکڑوں دلوں کی سنہری امیدوں کا مرکز بن گیا۔
اس وقت میں نے تمہیں پہلی محبت کے عہد و پیمان سے روگرداں ہوتے ہوئے دیکھا،
تم دولت و ثروت اور منصب و اعزاز کی طرف جھک گئیں
اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا دل پاش پاش ہو رہا ہے
مگر یہ چالیس سال کی بات ہے

میں زندہ رہا اور ایک دوسری لڑکی سے میری شادی ہو گئی،
اُس نے مجھے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی، مجھے شکایت کا کوئی موقع نہ دیا،
اور جب میں نے سنا تم بچوں والی ہو گئی ہو،
میرے دل میں یہ خواہش نہ تھی کہ یہ بچے میرے ہوتے۔
میرے اپنے بچے میری عیدوں کی رونق بڑھانے کے لئے کافی تھے،
اور میں ان کی موجودگی میں بے قیاس مسرت محسوس کرتا تھا
مگر یہ تیس سال کی بات ہے

تم بھی بوڑھی بن گئیں، پختہ سال، دلاویز، فربہ!
دولت و ثروت اور شکوہ و شان کی جگمگاتی دنیا میں۔
میری دنیا مقابلتہً بہت سیدھی سادھی تھی،
مگر مسرت کے دن میری قسمت میں بھی تھے۔
موسم سرما میں کسی آتش دان کے قریب،
کبھی اس سے زیادہ مسرور آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی نہیں دیں، جتنی اس دن جب میرے سب سے چھوٹے بچے کا نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی
مگر یہ بیس سال کی بات ہے

وقت گزرتا گیا میری سب سے بڑی لڑکی کی شادی ہو گئی،
میں ایک سفید ریش دادا بن گیا،
ایک چار سال کی بچی کو ساتھ لے کر میں خودرو پھولوں والے مرغزاروں میں پھرنے لگا
انہیں مرغزاروں میں جو ہمارے بچپن کی مسرتوں کا گہوارہ تھے
اور جہاں اب بھی جنگلی پھول اسی طرح کھلتے تھے۔
وہ اپنی ٹوکری ان پھولوں سے خوب بھر لیتی تھی۔
اور یہ ابھی دس سال کی بات ہے

اگرچہ پہلی محبت کے جنوں پرور ولولے
ہوش و خرد کی پُرسکون فضا میں گم ہو چکے ہیں،
لیکن میں ابھی اکثر محبت سے تمہیں یاد کرتا ہوں
اور اُس وقت تک کرتا رہوں گا جب یہ زندگی مجھے خدا حافظ کہہ دے گی۔
یہ پیہم گزرنے والی ساعتیں
آخر ایک ایسا وقت لائیں گی جب ہم نہ ہوں گے۔
اور جب ہمارے بچپن میں پھول چننے کی داستان صد سالہ سال کی پرانی بات ہو چکی ہو گی

حامد علی خاں

محفلِ ادب

پنچانہ ظرافت

بعضوں کا خیال ہے کہ پنچانہ ظرافت اکثر ذوقِ سلیم پر بار ہوتی ہے۔ پنچ میں لکھنے والے اکثر حدِ اعتدال سے گذر جاتے ہیں اُن کا مقصد، طنز اور ظرافت کے بجائے تھکا فضیحت ہوتا ہے اور اس طور پر پنچ کے ذریعہ سے سوقیانہ ظرافت اور بازاری پھکڑ کو بے جا فروغ حاصل ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے یہ فردِ جرم اودھ پنچ یا کسی اور پنچ پر کامیابی کے ساتھ لگائی جا سکے لیکن یہ کہنا کلیتہً صحیح نہیں ہے کہ پنچ اس قسم کے پھکڑ یا فحاشی کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ پنچ کا وسیلہ، پھکڑ یا فحاشی ہو سکتا ہے۔ مقصد ہرگز نہیں ہوتا، پنچ کا مقصد عالمانہ اور فلسفیانہ ظرافت کی نشر و اشاعت نہیں ہوتا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ تبسم نہیں صرف قہقہہ کا قائل ہوتا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ تبسم سے زیادہ قہقہہ کا قائل ہوتا ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ قہقہہ پھکڑ یا فحاشی کا محتاج ہوتا ہے یا کوئی سنجیدہ ظرافت بھی اس کی محرک یا معین ہو سکتی ہے تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فی الحقیقت تبسم ہونے یا قہقہہ لگانے کا انحصار نفسِ ظرافت پر اتنا نہیں ہے جتنا خود متبسم ہونے یا قہقہہ لگانے والے کی افتادِ طبع پر۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق نفسِ ظرافت سے ہو بنا برآں خود ظرافت کو معقول اور مہذب ہونا چاہئیے یہ اور بات ہے کہ اس پر کوئی قہقہہ لگائے یا متبسم ہو۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "معقول" اور "مہذب" کا معیار کیا ہے اور آیا پنچ اس کا پابند ہے یا نہیں۔ سرسری طور پر اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ معقول اور مہذب کا معیار وہی ہے جو معقول اور مہذب لوگوں کا شعار ہو لیکن سوال کا دوسرا حصہ یعنی آیا پنچ کو اس کا پابند ہونا چاہئیے یا نہیں، کسی قدر پیچیدہ ہے۔ بظاہر یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ پنچ کو یقیناً اس کا پابند ہونا چاہئیے۔

یہاں اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنچ کا مفہوم خود "عام پسندی" سے وابستہ ہے۔ لیکن خرابی یہ کہ یہی "عام پسندی" اکثر گر کر "عوام پسندی" کے حدود تک پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے جس تحریک کا مقصد "عام پسندی" ہوگا وہ "عوام پسندی" پر ختم ہوگی پنچ بالعموم اپنا مخاطب عوام کو سمجھتا ہے۔ ممکن ہے پنچ کو اس سے انکار ہو لیکن خود عوام اس سے کبھی انکار نہ کریں گے۔ یہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنچ بعض پیچیدہ نکتے

دقیق مسائل اور پُر لطف اشارات کو اکثر ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ عوام اُس کو سمجھ سکیں یا نہیں لیکن اس پر سر دُھننے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں تاہم یہ فن یا طریقۂ کار اپنے مقاصد کے اعتبار سے کتنا ہی مستحسن کیوں نہ ہو، حد درجہ نازک اور خطرناک ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کوشش میں قطعاً ناکامی ہوتی ہے اور پنچ کی ظرافت سرتاسر عامیانہ اور بازاری ہو جاتی ہے۔

"عام پسند" یا "خاص پسند" کا مسئلہ نازک اور مشکل ہے۔ سیاسی اور معاشری مسائل کی اہمیت ممکن ہو "عام پسندی" سے وابستہ ہو۔ لیکن جہاں تک اس کا تعلق، طنز و ظرافت کے فن یا مذاقِ سلیم سے ہے یہ کہنے میں تامل نہیں کیا جا سکتا کہ طنز اور ظرافت کو ہر حال میں ٹکسالی ہونا چاہئے۔ عوام کے مذاق کو بھی "خواص" کی سطح پر لانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس کوشش کا سب سے پہلا اور سب سے قوی اثر یہ ہوگا کہ ظرافت کی سطح، مائل بہ پستی ہونے کی بجائے ہمیشہ مائل بہ عروج رہے گی۔ یہ چیز نہایت ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کی کامیابی میں پنچ کی خدمات سے ہمیشہ رجوع کرنا پڑے گا۔

"ہندوستانی"

جاحظ کے دو لطیفے

(۱)

جاحظ کہتا ہے مجھ کو عمر میں کسی سے شرمندگی نہیں اٹھانی پڑی، ہاں دو عورتوں نے بے شک مجھے بہت خجل کیا۔ جن میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروازے پر ٹہل رہا تھا کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ مجھے ایک بڑی سخت ضرورت درپیش ہے، ذرا تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلے چلیئے۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا، ایک یہودی سُنار کی دکان پر جا کر کھڑی ہو گئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہا "ایسا ہی" اور یہ کہہ کے چلتی بنی۔ میں نے سنار سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے اس نے کہا کہ اس عورت نے ایک انگوٹھی مجھ سے بنوائی اور فرمائش کی کہ میں اس پر شیطان کی صورت نقش کر دوں میں نے کہا میں کیا جانوں شیطان کیسا ہوتا ہے؟ یہ سُن کے وہ چلی گئی اور اب یہاں آ کر جو کچھ اُس نے کہا وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے؟

(۲)

ایک آدمی میرے پاس آیا اور فرمائش کی کہ اپنے دوستوں کو ایک سفارشی خط لکھ دیجئے مجھے ضرورت ہے، میں نے ایک خط لکھا اور اس پر مُہر لگا کے اس کے حوالہ کیا،

رقعہ لے کر جب وہ باہر پہنچا، تو اُس نے رقعہ کا لفافہ پھاڑا، اور خط پڑھ لیا، اس میں میں نے لکھا تھا۔ یہ خط لکھ کے میں اس شخص کو دے رہا ہوں جسے میں ذرا بھی نہیں پہچانتا۔ اگر آپ اس کی حاجت پوری کر

دیں تو میں آپ کی تعریف نہیں کروں گا، اور اگر اسے ناکام واپس کر دیجئے، تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوگی"۔

وہ آدمی فوراً میرے پاس واپس آیا، میں نے کہا شاید تم نے میرا خط پڑھ لیا، اس نے کہا جی ہاں۔ میں نے کہا میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تمہیں گزند نہیں پہنچ سکتا، میں نے اپنی یہ علامت مقرر کر لی ہے کہ جب میں کسی کی سفارش کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ لکھتا ہوں۔

اس نے کہا خدا تجھ پر لعنت کرے، تیرے ہاتھ پاؤں بیکار کر دے،

میں نے کہا یہ کیا،

اس نے جواب دیا۔ یہ میری علامت ہے، جب میں کسی شخص کا شکریہ ادا کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہوں۔

"جامعہ"

ابواسحاق کے اکالانہ تصرفات

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی — کہ بورانی رست بادنجان و بادنجان بورانی

اس کا پہلا مصرعہ تو یقیناً خاقانی کا ہے، لیکن دوسرا نہیں۔ خاقانی کا اصل شعر یہ ہے:۔

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی — کہ سلطانی ست درویشی و درویشی ست سلطانی

لیکن اس شعر کا دوسرا مصرعہ بدل کر ابواسحٰق نے وہ رکھ دیا جو اوپر لکھے ہوئے شعر میں پایا جاتا ہے۔

ابواسحٰق ایک شاعر تھا جو کھانے کا بڑا شائق تھا اور اس کی شاعری کی خصوصیت یہی تھی کہ سوائے کھانے کی چیزوں کے اور کوئی ذکر ہی نہ کرتا تھا، اس نے سعدی، حافظ وغیرہ کے بہت سے اشعار میں اس طرح کا تصرف کرکے اپنے ذوق کا اظہار کیا ہے۔

چنانچہ حافظ کے بعض اشعار مع تصرفات ابواسحٰق کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اشعار حافظ	تصرفات ابواسحٰق
آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند — آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند	کیپا پزاں سحر کہ سر کلہ وا کنند — آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند
ترک عاشق کش ما مست برون رفت امروز — تا دگر خون دل از دیدہ رواں خواہد بود	مطبخی باز پیاز از جہت قیمہ خرید — تا دگر آب ز چشم کہ رواں خواہد بود
گوشہ گیری و سلامت ہوسم بود ولے — فتنہ می کند آں نرگس فتاں کہ مپرس	روزہ داری و قناعت ہوسم ہست ولے — چشمکے می زند آں برہ بریاں کہ مپرس
کس بہ امید وفا ترک دل و دیں مکناد — کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس	کس بہ بالائے مزعفر مکناد آش ترش — کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس

سعدی کا مشہور شعر ہے:۔ تواضع ز گردن فرازاں نکوست — گدا گر تواضع کند خوئے اوست

ابواسحٰق نے اس میں یہ تصرف کیا:۔ شکم پر ز حلوا و بریاں نکوست — عدس گر شکم پر کند خوئے اوست

الغرض اس نے اپنی ساری عمر اسی طرح کی شاعری میں بسر کی اور اسی نے خاقانی کے اس شعر کو جس کا آپ نے ذکر کیا ہے

بادنجان بورانی کے مانند ہی اپنا کر لیا اور اس قدر مشہور ہو گیا کہ آج قاآنی کا اصل شعر شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ قاآنی کا شعر جو شروع کے بدلے میں لکھا تھا یہ ہے۔ پس از سی سال الہام شد تحقیق این معنی کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

لیکن عام طور پر لوگ اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح ابتدا میں لکھا گیا ہے

نگار

ترکی کا جدید رسم الخط

ترکی میں پہلے چغتائی رسم الخط کا چلن تھا۔ اسلام کے پہنچنے پر عربی رسم الخط اختیار کیا گیا تھا مگر یکم دسمبر ۱۹۲۸ء سے رومن رسم الخط لازمی قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل و ترتیب ذیل میں درج ہے

حروف تہجی جدید ترکیہ[1]

A a	B b	C c	Ç ç	D d	E e
ا	بہ	جہ	چہ	دہ	ئہ
F f	G g	Ğ ğ	H h	I ı	İ i
فہ	غہ، گہ	غہ	ھہ	ئی	عی
J j	K k	L l	M m	N n	O o
ژ	نہ، کہ	لہ	مہ	نہ	او
Ö ö	P p	R r	S s	Ş ş	T t
ئو	پہ	رہ	سہ	شہ	تہ
U u	Ü ü	V v	Y y	Z z	
اُو	اُو	وہ	یہ	زہ	

عام طور پر مشہور تو یہ ہے کہ ترکی میں رومن رسم الخط جاری ہوا ہے۔ اب عربی رسم الخط وہاں نہیں رہا لیکن مذکورۂ بالا حروف پر محض ادنیٰ تامل کرنے پر مفصلۂ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) تعدادِ حروفِ تہجی میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ ترکی زبان میں پہلے غالباً کل ۳۳ حروف تھے جن میں سے ۲۸ عربی ۴ فارسی اور صرف ایک ترکی زبان کا تھا مگر اب صرف ۲۹ حروف ہیں تمام ہم آواز حروف میں سے صرف ایک رکھا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں اب یہ جھگڑا نہیں رہا کہ فلاں لفظ میں ت ہے یا ط۔ علاوہ بریں یہ بھی واضح رہے کہ موجودہ رومن حروف میں خ اور ق داخل نہیں ہیں کیونکہ خ کا تلفظ دراصل ہ کی طرح ہوتا ہے اور ق کے بدلے صرف ک ہی بولا جاتا ہے القصہ جو حرف جس طرح بولا جاتا ہے اسی طرح لکھا جاتا ہے۔

(۲) حروف تہجی کی قدیم ترتیب اب باقی نہیں رہی بلکہ رومن حروف کی ترتیب کو مناسب تبدیلی کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔

(۳) حروف تہجی کے تلفظ میں فرق آگیا ہے۔ فتحہ (زبر) چونکہ اخف الحرکات ہے اس لئے فتحہ مخلوط بالہا سے کام لیا گیا بہر کیف الف۔ بے۔ جیم وغیرہ کے ڈھنگ پر تلفظ کرنے کا جو قدیم دستور تھا اس کو خیرباد کہا گیا ہے۔

(۴) زبر۔ زیر۔ پیش جزم تنوین اور تشدید کی علامتیں اب علیحدہ چیزیں نہیں رہیں بلکہ جدید ۲۹ حروف ہی سے ان کا کام بھی چل گیا۔ پس ۳۳ حروف تہجی قدیم اور مذکورۂ بالا علامتوں کی جگہ پر صرف ۲۹ حروفِ جدید ہی کافی و شافی ہوئے ہیں۔

(۵) عربی حروف کے نقاط، اعراب اور مختلف صورتیں خصوصاً اختصار کی حالتوں کی، جو خوشخط کاتب کے حق میں سدِ راہ تھیں اب کالعدم ہو گئیں۔

[1] ماخوذ از رسالہ [illegible] پارس ۱۳۰۸ [illegible] طہران

[2] ترکی کی [illegible]

کان کی دوا لب اینڈ سنز پیلی بھیت دہلی

نمبر مقدمہ [illegible] ۱۹۲۳ء

بعدالت جناب مولوی سلطان احمد صاحب بہادر

آنریری اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اول مقام ہردوئی ضلع ہردوئی

راجہ بہادر راجہ رودھ کم انند سنگھ رئیس و تعلقدار ساکن دھرم پور کوٹھاری — مدعی

بنام

شیو کرن لال ولد جگن ناتھ پرشاد برہمن مدعا علیہ ۲	مدعا علیہم
رمان شنکر ولد شیو شنکر لال برہمن مدعا علیہ ۹	
بہاری لال ولد بسنت رام قوم برہمن مدعا علیہ ۱۰	
مسماۃ بودم کنور بیوہ شیو رتن لال برہمن مدعا علیہ ۱۶	
تیولال عرف رام ادہن ولد ماکھو برہمن مدعا علیہ ۱۷	
لچھمن پرشاد ولد دوارکا پرشاد برہمن مدعا علیہ ۲۰	

سکنان

منصور پور پرگنہ سانڈی تحصیل بلگرام ضلع ہردوئی

ہرگاہ کہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت منافع ضمنی ۱۵ ایکٹ لگان اودھ کے دائر کی ہے لہٰذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۵ ماہ ستمبر ۱۹۲۳ء بوقت ۱۰ بجے دن کے بمقام ہردوئی اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ کی کرو اور تم کو لازم ہے کہ اسی روز جملہ دستاویزات پیش کرو جن پر تم بتائید اپنی جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہو

تم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا

آج بتاریخ [illegible] ماہ اگست ۱۹۲۳ء میرے دستخط اور مہر عدالت کے جاری کیا گیا

[illegible] [illegible]

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم چوسٹھ صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۳؍ (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۶؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

چھاپنے والے:۔ درگا آرٹ پریس انار کلی لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۶۴۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ قضیہ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۳۲ء

جلد نمبر ۲۲ — نمبر ۴

تصاویر:- (۱) ڈیسیٹلے اور بیٹرس (۲) شیخ عبدالقادر جیلانی کا مقبرہ (۳) مسجدِ شاہِ جیلاں کا اندرونی منظر

جہاں نما

کامیاب زندگی

برنارڈ شا کی تقریر

برنارڈ شا کی یہ بصیرت افروز تقریر حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم ناظرین ہمایوں کے فائدے کے لئے اس کا ملخص درج کرتے ہیں:۔

"کوئی شخص اپنی ذات کے متعلق دوسروں کو صحیح واقفیت بہم نہیں پہنچاتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو اپنے متعلق صحیح باتیں بتاؤں گا تو یہ آپ کی غلطی ہے، کیونکہ میں کوشش کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

آپ لوگ "مجھے بڑا آدمی" سمجھتے ہیں اس لئے والہانہ شوق کے ساتھ میری باتیں سنتے ہیں تاکہ آپ خود یا آپ کے بچے "بڑے آدمی" بن سکیں۔ لیکن میں ظاہر میں ویسا ہی ڈاڑھی والا بڈھا ہوں جیسے اور ہوتے ہیں۔ پھر مجھ میں بڑائی کیا ہے؟ سنیئے یہ بڑائی آپ کے مقابلے میں میری کوئی اخلاقی برتری نہیں، بلکہ محض یہ ہے کہ میں ڈرامے لکھ سکتا ہوں اور آپ نہیں لکھ سکتے۔ اگر مجھ میں یہ بات نہ ہوتی تو میں ایک ہرزہ گرد بے سروپا گدا ہوتا۔ لیکن میری موجودہ حالت اتنی اچھی ہے کہ ہر شخص مجھے اُس سے بہت بڑا آدمی سمجھتا ہے جتنا فی الحقیقت میں ہوں۔ اُدھر اخبار لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ اخبار میرے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں، خبردار! اُس سے دھوکا نہ کھائیے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ بڑے آدمیوں کی ہستی کے متعلق لوگوں کا وہم وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت کبھی جن بھوت اور اس قسم کی دوسری فوق العادت مخلوق کی ہستی کے وہم کی تھی۔ بڑے آدمی اپنے ۹۹ فیصدی اوصاف میں بالکل ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے آپ خود ہیں بلکہ یہ کہنا آپ کی توہین کے مترادف ہے کیونکہ "نام نہاد بڑے آدمی" عموماً اپنے ان ننانوے فیصدی انسانی اوصاف میں مقابلۃً بدتر ہوتے ہیں۔ باقی رہا ایک فیصدی امتیازی وصف، سو اُس کا وجود بھی بسا اوقات اُن کے لئے آفت ہو جاتا ہے مثلاً اگر آپ کوئی خوبصورت عورت ہیں یا آپ کا گلا اچھا ہے اور آپ خوب گا سکتے ہیں تو آپ میں بعض ایسی خودغرضانہ صفات پیدا ہو جائیں گی جو کسی بدصورت عورت یا بُرا گانے والے میں کبھی قابلِ معافی نہ سمجھی جاتیں۔ اسی طرح اگر آپ میں زراندوزی کی قابلیتیں موجود ہیں تو آپ "دائرۂ قانون" کے اندر رہ کر ہر بڑے سے بڑا ظلم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کے اوصاف کا یہ ایک فیصدی امتیازی عنصر غریبوں کو امیر یا امیروں کو غریب بنانے پر صرف ہونے لگے یا آپ لوگوں کو توہمات سے نکال کر سچے مذہب کا راستہ دکھانے لگیں یا آپ سرمایہ دار طبقے سے غریبوں کے لئے حق طلبی

کرنے لگیں تو پھر آپ بہت ہی خوش قسمت ہوں گے اگر آپ جامِ شہادت نوش فرمانے سے بچ جائیں۔

پس اگر آپ اپنے بچوں کی سلامتی چاہتے ہیں تو چوکس رہیئے اور انہیں سیدھے سادے عام راستے سے الگ نہ ہونے دیجئے۔ اگر وہ ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹے تو بس جانیئے کہ اب ان کی خیر نہیں۔ سلامتی کی راہ یہی ہے کہ اپنے نظامِ تمدن و معاشرت کی قدامت کا پورا احترام کیا جائے۔ یہاں بھیڑ چال میں سلامتی ہے ورنہ آپ جانتے ہیں کہ کوئی نئی بات کہنے والوں کا حشر کیا ہوتا ہے۔ علم اور مذہب کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

احمق لوگ کہتے ہیں بچے ایک بہت بڑی ذمہ داری ہیں۔ ذمہ داری کا مال تو وہی جانیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ کمانے کے قابل ہونے سے پہلے تک بہت بڑے خرچ کا باعث ہوتے ہیں۔ بچے ہمیں کیا فائدہ پہنچاتے ہیں بعض اوقات یہ اپنی بے راہ روی سے الٹے ہمارے لئے ایک عذاب بن جاتے ہیں۔ بچوں کی ضرورت تو حکومت کو ہوتی ہے اسی لئے وہ مردم شماری کراتی رہتی ہو کہ مبادا نسلِ انسانی منقطع ہونے لگے اور وہ حاکم بے محکوم رہ جائے حکومت اپنی ذمہ داری اس لئے صحیح طور پر محسوس نہیں کرتی کہ باپ اور مائیں خود بخود اس کی سرپرستی کے بغیر اس کی مردہ رعایا کے جانشین پیدا کرتی رہتی ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ حکومت کو متنبہ کر دیں کہ اگر وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار نہ سنبھالے گی تو ہم بچے پیدا کرنے بند کر دیں گے۔ پھر دیکھئے اسے کس طرح قدرِ عافیت معلوم ہوتی ہے۔

اور پھر موجودہ طریقہ تعلیم و تربیت ہے بھی بالکل ناقص کسی قسم کی جبری تعلیم و تربیت بھی اصلی مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ بچپن میں میرے ماں باپ نے کبھی میرے معاملات میں زیادہ دخل نہ دیا تھا۔ میرے والدین کی ذہنیت عام ناطبوع ذہنیت کے والدین کی طرح نہ تھی جو بچوں کے اخلاق کی اصلاح کی دھن میں اپنے اخلاق کی خبر لینے کی کبھی فرصت ہی نہیں پاتے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری ماں نے مجھے کوئی اخلاقی یا مذہبی ہدایت دی ہو۔ اپنے والد کی صرف مجھے ایک بات یاد ہے کہ جب انہوں نے اپنے تمبیع میں کھیلنے کا ایک پائپ مجھے اپنے منہ میں لئے ہوئے دیکھا تو انہوں نے کہا "تم میری تقلید نہ کیا کرو میں ایک ناقص آدمی ہوں۔ تم اچھے بنو" سچ یہ ہے کہ گو انہوں نے اپنے اوصاف کو بہت گھٹا دیا لیکن اس سے مجھے فائدہ پہنچا چنانچہ میں نے تمام عمر نہ کبھی سگرٹ پیا ہے نہ شراب پی ہے اور نہ داڑھی منڈائی ہے۔ عموماً والدین کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ بچوں کے سامنے اپنے اوصاف بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ پھر جب بچے بڑے ہو کر ان کی اصل حقیقت سے واقف ہوتے ہیں تو انہیں اُن سے نفرت ہو جاتی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہو کہ آپ اپنے بچوں کے سامنے اپنے حسبِ فطرت بالکل غیر منافقانہ زندگی بسر کیجئے تاکہ انہیں بر سرِ بازار ڈھنڈورا پیٹنے کا کافی موقع میسر آئے۔

بچوں کے سامنے ہم اپنے یا دوسروں کے عمل کا نمونہ کسی طرح پیش نہیں کر سکتے۔ جس سوسائٹی میں وہ پیدا ہوتے ہیں اس میں ہر شخص خود غرض ہے۔ مزدوروں کی کوشش ہے کہ حتی الامکان کام کم کریں اور اجرت زیادہ سے زیادہ لیں۔ اس کے برعکس کارخانہ دار زیادہ سے زیادہ کام اور کم سے کم اجرت دینا چاہتے ہیں اور سرمایہ دار طبقہ ان دونوں کی محنتوں کے بل پر بغیر کسی

کام کے نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا خوگر ہے۔ اشتہاری تجارت اور ریاست وغیرہ کا حال بھی یہی ہے کہ اُن میں بے شرمانہ دروغ گوئیوں اور خیرہ چشمانہ عیاریوں کے بغیر کام نہیں چلتا گویا اپنے بچے کو آپ جس کام میں لگنے کے لئے کہیں گے ساتھ ہی ان تمام خود غرضیوں اور فریب کاریوں پر بھی آمادہ کریں گے۔ ہمیں اپنے بچوں کو ایماندار بنانے سے پہلے دنیا کو ایماندار بنانا چاہیئے بہتر یہ ہے کہ ہم بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور یہ اعتماد رکھیں کہ دنیا کے حالات دیکھ کر وہ اپنے متعلق ہم سے مقابلۃً کسی قدر بہتر اور صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔

موجودہ تعلیم ناکارہ ہے۔ بچوں کو چند باتیں طوطوں کی طرح رٹ کر ڈگریاں لے لینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ نصاب کی پابندی فضول ہے۔ جس بات سے بچوں کو دلچسپی نہ ہو اُس کا سیکھنا ضروری نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے جسموں کی صحت کے لئے پہلے ذہنی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمارے کھیلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ہم ہمیشہ دوسرے کو زک دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اس سے ہماری ذہنیت پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کا ہر تعلیم یافتہ شخص دوسروں کے لئے ایک چلتا پھرتا فتنہ، ایک آشوب خراماں ہے۔ جس سے ہر وقت دوسروں کو شکست اور ناکامی کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ ایک دوسرے سے بڑھنے کی خواہش سے بہتر یہ ہے کہ ہم تمام سوسائٹی کو بلند کرنے کی کوشش کریں، لیکن موجودہ کالجوں کے تعلیم یافتہ گروہ سے اس بلند مطمحِ نظر کو کامیاب بنانے کی توقع نہیں ہو سکتی۔

کسی بلند مقصد کے حاصل کرنے کا راز یہی ہے کہ اُس کے حصول کا صحیح جذبہ پیدا کیا جائے اور یہ جذبہ جنون کی حد تک ترقی کر جائے۔ اسی طرح دولت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن دولت کا جنون ایک عذاب ہے۔ غریب لوگ بھی خودکشی کرتے ہیں لیکن جنوبی افریقہ کے اُس بدقسمت کروڑپتی کی "مصیبت" کا اندازہ کیجئے جس نے صرف اس لئے خودکشی کر لی کہ اُس کے لاکھوں پاؤنڈ میں سے چند لاکھ پاؤنڈ کم ہو گئے۔ میں کہتا ہوں غریب آدمی اُس کے مقابلہ میں زیادہ خوش قسمت ہیں۔ میں نے خود کبھی دولت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر میں اس طرف توجہ کروں تو اپنے کاروبار کو بہت وسعت دے سکتا ہوں، لیکن میرے اطمینان کے لئے بہت ہی مختصر سازوسامان کافی ہے۔ البتہ مساوات کے لئے یہ میں ضرور چاہتا ہوں کہ سوسائٹی میں ہر شخص کے پاس اتنا ہی سامان ضرور ہو۔ بس اس سے زیادہ کسی قسم کی ہوس نہ ہونی چاہیئے اور نہ ہوس کی زندگی انسان کے لئے اچھے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

ڈینٹے اور بیٹرس

اٹلی کا شہرۂ آفاق شاعر اور عالم ڈینٹے ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا۔ ۹ ہی سال کی عمر میں وہ اپنے مولد و منشا فلارنس کے ایک معزز گھرانے کی ایک کمسن لڑکی بیٹرس کی گہری اور غیر فانی محبت میں مبتلا ہو گیا اور بالآخر "ڈیوائن کامیڈی" لکھ کر اُس نے بیٹرس کے نام کو زندۂ جاوید کر دیا۔

جب ڈینٹے نو برس کا تھا اور بیٹرس آٹھ برس کی تھی بیٹرس کے باپ کے قصر میں موسم بہار کا ایک جشن برپا ہوا جس میں ڈینٹے نے بھی شرکت کی۔ بیٹرس سے دوچار ہوتے ہی ڈینٹے کے نوخیز دل پر ایسا گہرا اثر ہوا جسے وہ مرتے دم تک پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا۔ اُسی وقت اُس کا چہرہ زرد ہو گیا اور اِس خوبصورت لڑکی کے جذبۂ پرستش سے وارفتہ و بے خود ہو کر وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لینے کے بجائے ایک طرف الگ کھڑا ہو گیا اس کے بعد اُسے کبھی بیٹرس کے تصور سے فراغت نہ ہوئی۔ مگر پھر نو سال تک اُس کو بیٹرس سے ملنے کا موقع نہ مل سکا، اور آخر جب اُس کی بیٹرس سے ملاقات ہوئی تو وہ ایک نوجوان عورت بن چکی تھی! اب اس کے حسن نے ڈینٹے کو کامل طور پر مسحور کر لیا۔ بیٹرس کا نوازش آمیز سلام ہی ڈینٹے کو ایک معجزے سے کم معلوم نہ ہوا۔ وہ ہیجانِ جذبات سے کانپتا ہوا گھر واپس آیا جہاں اُس نے اپنا وہ پہلا سانیٹ لکھا جس میں اُس نے بیٹرس کی جاودانی محبت کا نغمہ گایا۔

اُس زمانے میں یہ دستور تھا کہ نوجوان شاعر اپنی وہ نظمیں جو وہ اپنی محبوب عورتوں کے متعلق لکھتے ایک دوسرے کی طرف بھیجا کرتے تھے۔ ڈینٹے نے اپنا یہ سانیٹ اُس زمانے کے ایک مشہور شاعر کی طرف بھیجا جس نے اُس کی بے انتہا تعریف کی اور ڈینٹے کی دوستی کا دم بھرنے لگا۔ ڈینٹے کی شاعری کا موضوع صرف محبت تھی اور بیٹرس کے سوا اس کی نظموں میں کبھی کسی دوسری عورت کی محبت کا ذکر نہ آیا۔ ڈینٹے کے دل میں بیٹرس کے احترام کی یہ حالت تھی کہ وہ اس کے روبرو آنے سے ڈرتا اور جھجکتا تھا چنانچہ اس نے یہ عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا کہ وہ دوسری عورتوں کے پاس جا کر اُن کے سامنے بیٹرس کی خوبیاں بیان کر کے اپنی رُوح کو تسکین دیا کرتا لیکن اس طریقہ سے آخر ایک المناک نتیجہ ظہور میں آیا۔ بیٹرس دوسری عورتوں سے اس کی ملاقاتوں کا ذکر سُن کر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی اور جب اس کے بعد وہ ڈینٹے سے ملی تو اُس نے اس کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا مضحکہ اُڑایا۔ ڈینٹے کو اس بات سے اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا اور درد و رنج اُٹھا کر اُسے گھر پہنچایا۔ بیٹرس نے اس کے بعد جلد ہی ایک امیر سوداگر سے شادی کر لی اور ڈینٹے نے تقدیر کے فیصلے پر صبر اختیار کر کے اپنا غم غلط کرنے کیلئے میدانِ جنگ کا رُخ کیا مگر ابھی اس کے دل میں یہ بھیانک توہمات پیدا ہونے لگے کہ بیٹرس مر جائیگی۔ عجیب بات ہے کہ ڈینٹے جنگ کے بعد فلارنس پہنچا ہی تھا کہ واقعی یہ المناک واقعہ پیش آگیا اور جون ۱۲۹۰ء میں بیٹرس کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۴ سال کی تھی ـــــ بیٹرس کے کھو جانے کے غم کو بھلانے کے لئے ۲ سال بعد ڈینٹے کے دوستوں نے اُسے شادی پر مجبور کر دیا چنانچہ شادی ہوئی اور بچے بھی ہوئے لیکن بیوی کی بدمزاجی کی وجہ سے ان دونوں کے تعلقات کبھی زیادہ اچھے نہ ہوئے۔ ڈینٹے کے ۵ بیٹے تھے اور ایک بیٹی جس کا نام غالباً اس نے اپنی محبوبہ کی یاد میں بیٹرس رکھا تھا۔ اُس کے دو بیٹوں نے جنہیں اُس کی قابلیت کا ایک حصہ ورثہ میں ملا تھا اپنی یہ قابلیت اپنے باپ کی مشہور نظم "ڈیوائن کامیڈی" کو مصور کرنے میں صرف کی شادی کے باوجود بیٹرس کی پُراسرار محبت عمر بھر ڈینٹے کی زندگی کا جزوِ لاینفک رہی۔ وہ اس دنیاوی زندگی کو محض ایک گزرگاہ سمجھتا تھا، اور اپنے آپ کو ایک گنہگار روح جسے بیٹرس کا نقش اثر نیکی کا راستہ دکھا کر منزلِ کمال کی طرف لے جا رہا تھا۔ "ڈیوائن کامیڈی" کا بنیادی یہی خیال ہے۔ ۱۴ ستمبر ۱۳۲۱ء میں ڈینٹے کا انتقال ہوا۔ **حامد علی خاں**

قصّہ نویسی و قصّہ خوانی

(۲)

علمبرداران حقیقت حامیانِ صنّاعی کو یہ کہہ کر مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ (یعنی صنّاعین) زندگی کو ایک خاموش نگار خانہ اور قصہ کو ساکن و جامد تصویر سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی سخت غلطی ہے۔ ہر فنّی پیداوار بذاتِ خود ایک مکمل شے ہوتی ہے۔ اس لئے وہ زندگی کی نمائندگی نہیں کرسکتی کیونکہ زندگی کی امتیازی خصوصیتیں اختلاف۔ تنوع۔ ہجوم اور ہنگامہ ہیں۔ چونکہ افسانہ زندگی یا جزوِ زندگی کی محاکات ہے اس لئے اس میں وحدت و تسلسل کے بجائے انتشار و گوناگونی پائی جانی چاہیئے۔ صناعین اصولِ انتخاب پر عمل کرتے ہیں حالانکہ صحیح طریقہ اصولِ اشتمال کی پابندی ہے۔ صرف امتیازی و نمایاں واقعات انتخاب کر لینے سے قصہ کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ افسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ قصہ میں تمام ضروری و غیر ضروری یا اہم و غیر اہم واقعات کو شامل کرے۔ "حقیقیئن" کو اس پر بڑا ناز ہے کہ وہ معاملاتِ حیات کو ان کی تمام باریکیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا کارنامہ فطرت و صداقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن صناعین جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ محض فرضی و مصنوعی ہوتا ہے۔ اگر غیر اہم تفصیلات اور غیر ضروری جزئیات کی بھرمار قصہ کو بیزار کن بنادے اور جمالیات و صناعی کا خون ہوجائے تو بھی انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ بزعمِ خود حقیقت و صداقت کے علمبردار ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو "حقیقیئن" کو بھی اصولِ انتخاب اور تصنع سے مفر نہیں کیونکہ وہ زندگی کے کسی جزو کی کامل محاکات کے مدعی ہیں۔ کیا زندگی کے کسی ایک جزو کو دوسرے اجزا سے ممیز و مخصوص کرنے میں انہیں اصولِ انتخاب پر عمل پیرا ہونا نہیں پڑتا؟ کیا بغیر کوئی واضح و قطعی ابتدا اور انتہا مقرر کئے ہوئے کسی جزوِ زندگی کی تعیین ممکن ہے؟ کیا "حقیقیئن" بھی اپنا قصہ کسی خاص جگہ سے شروع اور کسی خاص مقام پر ختم نہیں کرتے حالانکہ حقیقی زندگی ایک بہتا دریا ہے جس کے حصّوں کا نہ کہیں آغاز ہے نہ انجام اور نہ ایک حصّے کو دوسرے حصے سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا "حقیقیین" کے اصولِ عمل اور کارنامے ویسے ہی بن مانے اور مصنوعی نہیں ہوتے جیسے "صناعین" کے؟ بات تو یہ ہے کہ کھلی فضا میں آزادانہ کام کرنے والے "حقیقیین" اور نگار خانہ میں بند ہو کر اصول و ضابطے کے پابند "صناعین" دونوں کے طریقۂ کار میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔

آج کل افسانہ نویسی کا شمار بھی فنونِ لطیفہ میں ہونے لگا ہے۔ افسانہ نگار کو نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ ان تمام فنی امور کی تکمیل کرنی پڑتی ہے جن کی سرانجام دہی شاعر، مصوّر، سنگ تراش اور دوسرے صناعوں کا فریضہ ہے۔ عمیق مشاہدہ۔ تلاشِ مواد۔ انتخابِ واقعات۔ ترتیب و ترکیب۔ تناسب و توازن۔ بلندیٔ مقصد۔ جوشِ بیان اور حسنِ اسلوب وغیرہ کی اوگھٹ گھاٹیوں کو طے کئے بغیر کسی بلند پایہ افسانے یا قصّے کی تکوین ناممکن ہے جن لوگوں کا خیال ہے کہ افسانہ کی کوئی خاص صورت و شکل نہیں ہوتی اور نہ افسانہ نویسی کے لئے اصول و قوانین مقرر ہیں وہ اس کی نوعیت و ماہیت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب و ترکیب سے پلاٹ وجود پذیر ہوتا ہے۔ پلاٹ میں حرکت و روانی اور جوش و ارتعاش ضرور پایا جانا چاہئیے خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی۔ نمایاں ہو یا مخفی ورنہ قصہ کی حیثیت محض ایک جسدِ بے روح یا پیکرِ بے جان کی سی ہوگی۔ یہ حرکت بالعموم دو مختلف و متضاد عناصر مثلاً نیکی و بدی۔ ہمدردی و بے مروّتی۔ ظلم و رحم۔ سنجیدگی و ظرافت وغیرہ کی کشمکش دکھا کر پیدا کی جاتی ہے۔ علاوہ بریں منظر۔ مقام۔ ماحول اور کام کی تبدیلیاں بھی اہتزاز و ارتعاش کی محرّک ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمارے مشاہدہ کے وقت ہی حرکت واقع ہو۔ ممکن ہے کہ حرکت پہلے پیش آچکی ہو اور ہم اس کے خاموش و ساکن نتیجہ کا تماشا دیکھ رہے ہوں۔ فرض کرو کہ ہم ایک زبردست فوج کو کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے دیکھ رہے ہیں۔ سپاہیوں کی موجودہ ساکن و خاموش وضع بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے لیکن اس کی لطف انگیزی و اثر آفرینی میں بے حد اضافہ ہو جائے گا۔ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے وہ متحرک نظارہ بھی پیش ہو جائے جبکہ فوج کا شاندار جلوس دشت و جبل سے گذرتا اور سڑکوں پر کوچ کرتا ہوا آرہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص لمحہ میں ہم جس شئے کا مشاہدہ کر رہے ہوں وہ خاموش نتیجہ نہیں بلکہ سبب ہو اور اس کے دامن میں لامتناہی واقعات کا ایک محشر پوشیدہ ہو۔ مثلاً جہانگیر کے دربار میں سرطامس رو کی باریابی کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اُس وقت کون جانتا تھا کہ فرنگی سفیر کی یہی رسائی آئندہ ہزاروں انقلاب انگیز واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ بہرکیف قصہ کے پلاٹ میں ظاہری یا مخفی حرکت ضرور پائی جانی چاہئیے۔

پلاٹ کی طرح کردار نگاری بھی ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے کیونکہ اشخاصِ قصہ کے بغیر پلاٹ ایک بے معنی سی چیز ہے۔ ماہرینِ فن کے نزدیک پلاٹ نام ہی ہے اُن واقعات کا جو اشخاصِ قصہ کو پیش آئیں فنی نقطۂ نظر سے پلاٹ کے مقابلہ میں کردار نگاری کہیں زیادہ اہم اور مشکل کام ہے۔ صرف نقادوں ہی کے خیال میں نہیں بلکہ ایک عامی شخص کے نزدیک بھی قصہ نویس کی کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے تخلیقی کردار زندہ انسان کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر چلتے پھرتے اور کام کرتے دکھائی دیں۔ کردار یا رجالِ داستان خواہ تاریخی ہوں یا تخیلی۔ حقیقی ہوں یا فرضی۔ خواہ وہ معمولی انسان کی طرح روزمرہ کام کرتے ہوں یا فوق البشری

مہمات سرانجام دیتے ہوں لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ہمارے سامنے سے پرچھائیوں کی طرح نہ گذریں بلکہ گوشت پوست کے بنے ہوئے زندہ انسان معلوم ہوں اور ان کی شخصیتیں انفرادی ہوں تاکہ کتاب پڑھ لینے کے بہت عرصہ بعد جب ہم اس کی تمام تفصیلات بھول جائیں اُس وقت بھی زندہ دوستوں یا دشمنوں کی طرح اُن کی یاد ہمارے ذہن میں باقی رہے۔ بعض جادو نگار و باکمال مصنفوں کے تخیّلی اشخاصِ قصہ نے تاریخی اکابر رجال سے کہیں زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ان سے مشورہ لیتے ہیں اور انہیں اپنا یارِ غار سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بُرے رجالِ داستان سے ہمیں دشمنوں کی سی نفرت و بیزاری بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کے کردار پیدا کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں بلکہ اس کے لئے خداداد ذہانت و قابلیت درکار ہے۔

جس شخص کو ہم روز دیکھتے ہیں۔ اس سے ملتے جُلتے اور گفتگو کرتے ہیں اس کی سیرت کا بھی مطالعہ سخت دشوار ہے۔ تجربی نفسیات کے ماہرین ذہن کی جانچ کے لئے پیمانے دریافت کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن انسانی سیرت کی جانچ یا پیمائش کا کوئی سہل طریقہ آج تک معلوم نہ ہوسکا۔ ہم ایک دوسرے کے بطن و ماہیت سے بہت کم آگاہ ہیں اور خود اپنے نفس کو پہچاننا تو محال ہی ہے۔ بڑے بڑے فیلسوف اور عارف معرفتِ نفس حاصل کرنے میں سرگرداں رہے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ فی الحقیقت انسان کا وجود ایک معمّا ہے جو کسی سے نہ حل ہوا ہے نہ ہوگا۔ پس "حقیقیئین" کا دعویٰ کہ وہ انسانی فطرت و سیرت کے رمز آشنا و کشّاف ہیں لایعنی سی بات ہے۔ "حقیقیئین" ہوں یا "صناعیین" دونوں صرف انسانی سیرت کی چند ظاہری نمایاں خصوصیتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے بھی خداداد ملکہ کی ضرورت ہے۔ انگلستان کے زبردست افسانہ نویس ٹھیکرے کا قول ہے کہ کردار نگاری کے لئے جس تخلیقی قوت کی ضرورت ہے وہ ایک پُراسرار چیز ہے جسے دوسرے لوگ تو درکنار خود مصنف بھی سمجھ نہیں سکتا۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیبی ہاتھ قلم پر غالب ہوگیا ہے اور جس طرف چاہتا ہے اسے حرکت دیتا ہے"۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری کی طرح افسانہ نویسی بھی اکتسابی نہیں بلکہ وہبی چیز ہے اور اس کے لئے خداداد قابلیت کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ہڈسن اس خداداد قابلیت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کردار نگاری کے لئے افسانہ نویس میں باریک تصور، حقیقت شناس تخیل اور عبارت آرائی کا زبردست ملکہ پایا جانا چاہیئے۔ جس مصنف کو ان سہ گانہ قوتوں کا وافر بہرہ قدرت کی جانب سے نہ ملا ہو وہ کبھی کامیاب کردار نگار نہیں بن سکتا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں کوئی دو انسان صورت و سیرت کے لحاظ سے بالکل یکساں نہیں بلکہ اُن میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اشخاصِ قصہ میں بھی انفرادی خصوصیتیں پائی جانی چاہئیں تاکہ

وہ ایک دوسرے سے ممیز ہوسکیں۔ ایک باکمال صناع (آرٹسٹ) اپنی ذہنی مخلوقات کی صورت وسیرت۔ عادت و خصلت۔ مذاق وپسند طبعی رجحان۔ طرزِ گفتگو اور چال ڈھال میں بعض امتیازی خصوصیتیں پیدا کردیتا ہے جن کی بنا پر ہم انہیں زندہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے شناخت کر لیتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں ہم اُن کی سیرت سے اس قدر مانوس ہوجاتے ہیں کہ بعض مذبذب موقعوں پر ہم پہلے ہی سے ان کے قول وفعل کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کردار نگاری کے دو طریقے ہیں راست اور بالواسطہ۔ پہلے طریقہ کے مطابق مصنف خود ہی اشخاصِ قصہ کے خیالات، جذبات۔ عادات وخصائل اور عزائم ومقاصد کی تحلیل وتشریح کرتا جاتا ہے لیکن دوسرے طریقہ کے تحت وہ اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں دیتا بلکہ رجالِ داستان کے افعال واعمال۔ حرکات وسکنات اور بات چیت سے ان کی سیرت ظاہر ہوتی جاتی ہے۔ دورانِ مکالمہ میں وہ خود ہی ایک دوسرے کے قول وفعل پر بھی تنقید کرتے جاتے ہیں۔ یہی طریقہ زیادہ مستحسن ہے۔ ڈراما نویس ہمیشہ اسی طریقہ پر عمل کرتا ہے لیکن افسانہ نگار کو حسبِ موقع دونوں طریقے اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہے۔

ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ انسان کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کی صورت اور سیرت میں تغیر ہوتا جاتا ہے۔ بمرورِ زمانہ ہر شخص کی عادت وخصلت رفتہ رفتہ بدلتی جاتی ہے۔ لہٰذا اشخاصِ قصہ کے اصل کے مطابق معلوم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کردار نگاری میں حرکت وارتقا کے شواہد پائے جائیں۔ جو کردار حرکت وارتقا سے عاری ہو اُس کی حیثیت گڑیا یا پتلے سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ سرشار نے "فسانۂ آزاد" کے لئے تقریباً ڈھائی ہزار صفحے سیاہ کر دئے ہیں لیکن اس ضخیم افسانہ میں نہ پلاٹ کی کوئی خوبی نظر آتی ہے نہ کردار نگاری کی۔ اس افسانہ کا ہیرو آزاد ابتدا سے انتہا تک ایک ہی قسم کا لاابالی وبے پروا عیاش امیر ہے۔ اس کی سیرت میں ذرا بھی تبدیلی یا ارتقا کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہیرو کیا ہے لکڑی کی کھونٹی یا الگنی ہے جس پر بے پروا مصنف مختلف بے ربط اور ناممکن واقعات لٹکاتا چلا گیا ہے۔

واقعات کی اس بے ترتیبی وبے ربطی کے مدِنظر "فسانۂ آزاد" کے متعلق سرشار کا ایک معاصر نقاد کہتا ہے: "افسانہ کا ہے کو ہے دیوانی ہانڈی یا صدقہ کا ست نجا ہے"۔ اسی طرح شرر کے افسانہ "ایام عرب" میں بھی عمرو اور ... کا کرداری ارتقا مفقود ہے۔ ہم انہیں شروع شروع بازارِ عکاظ میں جیسا دیکھتے ہیں ویسا ہی اختتام کتاب پر بھی ... ہیں۔ بعض جوشیلے نوآموز ناول نویس کردار میں حرکت وتبدیلی دکھاتے ہیں لیکن وہ مقتضائے وقت اور موقع و محل کے مطابق نہیں ہوتی۔ ان کی ساری توجہ ہیجان خیز واقعات کی جانب مبذول رہتی ہے۔ ان واقعات کو پیدا کرنے میں جہاں جس شخص کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں وہ اُسے زبردستی کھینچ لاتے ہیں۔ اُن کے اشخاصِ قصہ کے تمام حرکات وسکنات مصنوعی وغیر متوقع معلوم ہوتے ہیں۔ وہ گویا کٹھ پتلیاں ہیں جو تار کے اشارے پر

اور حرکت کرتی ہیں۔

جب کوئی بلند پایہ و باکمال افسانہ نویس اپنی ذہنی مخلوق کو منظرِ عام پر لاتا ہے تو اس سے چند اچھی یا بُری خصوصیتیں منسوب کر دیتا ہے جو اسے دوسرے اشخاص سے متمائز کرتی ہیں۔ یہی نمایاں خصوصیتیں اس کی شناخت کی علامتیں ہوتی ہیں۔ قصہ نویس کو پوری آزادی حاصل ہے کہ ہم سے تعارف کرانے کے وقت وہ اپنے ہیرو کو جن اوصاف سے چاہے متصف کرے لیکن ایک بار اس کی سیرت سے ہمیں مانوس کرا دینے کے بعد ناول نگار کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ اب ہیرو سے جو کچھ افعال و حرکات سرزد ہوں گے وہ لامحالہ اس کی سیرت کے اقتضا کے مطابق ہوں گے۔ اگر اُس کا کوئی قول و فعل غیر متوقع یا خلافِ عادت ہوگا تو سامعین کو اعتراض و احتجاج کرنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔ سیرت میں ارتقا و تغیر ضرور ہوتا ہے لیکن وہ ایسا بتدریج اور خاموشی کے ساتھ رونما ہوتا ہے کہ ہر شخص سے محسوس نہیں کر سکتا۔ کرداری ارتقا کی مثال گھڑی کی گھنٹے والی سوئی کی حرکت یا پودے کی بالیدگی سے دی جا سکتی ہے۔ یوں دیکھنے میں گھڑی کی چھوٹی سوئی اور پودے کی بیل دونوں ساکن معلوم ہوتی ہیں لیکن کون نہیں جانتا کہ سوئی ضرور چل رہی ہے اور بیل ضرور بڑھ رہی ہے۔ اسی طرح کرداری حرکت و ارتقا کا کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا خواہ وہ محسوس ہو یا نہ ہو۔ ناول نگار کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ وہ کردار کی تدریجی ارتقا و تبدیلی کا اظہار کرے بلکہ اسے یہ بھی لازم ہے کہ اس تبدیلیٔ سیرت کے اسباب و عوامل کی بھی اچھی طرح تشریح کرے وہ ابتدا ئہ ہیرو کو چند نمایاں اور امتیازی خصوصیات کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن بمرورِ زمانہ دوستوں کی صحبت اجنبیوں سے تبادلۂ خیالات۔ گرد و پیش کے حالات۔ ذاتی مشاہدات و تجربات۔ مطالعۂ کتب اور دوسرے متعدد موثرات کی وجہ سے اس کے عادات و خصائل اور خیالات و جذبات میں رفتہ رفتہ جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ان سب کا استقصا افسانہ نویس کے فریضہ میں داخل ہے۔ یہ باتیں صرف ہیرو سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام رجالِ داستاں کی سیرت نگاری اسی اصول کے تحت ہونی چاہیئے۔ جس شخصِ قصہ کا کرداری ارتقا رک جائے اسے ناول سے خارج کر دینا مناسب ہے۔

قصہ میں پلاٹ اور کردار کے علاوہ ماحول کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی شے کی تصویر میں اس وقت تک اصلیت و صداقت کی جھلک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اُس میں عقبی زمین (بیک گراؤنڈ) اور گرد و پیش کی چیزیں بھی نمایاں نہ کی جائیں۔ فرض کرو کہ مصوّر ایک ہندوستانی حلوائی کی دکان کی تصویر پیش کرنا چاہتا ہے۔ جس شخص کو فنِ مصوری میں پوری مہارت حاصل نہ ہو اس کی پیش کردہ تصویر میں صرف مٹھائیوں سے بھری ہوئی چند تھالیوں کے پیچھے ایک موٹا حلوائی بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ لیکن ایک باکمال و چابک دست مصوّر اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام ضمنی اور ضروری باتوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس کی تصویر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ایک کھپریل کے چھپر والی دکان میں متعدد تھالیاں اور خوانچوں میں طرح طرح کی مٹھائیاں سجی ہوئی ہیں۔ ہر طرف

بھڑیں اور مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔جن کے بھگانے کے لئے ایک برتن میں اُپلیاں سُلگائی گئی ہیں۔ ایک طرف بہت سے پتّل اور دونے رکھے ہوئے ہیں۔چند گاہک دکان کے سامنے کھڑے ہیں۔ بڑی توند والا حلوائی صرف ایک میلی کچیلی دھوتی باندھے مٹھائیاں تول رہا ہے۔ دکان کے ایک کونے میں کڑاہ چڑھا ہوا ہے۔ حلوائی کی بیوی چولھے میں اُپلیاں ڈال رہی ہے۔ دوسری طرف دو تین آدمی بیٹھے ساگ پوری کھا رہے ہیں۔ دکان کے نیچے ایک دو کتے دُم ہلا ہلا کر کھانے والوں کا منہ تک رہے ہیں۔حلوائی کا لڑکا گوالن سے دودھ خرید رہا ہے۔غرض کہ ان تمام چیزوں کی موجودگی کثیف حلوائی کی دُکان کی جیتی جاگتی تصویر پیش نظر کر دیتی ہے۔اسی طرح ماحول کی تشریح اور ضمنی باتوں کی تفصیل سے قصہ چمک اُٹھتا ہے اور اس کی رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑنے لگتا ہے۔ تقویمی ماحول کی دو قسمیں ہیں ایک معاشری دوسرا طبعی۔

اشخاصِ قصہ کا تعلق جس زمانہ یا جس مقام سے ہو اس کی تمام خصوصیات کو نمایاں کرنا افسانہ نگار کا فریضہ ہے۔ آج کل ممالکِ متمدنہ میں زندگی کے معاملات اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ وہاں سہولت کی غرض سے اصولِ تخصیص پر عمل کیا جاتا ہے۔چنانچہ حربی زندگی۔بحری زندگی۔تجارتی زندگی۔ ملازمتی زندگی۔شہری زندگی دیہاتی زندگی۔ اعلیٰ طبقہ کی زندگی۔ ادنیٰ طبقہ کی زندگی وغیرہ کے متعلق علیحدہ علیحدہ افسانے لکھے جاتے ہیں۔ اشخاصِ قصہ جس سوسائٹی یا سماج سے تعلق رکھتے ہیں اس کے رسم و رواج۔طرز بود و ماند۔خیالات و اوہام اور معاشری کیفیتوں کا ہو بہو نقشہ کھینچنے سے قصہ کی دلچسپی المضاعف ہو جاتی ہے۔جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے "فسانۂ آزاد" میں نہ پلاٹ کی کوئی خوبی پائی جاتی ہے اور نہ کردار نویسی کی۔ بلکہ قصہ کی ساری دلچسپی کا باعث صرف یہ ہے کہ اس میں سرشار نے اپنے زمانے کی لکھنوی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے اور اس میں مبالغہ کا شوخ رنگ بھر کر اسے اصل سے بھی زیادہ پُرلطف بنا دیا ہے۔ اگر افسانہ نویس کی قوتِ مشاہدہ۔قوتِ تخیل اور قوتِ بیانیہ نہایت زبردست ہو تو وہ غائب کو حاضر۔ بعید کو قریب اور ماضی کو حال میں منتقل کر سکتا ہے۔چنانچہ شرر نے اپنے وسیع مطالعہ۔زبردست تخیل اور قابلِ تحسین عبارت آرائی کی مدد سے "ایامِ عرب" میں قدیم عربوں کے خیالات و مزعومات۔ اوہام و عقاید اور رسم و رواج کی ایسی واضح و روشن تصویر پیش کی ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال پیشتر کا عربی تمدن پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

طبعی ماحول میں مقامی اور فضائی دونوں کیفیتیں شامل ہیں۔جس ملک یا جس شہر میں کوئی مشہور واقعہ پیش آتا ہے یا جہاں ابطالِ قصہ کا گذر ہوتا ہے وہاں کے دریا۔ پہاڑ۔ میدان۔ وادی۔ کھیت۔ سڑک۔ گلی کوچوں یا مکان کی زینت و آرائش کی تفصیل بیان کرنے میں اسکاٹ اور ٹامسن کی طرح شرر کو بھی یدِ طولیٰ حاصل ہے۔موسمی اور فضائی کیفیتوں کا بیان بالعموم دو طرح سے کیا جاتا ہے۔بعض وقت قدرت کی تمام چیزیں ہیرو کی ہمدرد و غمگسار دکھائی

جاتی ہیں مثلاً قتل یا اور کوئی المیہ واقعہ پیش آنے پر طوفان کا آنا۔ شفقِ خونیں، کا نمودار ہونا۔ ابر باراں کا گریہ وزاری کرنا وغیرہ۔ کبھی نیچر کو انسان کے رنج وخوشی سے بالکل بے حس و بے تعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مصوّرِ غم فرماتے ہیں کہ "سورج نکلا اور ڈوبا۔ تارے چمکے اور ماند پڑے۔ پھول کھلے اور کملائے۔ غرض کہ کارخانۂ عالم حسبِ معمول چلتا رہا۔ دنیا کی ہر شے اپنا رنگ بدلتی رہی لیکن کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو نجم النسا کی مصیبت میں۔"

کسی اختراعِ فنی کی قدر دانی کے لئے نقاد میں بھی ویسی ہی ژرف نگاہی پائی جانی چاہیئے جیسی اس کی تخلیق کے لئے خود صناع کے لئے ضروری ہے۔ بعض سخن فہموں کی تیز نظری کسی شعر میں ایسے ایسے نازک و باریک پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے جو خود صاحبِ سخن کے دماغ میں بھی رونما نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح فنِ نقاشی و مصوری کے نکتہ شناس بعض وقت تصویر کی "عقبی زمین" یا چوکھٹے میں ایسی اہم باتیں دریافت کر لیتے ہیں جو مصور کے مقصود بالذات سے بھی زیادہ اثر آفریں اور قیمتی ہوتی ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار کسی چابکدست مصور نے جامع مسجد دہلی کی شاندار تصویر مولانا محمد علی کی خدمت میں پیش کی تھی۔ لائق مصور اپنے فن کے نکتوں سے واقف تھا اس لئے تصویر میں اصلیت کی جھلک پیدا کرنے کے لئے اس نے نہ صرف "عقبی زمین" کو درختوں اور نیلگوں آسمان سے زینت دی تھی بلکہ "پیش منظر" میں بھی یہ دکھایا تھا کہ مسجد کی سیڑھیوں پر چند بے فکر لوگ بیٹھے ہیں اور ایک اندھی بڑھیا چیتھڑے لگائے اپنی بچی کی انگلی پکڑے بھیک مانگ رہی ہے۔ تصویر کا عنوان "جامع مسجد دہلی" تھا۔ مولانا نے تصویر دیکھ کر فرمایا کہ اگر اس کا عنوان بدل کر یہ لکھ دو کہ "اس کے باپ دادا نے یہ مسجد تعمیر کی تھی" تو جو قیمت مانگو بخوشی ادا کر دوں گا۔ محض عنوان کی تبدیلی نے تصویر کو کتنا عبرت انگیز و پُر تاثیر بنا دیا۔ تصویر کی علتِ غائی کچھ اور تھی لیکن مولانا محمد علی کی باریک بینی نے اس کی محض ضمنیات میں سلطنتِ مغلیہ کا پُر درد مرثیہ مضمر پایا۔ افسانہ خوانی کے لئے بھی ذہنِ رسا اور مذاقِ سلیم کی ضرورت ہے۔ مولانا محمد علی کا سا دل ودماغ رکھنے والا قاری افسانہ کے ضمنی وما حولی عناصر میں ایسے نادر اور اچھوتے پہلو دریافت کر سکتا ہے۔ جن کے افادہ و دلچسپی کے آگے قصہ کے مرکزی واقعات بے حقیقت معلوم ہوں گے۔ چنانچہ ایک نکتہ شناس و سنجیدہ مذاق قاری کے نزدیک شرر کے افسانہ "ایامِ عرب" میں قدیم عربی تمدن کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ وہ عمرو و زبیر یا جبیبہ و حلیمہ کے مرکزی قصہ سے کہیں زیادہ اہم اور قیمتی ہیں۔ اسی طرح سید سجاد حیدر یلدرم کے افسانہ "قیس ولیلیٰ" میں ہیرو اور ہیروئن کے کارنامے اربابِ نظر کے دل ودماغ پر ویسے گہرے نقوشِ تاثر ثابت نہیں کرتے جیسے قدیم وجدید طرزِ زندگانی کا وہ دلچسپ و پُر از معلومات موازنہ جو محض ضمنی طور پر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

(باقی)

محمد حسین ادیب

موت

(سانیٹ)

مرے محبوب، جانے دے، مجھے اُس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا، اور تیر کی مانند جاؤں گا،
کبھی اِس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا،
گوارا کر خُدارا اِس قدر ایثار، جانے دے
نہ کر اب ساتھ جانے کے لئے اِصرار جانے دے
میں تنہا جاؤں گا، تنہا ہی تکلیفیں اُٹھاؤں گا،
مگر اُس پار جاؤں گا، تو آخر چین پاؤں گا،
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار، جانے دے

مجھے اُس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے؟
مجھے اُس پار لینے کے لئے وہ کون آیا ہے؟
خُدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے؟
مجھے جانے دے، اب رہنے سے میری جان جاتی ہے
مرے محبوب میرے دوست، اب جانے بھی دے مُجھ کو؛
بس اب جانے بھی دے، اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو!

(ن۔ م۔ راشد

میں اور وہ اور کوئی اور

میں اپنے کمرے میں اکیلا اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ اُس نے پردے کی آڑ سے مجھے جھانکا اور وُہ چُپ چاپ اندر آ گئی!

گھونگھریالے بال ماتھے پر جھالر کیے ہوئے، زلفیں رخساروں کی جدول بنی ہوئیں، گول چہرہ، گلاب کی سی رنگت، بادام سی آنکھیں، بھویں ذرا ملی ہوئیں، پلکیں لانبی لانبی تیز نوک دار برچھیاں تانے، چھوٹی غنچہ سی ناک، دانت کہ اوپر نیچے موتی رکھے ہوئے۔ ٹھوڑی کہ چاند سے مکھڑے کا سہارا، آنکھوں میں شوخی، چہرے میں شرارت، الھڑ، چنچل، پھولوں کی شہزادی، اُس کی چال ایک نئی راگنی، اُس کا سراپا ایک نوخیز سروِ رواں۔ وہ آئی، سیدھی میری طرف آئی اور بستر پر میرے پہلو میں بے تکلف بیٹھ گئی!

کیا جذبات میرے دل میں اُٹھے! ابھی کل رات میں لسان الغیب کے یہ شعر گنگنا رہا تھا: ؎

زلف آشفتہ و خوے کردہ و خنداں لبِ مست
پیرہن چاک و غزل خوان و صراحی در دست

نرگسش عربدہ جو و لبش افسوس کناں
نیم شب مست ببالینِ من آمد بنشست

سر فراگوشِ من آورد و بآوازِ حزیں
گفت کاے عاشقِ شوریدۂ من خوابت ہست

بس بالکل یہی کیف تھی اور یہی سماں۔ سوائے اس کے کہ اُس کے ہاتھ میں صُراحی نہ تھی بلکہ کوئی اور گول گول سی چیز اور آدھی رات کا وقت نہ تھا بلکہ دن دوپہر کا اور اُس کے نازک لبوں پر "عاشق" کا لفظ نہ تھا بلکہ ایک اور اس سے بھی (آج کل) عاجز "لفظ! اس کا پیرہن بھی چاک تھا اور وہ میرے ہی کچھ شعر گنگنا رہی تھی، بار بار سُنا کر گویا مجھے پھسلا رہی تھی: ؎ جھن من جھن من جھن جھنکار

ناچیں کودیں گالے گائیں
اپنے اپنے من کی سُنائیں

پیار کریں آ باہم پیار
جھن من جھن من جھن جھنکار

اور اُس کی آواز "حزیں" نہ تھی بلکہ نشاط انگیز اور کیوں نہ ہوتی آخر چودھویں اور بیسویں صدی کا فرق حائل تھا، کہاں حافظ کے وہ پردہ نشین باحیا معشوق اور کہاں دورِ حاضر کی یہ میری بے پردہ شوخ دیدہ حسینہ!

وہ میری طرف لپکی اور صرف وہی نہیں بلکہ میں بھی! ــــــ اُس وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

تھوڑی دیر کے لئے میں اپنی قدامت پسند پاکبازی کو بھول گیا ہوں۔ مدتوں سے نفسی ضبط اور زاہدانہ روک تھام نے میرے جذبات کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالا تھا، مرد میں نسوانیت کے لئے جو ایک ولولہ ہوتا ہے جس سے اُس کی مردانگی طاقت پکڑتی ہے اُسے برسوں سے ایک متانت بھرے زہد و اتقا نے میرے اندر مروڑ کر مسخ کر دیا تھا یہاں تک کہ اب میں تمام قسم کے جنسی تعلقات کو گناہِ کبیرہ سمجھنے لگ گیا تھا ـــ لیکن اس حُسن کی پُتلی۔ اس پیاری دلکشی نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے دبے ہوئے جذبات کو اُبھار دیا ہے۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے اُبھرنا اُبلنا اُچھلنا چاہتا ہوں، اپنی مُردہ دلی کو خیرباد کہہ کر کم از کم چند ثانیوں کے لئے پھر زندہ و تابندہ ہو جانے کا تمنائی ہوں ـــ پتلے پتلے لال لال ہونٹ، کالی کالی گول گول آنکھیں، بھرے ہوئے نازک نازک گال ـــ میں نہ رہ سکا، اپنے اصولوں کو بھول کر، اپنی "پاکیزہ" ضد سے ہٹ کر، اپنی خاموش خشک مزاجی سے یکسر منہ پھیر کر میں نے پہلے اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور پھر پے در پے اُس کے بوسے لئے، اور اسی پر بس نہیں اُس حُسن کی دیوی نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیا، میں نے اُس کے رخسار پر بوسے دئے تھے اُس نے میرے لبوں اور میری آنکھوں کو چُوما، میں نے اُسے سینے سے لپٹایا تھا اُس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بھینچا بلکہ اِس مرحلے سے جلد گذر کر اُس نے میرے رخساروں کو کھینچا اور میرے بالوں کو نوچنا شروع کیا۔ بیسویں صدی کی ترقی یافتہ خاتونوں کی محبت سہہ سکنا ہر بھلے مانس آدمی کا کام نہیں، اِس کے لئے ایک مضبوط دل ایک قوی جگر اور ایک جنگجو رُوح کی ضرورت ہے ـــ پھر آفت پر آفت یہ کہ آخر کار اُس نے میرے کانوں میں میری گردن پر میرے پہلو میں غرض جہاں جہاں اُس سے بن پڑا مجھے گُدگُدانا شروع کیا۔ اور ستم ظریفی یہ کہ ساتھ ہی فی البدیہہ فرمائش کی کہ آپ بھی مجھے گُدگُدائیں بس ـــ میں بستر پر دم بدم پہلو بدل رہا تھا، لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، مگر وہ ظالم مجھے کب چھوڑتی تھی، نوبت بایں جا رسید کہ وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی اور شاید میرے سر کے روز بروز کم ہوتے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کر کے طنزاً مُسکرائی اور بولی" اباجی! گنجے کے منجے" ـــ کہ اتنے میں پردہ اُٹھا اور یہ چار برس کی بے وفا چھپکلی پلنگ سے پھاند کر" بُوجی بُوجی" (= امّی) کہتی کسی اور کی ٹانگوں سے لپٹ گئی!

ب ـ ا

غزل

ابتدا وہ تھی کہ میں ظالم بنا، جاہل بنا
انتہا یہ ہے کہ رازِ دوست کا حامل بنا

رہ سپارِ حق بنا یا پیروِ باطل بنا
جو بنا نا ہو، بنا۔ لیکن کسی قابل بنا

شوق کے لائق بنا، ارمان کے قابل بنا
اہلِ دل بننے کی حسرت ہے تو دِل کو دِل بنا

عقدہ تو بے شک کھلا لیکن بصد دقت کھلا
کام تو بے شک بنا لیکن بصد مشکل بنا

جب اُبھارا ہی تو اپنے قرب کی حد تک اُبھار
جب بنایا ہی تو اپنے لطف کے قابل بنا

سب جہانوں سے جدا اپنا جہاں تخلیق کر
سب مکانوں سے جدا اپنا مکانِ دل بنا

یادِ ماضی تازہ کر کے حال کی تخریب کر
اور اُس تخریب پر ایوانِ مستقبل بنا

یہ تو سمجھے، آج آزاد ایک کامل فرد ہی
یہ نہ سمجھے، ایک ناقص کس طرح کامل بنا

حکیم آزاد انصاری

(۱)

کہا جاتا ہے کہ علمِ سیاست کی داغ بیل قدیم یونان میں پڑی اور رفتہ رفتہ یہ علم ممالکِ یورپ میں ارتقائی نشو و نما پا کر تمام دنیا میں پھیل گیا۔ کم و بیش تمام مغربی مصنفین کا یہی عقیدہ ہے۔ مغربی مصنفین اگر اس نظریہ کو مانتے ہیں تو جہاں تک یورپ کا تعلق ہے چنداں ہرج نہیں اس لئے کہ یورپ میں یہ فخر یونان ہی کو حاصل ہے کہ اول اول وہاں سیاسی نظام و سیاسی نظریات کی بنیادیں پڑیں۔ اور یہ بنیادیں نہ صرف سیاسی معاملات سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ ان کا اثر تمام تمدنی و معاشرتی نظام پر یکساں حاوی تھا اسی وجہ سے یوروپی مصنفین یونان کو اپنا روحانی وطن مانتے ہیں جہاں سے اُن کے خیال کے مطابق اول اول علم کا چشمہ اُبلا۔ لیکن دوسرے علوم سے قطع نظر اگر صرف سیاست ہی کو لے لیا جائے اور تاریخ کی روشنی میں اُس کا مشاہدہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ سیاسی مفکرین یونان سے صدیوں پہلے دوسرے مشرقی ممالک میں گذر چکے ہیں اور یونان اس دوڑ میں بہت پیچھے ہے۔ آیئے ذرا دو ایک ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تاکہ یہ معاملہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی کے ایک مشہور ماہر الطبقات پروفیسر شلائمن نے شہر ٹرائے کے قدیم کھنڈروں میں کھدائی کا کام شروع کیا اور کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد انہوں نے قدیم ٹرائے کا پتہ لگایا۔ قدیم یونان کی تہذیب کا گہوارہ ایشیائے کوچک تھا۔ یہاں تک کہ یونانی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہومر ایشیائے کوچک کا باشندہ بتایا جاتا ہے۔ قدیم یونانی تہذیب سے قبل جس کا خاکہ ہومر کی منظوم حکایتوں میں ملتا ہے۔ یونان کئی تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ جن کا اب تک کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ پروفیسر موصوف نے اپنی محنت و کاوش سے دریافت کیا کہ یونانیوں کی تہذیب سے پہلے جو تہذیب وہاں رائج تھی وہ مائسینین (Myeaenean) زمانہ کے نام سے موسوم ہو سکتی ہے۔ اس کا تعینِ عہد ڈیڑھ ہزار سال قبلِ مسیح ہو سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء کے قریب انگلستان کے ایک مشہور پروفیسر اے۔ جے۔ ایونس نے جزیرۂ کریٹ واقع بحرِ روم میں کھدائی کا کام شروع کیا اور انہوں نے بھی اس جزیرہ میں جو جزیرہ نمائے یونان کے قریب

ہے ایک دوسری تہذیب کا پتہ چلایا جس کا عہد غالباً ڈیڑھ ہزار لغایت ایک ہزار سال قبلِ مسیح تھا۔ اب ہندوستان کا حال سنیئے۔ ابھی آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا کہ مسٹر بنرجی اور مسٹر وکشت کی رہنمائی میں سندھ اور پنجاب کی سرحد پر محکمۂ آثارِ قدیمہ کی سرپرستی میں کھدائی شروع ہوئی۔ کام شروع ہونے کے کچھ دنوں بعد معلوم ہونے لگا کہ محنت بیکار نہ جائے گی بلکہ اس تودۂ خاک کے نیچے جو خزانہ پوشیدہ ہے وہ نہ صرف ہندوستان کی تاریخ کو بلکہ دنیا کی تاریخ کو مالا مال کر دے گا۔ آخر کار کھدائی کے بعد ایک غارت شدہ شہر کے حدود اور مکانات کا پتہ چلا۔ یہ شہر موہنجو دارو تھا جس میں سے عورتوں کے مختلف قسم کے طلائی زیورات۔ سونے چاندی کے برتن انسانی سروں کا ایک کثیر ذخیرہ اور دیگر سازوسامانِ معیشت و خانہ داری نمودار ہوا ہے۔ ان چیزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ محققین کی رائے ہے کہ ہندوستان کو تین ہزار برس قبلِ مسیح کی کھوئی ہوئی تاریخ ہاتھ آئی۔ اب تک زیادہ سے زیادہ ہزار برس قبلِ مسیح کی تاریخ کا پتا چلتا تھا۔ مگر وہ بھی اتنا دھندلا اور مذہبی روایات میں اتنا ملا جلا تھا کہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے الگ کرنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اس گنجِ شایگاں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں تمدن نے کتنی ترقی کر لی تھی کہ نہ صرف مکان وغیرہ پختہ اور عمدہ اینٹ پتھر کے بنے ہوئے تھے بلکہ کھانے اور پینے کے برتن وغیرہ بھی سونے چاندی کے ہوتے تھے جن پر نقش وغیرہ کھدے ہوئے تھے۔

ماہرین الطبقات اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ اول اول تہذیب کی بنیاد کہاں پڑی۔ کوئی بابل اور نینوا کی اینٹوں کو دیکھ کر حکم لگاتا ہے کہ انسان نے خانہ بدوشی اور جنگلی زندگی کو خیرباد کہہ کر یہیں بود و باش اختیار کی تھی اور یہیں سوسائٹی کی بنیاد پڑی تھی۔ دوسرا گروہ مصر کے متعلق اصرار کرتا ہے کہ تہذیب کی کرنیں پہلے پہل طوطن خامن کے ملک میں چمکیں اور ثبوت میں اہرامِ مصری اور ابوالہول کی زندہ یادگاروں کو پیش کرتا ہے۔ اس لئے کہ تمام ملکوں کی قدیم عمارتوں کی ابتدا کا کچھ نہ کچھ پتہ چل جاتا ہے مگر اہرام کی صحیح تاریخ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ بعض امریکی کہتے ہیں کہ تہذیب کا پہلا گہوارہ ملکِ چین کا صحرائے گوبی ہے جہاں حال میں انسانوں کی کچھ ایسی ہڈیاں پائی گئی ہیں جو اس موہوم جانور سے مشابہ ہیں جو ابوالبشر سمجھا جاتا ہے۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور اب تو اس بحث میں ہندوستان بھی برابر کا حصہ دار ہو گیا ہے مندرجہ بالا واقعات کو دیکھ کر یہی رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ ماہرین کا نظریہ خواہ کچھ بھی ہو مشرق یورپ سے صدیوں قبل تمدن کا مرکز تھا اور مشرق کے لوگوں نے جو ترقیاں اس دور میں کی تھیں وہ اس زمانے میں مغرب کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ سر سر نیدر ناتھ بنرجی اپنی مشہور کتاب "ایک قوم بحالتِ تعمیر" میں لکھتے ہیں کہ جب یورپ کے مہذب ترین ملک کے لوگوں کے آباؤ اجداد جنگلوں میں پھرتے تھے اس وقت ہندوستانیوں نے سلطنتیں

قائم کر رکھی تھیں۔ بڑے بڑے شہر آباد کر رکھے تھے اور مذہب، ادب اور اخلاقیات میں وہ ترقیاں کی تھیں کہ آج وہ مہذب دنیا کے لئے باعثِ حیرت ہیں۔"

یونانیوں کو تمام علوم مثلاً فلسفہ۔ ریاضی۔ تاریخ۔ طب و نجوم وغیرہ کا ابوالآبا کہتے ہیں۔ مغربی مصنفین تو اپنی خودستائیوں میں یہاں تک پرواز کرتے ہیں کہ ہندوستان کے ریاضی فلسفہ اور طب وغیرہ کو بھی یونانیوں کا مرہونِ منت بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ہندوستان میں علوم کا دور دورہ تھا وہ ان چند یونانی مفکرین کے طفیل ہے جو سکندرِ اعظم کے ساتھ اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آتے رہے۔ یہ نظریہ جتنا لغو ہے اتنا ہی بے بنیاد بھی ہے اس لئے کہ سکندرِ اعظم کا حملہ چوتھی صدی قبلِ مسیح کے آخر میں ہوا اور ہندوستان میں ریاضی فلسفہ وغیرہ کا دور دورہ اس سے صدیوں قبل شروع ہو چکا تھا۔ اپنی بحری زندگی کے قصوں کی وجہ سے جن کا ذکر ہومر اپنی اوڈیسی میں کرتا ہے یونانی جغرافیہ کے موجد مانے جاتے ہیں۔ لیکن اس امر کی پختہ شہادتیں موجود ہیں کہ فن جہاز رانی میں چینیوں نے یونانیوں اور فنیشیوں سے صدیوں قبل بہت کچھ ترقیاں حاصل کر لی تھیں اور سمندر کے سفر سے بخوبی آگاہ تھے۔ جرمنی کے مشہور عالم فان ہمبولٹ نے قطب نما کی ابتدا کے متعلق جو مضمون تحریر کیا ہے اور جو پیرس میں ۱۸۳۴ء میں چھپ گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول قطب نما کا حوالہ چین کی تاریخ میں شاہ ہیون یون کے چونسٹھویں جلوس کی سالگرہ پر ملتا ہے۔ یہ واقعہ دو ہزار چھ سو چونتیس قبل مسیح کا ہے۔ شاہ ہیون یون نے جب چی یون پر حملہ کیا تو اس کی فوج ایک کہر میں گھر گئی۔ اس وقت شاہ نے ایک معمولی گھڑی بنانے کا حکم دیا جس سے جنوب کی سمت کے علاوہ اور سمتیں بھی دریافت ہوں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے مضمون نویس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ چینی جہاز کھینتے کھینتے ہندوستان کے ساحل تک چلے آئے تھے اور ان کے جہازوں کا رُخ سوئیوں کی نوک سے درست کیا جاتا تھا۔

ان تمام امور پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں مشرقی سوسائٹی نے خاص تمدنی ترقی کر لی تھی۔ عام طور پر لوگ گاؤں اور قصبوں میں رہتے تھے اور ان تمام مقامات میں ایک مستقل سیاسی نظام ہوتا تھا جو ملک کی ترقی اور امن کا ضامن تھا۔ ملک کی ترقی خود اس بات کی شاہد ہے کہ سوسائٹی میں کوئی باقاعدہ نظام ضرور ہوگا جس کو آج ہم حکومت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ ایک عمدہ حکومت تمام ترقیوں کی بنیاد ہوتی ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ مشرقی مفکرین نے حکومت کے سیاسی پہلو پر غور و فکر نہ کیا ہو۔

مشرق میں سیاسی بیداری پہلے پہل چین میں شروع ہوئی۔ پہلا معلم و مصنف سیاست ہونگ فوزی ہے جو پانچ سو پچاس برس قبل مسیح پیدا ہوا اور چار سو اٹھتر قبل مسیح میں وفات پا گیا۔ اس کے متعلق ہماری جو کچھ معلومات ہیں ان کا سرچشمہ اُس کا ایک پیرو منسیوس ہے جو اُس کی وفات کے تقریباً سو برس بعد پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ

اس کی تصنیف "تاریخ لو" سے بھی نہایت مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جب اس کی شہرت چار دانگِ عالم میں ہوئی تو ہونگ فوزی کا نام لاطینی زبان میں ڈھالا گیا جو بگڑتی ہوئی صورت میں کنفیوشس ہے۔ کنفیوشس چین کے شہر لو میں اُس وقت پیدا ہوا جب ہر طرف خانہ جنگی کا بازار گرم تھا۔ امیروں اور رئیسوں نے زمین کے ٹکڑے کر لئے تھے اور ان پر قابض تھے۔ ظاہر ہے کہ ملک تباہ حال تھا اور آسودگی کوسوں دور۔ اس اختلال اور پریشاں حالی میں نظام قائم کرنا سخت مشکل تھا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ مرکزی حکومت خود اتنی کمزور تھی کہ امیروں اور نوابوں پر سختی نہیں کر سکتی تھی۔ امرا آپس میں خوب لڑتے تھے۔ کنفیوشس نے ان تمام خرابیوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خون کے آنسو رویا مگر کیا کر سکتا تھا۔ منسیوس کا بیان ہے کہ کنفیوشس اس خانہ جنگی سے بہت پریشان ہو گیا تھا اور آخر میں اُس نے اصلاح و تعمیر کا مقصدِ عظیم اپنے سامنے رکھ کر کوشش شروع کی۔ اس سلسلہ میں اوّل اس نے چین کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کا مطالعہ کیا اور شاید وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ سمجھا کہ انسانوں پر کسی نظریہ کی بنا پر خواہ وہ قانونی ہو یا فلسفیانہ حکومت کرنا ناممکن ہے۔ اس کی نظر میں سیاست کا فن کوئی زبردستی کا قانون نہیں تھا جس کو ایک جماعت تمام ملک پر عائد کر دیتی ہے۔ بلکہ سیاست اس فن کا نام ہے جس کی رو سے انسانوں کے عادات و اطوار۔ خصائل و اخلاق اور رسم و رواج کو تسلیم کر کے ان میں رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا کی جائے۔ اس باب میں وہ گویا آئرلینڈ کے مشہور سیاسی مصنف برک کا ہم زبان ہے۔

کامل پندرہ برس تک کنفیوشس مطالعہ میں مصروف رہا اور اپنے حجرے سے باہر نہ نکلا حالانکہ کسی نہ کسی طرف سے اس پر برابر شرکت کی خاطر دباؤ پڑتا رہا۔ اپنی عمر کے باونویں سال میں وہ شہر چنگ ٹو کا مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ اور بعد ازاں وزیر عدالت ہوا۔ اس وقت اس نے اپنے نظریات کو بروئے کار لانا شروع کیا۔ مجرموں کو سخت سزائیں دیتا تھا تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

کنفیوشس کا قول تھا کہ سوسائٹی کا نظام پانچ جفت عناصر کی باہم ترکیب سے وضع ہوا ہے۔ سوسائٹی کا قیام انہیں عناصر کی منظم کارکردگی پر منحصر ہے۔ وہ پانچ جفت عناصر یہ ہیں۔ اول حاکم و رعایا۔ دوم شوہر اور بیوی سوم باپ اور بیٹا۔ چہارم بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی۔ پنجم دوست۔ اس کو پختہ یقین تھا کہ انسانی فطرت نیک ہے اور ہمیشہ نیکی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور اس لئے اس نے سوسائٹی کے مجموعی آرام و امن کے لئے ہر جفت میں اول عنصر کی حکومت کو تسلیم کیا اور تلقین کی کہ اول عنصر کو چاہیئے کہ انصاف اور رحم کے ساتھ دوسرے عنصر پر حکومت کرے اور اس طرح دوسرے عنصر کو چاہیئے کہ وہ بھی کمال ایمانداری اخلاص اور وفاداری سے اول عنصر کی فرماں برداری کرے۔ رہے دوست تو ان کو آپس میں کمال محبت کا سلوک کرنا چاہئے۔ یعنی رعایا کو حاکم کی بیوی کو شوہر کی۔ بیٹے کو باپ کی۔ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو

و سائٹی کے نظام میں سخت خلل واقع ہوگا اور ساری زندگی تلخ ہو جائے گی۔

منصبِ شاہی کو وہ خدا کی طرف سے ودیعت کردہ منصب سمجھتا ہے لیکن اس منصب کے لئے اہلیت کی شرط کو ضروری قرار دیتا ہے اور اہلیت سے الطاف اور رحم مراد لیتا ہے۔ بادشاہ کو منصب اختیار کرنے کے بعد کبھی ذاتی اغراض اور منافع کے لئے کوئی کام نہ کرنا چاہیئے۔ رعایا کی ترقی اور ملک میں امن کا قیام یہ اس کے دو اہم فرض ہیں اور جب تک وہ ان دو باتوں پر عمل پیرا ہے وہ شاہی منصب کی اہلیت رکھتا ہے لیکن جب وہ رعایا پر ظلم کرنا شروع کرے کسی وزیر یا اس کے کسی خاندان کے فرد کو یا پھر کسی خدائی طاقت کو چاہیئے کہ اس کو ہٹا دے۔ کنفیوشس اس خدائی طاقت کے مفہوم کو صاف اور واضح طور پر بیان نہیں کرتا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کا مطلب کسی ایسے طاقتور شخص سے ہو جو عام طور پر منتظم سوسائٹی کے درہم برہم ہوتے وقت پیدا ہو کر سارے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تاریخ میں اس کی صدہا مثالیں ہیں۔ نپولین نے خود اسی طرح برسرِ اقتدار ہو کر حکومت کی۔ آج مسولینی اور مصطفیٰ کمال پاشا کا بھی حال ہے۔ ایک طرف تو کنفیوشس کی تعلیم ہے کہ حکومت کی تعظیم کی جائے اور اس کے تمام احکام کی پابندی ہو یہاں تک کہ خود شاہ کی حکومت کا سرچشمہ خدا کی حکومت ہے۔ دوسری طرف وہ بادشاہوں کے لئے صحیح لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کی تعلیم میں جو بات نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ جابر اور ظالم بادشاہ کے مقابلہ میں رعایا کی بغاوت کو جائز ٹھہراتا ہے اور اس لئے بادشاہ کے اختیارات کو رعایا کا تابع قرار دیتا ہے۔ اس کی تعلیم انصاف پسند اور رحم دل بادشاہ کی موافقت میں ہے۔ وہ مطلق العنانی اور خودسری کو بُرا کہتا ہے اس لئے کہ مطلق العنان کی حکومت رعایا کے فائدہ کے بجائے اس کے ذاتی مفاد کے لئے ہوتی ہے۔

کنفیوشس مدتوں چین کی مختلف ریاستوں میں پھرتا رہا اور کئی مقامات پر اس نے امرا سے اپنے نظریہ کو قبول کرا کے بروئے کار لانے کی التجا بھی کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی امیر یا حاکم اپنی سلطنت کا انتظام صرف بارہ مہینوں کے لئے میرے ہاتھوں میں دے دے تو ملک کو میں بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہوں اور تین سال میں تو میری تمام آرزوئیں پوری ہو سکتی ہیں۔ کم و بیش تمام ریاستوں کے حاکموں نے اس کا بہت عزت و تکریم کے ساتھ استقبال کیا۔ مگر اس کی نصیحت پر کوئی بھی عمل کے لئے تیار نہ ہوا۔

چین کی سماجی زندگی پر اُس کا اتنا اثر تھا کہ دو سو برس بعد جب چین سین کے ظالمانہ پنجوں میں گرفتار ہوا اور اس گرفتاری میں سین نے تمام قدیم روایات کا خون کرنے کی انتہائی کوشش کی تو یہ صرف کنفیوشس ہی کی تعلیم تھی جو زندہ تھی اور زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی۔ چین میں باوجود پیہم انقلاب پر انقلاب آنے اور شاہنشاہی کا درجہ ختم ہونے کے بعد بھی آج کنفیوشس کا اثر باقی ہے۔

کنفیوشس سیاسی معلم ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑا فلسفی اور ادیب بھی تھا۔ اُس کی کہاوتیں اب تک مشہور ہیں اور موسم بہار کی طرح تازہ ہیں۔ ذیل میں اس کی دو چار کہاوتیں قارئین کی دلچسپی کے لئے درج کی جاتی ہیں :-

عقلمند آدمی اپنی تلاش کرتا ہے، بیوقوف اور کم درجہ کا آدمی دوسروں کی جستجو میں رہتا ہے۔

حقیقی عظمت اور بزرگی یہ نہیں ہے کہ انسان کو حوادثِ زمانہ کے مقابلہ کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلکہ اصلی عظمت مقابلہ کرنے، ہارنے اور پھر دوبارہ مقابلے کی تیاری میں ہے۔

سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ تکلیف میں انسان اپنے نفس پر حاکم ہو اور درد اور مصیبت کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔

(باقی آئندہ) ——— "قرہ خاں"

غزل

نہیں کہتے اُسے آرام جو دولت سے ملتا ہے
سکوں ہے نام اُس کا جو تری قربت سے ملتا ہے

دمِ رخصت تم اپنے مبتلا کا حال تو دیکھو
گلے سے وہ تمہارے ہائے کس حسرت سے ملتا ہے

نصیب اُس کا ہے تو کرتا ہی جس سے پیار کی باتیں
مقدر اُس کا ہے جو تجھ سے مہ طلعت سے ملتا ہے

کسی کو بدگمانی کیوں ہو میرے تجھ سے ملنے پر
کہ بلبل پھول سے اک جذبۂ فطرت سے ملتا ہے

نیا جلوہ نیا عالم نیا رنگ اُس کا جب دیکھو
یہ مانا ہم سے وہ دلدار اک مدت سے ملتا ہے

نجیب امید ایسے سے وفا کی! باز آ ناداں
بھلا تیرا وہ کیا ہوگا جو اک خلقت سے ملتا ہے

میر سعادت حسین نجیب

برکھا رین چاندنی

بھانت بھانت کے چھائے بادل ہلکی گہری بدلی وائے چتلے[1] چتلے صاف اور میلے بھورے بھورے کالے کالے

ہردے بیچ کوئی مسکیاوے[2]

کچھ بادل میں اون سی ملتے اور کچھ جیسے روئی کے گالے چندر چھپے ان میں اور نکلے چمک چمک مکھ آنچل ڈالے

ہردے بیچ کوئی مسکیاوے

دھیرے دھیرے ڈولے بدلی آئے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے دھنک[3] رنگ سی چندر گھرا ہے اتر دکھن کاندھالو[4] بجھکے

ہردے بیچ کوئی مسکیاوے

ڈوب ڈوب بدلی سے ابھریں دوڑ دوڑ کے بھاگیں تارے کوئی بڑا ہو کوئی چھوٹا ننھے منے پیارے پیارے

ہردے بیچ کوئی مسکیاوے

برکھا رین میں کوٹھے اوپر دور کہیں کوئی کجلی[5] گاوے باہر گاؤں کھڑا ہر واہا[6] اپنے ساتھی کو گہراوے[7]

ہردے بیچ کوئی مسکیاوے

دیا اسی جگ داتا کی ہے جو سنسار کا بھار سنبھالے نیچ اونچ کو آن پہونچاوے سارے جگ کو پوسے پالے

ہردے بیچ وہی مسکیاوے

---

[1] چتلے بادلوں کے مجمع کو اودھ میں "تتل بدریا" کہتے ہیں۔ [2] مسکیاوے۔ یعنی مسکراوے۔ تبسم کرے [3] قاعدہ ہے کہ ہلکے بادلوں میں چاند کے چاروں طرف قوسی رنگ کے ہلکے پڑجاتے ہیں [4] کاندھالو بکے۔ چمک ہوئے بجلی چمکے [5] کجلی۔ ایک موسمی گیت کا نام ہے۔ برسات کے زمانے میں یہ گیت عام ہے [6] ہرواہا۔ ہل چلانے والا یعنی کسان [7] گہراوے یعنی آواز دے پکارے۔ قاعدہ ہے کہ کسان رات کے وقت کھیت وغیرہ کے انتظام کے لئے اپنے دوسرے ساتھی کو پکارنا اور آواز دیا کرتا ہے۔ وہ سین نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔

بچے اور بوڑھے

یہ افسانہ کیسنکر کی کتاب "مناظرِ رویا" سے ماخوذ ہے۔ یہ مصنف سلوفینی مصنفین کے نوجوان طبقے میں سب سے زیادہ ہونہار تھا اور اس کے ڈرامے ناول اور افسانے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ "مناظرِ رویا" اس کی آخری تصنیف ہے جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ اس افسانے کا ترجمہ انگریزی میں پہلے پہل ۱۹۲۶ء میں ہُوا اور اب میں نے وہیں سے لے کر اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

ہر رات سونے سے پہلے بچے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ آتش دان کے سامنے بیٹھ جاتے اور جو کچھ اُن کے جی میں آتا کہے چلے جاتے۔ شام کے دُھندلکے میں شفق اپنی خواب آگیں آنکھوں کے ساتھ تنگ دریچے میں سے کمرے کے اندر جھانکتی اور گوشے گوشے سے تاریکی کے خاموش بادل خدا جانے کیا کیا عجیب وغریب داستانیں اپنے ساتھ لئے ہوئے اوپر کو اُٹھ اُٹھ کر فضا میں تیرنے لگتے۔

بچوں کے دل میں جو بات بھی آتی کہتے چلے جاتے، لیکن اُن کے پاکیزہ دلوں میں مسرت کے نُور میں سموئی ہوئی محبت اور امید کی داستانوں کے سوا اور تھا بھی کیا؟ مستقبل اُن کے نزدیک خوشی اور بے فکری کا ایک طویل خوشگوار عہد تھا اور زندگی ان کے خیال میں اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ کہیں کسی مشجّر پردے کے پیچھے پُرجوش دل اور پُرشوق نگاہوں کے ساتھ نور کے ایک دریا میں تیرتی چھینٹے اُڑاتی اور گاتی ہوئی نور کے کسی سمندر کی طرف بہے چلی جارہی تھی۔ بچے آہستہ آہستہ باتیں کرتے، ان کی آدھی باتیں سنی جاتیں اور آدھی اَن سُنی رہ جاتیں۔ ہر داستان بے سروپا ہوتی جس کا نہ کوئی آغاز ہوتا نہ انجام، اور پھر کبھی چاروں بچے یکبارگی بولنے لگتے، لیکن باوجود اس کے کسی کی بات میں بھی خلل نہ پڑتا۔ اُن کی نگاہیں ایک ایسے دل لبھا لینے والے آسمانی نور پر جمی ہوئی ہوتیں جس کے پرتو میں ہر لفظ سچا اور واضح ہوجاتا، ہر داستان سچی زندگی کا ایک دلکش مرقع بن جاتی اور ہر افسانے کا انجام شاندار نظر آنے لگتا۔

بچوں کی صورتوں میں باہم اس قدر قریبی مشابہت تھی کہ شفق کی دھندلی روشنی میں سب سے چھوٹے

بچے حسین پر جس کی عمر چار سال کی تھی زبیدہ کا گمان ہوتا۔ حالانکہ وہ اُس سے چھ سال بڑی تھی۔ سب کے چہرے نازک اور دُبلے پتلے اور آنکھیں بڑی بڑی اور کشادہ تھیں جن سے سوچ بچار کے آثار نمایاں تھے۔

اُس شام کو جس کا ذکر ہے کسی نامعلوم مقام سے کوئی نامعلوم چیز کسی تند ہاتھ نے اِس آسمانی فضا میں لاڈالی تھی جس سے پرلطف کہانیوں اور معصوم دلچسپیوں کی یہ مسرور زندگی بُری طرح مجروح ہوگئی۔ ڈاک یہ خبر لائی تھی کہ ابا اٹلی کے میدانِ جنگ میں کام آگئے"۔ ایک عجیب وغریب نامعلوم اور ناقابلِ فہم بات اُن کے لئے پیدا ہوگئی تھی۔ ایک بلائے سرِم سامنے کھڑی تھی جس کا نہ چہرہ تھا نہ آنکھیں اور نہ منہ۔ بس ایک طویل وعریض ہیئت تھی جس کا جامع مسجد کی چہل پہل، بازار کی گہما گہمی، شام کے دھندلکے میں آتشدان کی خوشگوار سرخ لَو اور دلچسپ کہانیوں سے کوئی ربط ہی معلوم نہ ہوتا تھا۔ نہ اس کا خوشی ہی سے کوئی واسطہ تھا اور نہ خاص طور پر غم ہی سے کوئی تعلق، کیونکہ یہ مردہ تھی۔ نہ اس کی آنکھیں تھیں کہ اس کی نگاہیں اس کا حال کھولتیں اور نہ اس کا منہ تھا کہ اس کی باتوں سے اس کی حقیقت معلوم ہوتی۔ سوچ بچار اس عظیم الہیئت دیو کے مقابل اس طرح عجز وہراس کی تصویر بن کر کھڑی تھی گویا سامنے کوئی بہت بڑی سیاہ، ڈراؤنی ہنگاخ دیوار کھینچ دی گئی ہو۔ یہ دیوار تک پہنچتی اور پھر حیران وششدر کھڑی کی کھڑی رہ جاتی۔

حسین نے حیرت زدہ آنکھیں کھولے ہوئے پوچھا "لیکن ابا واپس کب آئیں گے؟"

زبیدہ نے کچھ بگڑ کر جواب دیا "جب وہ جنگ میں کام آگئے تو واپس کس طرح آسکتے ہیں"۔

کچھ دیر کے لئے سب چپ ہوگئے وہ پھر اُسی عظیم الشان سیاہ دیوار کے سامنے کھڑے تھے جس کے پرے اُن کی نظر کام نہ کرسکتی تھی۔

آخر زاہد جس کی عمر سات سال کی تھی یکایک بول اُٹھا "میں بھی جنگ میں جاتا ہوں" اس نے یہ بات اس انداز سے کہی گویا وہ دفعتہً صحیح فیصلے پر پہنچ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

پھر ننھے حسین نے اسے ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا "تم ابھی بہت چھوٹے ہو"۔ حسین نے خود ابھی ننھے بچوں کا گاؤن پہننا نہ چھوڑا تھا۔

خالدہ جو سب سے زیادہ نحیف اور کمزور تھی اور اپنی اماں کی شال میں لپٹی ہوئی یوں معلوم ہوتی تھی گویا کسی راہگیر کے سامان کی گٹھڑی ہے کہیں تاریکی میں سے اپنی نرم اور دھیمی آواز سے بولی "جنگ ہوتی کس طرح کی ہے؟ زاہد تم بتاؤ۔ ہمیں آج اسی کی کہانی سناؤ"

زاہد بولا "سنو۔ جنگ یوں ہوتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے جسم میں چھریاں گھونپتے ہیں اور

تلوار سے ایک دوسرے کا سر کاٹ لیتے ہیں ساتھ ساتھ بندوقیں بھی چلاتے جاتے ہیں بس یہ ہے جنگ"۔

خالدہ نے پوچھا" اور ایک دوسرے کو مارتے کس لئے ہیں ؟"

زاہد۔"بادشاہ سلامت کے لئے" یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔

گھٹا ٹوپ اندھیری دوریوں میں اُن کی دُھندلی نگاہوں کے سامنے ایک عجیب پرشکوہ چیز نمودار تھی جس سے آسمانی نور کی برکھا لگ رہی تھی اور وہ بے حس وحرکت دم سادھے ہوئے بیٹھے تھے۔ گویا عبادت گزار اپنے معبود کے سامنے بیٹھے ہوں۔

اس کے بعد زاہد نے پھر بہ سرعت اپنے خیالات کو جمع کرتے ہوئے اُس خاموشی کا طلسم توڑا جو بے طرح ان پر چھا گئی تھی"نہیں میں ضرور دشمن سے لڑنے کے لئے جنگ میں جاؤں گا"

اس پر خالدہ نے دھیمی آواز سے پوچھا"دشمن ہوتا کس طرح کا ہے ؟" اس کے سینگ بھی ہوتے ہیں ؟"

حسین (پُرجوش انداز سے تقریباً برافروختہ ہو کر)"اور نہیں تو کیا، پھر وہ دشمن ہی کیا ہوا"۔

اب زاہد کو بھی کوئی قطعی جواب بن نہ پڑا۔ اس نے رُکتے رُکتے کہا"میرے خیال میں تو اس کے سینگ نہیں ہوتے"

زبیدہ نے بادل ناخواستہ دخل دیتے ہوئے کہا"سینگ اُس کے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ وہ ہماری ہی طرح کا آدمی ہوتا ہے۔ پھر ذرا سوچ کر بولی" البتہ اس کی روح نہیں ہوتی"۔

طویل وقفے کے بعد حسین نے پوچھا"جنگ میں کس طرح کام آتے ہیں ؟" پھر اپنے بازو زور زور سے آگے پیچھے ہلا کر بولا" اس طرح ؟"

زاہد نے کہا"نہیں آدمی کو جان سے مار ڈالتے ہیں"

پھر حسین کہنے لگا" ابا کہتے تھے ہم تمہارے لئے بندوق لائیں گے"

زبیدہ کسی قدر درشت لہجہ سے بولی" اگر وہ جنگ میں کام آگئے ہیں تو وہ تمہاری بندوق کس طرح لا سکتے ہیں"۔

حسین"اور پھر دشمن نے اُن کو جان سے ——— مار ڈالا ؟"

زبیدہ" ہاں جان سے"

بچوں کی کھلی ہوئی معصوم آنکھوں میں سے خاموشی اور غم نے تاریکی میں، کسی نامعلوم چیز پر جس کا دل و دماغ احاطہ نہیں کر سکتے ٹکٹکی باندھ دی۔

دادی اماں اور دادا جان اُس وقت گھر کے دروازے کے سامنے ایک بنچ پر بیٹھے تھے باغ

کے گھنے پتوں میں سے شفق کی سُرخ روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی اور شام کی گہری خاموشی میں اصطبل سے رونے کی ایک دبی ہوئی اور گھٹی ہوئی آواز سنائی دیتی تھی جواب تقریباً ہچکیوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ غالباً نوجوان ماں کے رونے کی آواز تھی جو وہاں جانوروں کی خبر گیری کے لئے گئی تھی۔

بوڑھا اور بڑھیا شدید غم میں سر جھکائے ہوئے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ آج مدتِ دراز کے بعد پھر ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں تھے اور اُن کی آنسوؤں سے محروم آنکھیں شفق کے نور پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بالکل چُپ چاپ تھے۔

حامد علی خاں

عزمِ سفر

وہ لوگ جن کا عمر بھر، رہے گا ایک مستقر ضرور پائیں گے ضرر۔ نہ ملک میں وُہ ذی اثر
نہ قوم ہی میں معتبر۔ چلو اٹھو کہاں کا گھر ابھی سے باندھ لو کمر، سفر سے ہوں گے بہرہ ور
وسیع تا کہ ہو نظر

سفر کو صورتِ سقر کہیں گے اب بھی ہم اگر ہنسیں گے سارے باخبر ہمارے اس خیال پر
زمانہ وہ گیا گذر، ٹھگوں کا اب ہے شور و شر نہ رہزنوں کا کچھ خطر۔ ذلیل ہو کے خیرہ سر
خبر نہیں گئے کدھر

کسی پہ کیا ہے منحصر ہر ایک شاہِ خوش سیر ہے امن کا پیامبر۔ پُر امن راہِ بحر و بر
کہیں بھی کچھ نہیں ہے ڈر۔ برائے طالبِ گہر برائے کاسبِ ہنر، سفر وسیلۂ ظفر
کرو سفر کرو سفر

سید علی منظور
(حیدرآباد دکن)

احسن الکلام

دل ہے یکسو عاشقوں کا حال یکساں دیکھ کر — یعنی اطمینان ہی سب کو پریشاں دیکھ کر
تھی کسے تابِ تکلم روئے تاباں دیکھ کر — نکلے گویا کہنے سُننے کے بھی ارماں دیکھ کر
کم نہ ہوگا جوشِ وحشت، کیوں کیا ہی مجھ کو قید — اور چڑھتا ہے جنوں دیوارِ زنداں دیکھ کر
ایک دِل صدہا تمنائیں، ہزاروں حسرتیں — میہماں گھبرا گیا ہے اتنے مہماں دیکھ کر
دستِ وحشت کو یہ تھا حفظِ مراتب کا لحاظ — اُن کا دامن تہ کیا میرا گریباں دیکھ کر
پائے گا حد، وسعتِ دل کی تو کیا پائے خیال — آپ کھو جائے گا ذرّے میں بیاباں دیکھ کر
حُسنِ عالم کا نگاہوں سے مرقع گر گیا — دِل کے آئینے میں عکسِ روئے جاناں دیکھ کر
اُٹھ گیا دُنیا سے آنکھوں کا لحاظ و پاس بھی — بے مُروّت ہنس رہا ہے مجھ کو گریاں دیکھ کر
آئینہ خانے میں اوّل دیکھیئے اپنا جمال — پھر تعجب کیجئے عاشق کو حیراں دیکھ کر
ہجر و وحشت کا اثر ہم دیکھتے ہیں ساتھ ساتھ — تم کو تنہا چھوڑ کر دل کو پریشاں دیکھ کر
ہو بُرا بینائیوں کا پا لیا غیروں نے بھید — نالۂ فریاد ہنس کر چشمِ گریاں دیکھ کر
کُھل گیا روئے حقیقت وا ہوئی چشمِ مجاز — اپنی صورت دیکھ لی تصویرِ جاناں دیکھ کر

کیوں فریبِ حُسن کی در پردہ ہو منّت کشی
ہم اُٹھائیں گے تو احسن بارِ احساں دیکھ کر

احسن مارہروی

مذہب

انگلستان سے ایک نوجوان ہندوستانی طالب العلم کا یہ مضمون اشاعت کی غرض سے ہمیں موصول ہوا ہے۔ مضمون نگار کسی خاص مذہب پر معترض نہیں بلکہ اس نے مذہب پر بحیثیت مجموعی اصولی اعتراض کئے ہیں۔ آج کل کے نوجوانوں میں جو دہریہ پن پھیل رہا ہے یہ مضمون اس کا ایک نمونہ ہے۔ ہم نے یہ آواز سُنی ہے اور اسے سُن کر خاموش ہو جانا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ دوسروں کو سُناتے ہیں تاکہ حامیانِ مذہب اس کا معقول جواب دے کر مخالفینِ مذہب کو مطمئن کر سکیں۔ الحاد کے اس انتباہ سے اہلِ مذہب کو یہ فائدہ ضرور اُٹھانا چاہیئے کہ وہ تنگ نظرانہ توہمات کو جو غلط طور پر مذہب میں شامل ہو گئے ہیں مذہب سے خارج کر کے ازسرِنو اس کی اصلاح کریں۔ "ہمایوں"

علم اور جہالت کے درمیان ایک موہوم سرحد ہے جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ مگر سرزمینِ جہل پر ایک نشان ایک نہایت مستحکم کھونٹے کی طرح سے گڑا ہوا ہے جس کی مدد سے ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم کہاں ہیں۔ یہ نشان مذہب ہے۔ انسان کی ذہنی زندگی کے ارتقار کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب قدرت کی ظالم اور بے درد اور اندھی طاقتوں سے وحشی انسان سامنا کرتا تھا تو اس کے دل میں طرح طرح کے خوف پیدا ہوتے تھے۔ ہر جنبش میں اسے زندگی معلوم ہوتی تھی۔ بادل کی گرج کسی دیوتا کی خفگی تھی۔ درختوں پر بھوت پریت بستے تھے۔ ہر چشمے اور ندی، نالے میں رُوح ہوتی تھی۔ انسان بیچارہ ان تمام اَن دیکھی ہستیوں کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتا تھا اور چونکہ ہر علم کی بنیاد طبعی تجربہ ہے اس وجہ سے جب وہ اپنے توہمات کے جذبوں کو مادّی لباس پہنانا چاہتا تھا تو اس کے دیوتاؤں میں بھی انسانی خوبیاں اور انسانی خصلتیں، [illegible] کی خوبیاں اور حیوانوں کی خصلتیں پائی جاتی تھیں۔ چوہا، بلی، بندر، لنگور، کتا، بھیڑیا، مور، سانپ سب پوجے [illegible] یا ابھی تک پوجے جاتے ہیں۔ انسان کے دیوتاؤں اور خداؤں میں بھی غصہ، نفرت، محبت، فیاضی، رحم، انصاف، چالاکی وغیرہ، غرض تمام وہ خصلتیں ملتی ہیں جو معمولی آدمیوں میں پائی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب ایک نوع کا معاشری مرض ہے جو زمانۂ جہالت میں اولین انسانوں کے گوناگوں جذبۂ لائے خوف وہراس کا آفریدہ ہے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انسان کے توہمات بھی کم ہوتے گئے۔ یہ توہمات کبھی تو بالکل بھلا دئے

گئے اور کبھی صرف ان کی شکل بدل گئی اور انسان کی ہزار شیوہ فطرت فرسودگی سے اکتا کر انہیں کی کسی دوسری نئی شکل کی پرستش کرنے لگی۔ مگر مختلف مذہبوں کی نوعیت پھر بھی وہی رہی جو ایام جاہلیت میں تھی۔

اب ایام جاہلیت میں وحشی انسانوں کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو دیکھئے۔ زندگی کی پہلی ضرورت کھانے پینے کے سامان کی فراہمی اور جسم کو جاڑے اور گرمی سے بچانا ہے۔ ان ضرورتوں کو مہیا کرنے کے لئے انسان کو سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ قبائل کی آپس میں لڑائیاں۔ اہل قبیلہ کے باہمی فساد، زمین کے لئے لڑائی اور اسلحہ کے واسطے لڑائی بغرض انسان صرف ایک قانون کے مطیع تھے اور وہ طاقت کا قانون تھا۔ مگر زور بازو سے اپنے حریف کو چت کر دینا تو ممکن ہے اس کے سینے پر چوبیس گھنٹے بیٹھے رہنا دشوار بھی ہے اور نامناسب بھی۔ دشوار اس وجہ سے کہ نہ معلوم کب ہماری آنکھ جھپک جائے اور ہمارا دشمن اس بیخبری کے عالم میں الٹا ہم پر حاوی ہو جائے، نامناسب اس وجہ سے کہ دشمن کو نیچا دکھانے سے ہمارا مقصد نہ صرف اس کے مال و اسباب پر قبضہ کرنا تھا بلکہ اس کو اپنا غلام بنا کر اس سے کام لینا بھی تھا۔ حاکموں کو ضرورت کسی ایسی چیز کی تھی جو محکوموں پر ان کا ایسا رعب بٹھا دے کہ محکوم حاکم کو اپنا خدا یا خدا انہیں تو کم از کم اس کا نائب ضرور ماننے لگیں۔ ذہنی غلامی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی غلامی نہیں۔ جب ایک فاتح گروہ دوسرے مفتوح گروہ پر ذہنی قبضہ قائم کر لیتا ہے تو جبری حکومت کی ساری مشکل حل ہو جاتی۔ اس ذہنی غلامی کے قائم کرنے میں مذہب کی زنجیر سب سے قوی ہوتی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مذہب کی جڑ خوف اور جہالت ہے۔ مگر ہم نے ابھی تک مذہب کی تعریف نہیں کی۔ ہر شخص چونکہ مذہب کی الگ تعریف کرتا تھا اس وجہ سے ہمارے خیال میں مذہب کے بارے میں بلاخوف تردید صرف یہ بات کہی جا سکتی کہ وہ کائنات کے متعلق ایک ایسا نظریہ ہے جس میں پہلے تو ایک مافوق الادراک طاقت کی حکومت ہر چیز پر مان لی گئی ہے، انسانوں کی نجات اس طاقت کی خوشنودی اور ان کا ابتلا اس کی ناخوشی پر منحصر ہے، دوسرے روح جو مادی جسم سے جدا ہو سکتی ہے اور تیسرے دنیاوی زندگی کے علاوہ ایک اور آنے والی زندگی میں اعتقاد۔ یہ تین چیزیں تقریباً ہر مذہب کا ضروری جزو ہیں۔

ظاہر ہے کہ مذہب اور جبر و استبداد کے درمیان ایسی صورتوں میں ضرور رشتہ بندی ہوگی۔ محنت اور مزدوری کرنے والوں کو اگر یہ یقین دلایا جائے کہ ان کی محنت کی اصلی اُجرت انہیں اگلی دنیا میں ملے گی اور دنیاوی زندگی محض وہم اور مایا ہے۔ اگر ان کو یہ یقین دلایا جائے کہ اپنے مالکوں اور آقاؤں کا حکم ماننا ان کا فرض ہے اور ان کی عدول حکمی گناہ، تو ظلم و تشدد کی آدھی سے زیادہ لڑائی کا فیصلہ مظلوموں کے خلاف مقدر ہو چکا۔ دنیا میں دغا بازی اور جھوٹ اور وحشیانہ طاقت اکثر اخلاق اور راستبازی کا جامہ پہن کر حکومت کرتی ہے۔ جو لوگ محنت اور مزدوری کر کے اپنے دست و بازو سے دولت پیدا کرتے ہیں ان کو دبا رکھنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ نہ صرف ان کے خلاف اسلحہ کا استعمال ہو بلکہ ان کے دل و دماغ اس قدر مجبول کر دیئے جائیں کہ وہ اپنے دشمنوں کی پوجا کرنے لگیں اور اندھی مشین

عشق اور وطن

فرانسس ہارٹی، سر ونٹن چیمپٹن کے عالیشان بنگلہ میں کھڑی تھی۔ گھنٹی بجانے سے پہلے ایک
کچھ سوچتی رہی۔ خدمتگار نے دروازہ کھولا اور فرانسس کو گہری تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

فرانسس بولی "میں سر ونٹن چیمپٹن سے ملنا چاہتی ہوں۔"

خدمتگار نے دروازہ کو اور زیادہ کھول دیا اور بڑے کمرے میں ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے
جہالہ کہنے لگا "آپ وہاں تشریف رکھیے اور مجھے اپنا کارڈ دے دیجئے۔ میں ابھی جواب لاتا ہوں کہ انہیں فرصت
جو ہے یا نہیں۔"

گو وہ خالص انگریزی بول رہا تھا مگر انگریز معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کی شکل وصورت غیر ملکیوں سی بہت
مشابہ تھی۔ اونچے قد اور بھرے بھرے بدن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فوجی ملازمت کر چکا ہے۔
فرانسس نے اُسے اپنا کارڈ دے دیا جو اُس نے قدرے جھک کر لیا اور پھر اس طرح اکڑ اکڑ کر چلنے لگا
جیسے مغرور فوجی چلا کرتے ہیں۔ ایک منٹ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ وہ واپس آکر کہنے لگا "چلیئے یاد
فرما رہے ہیں۔" وہ فرانسس کو لائبریری میں لے گیا جو کتابوں سے اٹی پڑی تھی۔

سر ونٹن، جن کی عمر تقریباً پچاس برس کی تھی، اپنی کرسی سے اُٹھے اور پہلے زمانہ کی تہذیب کے مطابق
خمیدہ ہو کر سلام کیا۔

انہوں نے کہا "مجھے آپ کا خط مل گیا تھا" کیا میں اب پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کیا بات تھی جسے آپ
خط میں لکھنا پسند نہ کرتی تھیں؟"

"میں آپ سے ملنا خط لکھنے سے بہتر سمجھتی تھی اور جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ آپ کے لختِ جگر کپتان
چیمپٹن کے متعلق ہے۔"

سر ونٹن نے کہا "لیکن میرا لختِ جگر تو مر چکا۔"

ں۔ اُن کے انتقال کے وقت میں اُن کے پاس موجود تھی۔"

نے کچھ حیرت اور کچھ شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا "مگر وہ تو جرمنی کے قید خانہ میں

مرا تھا۔"

فرانسس بولی" بہتر یہی ہے کہ میں سب حالات کو تفصیل سے بیان کر دوں۔
"میں بھی جرمنی کے قید خانہ میں تھی۔ لیکن جب حکام بالا کو یہ معلوم ہوا کہ میں نرس ہوں تو انہوں نے مجھے افسروں کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا۔ وہیں آپ کے لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ ہم بہت جلد دوست بن گئے اور کچھ عرصہ کے بعد شادی کا اقرار بھی کر لیا۔ اُس وقت رابرٹ کی بیماری خطرناک نہ تھی اور ڈاکٹروں کو امید تھی کہ عنقریب صحت عود کر آئے گی لیکن بدقسمتی سے بہت سی بیماریاں ایک ساتھ ان کے لئے موت کا پیام لے آئیں"۔

فرانسس خاموش ہو گئی۔ بہ ظاہر رنج نے غلبہ پا لیا تھا۔
سر وٹن کہنے لگے" اپنے دل کو تسلی دیجئے"۔"آپ کی کیا خاطر کروں؟ . . . . شراب لاؤں؟"

"جی نہیں ——— شکریہ! بات تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ تجہیز و تکفین کے بعد میں ایک جرمن قیدی کے بدلہ میں رہا کر دی گئی۔ میں نے جیل خانہ کے کماندار سے آپ کے لڑکے رابرٹ کی چیزیں لانے کی اجازت چاہی، تاکہ آپ کے پاس پہنچا سکوں۔ خدا کا شکر ہے اُس نے منظور کر لیا۔ آپ کے نام اس کا ایک خط بھی میرے پاس ہے۔ وہ مجھے ہالینڈ کی سرحد کے راستہ سے لائے جہاں راٹرڈم سے کشتی پر سوار کرا دیا کل لندن میں داخل ہوئی۔ رابرٹ کی چیزیں ہوٹل میں ہیں۔ میرے ساتھ اپنے کسی ملازم کو کر دیجئے، وہ لے آئے گا"۔

سر وٹن نے کہا" میں ایسا نہیں کر سکتا مجھے قوی امید ہے کہ آپ اس غریب خانے کو اپنا گھر سمجھیں گی، خاص طور پر جب تک لندن میں قیام ہے ——— آپ نے میرے لڑکے کے لئے جو کچھ کیا ہے، اس کے صلہ میں ایک خدمت یہ بھی سہی ———" فقرہ کو نامکمل چھوڑ کر فرانسس بالکل قریب آ گئے اور اپنا ہاتھ آگے پھیلا کر کہنے لگے" سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں؟ اگر اجازت دیں تو لیڈی چیمپٹن کو بلا لاؤں"

"شکریہ! اور میں درخواست کرتی ہوں کہ آپ انہیں میرے آنے کی وجہ بتا دیں ——— میں اس واقعہ کو بار بار بیان کرنا نہیں چاہتی"

"اچھی بات ہے ——— میں خوب سمجھتا ہوں"

شام کو فرانسس کی چیمپٹن کے دولت کدہ میں ایک معزز مہمان کی طرح بہت خاطر و مدارات کی گئی کھانے پر دو مہمان اور موجود تھے۔ سر وٹمن نے ان کا تعارف اس طرح کرایا کہ آپ جنرل ہیولیٹ ہیں اور آپ یالٹس ہیں لیکن یہ نہ بتایا کہ یالٹس سکاٹ لینڈ کا باشندہ اور محکمہ سراغرسانی کا انسپکٹر تھا۔

سر وٹمن امیر البحری کے ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ اُن کی دن رات حفاظت کی جاتی تھی۔ کیونکہ اہلِ جرمنی ان سے بہت خائف تھے اور بدگمان بھی۔ خاص طور پر جب سے انہوں نے انگریزی جہاز کے بیڑے کی حفاظت کے لئے ایسی تدابیر اختیار کی تھیں جن سے جرمنی کی آب دوز کشتیاں بجائے اوروں کے ڈبونے کے خود ہی ڈوب جاتی تھیں۔ سب تدبیریں ان کے اپنے دماغ کی ایجاد کردہ تھیں۔ لیڈی چیمپٹن ایک خوبصورت اور شریف خاتون تھیں جو بہت جلد فرانسس کی طرف مائل ہو گئیں۔ اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی کیونکہ فرانسس نہ صرف بہت ہی خوبصورت تھی بلکہ بہت اچھے اور دلکش اخلاق کی حامل بھی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد قہوہ کا دور چلا اور سر وٹمن فرانسس کے قریب بیٹھ گئے۔ جب خدمت گار دروازہ بند کر کے چلا گیا تو بولے

"ہمارا خدمت گار بھی کتنا عجیب انسان ہے!"

فرانسس نے کہا "جی ہاں اسے دیکھ کر ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ یہ معمولی شخصیت کا آدمی نہیں ہے" ——— دیکھئے تو فوجیوں کی طرح کیسا مضبوط اور توانا ہے"۔

سر وٹمن مسکرانے لگے۔

"اس کا نام والڈر ہے، یہ بلجیم کا رہنے والا ہے۔ وہاں کے بادشاہ نے اسے ایک بہادری کا کام سرانجام دینے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی زخموں کی زیادتی کی وجہ سے یہ بیمار ہو گیا اور فوجی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ پھر یہ بلجیم اور انگلستان کے درمیان خاص پیغام رساں کا کام دینے لگا لیکن اس مرتبہ بھی صحت نے دھوکا دیا اور یہ میرے پاس ملازمت کی تلاش میں آیا۔ میں نے اسے خدمت گار بننے کے لئے کہا کیونکہ بقولِ خود وہ پہلے بھی یہ ملازمت کر چکا تھا اور اُس نے منظور کر لیا۔ لیکن اس کی حیثیت خدمت گار سے بہت زیادہ ہے ——— تمام گھر کا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے"۔

فرانسس نے کہا "بے شک بہت کارآمد ہے"۔

جب فرانسس رات کو اپنے سونے کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا کہ ہر ایک چیز صفائی اور قرینہ سے اپنی اپنی جگہ رکھی ہے۔ وہ ایک لمحے کھڑی ہوئی صفائی کرنے والے کی تعریف کرتی رہی۔ اپنے سوٹ کیس کو کھلا دیکھ کر اُسے تعجب ہُوا۔ اُس کی بھی تمام چیزیں خوش اسلوبی سے سجا دی گئی تھیں

اور کپڑے بدلنے کی میز پر تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا تھا۔

فرانسس اپنے دل میں خیال کرنے لگی "مجھے یقیناً نہایت عجیب کنیز ملی ہے"۔

اسی اثنا میں دروازہ سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔

فرانسس نے کہا "اندر آجاؤ"۔ اس کا خیال تھا کہ وہی کنیز ہوگی۔

دروازہ کھلا اور والڈر نمودار ہوا۔ اُس کے لبوں پر ایک ایسا تبسم کھیل رہا تھا جو سمجھ میں نہ آتا تھا مگر دکھائی ضرور دیتا تھا۔ اور اُس کی نظریں مقابلہ کی دعوت دے رہی تھیں۔

اُس نے دریافت کیا "آپ کو اپنا کمرہ پسند ہے؟"

"ہاں۔ بے شک"۔ مجھے خادمہ کے اِس حُسنِ ذوق کی تعریف کرنی چاہیئے، جو اُس نے اِس کمرے کے سجانے میں ظاہر کیا"۔

والڈر نے آہستہ سے کہا کمرے کو سجایا تو ہے میں نے اور آپ تعریف کرتی ہیں خادمہ کے حُسنِ ذوق کی"

"سچ؟ ــــــــ واقعی؟" وہ اپنی رات کی پوشاک جو پلنگ پر قرینہ سے رکھی تھی، دیکھ کر حیران سی ہوگئی۔

"میرا فرض تھا کہ میں یہ سب کچھ کروں"۔

والڈر آہستہ آہستہ چارپائی کی طرف چلا اور تکیہ کے نیچے سے ایک خود بخود چلنے والا پستول نکال کر کہنے لگا "میرے خیال میں آپ شاید اسے پسند نہ کریں کہ اس پر خادمہ کی نظر پڑ جائے"۔

فرانسس چُپ چاپ کھڑی، اُس کے چہرہ کی طرف تکتی رہی۔

"میں اسے سوٹ کیس میں بھول گئی تھی، لیکن آپ کو بغیر سوٹ کیس کھولے نہ مل سکتا تھا"۔

"برخلاف اس کے مجھے کامل توقع تھی کہ آپ کے پاس اس قسم کا کوئی ہتھیار ضرور ہوگا"۔

والڈر یہ کہہ رہا تھا اور اُس کی نظریں فرانسس کے دلفریب چہرہ پر جمی ہوئی تھیں ــــــــ یہ نظریں صرف گستاخ ہی نہ تھیں بلکہ ایک خاص مقابلہ کی دعوت دے رہی تھیں۔

"میرے خیال میں اس پستول کا آپ کی خادمہ کو مل جانا اچھا نہ ہوتا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں، اس لئے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضرور لیڈی چیپٹن کو بتا دیتی ــــــــ"

وہ بات کہتے کہتے رُک گیا، گویا آگے فرانسس کو بولنا چاہیئے تھا۔

فرانسس نے کہا آپ بہت عجیب آدمی ہیں۔ سر وٹن آپ کی تعریف کر رہے تھے، لیکن مجھے یہ اُمید

ں کہ آپ اتنے ہوشیار بھی ہوں گے۔"
والڈر نے ایسی آواز میں جو جذبہ سے سراسر خالی معلوم ہوتی تھی کہا "سر وِلٹن بہت مہربان ہیں وہ ہمیشہ
ے معمولی سے معمولی کاموں کی تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ایک خاتون
دٹ کیس کھونے سے بہت زیادہ مشکل کام سرانجام دئے ہیں۔"
وہ بول رہا تھا اور فرانسس اُس کی شکل وصورت کا جائزہ لے رہی تھی، وہ اتنا زیادہ خوبصورت نہ تھا ـــــ
بصورت کیا معنی، بدصورت ضرور تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خاص کشش تھی اور اُس کے چہرے کے
ن میں ایک عجیب مقناطیسی طاقت تھی ـــــــ بہت سی عورتیں اس کشش اور مقناطیسی طاقت کو
صورتی پر ترجیح دیتی ہیں۔
آخر فرانسس نے کہا "مگر آپ نے مجھے اب تک نہیں بتایا کہ میرے صندوق میں سے اس قسم کا ہتھیار
نے کی آپ کیوں اُمید رکھتے تھے؟
اُس نے کہا "کیا اس کا سبب معلوم کرنا ضروری ہے؟ سبب؟ جس سے یہ پستول ملنے کی امید تھی ـــ
ید اس کے ساتھ آپ کو اور باتیں بھی معلوم ہو جائیں۔ خیر سبب تو مجھے معلوم نہیں، میں آپ سے ایک سوال
ا ہوں۔"
لڑکی کے چہرہ پر حیرت برسنے لگی اور ایسا بھی معلوم ہوتا تھا کہ اُسے بہت کچھ علم ہے۔ پھر وہ ہنس
ی۔
"بہت ہی زیادہ غیر معمولی آدمی ہیں آپ۔ آپ کی باتیں سن کر میرے دل میں ایک ناول کے کردار
یاد تازہ ہو جاتی ہے، جو میں نے مدت ہوئی پڑھا تھا۔"
اس مرتبہ فرانسس کی آنکھوں نے اسے مقابلہ کی دعوت دی۔ والڈر لگاتار پانچ سیکنڈ تک اُس کی
ھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا۔ پھر بہت ہلکی آواز میں کہنے لگا۔
"ناول کے کردار کی؟"
لڑکی نے کہا "آپ شیلر ہیں مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ بہت جلد مجھ سے گھُل مل جائیں گے، لیکن مجھے
اُمید قطعی نہ تھی کہ سر وِلٹن کے گھر کا سب انتظام آپ کرتے ہوں گے۔"
والڈر بولا "شاید آپ کو ہمارے جاسوسی محکمے کی طاقتوں کا اندازہ نہیں۔ وطن کے لئے کوئی کام
ممکن نہیں ـــــ دشمنوں کو بھی معلوم ہو جائے گا ـــــ جو کام میں نے یہاں کیا ہے یہ تو
ں کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا، جو میں نے بلجیم میں سرانجام دیا تھا اور اُس سے تو خاص طور پر

بہت ہی کم ہے جو میں یہاں پورا کرنا چاہتا ہوں ——— آپ کی مدد سے"

فرانسس نے دریافت کیا "کیا میرے کمرے میں اس قسم کی باتیں کرنا عقلمندی کا کام ہے"؟

کچھ خطرہ نہیں ——— میں جانتا ہوں اس وقت کون کس جگہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی برآمدے میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ مجھے اس کا علم نہ ہو جائے اور پھر میں اس دروازہ سے غائب ہو جاؤں گا"

اُس نے یہ کہتے ہوئے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا جو چارپائی کے دوسری جانب تھی۔

فرانسس نے کہا "مجھے تو کوئی دروازہ نظر نہیں آتا"

"یقین جانو! وہاں دروازہ ہے۔ اور بھی بہت سے ہیں ——— اب مجھے چلنا چاہیئے کیونکہ سرونٹن کو دارالمطالعہ میں میری ضرورت پڑے گی، انہیں گرم دودھ کا گلاس پلانا ہے ——— یہ اپنے وقت کے بہت پابند ہیں ——— یہ انگریز لوگ بہت پابند ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں اتنی آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے"۔

چند روز میں والڈر نے فرانسس کی دستاویز کی جو جرمنی کے خفیہ محکمے کی طرف سے ملی تھیں خوب جانچ پڑتال کر لی مگر اپنے متعلق کچھ نہ دکھایا البتہ یہ بتا دیا کہ کس طرح چور دروازے بنائے تھے ——— چند کیمیائی اشیاء کے استعمال سے مکانوں کے پرنالوں اور چھتوں میں سوراخ کر کے سرونٹن کو دکھا دئے کہ ان کی مرمت جلد ہونی چاہیئے۔ سرونٹن اپنی بیوی اور ملازموں کو لے کر لندن کے ایک ہوٹل میں چلے گئے اور والڈر کو کام کی دیکھ بھال کے لئے وہیں رہنے دیا۔ اُس نے جو آدمی کام پر لگائے وہ جرمن تھے جن کے متعلق عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ انگریزی نسل سے ہیں۔ اِس طرح والڈر کے لئے اِس قسم کا کام کرالینا مشکل نہ رہا۔ فرانسس والڈر کے بتانے کے بغیر بھی یہ باتیں کسی نہ کسی طرح معلوم کر لیتی کیونکہ وہ سرونٹن کے یہ الفاظ سن چکی تھی کہ "والڈر اپنے کام میں بہت ہوشیار ہے اور گھر کا سب انتظام اسی کے سپرد ہے"۔

ایک مہینے کے بعد ہی والڈر نے فرانسس کو بتا دیا کہ وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے بھیجی گئی ہے'

اُس نے کہا "ہمیں یہاں امریکہ کی فوجوں کو، جو فرانس جا رہی ہیں روکنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ عنقریب ہی امریکہ کی پہلی بحری مہم روانہ ہونے والی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ وہ راستہ جو امریکہ کے جہازوں کا بیڑا اختیار کرے گا معلوم کریں اور پھر ہماری آب دوز کشتیاں اس بیڑے کو برباد کر دیں گی ——— اس نقصان سے امریکہ چند مہینوں کے لئے خاموش ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ لڑائی سے بالکل ہی کنارہ کش ہو جاتے کیونکہ ریاستہائے متحدہ میں ایک بہت بڑی جماعت جنگ کے خلاف ہے۔ اگر ہم نے یہ کام خیر و خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچا دیا تو ہماری خدمات اُن جرنیلوں کے کاموں سے زیادہ شمار کی جائیں گی جو دشمن سے جنگ کے میدانوں

لڑ رہے ہیں ـــــ امریکہ کی مدد کے بغیر دشمن لازمی طور پر شکست کھا جائیں گے۔"

فرانسس پوچھنے لگی "لیکن ہم کس طرح یہ کام انجام کو پہنچا سکتے ہیں؟"

"سر وٹن سے راستے کا خاکہ حاصل کر لینے سے۔ ایک نقل سر وٹن کے پاس بھی بھیجی جائے گی تاکہ وہ
در محفوظ تر ستجاویز امریکہ کے راہبر کو بتا سکیں ـــــ اس معاملہ میں ہم بہت خوش قسمت نکلے۔ سر وٹن
اور انگریزوں کی طرح بے مدضدی ہیں۔ انہوں نے حکومت کے کارکنوں سے کہہ دیا تھا کہ میں امیر البحری
دفتر میں کام نہیں کر سکتا اس لئے سب کاغذات مکان پر بھیجے جانے لگے۔ اگر نقشے وغیرہ دفتر میں رکھے
نے تو ہم کچھ بھی نہ کر سکتے۔ ایک اور بات بھی اہم اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ جنرل ہیولیٹ جنگجو سپاہی نہیں
، بلکہ انگریزی خفیہ پولیس کے بڑے افسروں میں سے ایک ہے۔ اور یالٹس "سکاٹ لینڈ یارڈ" کا انسپکٹر
ـــــ میں یہ بات عرصہ دراز سے جانتا ہوں مگر آپ سے بے موقع ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا
کو اپنی فکر پڑ جاتی۔"

فرانسس نے ذرا چڑ کر کہا "آپ میری چالاکی اور ہوشیاری کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے۔"

"اس کے برعکس میں نے آپ کے متعلق بہت اعلیٰ اور بلند رائے قائم کر رکھی ہے۔"

"شکریہ! مجھے فخر ہے کہ میں آپ کی خوشنودی حاصل کر رہی ہوں۔"

اُس کی آواز میں طنز تھی مگر اس کی وجہ والڈر کی سمجھ میں نہ آسکی۔

والڈر نے کہا "چھوڑیئے بھی اس قصہ کو ہمیں بچوں کی طرح فضول باتوں میں وقت نہیں کھونا چاہیئے، ہم
ں وطن کی خدمت کرنے آئے ہیں یا اپنے متعلق سوچنے؟"

فرانسس اپنے کمرے میں چلی گئی اور بڑی دیر تک بیٹھی معاملات کی اہمیت پر غور کرتی رہی۔ پھر اپنے دل
ے یوں باتیں کرنے لگی۔

"اگر اُسے صرف یہی معلوم ہوتا کہ اس کا مجھ پر کتنا زور ہے ـــــ محبت کا زور ـــــ وہ
ھے دنیا کے ہر حصے میں لے جا سکتا۔ لیکن وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھے اُس سے محبت ہے اور میرا خیال ہے
ـــــ اُسے محبت کے لفظ کے معنی بھی نہیں آتے ـــــ وطن کے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے
رہے یقیناً ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے، اور سب کچھ وطن کے لئے وقت پڑنے پر قربان کر دے گا"

دوسرے دن والڈر نے اُسے بتایا کہ آج راستہ کے خاکے کی نقل دفتر امارت بحری سے سر وٹن
ے پاس بھیجی جائے گی۔

فرانسس نے دریافت کیا "آپ کو کیونکر پتہ چلا؟"

"اس کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ــــــ میرا خیال تھا کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ ٹیلیفون کی گفتگو کو سمجھ لینا جب کوئی اور بات کر رہا ہو میرے لئے بچوں کے کھیل سے زیادہ نہیں۔ خیر ــــ اب ذرا غور سے سنیئے آج کی رات میں آپ کو وہ حروف بتا دوں گا، جن کے ملانے سے آہنی تجوری کھل جاتی ہے ــــــــ یہ بہت ضروری اور اہم کام ہے۔ اسے آپ سرانجام دیں آپ پر کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں اور مجھے پالٹس بہت مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔"

دوپہر کے بعد چپراسی دفتر سے آکر خاکے کی نقل اور ضروری کاغذ دے گیا۔ سر ڈلٹن نے غور سے پڑھ کر چند ایک نوٹ لکھے اور لوہے کی الماری میں بند کر دیئے اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

والڈر نے فرانسس کو وہ حروف بتا دیئے تھے جن کے ملانے سے محفوظ آہنی تجوری کھولی جا سکتی تھی اور اُس نے حفظ کر لئے تھے۔ وہ الماری میں سے نقشہ نکالنے لگی ہی تھی کہ ایک اجنبی کی آمد نے ان دونوں کے کام میں کچھ وقت کے لئے رکاوٹ ڈال دی۔ یہ اجنبی سر ڈلٹن کا چھوٹا لڑکا تھا جو میدانِ جنگ سے بیماری کی چھٹی لے کر آیا تھا۔

والڈر نے جب وہ آرتھر کو لائبریری میں بٹھا کر سر ڈلٹن کے پاس جا رہا تھا فرانسس کے کان میں کہا "ہمیں رات کے کھانے کے بعد تک انتظار کرنا پڑے گا" آپ چپ چاپ اور اچانک اس کمرے میں چلی جائیے اور خود کو نہمان ظاہر کیجئے۔"

جب فرانسس لائبریری میں داخل ہوئی تو آرتھر نے ہاتھ پھیلائے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا "آپ وہی نرس ہیں جو مجھے ڈیوائے ولی میں ملی تھیں۔"

فرانسس نے اُسے پہچان تو لیا مگر اپنی کسی حرکت سے اس بات کو اُس پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

وہ بولی "آپ غلطی پر ہیں"۔ میں کبھی ڈیوائے ولی نہیں گئی۔ ہاں البتہ جرمنی کی قیدی ضرور رہی ہوں۔"

خوش قسمتی سے ٹھیک اُس وقت سر ڈلٹن آ گئے اور انہوں نے فرانسس کا تعارف اپنے لڑکے سے کرا دیا۔

آرتھر نے کہا "آپ سے ملنا اور بھی زیادہ باعثِ خوشی ہے۔ تعجب ہے جب بھائی صاحب اس جہان سے رخصت ہونے لگے تو اُن کے پاس ایک انگریز خاتون تھیں۔"

اُس رات کو کھانا کھاتے ہوئے آرتھر چیمپٹن، فرانسس سے بہت اچھی طرح پیش آیا اور فرانسس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کسی اور سے باتیں کرتے کرتے یک لخت گھبرا کر اُسے گھورنے لگ جاتا تھا۔

فرانسس نے دل میں خیال کیا "بالکل ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس بات کا یقین نہیں دلا سکا کہ اُس

مجھے کبھی ڈیو لے دلی میں نہیں دیکھا"

کھانا کھانے کے بعد سب مرد سوائے سرونٹن کے بلیرڈ کھیلنے کے کمرے میں چلے گئے اور سرونٹن معمل میں چلے گئے۔ فرانسس اور لیڈی ونٹن بیٹھی ہوئی باتیں کرتی رہیں۔ دس بجے کے بعد وہ بھی حسبِ معمول اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئیں اور اُن کے کمرے سے نکلتے ہی والڈر آموجود ہوا۔

اُس نے فرانسس سے کہا "میں پالٹس کو دھوکا دے کر دوسری طرف لے جاتا ہوں۔ جنرل ہیولیٹ اور نوجوان افسر بلیرڈ میں محو ہیں۔ اُن کی طرف سے بھی کوئی خدشہ نہیں، ہاں پالٹس کمرے کے سامنے کسی کی تلاش میں دبے پاؤں پھر رہا ہے اور وہاں سے لائبریری کی ہر ایک چیز کو آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ میں کھڑکیاں بند نہیں کر سکتا اور اُن کے پردے بھی نہیں گرا سکتا کیونکہ اگر کوئی بُری بات خدا نہ کرے پیش آئی تو آپ صرف انہی کھڑکیوں سے بھاگ سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو کھڑکی سے کُود کر اپنے کمرے میں چلی جائیے اور اگر حسبِ اُمید سب ٹھیک رہا تو معمولی طور پر بالاخانہ سے اپنے کمرے میں چلی جائیے۔ وہاں آکر میں آپ سے نقشہ لے لوں گا۔ اطمینان اور آہستگی سے کام کیجئے کامیابی عطا کرنے والا خُدا ہے۔ میں پالٹس کو کمرے کی دوسری طرف لے جا رہا ہوں، جب آپ مجھے یہ کہتے ہوئے سنئیں "وہ ہے وہاں جھاڑی میں" تو آپ خاموشی کے ساتھ لائبریری میں جا کر اپنا کام شروع کر دیجئے"۔

فرانسس بیٹھک میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ اُس نے والڈر اور پالٹس کے ہال سے نیچے اترنے کی آواز سُنی اور جب وہ سامنے کے دروازہ سے نکل گئے تو چپکے سے لائبریری میں چلی گئی۔ آہنی تجوری کو دیکھنے کے لئے کمرے میں کافی روشنی تھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ حروف کے ڈائل پر رکھ لیا اور والڈر کی آواز کا انتظار کرنے لگی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ ڈائل پر انگلیوں کے نشان نہ رہ جائیں کیونکہ اس میں پہچانے جانے کا خوف تھا اس لئے اُس نے دستانے پہن رکھے تھے۔

والڈر کی آواز آئی اور فرانسس اپنا کام کرنے لگی، لیکن ابھی آہنی تجوری کو کھولا بھی نہ تھا کہ کسی کے ہال پر سے اترنے کی آواز کان میں آئی۔ فرانسس سمجھ گئی کہ پالٹس آرہا ہے اور فوراً کُھلی کھڑکی سے پھلانگ کر بالاخانہ پر چلی گئی۔ جب وہ دوڑ رہی تھی تو اُس کے جوتے کی ایڑی کسی چیز میں پھنس گئی اور وہ گرتے گرتے بچی۔ ایک جھٹکے سے اپنا پاؤں تو نکال لیا مگر جوتے کی ایڑی علٰحدہ ہو گئی۔ ٹھہر کر ایڑی اُٹھانے کی جرات کیونکر کرتی تعاقب کرنے والا سر پر آموجود ہوتا وہ بھاگتی رہی حتےٰ کہ اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔

کسی کی پیچھے دوڑنے کی آواز سُن کر فرانسس سمجھ گئی تھی کہ یقیناً پالٹس ہے اور ڈرنے لگی تھی کہ خواہ اُس نے نہ بھی دیکھا ہو پھر بھی ایڑی میرا جُرم ثابت کر دے گی۔ جوتا لئے حیران پھر رہی تھی کہ کہاں چھپائے۔ اتنے میں چور

دروازہ کھُلا اور اُس میں سے والڈر آنکلا۔ اُس نے کہا۔

"یہ جُوتے مجھے دے دیجئے اور آپ دوسرا جوڑا پہن لیجئے۔" وہ دو ایک منٹ میں یہاں آنے والے ہیں۔

جُوتے لے کر والڈر اُسی چور دروازے سے غائب ہو گیا۔

فرانسس نے دوسرے جوتے پہنے ہی تھے کہ دروازہ سے کھٹ کھٹ کی آواز آنے لگی۔ جا کر دروازہ کھولا اور یالٹس کو کھڑے پایا۔

"کیوں کیا بات ہے، مسٹر یالٹس؟" اُس نے ایسی سنجیدہ آواز سے کہا جیسے سنجیدہ اس کے چہرے کے نقوش تھے "آپ ہانپ رہے ہیں!"

یالٹس نے اُسے سر سے پاؤں تک خوب تاڑ تاڑ کر دیکھا۔

"گھر میں چور تھا، مس ہارڈی! اگر یہی عورت ——— میرا خیال ہے وہ اس راستہ سے آئی ہے آپ نے تو نہیں دیکھی، نہ آواز سُنی ——— یا سُنی ہے؟"

"نہیں۔ میں تو کوئی دس منٹ ہوئے یہاں آئی ہوں ——— میں لیڈی چیمپٹن کے پاس گئی تھی یہ دریافت کرنے کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، مگر وہ سو رہی تھیں۔ ابھی وہاں سے آئی تھی کہ آپ نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا ———"

یالٹس نے نہایت تیزی سے کہا "تو شاید آپ کے کمرے میں گھُس گئی ہو جب کہ آپ کمرے میں موجود نہ تھیں کہیں یہیں چھُپ رہی ہو گی۔"

فرانسس نے اُس کی عقلمندی کی دل ہی دل میں تعریف کی۔ یالٹس اُس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ مگر چور کے لئے نہیں، بے ایڑی کے جُوتے کے لئے۔

اُس نے ایک خاص لہجہ میں کہا "اچھی طرح تلاش کر لیجئے، مسٹر یالٹس! اغلب ہے کہ چارپائی کے نیچے سے مل جائے۔"

وہ دل مضبوط کئے کھڑی رہی اور یالٹس کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ گو سب سے پہلے اُس نے جُوتوں پر نظر ڈالی جو فرانسس پہن رہی تھی کہ آیا دونوں کے ایڑیاں ہیں۔

جب یالٹس نے ایک چھوٹی سی الماری کھولی جس میں ایک کم سن بچہ بھی نہ چھُپ سکتا تھا تو وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگی اور ساتھ ہی یہ خیال کرنے لگی کہ اگر والڈر جوتے نہ لے جاتا اور اسے مل جاتے تو کیا ہوتا ———"

آخر یالٹس نے کہا "وہ کہیں بھی ہو مگر اس وقت اس کمرے میں نہیں۔ معاف کیجئے مس ہارڈی میں نے

بے وقت آپ کو بڑی تکلیف دی۔"

فرانسس پالٹس کی چالاکی پر ہنسنے لگی، کیونکہ اُس کے یہ الفاظ جب آپ کمرے میں موجود نہ تھیں اور اس وقت "کچھ اور معنے بھی رکھتے تھے۔

اُس نے کہا "میں آپ کے تشریف لانے سے بہت خوش ہوئی۔ چور یہیں چھپا رہتا"

وہ کمرے سے باہر چلی گئی اور اس طرح پالٹس کو تلاشی لینے کا دوسرا موقع دے دیا اور اس نے کوشش بھی کی مگر جیسا کہ فرانسس کو یقین تھا اُسے کچھ نہ ملا، یہاں تک کہ پستول کو بھی والڈر نے زینہ کے نچلے حصہ میں چھپا رکھا تھا۔

فرانسس بیٹھک میں گئی فوراً ہی والڈر بھی بہ ظاہر کھڑکیاں بند کرنے اور پردے گرانے کے لئے وہاں آ گیا۔

اُس نے کہا "پالٹس کو ہم دونوں پر شبہ ہے"۔ وہ جنرل ہیولیٹ سے کہہ رہا تھا اس کے متعلق۔ ـــــــ آدھی رات گزرنے پر آپ ایک مرتبہ پھر کوشش کیجئے۔ اس دفعہ آپ ضرور کامیاب ہو جائیں گی کیونکہ وہ دونوں میرا تعاقب کر رہے ہوں گے۔"

والڈر باہر گیا ہی تھا کہ آرتھر چیمپٹن داخل ہُوا۔

اُس نے کہا "میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں مس ہارڈی" بہت ضروری باتیں"۔

فرانسس نے کہا "شوق سے فرمائیے"

"آپ کیوں نہیں مان لیتیں کہ آپ وہی نرس ہیں جسے میں نے ڈیولے ولی میں دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے اس انکار میں کوئی خاص راز ہے"

فرانسس معاملہ کی اہمیت پر بہت تیزی سے غور کرنے لگی۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر اب بھی انکار کر دیا تو آرتھر کو یقین نہ آئے گا اور ممکن ہے اس کا شبہ اتنی ترقی کر جائے کہ یہ اپنے والد کو اور سب کو بتا دے اس لئے اقرار کر لینا ہی بہتر ہے۔

"جی ہاں میں وہی نرس ہوں جسے آپ نے ڈیولے ولی میں دیکھا تھا اور میں وہی نرس ہوں جو آپ کے بھائی کے پاس جب وہ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے، موجود تھی۔ میں اب تک اس بات کے ماننے سے کیوں انکار کرتی رہی اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دراصل برطانی خفیہ پولیس کے محکمے کی ایجنٹ ہوں۔ اور اگر یہ بات ظاہر ہو جائے تو میری یہاں کی ساری محنت اکارت جائے گی ـــــــ مجھے آپ کی نیک ذات سے توقع اُمید ہے کہ آپ ایک شریف آدمی اور سچے محب وطن کی حیثیت سے اس راز کو افشا نہ کریں گے۔"

فرانسس اُس کے قریب آگئی اور اپنی انگشتری دکھانے لگی۔

"یہ ہے میری ملازمت کی نشانی، اب تو اعتبار کرتے ہیں مجھ پر؟"

نوجوان افسر نے پرجوش انداز میں کہا "مجھے آپ پر اعتبار ہے"۔ اُس کی آنکھیں کچھ اس طرح چمکنے لگیں کہ فرانسس کو راز افشا ہونے کا خوف بالکل نہ رہا ـــــــ صاف ظاہر تھا کہ اُسے فرانسس سے محبت ہوگئی تھی اور بے انتہا محبت۔

فرانسس نے پوچھا "آپ وعدہ کرتے ہیں کہ کسی کو نہ بتائیں گے"

"ہاں میں صدقِ دل سے وعدہ کرتا ہوں"

وہ اپنی محبت کا اظہار الفاظ میں کرنے سے باز رہنے کی بے سود کوشش کرتا رہا۔ اُس نے اپنے والد سے ملنے کے متعلق ہچکچاتے ہوئے کچھ کہا اور چلا گیا۔

جب دروازہ بند ہُوا والڈر پھر پردوں میں سے نکل آیا۔

اُس نے ترشی سے کہا "آپ اس نوجوان سے محبت کرتی ہیں اور اس کے لئے مادرِ وطن سے دغا کریں گی"۔

فرانسس والڈر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔

"بیوقوف نہ بنیئے والڈر! بیوقوف نہ بنیئے ـــــــ تمام دنیا میں ایک آپ ہیں جس سے میں محبت کرتی ہوں ـــــــ تعجب ہے کہ آپ میرے اس راز سے اب تک کیوں بے خبر رہے"۔

والڈر کی آواز میں نرمی آگئی اور نظر میں بھی۔

اُس نے کہا "مجھے اس بات کا اب یقین ہُوا ہے۔ میں آپ کی نظروں سے دھوکا نہ کھا سکا گو وہ سچی اور ـــــــ"

اُس نے فرانسس کو اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ بھی نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس سے لپٹ گئی۔

"مجھے بھی آپ سے محبت ہے۔ مجھے بھی آپ سے محبت ہے" وہ یہ الفاظ کہتا رہا اور اُس کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمکنے لگیں۔

کچھ دیر کے لئے اِس نئی دنیا میں جو صرف انہیں سے تعلق رکھتی تھی پہلی مرتبہ قدم رکھ کر وہ اپنے فرض کو بھی بھول گئے اور محبت کی کہانی ـــــــ وہی پرانی کہانی دہرانے لگے جو ہمیشہ دو آدمیوں کو نئی معلوم ہوتی ہے

پھر والڈر نے ایک آخری بوسہ لیا اور اپنے فرض کی تکمیل کی طرف لوٹا۔

اُس نے کہا "آدھی رات کو کوئی اندیشہ نہ کرنا اس مرتبہ آپ کے کام میں کوئی خلل انداز نہ ہوگا۔ وہ میری کچھ

ہال کر رہے ہوں گے اور میں انہیں لائبریری سے بہت دور لے جاؤں گا۔"

وہ حسبِ معمول کمرے سے خاموش رفو چکر ہو گیا۔

جب فرانسس اکیلی رہ گئی تو اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا اور سامنے دیوار میں آنکھیں گاڑ دیں مگر کچھ دیکھ نہ رہی تھی۔

"مجھے اس سے محبت ہے ——— ضرور ہے" وہ خود کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "مگر یہ بات نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرنی چاہیئے۔"

یہ الفاظ ایک ایسی ہستی کے منہ سے نکلنا جو چند لمحے پہلے ——— ہاں صرف چند لمحے پہلے زمین کی اس بہترین بہشت کے مزے، جو صرف محبت عنایت کر سکتی ہے، لُوٹ چکی ہو کتنا تعجب خیز ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب فرانسس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے ہوتا تھا۔ وہ چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے فرطِ انبساط سے تمتما رہا تھا جب والڈر نے اُسے آغوش میں لے رکھا تھا اب مردہ اور زرد سا نظر آتا تھا۔ اور وہ آنکھیں جو محبت کے جوش سے چمک رہی تھیں اب خوف اور مایوسی کی وجہ سے ڈراؤنی اور سیاہ معلوم ہوتی تھیں۔

فرانسس کرسی پر سے اُٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"یہاں سے ضرور چل دینا چاہیئے" وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ "باغ میں سے ——— گلی میں پہنچنے کی دیر ہے، پھر میں محفوظ ہو جاؤں گی ——— ہاں بس ایک یہی راستہ ہے۔"

اُس نے گھنٹے پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے میں صرف چار منٹ باقی تھے۔ مکان سے کسی قسم کی کوئی آواز نہ رہی تھی۔ جس سے اُس نے یہ اندازہ کر لیا کہ والڈر جنرل ہیولیٹ اور پالٹس کو چکمہ دے کر دوسری طرف لے گیا ہے وہ ایک پراسرار اسٹول کے پاس گئی اور ایک سپرنگ کو ہلا کر اس کے تلے میں سے گیتوں اور غزلوں کی فہرست کو ایک طرف کیا اور اپنا پستول نکال لیا اور خوب غور سے دیکھ کر اپنے لباس میں چھپا لیا۔

ادھر گھنٹہ نے بارہ بجائے اور ادھر فوراً وہ لائبریری کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس مرتبہ جیسا کہ والڈر نے وعدہ کیا تھا کوئی اس کے کام میں حارج نہ ہُوا۔

چند لمحوں میں اُس نے راستے کے نقشہ کی نقل نکال لی اور بڑی احتیاط سے اپنی جیب میں چھپا کر آہنی الماری کو بند کر دیا اور خود تیزی سے ہال میں سے ہوتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں سے دو کھڑکیاں باغ میں کھلتی تھیں۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور بھاگنے لگی۔

چند گز دوڑنے کے بعد اسے محسوس ہُوا کہ کوئی اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اب فرانسس نے مُڑ کر دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ باغ کے چاروں طرف خاردار جھاڑیوں کی باڑ تھی

اُس نے خیال کیا کہ وہاں جھاڑیوں میں چھپ جاؤں گی اور تعاقب کرنے والے کو کچھ پتا نہ چل سکے گا لیکن وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچی ہی تھی کہ کسی نے اُس کے شانے کو پکڑ کر ہلانا شروع کیا۔

فرانسس اب سمجھی کہ یہ آرتھر چیمپٹن ہے۔

اُس نے ہانپتے ہوئے کہا آپ اس طرح بچ کر نہیں جا سکتیں آپنے مجھے خوب دھوکا دیا تھا ــــ میں اب سمجھا کہ آپ کون ہیں ـــــــ آپ جرمنی کی جاسوس ہیں اور والڈر آپ کا ساتھی ہے۔

فرانسس اندرونی طور پر بہت خائف تھی مگر جب اُس کی آنکھیں نوجوان افسر سے چار ہوئیں اس نے اپنے بُشرے سے کسی قسم کے خوف کا اظہار نہ ہونے دیا۔

اُس نے نہایت حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ آپ نشہ میں ہیں یا پاگل ہو گئے"۔

"نہ میں نشہ میں ہوں اور نہ پاگل" آرتھر چیمپٹن نے غصہ میں کہا ہاں آپ کے حسُن نے پاگل بنا دیا تھا مگر اب میرے ہوش وحواس بالکل درست ہیں ـــــ آپ کو میرے ساتھ مکان کو واپس چلنا ہو گا"

اُس نے یہ کہہ کر فرانسس کا بازو پکڑ لیا لیکن فوراً ہی والڈر جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ اُس نے آتے ہی اپنا ہاتھ اُٹھایا اور پستول کی گولی آرتھر چیمپٹن کی پیشانی میں جا کر لگی۔ نوجوان افسر بغیر کسی چیخ پکار کے زمین پر گر پڑا۔ والڈر نے اُسے کھینچ کر جھاڑیوں میں چھُپا دیا اور خود فرانسس کے قریب آکر کہنے لگا۔

"جلدی چلیئے۔ وقت بہت کم ہے"

فرانسس کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھر کے باہر والے دروازے سے اور پھر ایک چور دروازہ سے اندر لے گیا اور دونوں گودام میں پہنچ گئے۔

"آج کی رات کے کام سے ہم نے زندگی کی تمام مسرتوں کو اپنے قابو میں کر لیا" والڈر کہنے لگا جرمنی میں پہنچ جانے پر فوراً ہماری شادی ہو جائے گی۔ پھر ہم آرام سے شادی کے بعد کا پُر لطف مہینہ اپنی "عشرت منزل" میں گزار دیں گے"۔

وہ باتیں کرتا جاتا تھا اور ساتھ ہی پوشیدہ اسپرنگوں کے بٹن بھی دبا رہا تھا۔ فوراً دیوار کا ایک حصہ سرک کر دوسری جگہ ہو گیا اور ایک غار بن گیا جس میں بے تار برقی کا سٹ لگا ہوا تھا۔

اُس نے کہا" وہ نقشہ لائیے ـــــــ مجھے دے دیجئے"۔

فرانسس نے کہا ایک منٹ ٹھہریئے۔ اب تک میں نے جو کام کیا اُس میں ان ہدایات سے کام نہیں لیا جو مجھے بڑے دفتر سے دی گئی تھیں ـــــ مجھُ سے کہا گیا تھا کہ جو نقشہ وغیرہ تم حاصل کرو وہ ہیڈ بلیکر کے

سوا جو خفیہ محکمہ کا ممتاز افسر ہے، کسی کو نہ دینا۔

والڈر مسکرانے لگا۔

"مجھے آپ کی عقلمندی اور ہوشیاری کا اعتراف ہے۔ آپ اب تک خود کو دلیر ایجنٹ ثابت کرتی رہی ہیں۔ اور اب آپ کی اس بات سے ظاہر ہے کہ آپ قابل اعتماد بھی ہیں اور چالاک بھی۔ یہاں تک کہ جس سے آپ کو بے حد اُنس ہے اُس کے لئے بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ——— اچھا میں ہی بلیکر ہوں"۔

اُس نے چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر دکھائی اور کھول کر اندر سے لوہے کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر ایک لفظ کندہ تھا۔

"اُس انگوٹھی سے کتنا مختلف ہے یہ جس سے آپ نے نوجوان افسر کو اُلو بنایا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ اصلی ہے"۔

والڈر نے کہا "اب نقشہ لائیے۔ آپ کی جیب میں چیک رہا ہوگا۔ کھو تو نہیں گیا؟"

اُس نے خاکا لے کر بے تار برقی کے آلے پر اپنا کام شروع کر دیا۔

"والڈر! ٹھہریئے!" فرانسس چلائی۔

والڈر نے کچھ سختی سے کہا "وقت ضائع نہ کیجئے"۔

فرانسس نے زور دیتے ہوئے کہا "آپ کو ٹھہرنا پڑے گا یہ پیغام نہیں بھیجا جاسکتا"۔

"آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"میرا مطلب ——— یہ ہے کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور میں جانتی ہوں کہ آپ کو بھی مجھ سے محبت ہے۔ اس خاکے کو پھاڑ ڈالیئے اور آیئے اس جگہ سے دونوں بھاگ چلیں"۔

والڈر نے نفرت سے کہا "پاگل ہوگئی ہیں؟"

میں پاگل نہیں خدا کے لئے سُنیئے، مجھے آپ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں لیکن میں انگریزی نسل سے ہوں اور "برٹش سیکریٹ سروس" کی ممبر بھی۔ اگر آپ نے اس پیغام کے دینے کی ذرا بھی کوشش کی تو میں آپ کو جان سے مار ڈالوں گی"۔

فرانسس نے یہ کہتے ہی اپنا پستول نکال لیا اور والڈر کی طرف شست باندھ لی۔

والڈر نے کچھ جواب نہ دیا اور کسی کو مطلع کرنے کے طور پر اُس آلہ پر کچھ کہنے لگا۔

"خطرہ" جوش میں اُس کی زبان سے نکلا۔

فرانسس جانتی تھی کہ قریبی جگہ پر کسی جرمن نے اس کا مطلب سمجھ لیا ہے۔ اب حیل و حجت کرنے کا وقت

نہیں۔ ایک طرف والڈر کی محبت ہے اور دوسری طرف وطن کا عشق۔

فرانس نے گولی چلادی۔

والڈر کی انگلیاں آلے پر سے پھسل گئیں۔ ایک لمحہ کے لئے وہ بے تار برقی کی مشین پر بہت مضحکہ خیز طریقہ سے جھک گیا اور پھر فرش پر گر پڑا۔ فرانس نے پستول کو جس میں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا ایک طرف پھینک دیا اور خود والڈر کے قریب بیٹھ گئی۔ نہایت آہستگی سے اُس کا سر اُٹھایا اور اپنے زانو پر رکھ لیا اور روتے ہوئے بولی

"مجبوراً آپ سے ایسا سلوک کرنا پڑا"

والڈر کے لبوں پر ایک دلفریب تبسم کھیلنے لگا۔

اُس نے کہا "میں نے آپ کو معاف کیا۔ میں بھی ایسا ہی کرتا اگر آپ کی جگہ ہوتا ـــــــ میں آپ کا انتظار کروں گا ـــــــ عشرت منزل میں ـــــــ"

(ترجمہ)

ظفر واسطی
(شاہ آبادی)

مُغنیّہ

تیرے عشق افروز اور جاں سوز نغموں کی قسم ـــ تیرے خوش آہنگ اور دلدوز نغموں کی قسم
تیرے صہبا ریز، وجد آموز نغموں کی قسم ـــ تیرے کیف آور طرب انداز نغموں کی قسم

جب دلوں کو سحر زا نغموں سے تڑپاتی ہے تُو ـــ جب رگوں میں زندگی کا خون دوڑاتی ہے تُو
بزم کو جب راگ کی حدّت سے گرماتی ہے تُو ـــ غرق ہو کر بحرِ موسیقی میں جب گاتی ہے تُو

گیت کے طوفاں میں بہہ جاتی ہے ساری کائنات
ایک نغمہ بن کے رہ جاتی ہے ساری کائنات

اختر انصاری دہلوی

غزل

وہ الفت آفریں ہونگے نئے جب تیغ کیں ہونگے
جفا و جور کے انداز سارے دلنشیں ہونگے

کسی کے جانستاں غمزے کچھ ایسے دلنشیں ہونگے
کہ رفتہ رفتہ شمشیرِ قضا کے سب قریں ہونگے

ثبوت اپنی وفاداری کا دیں گے قابلِ تحسیں
وہی جو کوچۂ جاناں میں پیوندِ زمیں ہونگے

وجودِ اہلِ محفل پر عدم ہی کا گماں ہوگا
نہ ہوگا کوئی محفل میں جو وہ محفل نشیں ہونگے

بہارِ دامنِ گلچیں دکھائیں گے مرے آنسو
ٹپک کر خون کے قطرے طرازِ آستیں ہونگے

وفا کی قدر کیا ہو اُن کی چشمِ بے مروّت کو
جفا وہ کرتے جائیں گے مگر نادم نہیں ہونگے

تجلی اُن کی ہو محدود اگر مجھ تک تو بہتر ہے
کہ میں خلوت نشیں ہونگا جو وہ محفل نشیں ہونگے

سبکروحوں کو سیرِ عالمِ امکاں سے کیا مطلب
نہ زیرِ آسماں ہونگے نہ بالائے زمیں ہونگے

لبِ مشتاق عرضِ شوق میں طوفاں اُٹھائیں گے
اگر پرسش پہ مائل اُن کے پائے نازنیں ہونگے

عتاب اُن کا نہ روکے گا ہمارے شوقِ بیحد کو
ہمیں وہ اور شہ دیں گے اگر چیں بر جبیں ہونگے

کسی دن کوئی گستاخی کسی سے ہو ہی جائے گی
کسی کے عشوۂ پنہاں جو یوں شوق آفریں ہونگے

کلامِ حضرتِ غالب سے وحشت فیض کا خرمن
جہاں اہلِ سخن ہونگے اُسی کے خوشہ چیں ہونگے

رضا علی
وحشت کلکتہ

کہکشاں

آسماں ہے محفلِ ہستی میں مے خانہ مرا ۔۔۔ کہکشاں میری صراحی چاند پیمانہ مرا

آغا حشر کاشمیری

زمانۂ قدیم میں ستاروں کے اُس عظیم الشان دُور و دراز مجموعے کے متعلق جسے ہم کہکشاں کہتے ہیں طرح طرح کے افسانے بیان کئے جاتے تھے۔ ستاروں اور ستّاروں کی حقیقت کو تخیّل کی بلند پروازیوں سے بیان کرنے میں یونانیوں کو کمال حاصل تھا۔ مظاہرِ قدرت کی ہر شئے کے لئے کوئی نہ کوئی رُومانی افسانہ اُن کے پاس ضرور موجود تھا۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ کہکشاں آسمان میں ایک رَوزن ہے جس کے ذریعہ سے صفحۂ ہستی پر نور کی بارش کی جاتی ہے، یا یہ کہ کہکشاں فرشتوں کی آمد و رفت کے لئے ایک راستہ ہے جو بہشت کو جاتا ہے۔ خیالات کی یہ بلند پروازی یُونانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ ہر ملک میں قدرتی مناظر کے متعلق تخیّلی افسانے موجود تھے۔ فرانسیسیوں کا خیال تھا کہ کہکشاں ان مشعلوں کی روشنی ہے جنہیں فرشتے اپنے ہاتھوں میں لئے کھڑے رہتے ہیں اور انسان کو بہشت کا راستہ دکھاتے ہیں۔ سویڈن کے باشندوں کا ایک جدید شاعرانہ تخیّل ہے کہ سیلاَمے اور ذُولاَمیتھ کا باہمی عشق کہکشاں کی بنیاد کا باعث ہُوا۔ یہ دونوں دو متفرق ستاروں پر رہتے تھے چنانچہ ایک ہزار سال کی محنت میں انھوں نے کہکشاں کا پُل تیار کر لیا تھا جس کے ذریعے سے وہ ایک دوسرے سے ملاقات کر سکتے تھے۔

چینیوں اور جاپانیوں کا خیال تھا کہ کہکشاں ایک دریا ہے۔ اِن مُلکوں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ لامیرا[1] اور اکوئیلا[2] نے اپنی شادی کے بعد اپنے فرضِ منصبی کی ادائی میں کوتاہی شروع کر دی۔ اُس کی سزا میں دیوتاؤں نے ان دونوں کے درمیان یہ دریا حائل کر دیا اور انہیں صرف سال کے ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو ملاقات کرنے کی اجازت دی۔ یہ تاریخ جولائی کے مہینے میں واقع ہوتی ہے۔ اگر رات کے وقت مطلع صاف ہو تو کہکشاں کو ہم بہت وضاحت سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ ابابیلیں آسمان میں بہت بلندی تک اُڑ کے چلی جاتی ہیں اور اسی جانب کو اُڑتی ہیں جدھر کہکشاں

---

[1] و [2] ستاروں کے نام ہیں۔

کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ اِن چڑیوں کو کہکشاں کی نرم روشنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جاپانی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چڑیاں دریائے کہکشاں پر ایک پُل بنا لیتی ہیں جس کے ذریعہ سے لائرا اور اکوئلا میں ملاقات ہو سکتی ہے۔ مگر برسات کے زمانہ میں جب بارش ہوتی رہتی ہے اور آسمان پر گرد و غبار ہوتا ہے تو کہکشاں نظروں سے چھُپ جاتی ہے اور ابابیلیں آسمان کی جانب نہیں اُڑتیں۔ ایسے موقعہ پر جاپان اور جزیرہ کوریا کے باشندے ان چڑیوں کو ڈھیلے مار مار کر اُڑا دیتے ہیں گویا ان کو اپنا فرضِ منصبی یاد دلانے کے لئے۔

شاعروں نے بھی کہکشاں کے متعلق خیال آرائیاں کی ہیں۔ ملٹن کہکشاں کی یوں تعریف کرتا ہے:-

"کشادہ سڑک جس کی خاک سونے کی ہے، اور جو ستاروں سے مِل کر بنی ہے وُہ ستارے جنہیں تم ستارے سمجھتے ہو"۔

اُوِیڈ کہکشاں کو ایک شاہراہ سے مشابہت دیتا ہے۔ جس کی اینٹیں ستاروں سے بنی ہیں۔

اکثر صاف و شفاف راتوں کو میں اِس آسمانی دریا کی سیر کرنے لگتا ہُوں۔ ہاں محض جنبشِ نظر سے چشم زدن میں اِس پُر اسرار منظر کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ آہ! لائیرا اور اکوئیلا ایک دوسرے کے لئے بیقرار ہوں گے۔ مگر سیلامے اور دولامیتھ کا کیا حال ہوگا؟ ہزار سال کی محنت کے بعد اُنھوں نے یہ پل تیار کیا ہے! کہکشاں واقعی کوئی پُل ہے؟... فرشتوں کی آمد و رفت کا کوئی راستہ ہے؟ گُنبد گردُوں میں روزن ہے جس کے ذریعہ ہم عالمِ بالا کی سیر کرتے ہیں؟ یا شاعروں کے خیالاتِ پریشان کی وادی ہے؟ جذبات نورانی اجسام کی شکل میں مُبدّل ہو گئے ہیں؟..... تخیّل کا سرچشمہ؟ ...... نورانی دریا جس میں ستاروں کی کشتیاں بہہ رہی ہیں؟..... میں نہیں کہہ سکتا۔

ممکن ہے کہ کہکشاں فضائے بسیط میں ایک وسیع میدان ہو جس میں نقرئی پھُولوں کی کھیتیاں آباد ہوں اور اِن کھیتیوں کا کِسان خود خدا ہو!

آرزُو جلیلی

اصلاحِ ادب

(۴)

بہ سلسلۂ اشاعت جولائی

نثر

فقرہ - میاں سائیس گاڑی کو کھڑی کرو۔
اصلاح - میاں سائیس گاڑی کھڑی کرو۔
وجہ - گاڑی کو کھڑی کرو میں "کو" کا استعمال غلط ہے۔ اگر "کو" ضرور لکھنا ہو۔ تو گاڑی کو کھڑا کرو لکھیں گے۔ اسی طرح "ضروریات کو پورا کرو" اور "ضروریات پوری کرو" صحیح ہے۔

فقرہ - اجی قبلہ! میں آپ کا تابعدار ہوں۔
اصلاح - اجی قبلہ! میں آپ کا خادم ہوں۔
وجہ - "تابعدار" کی ترکیب غلط ہے۔ لفظی معنوں پر قیاس کیا جائے تو اس کے معنی "آقا" یا "مخدوم" کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خادم کا محل ہے۔

فقرہ - انجمن کے عہدہ داران اور دوسرے ملازمان کو ایثار سے کام لے کر حسب استطاعت اس کی مالی امداد کرنی چاہیئے۔
اصلاح - انجمن کے عہدہ داروں اور ملازموں کو ایثار سے کام لے کر حسب استطاعت اس کی مالی امداد کرنی چاہیئے یا عہدہ داران و ملازمانِ انجمن کو ایثار سے کام لے کر حسب استطاعت اس کی مالی امداد کرنی چاہیئے
وجہ - "عہدہ داران" اور "ملازمان" میں فارسی قاعدے سے جمع بنائی گئی ہے۔ اور اس جمع کو اردو میں فارسی ترکیب کے بغیر استعمال کرنا غلط ہے۔

فقرہ - میں اس مقدمے میں آپ کی باعزت بریت پر مبارک باد دیتا ہوں۔
اصلاح - میں اس مقدمے میں آپ کے باعزت بری ہونے پر مبارک باد دیتا ہوں۔

وجہ۔ "بریت" کوئی لفظ نہیں البتہ "برارت" صحیح ہے۔

فقرہ۔ ڈپٹی کمشنری کے عہدے پر آپ کی تقرری کا مژدہ سُن کر دلی خوشی حاصل ہوئی۔

اصلاح۔ ڈپٹی کمشنری کے عہدے پر آپ کے تقرر کا مژدہ سُن کر دلی خوشی حاصل ہوئی۔

وجہ۔ تقرری میں "ی" کا اضافہ غلط ہے۔

فقرہ۔ وہ معترف ہے کہ اس نے یہ کتاب تالیف کرتے وقت عربی کی متعدد بیش بہا کتابوں سے استفادہ حاصل کیا ہے

اصلاح۔ وہ معترف ہے کہ اُس نے یہ کتاب تالیف کرتے وقت عربی کی متعدد بیش بہا کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

وجہ۔ استفادہ میں خود حصول کے معنی مضمر ہیں۔ لہٰذا اس کے آگے حاصل لکھنے کی ضرورت نہیں اسی طرح "استمداد حاصل کرنا" غلط اور "استمداد کرنا" صحیح ہے۔

فقرہ۔ دنیا کو عالم وجود میں آئے ہوئے لکھوکھہا سال گزر چکے ہیں۔

اصلاح۔ دنیا کو عالم وجود میں آئے ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں۔

وجہ۔ لکھوکھا سراسر غلط ہے۔ جسے محض عوام بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس سے سخت احتراز چاہیئے۔

فقرہ۔ لندن انگلستان کا دارالخلافہ ہے

اصلاح۔ لندن انگلستان کا دارالحکومت ہے۔

وجہ۔ دارالخلافہ (دارالخلافت) ایک خاص لفظ ہے۔ جو خلافت اسلامیہ کے زمانے میں وضع کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں "دارالحکومت" "پایۂ تخت" وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا۔ اب خلافت تو قائم نہیں رہی اس لئے اگر یہ لفظ صرف اسلامی سلطنتوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو انسب ہے۔

یہ میری ذاتی رائے ہے باقی حضرات کو اختیار ہے

فقرہ۔ میں مدت سے اس کتاب کا متلاشی تھا۔ الحمدللہ کہ آج آپ کی بدولت اس کے مطالعے کا موقع مل گیا۔

اصلاح۔ میں مدّت سے اس کتاب کی تلاش میں تھا۔ الحمدللہ کہ آج آپ کی بدولت اس کے مطالعے کا موقع مل گیا۔

وجہ۔ عربی دان ہندیوں نے ترکی کے لفظ "تلاش" سے عربی قاعدے کے مطابق متلاشی بنا لیا۔ جسے عوام اندھا دھند استعمال کرنے لگے۔

میں نے اردو کے صرف ایک مسلّم الثبوت ادیب و مستند انشا پرداز کی تحریر میں یہ لفظ دیکھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے غلط العام قرار دے کر فصیح ٹھہرا لیا جائے یا غلط العوام سمجھ کر ترک کر دیا جائے۔ اس

کے جواب میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر اس کی بجائے ایک ہی لفظ لکھنا ہو تو "تماشی" یا "متجسس" "جویا" ہو
لکھنا چاہیئے۔ مرزا داغ مرحوم فرماتے ہیں ؎

جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشم شوق   خلوت میں اس طرح ہے کہ خلوت گزیں نہیں

جب فصیح الملک مغفور جیسے مستند شاعر و زبان داں نے "تلاشی" کو "تلاش کرنے والا" کے معنوں میں لکھا
تو کسی کو اس کی فصاحت میں گنجائش کلام نہیں ہونی چاہیئے۔ میں بلاوجہ بعض الفاظ کو ترک کر کے زبان کا
تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ میری دلی آرزو ہے کہ ہماری زبان وسیع و عالمگیر ہو جائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتا
ہوں کہ اس کے بلند و برتر معیارِ فصاحت میں فرق نہ آنے پائے۔ لہذا جاہل عوام کے خود تراشیدہ لغوالفاظ
تراکیب کی سختی سے مخالفت کر رہا ہوں اور یہی میرے اس مضمون کی علت العلل ہے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ ہندی الفاظ اردو قواعد کے سانچے میں ڈھال کر مختلف طریق پر استعمال نہ کیے جائیں
بلکہ میں اس کا زبردست موید ہوں۔ جس طرح عربی داں فارسی والوں نے عربی قواعد کے خلاف "عتاب"
سے "معتوب"۔ "خان" سے "خوانین" اور "خاتون" سے "خواتین" وغیرہ بنالیا ہے۔ اسی طرح ہماری زبان کے
عربی داں حضرات نے بھی "ارقام" اور "تہدیہ" وغیرہ کے الفاظ تراش لئے ہیں۔ جو اب بیش بہا جواہرات بن کر
اردو کے خزانے میں جگمگا رہے ہیں۔ جب عربی والوں نے فارسی سے "ترزبان" کا لفظ لے کر اسے ترجمان
بنالیا۔ اور پھر اسے اپنے قواعدِ زبان کے سانچے میں اس طرح ڈھال لیا کہ اس پر تعریب کا گمان تک
نہیں ہوتا۔ یعنی باب دَحْرَجَ یُدَحْرِجُ پر لاکر اس سے ترجمہ اور مترجم جیسے لفظ بنالئے۔ تو مستند
اردو والوں کو "ارقام" اور "تہدیہ" جیسے الفاظ بنانے کا کیوں حق حاصل نہیں۔ بے شک پورا پورا حق حاصل
ہے۔ لیکن بات صرف یہ ہے کہ جو غلط الفاظ عوام ہی تک محدود رہے اور غلط العام کے درجے تک نہیں
پہنچ سکے وہ بدستور غلط کے غلط رہے اور جنہیں غلط ہونے کے باوجود یہ درجہ مل گیا وہ درست و صحیح قرار پائے
مثلاً "منشی۔ مجرب اور مرغن" غلط العوام ہونے کے باعث غلط اور "ارقام" اور "تہدیہ" غلط العام ہونے کی
وجہ سے صحیح ہیں۔ اگر "تلاشی" کو بھی غلط العام کا درجہ دے دیا جائے تو یہ بھی بلاتامل صحیح و فصیح قرار پاسکتا ہے۔

نظم

شعر

مشتاق سب ہیں بدر سے زیادہ ہلال کے
دنیا میں قدر داں نہیں صاحب کمال کے

اصلاح

مشتاق سب ہیں بدر سے بڑھ کر ہلال کے

دنیا میں قدر داں نہیں صاحب کمال کے

یہ۔ زیادہ (زیادۃ) عربی ہے۔ لہٰذا ہندی الفاظ کی طرح اس کی "یا" کا اخفا غلط ہے۔

ز۔ وہ شوہر کے لئے قربان ہوئی تھی جوشِ الفت میں
اگرچہ رنج وغم سے ہو رہی تھی زرد سر تا پا

ملاح۔ وہ شوہر کے لئے قربان ہوئی تھی جوشِ الفت میں غم و اندوہ سے گو ہو رہی تھی زرد سر تا پا

یہ۔ اگرچہ میں "ہ" کا اعلان غلط ہے۔

م۔ کیوں حریصِ منّتِ دربان ہوں...
ہم نہیں مکھی ہیں دسترخوان کی

ملاح کیوں حریصِ منّتِ دربان ہوں...
ہم کوئی مکھی ہیں دسترخوان کی

دوسرے مصرع میں "ہیں" حشو ہے۔ اصلاح سے سارا شعر پر زور ہوگیا۔ جملۂ خبریہ سے جملہ انشائیہ میں بہتر ہوتا ہے۔

شعر مدرسہ یا دیر تھا۔ کعبہ تھا یا بُت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

غلطی۔ "بُت خانہ" اور "صاحب خانہ" میں ایطا ءِ جلی ہے۔ لہٰذا قافیہ غلط ہے۔

اگرچہ "واں" اس لحاظ سے کہ یہ شعر شعرائے متقدمین میں سے ایک صاحب کا ہے۔ قابلِ گرفت نہیں۔ لیکن آج کل متروک ہے۔

شعر ٹوٹ کر شیشۂ دل کیونکہ جڑے مشکل ہے
نہ اِدھر کا کوئی ٹکڑا نہ اُدھر کا ٹکڑا

غلطی۔ "کیونکر" کی بجائے "کیونکہ" لکھنا غلط ہے۔ اس کی جگہ "کیسے" بھی آ سکتا ہے۔ اگرچہ وہ "کیونکر" کے برابر فصیح نہیں۔

شعر سرفرازی فلک پست ہے اس کے آگے
چشمِ بد دُور بہت بالا ہے ایوان تیرا

غلطی۔ پہلے مصرع میں "سرفرازی" کی "یا" کا مشدّد ہو جانا خلافِ فصاحت ہے۔ دوسرے مصرع میں "بالا" کا "الف" گر گیا ہے۔ جو سراسر غلط ہے۔

ہندی کے کسی لفظ کے آخر سے "واؤ" یا "یا" گرا دینا جائز مگر "الف" گرانا خلافِ فصاحت ہے لیکن ہندی کے سوا کسی دوسری زبان مثلاً فارسی یا عربی وغیرہ کے لفظ کے آخر سے "واؤ" یا "یا" گرانا ناجائز اور "الف" گرانا قطعاً غلط ہے۔

شعر
پیروی سنتِ نبوی کی میسر ہوتی
داغ دل پھر تو مرا لالۂ گلشن ہوتا

غلطی۔ نبوی میں "با" مفتوح ہے۔ ساکن نہیں۔

شعر
یہ شوخ سی نگاہیں
یہ حسن کی شعاعیں
معذور ہیں ادائیں
مجبور ہیں جفائیں

غلطی: "نگاہیں" اور "شعاعیں" میں ایطاء جلی ہے۔ لہٰذا قافیہ غلط ہے۔ "ادائیں" اور "جفائیں" کا قافیہ درست ہے۔ لیکن یہاں چاروں قافیوں کا درست ہونا ضروری ہے۔

شعر
نظمِ عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے
ہنس کے رباب اٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے

خامی۔ عبودیت کو "یا" مشدّد سے باندھنا چاہئیے۔

شعر
تمہارے لطف و عنایت کا واہ کیا کہنا
کہ جس کا درد کیا وہ ہی درد مند ہوا

خامی۔ "وہ ہی" کی جگہ "وہی" لکھنا فصیح ہے۔

شعر
اے تاجِ دلربائی
غارت گرِ خدائی
اے مستِ سکرزائی
وہ کیفیت ہے چھائی

خامی۔ اردو زبان اور علی الخصوص نظم کی لطافت۔ نزاکت اور متانت "مستِ سکرزئی" جیسی ثقیل و مضحکہ خیز تراکیب کی متحمل نہیں۔

نشتر جالندھری

راحت کدہ

(۱)

سخت بے پروا تھا آخر ناگہاں مارا گیا
عشق کی یورش میں قلبِ ناتواں مارا گیا

آہ! منزل تک نہ پہنچا کاروانِ آرزو
راہ ہی میں کارواں کا کارواں مارا گیا

تھا دلِ بے چارہ تنہا اور ہجومِ رنج و غم
جانے اس گھمسان میں اب وہ کہاں مارا گیا

سوزِ اُلفت ہی پہ تھا جس کا مدارِ زندگی
سوزِ اُلفت ہی سے وہ آتش بجاں مارا گیا

جس کے نغموں میں تھی رقصاں موجِ صہبائے نشاط
آہ! وہ رنگین نوا جادو بیاں مارا گیا

جس کے دم سے محفلِ احباب تھی خلدِ نشاط
حیف ہے وہ جانِ بزمِ دوستاں مارا گیا

یاد ہے تم کو بھی وہ "صہبائیِ" رنگین مزاج
کارزارِ عشق میں وہ نوجواں مارا گیا

(۲)

اب کیا ہوئیں وہ حُسن کی رنگیں ادائیاں
چُپ ہوگئی ہیں عشق کی جادو نوائیاں

جانے وہ کیا ادا تھی کہ دل میں اُتر گئی
میرے لئے ہیں راز تری دلربائیاں

جب تیری بے وفائی پہ بھی تجھ پہ مر مٹے
پھر کیا کہیں کسی سے تری بے وفائیاں

تجھ پر اثرؔ نثار دل و جاں بھی کر چکا
پھر بھی غریب سے ہیں وہی کج ادائیاں

اثرؔ صہبائی

غزل

ہر روز سیلِ اشک بہا کی مرے خدا — دولت مری تو مفت لٹا کی مرے خد

دل اب بھی اُس کے قول و قسم بھولتا نہیں — ظالم نے اُس پہ کتنی جفا کی مرے خا

اچھا ہے اعتبار کسی کا نہیں رہا — اُس نے بھی آہ مجھ سے دغا کی مرے خا

دیتی رہی وہ چشمِ فسوں گر مجھے فریب — در پردہ مجھ پہ تیغ چلا کی مرے خا

یہ انتہائے جور و جفا آہ کیا کروں — یہ ابتدا ہے مہر و وفا کی مرے خ

آنکھوں سے کیا لگاؤں کہ ملتی نہیں مجھے

ڈھونڈے سے خاک اُس کفِ پا کی مرے خدا

حامد علی خاں

محفل ادب

نیندوں کی بستی

خاموش۔ خاموش
اے دوست خاموش

اے رونے والے   اے فاتحہ خواں
یہ سرزمیں ہے   شہر خموشاں
سوئے پڑے ہیں   ہستی کے طوفاں
غم ہائے امروز   فردا کے ارماں

ناکامئ دوش
خاموش۔ خاموش

خاموش۔ خاموش
اے دوست خاموش

اے جنبش لب   ہاں ہاں خبردار
باطل نہ ہو جائے   یہ سحر زنہار
ہیں آج یک جا   عجز اور پندار
پہلو بہ پہلو   مجبور و مختار

ہشیار و مدہوش
خاموش۔ خاموش

خاموش۔ خاموش
اے دوست خاموش

بیٹھے ہیں مل کر   سانجھ اور سویرا
دھندلی ضیا ہے   ہلکا اندھیرا
اس وقت کوئی   تیرا نہ میرا
اترا ہوا ہے   روحوں کا ڈیرا

آنکھوں سے روپوش
خاموش۔ خاموش

خاموش خاموش
اے دوست خاموش

خاموشیوں میں   گم ہیں صدائیں
بے کار ہیں سب   یہ التجائیں
کس کو پکاریں   کس کو بلائیں
یہ بیوی بچے   یہ باپ مائیں

ہیں پنبہ در گوش
خاموش۔ خاموش

(نظام المشائخ)

بعض ساز اور اصطلاحات موسیقی

ہم ذیل میں بعض عربی اور یوروپین سازوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یوروپین سازوں کے نام عربی ناموں سے مشتق ہیں یا ان کی بگڑی ہوئی صورت ہیں۔

عربی نام	یوروپین	عربی نام	یوروپین
اَلعُودُ	=(al-ud) A Lute	صنوج (مجیرہ یا جھانجھ)	Songjas =(Sunuj)
قِطارُ	:(qitar) Guitar	الدّف (مربع)	A dufe =(Al-duff)
رَبابَ	=(Rabab) Rebec	بندیر (مدور)	Pandore =(Bandair)
نقّارہ	=(Naqqara) Naker	قَصْعَہ (ایک قسم کا عربی ڈھول)	Qasa
		سولھویں صدی میں فرانسیسی queeee ہوا اور اب فی زمانہ caisee کہلاتا ہے	
طَبل	(Tabl) Tabor، tabor، tabal،	النفیر (نفیری)	(Nafir) anafil
انفار (بہت سی نفیریوں کا یکدم بجنا)	Tanafore (anfar)	السرنائی	(Al-surnay) Dulcaya
قَانُونُ	Canon (Qanoon)	الشّقیرہ	Eschaquiel (Al-shaqira)
زَمرُ	shawm (Zamr)		

معلوم ہوتا ہے کہ یوروپ میں جلترنگ کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی سے نویں صدی تک کا زمانہ ادبیات یوروپ میں (جلترنگ) کے ذکر سے خالی ہے مگر نویں صدی سے بارھویں صدی تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے واقعی عربی اور ہوائی دونوں قسم کے ارغنوں بنائے تھے اور آبی ارگن سے مراد "جلترنگ" ہے (نگار)

ایڈیسن اور اُس کا طریق عمل

ایڈیسن کی ایجاد کا حال اس قول سے معلوم ہوگا کہ اس سے کسی نے ایجاد کرنے کا راز دریافت کیا اور خود ہی سائل نے کہا کہ غالباً الہام (انسپریشن) ہوتا ہے۔ ایڈیسن نے جواب دیا کہ ایک حصّہ انسپریشن اور سو حصّہ پرسپیریشن (یعنی پسینہ) یعنی ایک خیال آنے سے ہی ایجاد نہیں ہوتی بلکہ سو حصّہ پسینہ بہایا جائے تب ایجاد ہوتی ہے۔

ایڈیسن اپنے ذہن میں ایک خیال پیدا کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعلق تجربات کیا کرتا تھا۔ اس کے دار العمل میں دن رات کام ہوتا تھا۔ یعنی اس کے اسسٹنٹ تجربات کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھتے تھے۔ رات کا کام کرنے والے صبح ہوتے ہی دن کے کام کرنے والوں کو تجربات سپرد کر دیتے تھے۔ صبح یہ خود آ کر تمام مشاہدات کا مطالعہ کرتا تھا۔ بعض وقت کوئی اسسٹنٹ کوئی نئی تجویز پیش کرتا تو وہ اکثر یہ کہہ دیا کرتا تھا کہ فلاں زمانہ میں یہ تجربہ ہو چکا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا۔

اسے کھانے پینے کی کبھی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اگر یہ آخر عمر میں شادی نہ کرتا تو غالباً اب سے بہت پہلے محض اپنی صحت کی طرف بے توجہی کی وجہ سے مر چکا ہوتا۔ مگر اس کی بیوی اس کی ہر بات کا لحاظ رکھتی تھی اکثر یہ تجربہ خانہ میں ہی سویا

اگر کبھی گھر جاتا تھا تو صبح ۷ بجے ہمیشہ تجربہ خانہ میں آجایا کرتا تھا۔ آخری عمر میں سات بجے شام کو اکثر گھر چلا
۔ ۱۲ بجے ہلکا سا ناشتہ کرتا تھا اور اخبار وغیرہ پڑھ کر اور ملاقاتیوں سے مل کر ایک بجے پھر اپنے
سے کمرے یا دار العمل میں آجاتا تھا۔
مشرقی اقوام کے برخلاف ایڈیسن کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم لوگ اپنے اجداد سے یقیناً زیادہ عقلمند ہیں اور
ائندہ نسلیں ہم سے زیادہ عقلمند ہوں گی۔ انسان کی عمر سائنس اور حفظانِ صحت کے ماتحت، اصول کی
اور بے توجہی کی وجہ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ انسان کی پیدائش کے وقت عمر مقرر نہیں ہوتی (جامعہ)

ترکی ملک الشعراء عبد الحق حامد

عبد الحق حامد صرف ایک پرزور تمثیل نگار نہ تھا بلکہ بیانیہ شاعری پر بھی اُسے اعلیٰ درجہ کی قدرت
ل تھی۔ اپنی نظم صحرا اور بلدہ میں اس نے اُس عشق کا اظہار کیا ہے جو اُسے سبزہ زاروں، مرغزاروں
ں ہوا میں ہلنے والے درختوں اور ان کی ترنم ریزیوں کے ساتھ تھا، ان چیزوں کو وہ خاص الہامات
ہے اور ان کے مقابلے میں شہروں کے تصنعات اور زر پرستیوں کو نام دھرتا ہے۔ حامد سے پہلے کسی ترکی
نے نہ تو دیہات کی فضا کا اتنا گہرا اثر اپنے قلب پر کیا تھا۔ اور نہ اس زور اور قدرتِ کلام کے
اسے بیان کیا تھا۔ ادبیات کی یہ صنف خالص مغربی الاصل ہے۔ اور اس کی خاطر حامد نے مشرقی
ں کو چھوڑ کر فرانسیسی طرز کے مخلوط قوافی استعمال کئے ہیں۔ حامد کا اس طرح لوچ کے ساتھ دیہاتی فضاؤں
ویریں آتارنا خاص کر اس وجہ سے اور زیادہ قابل توجہ ہے کہ وہ شہروں کی زندگی، ان کے شور شغب
اُن کی دلچسپیوں کا بہت شوقین تھا چنانچہ اپنی نظموں کے ایک مجموعۂ دیوانیلی کلیرم" (میرا جنون شباب) میں
نے انہی چیزوں کو بیان کیا ہے۔
اس نے ایک منظوم قصہ غرام (جذبۂ عشق) بھی لکھا ہے جس میں مذہب، تصوف، فنا وغیرہ کے متعلق اپنے
الات ظاہر کئے ہیں۔
اپنی پہلی بیوی کی وفات کا، جو بیروت میں واقع ہوئی تھی، حامد پر اتنا اثر ہوا کہ وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا،
اس کے اعزہ و اقربا کو کامل چالیس دن تک اُس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنی پڑی۔ اس زمانہ میں اُس نے مقبرہ
عنوان سے اپنی بیوی کا ایک نہایت پُراثر اور دل ہلا دینے والا مرثیہ لکھا جو اس وجہ سے کہ اُس میں تصنّع اور
زو گداز کا عنصر بہت افراط سے تھا، اس زمانہ میں تو مقبول نہ ہو سکا لیکن اب اس نے ترکی ادبیات میں اپنی ایک مخصوص
معزز جگہ پیدا کر لی ہے۔ (اردو)

مطبوعات

نرالی اُردو۔ مصنفہ مسٹر ایم اے مغنی دہلوی بی اے حجم ۱۲۸ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت ۸ ؍
مینجر دفتر "نرالی اردو" کوچہ دکھنی رائے دریاگنج دہلی سے طلب کیجئے

ہم جناب مغنی کو اس ادبی کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے بازاری اور دیہاتی لوگوں کی زبان کتابی صورت میں جمع کر کے اردو ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ یہ اپنی طرز کا غالباً پہلا مجموعہ ہے اور اس سے قبل "کرخنداروں" کی زبان کہیں یکجا اور بالعموم صورت میں طبع نہیں ہوئی۔ نہ صرف زبان کے لحاظ سے یہ کتاب قابل قدر ہے بلکہ اس میں سوقیانہ معاشرت اور نفسیات کے جو مرقع مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں وہ بھی اپنی ایک الگ قیمت رکھتے ہیں۔ ذیل میں ہم ناظرین "ہمایوں" کے تفنن طبع کے لئے اس کتاب سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں:۔

آگو آگو دیکھیو ہوتا ہے کیا

جب سے کانگریس میں عورتوں نے شراکت کی ہے تبھی وس کے ہر جلسہ میں جانا شروع کر دیا یار لوگ تو ہر وخت یہی چھیڑ خانی کرتے ہیں کہ وئی خلیفہ تم تو آنکھیں سینکنے کے لئے کانگریس کے شوقین بنے ہو۔ مگر اصلیت میں بات یہ ہے کہ کتنے شرم کی بات ہے کہ اپنے ملک کو آزاد کروانے کے کارن عورتیں تو سب جتن کریں اور ہم مرد ہو کے وِن کے پیچھو رہ جائیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کسو کو بھی میری بات کا تیکن نئیں آیا لیکن ناٹی سفہ والا تو بولا کہ وئی خلیفہ خیر تم چاہے جو کئیو میں تو وسی دن جلسہ میں جاتا ہوں جس دنا کوئی عورت تقریر کرتی ہے اور میرے پہ ہی کیا منحصر ہے اب تو سب لوگ باگوں نے یہ معمول بنا رکھا ہے۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا جس دن جلسہ میں کوہی عورت نئی آتی وس دن بس صفاچٹ میدان ہوتا ہے اور سوائے گنتی کے دو چار آدمیوں کے یا کچھ لٹھ بند سپاہیوں کے کوہی بھی نئی ہوتا، اور جس دن یار لوگوں کے کانوں میں یہ بھنک پڑ جاتی ہے کہ آج کوہی عورت لکچر دے گی وِس دن جلسہ میں خوب زوروں کی رو دنخ ہو جاتی ہے۔ خدا وِن سے سمجھے یہ پلس والے سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں نئیں تو ہر روز جلسہ ہوا کرے تو بڑا لُطف آئے میری تو اچھی خاصی سیل ہو جائے۔ میں نے کیا کہ بے ناٹی میں تو تجھے السیانی سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سو بے غیرت مرے ہوں گے جد تو ایک بی جایا پیدا ہوا ہوگا۔ وہ بولا خلیفہ میں تو بے حایا ہی سہی مگر وِن کو کیا کئیو گے جو جلسہ سے دو گھنٹے پہلے اسٹیج کے برابر میں جا بیٹھتے ہیں اور جد وہ بیچاریاں بولتی ہیں تو وہ وِن کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں اور جو کوہی وِن سے دریافت کرے کہ وئی جلسہ میں کیا کیا ہُوا تھا تو جواب دیں گے کہ ہنگامہ میں کچھ

سنائی ہی نہ دیا۔ ہاں بولنے والیاں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر تھیں اور زرد ساڑھی والی سب سے پر بین تھی وِس کے
ناک نقشہ کی عورت تو ہم نے آج تو لی دیکھی بھی نہیں اور سچ پوچھو تو وِسی کی وجہ سے جلسہ میں ہمارا دل بھی لگ گیا ورنہ میں
اِتّا وخت کہاں۔ . . . . میں نے کہا دیکھ وتی ناٹی تجھے اوروں سے کیا غرض۔ وہ اپنی قبر میں سوئیں گے تو اپنی قبر
میں۔ وہ بولا خلیفہ کچھ بھی ہو ہم تو فقط دیکھنے کے گنہ گار ہیں۔ میں نے کہا اچھا وائی جو مجاز چاہئے کر مگر یہ سمجھ لے کہ
تیری حرکتوں کا انجام کار ٹھیک نئیں۔

خیرو سے خوب وصیّت کر کے میں گھر پونچا واں جا کے خبر لگی کہ مُنبو کو جو کانگریس کے پچاس ساٹھ آدمی
پکڑے گئے تھے وِن کا ماتم کرنے کے لئے آج شام کو جلسہ ہوگا۔ شام ہوتے ہی میں بھی جلسہ میں جا پونچا۔ آدمی
پہ آدمی ٹوٹے پڑ رہا تھا اور ایک عورت اسٹیج پر کھڑی بول رئی تھی۔ چان چک میری نظر ناٹی پہ پڑی جو وئیں برابر میں کھڑا
وِس بیچاری کو بُری طرحوں گھور رہا تھا۔ اِتّے میں واں پلیس بھی آن دھمکی میں نے دل میں کہا کہ وئی اب کام بھاری ہو یہ سوچ
میں تو جلدی سے واں سے کھسک گیا اور گھر پونچ کر کوئی آدھ گھنٹے بھی بمشکل سے کمر ٹکائی تھی کہ اِتّے میں ناٹی کے باوا
چیختے وے آئے اور بولے کہ ذری چل کے دیکھو تو تمارے یار کی کیا حالت ہو ری ہے میں منادی کرتا تھا کہ بے جلسہ
میں مت جایا کر مگر نئی مانا اور اپنا مغز پھڑوا کے ہی چین لیا۔ میں وِن کے ساتھ ہو لیا۔ ناٹی اپنی بیٹھک میں سر باندھے دے لیٹا
تھا مجھے دیکھ کے بولا جس درونغہ نے میرے لاٹھی ماری ہے میں وِس کو جانتا ہوں ذرا اچھا ہو جاؤں پھر اگر میں نے بھی
درونغہ جی کو سرِ بازار پٹخنا نہ سُنایا تو میں بھی اصل کا جنا نہیں۔ میں نے کہا وئی ناٹی جانے دو بے فضول باتیں مت
کرو۔ جو ہونا تھا ہو لیا آئندہ کو کان پکڑو۔ چلتے وخت میں نے چپکے سے کہا دیکھا پیارے میں نئی کہتا تھا کہ کسی کو بُری
نیّت سے نہ دیکھے اور کی ماں بہن کو اپنی ماں بہن سمجھے۔ ناٹی ہے تو ایک ہی حلالی بولا کہ جیسے اور کی ماں بہن اپنی
ماں بہن ویسے اور کی بیوی اپنی بیوی۔ یہ بھی تو کہو۔ میں نے کہا پیارے تیری اِسی نیت نے تو تجھے آج یہ پھل دیا
ہے کہ تو سر باندھے پڑا ہے اور ابھی تو بقول کسو شاعر کے آگو آگو دیکھیو ہوتا ہے کیا۔

یورپ میں دکھنی مخطوطات ۔ مولفہ مولینا نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ حجم سات سو صفحات بڑی تقطیع کاغذ کتابت اور طباعت نفیس۔ قیمت غیر مجلد للعہ۔ مجلد صہ روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔ جناب مولف سے تلمجا گوڑا اترپ بازار (حیدرآباد دکن) سے منگوایئے
ہاشمی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ ادبِ اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ انہوں نے دورانِ قیام
یورپ میں مشہور کتب خانوں سے استفادہ کیا اور جہاں کہیں کسی دکھنی مصنف یا شاعر کی کوئی تحریر ملی اسے نظم و نثر کے اس
بیش بہا تاریخی مرقع (یورپ میں دکھنی مخطوطات) میں شامل کر لیا۔ مقدمہ ڈاکٹر محی الدین صاحب نے لکھا ہے اس کے علاوہ
جنابِ مولف کا پیش نامہ کتاب کے متعلق ضروری معلومات کا حامل ہے۔ دکھنی مصنفین کے حالات اور نمونہ کلام کے ساتھ

متفرق اردو اور فارسی نسخوں کے اختلافات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ شائقین ادب کو مولف کی اس جاں محنت کی داد دینی چاہیئے۔ پانچ روپے میں تاریخ وادب کے یہ جواہرات گویا کوڑیوں کے مول ہیں۔

مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی کی کتابیں

ذیل کی کتابیں جامعۂ ملیہ دہلی نے نہایت حسن اہتمام سے شائع کی ہیں۔ معنوی محاسن اور حسن جامعہ کی کتابوں کا طغرائے امتیاز ہے۔

دنیا کے بسنے والے۔ چھوٹی تقطیع حجم بہتر صفحات۔ دنیا کے مختلف اقطاع کی قوموں کے حالات بشیر حسین زیدی بی اے (کینٹب) نے نہایت دلاویز پیرائے اور سلیس زبان میں لکھے ہیں۔ بچوں کی معلومات میں اس سے بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔ قیمت ۶ر

محنت۔ بچوں کے لئے سبق آموز اخلاقی ڈراما حجم ۴۷ صفحات قیمت ۴ر

کھیتی۔ اسی صفحات کا یہ اخلاقی ڈراما پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن نے لکھا ہے "محنت" کی طرح یہ بھی نہایت سلیس اور پر لطف زبان میں لکھا گیا ہے۔

گناہ کی دیوار۔ یہ ڈراما اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے نے لکھا ہے۔ یہ بھی اخلاقی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اور مصنف نے اپنا نقطۂ نظر نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ طلبہ کے عام شائقین بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ قیمت ۸ر

ہمزاد۔ یہ بھی جناب قریشی کا ڈراما ہے۔ گناہ کی دیوار کی طرح یہ ڈراما بھی نہایت کامیاب ہے۔ پلاٹ سادہ ہے اور ڈرامے کو غیر ضروری عناصر سے پاک کر کے اردو میں ایک عمدہ مثال قائم کی گئی ہے۔ بہت دلچسپ ہے۔ قیمت ۶ر

کلام جوہر۔ مولانا محمد علی مرحوم (بانئ جامعۂ ملیہ) کا نمونۂ کلام ہے۔ مقدمہ مولوی عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے۔ مولانا کا سچے درد میں ڈوبا ہوا کلام کسی تنقید کا محتاج نہیں ہے۔ جامعۂ ملیہ کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے مولانا کے مرحوم کا کلام یکجا شائع کر کے ایک اہم ادبی فرض انجام دیا۔ حجم ۱۵۶ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت ۸ر

ضروری اطلاع

خریداران ہمایوں کے لئے

خریداران ہمایوں سے بہ ادب گذارش ہے کہ جو حضرات پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت کریں اُن کو لازم ہے کہ اپنا خریداری نمبر بھی لکھیں بصورت دیگرہ خریدار نہ سمجھے جائیں گے اور ہم اُن کے ارشاد کی تعمیل سے قاصر ہوں گے۔ یہ نہایت ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی دفتری کارروائی نہیں ہوسکتی۔

جواب طلب امور کیلئے قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق جوابی کارڈ یا ٹکٹ بھیجنا اشد ضروری ہے۔ دوسری صورت میں دفتر جواب دینے کا پابند نہیں ہوگا

مینجر "ہمایوں" لاہور

محمد سعید صدیقی | سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر ۲۳ لارنس روڈ سے شائع کیا

فروری

[illegible]

[illegible]

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں بی اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ فروری سنہ ۱۹۳۳ء

تصویر :- ماں اور بچہ

قیمت فی ... ... چندہ سالانہ ...

جہاں نما

فضا کی انتہائی وسعتیں

سر جیمس جینز نے کیمبرج میں ہنری سجوک میموریل لکچر کے دوران میں ستاروں اور کائنات کے متعلق عجیب وغریب حقائق بے نقاب کئے۔

انہوں نے کہا یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ستاروں کا نظام پہنائے کائنات میں ہر جگہ پھیلا ہوا نہیں ہے۔ یہ ایک خاص منظم ہیئت میں ہیں جو ایک قرص یا سکے یا گاڑی کے پہیئے سے مشابہ ہے۔ چند سال قبل یہ تینوں تشبیہیں یکساں صحیح سمجھی جاتیں لیکن اب ہمیں ان میں سے آخری کو لقیناً ترجیح دینی چاہئے، کیوں کہ حال ہی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ ستاروں کا تمام نظام ایک مرکز کے گرد اُسی طرح چکر کھا رہا ہے جیسے ایک گاڑی کا پہیہ اپنی دُھری کے گرد گردش کرتا ہے۔

پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آفتاب ستاروں کے اس نظام کے بالکل قریب ہے، لیکن ہمیں اب معلوم ہو گیا ہے کہ یہ بہت دُور ہے۔ دُھری اتنی دور ہے کہ ہم کسی دُوربین کی مدد کے بغیر اس کے روشن ترین ستاروں کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ آنکھوں کو صرف وہی ستارے نظر آتے ہیں جن کی روشنی تین ہزار سال میں ہم تک پہنچ جاتی ہے لیکن دھری اتنی دُور ہے کہ وہاں سے روشنی کو زمین تک پہنچنے میں چالیس ہزار سال لگ جاتے ہیں۔ یا باصطلاحِ ماہرانِ ہیئت دُھری چالیس ہزار نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس دُھری کے پہیئے کا قطر ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے، لیکن غالباً یہ دو لاکھ نوری سالوں کے فاصلے کے برابر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب اس پہیے کے اروں کے نصف طول سے بھی کم فاصلے پر واقع ہے۔ اس پہیے کی گردش آفتاب کو فضا میں دو سو میل فی سیکنڈ کے حساب سے گھماتی ہے، تاہم پہیا اتنا بڑا ہے کہ اسی رفتار پر سفر کرنے کے باوجود آفتاب بیس کروڑ سال میں ایک دفعہ دُھری کا چکر لگا سکتا ہے۔

اگر دوسرے ستاروں کی قوتِ جاذبہ بر روئے کار نہ آئے تو آفتاب فضا میں اس طرح چکر کھا کر گرے جس طرح بائیسکل کے پہیئے سے کیچڑ کا ایک ذرہ اُڑ کر گرتا ہے۔ یہ جاذبیت اُسے اسی طرح اپنے مدار پر قائم رکھے ہوئے ہے جس طرح زمین کو آفتاب کی جاذبیت نے تھام رکھا ہے۔

ایک زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ فضا ایک ایسے جوہر (ایتھر) سے پُر ہے جو تمام اُن اعمال کی ذمہ دار ہے جو خالی فضا میں وقوع پذیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ جس طرح ہوا موسیقی یا بولنے والی آواز کو صوتی لہروں کی شکل میں ایک فاصلے تک لے جاتی ہے۔ اسی طرح ایتھر کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ آفتاب کی روشنی اور حرارت کو ایتھر کی لہروں کی شکل میں فضا کا فاصلہ طے کراتا ہے۔

مائیکل سن اور مارلے کے مشہور تجربے نے اس نظریے کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اگر تمام فضا ایتھر سے بھری ہوئی ہوتی تو فضا میں زمین کی حرکت سے ایتھر کی ایک آندھی سی پیدا ہو جاتی جو زمین کے پاس سے گزرتی۔ تجربے کا مقصد یہ تھا کہ اس ایتھری آندھی کی رفتار معلوم کی جائے۔ لیکن اس کے نتائج نہایت غیر متوقع ظہور میں آئے۔ بجائے اس کے کہ ایتھری آندھی کی رفتار معلوم ہوتی معلوم یہ ہوا کہ فضا میں ایتھری آندھی کا وجود ہی نہیں ہے۔

آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت نے اس عقدے کو نہایت اچھی طرح حل کر دیا ہے۔ ہم اب فضا کو ایتھر سے یکساں طور پر بھرا ہوا نہیں سمجھتے بلکہ اس کی ایک اپنی الگ ساخت اور شکل سمجھتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک کامل طور پر مسطح بلیرڈ ٹیبل اور ایک گیند بلا کھیلنے والے میدان کی کوئی خاص ساخت اور شکل نہیں ہوتی کیوں کہ اس کا ہر ٹکڑا ہر دوسرے ٹکڑے سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ ایک اس قسم کی سطح ہوتی ہے جس پر ہم کھیل سکتے ہیں۔ ہم جس طرف گیند کو پھینکتے ہیں ہم جانتے کہ وہ سیدھی اُس طرف چلی جائے گی لیکن اگر ایک بلیرڈ ٹیبل کی ساخت میں اونچ نیچ ہو یا ایک گیند بلا کھیلنے کے میدان میں گڑھے پڑے ہوئے ہوں تو پھر ہم گیند کو سیدھا نہیں پھینک سکتے۔ ہماری گیند نشیب و فراز میں گرتی پڑتی کہیں کی کہیں نکل جائے گی۔

اضافیت کا نظریہ ثابت کرتا ہے کہ فضا کی ساخت اسی قسم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیارے اور نجوم مذنبہ آفتاب کے گرد خم دار مدارات پر گردش کرتے ہیں۔ ٹینس کی گیند نیچے کو زمین کی طرف خم کھاتی ہے اور برقیہ ایک برقی یا مقناطیسی مقام میں خم کھا کر چلتا ہے۔

جب ایک معمولی سطح میں کوئی خاص بناوٹ ہو یا اس میں خم ہوں تو ہم اسے ہموار اور ناہموار دو حصّوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہی حال فضا کا ہے۔ اس میں بھی ایک ہموار بناوٹ ہے جو برقیے کو اس کے مدار میں محفوظ رکھتی ہے، ایک ناہموار اور بالکل مختلف ساخت ہے جو ٹینس کی گیند کو خواہ ہم اسے کتنے زور سے پھینکیں کامل طور پر سیدھا جانے سے روکتی ہے۔ ان دو ساختوں میں اضافیت کے نظریے نے ایک تیسری ساخت کا اضافہ کیا ہے جو ان دونوں سے زیادہ

ناہموار ہے اور جو اسی عام نوع کی ہے جیسی سطح زمین کے انحنا میں ہمیں ملتی ہے۔

زمین کے انحنا کی وجہ سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم ایک مربع کی صحیح صحیح شکل سطح زمین پر بنا سکیں۔ ایک صحیح مربعے کی شکل ہم اُسی صورت میں بنا سکتے ہیں جب ہم سطح زمین سے گزر کر کسی ایسی چیز پر بھی پہنچ جائیں جو سطح زمین نہ ہو۔ اسی طرح نظریۂ اضافیت نے جو انحنا فضا میں دریافت کئے ہیں، انہوں نے ہمارے لئے فضا میں ایک چوکور کا بنا سکنا ممکن کر دیا ہے۔ ایک صحیح صحیح چوکور بنانی اُسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم فضا میں سے گزر کر کسی ایسی چیز پر بھی پہنچ جائیں جو فضا نہ ہو۔

یہ ممکن نہیں کہ ہم فضا میں ایک پدم میل کا ایک مربع بنا سکیں اور پھر یہ بھی معلوم کر سکیں کہ آیا اس کے چاروں ضلعے برابر ہیں یا نہیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ ہم سحابیاتِ نجمی کو تنکوں کی ایک مٹھی سمجھ کر اُس فضا کا بہاؤ معلوم کرنے کے لئے پھینک دیں جس میں وہ گھرے ہوئے ہیں اور معلوم کریں کہ آیا فضا حقیقت میں پھیل رہی ہے یا نہیں؛ اگر فضا اُسی طرح خم دار ہے جس طرح آئن سٹائن کے تخیّل نے اُسے محسوس کیا تو یہ پھیل بھی ضرور رہی ہوگی، اس طرح کہ سحابیاتِ نجمی ایک دوسرے سے پیچھے ہٹ رہے ہوں گے، اور اسی طرح ہم سے بھی، اور اُن کی رفتار کو اُن فاصلوں سے ایک نسبت ہوگی۔

یہ اندازہ کرنا ممکن ہے کہ کائنات کی ارتقائی عمر کیا ہوگی —— یعنی وہ عرصہ جو کائنات کو اپنی موجودہ حالت اور ہیئت اختیار کرتے ہوئے منقضی ہوا۔ جن مختلف ذرائع سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں، مثلاً مداراتِ نجومِ ثنویہ، امواجِ نجوم کا پھیلاؤ، ستاروں کی حرکات میں توانائی کی تقریباً یکساں تقسیم تمام ثابت کرتے تھے کہ یہ ارتقائی زمانہ لاکھوں کروڑوں سال پر حاوی ہے اس کے برخلاف سحابیاتِ نجمی کے پیچھے ہٹنے کی رفتار جس کو ہکائے ستارہ بیں نے دیکھا اس قدر تیز تھی کہ اگر وہ حقیقی ہوتی تو کائنات کو ہر دس ارب سال کے بعد اپنی حدود دُگنی کر دینی پڑتیں صحیح مدت غالباً ایک ارب تیس کروڑ سال ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

خوشی ؛ غم و رنج، مقابلہ و مجادلہ۔ بیزاری و بے تابی، اضمحلال و حسد، گناہ احساسی و ایذا رسانی اور ہمہ گیر ظلم و ستم کی
اس دُنیا میں کیا خوشی ہنوز ممکن ہے ؟

رسل کہتا ہے کہ اپنے بعض دوستوں سے گفتگو کرنے اور اُن کی بعض تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں تقریباً اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ خوشی دُنیائے حاضر میں ناممکن ہے لیکن غور و خوض کرنے سے، دور و دراز ملکوں کی سیر و سیاحت سے اور اپنے باغ کے مالی سے بات چیت کرکے یہ خیال بتدریج دُور ہو رہا ہے۔ جب میں لڑکا تھا تو میں ایک شخص کو جانتا تھا جو کنوئیں کھودنے کا کام کرتا تھا جو بہت لانبا تھا، اس کے پٹھے پہلوانوں کی طرح مضبوط تھے، وہ پڑھ لکھ نہ سکتا تھا اور جب ۱۸۸۵ء میں اُسے پارلیمنٹ کے لئے حق رائے ملا تو اُسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ پارلیمنٹ بھی کوئی شے ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اُس کی خوشی جسمانی طاقت، وافر کام اور چٹانیں کاٹنے سے حاصل ہوتی تھی۔ میرے مالی کی خوشی بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اپنے پودوں کی نگہداشت کے لئے خرگوشوں کی سرکوبی کرتا رہتا ہے جنہیں وہ بھیانک چالاک اور خونخوار پکارتا ہے کچھ اس طرح جیسے انگریز خفیہ پولیس والے روسیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہر روز اُسے اس سے واسطہ پڑتا ہے اور اُس کا کام برابر جوش کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اگرچہ وہ ستر برس سے زائد عمر کا ہے وہ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور اپنے کام پر آنے کے لئے پہاڑی علاقے میں بلا ناغہ پورے سولہ میل بائیسکل چلاتا ہے لیکن اُس کی خوشی کا چشمہ کبھی سوکھتا نہیں اور اس کی وجہ محض "وہ خرگوش ہیں"۔ تم کہو گے لیکن اس قسم کی سادہ خوشیاں ہم عالی دماغ لوگوں کو خوش نہیں کر سکتیں+ میرے خیال میں یہ دلیل محض غلط ہے۔ عقلمند آدمی بھی اپنے اپنے کاموں میں یہ سادہ خوشیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر حالت میں تکمیل کار کی خوشی محض ایسی مشکلات کی متقاضی ہے جو شروع میں سخت دشوار معلوم ہوں لیکن جو بالعموم استقلال سے آسان ہوتی جائیں+ آج کل تمدن کے زمانے میں سب سے خوش لوگ طبیعیات دان ہیں جو اس بات میں ادیبوں کی جماعت سے مختلف ہیں کہ وہ اپنی خانگی زندگی میں بھی مسرور نظر آتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُن کی عقل کلیتہً مصروف کار رہتی ہے اور ایسی باتوں میں دخل در معقولات نہیں دیتی رہتی جہاں اُس کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ دُنیائے حاضر میں طبیعیات کی قدر دانی ہے اور کسی کو اُس کی اہمیت میں شبہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طبیعیات دان مزے کرتے ہیں اور کئی نقاش اور ادیب

بھوکوں مرتے ہیں اور ناخوش ہیں جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عوام الناس کے شکوک وشبہات کے ساتھ ہر وقت دست وگریباں رہنا خوشی کا موجب نہیں ہوسکتا۔ یہ امر واقع ہے کہ مغربی ملکوں میں اکثر فہیم نوجوانوں کی عقل وفہم بیکار پڑی رہتی ہے۔ اس کے برخلاف رُوس چین جاپان اور حال ہی میں ہندوستان میں بھی اُنہیں کوئی نہ کوئی ایسا اصطلاحی یا سیاسی کام کرنے کو مل جاتا ہے جس میں گو اُن کے سولی پر چڑھ جانے کا خطرہ لاحق ہو لیکن جس سے اُنہیں وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جو مغرب میں آرام اور کم اختیاری کی زندگی سے کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ عسیر الحصول خوشیاں اکثر لوگوں کے بس کی نہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کے بس کی یہ بات ضرور ہے کہ وہ اپنے اپنے کام میں خاص مہارت پیدا کریں بشرطیکہ انہیں یہ خواہش نہ ہو کہ ساری دُنیا ہمیں اس مہارت پر سراہے٭ ایک شخص کا ذکر ہے کہ نوجوانی ہی میں اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہوگئیں لیکن وہ اپنی طویل عمر کے آخری دنوں تک بغایت خوش رہا اور وہ اس طرح کہ اُس نے پانچ جلدوں میں ایک کتاب گلاب اور پاپا لاپر لکھی جو اس موضوع پر ایک مستند تصنیف مانی جاتی ہے٭ کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی بلکہ کسی کام میں کمال پیدا کرنے سے سارے جہان میں ہر دلعزیز ہوئے بغیر بھی انسان خوش دل رہ سکتا ہے۔ یہ خوشی کی ایک آسان راہ ہے جو ہر ایک کے لئے کھُلی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل کلوں کے دور میں یہ ناممکن یا سخت دشوار ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ کلوں کے کام میں جس قدر مصاحبت اور تعامل ہوتا ہے وہ زراعت کے نام نہاد فطری کام میں میسر نہیں کسی خاص مقصد میں محکم یقین اور اُس کے لئے پیہم عمل خوشی کا موجب ہوتا ہے۔ محض بم اندازوں کا سا مقصد ہی نہیں بلکہ سینکڑوں اور مقاصد جن میں اکثر لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں مثلاً کسی مدرسے کسی یتیم خانے کسی انجمن کے مقاصد میں دلچسپی لینا۔ اسی طرح کسی تفریحی شے میں دلچسپی لینا انسان کے مخصوص کام کے لئے بھی مفید ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آج کل کا ایک شہرۂ آفاق ریاضی دان جتنا وقت ریاضی کے لئے وقف کرتا ہے اتنا ہی وقت پرانے ٹکٹ اکٹھے کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ ٹکٹوں کی فراہمی صرف ریاضی کی مشکلات کو حل نہیں کرتی اور نہ ٹکٹ صرف ایسی شے ہیں جنہیں اکٹھا کیا جاسکتا ہے٭ اس دلچسپ متمدن دُنیا میں ہزاروں اور ایسے تفریحی مشاغل ہیں۔ پُرانے سکّوں پُرانے ہتھیاروں، پُرانے برتنوں کا اکٹھا کرنا، فوٹو اتارنا، اشعار کا انتخاب، بہترین تقریروں تحریروں کا انتخاب اور بیسیوں ایسی ہی اور چیزیں ہیں جو کی جاسکتی ہیں اور جن کا کرنا انسان کے لئے خوشی کا باعث ہے۔ یہ خیال کہ یہ ذرا ذرا سی باتیں ایک بالغ یا عمر رسیدہ کے لئے ناموزون ہیں محض فضول ہے۔ ہر وہ خوشی جو دوسروں کے لئے نقصان رساں نہ ہو مفید ہے۔ رسل کہتا ہے کہ "میرا یہ حال ہے کہ میں دریا اکٹھے کرتا رہتا ہوں رُوس کے دریائے والگا میں میں نے سفر کیا چین کے یانگ سی پر میں گیا اور مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تاحال امیزان یا اوری نوکو کی سیر کیوں نہیں کی۔ یہ جذبات سادہ ہیں لیکن میں ان پر شرمندہ نہیں ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار امریکہ کے ایک مشہور ادیب سے ملا جس کی کتابوں کے مطالعہ سے مجھے خیال ہوا تھا کہ

ہر شے جو اچھی طرح کی جاسکے کرنے کے قابل ہے٭

عقلمند آدمی کبھی صرف اپنے کام میں منہمک نہیں رہتا۔ تم ہر روز چھ گھنٹے اپنا کام کرتے ہو تو ہر روز آدھ گھنٹہ زندگی کے بعض اور پہلوؤں پر بھی نظر دوڑایا کرو٭

وہ ایک غم پسند آدمی ہے تو اُس وقت "بیس بال" (ایک قسم کا کھیل) کے مقابلوں کی خبریں برقی خبر رساں پر آرہی تھیں اور وہ اس پر کان لگائے ہوئے تھا۔ اُس وقت وہ مجھے اور اپنے علمِ ادب کو اور اس دُنیا کے سارے افکار و مصائب سب کو قطعاً بھول گیا تھا اور جب اس کے کسی واقف یا دوست کی جیت کی خبر آتی تھی تو وہ خوشی کے مارے اس طرح چلّاتا تھا جیسے کوئی بچہ یا لڑکا چلّائے+ تاہم یہ درست ہے کہ تفریحات عموماً اصلی خوشی کا موجب نہیں ہوتیں وہ تو صرف کسی خاص وقت میں دُنیا کے بکھیڑوں کو بھول جانے کا ذریعہ ہیں اور بس۔ اصلی خوشی سب سے زیادہ اس پر منحصر ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں اور چیزوں میں ہمدردانہ دلچسپی لے+ اپنے ہم جنسوں میں صحیح نوع کی دلچسپی وہ ہے جس میں اُلفت کی آمیزش ہو گو وہ اُلفت ایسی نہ ہونی چاہئے جو کسی کو صرف اپنا بنا لینا چاہے بلکہ ایسی جو دوسروں کو دیکھے، اُن کی انفرادی باتوں میں لطف حاصل کرے، اُن کے مخصوص مفاد اور مسرتوں کے لئے تسلی و تکمیل کی راہیں ڈھونڈے بغیر اس خواہش کے کہ وہ اُس کے ممنون ہوں یا وہ خود اُن پر قبضہ پالے+ انسان کو چاہئے کہ وہ نا احسان مندی سے اپنا جی بُرا نہ کرے اور دوسروں کی عجیب و غریب عادتوں سے غصے میں آنے کی بجائے ان پر ہنس دیا کرے۔ اگر کوئی شخص اپنے دل میں خوش ہوگا تو وہ دوسروں کے لئے بھی خود بخود ایک پُر لطف ساتھی بن جائے گا اور اس سے پھر اُس کی اپنی خوشی دوبالا ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ بناوٹی نہ ہونا چاہئے نہ اس خیال سے کہ یہ ایک ایثار ہو یا ایک مقررہ فرض۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بہت سے اشخاص سے از خود اور بغیر کوشش کے دوستداری کا سلوک کرتا ہے خود بخود مسرور و مطمئن رہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص مختلف اشیاء میں ہمدردانہ دلچسپی لے اس کی خوشی میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک ماہر رضیات کو پتھروں اور ٹیلوں سے دلچسپی ہے ایک ماہر اثریات کو پرانی عمارتوں اور کھنڈروں سے پس ہمیں بھی کسی نہ کسی شے یا اشیاء سے دلچسپی لینی چاہئے۔ دُنیا ایک وسیع عجائب خانہ ہے۔ ہم یہاں اگر صرف اپنے مفاد سے دلچسپی لیں گے تو ہماری زندگی بہت جلد غیر دلچسپ ہو جائے گی۔ ایک مختلف چیزوں میں دلچسپی لینے والا جب مثلاً ستاروں کی تاریخ (یا قدیمی ہندوؤں یا قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے کارناموں کا حال پڑھ کر پھر اپنے کاروبار یا ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہوگا تو وہ دیکھے گا کہ اُس کی فکر و تشویش میں خاصی کمی واقع ہو گئی ہے+ خوشی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ تمہارے مفاد جتنے وسیع ہو سکیں ہوں اور چیزوں اور لوگوں کی طرف تمہارا رویہ دوستانہ ہو نہ کہ معاندانہ+ اب ہم خوشی کے ذرائع پر بہ تفصیل غور کرتے ہیں+

مسرور اشخاص کی ایک عالمگیر اور متمیز خصوصیت ہے **انہماک**۔ انہماک زندگی کے لئے ہے جیسے اشتہا کھانے کے لئے انہماک کے بخوبی سمجھنے کے لئے تمثیلاً دیکھنا چاہئے کہ لوگ اپنا اپنا کھانا کیونکر کھاتے ہیں۔ بعض لوگ کھاتے وقت بیزار نظر آتے ہیں خواہ ان کا کھانا کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، دراصل اُن کو ہمیشہ اچھا کھانا ملتا رہا ہے اور انہیں کبھی معلوم نہیں ہوا کہ تڑپا دینے والی

جس شخص میں ظرافت کا مادہ ہے وہ مسرور و خوش اطوار ہوگا کیونکہ اگر وہ اوروں پر ہنسے گا تو بعض اوقات اپنے آپ پر بھی ہنس دے گا۔

تم کسی کی دوستی چاہتے ہو تو پہلے خود اُس کے دوست بن جاؤ+

دوستی وہ چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا+

بھوک کیا بلا ہوتی ہے۔ وہ کھاتے ہیں کیونکہ دنیا میں کھانے کی رسم پڑگئی ہے اور یہ گویا ایک فیشن ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کھانا اکتا دینے والی شے ہے مگر کیا کیا جائے یہ نہ جی اکتائے گی تو کوئی اور شے جی اکتا دے گی اور بعض بیمار لوگ ہیں جن کے معالج نے انہیں بتایا ہے کہ کھانا ضروری ہے کیونکہ اس سے طاقت قائم رہتی ہے اور بعض چٹورے ہیں جو کھانا شروع تو کرتے ہیں خوشی سے لیکن تھوڑا کھانے کے بعد دیکھتے ہیں کہ اس کھانے میں مرچ کم ہے اس میں چینی زیادہ یہ پورا پکا نہیں وہ بے مزہ سا ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ اور بعض پیٹو ہیں جو کھانے پر اس طرح گر پڑتے ہیں جس طرح گدھ مردار پر۔ وہ پیٹ بھر کر کھاتے ہیں اور پھر نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو خوب بھوک سے کھانا شروع کرتے ہیں کھانے میں لطف بھی اٹھاتے ہیں اور جب کھا چکتے ہیں تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ زندگی کے دسترخوان پر بھی مختلف لوگوں کا یہی حال ہے۔ مسرور آدمی موخر الذکر کھانے والے کی قسم سے ہے۔ کھانے سے بیزار ہو جانے والا اللہی ناخوشی کے شکار کی طرح ہے۔ بیمار آدمی جو اپنا فرض سمجھ کر کھاتا ہے گویا تارک الدنیا ہے۔ پیٹو عیاش ہے اور چٹورا اُس مدمغ کی طرح ہے جسے زندگی کی اکثر خوشیاں کثیف معلوم ہوتی ہیں شاید پیٹو کے سوا باقی یہ سب آدمی ایک صحت مند آدمی کو جو اپنے کھانے سے فطری طور پر لطف اٹھائے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہم سے کم ظرف آدمی ہے گویا بھوک لگنے پر کھانا کوئی کمینہ حرکت ہے یا زندگی کی مسرتوں سے لُطف اندوز ہونا کوئی برائی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ نیکی اُن پر منکشف ہو چکی ہے۔ اپنی انکشاف کی چوٹیوں سے "وہ فریب خوردہ" نوعِ انسان کو رحم اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اس نوع کے تمام "انکشافات" درحقیقت عوارض ہیں جو نفس کو بتدریج کمزور اور کھوکھلا کر دیتے ہیں اور ان سے جس قدر جلد بھی رہائی پائی جائے بہتر ہے۔ فرض کرو کہ ایک آدمی کو بیر پسند ہیں دوسرے کو پسند نہیں ہیں تو دوسرا آدمی کس طرح پہلے آدمی سے بہتر ہو گیا؟ بیر نہ اچھے ہیں نہ بُرے۔ جو بیر پسند کرتا ہے اِس کے لئے وہ اچھے ہیں جو ناپسند کرتا ہے اس کے لئے بُرے ہیں لیکن جسے وہ پسند ہیں اُس کی زندگی نہ پسند کرنے والے سے زیادہ مزے دار ہوتی ہے اور وہ دنیا میں زیادہ خوش رہتا ہے۔

اِسی طرح کھیلوں سے دلچسپی لینے والا یا کتابوں سے لطف اٹھانے والا اپنی دلچسپی اور لطف میں خوش ہے اور جسے یہ دلچسپی نہیں وہ اس خوشی سے محروم ہے۔ جتنی زیادہ چیزوں میں بھی ایک آدمی دلچسپی لے گا اتنا ہی زیادہ اُس کی خوشیوں میں اضافہ ہوگا اور اتنا ہی کم وہ قسمت کے رحم پر زندگی گزارے گا اس لئے کہ اگر اُس سے ایک چیز چھن جائے گی تو وہ دوسری طرف رجوع کرے گا۔ انسان کی زندگی اتنی طویل تو نہیں کہ وہ ہر شے میں دلچسپی لے سکے لیکن پھر بھی جتنی اچھی چیزوں میں بھی ہم دلچسپی لیں گے اتنی ہی ہماری زندگی زیادہ مطمئن اور مسرور ہو گی۔ الٹی کھوپری والا آدمی چیزوں سے منہ پھیر کر اپنے اندر محصور رہتا ہے لیکن یاد رکھو کہ ایسے غلط اندیش فلسفیوں کی ناخوشی میں کوئی بڑی ناقابل الفہم نیکوکاری چھپی ہوئی نہیں ہے۔ انسان کا دل ایک عجیب الخلقت کل ہے کہ وہ اُس تمام مواد سے جو اس میں ڈالا جائے نئی سے نئی چیزیں ساخت

وہی شخص زندگی سے اچھی طرح حظ اٹھا سکتا ہے جس کے دل کو تفتیش و دریافت کی دُھن لگی ہے۔

کرتی ہے لیکن اگر اُس میں کچھ نہ ڈالا جائے تو وہ ایک بے سُود سی شئے ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا کی مادّی چیزیں اُس دلچسپی کی وجہ سے جو ہم ان میں لیں واقعات بن جاتی ہیں اور مختلف النوع واقعات کا تواتر صحیح زندگی ہے۔ وہ فرد بشر جس کی توجہ بالعموم بیرونی طرف کو مبذول ہوجب گا ہے گاہے اپنے اندرونِ نفس میں نگاہ ڈالتا ہے تو وہ اس میں رنگ رنگ کے نواور پاتا ہے جس سے اُس کی زیست گویا روز بروز مرصّع ہوتی جاتی ہے۔

انہماک کی بے شمار صورتیں ہیں۔ ایک انہماک پسند آدمی کو باغ کی ایک گشت میں، کھیتوں کی سیر میں، شہروں کی عمارات میں، پرانے زمانے کی تعمیروں میں، نئے زمانے کے کارخانوں میں بیسیوں دلچسپ حقائق نظر آتے ہیں اور ایک چیز ول میں دلچسپی رکھنے والا شخص اس مادّی دُنیا کا بہتر اور زیادہ کامیاب باشندہ ہوتا ہے۔ سیر و سیاحت ہی کو لو۔ ایک قسم کا شخص دُنیا بھر میں گھومنے کو نکلے گا، بہترین ہوٹلوں میں قیام کرے گا، وہی خوراک کھائے گا جو اپنے گھر میں کھاتا تھا، اسی طرح کے بے فکروں سے ملے گا جن سے اپنے وطن میں ملتا تھا، اُسی قسم کی باتیں کرے گا جو اپنے گول کمرے یا کھانے کے کمرے میں کیا کرتا تھا وہ گھر واپس آئے گا تو وہ اس بیزار کرنے والے تجربے سے رہائی پانے پر فقط خدا کا شکر ادا کرے گا۔ لیکن ایک دوسری قسم کا شخص ہر مقام کی خصوصیتیں دیکھے گا، نئے نئے آدمیوں سے ملے گا، تاریخی یا معاشری دلچسپی کی چیزیں ملاحظہ کرے گا جس جگہ جائے گا وہاں کی مخصوص خوراک کھائے گا، وہاں کی زبان اور وہاں کے طور طریقے سیکھے گا اور جب گھر واپس لوٹے گا تو اس کے دماغ میں سردی کی راتوں کے لئے آپ بیتی کا ایک ایسا ذخیرہ جمع ہو گا جو مدتوں تک ختم نہ ہو گا۔ ان سب مختلف حالات میں منہمک آدمی غیر منہمک آدمی سے فائدے میں رہے گا۔ اس کے لئے نامرغوب تجربے بھی مفید ثابت ہوں گے۔ جہاز کی غرقابی، بغاوت، زلزلہ آتش زدگی ایک باہمت آدمی کے لئے ایسے حادثات اور اُن کی یاد عموماً مسرت خیز ہوتی ہے۔ لیکن ہر انسان کی ہمت کی ایک حد ہے صحت برباد ہو جائے تو بہت کم آدمیوں میں انہماک باقی رہتا ہے اگرچہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بعض آدمی بڑی جاں گسل تکلیفیں سہتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی ہمت اور اپنی انہماک پسندی نہیں کھوتے۔

مختلف آدمیوں کو مختلف باتوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ہر شخص کو خود غور کرنا چاہئے کہ اسے کس چیز سے شغف ہو

حسن بینی زندگی کی مکمل لطف اندوزی کا آغاز ہے

حسن خدا کے چہرے کا ایک پہلو ہے۔

پاکیزگی پاکیزگی نہیں جب تک وہ خوبصورتی بھی نہ ہو۔

تعلیم کا ایک مقصد حسن کی پسندیدگی ہونا چاہئے جس شخص میں یہ وصف پیدا ہو گیا تو اس پر گویا رنگا رنگ نعمتوں کی بارش ہوتی رہی۔

ہم میں سے اکثروں کو زندگی میں ایسے ایسے موقع پیش آتے ہیں کہ اگر ہم اُن سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں تو اس سے ہم اپنی خوشیوں میں گراں قدر اضافہ کر سکتے ہیں۔

ہم انسان ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں۔ بغیر ایک دوسرے کے ہم بیکار ہیں پھول باہر دھوپ اور ہوا میں کھلتے اور لہلہاتے ہیں اور کوٹھڑیوں میں وہ مرجھا کر رہ جاتے ہیں

جب وہ ایسی چیز کو پانے کی کوشش میں مصروف ہوگا تو اُس کی زندگی غیر دلچسپ نہ رہے گی۔ لیکن ان جزوی دلچسپیوں سے زیادہ دل خوش کن ہے زندگی میں ایک عام انہماک جس کے لئے اعتدال پر عمل درآمد ضروری ہے۔ ایک اچھی زندگی میں مختلف باتوں میں توازن قائم رہنا چاہئے۔ ہمارے مختلف ذوق اور مختلف خواہشیں جب تک دُنیا کے چوکھٹے میں پوری نہ آئیں گی دیر تک لطف نہ دیں گی۔ یعنی یہ لازم ہے کہ وہ ہماری صحت سے ہمارے تعلقاتِ محبت سے اور اس معاشرہ کی قدر و منزلت سے جس میں ہمیں رہنا ہے مطابقت کریں ورنہ وہ بجائے خوشی کے ہماری ناخوشی کا موجب ہو جائیں گی۔ ہاں بعض کارنامے مثلاً کوئی اصلاحی تحریک کوئی بغاوت کوئی زبردست ایثار یہ اس قدر عظیم الشان ہیں کہ اُن کے لئے انسان اگر بہت سی نعمتیں ضائع بھی کر دے تو مضائقہ نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ایسے کام ایسی ہی قربانیوں سے ممکن العمل ہوتے ہیں۔ لیکن بالعموم وہ آدمی جس میں کوئی خاص خواہش حد سے بڑھ جائے کسی تکلیف یا خوف یا ہَول کا شکار ہوتا ہے جس سے وہ اس طریقے سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ گریز ضروری بھی ہو جاتا ہے لیکن جہاں بھی اس کی خاص ضرورت نہ ہو۔ یہ محض کسی نفسی خرابی کا نشان ہوتا ہے۔ غرض ایک عام انہماک انسانی فطرت کی ایک ضروری خصوصیت ہے۔ متمدن معاشرت میں عام انہماک کی کمی زیادہ تر ان بندشوں کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے جو قانون یا رواج نے نوعِ انسان پر عائد کر رکھی ہیں کہ ان بندشوں سے بالا بالا زندگی بسر کر سکنے کے لئے جسمانی صحت مندی اور غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہے یا پھر کسی نہایت ہی دلچسپ کام کی۔ اس توانائی کی دراصل صاحبِ انہماک کو غایت درجہ حاجت ہے اور یہ توانائی اُسی صورت میں عمل میں آتی ہے جب نفس کی کَل باقاعدہ طور پر بغیر رکاوٹ کے اپنا کام کئے جائے۔

اُلفت کئے جانے کا خیال انہماک کا معاون ہے اور یہ خیال کہ کسی کو مجھ سے لگاؤ نہیں انہماک کو برباد کر دیتا ہے محرومِ الفت شخص بعض دفعہ اپنی نیکی و احسان سے انتہائی کوشش کرتا ہے کہ لوگ اُس سے الفت کریں لیکن اس میں وہ عموماً ناکام رہتا ہے کیونکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ لوگ اکثر اسی سے اُلفت کرتے ہیں جو الفت کا مطالبہ نہ کرے۔ ناکام مطالبہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ دنیا درشت آدمیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ غلط ہے فی الحقیقت دُنیا میں خوش طینتی زیادہ ہے بد طینتی کم۔ ایسا محرومِ الفت شخص بالعموم خود اندیشی اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ ایک ایسی بے اطمینانی ہوتا ہے جس سے رہائی پانے کے لئے وہ دُنیا سے بے تعلق ہو کر اپنی ہی عزلت میں جا گزیں ہو جاتا ہے جو لوگ الفت پا کر مصون زندگی گزارتے ہیں وہ بہت زیادہ خوش رہتے ہیں اور عموماً اس صیانت کے احساس کے باعث ایک انسان بہت سی خطروں سے

ناخوش ناتجربہ کاروں کو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود چکھو اور دیکھ لو۔

اپنے آپ کو جان لو تو تمہاری زندگی میں خود بخود اضافہ ہو جائے گا۔

دوست از خود منتخب ہوتے ہیں۔

بچ جاتا ہے۔ زندگی میں خود اعتمادی بہت حد تک صحیح قسم کی الفت ملنے سے آتی ہے یہ اطمینان و اعتماد بہ نسبت الفت کرنے کے زیادہ الفت کئے جانے سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ باہمی الفت ان دونوں سے افضل و بہتر ہے۔ تعریف و ثنا سے بھی یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سیاسی رہنماؤں کو دیکھو جن کے کام کا دار و مدار زیادہ تر دوسروں کی ستائش پر ہے۔ بچوں کے لئے اُن کے والدین کی الفت لابدی ہے۔ جس بچے کو بچپن میں والدین کی محبت نہیں ملتی وہ بہت جلد فنا و بقا اور تقدیر کے مسائل پر غور و خوض کرنے لگ جاتا ہے وہ بڑا ہو کر دُنیا کو جہنم تصور کرنے لگتا ہے اور اِس جہنم کو قابل سکونت بنانے کے لئے وہ خود ہی اپنے فلسفے کی ایک دُنیا بناتا ہے اور اپنے گھر یا اپنے کتب خانے میں گھسا رہتا ہے تاکہ وہاں اپنے خیالوں کے ساتھ مصؤن و مامون رہے۔ اگر اسے بچپن میں اُلفت ملتی تو وہ اہلِ دنیا سے زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ دوچار ہو سکتا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ الفتِ مطلوبہ مضبوط ہو نہ کہ پھسپھسی۔ اس لئے ماں باپ کو چاہئے کہ وہ اپنے بچے کو گلے سے نہ لگائے رکھیں، اُس کی آٹھوں پہر حفاظت نہ کرتے رہیں بلکہ صرف بقدرِ ضرورت اس کی مدد کر کے اس سے استعداد و خوبی پیدا کرنے کی توقع رکھیں۔ جس بچے سے اس کی ماں بہت زیادہ لاڈ پیار کرے گی وہ بیاہا جا کر اپنی بیوی سے بھی روز و شب لاڈ پیار چاہے گا اور عموماً اس کا نتیجہ میاں بیوی کا بگاڑ ہو گا۔ الفت میں مصیبت کے وقت ہمدردی اچھی ہے لیکن مصیبت آنے سے پہلے اُس کے متعلق ہمدردانہ خوف کا اظہار بُرا ہے۔ دوسرے کی طرف سے ڈرنا بھی اتنا ہی بُرا ہے جتنا خود ڈرنا اور الفت میں بہت زیادہ خاطر مدارات اُسی شخص کے لئے مفید ہوتی ہے جو دلیر اور قوی دل ہو۔ الفت ملنے کی ایک اور نہایت ہی مرغوب اور مسرت خیز صورت ہے اور وہ ہے جنسی الفت یعنی مرد عورت کی باہمی کشش۔ جس مرد یا عورت کو کسی عورت یا مرد کی اُلفت نہ ملے وہ کبھی اپنے کام میں منہمک یا مسرور نہ ہو گا۔ یہ الفت ملنے کی کیفیت تھی۔ الفت کرنے کی دو قسمیں ہیں ایک قسم انہماک کا اظہار ہوتی ہے دوسری خوف کا۔ جو الفت اس وجہ سے کی جائے کہ کوئی خوف دور ہو یا کوئی ناخوشی کم ہو وہ اس قدر حیات انگیز نہیں ہوتی جتنی وہ الفت جس میں ایک نئی خوشی کی توقع ہو۔ البتہ انہماکی "الفت کی ایک مذموم شکل یک طرفہ الفت ہے وہ جس میں ایک شخص بیسیوں سے الفت پا کر اور گویا انہیں چوس کر اور بے جان کر کے خود کسی ایک سے بھی الفت نہیں کرتا۔ غرض بہترین الفت وہی ہے جو باہمی ہو، جو جانبین میں فطری طور پر پیدا ہو، جو محض ایک دوسرے کی بھلائی کی غرض سے قائم نہ کی جائے بلکہ جو ایک مرکب ہو جس کا نتیجہ خود بخود دونوں کی بہتری ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ شخص جو اپنی خودی کی چاردیواری میں محصور ہے خواہ وہ دنیا میں لاکھ کامیاب ہو، خواہ اُس کے پاس بے انتہا زر و مال کا خزانہ موجود ہو بغیر الفت پانے اور الفت کرنے کے کبھی زیادہ مسرور و شاد کام نہیں ہو سکتا۔ حال کے

کوئی شے دوستی سے زیادہ گراں بہا نہیں +

صحیح تنقیدی دوستی ایک نوع کی ربانی بصیرت پر مبنی ہوتی ہے +

عظیم الشان رفاقت صرف ایک عظیم الشان روح کا کام ہے +

حریت پسند نوجوان پرانی احتیاطوں اور نام نہاد نیکو کاریوں کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ مرد اور عورتیں جنہیں ایک دوسرے
کی کشش محسوس ہوتی ہے اس بات کے مجاز نہیں کہ ایک دوسرے سے فطری الفت و محبت کا اظہار کر سکیں۔ رسمی جنسی تعلقات
بالعموم خشک و بے الفت ہوتے ہیں اور وہی جنسی تعلقات ترقیٔ انسان کے لئے بار آور ثابت ہو سکتے ہیں جن میں علیحدگی اور
اور غلط حیاداری مطلق نہ ہو اور جس میں طرفین کی شخصیت ایک نئی مجتمع شخصیت میں مدغم ہو جائے۔ احتیاطیں اور معقول
پر اچھی ہوں تو ہوں لیکن محبت میں احتیاط انسانی خوشی کے لئے عموماً زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔

جتنے ادارے پرانے زمانے سے چلے آتے ہیں ان میں اس وقت کوئی ادارہ اس قدر درہم برہم نظر نہیں آرہا جتنا کہ
خاندان۔ خاندانی زندگی آج کل بجائے خوشی کے ناخوشی کا گہوارہ بن رہی ہے۔ جتنی ناخوشی اور کرب و اندوہ آج ایک گھرانے
کے ارکان کے مابین نظر آرہا ہے کہیں اور نظر نہیں آتا (اور یہ ناخوشی مشرق میں ابھی کم نظر آتی ہے لیکن مغرب میں تو گویا خاندانی
زندگی پر آفت ٹوٹ رہی ہے)، لڑکے لڑکیاں بچے بچیاں تک گستاخ ہو گئے ہیں۔ ماں باپ کا وہ اقتدار اور وہ اثر نہیں رہا جو پہلے
تھا۔ اکثر گھروں میں وہ سکون و مسرت اور وہ امن و امان قائم نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ عورتیں بیوی
بننے اور بچے جننے کو وبالِ جان سمجھنے لگی ہیں کیونکہ اب وہ آپ اپنی روزی کما سکتی ہیں اور اس طرح محض خانہ داری کے انتظام
اور بدمزاج اور اکھڑ نوکروں نوکرنیوں کے اہتمام سے نجات پا سکتی ہیں۔ ہر عورت جو آپ اپنی روزی کمائے آزاد ہوتی ہے جہاں
چاہتی ہے جاتی ہے جو چاہتی ہے کرتی ہے اُسے کسی شوہر کی دلداری اور خاطر مدارات مقصود نہیں وہ مکان کی محتاج نہیں
اسے بچوں کی گستاخی اور احسان ناشناسی سے واسطہ نہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ شادی شدہ ہیں وہ ان تمام مشکلوں میں گرفتار
ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ اپنے بچوں سے کیا توقع رکھیں کیا نہ رکھیں وہ بات بات میں جھجکتے ہیں کیونکہ والدین کے احکام یا خواہشات
کی بجا آوری اب عقلی فیشن کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شادی شدہ اور خصوصاً سمجھدار شادی شدہ اولاد کی زیادہ خواہش
نہیں رکھتے بلکہ ہر ممکن ذریعہ اختیار کرتے ہیں جس سے وہ اس "نعمتِ خداوندی" سے محروم رہیں۔ مغربی تمدن بانجھ ہو رہا ہے
اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب وہ ناپید ہو جائے گا۔ مذہبی آدمی بہتیرا چلاتے ہیں کہ اولاد روکنا گناہ ہے، خدائی
احکام اور مشیتِ ایزدی کے خلاف ہے اس کا نتیجہ عذاب ہوگا اور مصیبتیں نوعِ انسان پر نازل ہوں گی لیکن وہاں کون
سنتا ہے احکام او مشیت پر اب کون کان دھرتا ہے کہ ان چیزوں کے زمانے ہو چکے۔ تاہم نفسیاتی مفکرین اور دوسرے رہنماؤں
کو تشویش ہو رہی ہے کہ کس طرح اس صورتِ حالات کا تدارک کریں۔ وہ سمجھتے ہیں، کم از کم ان میں اعتدال پسند صاف صاف
کہتے ہیں کہ عیالداری یا زیادہ صریح لفظوں میں خاندانی زندگی سے جو خوشیاں انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں وہ دوسری سب خوشیوں
سے زیادہ دل خوش کن اور پائدار ہوتی ہیں۔ رسل کو اس کا یقین واثق ہے اور ذاتی تجربہ ہے۔ رسل کی بیوی ڈورا رسل نے بھی اپنی
تصنیف "خوش رہنے کا حق" میں اس کا اعتراف کیا ہے اگرچہ اس کی انقلاب پسندی جنسی آزادی کی زبردست حامی و موید ہے اور
اس لئے وہ چاہتی ہے کہ شادی شدہ حالت میں بھی میاں بیوی کو انتہائی آزادی دی جائے جس میں وہ کھلم کھلا جو خود مناسب

سمجھیں کریں۔ رسل کہتا ہے کہ جوانی کے گزر جانے کے بعد اس دُنیا میں خوش رہنے کا آسان ترین ذریعہ یہ ہے کہ انسان محسوس کرے کہ میں ایک تن تنہا فرد نہیں بلکہ زندگی کی بہتی ہوئی ندی کا جزو ہوں جو نہیں معلوم کب سے بہہ رہی ہے اور نہیں معلوم کب تک بہے جائے گی تخلیق کی حس ہمیں اس ندی سے وابستہ رکھتی ہے۔ ہمیں اپنے بعد میں آنے والی دُنیا سے دلچسپی رہتی ہے ہم یہ نہیں سمجھ لیتے کہ زندگی محض فضول ہے اور دنیا فقط فانی۔ ماں باپ کی محبت ایک خاص نوع کی انوکھی محبت ہے جو بچوں کو کسی اور سے کبھی میسر نہیں آسکتی اور اس محبت کا اثر طرفین کے لئے کارآمد ہے۔ والدین کی محبت بچوں کے لئے ایک بے غرض محبت ہوتی ہے مصیبت اور آفت کے وقت اس سے ایک ایسی تسکین ہوتی ہے اور ایک ایسا اطمینان ملتا ہے جو کہیں اور دستیاب نہیں ہوسکتا۔ لیکن محبت کے تمام تعلقات میں پوری خوشی جب ہی حاصل ہوسکتی ہے کہ محبت دوطرفہ یکساں ہو۔ والدین بچوں سے محبت رکھتے ہیں تو بچوں کو بھی لازم ہے کہ والدین سے محبت رکھیں اگرچہ یہ توقع مشکل ہے اور غیر ضروری کہ بچے بھی والدین سے پوری اتنی ہی محبت رکھیں جتنی والدین بچوں سے رکھتے ہیں عیالداری کی مسرت کے دو وجوہ ہیں ایک یہ ہے کہ ہمارا وجود اور جسم وسعت پاتا ہے ہم اپنے آپ کو ایک دوسری شخصیت میں مجسم دیکھتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس میں طاقت اور نزاکت کا ایک نہایت نفیس امتزاج ہوتا ہے۔ والدین کے لئے ایک ننھے وجود کی حفاظت اور پرورش تکلیف سے زیادہ خوشی کا موجب ہے لیکن والدین کا یہ خواہش رکھنا کہ ہمارا بچہ ہمیشہ ہی ہماری حفاظت میں رہے وہ بڑا بھی ہو جائے تو ہم گویا اُس کی پرورش ہی کرتے ہیں بچے کے لئے غایت درجہ ضرر رساں ہے۔ دراصل یہ محض والدین کی قبضہ کئے رکھنے کی خواہش ہے اور فہیم اور صحیح محبت کرنے والے والدین کو چاہئے کہ وہ بچے کی شخصیت کو جلد سے جلد آزاد اور خود مختار ہو جانے دیں تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا سیکھے اور وہ دنیا میں خود کچھ کرنے کے قابل ہو +

عیالداری کی مکمل خوشی وہی لوگ محسوس کرسکتے ہیں جو بچے کی شخصیت کو عزت آمیز محبت کی نگاہ سے دیکھیں کہ اُن کو نہ غیر ضروری توقعات ہوں گی نہ خود غرضانہ خواہشات۔ اس قسم کی آزاد محبت سے جو دلی اور روحانی خوشی محبت کرنے والے کو ہو سکتی ہے۔ وہ جبر و قبضہ سے کبھی نہیں ہوسکتی لیکن اس کے یہ بھی معنی نہیں کہ والدین اپنے بچوں کے غلام بن جائیں۔ والدین کے لئے نری والدیت ہی زندگی نہیں اور جن ماں باپ پر بچوں کا زیادہ بوجھ پڑے گا جو بچوں کے لئے روز و شب کچھ نہ کچھ کرتے رہیں گے انہیں یقینی طور پر اپنی اولاد سے زیادہ توقعات وابستہ ہوں گی اور اس لئے ان کا اور ان کی اولاد کا باہمی تعلق کبھی دیر تک تسلی بخش نہ رہے گا۔ ماؤں نے جس طرح صدیوں سے اپنی ساری کی ساری عمریں اپنے بچوں اور اُن کے باپوں کی نگہداشت اور خاطر مدارات میں کاٹی ہیں وقت آگیا ہے کہ اب انہیں اس دن رات کی غلامی سے نجات دلائی جائے اور ایک ایسا طریقۂ عمل اختیار کیا جائے جس سے ماں اور باپ اور بچوں سب کی انفرادی خصوصیات اور قوتیں نشوونما پائیں اور زندگی کے کاموں میں بروئے کار آئیں +

کام میں مشغولیت خوشی کا موجب ہے بشرطیکہ کام کا بوجھ زیادہ نہ ہو۔ کام کے بغیر نکمے امیروں کی زندگی اُن کے لئے

بیزاری اور بے چینی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ کام کرنے سے بیزاری کا احساس دور رہتا ہے کیونکہ وہ بیزاری جو غیر دلچسپ کام سے بھی پیدا ہو اتنی بیزارکن نہیں ہوتی جتنی نری طبعی فراغت کی بیزاری۔ کام کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کامیابی اور ترقی کے موقع دستیاب ہوتے ہیں اور انسان کی شخصیت جلا پاتی ہے۔ مقصد کا تسلسل پائدار خوشی کا ایک نہایت اہم اور ضروری جزو ہے اور یہ تسلسل عموماً کام ہی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کام دو باتوں سے دلچسپ بنتا ہے اول مہارات کے استعمال سے دوم تعمیریت سے۔ ماہر آدمی ہمیشہ اپنے کام سے ایک خاص نوع کی خوشی پاتا ہے اور جب تک وہ ترقی کرتا رہے اُس کی خوشی بڑھتی رہتی ہے۔ مہارت کی لطف اندوزی ہوا بازوں سے قلابازیاں لگواتی ہے اور کھلاڑیوں کو بعض اوقات جان پر کھیل جانا سکھاتی ہے۔ مغرب میں ستر ستر برس کے بوڑھے ماہرین سیاست ہو کر مسرور زندگی کے بامراد عاشق بنے رہتے ہیں۔ تعمیریت تباہ کاری کی بہ نسبت زیادہ پائدار خوشی پیدا کرتی ہے کیونکہ وہ مقاصد سب سے بڑھ کر تسکین دہ ہوتے ہیں جو انسان کو ایک کامیابی سے دوسری کامیابی کی طرف لے چلیں اور یہ بات کبھی تباہ کاری کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ کسی بڑے تعمیری کام کے کرنے میں جو تسکین ہوتی ہے وہ زندگی کی سب سے بڑی خوشیوں میں شامل ہے اگرچہ بدقسمتی سے یہ تسکین صرف بڑے بڑوں کو میسر آسکتی ہے۔ طبیعت داتوں اور بعض ادبا و شعرا کی مسرت کچھ ان کی عام قدردانی کا نتیجہ ہوتی ہے اور کچھ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ تخلیقی و طبع زاد کام خود بخود دل کو مسرور کر دیتا ہے۔ کم از کم یہ ضرور ہوتا ہے کہ اُن کا کام ان کی ناخوشی کو کچھ نہ کچھ کم کر دیتا ہے۔ شیکسپیر اپنے کلام کے متعلق کہتا ہے کہ جب تک انسان سانس لے گا اور جب تک آنکھ دیکھے گی تب تک یہ بھی زندہ رہے گا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس خیال سے اس کی کلفتوں میں کمی ہوتی تھی۔ اپنے ایک سانیٹ میں وہ کہتا ہے کہ اپنے دوست کے خیال نے زندگی کو میرے لئے قابل برداشت بنا دیا لیکن یہ نتیجہ غالباً دوست کے خیال سے نہیں بلکہ خود اُن عشقیہ نظموں ہی سے ظہور میں آیا۔ عام طور پر علم و ادب کے دائرے میں ناخوشی کا زیادہ دور دورہ ہے اور اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ بہت سے علما و ادبا کو اپنی قابلیت کے لئے مناسب موقع دستیاب نہیں ہوتے کبھی انہیں ایسا کام کرنا پڑتا ہے جو ان کی پسند کے مطابق نہیں ہوتا کبھی ایسا جو اُن کے ضمیر کے خلاف ہوتا ہے۔ اس سے اُن کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہے اور بغیر خودداری کے اصلی خوشی بے انتہا عسیر الحصول ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تعمیری کام صرف بڑے بڑوں کے نصیب میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے تعمیری کاموں میں بھی زندگی کی خوشیاں مضمر ہیں لہٰذا ہر شخص کو وہ کام کرنے کی کوشش کرنا چاہئے جس کی اُس میں صلاحیت ہو جس میں وہ دلچسپی لے سکے، جو وہ کسی اچھے طریقے میں کر سکے اور یہ شرائط بہت سے معمولی کاموں میں پوری ہو سکتی ہے۔ بچوں کی پرورش، دستکاری کا کام، کسی قسم کی تصنیف یا تالیف، غرض بیسیوں معمولی معمولی کام ہیں جن کا ذکر کرنا انسان کے اپنے اور دوسروں کے لئے مفید اور موجب

زندگی مسلسل تجربے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ جو شخص زندگی سے لطف اٹھانا چاہے اسے تفتیش و دریافت میں منہمک رہنا چاہئے۔

تم کو جس کام کا ملکہ ہو صرف اُسی کے کرنے کی عادت ڈالو۔

مسرت ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کا رجحان ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی کو بیک نظر دیکھ سکتے ہیں یعنی انہیں اپنی زندگی مربوط نظر آتی ہے اس کے برعکس بعض لوگوں کو اپنی زندگی پارہ پارہ دکھائی دیتی ہے۔ جس میں الگ الگ بکھرے ہوئے واقعات ہوتے ہیں۔ زندگی کو مجموعاً دیکھنے کی عادت خوشی کی معاون ہے اسی لئے ایک ایسا مقصدِ زندگی جو یکسانیت لئے ہوئے ہو عموماً زیادہ مسرت خیز ہوتا ہے۔

بے غرضانہ دلچسپیاں زندگی کی مصروفیت کا جزو ہوں تو زندگی میں خوش رہنا زیادہ آسان ہوجاتا ہے صرف بیچ کے مفید کاروباری معاملات میں منہمک رہنا زندگی کو غیر دلچسپ بنادیتا ہے۔ اس سے انسان کے نفس میں بے کلی، کم اندیشی، تنک مزاجی اور عدم تناسب پیدا ہوتا ہے اور ان چیزوں سے تھکن پیدا ہوتی ہے اور تھکن پھر ان چیزوں میں اضافہ کر دیتی ہے جس کا آخری نتیجہ یقینی طور پر جسمانی و نفسی علالت ہوتا ہے۔ جو لوگ کبھی کبھی اپنے کام سے بے پروا ہوجاتے ہیں گویا جنہیں اپنے کام میں اونگھ جانے کی عادت ہے وہ بسا اوقات اپنا کام زیادہ خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں وہ شخص جو کام ہو چکنے کے بعد اپنے کام کو بالکل بھلا دیتا ہے۔ اپنا کام بدرجہا بہتر کرتا ہے اس شخص سے جس کا کام ہو چکنے کے بعد بھی اُس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ ہر کام کرنے والا ایسی باتوں سے بھی دلچسپی لینا سیکھے جن کو اس کے کام سے کوئی تعلق نہیں اور جن میں وہ قویٰ معطل رہتے ہیں جن پر کاروبار کی انجام دہی میں زور پڑے تفریحات تماشے، کھیل، کتب بینی، سیر و سیاحت اور بیسیوں اور ایسی باتیں تضیع اوقات کا موجب نہیں بلکہ ان میں دلچسپی لینے سے ہم نہ صرف اپنے کام کو بہتر سرانجام دیتے ہیں بلکہ ہمیں دنیا کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں اور ہماری زندگی زیادہ دل آویز ہمارا نفس زیادہ مکمل اور ہماری روح زیادہ حقیقت آشنا ہوجاتی ہے ہم پھر اس دھوکے میں نہیں پڑے رہتے کہ دنیا میں صرف دو ہی چیزیں ہیں ہم اور ہمارا کام۔ یوں دنیا کی ایک زیادہ صحیح تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے ہمیں اس عجیب و غریب مقام میں صرف تھوڑا عرصہ رہنا ہے اس تھوڑے عرصے میں ہم جتنا کچھ بھی دیکھ سکیں اچھا ہے۔ کہیں تماشا دیکھنے کو جانا اور بعض منظروں کے دوران میں آنکھیں بند کئے رہنا کون سی عقلمندی ہے۔ دیکھنے اور جاننے اور سمجھنے اور لطف اٹھانے کے جتنے موقع بھی ہمیں ملیں ہمیں اُن کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے۔ یہاں رونے کی باتیں بھی ہیں ہنسنے کی چیزیں بھی ہیں تعجب کی حالتیں بھی ہیں، غرض رنگ رنگ کی کیفیتیں ہیں۔ عقلمند آدمی کو چاہئے کہ ان چیزوں میں سے جتنی بھی ہو سکے وہ دیکھے

زندگی کے کئی مواقع جو زیادہ اہمیت نہیں رکھتے فی الحقیقت اہم ہیں کیونکہ عموماً ایسے ہی اوقات میں خوش طبعی پنپتی اور دوستی جلا پاتی ہے۔ حسنِ ادب کا تقاضا ہے کہ ہم بڑی سے بڑی باتوں کو بھی تھوڑی دیر کے لئے بھول جائیں اس سے ہمارے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

ایک مکمل کتب خانے کے دریچوں سے ساری دنیا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

کائنات کی عظیم الشان وسعت اور عمق جس دل میں گھر کر جائے وہ کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہو سکتا۔

اور اُن سے اپنی شخصیت کو مالا مال بنالے۔ دُنیا کے اس ذرا سے کونے میں جس میں ہم رہتے سہتے ہیں ہم اپنے کاموں میں اس قدر منہمک و مستغرق ہوجاتے ہیں۔ اس قدر ہمہ تن توجہ اور ہمہ تن اضطراب ہوجاتے ہیں کہ ہمیں کسی اور شے کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ جدوجہد کی زندگی کے پجاری ہمیں بتاتے ہیں کہ اس طریقے سے ہم زیادہ کام کرسکتے ہیں ہاں زیادہ کام شاید کرلیتے ہوں لیکن اس طریقے سے ہم بہتر کام نہیں کرسکتے۔ انسان اس دُنیا میں کیا اک ذرا سا کیڑا ہے اور یہ دُنیا نظامِ شمسی میں کیا اک ذرا سا خطہ ہے اور نظامِ شمسی کائنات میں کیا اک ذرا سا ذرہ ہے! یہ باتیں ہم کو بھول نہ جانی چاہئے اور وہ شخص جو صرف اپنے کام میں روز و شب منہمک ہے بھول جاتا ہے کہ اُس کے کام کی اہمیت جتنی وہ سمجھتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ تمدنِ حاضر کی تعلیم اس بارے میں ناقص ہے۔ متمدن انسان کسی قسم کی مخصوص مہارت حاصل کرلیتا ہے اور اُسی میں غرق ہوجاتا ہے۔ اُس کا نفس اور اُس کا دل وسیع نظری سے وسعت نہیں پکڑتے۔ وہ کسی کونسل کی رکنیت کے لئے امیدوار بنتا ہے تقریریں کرتا ہے لوگوں کی خاطر مدارات کرتا ہے۔ اپنے مخالفین پر نکتہ چینی کرتا ہے جھوٹے سچے وعدے کرتا ہے، کسی قوم کی برائی کرتا ہے، کسی بُرے جذبے کو ابھارتا ہے ان ذرائع سے وہ غالباً کامیاب تو ہوجاتا ہے اس کا فوری مقصد اسے حاصل ہوجاتا ہے لیکن کم از کم تمدن کے انتہائی مفاد کو اس سے ایک سخت صدمہ پہنچتا ہے اس کے برخلاف اگر اُسے خیال ہو کہ زمین کیوں کر کروڑوں سالوں میں اپنی موجودہ حالت میں آئی، انسان کیوں کر لاکھوں سالوں میں انسان بنا ساری کائنات کتنی بڑی اور حیرت انگیز ہے۔ ہماری دُنیا کتنی چھوٹی اور ہم کیسے معمولی وجود ہیں تو وہ اپنے جنگ و جدل کی مساعی میں زیادہ وسعتِ نظر اور زیادہ عاقبت بینی سے کام لے سکے اُس کے سامنے ایسے مقاصد اور اک ایسا نصب العین قائم ہوجائے جن کے ہوتے ہوئے اُس کا نفس ایک نوع کی پائدار خوشی سے روز بروز زیادہ مضبوط اور مطمئن ہوتا جائے نوجوانوں کی تعلیم کس قدر بہتر و بار آور ہو اگر اپنی تعلیم سے وہ اُدھر تو یہ محسوس کریں کہ زندگی اس سیارے پر محض ایک عارضی حادثہ ہے اور ادھر یہ سمجھ لیں کہ ہر روز کتنی کچھ جدت اور کتنی کچھ عظمت کی قابلیت رکھتا ہے! وہ شخص جس کی رُوح میں ترقی کی صلاحیت ہے اپنے نفس کے دریچے کھلے چھوڑ دیتا ہے کہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی ہوائیں کائنات کے کونے کونے سے اُس کی بند کوٹھڑی میں خوب چلیں اور وہ اس سے لطف اٹھائے اور اپنا آپ بڑھائے۔ وہ شخص جس کا نفس دُنیا کا آئینہ ہے اُس کا نفس دُنیا ہی کی طرح وسیع ہوجاتا ہے۔ نشیب و فراز زندگی میں اسے ایک نوع کا اطمینان حاصل رہتا ہے جو گویا اس کا بہترین رفیق و مددگار ہے۔ ہر فردِ بشر کی زندگی میں ایسے وقت آتے ہیں جب مصیبتیں چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتی ہے جب ہر درست شے گویا غلط ہوجاتی ہے، روپیہ لُٹ جاتا ہے، عزیز مرجاتے ہیں، دوست رفو چکر ہوجاتے ہیں، کام بے مزہ ہوجاتا ہے ایسے وقتوں میں کسی اور بات میں جی کو لگا سکنا ایک نعمت ہے جو بسا غنیمت ہے۔ کوئی ایسے آڑے وقت میں شطرنج کھیلنے لگ جائے گا، کوئی سراغ رسانی کے افسانے سنے گا، کوئی ستاروں کی حرکات میں دلچسپی لے گا، کوئی کلدانیوں کے کھنڈروں کے حالات پڑھے گا۔ غرض کوئی کسی چیز سے اپنا جی بہلائے گا کوئی کسی چیز سے اور یہ سمجھ داری اور دُور اندیشی ہی تکلیف، مصیبت، موت، انسانی زندگی میں ان کا دور دورہ تو ہو کر رہے گا۔ یہ غیر اغلب نہیں کہ انسان پر مصیبت کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑے

کہ اُس کا دل پاش پاش ہو جائے لیکن دل کے ان ٹکڑوں کو پھر بھی جوڑ نا یہ ہے عقلمند اور دور اندیش انسان کا کام۔ ایک دوسرا طریقہ ہے اپنی تکلیفوں کو بھولنے کی کوشش کرنا افیم اور شراب اور رندی سے لیکن یہ فقط اپنی روح کو برباد کرنا ہے البتہ بعض ناساعد حالات میں مختلف باتوں میں اپنے جی کو لگا لینا جو اگر مفید نہ ہوں تو کسی کے لئے ضرر رساں بھی نہ ہوں بلاشبہ مفید اور کارآمد ہے کیونکہ اس سے زندگی کی ندی محض ایک بدررو ہو جانے سے بچ جاتی ہے اور اس کا بہاؤ اور اُس کی وسعت کم ہونے نہیں پاتی +

سعی و تسلیم کا صحیح امتزاج زندگی کے توازن کے لئے ضروری ہے۔ اعتدال کا نظریہ جو زندگی کے اکثر مرحلوں میں صحیح رہنمائی کا کام دیتا ہے اس باب میں بھی ہماری نفسی مشکلات کا بہترین حل ہے۔ ایک حد تک پوری کوشش کرو اور پھر قسمت پر چھوڑ دو اور سر تسلیم خم کر دو۔ انسان کا اولین فرض سعی اور جدوجہد ہے۔ دنیا کی معاشرت کا ایسا انداز ہے کہ یہاں روٹی بھی بغیر ہاتھ پاؤں ہلانے کے میسّر نہیں آتی۔ اور تو اور فریب کار فقیروں کو بھی اپنی روزی کمانے کے لئے سو ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ دنیائے حاضر کی مقابلہ بھری زندگی میں کوشش کے بغیر گزارہ نہیں۔ رفیق زندگی کے حصول میں بچوں کی پرورش میں کسی قسم کی بہتری کے حصول میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں توجہ اور کوشش کی ضرورت ہے مثلاً قوت جو زندگی کی بہترین خواہشات میں سے ہے اور جس کے حصول سے وہی شخص بے پروا ہوتا ہے جو اپنے ہم جنسوں سے بے پروا ہو کوشش بلکہ طویل کوشش ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اُدھر تسلیم خوشی کے حصول کا ایک لازمی ذریعہ ہے عقلمند آدمی مناسب کوشش کرنے کے بعد نتیجہ مستقبل پر چھوڑ دیتا ہے جو ہو سو ہو کہہ کر سکون و آرام کے مزے لیتا ہے تسلیم یاس انگیز نہ ہونی چاہئے۔ یقین میں ان خیالات کا دور دورہ نہ ہونا چاہئے کہ انسان تو محض ہیچ ہے اور تدبیر قطعاً لاحاصل ہے اور تقدیر ہی ہے جو ہے اور انسان کی اصل زندگی تخیلات اور غور و خوض و مراقبہ میں مضمر ہے نہیں بلکہ صحیح تسلیم میں ایک ناقابل تسخیر امید کی ایک ہمہ گیر غیر ذاتی امید کی روشنی پر توانگن ہونی چاہئے۔ اگر انسان کی ذاتی توقعات میں نوع انسان کی غیر ذاتی عالمگیر امیدوں کی آمیزش ہوگی تو مصیبت و نکبت کبھی آ کر اُس کی رُوح کو ہمیشہ کے لئے بیکار نہ کر سکیں گی۔ ایک ایسا موجد جسے اپنی ایجاد میں ہزاروں مشکلوں کا سامنا ہو جسے بالآخر اپنے تجربے چھوڑ کر ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑے اگر اُس نے زیادہ تر علمی ترقی کی خاطر تکلیفیں جھیلی ہیں اور کوششیں کی ہیں تو ناکامی اُسے کبھی قطعاً مایوس نہ کر دے گی لیکن اگر اُس کا مُدعا

بغیر جدوجہد اور مسلسل مشغولیت کے زندگی سے لطف اٹھانا ممکن نہیں۔

ذاتی کوشش علم کوشش کے ماحول میں پھولتی پھلتی ہے اگر تم اچھی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ کس طرح دوسروں نے خوبی کے ساتھ اپنی زندگی گزاری

خزانے بغیر کوشش کے شاذ و نادر ہی دستیاب ہوتے ہیں +

ہم انسانوں کا رستہ تاریکیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے لیکن ہماری آنکھیں تاروں پر لگی ہوئی ہیں +

محض حصولِ زر تھا تو نتیجہ دگرگوں ہوگا۔ بعض لوگ زندگی کی معمولی معمولی تکلیفوں میں بے صبر و بے تاب ہو جاتے ہیں اگر ریل وقت پر چھوٹ جائے اور وہ اس میں سوار نہ ہو سکیں تو وہ غصے سے بے تاب ہو جاتے ہیں اور زمین پر پاؤں دے دے مارتے ہیں۔ کھانا ذرا خراب پکا ہو تو وہ نوکروں کے لئے قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ اُن کی انگیٹھی دھواں دینے لگے تو وہ مایوسی سے مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے زود رنج آدمی اُس توانائی کو محفوظ رکھیں جو وہ اس طرح بے موقع بے ضرورت ضائع کرتے رہتے ہیں تو شاید وہ ملک کے ملک فتح کر لیں اور خدا جانے کیسی کیسی اور مہمیں نہ سر کر لیں۔ سمجھ دار آدمی خیال ہی نہیں کرتا کہ ملازم نے ایک تپائی پر سے گرد کیوں نہیں صاف کی، باورچی نے ایک آلو نیم پخت کیوں چھوڑ دیا، خاکروب نے چالیس پچاس تنکوں پر اپنی جھاڑو کیوں نہیں پھیری یعنی ایسی چیزوں کا جب وہ تدارک کرتا ہے تو بغیر جذبے اور جوش کے کرتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر تشویش، ذرا ذرا سی چیز پر غصہ لاحاصل ہے، ضرر رساں ہے بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ جو کہتے ہیں کہ یہ ان کے بس کی باتیں نہیں وہ ان باتوں میں تسلیم کی خو ڈالیں پھر دیکھیں کہ کیوں کر بڑی اور چھوٹی سب باتوں میں اُن کا نفس زیادہ مطمئن اور خوش رہتا ہے پھر لوگوں کی عجب عادتوں پر انہیں محض ہنسی آئے گی۔ پھر کسی دعوت پر جاتے وقت اگر اُن کے بوٹ کا تسمہ کھل جائے گا یا ٹوپی کا پھندنا ٹوٹ جائے گا تو وہ سمجھ لیں گے کہ کائنات کی تاریخ میں کوئی ایسا اہم واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو گیا جس کا دُور تک اور دیر تک اثر پڑ گیا ہو۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں ظریفانہ خیالوں اور مذاقیہ مثالوں سے آپ سے آپ اُڑان چھو ہو جاتی ہیں۔ یہ اچھا نہیں کہ ہم دن بھر اپنے آپ کو ایک الم انگیز داستان کا مصیبت زدہ ہیرو تصور کئے رہیں۔ ہر حالت کے لئے مناسب اور بہترین رویہ اختیار کرنا ذرا عقل و تجربہ چاہتا ہے اور عقل و تجربہ سے ظاہر ہے کہ جب تک انسان میں کچھ نہ کچھ تسلیم کی عادت نہ ہوگی وہ اکثر فکر و تشویش کا شکار بنا رہے گا بعض سعی پسندوں کو وہم ہے کہ تسلیم کی عادت کامیابی کے لئے مفید نہیں کیونکہ وہ توانائی کی راہ میں روڑا اٹکاتی ہے یہ غلط ہے کام کام کے متعلق دھوکے میں پڑے رہنے سے بہتر سرانجام نہیں ہو جاتا، نہ اسے مشکل تصور کرنے سے وہ آسانی سے ختم ہو جاتا ہے وہ کام جس کے کرنے میں اپنے آپ کو سارا وقت اکساتے رہنا ضروری ہو مفید ہے لیکن مضر بھی ضرور ثابت ہوگا اس کے برخلاف ایسا کام جس کے کرنے سے پہلے یا کرتے وقت انسان اونچ نیچ کو خوب سوچ سمجھ لے کبھی مایوسی یا غلط فہمی کا موجب نہیں ہو سکتا۔

غرض ہم دیکھ چکے ہیں کہ خوشی کا انحصار دو باتوں پر ہے دُنیا کے بیرونی اسباب پر اور انسان کے اپنے رویّہ پر۔ خوشی کے لئے جس نسخے کی ضرورت ہے وہ بالکل سادہ ہے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے ایک خاص قسم کے مذہبی اعتقاد کی ضرورت ہے۔ مذہب

صحیح قسم کی حقیقت بینی کا لازمی نتیجہ صحیح قسم کی تصوریت ہے۔

اس سے بڑی غلطی کوئی نہیں کہ ہم سمجھ بیٹھیں کہ زندگی سنجیدہ ہی ہمیشہ سنجیدہ ہے اور محض سنجیدہ ہی کسی نے خوب کہا ہے کہ یہ دُنیا تو ایک تماشا گاہ ہے۔

مذہب انسانی تمدن کا ایک لازمی جزو ہے۔ وہ فریب کاری کے کہر کو دُور کر دیتا ہے اور حقیقت بینی اور مسرّت کو دو چند کر دیتا ہے

انسان کے لئے کہاں تک ضروری ہے وہ کیسا ہو کیسا نہ ہو یہ ایک دوسرا سوال ہے لیکن محض خوش رہنے کیلئے مذہب پر اعتقاد مذہب پر اعتقاد نہیں بلکہ سوداگری ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اُن کی مصیبتوں اور غموں کے اسباب نہایت پیچیدہ اور "عقلی" ہیں۔ یہ سب فضول ہے۔ ناخوش آدمی عموماً ایک غم انگیز فلسفے یا اس غیر خیالات پر یقین کر لیتا ہے اور مسرور انسان خود بخود خوشی کا مذہب اختیار کرتا ہے۔ بعض چیزیں اکثر لوگوں کی خوشی کے لئے لابدی ہیں مثلاً خوراک، مکان، صحت، محبت۔ کام میں کامیابی، دوسروں میں عزت، بعضوں کے لئے بچے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہاں صرف ایک غیر معمولی آدمی خوشی حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ چیزیں میسر ہوں اور پھر بھی آدمی ناخوش ہو تو وہ یقیناً کسی قسم کی نفسی بے ترتیبی کا شکار ہے جس کا علاج اگر وہ معمولی سمجھ کا مالک بھی ہو تو خود کر سکتا ہے۔ جہاں بیرونی حالات خاص طور پر ناموافق نہ ہوں وہاں خوشی کا حصول بآسانی ہو سکتا ہے بشرطیکہ انسان کے جذبات اور دلچسپیوں کا رجوع باطن کی طرف نہ ہو بلکہ خارج کی طرف۔ اس لئے تعلیم اور ہماری ذاتی مساعی کا نصب العین یہ ہونا چاہئیے کہ ہم اپنے خود اندیش جذبات و شہوات مثلاً خوف، حسد، گناہ احساسی، خود پسندی کو روکیں تاکہ ہم اپنی ذات یا اپنی ہی شخصیت کے اندر نہ گھرے بیٹھے رہیں بلکہ دنیا اور کائنات سے ایک صحیح اور پائدار واسطہ پیدا کریں۔

مسرور انسان وہ ہے جس کی زندگی کو زیادہ تر دوسروں سے واسطہ ہو، جس کی الفتیں آزاد اور جس کی دلچسپیاں متنوع ہوں، جس سے دوسرے اُس کے لئے اور وہ دوسروں کے لئے ایک دل آویز وجود بن جائے۔ الفت کئے جانے سے خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن عام طور پر الفت ملتی بھی اُسی کو ہے جو خود اُلفت کرے بشرطیکہ وہ شروع سے لین دین کی طرح الفت سے تجارت نہ کرے۔ سوال یہ ہے کہ ایک انسان کو جو ناخوش ہو کیا کرنا چاہئیے؟ ایک ناخوش آدمی جب تک اپنی ناخوشی کے خیال میں غرق رہے فی الحقیقت اپنے آپ میں غرق رہتا ہے۔ اگر وہ خود اندیشی اور ناخوشی سے رہائی چاہتا ہے تو اسے غیر مصنوعی طور پر بیرونی دلچسپیوں میں مصروف ہونا چاہئیے۔ اگر وہ گناہ احساسی کا شکار ہے تو اسے اپنے آپ کو سمجھانا چاہئیے کہ میں نے کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس سے میری روح تباہ ہو گئی ہو، اگر وہ اپنے آپ کو بہت بد قسمت سمجھتا ہے تو اُسے غور کرنا چاہئیے کہ وہ کچھ اتنا بد بخت نہیں جتنا اُسے وہم ہے اگر وہ خوف سے کانپتا ہے تو اسے نڈر بننے کی مشق کرنی چاہئیے ناخوش آدمی کو کئی قسم کی روزانہ مشقوں کی ضرورت ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ انسان کو چاہئیے کہ وہ ہر روز کم از کم اپنی ایک کمی کا جی میں اعتراف کر لیا کرے۔ البتہ ناخوش آدمی کو کمیوں کے اعتراف کے ساتھ اپنی خوبیوں پر اصرار بھی کرنا چاہئیے مثلاً وہ اپنے جی سے کہے کہ ہیں جو ان دو ایک باتوں میں فلاں شخص سے بہتر ہوں اگر ان دو ایک باتوں میں اس سے فروتر بھی ہوں تو میری زندگی اس سے کچھ ایسی خراب نہیں ہو گئی۔ اس قسم کی روزانہ مشقیں اگر برسوں تک جاری رکھی جائیں تو انسان یقیناً زیادہ دلیر اور زیادہ خوش ہو سکتا ہے۔

کونسی بیرونی چیزیں اور دلچسپیاں ہیں جن میں تم کو مصروف ہونا چاہئیے؟ اس سوال کا جواب خود تمہاری فطرت کا میلان اور تمہارے حالات مہیا کریں گے۔ ابتدا ہی میں اپنے آپ کو یوں نہ کہو کہ "میری زندگی خوب مزے میں گزرے اگر میں ٹکٹ جمع کرنے شروع کر دوں" اور پھر لگو ٹکٹ جمع کرنے۔ اس طرح کی جھوٹ موٹ مسرّت جوئی سے مسرت حاصل نہ ہو گی۔ دلچسپی ہمیشہ غیر مصنوعی اور اصلی ہونی چاہئیے جس میں نفس حقیقتاً مصروف ہو۔

رسل کہتا ہے کہ ایک مسرور زندگی عموماً حیرت انگیز حد تک ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ایک نیکوکار زندگی۔ اخلاقی واغطین ایثار پر بہت زور دیتے ہیں۔ جو شخص اپنے ایثار سے آگاہ ہو وہ اپنے آپ میں منہمک اور اپنے ایثار کے خیال میں غرق رہتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ اس کا فوری اور نہ اس کا انتہائی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ ضرورت ایثار کی نہیں بلکہ دلچسپیوں کو اس طرح بیرونی اشیا کی طرف مبذول کرنے کی ہے کہ ایک انسان خود بخود بے جانے ایسے کام کرتا ہے جو ایک "نیکی پیشہ" سمجھ سوچ کر کرتا ہے۔ عام واعظ نیکی کے کام پر زیادہ زور دیتا ہے لیکن نیکی کی نیت پر کم توجہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ایثارِ ذات پر زیادہ زور دیتا ہے۔ فقط ذات پر کم۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ محبت بے غرضانہ ہونی چاہیئے۔ بے شک محبت کا ایک حد تک بے غرضانہ ہونا اچھا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسروں کو اسی طرح مسرور بنا سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو مسرت سے محروم رکھیں۔ ذات اور ایثارِ ذات کا سارا جھگڑا مٹ جاتا ہے اگر ہم لوگوں کی زندگی ہیں، اگر ہم دُنیا کی مختلف چیزوں میں نیک نیتی سے اور غیر مصنوعی طور پر دلچسپی لیں۔ ایسا کریں گے تو ہم خود بخود دریائے زندگی کی ایک اٹھتی ہوئی موج بن جائیں گے اور ہم محض ایک الگ تھلگ پڑی ہوئی گیند نہ ہوں گے جسے میدانِ ہستی میں کسی سے کچھ سروکار نہیں۔

ہر قسم کی ناخوشی کسی نہ کسی بے ترتیبی، کسی نہ کسی تخریب، کسی نہ کسی نامطابقت کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے یا تو ایک بے ترتیبی و تخریب اپنے نفس کے اندر، ایک لڑائی سی اپنے آپ سے یا ایک نامطابقت اپنے اور دوسروں کے درمیان جو مشترک مفاد اور باہمی الفت کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مسرور انسان وہ ہے جس کے نفس میں اس قسم کی کوئی خرابی نہ ہو، جس کی شخصیت نہ اپنے اندر مشوش ہو نہ دوسروں سے برسرِ پیکار۔ ایسا انسان اپنے آپ کو کائنات کا باشندہ سمجھتا ہے۔ وہ اُس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اُس کی خوشیوں سے مسرور، اُسے موت کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اور اُس کے بعد میں آنے والے لوگ دراصل ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ و متحد ہیں اس سے وہ جُدا ہے نہ اُس سے وہ الگ۔ ایسے ہی سچے اور گہرے باہمی اتحاد میں دنیا کی سب سے پائدار خوشیاں جلوہ گر ہیں۔

بشیر احمد

ہنسو اور موٹے ہو جاؤ یہ تھا پرانا مقولہ۔ نیا فلسفہ ہے ہنسو اور نیک بن جاؤ۔

ہر شخص سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو سکتا ہے عقلمند آدمی جہاں سے جو کچھ حاصل ہو سکے سمیٹ لیتا ہے۔

مے دو آتشہ

حکیم عمر خیام کی بعض مشہور رباعیوں کے ترجمے

عمر خیام

دورے کہ درو آمدن و رفتن ماست　　آنرا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نہ زند دمے دریں معنی راست　　کایں آمدن از کجا و رفتن بہ کجاست

ترجمہ

یہ دہر کہ اپنی آمد و شد ہے جہاں　　ہے اُس کی بدایت بھی نہایت بھی نہاں
اے کاش! کوئی یہ عقدہ حل کر سکتا　　آئے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں

عمر خیام

دریاب! کہ از روح جدا خواہی رفت　　در پردۂ اسرارِ فنا خواہی رفت
مے خور کہ ندانی ز کجا آمدۂ　　خوش زی کہ ندانی بہ کجا خواہی رفت

ترجمہ

جانا ہے، تجھے یہاں سے ہاں جانا ہے　　آیا ہو تو بے شبہ و گماں جانا ہے
مے پی کہ نہ آگہ ہو، کہاں سے آیا　　خوش جی کہ نہ واقف ہو، کہاں جانا ہے

عمر خیام

بر سینۂ غم پذیرِ من رحمت کن　　بر جان و دلِ اسیرِ من رحمت کن

بر پائے خرابات روِ من بخشائے بر دستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن

ترجمہ

اس سینۂ غم پذیر پر رحمت کر اس جانِ الم اسیر پر رحمت کر
اس میکدہ رو پاؤں کو دوزخ میں نہ جھونک اس دستِ پیالہ گیر پر رحمت کر

عمر خیام

مے نوش کہ عمرِ جاودانی این است خود خاصیتِ دورِ جوانی این ست
ہنگامِ گل و مل است و یاراں سرمست خوش باش دمے کہ زندگانی این ست

ترجمہ

مے پی کہ حصولِ کامرانی ہے یہی خوش جی کہ حیاتِ جاودانی ہے یہی
بے خوف مے و نغمۂ شاہد میں گزار کھل کھیل کہ اصلِ زندگانی ہے یہی

عمر خیام

یارب! تو گلم سرشتۂ من چہ کنم پشم و قصبم تو رشتۂ من چہ کنم
ہر نیک و بدے کہ از من آمد بہ وجود تو بر سرِ من نوشتۂ من چہ کنم

ترجمہ

یارب! مری کیا خطا ہے میرا کیا جرم ناحق یہ سرِ سزا ہے میرا کیا جرم
ہر لمحہ مری ذات سے عصیاں کا صدور تیرا ہی لکھا ہوا ہے میرا کیا جرم

آزاد انصاری

نالدیرہ

شملے سے مشوبرہ، مشوبرے سے نالدیرہ کسی زمانہ میں کافی کٹھن منزل تھی۔ موٹر نے (جسے شملہ میں میسر ہو سکے) اس کٹھن گھاٹی کو کھیل بنا دیا ہے۔

مشوبرے داخل ہوتے ہی وہ خوشنما باغیچے نظر آتے ہیں جن پر جا بجا شد و مد سے اعلان ہی "Private Grounds" بعض دلفریب کونوں پر جلی حروف سے پک نک (Picnic) کرنے والوں کو قانونی دھمکیاں ہیں۔ اف رے غرورِ ملکیت! زر ہو کہ زمین ہو کہ زن ہو مالک پھولا نہیں سماتا۔ "میری چیز ہے، خبردار کوئی ہاتھ نہ لگائے" یہ ہے شخصی ملکیت کا آئین و مذہب۔

Private Grounds کے ناپرائیویٹ حسن سے مسحور نالدیرہ کی طرف انسان بڑھا چلا جاتا ہے۔ رستے میں ایک خطہ ہے جہاں خزاں کی ملکہ نے سبز پتوں سے زمردی وردی اتروا کر سنہری اور ارغوانی وردی کی شان دکھائی ہے۔ ہائے خزاں کی بہار انسان دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ خدا سمجھے ان جفا پیشہ ادیبوں سے جو محض زورِ قلم سے خزاں جیسی پری کو بدنام کرتے ہیں۔ میں خزاں کو کبھی بُرا نہیں کہتا۔ اس جادو کی ملکہ کا میرے سر پر احسان ہے۔ سیاہی لے گئی ہے سفیدی دے گئی ہے۔ لوہے کے بدلے چاندی۔

موٹر جوں جوں آگے بڑھتی ہے خوف کے مارے دل میں عائیں یوں چمکتی ہیں جیسے ریت میں ذرّے۔ تنگ سڑک جب کسی ٹکڑ پر بائیں ہاتھ کو اوجھل ہو جاتی ہے اور سامنے ایک عمیق کھڈ منہ پھیلائے موٹر کو ہڑپ کرنے کے لئے طیار دکھائی دیتا ہے تو خواہ مخواہ منہ سے نکلتا ہے آہستہ، روکو" جو ذرا اس سے بھی زیادہ دل کو دہلانے والا موقع ہو یعنی سڑک تنگ ہو، پہاڑ بائیں ہاتھ ہو، مڑنا دائیں طرف کھڈ کی جانب ہو اور عین وہیں کھڈ کی طرف نہ جنگلا نہ پتھر کی دیوار، اور ہو باریک سا کونا تو زبان کہے یا نہ کہے دل کہتا ہے

"اے خدا بچانا"

دعا کی ایجاد غالباً کشتی کے سفر سے ہوئی۔ کشتی کھیتے وقت ہر نا خدا خدا کو یاد کرتا ہے۔ جو زیادہ خوش عقیدہ ہیں وہ پیر دستگیر کا نام لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب تک سفر ہے اور سقر ہے دعا زبانوں سے مٹ جائے تو مٹ جائے دلوں میں ضرور گونجتی رہے گی +

نالدیرہ آ گیا۔ بنگلہ پہاڑ کے پہلو میں ہے۔ مختصر سا ٹیلا ہے درخت البتہ شاندار ہیں اور خصوصیت یہ ہے کہ سفر

کہیں نظر نہیں آتا۔ درختوں کے نیچے ہری ہری دوب کی عجب بہار ہے۔ چوٹی پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے کئی تنگ کئی فراخ ناہموار سے مرغزار ہیں۔ پانی نہیں ہے ورنہ یہ خیال ہوتا کہ قدرت شالامار بناتے بناتے کسی اور کام میں لگ گئی۔ علاوہ ڈاک بنگلے کے ایک چھوٹا سا خوشنما Pavilion ہے۔ انگریزوں نے یہاں Golf Course بنایا ہے۔ شوخ شنگ مسیں بانکے بانکے گھوڑوں پر سوار شملہ سے اڑتی ہیں یہاں آنکلتی ہیں کھیلتی ہیں کھاتی ہیں حسینوں کی شوخی کے لئے نالدیرہ مقناطیس ہے۔

میں نالدیرے کیوں آنکلا؟ دنیا میں دو چیزیں عنقا ہیں، ایک تنہائی دوسرے خموشی۔ ان کی تلاش میں۔ موٹر نوکر نیچے رہ گئے۔ میں اس فراخ چوٹی کی سیر میں مصروف ہوا۔ ایک پہاڑی لڑکا آنکلا۔ مجھے اور موٹر کو دیکھ کر آیا۔ غالباً وہ Golf کھیلنے والوں کے ساتھ Caddy کا کام کرتا ہوگا۔ اسے ایک دونی دی اور کہا کہ بھاگو وہ چلا گیا۔ تنہائی تھی مگر خموشی نہ تھی۔ پہاڑی کوّے چلاّ چکتے تو کم بخت جھینگر اپنی نہ تھمنے والی سیٹی شروع کر دیتا۔ خدا خدا کر کے شاید دو ثانیے کامل خموشی نصیب ہوئی۔ کان جب مایوس ہو گئے تو آنکھوں کی باری آئی۔ دور بہت دور سر بہ فلک برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ نظر آئے۔ برف سے لدے ہوئے پہاڑوں پر پھرا ہوں۔ برسوں سے دیکھنے کا عادی ہوں مگر یہ نظارہ کچھ اور تھا۔ ابر کا نام نشان نہ تھا سورج کی شعاعیں اپنی پوری طاقت سے برف کو سیماب بنا رہی تھیں۔ برف پوری دلی محبت سے ان شعاعوں کو سمیٹ رہی تھی پھیلا رہی تھی۔ دنگ رہ گیا۔ خدا جانے فطرت نے کیوں یہ کئی سو میل لمبا تین میل بلند شاندار بجلی کے لیمپوں کو مات کرنے والا لمپ دن کے وقت روشن کر رکھا تھا۔ کیا فطرت کو بھی عشق کا مرض ہے؟ کہاں آفتاب کہاں برف مگر فطرت ان دونوں کا عقد کر کے مزہ لے رہی ہے۔

جن لوگوں کو پہاڑوں سے عشق ہے وہ آبادیوں سے بھاگتے ہیں اور ہونا بھی یوں ہی چاہئے۔ آبادیوں کے رہنے والے زمین کے شیدائی۔ ان میں جو سب سے بڑا وہ سب سے بڑا زمیندار۔ پہاڑ زمین سے باغی۔ آبادیوں میں رہنے والے ترتیب کے متوالے۔ اُن کے ہر بات کے متعلق قاعدے ہیں۔ سڑکیں سیدھی، گھر چوکونے، کمرے گول، چارپائیاں مستطیل۔ پہاڑ بے ترتیبی کی زندہ تصویر، اونچے، نیچے، ٹیڑھے کہیں پتھر کہیں پھول کہیں بے پھل کے درخت اور کہیں بے پانی کی ندی۔

اے باغی پہاڑو! تمہارے طفیل نالدیرے میں مجھ سے دو نیک کام ہوئے ایک یہ کہ بنگلہ میں قدم نہ رکھا اور دوسرا یہ کہ نالدیرے کی چوٹی پر سگرٹ نہ جلایا۔ اس لطیف پاکیزہ ہوا کو سگرٹ کے دھوئیں سے زخمی کرنا میری حسن پرست طبیعت کے لئے قتل سے بدتر جرم تھا۔ آبادیوں میں جہاں ہوا کثیف ہے اور دل پتھر ہیں کافی سگرٹ جلاتا ہوں۔ نالدیرے میں نہ سگرٹ جلایا نہ خود جلا۔ زمین سے دور تھا آسمان کے قریب تھا۔

فلک پیما

معمورِ تمنّا

اے فریبِ التفاتِ حسن یہ کیا کر دیا
پھر مجھے آمادۂ عرضِ تمنّا کر دیا

شیخ کعبے سے نکل آیا برہمن دیر سے
تو نے کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارا کر دیا

ہم نشیں! رازِ شکستِ دل بتاؤں کیا تجھے
کچھ تو ظاہر دو آنسوؤں کو جس نے رسوا کر دیا

چاکِ داماں کو لئے پھرتے ہیں دیوانے ترے
او خود آرا! تو نے اُن کو بھی خود آرا کر دیا

تم ہی تھے وہ یا "فریبِ شوق" یہ کس کو خبر
ہم نے تو آنکھوں کو قربانِ نظارا کر دیا

اب کہاں کا حشر، کیسی داد، سب خاموش ہیں
ہائے اے حسنِ پشیماں! تو نے یہ کیا کر دیا!

بھیجتا ہی کون چھپ چھپ کر پیامِ مشک بو
کس نے راتوں کو مری، خوابِ زلیخا کر دیا

حسن کے رُخ پر تو اے منصور پردہ ہی رہا
عشق کی مجبوریوں کو تُو نے رسوا کر دیا!

کیوں وہ بیزارِ تمنّا ہی کہ جس نے اے روشؔ
دل کے ہر ذرّے کو معمورِ تمنّا کر دیا

روشؔ صدیقی

(ایک ایک افسانہ اردو لباس میں)

اگر میرے فاضل وکیل اجازت دیں تو میں اپنی طرف سے اُن کی اس قابلِ یادگار بحثِ صفائی کے لئے جس کی جامعیت اور دل نشینی کے باوجود مجھے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنا ہی پڑے گا۔ ان کا مخلصانہ شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری اس گزارش اور خواہش میں طنز یا عناد کا کوئی جذبہ موجود نہیں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ دنیا کی نظر میں میرا گناہ قابلِ عفو و لایق درگزر نہیں۔

میں خود بھی کسی رحم کی التجا نہیں کرتا۔ لیکن اس جہانِ فانی کو خیرباد کہنے سے پیشتر چند گزارشات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جن کی بنا پر مجھے پورا یقین ہے کہ مستقبل کا ماہرِ نفسیات انسانوں کے ایک ایسے گروہ کے وارداتِ قلبی کے سمجھنے کی کوشش کرے گا جس میں میرا شمار ہے۔ میری سرگزشت اور گزارش حسب ذیل ہے:۔

میں ایک قصبہ کے افسرِ محاصل کا پانچواں اور سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔ میری تین بہنیں اور ایک بھائی مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ میرا باپ تین بیٹیوں کی پے بہ پے تشریف آوری سے ذرا کھسیانا سا ہو چکا تھا لہٰذا جب میرا بڑا بھائی پیدا ہوا تو میرا باپ مارے خوشی کے جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ بھائی جان کا ورودِ مسعود بھی والد بزرگوار کے لئے کچھ مستقل طور پر خوشگوار ثابت نہ ہوا کیونکہ بڑے بھائی فطرتاً کمزور اور ضعیف پیدا ہوئے تھے جہاں سردی کا موسم آیا اُن کی جان کے لالے پڑے۔

اب والدِ بزرگوار کی تمام امیدیں خود میری ذات سے وابستہ ہو گئیں۔ اللہ کے فضل سے قصبہ میں سب سے پہلے ربڑ کے پہیوں والی گاڑی میں سیر کرنا مجھے ہی نصیب ہوا۔ میری بچپن کی اس خوش نصیبی اور امارت کا قصبے میں گھر گھر چرچا رہا۔ جب میں گھر سے باہر نکلتا تھا تو میرا لباس نئی دلہنوں کی زرق برق پوشاک کو مات کرتا تھا۔ لہٰذا جس طرف میں نکل جاتا نگاہیں میرے تعاقب میں بے تاب رہا کرتیں۔ اور ایک مرتبہ تو ہمارے قصبے کے بڑے زمیندار کی بیگم نے عین بازار میں اپنی گاڑی سے اتر میری پیشانی چٹاق پٹاق بوسوں سے منور کر دی۔

جناب والا میرے والد کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو وہ ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حالات نے مساعدت کی انہوں نے نہ صرف بی اے پاس کر لیا بلکہ ایک متمول عورت سے اُن کی شادی بھی ہو گئی۔ والد چونکہ جاہ و منزلت کے پرستار

میں سے تھے لہٰذا اُن کی تمنا تھی کہ اُن کی اولاد دُنیا میں ترقی کرے اور اُن کا نام روشن ہو مگر مصیبت یہ پیش آئی کہ میرے سب بھائی بہنوں نے والدہ کی سادگی بلکہ سادہ لوحی ورثے میں پائی +

ان حالات میں والدِ بزرگوار لگے سمجھنے کے کہ ع فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص۔ دنیا جہان کی کوئی امید ایسی نہ تھی جس کا مرکز میری ذات شریف نہ قرار دی گئی ہو۔ ان امیدوں اور تمناؤں کی وسعت کے ساتھ ساتھ مجھے ہر قسم کے امتیازات اور اختیارات عطا کئے گئے۔ آپا کو بٹیا اور بھائی بہنوں کو گھوڑا بنانا تو میرے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ میرے خوبصورت بال بڑھتے بڑھتے کندھوں تک لٹک گئے اور میری رسیلی آنکھیں اور عمدہ پوشاک شہزادوں سے سوا جلوہ پیدا کرتی تھی۔ میری جادو بھری نگاہیں اور وجد انگیز تبسم ہر طرح کی شرارتوں کی پردہ پوشی و تلافی کے لئے کافی تھا +

رفتہ رفتہ میری شرارتیں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگیں ایک دفعہ پھولوں کی ایک کیاری یوں تباہ کر کے رکھ دی کہ اُس کا نام ونشان تک نظر نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ جناب مالی کے بیٹے کی آنکھ پر وہ تاک کر نشانہ بٹھایا کہ بیچارا نیم گل ہی ہو گیا! ایک روز بندوق سے پرندے پر ایسا نشانہ لگایا کہ گھر کا گھر جلتے جلتے بچ گیا۔ مگر معمولی شرارتوں پر تو کوئی بازپرس ہوا ہی نہیں کرتی تھی۔ ہاں اگر کوئی غیر معمولی کارنامہ معرض ظہور میں آئے تو والد اپنی ناراضی کا اظہار ضرور فرمایا کرتے تھے۔

والد ہوئے خفا اور میں نے رکھا چُپ کا روزہ۔ میری خاموشی کیسے اور کیوں کر گوارا ہو سکتی تھی، وہ منٹوں میں منا لیا کرتے تھے۔ پہلے سے زیادہ پیار بھی کرتے اور ایک پیسہ نقد بھی جیب خاص سے مرحمت فرماتے۔ پیسہ دیکھتے ہی میرا سب رنج حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا اور پیسہ جیب میں ڈال میں بھاگتا بازار سے برف کے طوطے خریدنے +

دس برس کی عمر سے پہلے میں سکول میں داخل ہوا۔ استاد تو لگے میرے ذوق و شوقِ علم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے اور یہاں یہ حالت تھی کہ کس کافر کا سکول میں جی لگتا تھا۔ سکول کے بند کمروں کی ہوا میں دن بھر یوں بندھے بیٹھے رہنا خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی تھا۔ درد سر کی شکایت پیدا ہوئی اور صحت نے جواب دینا شروع کیا۔ خدا ان سے سمجھے ماسٹر صاحبان بھی دوسرے شاگردوں سے مجھے زیادہ سمجھنے لگے اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ سکول تو کبھی کبھار یار دوستوں سے ملنے چلے ہی جایا کرتے تھے لیکن تعلیم سے تو دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ میں اپنے ہم جماعتوں کو جاہل اور احمق تو سمجھتا ہی تھا اب اس کا ثبوت انھوں نے مجھ پر آوازے کسنے اور پھبتیاں اُڑانے میں مہیا کرنا شروع کیا۔ سکول پہنچ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ بندروں کے نرغے میں گھر گیا ہوں۔ بیماری کی وجہ سے شراب کی ایک چھوٹی سی بوتل میرے پاس رہا کرتی تھی۔ ستم کار ہم جماعت نہ صرف شراب کی بوتل ہی اڑا لیتے بلکہ بسکٹ اور ڈبل روٹی سبھی کچھ چھین کر چڑا کر چٹ کر جاتے اور میں روتا ہوا گھر پہنچتا۔ آخر ماں باپ نے سکول سے ہٹا لینے کی ٹھانی اور بندہ خوشی خوشی بستہ بغل میں دابے واپس پہنچا۔ میری واپسی نے گھر بار کو ایک معمورۂ مسرت بنا دیا +

کچھ عرصہ دم لیا مگر گردشِ فلک نے پھر ایک ہائی سکول میں لا داخل کیا۔ استادوں کی زائد از ضرورت شفقتیں یہاں بھی موجود پائیں۔ جب استاد پورے جوش سے سبق پڑھا رہا ہوتا تو میں اپنے قریبی ساتھی کے ساتھ اُس کی نظر سے اوجھل شطرنج کھیلا

کرتا تھا۔ اُستادوں کی متفقہ رائے تھی کہ بندہ پرلے درجے کا ذہین تو ہے مگر محنت سے جی چراتا ہے۔

جب میری عمر تیرہ برس کی ہوئی تو والد کو ملازمت کے سلسلہ میں پریگ جانا پڑا میرے گردوپیش کے حالات میں یہ پہلی تبدیلی تھی جو آئندہ بدبختیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ وہ دن اور یہ دن کبھی چین نصیب ہوا ہی نہیں۔ اپنے قصبے میں ہمارا شمار رؤسا میں سے تھا۔ اب ہم پہنچے پریگ۔ وہاں چہل پہل کا عالم ہی دوسرا تھا۔ وہاں عورتوں کی فیشن پرستی اور فضول خرچی کی وہ انتہا کہ ہم دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے جاتے تھے۔ والدِ بزرگوار کی حیثیت بھی ایک معمولی ملازم کی ثابت ہوئی۔

پریگ کے سکول کو جو اپنی شمولیت سے ہم نے مشرف فرمایا تو ایک نئی دنیا نظر آئی۔ پریگ کے سکول ماسٹر پہلے ہی سے فیصلہ کئے بیٹھے تھے کہ دیہاتی لڑکے پرلے درجے کے کندۂ ناتراش ہوتے ہیں۔ ان ماسٹروں نے جناب شیطان کی طرح میرا ناک میں دم کردیا۔ خدا جانے ان پر وحی نازل ہوئی یا کیا ہوا انہوں نے مجھے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ یہ بڑا جاہل اور کھلنڈرا لڑکا ہے۔ مجھے بھی ایک مرتبہ چی کڑا کرکے لاطینی زبان پڑھانے والے ٹھگنے سے جسے لڑکوں کو فیل کرنے میں مزہ آتا تھا کہنا ہی پڑا کہ یہ شیوہ قرینِ دانش نہیں۔

بس صاحب پھر کیا تھا سکول ایک مقتل بن گیا جہاں ہر روز ماسٹر صاحبان ہماری کھال اُدھیڑنے لگے۔ ہر روز کی مصیبت نے دل و دماغ پر ایسا بُرا اثر ڈالا کہ کسی وقت تو میں بزُوں کی جان کو رو یا کرتا اور کبھی مارے غصے کے دیوانہ ہو جاتا۔ اور تو کچھ بن نہ پڑتا تھا البتہ ان استادوں کے جو منظورِ نظر ہوا کرتے تھے ان سے دھینگا مشتی ضرور ہوا کرتی تھی۔

امتحان ہوا نتیجے کا انتظار مجھے تو نہیں گھر والوں کو ضرور تھا۔ نتیجہ نکلا تو یہ نکلا کہ ہم پانچوں مضامین میں چاروں شانے چت۔ ماں باپ نے آخر میرے متعلق اپنی رائے تبدیل کی۔ بڑے بھائی جنہیں اب تک میرے مقابلے میں حماقت کی پوٹ سمجھا جاتا تھا ترقی پا گئے اور والد اپنی خوشنودیٔ مزاج کے اظہار اور ان کے مرتبہ کے اعتراف میں انہیں ہر اتوار کو سگریٹ دینے لگے۔ اب بھائی بھی میری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا کیونکہ اُس نے میری گدی پر قبضہ جما لیا تھا۔ مجھے اُس کے اُترے ہوئے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ واللہ مجھے اُس سے بھی اتنی ہی نفرت پیدا ہو گئی جتنی ماسٹروں سے تھی۔

میرا ایک چچیرا بھائی فوج میں ملازم تھا میں نے اُس سے ربط ضبط بڑھایا چھاؤنی میں جا کر بندوقوں کی آواز کا سننا قواعد میں سپاہیوں کا یکساں قدم اٹھانا۔ فوجی بینڈ کا بجنا اور "سٹینڈ ایٹ ایز" کے حکم پر فوج کا باتوں میں مشغول ہو جانا میرے لئے نہایت فرحت افزا نظارے تھے۔ چچیرے بھائی کے ساتھ ایک ہوٹل میں چائے پیتے پیتے جب عورتوں کے متعلق ذکر چھڑ گیا تو میں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ میرے تن بدن میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑ گئی ہے۔ اُس وقت کا تصور جب میں چمکدار بٹنوں والی نیلی وردی پہنے، اپنے سفید دستانوں والے ہاتھوں کو کسی خوبصورت عورت کے نرم و نازک رخساروں پر پھرا رہا ہوں گا مجھے اس دنیا میں جنت کی اُمید بندھائے دیتا تھا۔

قرار یہ پایا کہ جھٹ فوج کی ملازمت کر لی جائے۔ طبی معاینہ جو ہوا تو پیدائشی کمزوری کی بنا پر میڈیکل آفیسر صاحب نے

کھٹ سے مجھے چلتا کیا۔ میں کمرے سے باہر نکل برآمدے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ ماں باپ کو پانی پی پی کر کوسوں اور پیٹ بھر کر پیٹوں کہ انہوں نے اپنی نادانیوں سے یوں مجھے پیدائشی نکما بنا دیا تھا۔

زندگی کی رہی سہی امید کا حسرت ناک انجام طبیعت کو اور بھی اُچاٹ کرتا گیا۔ سوچ بچار کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی کہ والدین کی نادانیوں سے پیدائشی طور پر کمزور تو تھا ہی، ان کا فرض تھا کہ اُس کی تلافی کسی بہتر طریق پر کرتے۔ اب تو وہ میرے دین دار ہیں میں اُن کا کسی طرح زیر بارِ احسان نہیں ہوں۔

اچھا جناب تو پھر میں ایک پزاوے والے کے سپرد کر دیا گیا۔ فوجی بارکوں کے قریب ایک مکان کی تعمیر میں میں اپنے محترم اُستاد کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا لیکن دراصل قواعد کرتے سنگینیں چڑھانے، اور دشمنوں پر حملہ بولنے کے لئے میرا دل بے تاب ہا کرتا تھا۔ ایک شخص کے ساتھ اینٹیں ڈھونا اور ایک شرابی جمعدار کے لئے تمباکو خرید لانا میرے لئے کوئی دلکش مشغلہ نہ تھا۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ والدین نے محسوس کیا کہ یہ صورتِ حالات ناقابل برداشت ہے۔ اس پزاوے کے مالک سے تو چھٹکارا ہوا۔ میں ایک انہر محصل کا منشی بنا تو ہر وقت روپوں کی جھنکار سی کام رہا۔ ایک ڈاکٹر کی ملازمت کی تو دوائیں گھوٹتا پیتا رہا۔ شراب کی کشید کے کارخانے میں ملازم ہوا تو شراب کے سمندر میں تیرا بھی پاپڑ بیلے مگر کہیں جم کر نہ بیٹھنا تھا نہ بیٹھا۔ ہفتہ عشرہ یہاں تو مہینہ ڈیڑھ وہاں۔ خدا نے اس سے زیادہ کسی کا محتاج نہ ہونے دیا۔ ملکِ خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست۔ پڑھا ایک کا کام چھوڑا دوسرے کے ہاں چلا گیا کیونکہ میری تربیت نے مجھے تن آسان اور کام چور بنا رکھا تھا۔ والد تو یہ لچھن دیکھ کر ایک روز اس قدر آشفتہ ہوئے کہ مجھے اصلاح خانہ میں بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ تو خدا والدہ کو جنت نصیب کرے اس خبر سے اُن کو ضعفِ قلب کا دورہ ہوا کہ اپنی جان گنوا کر انہوں نے مجھے اس تجویز کی تکمیل سے نجات دلائی۔ اکیس برس کی عمر میں میرا کام صرف یہ تھا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے پریگ کے شہر میں آوارہ گردی کیا کروں دکانوں کی روشن کھڑکیوں میں سے چمکتی دمکتی چیزوں کا نظارہ مجھ پر وہی کیفیت طاری کیا کرتا تھا جو بھوکے پر پلاؤ کی خوشبو سے مسلط ہوا کرتی ہے۔ بر سرِ راہ کھڑے ہوئے میں کوٹ پتلون کی ہر جیب کو پوری کوشش اور تیزی کے ساتھ ٹٹول جایا کرتا تھا ع شاید درمے نہفتہ باشد۔ بازار کی دوسری کشاکش کی طرف تو میری توجہ کم مبذول ہوتی تھی البتہ میں دیکھتا تھا کہ بیشمار عورتیں آتی جاتی ہیں جنہوں نے چوڑی چوڑی لیس کی آڑ میں مختصر لباس سے اپنے حسن کی نمائش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہوتا تھا جہاں دیکھتا کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست کا عالم نظر آتا۔ ان عورتوں کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ بے اختیار چوم لینے کو جی چاہتا تھا لیکن وائے محرومی حسن کے اس بحر ناپیدا کنار میں سے کسی ایک عورت کے دل میں اتنا بھی خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ایک نگاہ ہمارے حال پر بھی ڈالتی جائے۔

من چشم نہ بردارم از روے نگارینش
آں مستِ تغافل را توفیقِ نگاہے نیست

ان حالات میں میری مایوسی بسا اوقات جنون کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ میرا دماغ اس پریشانی کے عالم میں گھونگرول کی ٹاپوں میں اس روپے کی جھنکار سنتا تھا جس کی کشش حسن و نخوت کی ان تیلیوں کو میرے زیب آغوش بنا دینے میں جادو کا سا اثر رکھتی تھی۔ جناب والا میری اس بے تابی کا جو ایسی پریوں سے ملاپ کے لئے مجھے لاحق تھی آپ کچھ اندازہ نہیں فرما سکتے۔ خدا نے آپ کو دولتِ دنیا سے بہرۂ وافر عطا فرمایا۔ اس دولت کے بل پر لونڈیوں کی منہ مانگی تعداد آپ کے در دولت پر حاضر تھی اور جب یوں آپ کے دانت کھٹے ہوئے تو باقاعدہ شادی کی سوجھی اور آج آپ ایک حور سی بیوی اور چاند سے بچوں میں بیٹھے لفرے اڑا رہے ہیں +

جب مجھے اپنی طرح کے دوسرے محرومانِ قسمت سے سابقہ پڑا تو اشتعالِ طبع دو بالا ہو گیا۔ ہم ہر روز دنیا کی موجودہ حالت پر گرما گرم مباحثہ کیا کرتے اور بعض اوقات تو خود بھی اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ زار زار روتے ہوئے باہم یوں بغلگیر ہوتے تھے کہ بس کسی سمندر میں ڈوب مریں گے۔ ان حالات میں میں نے اشتراکیت کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا جن کے سرخ سرخ سرورقوں کا ایک جلوہ آپ جیسے دولتمندوں کے بدن میں لرزہ پیدا کر دیا کرتا ہے موجودہ معاشرت کے مسئلے کا حل بہت ڈھونڈا پر یہاں بھی نہ پایا۔ آج تک یہ عقدہ نہیں کھلا کہ آخر ایک دنیا تو عیش سے بسر کرے اور ہم رہیں پورے طور پر محروم تو کیوں۔

جناب عالی۔ اسی بنا پر میں نے اُس دولتمند پر تین گولیاں چلا کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ اُس دولتمند کو میں صرف ایک ایسی جماعت کا نمائندہ سمجھتا ہوں جو ہماری طرح کام تو نہیں کرتی گلچھرے ضرور اڑاتی ہے۔ مجھے ان بزرگوار سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔ اگر اُس صبح آپ سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو آج اس فاضلانہ بحثِ صفائی سے مجھے اور اُس دن اپنی زندگی سے آپ کو محروم رہنا پڑتا۔ راحت و آسائش مجھ غریب کے نصیب میں نہ یہاں تھی اور نہ یقین ہے وہاں ہوگی جہاں دو ہاتھ رسی پر سوار ہوتے عشرے میں پہنچا چاہتا ہوں +

عطاء اللہ

صرف دوستیِ دنیا کی وہ چیز ہے جس کی سودمندی پر ساری نوعِ انسان متفق ہے۔

بھائی اتفاق سے ہیں دوست دل سے

دو شخص اصلی دوست اس وقت ہوتے ہیں جب اُن کی رائیں متضاد اُن کے اصول یکساں اور اُن کی پسند ناپسند مختلف ہو۔

خودکشی

مدتیں گزریں کہیں اک عاشقِ ناکام تھا
ہجر کے سنگیں شکنجوں میں اسیرِ دام تھا

زندگی تھی ہر نفس تازہ مصیبت سے دوچار
کٹ رہی تھی ہجرِ جاناں میں جوانی کی بہار

شوق پامالِ صعوبت، جوشِ تاراجِ ستم
کام اپنا کر چکا تھا عاشقی میں زہرِ غم

سابقہ خوشیوں کا بدلہ لے لیا تھا ہجر نے
ولولوں کا سر کچل کر رکھ دیا تھا ہجر نے

زنگ آلودہ تھی سعیِ نو کی تیغِ آبدار
تھا پرانی آرزوؤں پر تخیل کا مدار

ہجر کے ہاتھوں جوانی اس قدر مغموم تھی
روح آزادی پر پرواز سے محروم تھی

تنگ آ کر ایک دن اُس نے کیا دل میں خیال
لاؤ سر سے پھینک ہی دوں زندگانی کا وبال

کر کے ہمت توڑ ہی ڈالوں یہ ربطِ جان و تن
پھاڑ ہی ڈالوں عناصر کا یہ خاکی پیرہن

توسنِ عمرِ رواں کو ایڑ دینا چاہیئے
دوسرے عالم میں چل کر سانس لینا چاہیئے

ہائے مرگِ ناگہانی بھی مگر ممکن نہیں!
اس گنہ کا بار لوں میں اپنے سر ممکن نہیں!

جان دینا پست ہمت بزدلوں کا کام ہے
لوگ کہتے ہیں کہ یوں مرنا جنونِ خام ہے

خودکشی کرنا ہے ان حالات میں امرِ محال
چھوڑ دینا چاہیئے پھر جاں سپاری کا خیال

یک بیک پھر خود ہی گویا چونک اٹھا خواب سے
خود بخود کرنے لگا باتیں دلِ بیتاب سے

"اے کمینہ، پست ہمت، تنگ دل، بے ننگ و نام   کیوں سمجھ رکھا ہے تو نے خودکشی کرنا حرام"

"تو ابھی تک معنی و الفاظ کے چکر میں ہے   تو رواجِ عہد کے دورِ سخن پرور میں ہے"

"ریل کی پٹڑی سے کٹ کر جان دینا کھیل ہے؟"   بے دھڑک پھانسی گلے میں ڈال لینا کھیل ہے؟"

"مسکرا کر جان دینا بزدلی کا نام ہے؟   دل میں خنجر بھونک لینا کوئی آساں کام ہے؟"

"سہل ہے بے باک پینا زہر سے لبریز جام؟   کچھ ہنسی ہے اپنے ہاتھوں ختم کرنا اپنا کام؟"

"تیری نظریں سطح بیں ہیں اُن میں گہرائی نہیں   تیری رو بھی عقل میں عرفاں کی رعنائی نہیں"

"اے اسیرِ رسمِ کہنہ! اے عقائد کے غلام!   کاٹ بھی دے تیغِ نو سے بدعتِ ماضی کا دام"

"سنگِ عزمِ مستقل سے توڑ دے رسم و رواج   کچھ تو کر انساں کی دیرینہ حماقت کا علاج"

"جان دینے سے حیاتِ جاوداں مل جائے گی   ایک پل میں رفعتِ روحانیاں مل جائے گی"

اتنا کہہ کر بھر گیا سعئ عمل کے جوش میں   اٹھ کے دوڑا بے تحاشا موت کی آغوش میں

زرد چہرے پر سرورِ جاودانی لے چلا   آنکھ میں غلطاں خمارِ کامرانی لے چلا

جلد اک دریا کے اونچے پل پر آ کر رک گیا   آستانِ شاہدِ مقصود پا کر رک گیا

دیر تک دیکھا کیا نیچے نگاہِ غور سے   عزم نکلا اک اخیری کشمکش کے دور سے

قابلِ تحسین تھی اس جانباز کی تعجیل بھی   کر دکھائی اپنے فوری عزم کی تکمیل بھی

چند موجیں دفعتاً پانی میں اٹھیں بےقرار   نیم جاں اک جسم ڈوبا اور ابھرا چند بار

سطحِ دریا ایک لمحے میں برابر ہو گئی
بے شکن شفاف آئینے کی چادر ہو گئی

ذوقی

رتن ناتھ سرشار

یوں تو سرشار نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں مگر جس کتاب نے اس کا نام زبان زدِ خلائق کیا وہ فسانۂ آزاد ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ان دنوں لکھی گئی تھی جب سرشار اودھ اخبار لکھنؤ کا ایڈیٹر تھا چنانچہ یہ فسانہ ایک سال تک یعنی دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک اودھ اخبار ہی میں نکلتا رہا۔ کتاب کی صورت میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔

فسانۂ آزاد یوں تو بہت ہی لمبا ناول ہے اور قصہ در قصہ بیان ہونے کی وجہ سے کہانی بہت الجھ گئی ہے مگر حشو و زوائد سے پاک ہو کر کہانی یوں بھی بیان کی جا سکتی ہے۔ قصہ کا ہیرو ایک سیلانی، علائق دنیوی سے پاک آزاد منش آدمی ہے ہر علم سے بہرور اور ہر ہنر سے فیض یاب ہے۔ فہم و ذکا میں ارسطوئے زماں، حسن میں یوسف ثانی، حاضر جواب، بذلہ سنج، لطیفہ گو یعنی خصائص عالیہ کا مخزن ہے ایسا بے سروپا ہے کہ دین دنیا کے دھندوں سے کوئی سروکار نہیں بس کام ہے تو یہ کہ کہیں لکھنؤ کا محرم دیکھنے جا نکلتا ہے کہیں عیش باغ کا میلہ، کہیں ہولی، کہیں دیوالی وغیرہ وغیرہ۔ اسی دوران میں ایک حسینہ کی تعریف سن لیتا ہے جس کا نام حسن آرا ہے۔ وہاں بھی جا دھمکتا ہے مگر حسن آرا ہر طلب گار کا امتحان لیتی ہے اور جہاں سینکڑوں امتحان میں ہار جاتے ہیں۔ آزاد پورا اترتا ہے۔ چنانچہ منتخب ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ آن پڑی ہے کہ آزاد روم میں جا کر ترکوں کے ساتھ جنگِ روس میں شریک ہو اور وہاں سے سرخرو لوٹنے پر شادی ہو۔ اور اس دوران میں آزاد کسی اور سے نکاح نہ کرے۔ چنانچہ آزاد روانہ ہو جاتا ہے مگر جس سرائے میں آزاد ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سرائے کی مالکہ مسماۃ اللہ رکھی سے آپ کو عشق ہو جاتا ہے۔ آزاد کے تعشق کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی نظر میں دونوں فریق گھائل ہو جاتے ہیں۔ آخر آزاد اللہ رکھی کو بہزار دقت چھوڑ کر جاتا ہے بمبئی میں حسن آرا کی ایک رشتہ کی بہن کے ہاں ٹھہرنا ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ آپ پر عاشق ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میاں زاد کے ساتھ ایک ہمراہی بھی ہے جس کا اصل نام تو خواجہ بدیع الزمان ہے مگر جسے عرف عام میں خوجی کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت ہر وقت افیون کی پینک میں رہتے ہیں کبھی کبھی ہوش میں آتے ہیں اور انہی اوقات میں جو الفاظ آپ کی زبان سے نکلتے ہیں وہ فسانہ بن عجیب چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ جہاز میں آزاد کی ایک انگریز جوڑے سے دوستی ہو جاتی ہے جس میں میم صاحبہ، صاحب سے زیادہ زاد کی طرف مائل ہو جاتی ہے قسطنطنیہ میں آزاد بیمار پڑ جاتا ہے اور ایک یہودی خاندان اس کی بہت مدد کرتا ہے۔ اس خاندان چشم و چراغ مس میڈا ہے جو حضرت آزاد پر اور جن پر حضرت آزاد عاشق ہو جاتے ہیں۔ جنگ میں آزاد بڑے بڑے کارنامے کرتا

ہے اور اسے بڑی ناموری حاصل ہوتی ہے۔ دوران جنگ میں روسیوں کی طرف سے ایک حوروش مردانہ بھیس میں جنگ آزمائی کرتی ہے۔ آزاد سے سامنا ہوجاتا ہے۔ میاں آزاد سدا کے عاشق، مبارزہ میں ایک دفعہ جوا چکتے ہیں تو اس نازنین (مس کلیریسا) کے گھوڑے پر جا پڑتے ہیں اور مس کلیریسا کو پکڑ کر میدان جنگ میں لوسوں کا تار باندھ دیتے ہیں۔ کلیریسا انہیں قید کرکے لے جاتی ہے اور آپ سائبیریا بھیج دئے جاتے ہیں۔ راستے میں دریائے ڈینیوب کے کنارے سوتے ہوئے پولینڈ کی ایک شہزادی انہیں اٹھوا کر لے جاتی ہے اور ان کا علاج کرکے ان سے شادی کی طلبگار ہوتی ہے۔ یہ اس پیمان کے مطابق جو حسن آرا سے بندھ چکا تھا انکار کر دیتے ہیں۔ شہزادی انہیں قید کر دیتی ہے۔ مگر خوجی آزاد کی تلاش میں یہاں بھی آنکلتا ہے اور شہزادی اور آزاد کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ کھول کر کسی طرح آزاد کو وہاں سے نکال لاتا ہے۔ آزاد جنگ کے بعد واپس آجاتا ہے اور حسن آرا سے شادی کر لیتا ہے۔ مس میڈا، مس کلیریسا، پولینڈ کی شہزادی، ثریا بیگم وغیرہا سب منہ تکتی رہ جاتی ہیں+

یہ تو رہی کہانی۔ اب فنی لحاظ سے دیکھتے ہیں کہ فسانۂ آزاد کی کیا وقعت ہے۔ ہمیں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ فسانۂ آزاد ادبی نقطۂ نگاہ سے ناول کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔ ناول کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں مگر سب سے جامع تعریف یہ ہے کہ ناول زندگی کا مرقع ہوتا ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی بھی ضرورت نہیں کہ اس مرقع کا کونسا پہلو اہم ہوتا ہے۔ آیا سیرت نگاری ہی ناول کی سب سے اہم چیز ہے، یا کہانی، خیال، انداز، گفتگو، تنقید حیات یا مصنف کی بصیرت[1]۔ بہرحال ایک بات جو نظر انداز کی ہی نہیں جاسکتی وہ واقعیت[2] ہے کہانی خواہ حقیقت نگاری[3] کی مثال ہو یا مثالیت[4] کی۔ ہر حالت میں اسے زندگی سے بشریت سے منطبق کرنا پڑتا ہے+

فسانۂ آزاد لکھنؤ کی زندگی کا مثالی مرقع ہے اور چونکہ اس میں اس خطہ کی معاشرت کی بہت سی تصاویر ہیں، اور وہاں کے لوگوں کے، وہاں کی سوسائٹی کے مختلف طبقات کے واقعات ہیں۔ اس لئے اُسے ناول کہنا کوئی جرم نہیں+

یہ فسانہ سنا جاتا ہے سرشار کے ایک دوست پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی تجویز کے مطابق وجود میں آیا۔ یعنی کسی صحبت میں ہجر نے یہ بات کہی کہ "اگر کوئی ناول ایسا ہے جس کا ایک صفحہ پڑھئے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسئے تو وہ ڈان کوئک زوٹ ہے۔ اگر اردو میں ایسا ناول لکھا جائے تو خوب ہے" اور سرشار کے یہ بات دل کو لگی اور اس نے ایک ایسا ناول لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ جس کا نتیجہ ہمارا افسانۂ آزاد ہے۔ اب قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ مگر تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ خواہ سرشار کو فسانۂ آزاد کا خیال اسی بات سے پیدا ہوا ہو مگر خود سرشار نے ڈان کوئک زوٹ اچھی طرح نہیں پڑھا اور اگر پڑھا بھی ہے تو سمجھا نہیں۔ ڈان کوئک زوٹ دُنیا کی عظیم ترین تصنیفات سے ہے۔ بظاہر تو سروینٹیز اس کے مصنف کو اس زمانہ کے مروجہ طلبیہ قصوں اور مثالی کہانیوں کا خاکہ اڑانا مقصود تھا۔ اس لحاظ سے بھی ڈان کوئک زوٹ دنیائے

1. Vision 2. Life-likeness 3. Realism 4. Idealism

ادب کی بہترین پھبتی[1] ہے، مگر اس کتاب میں اس قدر مضامین پنہاں ہیں، اس کے نکات اتنے جامع ہیں، مصنف کی نظر اتنی وسیع ہے۔ ڈان کوئک زوٹ کے تصورات اور دنیا کی حقیقت میں اتنا تفاوت ہے کہ یہی کتاب جو دنیا کی بہترین مزاحیہ کتاب کہلا سکتی ہے، دنیا کی سب سے بڑی حزنیہ کتاب بھی ہے، ستم یہ ہے کہ مصنف ہر وقت اپنے ہیرو پر خود ہنستا رہتا ہے۔ سرشار نے اگر ہجر کے الفاظ اور ڈان کوئک زوٹ کی ورق گردانی سے کوئی مطلب اخذ کیا ہوگا تو یہی کہ کتاب ظریفانہ رنگ میں لکھی جائے اور آزاد کے ساتھ خوجی کو لگا دینے سے سانکو پنزا کی مثال پوری ہو جائے۔ جو ضد ڈان کوئک زوٹ کی بلند نظریوں اور سانکو پنزا کی بشریت میں ہے۔ وہی فرق قریب قریب آزاد کی بلند آہنگیوں اور خوجی کے نقطۂ نگاہ میں بھی ہے۔ جس طرح ڈان کوئک زوٹ اپنی خیالی محبوبہ ڈیلسنیا کے لئے دنیا فتح کرنے جاتا ہے۔ اسی طرح آزاد بھی حسن آرا کے حکم کی تعمیل میں روم لڑنے جاتا ہے۔ مگر یہ باتیں سطحی مشابہت لئے ہوئے ہیں اسی لئے فسانۂ آزاد کو اردو کا ڈان کوئک زوٹ کہنا اتنا ہی لغو ہے جتنا حشر کو اردو کا شیکسپیئر۔

کسی ناول کی جانچ کئی طریقوں سے ہوسکتی ہے۔ آرنلڈ بینٹ مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تین طریقے یا تین نقطۂ نگاہ یعنی ناولسٹ کا دائرہ عمل، اس کی تنقید حیات، اور اپنے افراد قصہ سے اس کا برتاؤ، ایک ناولسٹ کو جانچنے کے لئے کافی ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ناول کسی اور زاویۂ نگاہ سے یا کسی اور قاعدے کے مطابق یا کسی اور اصول کی رُو سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ یا اچھی طرح سے نہیں جانچا جاسکتا۔ ناول کو پرکھنے کے بہت سے پہلو ہیں مگر ان تین نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھنے میں بھی کسی ناول کی تحقیق میں فرق نہیں پڑتا اسی لئے ہم ناولسٹ کے دائرہ عمل کو پہلے لیں گے۔ اور باقی دونوں باتوں کو آخر میں علاوہ ان کے کئی معیار اور بھی ہیں جن کی رو سے فسانۂ آزاد پرکھا گیا ہے +

پہلے پہل مصنف کا دائرہ عمل[2] دیکھنا چاہیئے۔ بہت سے ناولسٹ ایسے ہیں جو ایک مقام یا علاقے تک محدود رہتے ہیں ہمارے ہاں تو ناول کا اتنا عام رواج ہی نہیں کہ ناولسٹ خاص خاص علاقوں کے لوگوں کی طرزِ معاشرت اور زندگی کے متعلق ناول لکھیں۔ البتہ اور ملکوں میں یہ اکثر ہوتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں انگلستان کی ایک خاتون جین آسٹن نے اس رواج کی بنیاد ڈالی اور اب تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کوئی بھی ریاست ایسی ہوگی جس کی نیابت عصری افسانے میں نہ ہو۔ بلکہ ایک امریکن ناولسٹ جیک لنڈن نے تو اس دور و دراز ملک ایلاسکا کی زندگی اور ماحول کی کہانیاں لکھنا اپنے لئے مخصوص کر لیا انگلستان میں ٹامس ہارڈی مشہور ناولسٹ، جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے انگلستان کے جنوب مغرب کے صوبجات کو ملا اور ایک فرضی نام یعنی ویسکس دے کر اس علاقہ کی زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ۱۹۲۷ء کا نوبل پرائز گریزیا ڈیلیڈا نامی اطالوی خاتون کو ملا تھا جس نے جزیرہ سارڈینیا کی معاشرت اور زندگی اپنے ناولوں میں پیش کر کے دکھائی ہے۔ یہ

1. Parody. 2. Field

خطوی[1] ناولسٹ بہت مقبول بھی ہوتے ہیں مگر دنیا میں ایسے ناولسٹ مثلاً ٹالسٹائے اور ڈاسٹو وسکی اور گوگل وغیرہ اور چند فرانسیسی ناولسٹ بہت ممتاز ہیں۔

سرشار نے اپنے تئیں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح تک محدود رکھا ہے۔ اس کی کہانی کا عمل سمندر پار بھی کیوں نہ ہو کئی ملک چھوڑ کر ولدیت چاہی ہی میں کیوں نہ پہنچ جائے مگر جو نقشہ سرشار وہاں کی زندگی کا دیتا ہے وہ چنداں قابل قدر نہیں ہوتا خصوصاً پولینڈ کی شہزادی والاقصہ تو الف لیلہ کی یاد دلاتا ہے۔ ایسے ہی قسطنطنیہ کی معاشرت تو کیا آزاد کے وہاں قیام کا جو بیان کتاب میں ملتا ہے وہ غیر موثر ہے اور قرین حقیقت نہیں معلوم ہوتا۔ سرشار کبھی اپنے اصلی رنگ میں نہیں ملتا جب لکھنؤ کا ذکر نہ کر رہا ہو۔ وہاں کے باشندوں کے تمدن، بود و باش کے متعلق نہ لکھ رہا ہو۔ بعض ایسے کیرکٹر بھی ہیں جو لکھنؤ سے باہر رہتے ہیں مثلاً بہار النساء جو بمبئی میں رہتی ہے مگر بہار النساء کے وہاں قیام سے سرشار کو آزاد کے لئے ایک مستقر بنانا مقصود تھا چنانچہ بمبئی سے جہاز میں سوار ہونے تک آزاد اسی پری پیکر کے ہاں رہتا ہے۔ اور جو جھلک یہاں کی زندگی کی سرشار ہمیں دکھاتا ہے یعنی بہار النساء کے گھر کی، وہ بھی لکھنؤ کا پرتو لئے ہوئے ہے +

البتہ اپنی بساط کی وسعت کے لئے سرشار نوابوں، ٹھاکروں، پنڈتوں، ملاؤں وغیرہ کے حالات کو کام میں لاتا ہے۔ یہ شخصیتیں اُس زمانہ میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں یہی لوگ اس سوسائٹی کے رکن رکین تھے۔ اگرچہ اودھ کا شاہی خاندان ۱۸۵۶ء ہی میں ختم ہو چکا تھا اور تمام صوبے پر انگریزی عملداری تھی مگر نوابوں اور ٹھاکروں اور تعلقہ داروں کے ہاں وہی واجد علی کا زمانہ تھا ان کے مشاغل وہی دولت مغلیہ کے آخری زمانے کے مشاغل تھے۔ ان کی روایات بھی وہی تھیں۔ غرضکہ اُن کا تمدن وہی رکیک اور مبتذل تمدن تھا۔ ان لوگوں کی زندگی کا نقشہ سرشار کی کتاب میں خوب دلکش انداز میں موجود ہے مگر اس ترکیب سے بھی کتاب کی وسعت میں بہت زیادہ ترقی نہیں ہوئی۔ علاقہ لکھنؤ کے باہر کوئی شہر ہو اس کا نام اگر بدل کر لکھنؤ ہی رکھ دیا جائے تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

باقی رہا آزاد کی مہمات کا ذکر، تو وہ تو اپنی جگہ ایک علحدہ ناول ہے۔ دراصل فسانۂ آزاد دو ناولوں کا مجموعہ ہے جن کا واحد ہیرو آزاد ہے۔ آزاد کی بمبئی سے روانگی ناول کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور اس کی پردیسی زندگی اور اُس کے معرکے اور کارنامے ایک علحدہ ناول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس بات میں سرشار دنیائے ادب میں اکیلا نہیں۔ ٹالسٹائے جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا ناولسٹ ہے وہ اپنے ناول "جنگ اور صلح" اور "رانیا کاری نینا" میں بھی دوہری دوہری کہانیاں وضع کرتا ہے اور پھر طرّہ یہ کہ ان دوہری کہانیوں کو آپس میں مربوط نہیں کر سکا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان کے مصنف چارلس ریڈ کے مشہور ناول "کلوائسٹر اور ہارتھ" یعنی کلیسا اور گھر" کے جوڑ بھی ڈھیلے ہی نظر آتے ہیں۔ یعنی اس کتاب کا ہیرو ناول کے درمیانی حصہ میں کوئی دو سو صفحات تک فقط سفر ہی کرتا رہتا ہے۔ یعنی ہالینڈ سے روما تک کا سفر کوئی دو سو صفحات میں پورا کرتا ہے جس کا کہانی سے دُور کا ہی تعلق ہے مگر سرشار نے تو ان دو حصوں کو ملانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ان کا درمیانی رشتہ بہت نازک ہے اور

1. Regional Novelists

آخر تک وہ دونوں قصے الگ الگ رہتے ہیں۔ شاید اسی بات میں سرشار کی سب سے بڑی کمزوری نظر آتی ہے۔

مگر یہ صرف اسی پر موقوف نہیں۔ اس فسانے میں اتنے قصے مختلف مقامات پر جڑ دیئے گئے ہیں کہ فسانۂ آزاد میں یک رنگی بالکل نہیں رہتی۔ مثلاً آزاد کی زندگی کا وہ حصہ جو ہندوستان سے باہر گذرا ہے۔ وہ بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اول قسطنطنیہ اور آزاد کا مس میڈا سے عشق۔ دوم محاذِ جنگ اور آزاد کے کارنامے۔ سوم پولینڈ کی شہزادی اور آزاد، ان سب میں پولینڈ کی شہزادی والا واقعہ نفسِ قصہ سے بالکل الگ ہے۔ اگر اسے نکال دیا جائے تو ناول میں سرمو فرق نہیں آسکتا۔

فسانۂ آزاد کا وہ حصہ جو لکھنؤ یا گردونواح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں بھرتی بہت ہے کہانی میں کہانی اور افسانے میں افسانہ نظر آتا ہے۔ اگر ٹھاکروں، نوابوں، رئیسوں کے حالات چھوڑ بھی دیئے جائیں اور لکھنؤ کا محرم الحرام یا عیش باغ کا میلا یا بسنت کا میلا یا کسی امیر کی برات سے قطع نظر بھی کیا جائے پھر بھی کئی ذیلی قصے[1] ایسے ہیں جن کا اصلی فسانہ سے نام کو تعلق نہیں اور اگر تعلق ہے بھی تو ایسا جس سے کہانی میں بہت طوالت اور ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس تعلق کے بیان کرنے سے تو اصلی کہانی کئی جگہ ٹوٹ جاتی ہے۔ ان ذیلی قصوں میں چند قصے جو نمایاں ہیں وہ یہ ہیں۔

اول۔ اللہ رکھی عرف ثریا بیگم کی زندگی اور اس کی معاشرتی معرکہ آرائیاں۔ ثریا بیگم کے کردار سے ہمیں اس وقت واسطہ نہیں اسے بعد میں دیکھیں گے۔ فی الحال یہ بتانا مقصود ہے کہ اس سیماب فطرت عورت کی زندگی کے واقعات کو اصل پلاٹ سے جو تعلق ہے وہ اس کا آزاد سے عشق ہے اور یہ عشق ہی اسے سینکڑوں خطرات اور صعوبتوں میں لا ڈالتا ہے۔ کہاں بھٹیارن کہاں ثریا بیگم اور بڑے بڑے خاندانوں سے میل ملاقات، کہاں کسی تھانیدار سے چہل، کہاں نقلی آزاد سے داؤ پیچ۔ یہ سب باتیں آزاد کی کہانی سے لاتعلق ہیں۔

دوم سپہر آرا اور ہمایوں فر۔ ان دونوں کا عشق اگر سرسری طور پر کہانی میں موجود ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا بلکہ اس سے فسانے میں شیرینی پیدا ہو جاتی کیونکہ سپہر آرا ہی دراصل سارے فسانے کی جان ہے وہی سب بہنوں سہیلیوں کے لئے حیات آفریں ہے، مگر یہ عشق اور ہمایوں فر کی موت، اس کا احیا یعنی وہ پیر فقیر کا ڈھکوسلا اگرچہ اس روپ بہروپ سے سرشار کو فقیروں کی شعبدہ بازیوں کی خاک اڑانی مقصود تھی، نقلی آزاد کے دام، یہ سب باتیں بھی وسطی پلاٹ سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتیں۔

سوئم۔ نقلی آزاد بذاتِ خود۔ یہ حضرت محض فسانے کو لمبا کرنے اور آزاد کی غیر حاضری میں ہندوستانی حصہ پلاٹ کو رونق دینے کے لئے داخل کئے گئے ہیں۔ ان کا آزاد سے اور اس کے معاشقوں سے کوئی تعلق نہیں۔

ان سب کے علاوہ اگر ان معترضہ کہانیوں کو لیا جائے جو نوابوں، ٹھاکروں ملانوں سے متعلق ہیں تو معلوم ہو جائے کہ اصل کہانی نصف جلد میں ختم ہو سکتی تھی۔ اس طرزِ نگارش کی کئی وجوہ ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرشار کو فسانوں کی تعمیرت

---

1. Subplot.

عزیز نہ تھی۔ یا اس نے تعمیر اور ساخت کے نکتے کو بہت اہم نہیں سمجھا۔ دوسرے۔ فسانۂ آزاد رسالے میں چھپتا تھا اس طریقۂ اشاعت کی وجہ سے کہانی میں بے ربطی پیدا ہو جانی لازمی تھی۔ اور یہ بات سرشار ہی پر موقوف نہیں تھی انگلستان میں اسی صدی کے نصف سے ذرا قبل ڈکنز اور زیادہ تر تھیکرے کے ناول رسالوں میں چھپنے کی وجہ سے ایسے ہی ڈھیلے ڈھالے اور قدرے بے ربط ہو گئے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہو جاتا تھا کہ سرشار نے اور ادھر ڈکنز نے بھی فسانے کے لئے نئی قسط نہیں لکھی ہوتی تھی۔ اس لئے جو مضمون یا کہانی اس وقت موجود ہوتا معمولی ردوبدل سے رسالے میں درج کر دیا جاتا۔ یا اگر کوئی ایسا خیال سرشار کے دماغ میں موجود ہوتا جو صوبہ کی زندگی کے متعلق ہوتا خواہ حسن آرا سے اسے واسطہ ہو یا نہ ہو تو لکھ کے مطبع میں بھیج دیا جاتا۔ انہیں وجوہ سے فسانے میں ایسا ڈھیلا ڈھالا پن اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔

دوسرے جو بات سرشار میں کم پائی جاتی ہے وہ تناسب ہے۔ یعنی کہانی کے مختلف اجزا کو یا حصص کو ایک دوسرے سے پوری نسبت سے قائم کر دینا سرشار میں مفقود ہے۔ اس نقص نے اس امر سے اور بھی زور پکڑا ہے کہ سرشار کو طوالت کی عادت بھی تھی۔ یعنی ایک بات جو دو صفحوں میں لکھی جا سکتی تھی سرشار اسے چار صفحات میں لکھتا ہے۔ اسی طرح جتنے انحرافات[1] فسانے میں موجود ہیں ان میں سرشار بھٹک گیا ہے اور کامیاب نہیں ہو سکا۔ بلکہ کئی ایسے قصے بھی ہیں جو ادھورے چھوڑے گئے ہیں اور بعد میں ان کا ذکر تک نہیں۔ ایسے ہی ملانوں کے، حافظوں کے، پنڈتوں کے، معلموں کے جو قصے موجود ہیں انہیں کہانی میں صحیح طور پر منسلک نہیں کیا گیا بجائے خود ان کی خوبی میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر ہر ایک چیز اپنی جگہ اچھی لگتی ہے۔ اگر ان سے سوائے قصہ کو طول دینے کے اور کوئی کام نہیں لیا گیا اور ان کی ترتیب بھی اس طرح نہیں کی گئی۔ جس سے نفس قصہ پر روشنی پڑے۔ سوائے اس کے کہ یہ نقائص میں شمار ہوں اور ان کی نسبت اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

سوم فسانۂ آزاد کا انجام مصنف کی تھکن کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے تھک کر کہانی کی رہی سہی باگ بھی چھوڑ دی جوں توں کہانی کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بڑے بڑے ادیب اور آرٹسٹ اپنے شاہکاروں کا اختتام ٹھیک طور پر نہیں کرتے۔ سر والٹر سکاٹ مشہور تاریخی ناولسٹ اپنے ناولوں کے خاتمے سمیٹ دینے میں مشہور رہے۔ ٹامس ہارڈی جیسا صناع اپنے ناول "ریٹرن آف دی نیٹو" کا انجام افرا تفری میں کر دیتا ہے یوسٹیشیا ناول کی ہیروئن کو اس کے عاشق وِلڈیو کے ساتھ ایک طوفان میں بہا دیتا ہے۔ خواجۂ خواجگان ادب یعنی شیکسپیر نے اپنے ڈرامے ہیملٹ کے اختتام میں اسی بے ترتیبی سے کام لیا ہے۔ اور بیسویں صدی میں آرنلڈ بینٹ نے "بڑھیا کی کہانی" میں اُن دو بہنوں کا جو ناول کی ہیروئین ہیں کے

---

1. Digressions

آخر میں گلا گھونٹ دیا ہے۔

سرشار کو جدید تنقیدی اصولوں سے جانچتے ہوئے اس بات کی توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ اس میں وحدت، تعمیر اور بصیرت، اخلاقی اہمیت، یا دوسری باتیں موجود ہوں۔ ان باتوں کے ابتدائی اصولوں سے بھی وہ واقف نہیں۔ نہ وہ فسانے کی ساخت کی طرف ہی متوجہ رہتا ہے اور نہ سیرت نگاری ہی کی طرف۔ پلاٹ کی پیچیدگیاں اور ان کا سلجھانا اسے نہیں بھاتا۔ نہ آخر میں کوئی حیرت انگیز انکشاف ہی ہوتا ہے اور نہ درمیان میں تذبذب رہتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو آدمی اپنے آپ سے بے خبر بھی نہیں ہوتا۔ یعنی جیسے اکثر ناولوں کے پڑھتے وقت اپنے ماحول سے پڑھنے والا انجات پا لیتا ہے فسانہ آزاد کو پڑھتے وقت بعض دفعہ یہ عالت طاری نہیں ہوتی کئی دفعہ فسانۂ آزاد اتنا پھیکا ہو جاتا ہے کہ اپنے گرد و پیش کو بھول جانا تو کجا، مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔

اس لئے خیال ہوتا ہے کہ سرشار کے سامنے کون سی شئے تھی کون سا خیال تھا جس کے ماتحت اس نے اتنے فسانے لکھے۔ اس کے دوسرے ناول پڑھنے سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح کی سوسائٹی ہی ایک ایسی چیز تھی جس سے سرشار کو دلچسپی ہے۔ اور اس دلچسپی میں بھی اونچے طبقے کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہی سوسائٹی اس کے دماغ سے کاغذ پر اترتے وقت عجیب رنگا رنگ کیفیت حاصل کر لیتی ہے اس معاشرت کو وہ اپنے ناول میں پیش کرتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مرغ بازی، بٹیر کی پالیاں، دنگل، براتیں، جنازے، بازاری لڑائیاں، ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق اسے لکھنا نہیں آتا۔ نہیں، بلکہ ان کے متعلق جب وہ لکھتا ہے تو اسکی قوت بیانیہ پورے زوروں پر ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقت نگاری کے معراج پر جا پہنچتا ہے۔ مگر اسے زیادہ لگن اسلامی گھرانوں کے متعلق لکھنے کی تھی۔ نوابوں کے ڈیرے اور بیگمات کی زندگی، یہ دونوں چیزیں اسے بہت مرغوب تھیں۔ سیرت نگاری سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اور نہ سیرتوں کے تنوع سے کبھی سوسائٹی کی تصویر کھینچ لینا ہی اسے آتا تھا۔ بلکہ معاشرتی جزویات کو اس طرح کام میں لانا کہ ان کے تدریجی اجتماع سے پلاٹ کے واقعات خود بخود پیدا ہو جائیں یہ بھی اس کا مطمح نظر نہ تھا۔ اور لطف یہ کہ اپنے زمانے کی معاشرت کی تصاویر بھی پیش کرنا اسے مطلوب تھا۔ اور ان پہ تبصرہ کرنے کو بھی اسکا جی چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈان کوئک زوٹ کی برابری کرتے وقت اس کا فسانہ ناولسٹ سماآیٹ کے شاہکار راڈرک رینڈم کے زمرہ میں آشامل ہؤا۔

راڈرک رینڈم کی قسم کے دو تین اور ناول دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان میں گل بلاس اور ٹام جونسز اول فرانسیسی اور دوسرا انگریزی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ ٹام جونسز جو اٹھارھویں صدی میں ہنری فیلڈنگ نے لکھا تھا، ان سب سے بلحاظ سیرت نگاری، ساخت اور کیفیت کے فوقیت رکھتا ہے۔ مگر یہ سب ناول پکارسک[1] ناول ہیں۔ اس طرز سے مراد وہ ناول ہیں جن میں ناولسٹ وسطی کیریکٹر یعنی بطل قصہ کو مختلف مناظر میں سے، مختلف واقعات

1. Picaresque.

اوراشخاص قصے میں داخل کرتا ہے اوراس طرح میں سے یکے بعد دیگرے نکلتا ہے۔ اور انہیں واقعات کے ذریعے سے
کسی سوسائٹی کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اس میں شرط یہ ہوتی ہے یا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ہیرو ہر واقعہ کی جان ہوتا ہے
یعنی ہر جگہ وہ موجود ہوتا ہے۔ اور ناول کا ہر واقعہ اسکی موجودگی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ گویا کہانی ہیرو کے گرد لپٹی ہوئی
ہوتی ہے مگر سرشار اس طرز پر بھی قائم نہیں رہتا۔ وہ آزاد کی موجودگی کو لازمی نہیں سمجھتا اور یہی وجہ ہے کہ کتاب میں
یک رنگی موجود نہیں۔ کوئی ایسا مرکزی عمل[4] نہیں جس کی معاونت ہر واقعہ کرے۔ جس میں ہر واقعہ ایک کڑی کی صورت
میں شامل ہو۔ افرادِ قصہ پلاٹ یا عمل کے اجزا کے طور پر وضع نہیں کئے گئے یعنی ان کا
ملے اور عمل کی ترقی میں شامل ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ اگر وہ پلاٹ کے ماتحت نہیں
خلاف پلاٹ نہیں۔ وہ پلاٹ کی وجہ سے ظاہر نہیں ہوئے۔ اور لطف یہ ہے کہ اگر وہ پلاٹ کے ماتحت نہیں
تو آزادانہ طور پر انہیں زندہ رہنا چاہئے تھا۔ سو اس لحاظ سے بھی فقط ثریا بیگم یا سپہر آرا وغیرہ مستثنےٰ ہیں
جنکا اصل کہانی یعنی آزاد اور حسن آرا کی کہانی سے کوئی واسطہ نہیں۔

اگر فسانہ آزاد میں صرف شرفائے لکھنؤ اور محلات کی طرزِ معاشرت ہی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اصلیت پر مبنی نہیں۔ مثلاً حسن آرا اور آزاد کی ملاقات ہی کو لے لیجئے۔ یہ طرز ملاقات واقعی چھوڑ رومانی[1] بھی نہیں۔ محض تصوری ہے۔ یو۔پی تو کیا ہندوستان بھر میں اور ہندوستان ہی پر کیا موقوف ہے باقی دنیا میں بھی جہاں معاشرتی آزادیاں بہت ہیں وہاں ایسا عجیب وغریب واقعہ شاید ہی کسی کو پیش آیا ہوگا۔ البتہ منمیات میں جنوں اور پریوں کے قصوں اور ہماری جلیل القدر رومانسوں[2] میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں۔ یہاں سرشار پہ مشرقی فسانوں مثلاً حاتم طائی کے قصے وغیرہ کا بہت اثر پڑا ہے۔ سپہر آرا اور ہمایوں فر کی عشق بازی بھی عصری زندگی کا عکس رنگیں ہے ہمایوں فر کا باغ میں مالی کے لڑکے کے بھیس میں آنا تو ہندوستانی قصوں سے ملتا جلتا ہے۔ آزاد کا یک دم عاشق ہو جانا بھی طلسم ہوشربا کی رسم ہے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ فریقین کے بیک وقت اور فوراً بیہوش ہو جانے کی رسم بھی طلسم ہوشربا کی شرمندۂ احسان ہے۔

لکھنؤ کے اسلامی طبقے کی معاشرت اور محلات، بیگمات، مغلانیوں وغیرہ کی زندگی جہاں تک اس کا تعلق طرزِ بیان اور گفتگو سے ہے بہت اچھی طرح ظاہر کی گئی ہے۔ گفتگو کی اصلیت اور سچائی میں یعنی واقعیت میں کسی کو کلام نہیں۔ بیگمات کے معاشرتی تعلقات، میل جول، رسوم، شادی بیاہ، تہوار۔ بے نظیر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ البتہ ان پر تخیلی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مستورات کی بول چال گپ شپ، ادھیڑ بن اسی

Romantic

Gil Blas 2. Tom Jones 3. Picaresque Novels 4. action

طرح بے ترتیب، بلا نتیجہ، اور بلا مقصد بیان کی گئی ہے جیسے زندگی میں ہوتی ہے۔ مگر بعض جگہ یہ گفتگو بہت ٹھوس
اور علمی ہو جاتی ہے اور جوان لڑکیوں کی گفتگو میں تو اشعار کی بھرمار ہے۔ انہیں پر کیا منحصر فسانۂ آزاد میں سب کو
شعر خوب یاد ہیں۔ طریقہ تصنع پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور اس سے بیان بے لطف ہو جاتا ہے۔ ان معاشرتی مرقعوں
میں بعض جگہ نزاکتِ بیان اور لطافتِ حسن بلکہ روشن خیالی کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان میں گہرائی
نہیں ملتی۔ سطحیت کا عیب عام ہے۔ افراد کی نفسیاتی تحلیل نہیں، انکے ارادوں کے پوشیدہ محرکات بھی واضح نہیں
کئے گئے۔ جذباتی تفصیل اور اس کا اثر افراد کے کردار پر کچھ موجود نہیں۔ سرشار نے اپنی تصویر کو کسی طرح میلا نہیں
ہونے دیا۔ یعنی جذباتی تکدر سے یہ سنہری دھند جس میں وہ حسن آرا اور اسکی بہنوں اور سہیلیوں کو ملفوف کر دیتا
ہے، ملوث نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ تصویر بہت اُجلی ہے، بہت حسین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن آرا کی زندگی دل پر زیادہ
نہیں کرتی شاید جو اثر پیدا بھی ہو سکتا تھا اسے سرشار کی عادتِ دیرینہ یعنی تسلسلِ مضمون نے ضائع کر دیا ہے
بلکہ بعض جگہ تو وہ ایسی غیر ضروری اور غیر متعلق باتیں شروع کر دیتا ہے کہ طبیعت منغص ہو جاتی ہے اور تمام اثر ضائع
ہو جاتا ہے۔ دراصل سرشار ایک جز رسٹ طبیعت اور انداز کا مالک تھا۔ ایسے انہی مضامین، یعنی شادی بیاہ کے چرچے،
بیت و عبادت کے مواقع وغیرہ کے بیان کرنے میں ایسا لطف آتا تھا کہ وہ اصل موقع کو بھول جاتا تھا۔

جہاں تک آزاد کے ترکی میں تمام کا تعلق ناول سے ہے۔ اور جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اس کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے
جہاں سرشار نے اپنے تئیں دھوکا دیا۔ آزاد کی دوستیاں خواہ وہ تختۂ جہاز پر ہوں یا قسطنطنیہ میں، خواہ فوج کی قیادت
کا سوال ہو یا ذاتی تہور کا، یہ سب باتیں اسکی طبیعت کے منافی نہیں۔ مگر ہندوستان کا آزاد اور چیز ہے۔ اور اگر سرشار
ہندوستان یعنی صوبۂ اودھ تک ہی محدود رکھتا اور اس کی فطرت کی جولانی کے لئے اور معرکے وضع کرتا تو یقیناً
موجودہ آزاد سے بہتر ہوتا۔ جنگ ایک ایسی چیز تھی جس کا علم سرشار کو نہ تھا اور نہ یہ مضمون اس سے اچھی طرح
سکا۔ اگر کسی جگہ شرر کا اور سرشار کا مقابلہ یا موازنہ کیا جا سکتا ہے تو یہی جنگ کے بیانات ہیں۔ شرر ایک رومانی
اور سرشار ایک اصلیت نگار مگر جنگ کے اذکار اگرچہ شرر میں بھی اصلی معیار پر نہیں ملتے۔ جیسے کہ داستان پاستان میں
اور سرشار سے بہتر ہونگے یعنی ملک عبدالعزیز ورجنا کا جنگی حصہ تو سرشار کے بیان سے اچھا ہے۔ جہاں سرشار
سے قوتِ بیان اور مشاہدہ اور قوتِ تخلیق اور سیرت نگاری میں بہتر ہے وہیں شرر رزمیہ بیانوں میں سرشار سے بہتر ہے
اس ضمن میں مس کلیپر ساڑلے واقعہ پہ نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ یہ واقعہ تصنع سے پُر ہے۔ یہاں بھی سرشار داستانِ امیر حمزہ
سے متاثر ہے جہاں اس قسم کے نسائی شہسوار بہت سے ہیں۔ خصوصیت سے گیتی سوار جو بعد میں بدیع الزماں کی والدہ ہوئی۔
فطرتاً یہ مختلف ہے۔ اور اس جگہ سرشار کے الفاظ اور اس کی تحریر مزاحیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور مزاحیہ ہی نہیں بلکہ یہ
واقعہ بالکل کامِک ہے یعنی انداز ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ سرشار کسی فرد کو اسوقت اسکی حقیقی حیثیت میں نہیں لے رہا بلکہ

ان کو اس حیثیت سے دیکھ رہا ہے کہ وہ فقط ہنسی اور ظرافت اور تفننِ طبع کے لئے وقف معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ بات سرشار کے کمالات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ وہ کسی واقعہ کو گرد و پیش کے فطری رشتوں سے توڑ کر ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس کے باشندے عمرو عیار، خوجی، سانکو پینزا، فالسٹاف[1] جیسے افراد ہیں۔

پولینڈ کی شہزادی والا واقعہ بھی "داستان" کی یادگار ہے۔ اسمیں بھی بارہا حسین جادوگرنیاں امیر حمزہ کے لڑکوں اور نبیروں پر عاشق ہو کر انہیں اٹھا لے جاتی ہیں اور ان سے وصل کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ بلکہ انکے انکار پر انہیں قید کر دیتی ہیں اور عذاب دیتی ہیں حتیٰ کہ شہزادوں کے عیار انہیں آکر چھڑا دیتے ہیں۔ اس موقع پر بھی سرشار نے اپنا اصل رنگ کھو دیا ہے۔ اگرچہ خوجی کی آمد سے اور اسکی مصلحت آمیز صلح سے کہانی میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے مگر غیر ضروری۔ کیونکہ خوجی کا بھی اصل مقام ہندوستان یعنی لکھنؤ ہے۔ جہاں وہ ہر وقت اپنی حقیقی آب و تاب میں نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود کتاب کے اس حصے میں اگر کوئی چیز دلچسپی پیدا کرتی ہے تو وہ خوجی کی موجودگی ہی ہے۔ خوجی کا کردار دنیا کے ادبی جواہر ریزوں میں سے ہے۔ اسکا آزاد سے چمٹا رہنا اور اپنے افیونی فلسفہ سے دورانِ گفتگو میں آزاد کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہنا اپنے نقطۂ نظر کی وجہ سے آزاد کے مثالی عزائم اور تخیلات کی دنیا میں "ہوش اور واقفیت" اور "روز مرّگی" قائم کرنا۔ یہ باتیں اس ترکی حصۂ کتاب کی جان ہیں۔ جسطرح داستان اور طلسمات میں عمرو عیار جو بذاتِ خود ایک عظیم ادبی کارنامہ اور اعلیٰ درجہ کی تخلیق ہے۔ امیر حمزہ کے ساتھ سایہ کی طرح رہتا ہے اور اپنی خست اور ہیبت کذائی سے داستان میں رنگینی، اور ظرافت پیدا کرتا ہے ویسے ہی خوجی اپنے افیونی کیف سے کتاب کو لالہ زار بنا دیتا ہے۔ جہاں خوجی ہوتا ہے سورج چمکتا رہتا ہے افسردگی، ملال، تکدر، پاس نہیں پھٹکتا۔ اگرچہ بعض جگہ اسکی باتیں تکرار کے باعث بے مزہ اور بعض جگہ بھونڈی بھی ہو جاتی ہیں اور صحیح مذاق سے گر جاتی ہیں۔ مگر اکثر مقامات پہ خوجی ظرافت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ ٹھیک بھی ہو کہ "ہائے نہ ہوئی میری قرولی" کی پکار کئی دفعہ پھیکی اور گراں ہو جاتی ہے۔ مگر دورانِ جنگ میں "خوجی دن" جب خواجہ بدیع الزماں باایں شان و شکوہ روسیوں سے لڑتے جاتے ہیں اور واپسی پر ہندوستان میں اپنے حقیقی بھائی خواجہ رفیع الزماں سے انکی لڑائی، اور آزاد کی واپسی کا دن، ان چیزوں میں سے ہیں جن پر اردو کو ناز ہے انہیں میں سرشار کی ظرافت نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ سیاسی فسانے میں خوجی کی نکتہ آرائیاں خواہ وہ اپنے متعلق ہوں یا جنگ کے فواید اور نقصانات پر، یا ہتھیاروں پر یا آزاد پر، یا اس کی محبتوں پر، بہت ہی پرلطف ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ انگلستان کے مشہور ناولسٹ چارلس ڈکنز کی طرح سرشار کو بھی بس کرنا نہیں آتا تھا۔ ضبط ایک ایسی چیز ہے جس سے اسے قطعاً انس نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فسانے کا ڈھانچ بہت ڈھیلا ہے اور افرادِ قصہ بے وجہ طوالت اور افراطِ بیان کے باعث کئی جگہ مسخ ہوتے ہوتے رہ گئے ہیں۔

---

[1] شیکسپیئر کے ڈرامے ہنری چہارم کا مشہور کردار

فسانۂ آزاد کے نسائی کیریکٹروں میں سپہر آرا سب سے کامیاب ہے اس کے مقابلے میں حسن آرا پھیکی، بے رنگ
ر جذباتی[1] ہے سپہر آرا فسانے کی بہار ہے۔ اس کا الھڑپن، اس کی شوخی۔ اس کی حاضر جوابی، اس کی چلبلاہٹ، اس کا
لبلین بے حد دلنواز ہیں۔ حسن آرا، حسن کی، فہم کی، سیرت کی مثال ہے۔ اور اس کا خشیر بھی مثال کا سا ہے وہ ایک
بر ہے اور باقی سب کم و بیش اسی کی نقلیں ہیں اور اسی سے کسبِ زندگی کرتی ہیں۔ مگر سپہر آرا ایک نمایاں شخصیت کی
لک ہے اور ان سب سے زیادہ جان رکھتی ہے۔ شاید یہی ایک ایسا کردار ہے جس میں کسی قسم کا ارتقا پایا جاتا ہے ورنہ
قی سب کیریکٹر ساکن ہیں یعنی ان میں نشو و نما نہیں ہوتی۔ اور جن خاصیتوں کو لے کر وہ فسانے میں شامل ہوئے
تھے بغیر کسی قسم کی کمی بیشی کے وہ اسی طرح فسانے کے اختتام تک موجود رہتے ہیں سپہر آرا کی زندگی ہی میں انقلاب آتا
ہے اور اس کی شوخی اور خوشی اور رنگینیٔ طبع زائل ہو جاتی ہے۔ مگر جب تک ہمایوں فر کی موت نہیں واقع ہوتی سپہر آرا کی باتیں
اہ وہ حسن آرا سے ہوں یا بہار النسا اور دوسری بہنوں اور سہیلیوں سے بے حد، دلکش ہوتی ہیں۔ جب آزاد چلا جاتا ہے
ر حسن آرا مغموم رہنے لگتی ہے تو سپہر آرا ہی اسے بہلاتی ہے اور جو تسلیاں اور دلاسے وہ حسن آرا کو دیتی ہے اگرچہ ان میں اکثر باتیں
سرت آمیز ہوتی ہیں مگر اس کی بذلہ سنجی ہمیشہ غم ربا اور دل خوش کن ہوتی ہے اور یہی باتیں اس حصہ کی روح ہیں +

دوسرا کردار جو خاص سرشار کی قوتِ تخلیق کا نتیجہ ہے وہ ثریا بیگم ہے۔ یہ عورت جو پہلے ایک ستر برس
کے بڈھے کی بیوی تھی اور پھر بھٹیاری بنی اور بعد میں آزاد پر عاشق ہو کر جہاں نور دین گئی اردو ناول میں
یک نئی چیز ہے۔ اگر اس کردار پر لفظاً "واقعی" عاید کیا جائے تو شاید ٹھیک نہ ہو۔ ثریا بیگم دراصل سرشار کی رومانی
کیفیات کا اُبال ہے۔ سرشار نے اسے اتنی روح اور زندگی اور ہمت ودیعت کی ہے کہ خواہ کیسی مشکل الجھن میں پھنسی
واس کی ذکاوت اسے وہاں سے صحیح و سالم نکال لاتی ہے۔ اور اپنی ہمت اور ہوشمندی کے طفیل وہ کہیں سے کہیں
پہنچ جاتی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ گھرانوں میں اسے دیکھ لو۔ اور شہر کے مشکوک سے مشکوک طبقہ میں اسے پا لو۔ ہر جگہ اپنی زبان
پنی عقل، اور حسن کے طفیل رونقِ محفل ہو گی۔ اس کی سیماب فطرتی ہی اسے ایسی مصیبتوں میں پھنسا دیتی ہے جہاں وہ
یک امیر بیگم کی حیثیت سے رہتی ہے اور تھانیدار سے اور نقلی آزاد سے اسکی نوک جھونک ہوتی ہے وہاں وہ اپنے
کمال پر ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کا آزاد کے عشق میں ثابت قدم رہنا اور اسی کے باعث بہت سے جھگڑوں میں
پڑنا اور دھوکے کھانا۔ اسکی سیرت کو کامل بنانے میں مدد دیتا ہے

مگر بحیثیت مجموعی یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرشار کی سیرت نگاری میں بہت سی کمیاں ہیں۔ جذبات انسانی کا

---

1. Sentimental
2. Pattern
3. [illegible]

اسے کوئی گہرا علم نہیں تھا۔ محبت کی بین القلبی کشاکشوں یا اسکے تیز و تند مظاہرات یا اسکی تحلیل، یا اسکے باہمی عمل
و ردِ عمل، یا اسکے لاگ لگاؤ سرشار کے دائرہ زندگی اور تخیل میں نہیں آئے تھے۔ اسے تو محبت کی سادہ کہانی کہنی
آتی ہے اسکے ہاں تو قیس لیلیٰ پر عاشق ہو جاتا ہے پھر کسی وجہ سے خواہ کسی اصول کے ماتحت خواہ والد یا والدہ کی
بدولت خواہ رسم و رواج کے طفیل ان میں علیحدگی ہو جاتی ہے فراق کی تصویریں ہوتی ہیں۔ رونا ہوتا ہے، بلکنا ہوتا ہے
پھر ملاپ ہوتا ہے اور بعد میں ایک دوامی معانقہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اُس کا دماغ اس کہانی میں کوئی جدت نہیں پیدا کر سکتا تھا
پھر بھی اس نے آزاد کو بیسیوں ہی معاشقوں میں پھنسایا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس زمانے کے لکھنؤ میں ایک نوجوان
کے لئے یہی مناسب ہو کہ جگہ جگہ عاشق ہوتا پھرے بات بات پر دل بیچتا پھرے، لمحہ لمحہ میں بیہوش ہوتا پھرے
اور ہر فسانہ کے ہیرو کی بہترین خوبی بن گئی جائے کہ سو صفحات میں دس دفعہ حضرت نت نئے حسین پر جان دیں اور انکی
زندگی تمام کیوپڈ (عشق کے دیوتا) کے جال میں پھنسنے، نکلنے اور پھر پھنسنے ہی میں گذر جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ضلع عصری فیشن اور ادبی رواج و روایات سے متاثر ہوتا ہے۔ سرشار کے دنوں
میں یہ فیشن بہت مقبول تھا کہ نوجوانانِ لکھنؤ کی تعلیم میں، آداب میں، دماغی تکمیل اور اجتماعی ترکیب میں سریع الحسی اصل
ہو۔ یعنی کسی چلمن سے کسی مہ پارہ کی جھلک پڑی اور فوراً اندھے ہو گئے کسی گاڑی سے گذرتے ہوئے کسی کا ہاتھ دکھائی دیا
اور صبر و قرار کھو دیا۔ کسی طریقہ سے بیاہ میں میلے میں، عید کو، شب برات کو، ہولی کو، دیوالی کو کسی کو ایک پل کے لئے دیکھ
لیا اور پھر آب و دانہ حرام، شب و روز آہ و زاری، بیقراری اور بین اور فلکِ کجرفتار کو گالیاں۔ خون دل کھانے کو
ہے اور لختِ جگر پینے کو ہے مسیحا کے لئے پکار ہے۔ اور قبر اور فاتحہ کے قصے ہیں۔ سرشار نے ایسے ماحول میں پرورش پائی
تھی۔ اس لئے ان اثرات سے اس جیسا آزاد دماغ بھی نہ بچ سکا۔

اگرچہ فسانۂ آزاد کے معاشقات میں لکھنؤ کی "مریضانہ جذبات پرستی"[1] نہیں۔ مگر انکی بہتات اور اُن کا تواتر
عصری اثرات کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آزاد کثیر المعشوق ہیں یہ بات جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا سب سے زیادہ طلسم
ہوشربا میں پائی جاتی ہے جس کا ترجمہ غالباً اسی صدی کے وسط میں اردو میں ترجمہ ہوا تھا۔ اور جس کا اثر ضرور ان سب
کتابوں پر ہوا ہوگا جو اسی زمانہ میں شائع ہوئیں۔ مثلاً ہوش ربا کے ہیرو اسد نامدار، مہ جبین، لعل سخندان، لالالن خو
بنت حکیم آزاد بخت وغیرہ کے علاوہ درجنوں حسینان ہوش ربا پر ہزار جان سے عاشق ہے۔ مگر وہاں اسد غازی
میں اتنی شرافت موجود ہے کہ بیچارہ آخر میں چپ چاپ سب سے شادی کر لیتا ہے۔ مگر یہاں ثریا بیگم، بہار النسا
(اگرچہ وہ شادی شدہ ہے)، مس کلیر سا، مس میڈا اور پولینڈ کی شہزادی سے بہت برا سلوک کیا جاتا ہے جو

[1] Sickly sentimentality

مس کلیریسا اور مس میٹلڈا کو جب سرشار اور کچھ نہیں دے سکتا تو محکمہ تعلیم ہی میں دھکیل دیتا ہے۔ اور بیچاری ثریا بیگم کے ساتھ جو آزاد کے عشق میں کہیں کی نہیں رہتی جو برتاؤ سرشار روا رکھتا ہے وہ نہ تو فنی لحاظ سے قابل ستائش ہے نہ مشرقی اخلاق و روایات کے مطابق ہے۔

آزاد کا حسن آرا سے عشق امیر حمزہ اور ملکہ مہر نگار کے عشق کا عکس لئے ہوئے ہے۔ فرق یہ ہے کہ داستان میں نوشیرواں اور اسکا وزیر بختک امیر حمزہ کو ملک بہ ملک نت نئی مہم پر بھیجتا رہتا ہے۔ اور یہاں حسن آرا یہ خدمت اپنے سر لے لیتی ہے۔ داستان میں حمزہ مفتوح بادشاہوں کی لڑکیاں، بہنیں، بیاہنے سے انکار کرتا ہے کیونکہ اس نے مہر نگار سے عہد باندھ رکھا ہے کہ اس سے شادی ہونے سے پہلے کہیں اور بیاہ نہیں کریگا۔ اگرچہ کوہ قاف میں امیر صاحبقران مدظلہ آسمان پری سے بے دریغ شادی کر لیتے ہیں۔ اور فسانۂ آزاد میں میاں آزاد سوائے پولینڈ کی شہزادی کے جس سے رہائی پانے کے لئے وہ خوجی کو مشورے کے مطابق مجبوراً عارضی نکاح کر لیتے ہیں۔ باقی سب حسینوں سے عجیب کج ادائی سے پیش آتے ہیں۔ معلوم نہیں اس طرح سرشار نے اپنے وطن کی کج ادا اور کم آمیز عورتوں سے انتقام لیا ہے یا کیا؟ ـــ

آزاد ایک مثالی ہیرو[1] کا عمدہ نمونہ ہے یعنی تمام کمالات کا مجموعہ، تمام صوری اور باطنی خوبیوں کا مرجع رفتار میں گفتار میں، اخلاق میں، ہر بات میں بے نظیر ہے بہادری کا یہ عالم ہے کہ فرزندان حمزہ کی طرح یا پولینڈ کے مشہور ناولسٹ سنکی وکز[2] کے ہیرو مائیکل کی طرح ایک حملہ میں دستے کے دستے فوج کے تباہ کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔

مگر سرشار کردار کی تخلیق میں یا فسانوی شخصیات کو زندہ کرنے میں زیادہ ماہر نہ تھا۔ مثلاً اسکے افراد قصہ ظاہری طور پر تو سبھی کچھ رکھتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ اور سیاہی کے بنے ہوئے ہیں۔ گوشت پوست نام کو نہیں خیال ہوتا ہے کہ اگر فسانۂ آزاد کے جمیع افراد کو لیا جائے اور اندازہ کیا جائے کہ انسانی عناصر میں سے گوشت اور خون یعنی بشریت ان میں کس درجہ تک ہے۔ تو اس زبان زد خلائق مصرع کے مصداق ہوگا ؏

جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

انگریزی کا ایک نامور نقاد کہتا ہے کہ کیریکٹر یعنی کردار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جنکو وہ "چپٹا" کہتا ہے۔ دوسرے جنہیں وہ "گول" کہتا ہے "چپٹے" کردار سے اسکی مراد ان افراد قصہ سے ہے جو فقط مصنف کے سطحی مطالعۂ زندگی اور قدرت تخلیق کی وجہ سے فقط دو ابعاد کے مالک ہوتے ہیں یعنی گہرائی بالکل نہیں رکھتے۔ مصنف کسی شخص کی دو ایک

1. Ideal Hero

2. Sienkiewicz

خصوصیات لے کر انہیں ایک نام دے دیتا ہے، مگر ان میں "زندگی" نام کو نہیں ہوتی۔ خود وہ کوئی ذاتی شخصیت نہیں رکھتے۔
اگر غور سے دیکھا جائے تو فقط کاغذی تصویر ہوتے ہیں جنہیں مصنف اپنی قدرت سے ناطق اور متحرک بناتا ہے "گول" افراد سے مراد
وہ فسانوی شخصیات ہیں جو فقط کاغذ کے نمونے کی طرح لمبائی اور چوڑائی ہی نہیں رکھتے بلکہ گہرائی بھی رکھتے ہیں یعنی اُن کی شخصیت
کامل ہے اور پورے خواص بشری کے حامل ہوتے ہیں، ہماری طرح دل رکھتے ہیں، جان رکھتے ہیں، خون رکھتے ہیں اور کتاب میں
ان کے متعلق کچھ پڑھنے سے ہمیں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

مگر "چپٹے" کردار کی ایک یہ خصوصیت ضرور ہے کہ وہ ان لوگوں کی طرح جنکی کوئی ذاتی خصوصیت بہت نمایاں ہو لوگوں
کے ذہن میں اور یاد میں بہت جلد محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ بولتے وقت کسی جملے کو یا لفظ کو بار بار دہراتے ہیں۔ یا
انکی عادت ایک آنکھ بند کر کے گفتگو کرنے کی ہوتی ہے۔ بعض لوگ جوش کے وقت موقع بے موقع تالی بجا دیتے ہیں یہ اور
ایسی ہی دوسری عادات ہمیں بہت جلدی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ جیسے فسانۂ آزاد میں خوجی ہے کہ ہر وقت "ہائے
نہ ہوئی قرولی" کی رٹ لگائے رکھتا ہے یا افیون کی پینک میں غٹ رہتا ہے۔ یا آزاد کی یہ عادت کہ وہ ہر گھڑی اک
تازہ حسین کو مقصودِ نظر رکھتا ہے لیکن آزاد ایک ایسا کردار ہے کہ اس کی ظاہری خصوصیات اسے کسی فسانے کے ہیرو
سے ممتاز نہیں کرتیں۔ اس لئے آزاد میں ہم ایسی کوئی خصوصیت نہیں پاتے جس کی وجہ سے وہ ہماری یاد میں عرصہ تک قائم رہے

انگریزی میں چارلس ڈکنز ایسا ناولسٹ ہے جسکے افراد کسی نہ کسی خاصیت کی بدولت توجہ حاصل کر لیتے ہیں اور
ہمیں بھولتے نہیں۔ مثلاً اسکا ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ لے لیجئے اس میں مسٹر مکابر اپنی طبیعت سے مجبور ہر وقت مستقبل پر
بھروسہ رکھتے ہیں اور عرصۂ زندگی میں سے اس لاابالیانہ انداز سے گذر جاتے ہیں کہ ان کا چہیتا فقرہ "کچھ نہ کچھ ضرور بن
جائے گا" بھی گراں نہیں گذرتا حالانکہ ہم اس فقرہ کو جا و بے جا سنتے رہتے ہیں۔ اور اگرچہ ہم دیکھتے ہی کہ مسٹر مکابر کے پاس اگر
دونی ہوتی ہے تو شام کے کھانے سے مستغنی ہو کر اسے فوراً ملائی یا کباب خرید کر خرچ کر دیتے ہیں اور جب کوئی مصیبت آن
پڑتی ہے یا کوئی قرض خواہ دروازے کھٹکھٹاتا ہے یا مقدمہ کر کے ڈگری حاصل کر لیتا ہے تو آپ بے فکر ہو کر کسی دوست سے
چونّی ادھار لیکر سگرٹ وغیرہ اڑا لیتے ہیں اور کہتے ہیں تو یہ کہ "بس امید ہے" کچھ نہ کچھ ضرور بن جائیگا"۔ تاہم ان کی کیفیت پڑھ
کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ مصنف نے اس کردار کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی فقط اسکی شخصیت کا ایک
رُخ ہی ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے پھر بھی زندگی سے اس آدمی کو نسبت ضرور ہے۔ ایسے ہی دوسرے افراد بھی کسی ذاتی
عادت یا خاصیت کی بدولت جسے مصنف نے بڑھا کر بیان کیا ہو ہمیں زندہ ہونے کا دھوکا ضرور دے دیتے ہیں یہ کردار
"چپٹے" ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ "چپٹی" قسم کی بہترین مثالیں ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مگر فسانۂ آزاد میں سپہر آرا جو ہمایوں فر
کے عشق کی بدولت جاندار معلوم ہوتی ہے) اور ثریا بیگم جو اپنے چنچل پن اور شوخی سے ضرور ایک جھلک ایسی
دے جاتی ہے جس سے اسکے حقیقت سے نزدیک ہونے کا گمان ہوتا ہے باقی بہت سے ایسے افراد ہیں جو فقط ایک

ایک دو دو سانس لے کربت بن جاتے ہیں جنہیں مصنف جہاں چاہتا ہے پھینک دیتا ہے۔

"گول" کردار سے مراد وہ شخصیت ہے جسکے ہر پہلو کو مصنف نے سچ کر دکھانے کی کوشش کی ہو گویا مسیحائی لمس سے زندہ کر دکھایا ہو۔ ایسے کردار فقط کتاب اور اس کہانی کے لئے ہی زندہ نہیں ہوتے بلکہ یوں بھی ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری ہی زمین کے باشندے ہیں اور ان کا ذکر اگرچہ ناول میں ہے لیکن وہ ضرور کہیں نہ کہیں رہتے ہونگے اگر ہم چاہیں یا وہ چاہیں تو ہم سے مل سکتے ہیں۔ کتاب سے اس زمین پر اتر کر اُن میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ البتہ ان کی شخصیت جیسی کہ ہم نے ناول میں دیکھی ہے ہم سے چند باتوں کے سوا خاص طور پر ممتاز ہوگی۔ سرشار میں ہم اتنی قدرت نہیں دیکھتے اسنے ہمیں اودھ کی سوشل یا اجتماعی زندگی کی ایک وسیع تصویر دے دی ہے لیکن اس نے خاص خاص افراد پر غور کر کے، انہیں "زندہ" کر کے، انکے خیالات، عادات اطوار، انداز، مفصل اور بے تکلف طور پر واضح کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سرشار تخیل[1] میں کسی سے کم نہیں واقعات کے تنوع اور انکی افراط کو دیکھکر سرشار کے اس کمال میں شک نہیں رہتا جہاں کہیں کوئی موقع ایسا آ نکلتا ہے جسمیں وہ قوت بیان کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ مثلاً کسی برات کا بیان یا محرم یا میلے وغیرہ کا ذکر، تو اس کا قلم اڑا چلا جاتا ہے جہاں موقع ملے سرشار کسی فرد قصہ کے متعلق ایک نیا قصہ گھڑ لیتا ہے پھر ایک نیا افسانہ در افسانہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان ضمنی افسانوں میں سے بعض سے تنگ آ کر وہ انہیں ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ مگر ان افسانوں کی کثرت ہی اسکی قوتِ تخلیق کی شاہد ہے۔ دو ایک فسانے جو نامکمل رہ گئے ہیں ان میں وہ ٹھاکر صاحب کا قصہ مہاجن وغیرہ کے معاملے اور ان نواب صاحب کا قصہ قابلِ ذکر ہیں جن کے ہاں ایک بٹیر کے مرجانے پر صف ماتم بچھ جاتی ہے اور بٹیر کی الوہیت پر تقریریں ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی کئی فسانے بے ترتیبی سے جابجا بکھرے ہوئے ہیں مگر ان سے سرشار کی فوق العادت تخیل کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے بلاشبہ وہ اپنی ان تھک طاقتوں کے ناقابل مدافعت تصرف سے مجبور ہو کر نئے فسانے نئے حوادث نئے واقعات تراشنے میں اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مگر بعض جگہ وہ حد سے تجاوز کر جانے کے باعث لغزش کر جاتا ہے۔ جیسے ہمایوں فر کے زندہ ہو جانے والے واقعہ سے پتا چلتا ہے۔ خواہ اسکی ظرافت ہو یا اسکا طنز یہ نقطۂ نگاہ، کوئی چیز ایسی نہیں جو یہاں اسکی مدد کرے۔

سرشار کی قوتِ تحریر کے متعلق پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کسی چیز کی تصویر کھینچ کے رکھ دینا اسکے معمولی کمالات میں سے ہے۔ مگر جہاں کہیں برات کی دھوم دھام ہو تو وہ فقط بیان ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ساتھ ساتھ براتیوں کی گفتگو باجے والوں کی چشمکیں، تماشائیوں کی پھبتیاں، غرض کہ سبھی کچھ اس انداز اور اس خوبی سے بیان میں جڑتا چلا جاتا ہے کہ اس کا بیان پڑھ لینا کسی چیز کو آنکھ سے دیکھ لینے سے بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک عام آدمی خود سب کچھ ایک نظر میں نہیں

1. Imagination

دیکھ سکتا اور آرٹسٹ کی نظر ہر چیز کو قاعدہ اور تناسب کے ساتھ تصویر میں رکھ دیتی ہے۔ سرشار کی زبان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کسی نصاب کو اٹھائے دیکھ لیا جائے، کوئی مؤلف ہو، دو ایک چیزیں سرشار کی ضرور شامل نظر آئیں گی محاورے کی صفائی اور روزمرہ کی تاذ ن کا یہ عالم ہے کہ زبان ہی کے زور سے وہ بعض دفعہ اپنے کردار "زندہ" کر دکھاتا ہے مگر ایک نقص سرشار میں ضرور ہے اور وہ معمولی نقص نہیں۔ وہ یہ کہ خواہ گفتگو ہو رہی ہو۔ خواہ بیان راوی لکھتا ہے" کو وہ نہیں چھوڑتا۔ اس سے پڑھنے والے کو ایک صدمہ سا ہوتا ہے۔ اور کہانی یا گفتگو کا لطف اور اثر زائل ہونے لگتا ہے۔ بلکہ ایک لمحے کے لئے مصنف کی حقیقت نگاری میں شک ہونے لگتا ہے بلکہ افسانے کی زندگی سے جو مشابہت تھی زائل ہونے لگتی ہے۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مصنف تو محض ایک فسانہ لکھ رہا ہے جس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں پڑھتے وقت اس قسم کا احساس پیدا ہو جانا فسانہ کی روح کو تقریباً تلف کر دیتا ہے۔ حالانکہ یوں بھی تقریباً ہر شخص افسانوں کو فرضی سمجھتا ہے۔

پھر بھی اس کی جادوگری کا یہ عالم ہے کہ فسانۂ آزاد کو پڑھ کر اگرچہ ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ یہ اصلی زندگی کی تصویر ہے مگر دل پر یہ خیال ضرور مسلط ہو جاتا ہے کہ سرشار کی دنیا میں ان افراد کی ہستی موجود ہے۔ اور یوں سرشار ایک ماحول ضرور پیدا کر دیتا ہے جس کے اندر اگرچہ اسکے کردار کٹھ پتلیوں کی طرح حرکت کرتے ہیں لیکن ہمیں بہت دیر تک یہ دھوکا ضرور رہتا ہے کہ یہ اصلی آدمی ہیں، یہ دھوکا پیدا کرنا بھی ایک آرٹسٹ کا کام ہے۔

انیسویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر اور نقاد میتھیو آرنلڈ کا قول ہے کہ شاعری تنقید حیات کا نام ہے یعنی یہ ہے کہ شاعر اپنے تجربۂ حیات سے متاثر ہو کر ایسے جذبات اظہار کے لئے چنتا ہے ایسے لمحات کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے خیال اور تجربے کے صحیح اور کامل اظہار میں مدد دیتے ہیں یہ اظہار اسکے مطالعۂ زندگی اور جذباتی سرمایۂ حیات سے ایسا متاثر ہوتا ہے، اس کے فلسفۂ زندگی سے یا اس کے تجربہ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ایسا رنگ جاتا ہے کہ اسکے اشعار کو اسکی تنقید حیات ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات شعر کے متعلق صحیح ہونے کے علاوہ ناول کے متعلق بھی بہت درست ہے اور یہ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ہم آرنلڈ بینٹ کے دوسرے معیار پر پہنچ جاتے ہیں+

شاید ہی کوئی ناولسٹ ایسا ہو گا جو کسی شئے سے متاثر ہو کر یا کسی چیز سے متنفر یا دل برداشتہ ہو کر اپنی ناپسند کا اظہار فسانے کے ذریعہ سے نہ کرتا ہو۔ دنیا میں سینکڑوں چیزیں ایسی ہیں جو ہمیں پسند نہیں، جن سے ہمیں روحانی پہنچتی ہے۔ ایک سادہ مثال لے لو۔ ایک جوان لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور انکے اقربا یا انکی سوسائٹی یا ان کے مذاہب یا رواجات انکے راستے میں حائل ہو کر انکی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر طرح طرح سوسائٹی میں

Illusion

حساس آدمی ایسے نکل آئیں کے جوان کی حالت سے متاثر ہوکر ان دونوں کی زندگی کا اپنے ناولوں میں اپنے ڈراموں میں نقشہ کھینچینگے اور انکے طرز بیان میں انکے اپنے جذبات اس طرح ملے ہوئے ہونگے کہ فسانے کا رنگ مصنف کے نقطۂ نگاہ اور فلسفۂ حیات سے متاثر ہوکر رہیگا فسانہ نگار خواہ قنوطی ہو خواہ رجائی، بہرحال اس کا بیان اسکے ذہنی رنگ میں ڈوبا ہؤا نظر آئے گا یہی اسکی تنقید حیات ہوگی۔ بلکہ ایسے واقعات کا انتخاب ہی اسکی تنقید سے مملو ہوگا +

مگر مصنف کا کمال اس بات میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقید کو اسی طرح اپنی کہانی اور اپنے بیان میں جذب کر دے کہ بظاہر کہانی میں کوئی اجنبیت یعنی مصنف کے اپنے الفاظ سے یہ تنقید حیات ظاہر نہ ہو مثلاً "وہ راوی کہتا ہے" کے ضمن ہی میں اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرتا پھرے۔ مصنف کی اپنی رائے، اور اسکا اظہار کہانی کی ساخت میں، افراد کے انتخاب میں، ان کے تعلقات اور میل ملاپ اور بول چال میں مضمر ہو۔ اگر مصنف کوئی پیغام اپنے افارئین تک پہنچانا چاہے یا اس کا کہانی کے لکھنے سے کوئی خاص مدعا ہو تو اس کا علانیہ، بغیر صحیح فن کاری کے اظہار کر دینا بہت معیوب ہے۔ مصنف کا فرض ہے کہ اپنے خیالات کو، اپنے جذبات کو کہانی میں اسطرح پر دکور کو دے کہ کہانی میں بھی نقص پیدا نہ ہو اور اسکا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ اگرچہ یہ باتیں سرشار کے سلسلہ میں بظاہر کچھ بے تعلق سی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بغور دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیادہ بے تعلق بھی نہیں کیونکہ سرشار اچھا خاصا نقاد حیات ہے۔ مگر اس کی تنقید نہایت دقیق اور خاموش ہے جب وہ اپنے فسانے میں ایک ہفتاد سالہ بوڑھے کی ایک کم سن لڑکی سے شادی کا ذکر، نوابوں کے ڈیرے کا بیان، اور گاؤں کے ساہوکار، منشی اور پٹواری اور ملا اور ایسے ہی دوسرے افراد لے آتا ہے تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف ہے اور خاص طور پر زندگی کے رکیک، سوقیانہ، مسرفانہ، قبیح اور شر انگیز پہلوؤں سے کافی واقفیت رکھتا ہے اور ان کا اظہار اس انداز سے کرتا ہے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہو کہ زندگی کے ان طریقوں سے پڑھنے والے کے دل کو الجھن، بے چینی اور پھر نفرت پیدا ہو جاتی ہے اس سلسلے میں وہ کہانی کو چھوڑ کر نوابی ٹھاٹھ اور بے مقصد زندگی کے خلاف کوئی تقریر نہیں کرنے لگتا کہ "اے، جاہل ہندوستان اور اے تباہ ہو جانے والے ملک اور اے بدقسمت لوگو کس قعر مذلت میں گرے ہوئے ہو" وغیرہ وغیرہ۔ اور نہ کوئی بسیط مضمون ہی کہیں بے ربطی سے جوڑ دیتا ہے۔ اور نہ اسکے افراد ایک دوسرے سے اس ذلیل طریق زندگی کے متعلق گفتگو ہی کرتے ہیں۔ بلکہ وہ فقط ان لوگوں کی زندگی کا ایک ایسا مبالغہ آمیز نقشہ کھینچتا ہے کہ ہم خود ہی جان لیتے ہیں کہ یہ زندگی لاحاصل، ذلیل اور بے معنی ہے مصنف اپنی رائے کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً کرتا رہتا ہے۔ مگر اس دبی زبان سے، اس پوشیدہ طریقہ سے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف کا مدعا اس زندگی کا خاکا اڑانا ہے۔ پڑھتے وقت تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرشار کو اس سے بہت لگاؤ ہے اور اس صداقت اور جوش سے وہ اس زندگی کی تصویر کھینچ رہا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ تمام تر اس کے محاسن کی طرف مبذول ہو جاتی ہے +

آخر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سرشار اپنے تخلیق کردہ افرادِ قصہ سے کیونکر برتتا ہے۔ بعض مصنف اپنے افراد سے نہایت نرمی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آتے ہیں بعض تو اپنی مخلوق کے عاشق ہوتے ہیں جیسے فرانس میں بالزک اور انگلستان میں فیلڈنگ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے روس میں ڈاسٹووسکی وغیرہ۔ ہندوستان کے ناولسٹ ابھی اس صنعت یعنی کردار کی تخلیق میں ایسے ماہر نہیں کہ کسی خاص ناولسٹ کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ نذیر احمد کے بعض افراد البتہ جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں مگر جہاں تک اس کی بساط میں ہے وہ اپنے افراد سے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ برتاؤ روا رکھتا ہے خواہ وہ کلیم کی طرح بانکا اور آوارہ ہو خواہ مرزا ظاہر دار بیگ کی طرح ریاکار اور جھوٹا ہو۔ شرر کے افراد تمام تر خاص خاص تاریخی اوقات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس لئے سب کے سب شہزادے اور ہم شکل اور ہم وضع اور ہم خصلت ہوتے ہیں۔ ان سب کی طرف شرر کی توجہ اتنی ہی ہوتی ہے جتنی توجہ ان کو کہانی میں استعمال کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے بھی کہ شرر عموماً کہانی کی ترکیب اور تعمیری دلچسپی کے پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور دلچسپی پیدا کرنے کو "کردار" پیدا کرنے پر ترجیح دیتا ہے۔

مگر چند مصنف ایسے بھی ہیں جن کے افراد ان کے تنفر سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ ایسے فسانہ نگار اپنے افراد سے ہمیشہ حقارت اور نفرت سے پیش آتے ہیں۔ آج کل ایک انگریز ناولسٹ آلڈس ہکسلے ہے جو اپنی فسانوی مخلوق سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ پچھلی صدی میں چارلس ڈکنز ایک ایسا مصنف تھا جو چند افرادِ قصہ سے ضرور مخالفت سے پیش آتا تھا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ افراد بالعموم کسی سماجی قباحت کے اظہار کے لئے تخلیق کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک ناول نکولس نکل بی میں وہ پرائیویٹ اسکولوں کے ظالم ہیڈ ماسٹروں کی گت بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس ناول میں ایک ماسٹر تخلیق کرتا ہے جس کا نام ماسٹر سوکیرز ہے۔ ایسے بے رحم ماسٹروں کی بیخ کنی ہو بھی اسی طرح سکتی تھی مگر سرشار ڈکنز سے زیادہ متین اور فراخ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ اپنی نفرت کو اپنی طبیعت پر مسلط نہیں ہونے دیتا تھا۔ نیز اسے صرف کہانی کہنے ہی میں وہ لطف آتا تھا کہ سو کی بہتری، خرابیوں کے استیصال، خوبیوں کے پرچار وغیرہ کو وہ کہانی پر کبھی ترجیح نہیں دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرشار فسانۂ آزاد کے تین ہزار صفحات میں نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے مسکراتا نظر آتا ہے۔

"اردو ناول" میں سرشار کی پوزیشن کے متعلق ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس باب میں نہ ابھی زیادہ لکھا ہی گیا ہے اور نہ کوئی تنقیدی کام ہی ہوا ہے۔ مگر چونکہ ہر ادبی تخلیق کی آخری منصف پبلک ہے اور سرشار اب بھی اتنا ہی مقبول جتنا ۱۸۸۰ء میں تھا اور جہاں کہیں اردو پڑھی جاتی ہے سرشار کی شہرت اور مقبولیت بھی عام ہے اور پھر فسانۂ آزاد کی گوناگوں خوبیوں سے کوئی ہوشمند شخص انکار نہیں کر سکتا اس لئے ہم بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کے "بقائے دوام کے دربار" میں سرشار کو ضرور ایک اعلیٰ مقام مل چکا ہوگا۔

فیاض محمود

سلمیٰ کے کھلونے

سوتے سوتے جو رات آنکھ کھلی
شعر کہنے کو بیقرار تھا جی
لمپ کی روشنی کو تیز کیا
اور اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا
ہر طرف چھا رہی تھی خاموشی
تھی تو آواز گرم سانسوں کی
اک طرف سو رہی تھی وہ دمساز
جس کے دم سے ہے زندگی میں گداز
رہبرِ راہِ صدق و مہر و وفا
باعثِ خیر و برکتِ دنیا
اور اک سو رہی ہے اک کھٹولے پر
ماں کی آنکھوں کا نور، جانِ پدر
اک ننھی سی جان، ہاتھ جلائے
ٹھنڈ سی پڑ گیا تھا جس کا گلا
بے خبر رکھے ہاتھ اک سر* پر
سو رہی تھی سفید بستر پر
(سو تو آرام سے مرے پیارو!
صبح تک شام سے مرے پیارو!)

خیر لکھنے کو جب قلم ڈھونڈا
صفت کا جیسے اک الم ڈھونڈا
نہ سرہانے کتاب میں پایا
نہ وہ تکیوں کے نیچے مجھ کو ملا
سامنے میز پر نظر ڈالی
وہ بھی آئی مجھے نظر خالی
ہاں مگر ایک لانبی سی ڈبیا
کبھی صابن کی جس میں تھی ٹکیا
اس پہ میں نے دھری ہوئی پائی
اور ڈبیا بھری ہوئی پائی
سخت حیرت کہ یہ کہاں آئی
کس طرح اور کب یہاں آئی
کھولی ڈبیا تو تھی عجب حالت
کیا کہوں تم سے اس کی کیفیت
نہ تو پیسے تھے اور نہ ننھے دھیلے
مٹی کے چھوٹے چھوٹے دو ڈھیلے

واہ سلمیٰ! تمہارے کیا کہنے
کھیل یہ پیارے پیارے کیا کہنے

جلیل قدوائی

* ہاتھ جل گیا تھا

غزل

جفا کر رہے ہیں جفا کرنے والے
دُعا کر رہے ہیں دُعا کرنے والے

غضب ہے کہ نا آشنا ہیں وفا سے
وفا سے مجھے آشنا کرنے والے

نگاہوں کے تیروں سے مارا ہی تو نے
نگاہوں سے میری حیا کرنے والے

یہ ٹوٹا ہوا دل مجھے کیا دیا ہے؟
عطا کر کوئی شے عطا کرنے والے

غمِ بے نوائی سے واقف نہیں ہیں
غمِ یار پر اکتفا کرنے والے

کہوں کیا دوا کرنے والوں سے عابدؔ
کئے جائیں کوشش دوا کرنے والے

عابد علی عابدؔ

شہرۂ آفاق ادیب ڈاکٹر جانسن

سے

میری پہلی ملاقات

۱۷۶۳ء میرے لئے ایک قابل یادگار سال ہے، کیونکہ اس سال مجھے ایک نہایت اہم ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی ملاقات کی کیفیت میں اب ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ میں بیس سال کی عمر ہی سے امام علم جانسن کی علمی تصانیف کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ میں اُس کی علمی سرگرمیوں سے بے حد لُطف اندوز ہوتا تھا اور ہمیشہ میری جانب سے دلی عقیدت و احترام کے پھول اس مصنف پر برستے رہتے تھے۔ اُس کی بے بہا تصانیف کو پڑھ کر اس کی ملاقات کا جذبہ میرے دل میں موجزن ہوا اور آخر مجھے مستقل طور پر یہ فکر لاحق ہوگئی کہ کسی طرح اس باکمال شخص سے شرف نیاز حاصل کروں۔ چنانچہ بہت جلد ایک موقع میرے ہاتھ آگیا۔

ایک کام کے سلسلہ میں مجھے ایڈنبرا جانا پڑا اور وہاں اپنے عزیز دوست ٹامس شیریڈن سے ملاقات ہوگئی جو زبان انگریزی کے بہت اچھے مقرر تھے۔ مجھ کو اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب میں اُن کے ساتھ تھا وہ ایک عام مجمع کے روبرو اپنی تقریر کے دوران میں ڈاکٹر جانسن کے علمی کارناموں، اُس کی فراست اور غیر معمولی ذہانت کی تعریف میں رطبُ اللسان ہو گئے تھے اور میں اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

تقریر کے بعد میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا ڈاکٹر جانسن سے آپ کی مُلاقات ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں مجھے یہ شرف حاصل ہے۔ تب میں نے اپنے جذبۂ خوشی کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ڈاکٹر جانسن سے میرا تعارف کرا دیں؟

انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں یہ ممکن ہے کیونکہ جانسن ٹامس ڈیوس کے ہاں اکثر رہا کرتے ہیں۔ ڈیوس میرے مُلاقاتی ہیں۔ میں اُن سے آپ کا تعارف کرا دوں گا۔ وہ یقیناً آپ کی مطلب براری کریں گے"۔ اندھا کیا چاہتا ہے دو آنکھیں۔ میں فوراً ڈیوس سے ملنے کے لئے راضی ہوگیا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن میرا اور ڈیوس کا تعارف ہوگیا۔ اب میں شیریڈن کو چھوڑ ڈیوس کے ساتھ ہوگیا۔

مسٹر ٹامس ڈیوس بہت ہی با اخلاق آدمی تھے۔ وہ ایک معمولی مصنف اور تاجر کتب تھے۔ ان کی دکان رسل اسٹریٹ میں واقع تھی۔ انہوں نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے کہا کہ جانسن سے میری گہری واقفیت ہے اور وہ مہینے میں کئی مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے آتا ہے۔ میں نے موقع کو پہچانتے ہوئے ڈیوس پر واضح کر دیا کہ جانسن کی مُلاقات کے لئے میں کس قدر بیقرار ہوں۔

ایک دن صبح میں اور ڈیوس چائے پینے کے بعد اخبار بینی میں مصروف تھے کہ ڈیوس عقب کی کھڑکی کے شیشوں میں سے کسی کو دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھا "دیکھئے وہ آتا ہے"۔ بالکل اسی طرح جیسے شکسپیر کے مشہور ڈرامے ہیملٹ میں ہوریشیو ہیملٹ کے باپ کے بھوت کو دیکھ کر ہیملٹ کو بایں الفاظ مخاطب کرتا ہے کہ "آقا! دیکھئے وہ آتا ہے"! میں نے ڈیوس کی اس بے موقع پکار پر ایک متعجبانہ نظر کھڑکی کے شیشوں پر ڈالی لیکن مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہ دکھائی دیا کہ ایک شخص تیز تیز قدم اٹھائے دکان کی جانب چلا آرہا ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں پڑ گیا۔ کیونکہ میں نے ڈاکٹر جانسن کی جو خیالی تصویر بنائی تھی۔ آنے والا شخص بالکل اُس کے مُشابہ تھا۔ ڈیوس نے کہا بیٹھ جائیے اب آپ کی تمنا پوری ہوگئی! میں نے اپنی جگہ سنبھالی اتنے میں ڈاکٹر جانسن کمرے میں داخل ہوا اور ہم تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اُس کو تصویرِ حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کی عظیم الشان شخصیت سے پوری طرح مرعوب ہو گیا!!

تھوڑی دیر بعد ڈیوس نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ مشہور ادیب مسٹر جیمس بوسول ہیں اور اسکاٹ . . . ل . . .

ڈیوس یہیں تک کہنے پایا تھا کہ میں نے اُس کو آنکھ سے اشارا کیا کہ خبردار یہ نہ کہنا کہ میں اسکاٹ لینڈ سے آرہا ہوں کیونکہ اُس زمانے میں جانسن اسکاٹ لینڈ کے باشندوں سے برافروختہ رہتا تھا) لیکن ڈیوس نے میرے اشارے کی پروا نہ کی اور کہہ دیا کہ آپ اسکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں اور وہیں سے آرہے ہیں"۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر جانسن! یہ حقیقت ہے کہ میں اسکاٹ لینڈ کا باشندہ ہوں کیونکہ قدرت نے مجھے وہیں پیدا کیا اس لئے میں مجبور ہوں لیکن اس دنیا کے کسی انسان کی میں اتنی قدر نہیں کرتا جتنی کہ آپ کی قدر کرتا ہوں۔ اس بات پر جانسن مسکرا پڑا اور ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ میں آپ کو اُس مسرت کا اندازہ نہیں کرا سکتا جو مجھے اُس گرانقدر ادیب کے ملنے سے ہوئی!!

یہ وہ زمانہ تھا کہ جانسن کی تصانیف پر تنقیدوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی لیکن تعجب اس امر پر تھا کہ جانسن سے ادیب نے ابھی تک ایک تنقید کا بھی جواب نہ لکھا تھا۔ کچھ دیر مختلف عنوانوں پر بحث رہی۔ اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ مسٹر جانسن جب آپ کی تصانیف پر اس قدر تنقیدیں ہو رہی ہیں تو آپ ان کے جوابات لکھ کر اُن کے قلم کو کیوں نہیں توڑ دیتے؟ آپ کی اس خاموشی پر ملک بھر میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ جانسن نے میرے اس بے موقع سوال پر مسکرا کر جواب دیا کہ "دوست! ابھی تک جتنی تنقیدیں مجھ پر ہوئیں وہ ایسے اشخاص کی جانب سے ہوئی ہیں جنہیں دنیائے علم میں شمہ برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ تنقید سے اُن کا مطلب صرف خود کو مشہور کرنا ہے۔ اگر آج میں کسی تنقید کا جواب لکھوں تو بے وقوف نقاد پھول جائیں گے کہ ڈاکٹر جانسن نے ان کا جواب لکھا یہی میری خاموشی کی وجہ ہے"۔ میں اس معقول جواب کو سن کر اور اس کی فراست کو دیکھ کر پھڑک گیا کہ وہ کس قدر حقیقت شناس ہے۔ اس کے بعد جانسن نے مجھے اور ڈیوس کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور چلا گیا۔ بس اسی دن سے میری اور جانسن کی دوستی کی ابتدا ہوئی اور یہی ملاقات تھی جو میری علمی ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

جیمس باسول

(ترجمہ) کاش ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہو کہ ایک معمولی ادیب اپنے سے بلند پایہ ادیب کی اسی طرح قدر و منزلت کرے جیسی کہ مذکورۂ بالا واقعہ سے نمایاں ہے۔ اور یہ فی الحقیقت ترقیِ علم و ادب کا موجب ہے لیکن یہاں تو آپس ہی میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش ہوتی رہتی ہے ترقی ہو تو کیسے!

مشرالدین حیدرآبادی

ارمغانِ فرنگ

ملکۂ خواب!

اے حسینہ! اگر تو عالمِ خواب میں ہے،
تو جاگ اور دروازہ کھول!
پو پھٹ چکی ہے، آ، اب ہم چل دیں!!
سبزہ زار، کہسار، اور ٹھنڈے پانی والے چشمے ہمارے منتظر ہیں!!!

اے ملکۂ خواب! اپنے جوتوں کو ڈھونڈنے میں وقت مت گنوا،
آ، برہنہ پاؤں ہی چل دے!!
ہمیں شبنم سے لتھڑی ہوئی گھاس پر سے گزرنا ہوگا!
اور دلدلے اور گہرے پانی کو عبور کرنا پڑے گا!

(پرتگالی)

سائے!!

نسیمِ صبح گاہی سرو کے درختوں کو، جھکولے دے رہی ہے
اور سبزہ زار پر شاخوں کے سائے گر کر تبدیل ہو رہے ہیں!!
اے محبت! تو بھی اس طرح اپنے لباس تبدیل کر!
مگر آہ، دیکھ، ہمیشہ کے لئے گم مت ہونا!!

اسی طرح، وقت کے ہمراہ میرے دل میں بھی انقلاب آئے،
تیری شکل کے سائے میرے دل کی دنیا کو پلٹ دیں!
مگر، آہ، اے محبت، تو دل سے ہمیشہ کے لئے جدا مت ہونا!!

(انگریزی)

خاموش محبّت!!

جو محبّت کا جویا ہے، اُسے ہمیشہ محبّت کی تلاش میں رہنے دو،
لیکن اُسے اِس سنہرے راز سے آگاہ کر دو،
کہ محبت کی سلطنت میں فقط، خاموشی، حکومت کرتی ہے!!
اور اگر وہ اس سنہرے راز سے غفلت برتے گا!
تو پھر اُس کے دل کی سلطنت میں غم کی خلش حکومت کرے گی!!!

(جرمن)

سنہرے پُل!!

میرے دل کے نغمے ہی وہ سنہرے پل ہوں گے!
جنہیں میری محبت عبور کر کے!!
اے میری محبوبہ! تیرے پاس پہنچے گی!!

خوشی کا وقت ہو یا غم کا موقع!
خواب کے دیوتا کے پر، ہر رات!!
مجھے تیرے محبوب دل کے پاس اڑا لے جائیں گے!!!

(جرمن)

ماہِ گم شدہ ماہِ نو کی آغوش میں

حسین و نازنین ماہِ نو نیلے رنگ کی زرق برق پوشاکوں میں ملبوس ہو کر زہرہ کے آستانۂ ناز پر پہنچا، اور سیمیں نوا کر التجا کی، "اے حُسن کی شہزادی! اے ملکۂ روشنی!! تیرے محبت آفریں سینہ میں محبت ہمیشہ موجزن رہی ہے، ——— تیرا نازک دل محبت کے خونیں تیروں کا ہمیشہ مسکن بنا رہا ہے، ——— تیرا زخم خوردہ دل محبت کی گہری ٹیسوں، کرب ناک تلخیوں سے خوب آشنا ہے، ——— آہ اس لئے میری اک التجا سُن! ——— میرے پُرانے محبوب گم شدہ چاند کو ایک بار، ہاں، فقط ایک بار پھر مجھ سے ہم آغوش کر!! ———
دُھند کی سنہری لکیروں کے درمیان سے ہو کر ماہِ نو کے عکس ریز چہرہ کی زرد ار شعاعیں دوشیزۂ شب پر جھلکیں ——— اور ماہِ نو نے تمام کائنات کی موجودگی میں اپنی آغوشِ عشرت کھول کر اپنے پُرانے محبوب گم شدہ چاند کی جبینِ ناز کو چُوم لیا!!!

عظیم قریشی لدھیانوی

محفلِ ادب

محبّت کا گیت

بہت میں نے گائے محبت کے گیت	کہ یہ شاعروں کی پرانی ہے ریت
کبھی میں نے ہر ایک کے دل کی بات	ہر اک کی، بد و نیک کے دل کی بات
نئی سے نئی میں سناتا رہا
مگر راز تیرا چھپاتا رہا

ستاروں کے نغمے ہواؤں کا زور	گلوں کی مہک آبشاروں کا شور
خمارِ خزان و سرودِ بہار	ہیں نظمیں مری سب کی آئینہ دار
زمانے کا ہر راز مذکور ہے
مگر نام تک تیرا مستور ہے

ترا راز گو میں بتاتا نہیں	زباں پر ترا نام لاتا نہیں
مگر کیا نہاں ہے مرا رازِ عشق؛	ابھی تک ہے، کیا، بے صدا سازِ عشق؟
میں گاتا ہوں جب سوزِ الفت کے راگ	لگاتا ہوں اوروں کے سینے میں آگ
سمجھتے ہیں کیا مجھ کو سب دیدہ ور	غمِ قیس و فرہاد میں نوحہ گر؟
نہیں جانتے کیا کہ لیلیٰ ہے تو؟
مرا منتہائے تمنّا ہے تو؟

(اکاروان)

پروازِ شاعر

ہم نوا کوئی نہ پایا جب زمین کے فرش پر	میرا نغمہ لے چلا مجھ کو اُڑا کر عرش پر
ظلمتِ ابلیس کی راہوں سے کتراتا ہُوا	بندگی کے گیت اپنے رنگ میں گاتا ہُوا

جادۂ پامال مہر و ماہ طے کرتا ہُوا　　مہ بہ مہ، انجم بہ انجم، راہ طے کرتا ہُوا
کہکشاں تا کہکشاں بڑھتا گیا بڑھتا گیا　　آسماں تا آسماں چڑھتا گیا چڑھتا گیا
کار پردازِ قدرت ہمسفر بنتے گئے　　اپنی اپنی منزلوں تک راہبر بنتے گئے
مرحبا کہتے ہوئے ننھی سی مشتِ خاک پر　　ہو گئے رخصت ستارے بامِ ہفت افلاک پر

میں کہ تھا سرمستِ صہبائے ازل چلتا گیا
پاؤں تھک کر رہ گئے تو سر کے بل چلتا گیا

(اکارواں)

تاریخ کا گمشدہ ورق

(وصل بعد از وصال)

نومبر ۱۸۴۸ء کی آٹھویں تاریخ ہے اور امیر عبدالقادر جزائری مع اپنی بیویوں، لڑکیوں اور اعوان و انصار کے شہر امبواز کے ایک عالی شان قصر کے اندر فروکش ہوئے ہیں جسے حکومتِ فرانس نے ان کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا تھا امیر عبدالقادر جزائری وہی وطن پرست و غیور امیر تھا جس نے اپنے ملک اور اپنے آبا و اجداد کی روایاتِ شجاعت کی حمایت میں ایک زمانہ تک عساکرِ فرانسادی سے جنگ کی اور اگر دس بار خود شکست کھائی تو پانچ مرتبہ دشمن سے بھی اپنی تلوار کا لوہا منوا کر چھوڑا ——— لیکن فرانس کی زبردست حکومت اور منظم فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، آخر کار اہلِ فرانس بلادِ عربی میں ساحل سے لے کر ریگستانوں تک وسیع حصۂ زمین پر قابض ہو گئے اور ۲۸ اگست ۱۸۴۸ء کی شام کو امیر عبدالقادر اپنی تلوار دشمن کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو ہی گیا ——— ہرچند عساکرِ فرانسادی کے جنرل نے امیرِ موصوف سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو حوالہ کر دیں گے تو ان کو اجازت دے دی جائے گی کہ وہ شرقی دیارِ عرب میں جہاں چاہے چلے جائیں لیکن حکومتِ فرانس اس عہد پر قائم نہ رہی اور انہیں فرانس بھیج دیا جہاں وہ قصرِ امبواز میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھے گئے۔ یہاں یہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک رہے اور ۱۸۵۲ء میں جب انقلابی دور فرانس میں شروع ہوا تو امیر عبدالقادر دمشق چلے آئے اور یہیں وفات پائی +

ان لوگوں میں سے جنھوں نے امیر عبدالقادر کا ساتھ دیا تھا اور جو ان کے ساتھ امبواز میں نظر بند تھے ایک شخص عبدالسمیع مغربی بھی تھا اس نے جس طرح امیر کا ساتھ ان کے لیلیٰ کامیابی میں دیا تھا اسی طرح ادبار میں بھی دیا اور امیر کی رفاقت ترک کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ امیر بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کو پوری طرح احساس تھا کہ اس نے محض ان کی محبت میں اپنے وطن اور اہل و عیال سب کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ عبدالسمیع امیر سے کہا کرتا کہ "اے میرے آقا میں نے اپنے دل کے دو ٹکڑے کر لئے ہیں ایک خدا کے لئے وقف ہے اور دوسرا آپ کے لئے" ——— لیکن اُسے خبر نہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی

والا ہے جب اسے اپنے قلب کے تین حصے کرنے پڑیں گے اور ایک حصہ کسی اور ہستی کے لئے وقف کرنا پڑے گا ـــــ یہ ہستی ایک نوجوان فرانسیسی لڑکی کی تھی جس کا نام الس فونتان تھا۔ یہ لڑکی ایک خادمہ کی حیثیت سے امیر کے قصر میں کام کرتی تھی اور یہیں دونوں کے درمیان پیمانِ محبت استوار ہو گیا تھا اور اُس نے بھی اپنے محبوب کے ساتھ اسیری کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

اتفاق سے ایک دن یہ لڑکی اپنے والدین واعزہ سے ملنے گھر گئی تو انہوں نے اس کو قید کر لیا اور پھر نہ جانے دیا کیونکہ ان کو اس کے تعلقِ خاطر کا حال معلوم ہو گیا تھا اور وہ کسی طرح گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ ایک غیر مذہب و غیر ملک کے انسان سے وابستگی پیدا کرے ـــــ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "ہم کو تیری موت گوارا ہے لیکن غیر کفو میں شادی کرنا کسی طرح منظور نہیں" ـــــ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی عہد کر لیا کہ وہ امیر اور عبدالسمیع دونوں سے اس کا انتقام لیں گے"۔

ہفتوں گزر گئے اور وہ لڑکی قصر تک واپس نہ آسکی عبدالسمیع کا تردد بڑھتا جا رہا تھا اور حیران تھا کہ اُس کی غیر حاضری کا سبب کیا قرار دے۔ آخر کار اُس نے دوسری لڑکیوں سے تحقیقِ حال کی اور جب اُسے معلوم ہُوا کہ اس کی محبوبہ مقید ہے اور ہر وقت ملول وحزیں رہتی ہے تو اس کی تکلیفیں اور بڑھ گئیں۔

نومبر ۱۸۱۵ء کی پانچویں تاریخ کی صبح کو جب اہلِ قصر کی آنکھ کھلی تو سنا کہ بائیں باغ کی سمت سے فریاد وزاری کی آواز آ رہی ہے۔ سب لوگ دوڑ پڑے اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے لباس میں لوٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے اس حال میں کہ اس کے سینہ اور پہلو سے خون جاری ہے۔ لوگ اس کو فوراً قصر کے اندر لے آئے اور علاج میں مصروف ہو گئے۔ یہ لڑکی زخموں کی تکلیف سے بے تاب تھی، درد سے تڑپ رہی تھی، لیکن عبدالسمیع کا نام ہر وقت اُس کی زبان پر تھا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا قصہ ہے ابھی تک عبدالسمیع کو بالکل علم نہ تھا کہ کون لڑکی کس حال میں قصر کے اندر آئی ہے۔ جب عبدالسمیع نے یہ خبر سنی تو وہ بھی محض تماشائی کی حیثیت سے اس کو دیکھنے گیا، مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس کو معلوم ہُوا کہ یہ تو اس کی محبوبہ تھی جس کے لئے وہ ہر وقت مضطرب رہا کرتا تھا اور جس کے دفعتہً غائب ہو جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی ـــــ یہ بے اختیار اُس سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح اس کا مجروح سینہ اور غم آلود چہرہ چومنے لگا ـــــ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب جوش کم ہوا تو عبدالسمیع نے بھی محسوس کیا کہ وہ مشرقی تہذیب سے ہٹا جا رہا ہے اور اس لئے اس نے آہستگی سے لڑکی کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور خاموش الگ کھڑا ہو گیا۔

جب اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ تمہاری شناسائی اس لڑکی سے کیوں کر ہوئی اور اس بے تکلفی وبے حجابی کے کیا معنی ہیں"؟ تو اُس نے کہا کہ میں امیر کے روبرو تمام واقعات بیان کروں گا اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہُوا ہے تو امیر ہی کے حضور میں سزا کو قبول کروں گا"۔

جب امیر عبدالقادر کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ دونوں سامنے لائے جائیں چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں نے اپنی داستان محبت کو شروع سے آخر تک دہرایا ــــــــ لڑکی نے گھر میں قید کر لئے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا "اے امیر آج میں نے گھر سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ خدا معلوم میرے بھائی کو کس طرح خبر ہو گئی اور اُس نے مجھے راستہ میں پکڑ کر اصرار کیا کہ پھر گھر واپس جاؤں۔ لیکن جب میں کسی طرح راضی نہ ہوئی تو اُس نے اپنا خنجر نکال کر میرے پہلو اور سینہ میں پیوست کر دیا، میں گر پڑی اور وہ مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا۔"

لڑکی نے یہ کہا اور دفعتہً اس کی گردن شانہ کی طرف ڈھلنے لگی، حتیٰ کہ چند لمحوں کے اندر وہ زمین پر گر پڑی اور اس حال میں کہ اس کی رُوح پرواز کر چکی تھی اور اس کا جسم سرد ہو گیا تھا۔

امیر عبدالقادر نے حکومت سے اس لڑکی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت حاصل کر کے اُسے قصر کے جوار میں سبز سایہ دار درختوں کے نیچے مدفون کر دیا اور دیر تک اس واقعہ سے متاثر رہا

---

۱۱ دسمبر ۱۸۵۲ء کی صبح کو امیر عبدالقادر مع اپنے ساتھیوں کے امبواز سے کوچ کی طیاریاں کر رہے ہیں۔ کیونکہ حکومت فرانس نے ان کو آزاد کر دیا اور اجازت دے دی ہے کہ جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ امیر جب اہتمام سفر سے فارغ ہو کر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگا تو معلوم ہوا کہ عبدالسمیع ان میں موجود نہیں ہے۔

امیر نے جستجو کی تو دیکھا کہ عبدالسمیع اپنے کمرے میں مُردہ پڑا ہوا ہے اور ایک تحریر اس کے سینہ پر رکھی ہوئی ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ

"اے امیر میں الیس فونتان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے جائیے تو مجھے اس کے پاس دفن کر کے جائیے۔"

چنانچہ آج بھی فرانس کے شہر امبواز میں اگر کوئی پہنچ جائے اور مسلمانوں کے قبرستان کی سیر کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک گوشہ میں چند درختوں کے نیچے ایک قبر زرد پتھر کی پائی جاتی ہے جس کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی نصب ہے یہی ہے الیس فونتان اور عبدالسمیع کی قبر جہاں وہ کبھی نہ جدا ہونے کے واسطے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے ہیں۔

(نگار)

اُردو زبان کا آغاز

اردو زبان کے آغاز کی نسبت یہ نظریہ اب روز روشن کی طرح عیاں ہوتا جاتا ہے کہ شمال مغربی سرحد سے جو

مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے وہ پہلے پہل پنجاب میں آکر ٹھہرے۔ وہاں کے باشندوں کے میل جول سے جو نئی مشترکہ ہندو مسلم زبان پیدا ہوتی رہی اسی کو لے کر وہ دوابہ میں اترے اور اُسی کو بولتے ہوئے گجرات اور دکن میں بھی داخل ہوئے۔

فتح دہلی سے قبل مسلمان پنجاب میں قریب دو سو سال تک رہے اور یہ عرصہ ایک نئی زبان کے آغاز کے لئے ناکافی نہیں ہے۔ وہاں جو زبان تیار ہوئی تھی اس میں لاہور کے ایک درباری فارسی شاعر مسعود سعد سلمان نے طبع آزمائی بھی کی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کا کلام آج ناپید ہے اور اس کے متعلق سوائے عوفی اور خسرو کے بیانات کے کوئی اور معلومات حاصل نہیں۔ اگر قدیم دکنی اور گجراتی کتابوں کی طرح مسعود کا یہ دیوانِ ہندی بھی آج دستیاب ہوجائے تو اُردو کی آغاز ہی تشکیل کی نسبت بہت کم گتھیاں باقی رہ جائیں۔

جب مسلمانوں نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کر لی تو وہ اُسی زبان کو لے کر راجدھانی میں داخل ہوئے اور دہلی اور اُس کے مشرقی علاقہ یعنی سرزمین برج میں آباد ہو گئے جو پنجاب میں بن رہی تھی اور ابھی خام حالت میں تھی۔ فاتحین کے ساتھ ہریانی یا بانگڑو (مشرقی پنجاب) علاقہ کے سیکڑوں باشندے بھی غالباً ملازمین اور بہیر و بنگاہ کی حیثیت سے چلے آئے۔ جس کی بنا پر آج اُردو زبان میں مشرقی پنجابی یا ہریانی عنصر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

(ہندوستانی)

عزلت گزینی کا فلسفہ

عزلت گزینی کا فلسفہ، ممکن ہے، موجودہ زمانے کے لوگوں کو اتنا خوش آئند معلوم نہ ہو لیکن اُس کا بھی کچھ اطلاق، ہر زمانے اور ہر شخص کے لئے ممکن ہے۔ زندگی کی کچھ پرسکون ساعتیں ہر شخص چاہتا ہے، جب دُنیا کے بکھیڑوں سے الگ ہو کر سوچ بچار، یا خدا کے دھیان، یا کسی بڑے یا اچھے کام کے خیال میں گزار سکے۔

زندگی کی کشمکش میں، ایسی گھڑیاں مشکل سے ہاتھ آتی ہیں۔ لیکن جب ہاتھ آجاتی ہیں تو اُس کشمکش کی زندگی میں عجب لطف دیتی ہیں۔

اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گوشہ نشینی کا فلسفہ، زندگی میں بالکل بیکار ہے۔ البتہ وہ صحیح استعمال چاہتا ہے جس میں افراط و تفریط شامل نہ ہوں۔

(ہندوستانی)

مطبُوعات

ہسٹری آف اُردو لٹریچر (A History of Urdu Literature) یہ ڈاکٹر ٹامس گریم بیلی ایم اے بی۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ پروفیسر السنۂ مشرقیہ لنڈن یونیورسٹی کی انگریزی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اگرچہ صرف سوا سو صفحات پرمشتمل ہے لیکن اس قدر جامع ہے کہ اس سے قبل اس نوع کی کوئی ایسی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری راقم الحروف کو ڈاکٹر بیلی کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ مشرقی زبانوں سے ان کی واقفیت اور دلچسپی حیرت انگیز ہے + علاوہ علمی و ادبی زبانوں کے وہ ہندوستان کی مقامی بولیوں سے بھی واقف ہیں۔ پنجابی کے متعلق خود مجھے تجربہ ہے کہ اس زبان سے اُن کی واقفیت اکثر پنجابیوں سے بھی بہ مدارج ارفع ہے۔ اگر وہ پسِ پردہ اس زبان میں گفتگو کر رہے ہوں تو ان کے یورپین ہونے کا وہم و گمان تک نہیں ہو سکتا یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پنجابی جاٹ بول رہا ہے +

موجودہ کتاب ڈاکٹر بیلی کی حیرت انگیز ذہانت کا ایک اور ثبوت ہے۔ اردو شاعری کے متعلق یقیناً اس پائے کی صحیح اور جچی تلی تنقید خود کسی ہندوستانی مصنف نے نہیں کی۔ کاش یہ کتاب زیادہ مفصل ہوتی۔ مگر اب بھی یہ اُردو کے نشوونما و ارتقا کے ابتدائی عہد سے لے کر موجودہ زمانے تک کی تحریکات کے ذکر سے خالی نہیں۔ اور اسی لحاظ سے ہم نے اسے جامع کہا ہے۔ تنقید ادب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو اس کتاب کا ایک ایک نسخہ ضرور اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ کتاب اگر مجلد ہوتی تو بہتر ہوتا۔ قیمت عمر ہے۔ ایسوسی ایشن پریس نمبر ۵ رسل سٹریٹ کلکتہ سے مل سکتی ہے۔

کارواں۔ یہ ایک لحاظ سے اردو میں اپنی نوع کا پہلا ادبی صحیفہ ہے۔ یوں تو بعض ماہوار رسائل بھی اپنے سالنامے شائع کرتے ہیں لیکن "کارواں" صرف "سالنامہ" ہے۔ اس کی اشاعت پروفیسر محمد دین تاثیر ایم اے کے زیرِ ادارت سال بہ سال ہُوا کرے گی۔ یہ رسالہ ظاہری و باطنی محاسن کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ اور اردو زبان کے ہر بہی خواہ کو اپنی زبان میں ایسی مطبوعات دیکھ کر قدرتاً مسرت ہوتی ہے۔ بیشتر مضامین نظم و نثر عمدہ ہیں۔ اس کے علاوہ سرورق اور اکثر تصاویر قابلِ ستائش ہیں۔ قیمت فی پرچہ عہ علاوہ محصول۔ دفتر "کارواں" لاہور سے منگوائیے۔

زہرِ عشق ۔ جناب مجنوں گورکھپوری نے مرزا شوق کی مثنوی نہایت حسن اہتمام سے مرتب کی ہے۔ یہ مثنوی بلاشبہ اردو زبان کی بہترین مثنویوں میں سے ہے اور اگرچہ ایک عرصے تک "اہلِ اخلاق" کے نزدیک بدنام رہی ہے۔ لیکن آخر اس کے عیرفانی محاسن ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے۔ جنابِ مجنوں شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب ایسی اچھی صورت میں پیش کی۔ کتاب کے شروع میں جنابِ مجنوں کے علاوہ جنابِ عبدالماجد دریابادی جناب احسن لکھنوی نبیرۂ مرزا مرحوم اور جناب نیاز فتح پوری کے تنقیدی مضامین ہیں جن سے مثنوی کے متعلق قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دیباچوں سمیت کتاب کا حجم ایک سو ساٹھ صفحات ہے۔ کتاب نفیس کاغذ پر عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور مجلد فروخت ہوتی ہے۔ جلد بھی خوبصورت ہے جس پر سنہرے حروف میں مثنوی کا نام لکھا ہے۔ تین رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت درج نہیں ایوانِ اشاعت گورکھپور سے مل سکتی ہے

جدید اردو شاعری ۔ یہ کتاب عبدالقادر صاحب سروری نے لکھی ہے۔
ابتدا میں شعر کی ماہیت وغیرہ پر تفصیلی بحث ہے۔ اس کے بعد موجودہ ادبی انقلاب سے پہلے کی شاعری کا ذکر ہے اور اسی سلسلے میں اصلاحی دور کے شعرا آزاد وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں موجودہ دور کے اکثر چھوٹے بڑے شعرا کے مختصر حالات اور اُن کے کلام پر مجمل تبصرہ دیا گیا ہے پنجاب کے شعرا میں سے حفیظ اور اقبال کے سوا کسی کا ذکر نہیں ۔ یہ مصنف کی دلچسپ بے خبری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔
بحیثیتِ مجموعی کتاب میں اردو ادب کے طالب العلم کے لئے دلچسپ معلومات ہیں۔ کتاب تنقید کے جدید اصول کے مطابق لکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور نوجوان مصنف کو اس میں قابلِ اطمینان کامیابی حاصل ہوئی ہے۔
حجم ۴۷۳ صفحات ۔ قیمت مجلد تین روپے
مکتبۂ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے منگوائیے

بچونکی طاقت بڑھانیوالی مشہور دوائی

ڈونگرے کا بال امرت

یہ ڈونگرے کا بال امرت میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے
بچے بہت خوشی سے پیتے ہیں چھوٹے بچوں کی کھانسی بخار
بدہضمی پیچش وغیرہ امراض جو اکثر ناطاقتی کی وجہ سے ہوتے
ہیں، اس کے استعمال سے رفع ہوجاتے ہیں اور اس سے
بچوں کا بدن تھوڑے ہی عرصہ میں گوشت سے بھر کر جسم
میں طاقت بڑھتی ہے

لاہور ایجنٹ لالہ بھگت رام لوہی اینڈ سنز سوتر منڈی لاہور

دُنیا کے بہترین افسانے

مولفہ مولانا منصور احمد صاحب مرحوم ایڈیٹر ہمایوں

انگریزی زبان میں دنیا کے بہترین منتخب افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں دُنیا کی ہر زبان اور ہر ملک کے بہترین افسانے جمع کئے جاتے ہیں اردو میں اب تک ایسی کوئی کتاب نہ تھی منصور احمد صاحب نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے اور چونکہ موصوف نے اس قسم کے تقریباً تمام مجموعوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے افسانوں کا انتخاب کیا ہے اس لئے یہ مجموعہ ہر لحاظ سے بہترین مجموعہ ہے ہندوستان انگلستان فرانس جرمنی اٹلی، یونان، ہالینڈ، بلجیم، یوگوسلاویہ، بلگیریا، رومانیہ، سپین، پولینڈ، عرب، ایران، چین، جاپان، امریکہ غرضکہ دنیا کے بہترین افسانوں میں سے منتخب افسانے اس کتاب کی زینت ہیں یہ مجموعہ جس محنت اور جانفشانی سے مولانا نے مرتب کیا ہے اتنا ہی کامیاب ہے۔ اس پر مولانا کے سحر نگار قلم نے ترجمے کو اصل کا روکش بنا دیا ہے۔ ۳۳ افسانوں کے ضخیم مجموعے میں ہر افسانہ غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے اور فطرت انسانی کے کسی نہ کسی پوشیدہ پہلو کو بے نقاب کرتا ہے۔ زبان بامحاورہ اور ٹکسالی ہے۔ ہندوستان کے تقریباً تمام موقر اخبارات و رسائل نے اس پر طویل تعریفی ریویو کئے ہیں۔ کتاب کی ظاہری صورت بے انتہا دلفریب ہے۔ حجم ۳۲۰ صفحے

قیمت مجلد سنہری ۱۲ ؎ غیر مجلد عہ

مُکمل شرح کلام غالب

حمیدیہ نسخہ دیوان غالب کا شائع ہونے پر سمجھا جاتا تھا کہ غالب کا سرمایہ عمر اردو میں جو کچھ ہے یہی تھا لیکن حال ہی میں شاگرد شاہجہان آبادی کی ایک بیاض دستیاب ہوئی ہے جس میں انہوں نے اپنے استاد غالب مرحوم کی غزلیں اور مروجہ دیوان کی بعض غزلیات کے تتمے درج کئے ہیں جو اب تک کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں دیکھے گئے اسی سلسلۂ گفتگو میں مولانا آسی نے ایک کہنہ بیاض اور دکھلائی جس میں غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام پایا گیا۔ اب اس میں مولانا نے نسخہ حمیدیہ سے کچھ کلام غالب اور منتخب کر کے کل مجموعہ کی شرح لکھی

قیمت ۳ روپے

منیجر رسالہ ہمایوں۔ ۳۲۔ لارنس روڈ۔ لاہور

البدر

مصنفہ مولینا مولوی عبدالواسع صاحب عثمانی پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

متعصب عیسائی مورخین واقعہ بدر سے استدلال کرتے ہیں کہ بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے پیروؤں کو لوٹ مار اور قتل و غارتگری کی تعلیم دیتے تھے اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام اپنے محاسن و پاکیزگی کے سبب سے وسعت پذیر نہ ہوا بلکہ قتل و خونریزی کے ذریعہ زبردستی پھیلا گیا۔

"البدر" میں اصول روایات و درایت اور فلسفہ تاریخ کے معیار سے مخالفین کی ایک ایک دلیل کو لے کر قرآن و حدیث کی روشنی میں تنقیدات کی گئی ہیں اور آخری باب میں اُن تمام دلائل کے ایسے مسکت اور دنداں شکن جواب دئے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر کٹے سے کٹر مخالف بھی دم بخود ہو جاتا ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا وہ نوجوان طبقہ جو مخالفین کے غیر ذمہ دارانہ خیالات سے متاثر ہو کر اسلام اور اسلامی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کا کوشاں ہے اس کتاب کو ایک نظر دیکھ لینے کے قبل اپنے خیالات کے اعادہ و تکرار سے محترز رہے۔

"البدر" اپنے باطنی محاسن کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہے جو آپ کے ذوق سلیم پر بار نہیں ہو سکتی۔

دو رنگوں میں چھپا ہوا نفیس ٹائیٹل

کاغذ ۲۸ پونڈ سفید

سائز ۲۶×۲۰/۸

ضخامت ۲۰۰ صفحات (علاوہ ٹائیٹل و نقشہ عرب قبل از اسلام)

قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے صرف عہر فی جلد علاوہ محصول ڈاک وغیرہ۔

خاص رعایت:۔ ناظرین ہمایوں اگر عہر بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں تو کتاب مذکور بذریعہ رجسٹری بھیج دی جائے گی۔ اس صورت میں آپ کو ۵؍ کی بچت ہوگی۔

ملنے کا پتہ:۔

عبدالباقی اینڈ کو

تاجران عسکر گنج

گورکھپور

حضرت خواجہ حسن نظامی کے دلچسپ مضامین

اور ہندوستان کے ممتاز مشاہیر کے خیالات

روزانہ
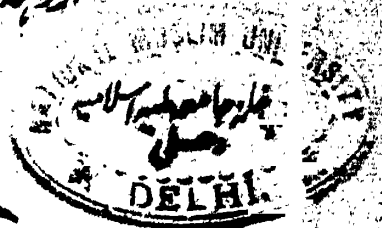
عادل

میں شائع ہو رہے ہیں یہ اخبار ہندوستان کے ہر طبقہ میں بیحد پسند کیا جا رہا ہے

ایک کارڈ لکھ کر نمونہ مفت منگا لیجئے

مضامین کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ مشتہرین کیلئے نفع بخش۔ ایجنٹوں کی آمدنی کا بہترین ذریعہ ہے

مینجر روزانہ "عادل" دہلی

۱۹۳۲ء

ہمایوں کا جوبلی نمبر طلب فرمائیے

سوا دو سو صفحات کا ضخیم رسالہ

متعدد ہاف ٹون اور رنگین تصاویر — نہایت نفیس اور دلکش ٹائیٹل

رعایتی **قیمت** ۸

مینجر رسالہ ہمایوں ۳۰-۲ لارنس روڈ۔ لاہور

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۰-۲ ... سے شائع کیا

قواعد

۱- "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم چوراسی صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۲ آنے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۶ آنے۔

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳- لارنس روڈ لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلے آنربیل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

جلد ۲۳ — نمبر ۳

"ہمایوں" بابت ماہ مارچ ۱۹۳۳ء

تصویر:۔ روسہ کی ایک خونین تماشاگاہ

قیمت فی پرچہ ۶ ر — ویلر بک سٹال پر ۸ ر — چندہ سالانہ للعہ مع محصول

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء مدیر ہمایوں

کے

ادبی مضامین کا دلکش مجموعہ

چھپ کر تیار ہے طلسمِ زندگی میاں صاحب کی پندرہ سال کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں تقریباً سو چھوٹے مضمون اور لطنے دو سو چھوٹے چھوٹے شہ پارے ہیں۔ مناظر، صدائے روح۔ آئینۂ دل، جدوجہد، سرگوشیاں، خیالات پریشاں چھ مختلف باب ہیں جن میں مضامین تقسیم کئے گئے ہیں طلسمِ زندگی، حسنِ فطرت، اخلاق، تصوف، نفسیات اور محبت کے پاکیزہ جذبات کا ایک بوقلموں نگارخانہ ہے جس میں زندگی کے صحیح اور فلسفیانہ مطالعہ کے بدیع المثال اور دلآویز مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔

کتاب کا ایک حصہ ایسے مضامین کے لئے وقف کیا گیا ہے جن میں مشرق و مغرب کے تمدن و معاشرت پر مزاحیہ انداز میں نظر ڈالی گئی ہے چونکہ یہ مضامین مختلف اوقات میں مختلف جذبات کے زیر اثر لکھے گئے اس لئے ان میں قدرتاً ایک ایسا دلآویز تنوع پیدا ہوگیا ہے جس سے مختلف طبیعتیں تسکین و تفریح کا سامان حاصل کرسکتی ہیں "طلسمِ زندگی" میں اکیس رنگین بلاک ہیں جن میں سے اکثر ہفت رنگ و سہ رنگ ہیں۔ ہر باب کا آغاز ایک رنگین صفحۂ جمیل سے ہوتا ہے جو بجائے خود قدیم اسلامی نقاشی کا ایک لازوال نمونہ ہے مصنف کی تصویر کے علاوہ تیرہ دلکش تصویریں ہیں جو اپنی اپنی جگہ استادانِ فن کے بہترین مصورانہ کمالات کا مظہر سمجھی گئی ہیں اس کے علاوہ سرورق سے لے کر خاتمے تک کتاب ماہرِ فن مصوروں کے مشورے کے مطابق آراستہ و پیراستہ کی گئی ہے۔ کتاب کی پہلی تصویر "طلسمِ زندگی" رنگ و تخیل کا ایک بے نظیر مرقع ہے جس کی بجائے خود ایک الگ قدر و قیمت ہے۔ کتابت پنجاب کے ایک بہترین خوشنویس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ طباعت اعلیٰ درجے کے حسنِ اہتمام کی مثال ہے۔ جلد نفیس سنہری نقاشی سے مزین ہے کتاب اس قدر خوبصورت ہے کہ موجودہ اردو تصانیف میں اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔

حجم تین سو دس صفحات ہے۔ تمام کتاب بہترین آرٹ پیپر پر چھپی ہے قیمت مجلد پانچ روپیہ (علاوہ محصولڈاک) کہ تقریباً یہی کتاب کی اصلی لاگت ہے۔ چند کتابوں کی جلد زیادہ نفیس تیار کرائی گئی ہے۔ جن کی قیمت سات روپے فی جلد ہے۔ یہ مجموعہ محدود تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن تک انتظار کی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے تو فی الفور اپنی فرمائش بھیج دیجئے۔ جن حضرات کی فرمائشیں پہلے پہنچیں گی ان کا حق فائق سمجھا جائے گا۔

سید عبداللطیف کوٹھی میاں بشیر احمد صاحب ۳۲۔ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ

موجودہ زمانے میں عموماً اس مسئلہ پر کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ذریعۂ تعلیم دیسی زبانیں ہونی چاہئیں لیکن ہندوستان کی صورت ہی اور ہے یہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے سوا جہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے اور کسی یونیورسٹی نے کسی دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا نیشنل کرسچین کونسل ریویو نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہندی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبے میں جو موجودہ ہندستانی یونیورسٹیوں کی روایات کے خلاف ہندی زبان میں پڑھا گیا پنڈت مالوی نے مدرسوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم کے سوال کو بجا طور پر اٹھایا ہے۔ انہوں نے کہا یونیورسٹی کے سنٹرل ہندو سکول میں طلبہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور آئندہ سال سے انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں بھی ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو جائے گی۔ یہ ایک نہایت اہم اور قابل ذکر اصلاح ہے۔ باقی دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں ملکی زبانیں ذریعۂ تعلیم ہیں۔ لیکن ہندوستان کی سولہ یونیورسٹیوں میں سے صرف ایک ریاست حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی ایسی ہے جس نے بہ غیر مشکوک طور پر صحیح اور مناسب طریق تعلیم اختیار کیا ہے، جیسا کہ پنڈت مالوی نے اپنی تقریر میں کہا دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کا طریق انگریزی زبان کا کما حقہٗ مطالعہ کرنے کے منافی نہیں ہے۔ جس کا ثبوت ہمیں عثمانیہ یونیورسٹی سے مل چکا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کی باقی یونیورسٹیاں بھی حیدرآباد اور بنارس کی مثال کی پیروی کریں گی۔ اس میں شک نہیں کہ اس راہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ گزشتہ سال اس موضوع پر انٹر یونیورسٹی بورڈ نے ایک گشتی مراسلہ شائع کیا تھا جس کے جوابات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان مشکلات پر غالب آنا غیر ممکن نہیں اصلاح و تجدید کے امکان کو ایک مناسب موقع نہ دینے کی ذمہ داری اتنی مشکلات پر عاید نہیں ہوتی جتنی طبیعتوں کی اس کج روی اور بیدلی پر عاید ہوتی ہے جو ایک مروجہ طریق سے انحراف پر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی تمام مضامین میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں اس لئے کامیاب ہو سکی ہے کہ یونیورسٹی کے قائم کردہ دارالترجمہ کی شبانہ روز کوششیں اور فاضل و ماہر مصنفین کی قابل قدر خدمات اس کے شامل حال تھیں۔ اس انقلاب انگیز طریقے کا جس پر اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی میں عمل ہو رہا ہے اور اس نئی تحریک کا جو عثمانیہ یونیورسٹی کے اصول پر اب بنارس یونیورسٹی میں رائج کی جائے گی ان لوگوں کو بہ نظر امعان مطالعہ کرنا چاہئے جو ہندوستان میں مسیحیوں کی اعلیٰ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

قسمت اور نیند کے متعلق اڈیسن کے خیالات

مسٹر ایم اے ریسناف جو اڈیسن کے ساتھ ایک مددگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں مندرجۂ ذیل شذرے میں اس عظیم الشان حکیم کی کامیابی کا راز اس کے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ایک دن ہم بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ مسٹر اڈیسن نے کہا "کیا تم قسمت کے قائل ہو؟" میں نے کہا "ہوں بھی اور نہیں بھی۔ میری عقل مجھے قسمت کے وہم کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرتی رہتی ہے لیکن میری وحشی روح مجھے اس سے جدا ہونے نہیں دیتی۔ اڈیسن نے کہا "مجھ سے پوچھو تو میں تو قسمت کا قطعاً قائل نہیں ہوں۔ اور اگر قسمت حقیقت میں کوئی چیز ہے تو میں دنیا میں سب سے بڑھ کر بدقسمت آدمی ہوں۔ اپنی تمام عمر میں ایک دفعہ بھی قسمت نے کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ جب مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھے ہر اُس چیز کی تلاش کرنی پڑتی ہے جس کی مجھے ضرورت نہیں ہوتی۔ یا ہر رطب و یابس میں سے ہو کر مجھے گزرنا پڑتا ہے۔ ننانوے چیزیں میری راہ میں ایسی آتی ہیں جو میرے لئے بے مصرف ہوتی ہیں اور اس کے بعد آخر میں اُس چیز کی باری آتی ہے جس کی میں تلاش میں ہوتا ہوں کیا تم اسے بدقسمتی نہ کہو گے؟ لیکن میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں قسمت کا قائل نہیں۔ نہ اچھی کا نہ بُری کا۔ بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ ایک دو مرتبہ کوشش کرنے کے بعد اپنے مقصد کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اپنے مقصد کو اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک میں نے اسے حاصل نہ کر لیا۔ یہی ایک فرق ہے جو مجھ میں جسے لوگ خوش قسمت خیال کرتے ہیں اور اُن لوگوں میں ہے جو اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مجھ میں کوئی خاص جوہر ہے جس کے زور سے میں نے اپنی بڑی بڑی ایجادیں کی ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ ہر صاحب فہم وہ کام کر سکتا ہے جو میں نے کیا بشرطیکہ وہ پنجے جھاڑ کر اپنے مقصد کے پیچھے پڑ جائے اور سمجھے کہ میں اسے تکمیل تک پہنچا کر چھوڑوں گا۔ تم نے میرا یہ قول لوگوں سے سُنا ہو گا کہ "قابلیت کا جوہر ایک فیصدی الہام پر اور ننانوے فیصدی محنت پر مشتمل ہوتا ہے۔ میں نے کہا "ہاں صاحب، دراصل محنت ہی سب کچھ ہے۔ لیکن یہ آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ کم از کم آپ غیر معمولی صبر و استقلال کے مالک ہیں" انہوں نے کہا "ہاں یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے بڑا صبر ملا ہے۔"

نیند کے متعلق بھی اڈیسن کے خیالات کچھ کم دلچسپ نہیں شاید اپنے اسی نظریئے کے طفیل وہ متواتر کئی کئی راتیں بغیر سونے کے کام میں گزار دیتے تھے یا برائے نام سو لیتے تھے۔

نظریۂ خواب اُن کا محبوب موضوعِ گفتگو تھا۔ وہ بار بار اس پر آجایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا "نیند محض ایک عادت ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل نہیں۔ خلیات نہیں سوتے۔ مچھلیاں تمام رات پانی میں تیرتی رہتی ہیں، وہ نہیں سوتیں۔ گھوڑا بھی نہیں سوتا۔ وہ کھڑا رہ کر آرام کر لیتا ہے۔ انسان کو نیند کی کچھ ضرورت نہیں۔ تم کبھی اس کا تجربہ کرو۔ تمام دن اور تمام رات کام کرتے رہو، پھر علی الصباح صرف آدھ گھنٹے کے لئے ذرا سستا لو، اس کے بعد اٹھو۔ اپنا منہ

HUMAYUN.
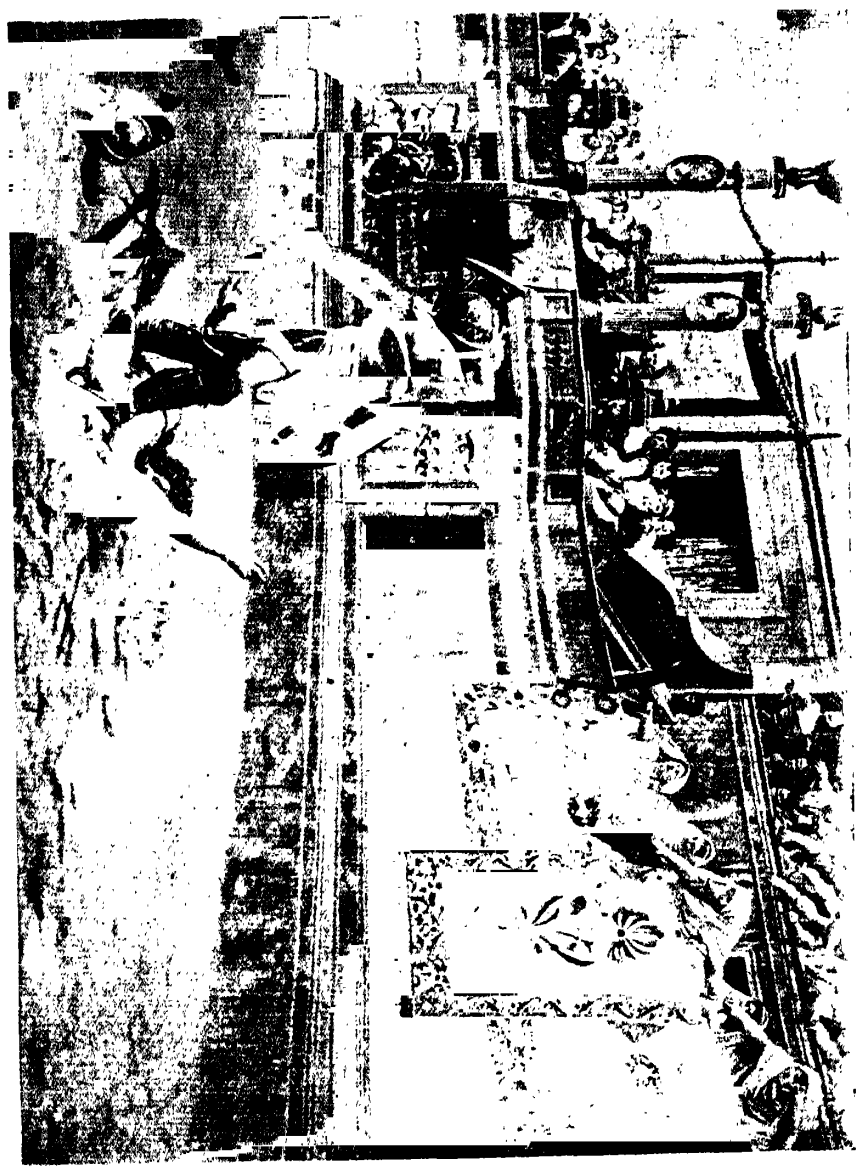
رومہ کی ایک خونیں تماشا گاہ

ٹھنڈے پانی سے دھوکر پھر اپنے کام میں لگ جاؤ تمہیں کوئی تھکان محسوس نہ ہوگی اور تم بالکل تروتازہ ہوجاؤ گے۔

ناخواندگی

ہر ملک کے ناخواندہ اشخاص کی تعداد حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ ڈیکر کی ۱۹۳۳ء کی جنتری میں ہمیں مندرجۂ ذیل نقشہ ملا ہے:۔

ناخواندہ اشخاص کی نسبت آبادی سے

ٹرکی ۱۹۲۷ء ۰ر۹۱ فیصدی	ہندوستان ۱۹۲۱ء ۰ر۹۰ فیصدی	مصر ۱۹۲۷ء ۷ر۸۵ فیصدی
برازیل ۱۹۲۰ء ۰ر۶۷ "	پرتگال ۱۹۲۰ء ۰ر۶۵ "	میکسیکو ۱۹۲۱ء ۹ر۶۴ "
سوویٹ یونین ۱۹۲۶ء ۷ر۴۸ "	سپین ۱۹۲۰ء ۰ر۴۳ "	یونان ۱۹۲۸ء ۰ر۴۲ "

پولینڈ ۱۹۲۱ء ۷ر۳۲ فیصدی اٹلی ۱۹۲۱ء ۰ر۲۶ فیصدی

کتابوں کے پچپن میل

برٹش میوزیم کی مشہور و معروف لائبریری کی چالیس لاکھ کتابوں کی ایک نئی فہرست تیار ہو رہی ہے۔ یہ کتابیں جن طاقچوں میں پڑی ہوئی ہیں اُن کو اگر مسلسل جوڑا جائے تو ایک پچپن میل لمبی قطار تیار ہو سکتی ہے گزشتہ فہرست کی ترتیب کو تریپن سال گزر چکے ہیں اور اس کی تیاری کے لئے عملہ پچیس سال تک مصروف رہا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ فہرست کی تیاری پر بھی ایک بہت لمبا عرصہ صرف ہو جائے گا۔ اب تک کہ دو سال گزر چکے ہیں صرف اُن مصنفین کی آدھی کتابوں کی فہرست تیار ہو سکی ہے جن کے نام ابجد کے پہلے حرف سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ فہرست تکمیل پر تقریباً ۱۶۵ جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کی قیمت چار سو پونڈ ہوگی اور دنیا بھر کی تمام اعلیٰ درجے کی لائبریریوں کا ایک ضروری جزو سمجھی جائے گی۔

تصویر ۔ (روما کی ایک خونین تماشاگاہ) یہ تصویر انسان کے عہد بربریت کی ایک عبرت آموز یادگار ہے۔ جسے فرانس کے نامور مصور (Hector Leroux) کے کمالِ فن نے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اس قسم کی بہیمانہ تفریحات کا آغاز یوں تو بہت قبل ہو چکا تھا لیکن سیزروں کے زمانۂ حکومت میں خاص طور پر اس ننگ انسانیت کھیل کو فروغ حاصل ہوا۔ روما کے خون آشام آقا اپنے غلاموں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں ہلاک کرانے کیلئے اس قسم کے دنگلوں میں لایا کرتے تھے۔ ان غلاموں کو گلیڈیٹر کہتے تھے جو غلام اپنے حریف کو پچھاڑ لیتا وہ تماشائیوں کا ایما معلوم کرنے کے لئے اوپر نظر اٹھاتا۔ خونخوار تماشائی جن میں عورتیں بھی شامل ہوتیں اپنے دہنے ہاتھوں کے انگوٹھے نیچے کی طرف جھکا دیتے۔ یہ ایک خوفناک خونین اشارہ تھا جسے پاتے ہی گلیڈیٹر طرفۃ العین میں اپنے برگشتہ بخت حریف کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

عشق

تم مجھ سے کہاں بھاگ کے جاؤگے بتاؤ — چھایا ہوں میں ہر سمت جدھر آنکھ اٹھاؤ

میں چشمِ ازل، چشمِ ابد، چشمِ بقا ہوں — موجِ نگہِ کاہکشاں بن کے اٹھا ہوں

ہے بوسۂ مہتاب سے تاباں رخِ ہستی — آفاق کے چہرے پہ ہے چھائی ہوئی مستی

میں دیدۂ انجم سے تمہیں جھانک رہا ہوں — وہ نور کا طوفاں ہوں جدھر جاؤ بپا ہوں

نکہت ہے مرے سانس کی ہر موجِ صبا میں — اک کیف سا پیدا ہے دلِ ارض و سما میں

میں تابِ رخِ حسن ہوں میں روحِ وفا ہوں — میں عارضِ گل نغمۂ بلبل میں بسا ہوں

ہے برق مرے خندۂ وحشی کی نشانی — ہے رعد مرے نالۂ غمگیں کی کہانی

میں سازِ فلک، سازِ زمیں، سازِ زماں ہوں — میں محرمِ جاں پردہ درِ رازِ جہاں ہوں

ہر ذرّہ مری آنکھ ہے کیا مجھ سے چھپوگے — چھپتے ہو عبث مجھ سے کہاں چھپ کے رہوگے

میں ربطِ عناصر ہوں میں شیرازۂ جاں ہوں

میں عشق ہوں، میں خونِ رگِ کون و مکاں ہوں

حامد علی خاں

مذہب

" انگلستان کے ایک ہندوستانی طالب علم" نے گزشتہ اکتوبر کے ہمایوں میں مذہب پر من حیث المجموع چند اعتراضات کئے ہیں، اور مدیر ہمایوں نے اہل مذہب کو صلائے عام دی ہے کہ ان اعتراضات کا جواب دے کر الحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کریں۔ گو مضمون فی نفسہٖ ایسا نہیں ہے کہ اس کا رد کسی خاص دقّت نظر کا محتاج ہو۔ لیکن چونکہ یہ اور اسی قسم کے اور خدشات اکثر انگریزی خواں طلبہ کے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان کا بالاستیعاب جواب دوں۔ یہ مضمون باوجود میری انتہائی کوشش کے خاصہ طویل ہو گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اعتراض تو ہمیشہ مختصر ہوتا ہے مگر اس کا شافی جواب ضرور مطول ہوگا۔

مضمون محولۂ بالا زیادہ تر بلا دلیل دعاوی پر مشتمل ہے۔ اور جس قدر نظریے پیش کئے گئے ہیں وہ سب کے سب خود محل نظر ہیں۔ اس لئے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بھی بناءالفاسد علی الفاسد کے مصداق ہیں۔ مثلاً صاحب مضمون فرماتے ہیں کہ مذہب زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے اور چونکہ انسان ذہنی ترقی کر کے جاہلیت کی چادر اتار کر پھینک چکا ہے اس لئے اسے مذہب کی ضرورت نہیں۔ اس نظریئے کا ثبوت پیش کئے بغیر وہ آگے بڑھتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ مذہب مظاہر فطرت میں روحانی تا[ثی]ر اور طاقت تسلیم کر لینے سے پیدا ہوا ہے۔ اس نظریے کو بطور حقیقت ثابتہ پیش کرنے کے بعد وہ تیسرا دعوی کرتے ہیں کہ مذہب کی تہ میں انسانی خوف و توہم کا جذبہ کارفرما ہے چنانچہ مذہبی رسوم و عبادات سب کی سب اسی جذبے کا مظاہرہ ہیں اور چونکہ سائنس نے توہمات کے قلعوں کو مسمار کر کے علم و بصیرت کی راہ کھول دی ہے اور انسان مظاہر قدرت سے خائف ہونے کی بجائے ان سے کام لے رہا ہے اور روز بروز اس پر یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ تمام مظاہر فطرت کسی نہ کسی قاعدے اور قانون کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے مذہبی عقائد کی بنیاد متزلزل ہو گئی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مذہب ایک مرض ہے جو انسان کو زمانۂ جاہلیت میں لاحق ہو گیا تھا اور جب تک بنی نوع انسان نے اس موذی مرض سے نجات حاصل نہ کی اُن کی ترقی مسدود رہیگی۔ نیز انسان اوج کمال تک کبھی نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس روگ سے کاملاً نجات نہ پالے۔

اس کے بعد مذہب کے خلاف ایک اور محاذ قائم کرتے ہیں۔ وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ مذہب نے ہمیشہ جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔ جابر بادشاہوں، ظالم حکومتوں، اور غریبوں کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں کی پشت پناہی اس کا

خاص ملتا ہے۔ اس لئے جس قدر جلد مذہب کو خارج البلد کر دیا جائے گا اسی قدر جلد مظلوم قومیں مزدور پیشہ جماعتیں اور کاشتکار ان جبر و استبداد کے آہنی پنجہ سے نجات پائیں گے۔ مضمون کا بہ امعانِ نظر مطالعہ کرنے پر بھی ہمیں معترض صاحب کے دعووں کی کوئی دلیل اس میں نظر نہیں آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ان کی تحریر اور ان کے اعتراضات تیس چالیس سال پرانے ہیں۔ کیوں کہ انیسویں صدی کے آخر میں مذہب کی تحقیر و تضحیک سائینسدانوں کے ایک طبقے کے نزدیک فیشن میں داخل ہو گئی تھی اور کوئی سائینس دان ان کے نزدیک اہلِ علم کے زمرے میں شریک نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ مذہب پر سوقیانہ پھبتیاں کس کر اپنی حکمت و دانش اور حریتِ فکر کا ثبوت نہ دے۔ لیکن وہ سائنس کا روزِ اول تھا۔ اور جس طرح ایک بچہ اپنی تازہ علمی فتوحات پر فخر کرتا ہے اسی طرح اس زمانے کے سائنس دان سائنس کی چند ابتدائی فتوحات سے اپنا دماغی توازن کھو کر بڑیں ہانکنے لگے تھے کہ ہم نے مذہب کے حصار کو مسمار کر لیا ہے۔ لیکن جس قدر ترقی سائنس نے پچھلے تیس سال میں کی ہے اس کے سامنے انیسویں صدی کا سائنس طفلِ مکتب ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں سائنس ترقی کر رہا ہے اور سائنس دانوں کا علم اور تجربہ وسیع ہو رہا ہے ان کے طفلانہ دعاوی بھی معدوم ہو رہے ہیں اور اب کوئی قابلِ اعتنا سائنس دان مذہب کا ذکر حقارت سے کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا اور نہ مذہب کو زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہی قرار دے سکتا ہے بلکہ موجودہ زمانے کے ایک بہت بڑے سائنس دان کا مقولہ ہے کہ "دہریے کے لئے موجودہ سائنس کی مملکت میں کوئی جگہ نہیں ہے صرف بے وقوف یا مجنون ہی دہریہ ہو سکتا ہے۔" ہم دیکھتے ہیں کہ مل اور کانٹ کے زمانے میں جس وثوق سے قوانینِ قدرت پیش کئے جاتے تھے اور جس قدر حتمی طور پر ارنسٹ ہیکل اور ہیگل سائنس کو حقیقتِ ثابتہ (Positive Science) تسلیم کرتے تھے اسی قدر تامل سے موجودہ سائنس دان قوانینِ قدرت اور حقائقِ ثابتہ کا نام لیتے ہیں۔ کیوں کہ علم کی ترقی کے ساتھ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ ہم ابھی حقائقِ ثابتہ یا قوانینِ قدرت دریافت کرنے سے کوسوں دور ہیں۔

اسی طرح موجودہ زمانے میں کوئی صاحبِ علم یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مذہب کی ابتدا یوں ہوئی تھی۔ بلکہ مختلف نظریئے جو جلد باز سائنس دانوں نے محض مذہب کی مخالفت کی بناء پر گھڑ لیئے تھے اب خود بخود متروک ہو رہے ہیں۔ اور محققین خود اس بات کے معترف ہو چکے ہیں کہ وہ نظریئے نہ تھے بلکہ قیاس آرائیاں تھیں۔ ان میں سے اکثر تو اس قدر پوچ ہیں کہ پہلی ہی نظر میں ان کی سخافت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور بعض پوچ تو نہیں مگر ان کے دلائل اس قدر ناقص اور نامکمل ہیں کہ انہیں حقائقِ ثابتہ کے طور پر پیش کرنا یا تو فریب نفس ہے یا بدترین سائینٹفک بددیانتی۔ قصہ مختصر اگر سائنس دانوں کی مختلف تھیوریوں کو جو انہوں نے مذہب کی ابتدا کے بارے میں اب تک پیش کی ہیں بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان پر مثنوی مولانا روم کی مشہور چھ اندھوں والی حکایت صادق آتی ہے جنہوں

نے ہاتھی کو کبھی نہ دیکھا تھا اور کسی نے ٹانگوں کو کسی نے سونڈ کو کسی نے دم کو مس کر کے ہاتھی کے متعلق مختلف نظریئے قائم کر لئے تھے۔ اسی طرح انیسویں صدی کے ان خود ساختہ محققین نے جو فی الحقیقت علم و بصیرت سے اسی قدر بے بہرہ تھے جیسے کہ وہ اندھے بصارت سے مذہب کی مختلف مسخ شدہ شکلوں کو دیکھ کر اسی پر اپنے نظریوں کی بنیاد استوار کرنی شروع کر دی۔ کسی نے کہا کہ مذہب کی ابتدا اینیمزم (animism) سے ہوئی۔ کسی نے کہا کہ مذہب اجداد پرستی یا ہیرو ورشپ سے پیدا ہؤا ہے۔ کسی نے کہا کہ مظاہر فطرت کی لم نہ معلوم کر سکنے سے انسان کے قلب پر ہیبت و خوف کے اثرات طاری ہوئے۔ اور اسے بادل کی گرج، بجلی کی چمک، آبشار کی فریاد، دریا کی روانی، پہاڑ کی عظمت، سورج کی حدّت غرض سب میں ایک ایک دیوتا کارفرما نظر آنے لگا۔ جسے اس کے سریع التاثیر دماغ نے قہر و غضب محبت و عداوت حسد و جوشِ انتقام وغیرہ انسانی صفات سے متصف کر دیا۔ اور ان مظاہرِ فطرت سے مستفید ہونے کے لئے اس نے ان دیوتاؤں کو خوش کرنا ضروری خیال کیا۔ اسی سے مذہب پیدا ہؤا۔ لیکن جوں جوں علم و تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور نئے نئے تاریخی اکتشافات نے واقعات کا ایک انبار جمع کر دیا تو ان نظریوں کو واقعات پر منطبق کرنے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آنے لگیں اور تمام مذاہب پر ان نظریوں کا چسپاں کرنا مشکل معلوم ہونے لگا تو کسی نے اسے مرض، کسی نے اسے جہالت کا بقیہ اور کسی نے اسے ظلمت و وہم پرستی کا کرشمہ قرار دیا۔ لیکن یہ درحقیقت اپنے عجز و جہل کا اعتراف تھا۔ کیوں کہ انسان کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کی حقیقت کی تہ کو نہیں پا سکتا تو اس کی تحقیر و تذلیل سے اپنا دل خوش کر لیتا ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

خود تاریخ کی روشنی میں بھی سائنس دانوں کے یہ نظریئے بالکل باد رہوا ثابت ہو چکے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ مذہب کی ابتدا اینیمزم سے یا ہیرو ورشپ سے یا خوف و ہیبت کے جذبے سے ہوئی تو ظاہر ہے کہ دو باتیں لازماً ثابت ہونی چاہیئں۔

اول یہ کہ موجودہ مذاہب سے پہلے یعنی ان کی تعلیمات کے رائج ہونے سے قبل انسان پر کوئی زمانہ ایسا گزرا ہی جب کہ وہ صرف اینیمزم یا ہیرو ورشپ کرتا تھا اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مذہب نہ تھا اور نہ توحید سے اور نہ اعلیٰ اخلاق سے وہ واقف تھا۔

دوم۔ موجودہ مذاہب میں بھی ترقی اسی طریق پر ہوئی ہے کہ ان میں ابتداً اینیمزم یا ہیرو ورشپ موجود تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے توحید کے عقیدے تک پہنچے۔ یا بالفاظ دیگر مذہب کی ابتدا اس کی انتہا سے اسفل اور ادنیٰ تھی۔ ہم ایک مثال سے اس کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں آرین اور سامی مذاہب بہت قدیم خیال کئے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر مذہب اینیمزم یا ہیرو ورشپ سے پیدا ہؤا تو لازماً ہمیں تاریخی طور پر ایسی شہادت

ملنی چاہئے کہ کوئی زمانہ ہندو یا سامی مذاہب پر ایسا گزرا ہے جب کہ توحید و الوہیت کا عقیدہ ان میں موجود نہ تھا لیکن تاریخ اس کی قطعی طور پر تردید کرتی ہے اور جس قدر ہمارا تاریخی علم وسیع ہو رہا ہے اسی قدر ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی جارہی ہے کہ ہر مذہب کا ابتدائی عہد اس کا بہترین اور زرّین عہد تھا۔ پھر وہ پھلا اور پھولا اور اس نے رطب و یابس کو جذب کرنا شروع کیا۔ بالآخر اس میں فساد رونما ہوگیا اور توحید کی جگہ اصنام پرستی، ہیرو ورشپ اور مظاہر پرستی نے لینی شروع کردی اور اعلیٰ اخلاق کی جگہ بداخلاقی عود کر آئی۔ چنانچہ عروج، اختلاط، تنزل و تسفل کی یہ منازل تقریباً سب مذاہب طے کر چکے ہیں۔ ہندو مذہب کو لو۔ اس کی ابتدا اعلیٰ توحید و یدانت اور تصوّف سے ہوئی۔ انسانی مساوات اور اخوت کی تعلیم کے دوش بدوش دنیا اور دنیا والوں کی مذمت کے جذبات اس کی مذہبی کتب میں موجود ہیں۔ لیکن مرورِ ایّام سے اس میں بدترین شرک مثلاً اصنام پرستی، حیوان پرستی، اشجار پرستی، لنگ پرستی وغیرہ وغیرہ داخل ہوگئے اور ہمارے پاس اس امر کے ناقابلِ تردید دلائل موجود ہیں کہ برہمنوں نے اپنے مذہبی اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے لوگوں کو وید، گیتا اور اپنشدوں کی تعلیمات سے چھڑا کر شرک و اوہام پرستی میں مبتلا کردیا۔ گویا ہندو مذہب میں انیمزم اور ہیرو ورشپ، توحید اور ہمہ اوست کے عقائد کے بعد کی ملحقات ہیں اور اب بھی ہم ہندو مذہب میں توحید کے دوش بدوش بدترین شرک کو موجود پاتے ہیں۔ اسی طرح اخوت و مساوات کی جگہ ذات پات اور چھوت چھات نے ہندو مذہب میں گھر کرلیا اور اسے رفتہ رفتہ قعرِ مذلت میں پہنچا دیا۔ اسی طرح بدھ مذہب کی ابتدا کیسے زرّین اصولوں سے ہوئی اور بدھ نے دنیا کے سامنے کیسی اعلیٰ تعلیم توحید و اخلاق کی پیش کی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کیوں کر وہ مذہب پھیلا۔ بڑھا اور پھر تنزل کی طرف جاکر بدترین صنم پرستی میں تبدیل ہوگیا۔ چنانچہ بدھ (بت) کا لفظ فارسی زبان میں صنم کا مترادف ہوگیا۔ اسی طرح کا تنزل ہم یونانی رومی اور ایرانی مذاہب میں بھی پاتے ہیں۔ عیسائیت کی ابتدا بھی حضرت مسیح علیہ السّلام کی پاکیزہ تعلیمات سے ہوئی جو توحید و اخوت سے معمور ہیں لیکن رفتہ رفتہ توحید کی جگہ تثلیث، مریم و عیسیٰ پرستی اور عملِ صالح کی جگہ کفارہ نے لے لی۔ خود اسلام کو لو جو مذہب کی سب سے آخری اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے۔ کیوں کر اس کی ابتدا اعلیٰ توحید اور بہترین اخلاقی تعلیمات سے ہوئی اور کیوں کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان سچے موحد، اخلاقِ فاضلہ اور اخوت و مساوات کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اور موجودہ زمانے میں کیوں کر قبر پرستی، پیر پرستی، تقلیدِ جامد نے توحید کو جلاوطن کردیا ہے اور ذات پات اور قومیّت نے اخوت و مساوات کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مذہب مظاہر پرستی یا ہیرو ورشپ کی ترقی یافتہ صورت ہے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا ورنہ ہم آج یہ نظارہ نہ دیکھتے کہ ہندو مذہب میں ویدانت اور تصوّف کے پہلو بہ پہلو بدترین شرک موجود ہے۔ عیسائیوں میں موحدین کے پہلو بہ پہلو الوہیتِ مسیح اور اقانیمِ ثلٰثہ کے عقائد کو ماننے والوں کی ایک موقر اور زبردست جماعت موجود ہے اور خود اسلام میں اس قدر اصلاحی تحریکات کے

شروع ہونے کے باوجود، اعلیٰ ترین اور خالص توحید کے دوش بدوش بدترین مظاہر شرک مثلاً قبر پرستی وغیرہ موجود ہیں
اس لئے تاریخی طور پر اس حقیقت سے انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ مذہب نے اسفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کے بجائے
ہمیشہ اعلیٰ سے اسفل کی طرف تنزل کیا ہے اور اس کی ابتدائی حالت ہمیشہ خالص و بے عیب رہی ہے اسکی ابتدائی
تعلیمات شرک و اوہام پرستی سے پاک اور ابتدائی پیرو اعلیٰ اخلاقِ انسانی سے متصف اور کمالِ انسانی کے سب سے
زیادہ قریب رہے ہیں اور اب بھی جب کہ بقول حضرتِ معترض کے سائنس کی روشنی نے لوگوں کی آنکھوں سے جہل
کی پٹی اتار دی ہے ہم یورپ و امریکہ میں وہی وہم پرستی، وہی تثلیث، وہی مریم و مسیح پرستی موجود پاتے ہیں۔ اس لئے
یہ دعویٰ کرنا کہ مذہب کی ابتدا مظاہر پرستی یا اجداد پرستی یا خوف و ہیبت سے ہوئی واقعات سے آنکھیں بند کرنے کے
مترادف ہوگا۔ یہ کہنا ایسا ہی لغو ہوگا جیسا یہ دعویٰ کرنا کہ ہندو مذہب کی ابتدا اصنام پرستی، عیسائیت کی ابتدا
مسیح و مریم پرستی۔ یا اسلام کی ابتدا قبر پرستی اور اینیمزم سے ہوئی۔ اور اگر ہم خداداد عقل و دانش سے کام لیں
اور استقرار کا خون نہ کریں تو واقعات کا مطالعہ ہمیں ایسے نتیجے پر پہنچائے گا جو سائنس دانوں کے مفروضہ نظریوں
کے بالکل متضاد ہوگا۔

فی الحقیقت مذہب کے متعلق جس قدر بھی نظریئے سائنس دانوں نے پیش کئے ہیں ان کی تہ میں فقط ایک
جذبہ کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ مذہب کے الہامی ہونے سے انکار کیا جائے۔ ہم انشاء اللہ اس مضمون میں ان پر
اجمالی روشنی ڈالیں گے کہ بغیر مذہب کے الہامی تسلیم کئے ہم کسی طرح مذہب کی حقیقت کو نہیں پا سکتے۔ یہاں ہم ایک
اور مغالطہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس میں مذہب کے مخالفین مبتلا ہیں اور وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی ابتدا حقیر
ثابت کر دینا ہی اس کی تکذیب و تردید کے لئے کافی ہے۔ اس لئے بخیالِ خود جب وہ یہ ثابت کر چکتے ہیں کہ مذہب کی
ابتدا اینیمزم سے یا اجداد پرستی سے یا خوف و ہیبت کے جذبات سے ہوئی تو وہ فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ مذہب
بالکل ناکارہ اور بے کار ہے اور پھر خود ہی فاتحانہ انداز میں چلا اٹھتے ہیں کہ اب مذہب کی کوئی پشت پناہ نہیں رہی
اور ہم نے اس کی لغویت پر مہر تصدیق ثابت کر دی ہے حالانکہ عقلِ سلیم کے نزدیک ان کا یہ استدلال ایسا ہی
لغو ہے جیسا یہ کہ چونکہ انسان ایک حقیر قطرے کے دس لاکھویں حصہ سے پیدا ہوا ہے اور درخت کا بیج پھولوں کا
پولن وغیرہ سے کے سب اس سے زیادہ موقر ہیں اس لئے انسان اسفل المخلوقات ہے۔ اسی طرح اگر ہم یہ ثابت
کریں کہ سائنس کی ابتدا جادو، ٹونوں اور ٹوٹکوں سے ہوئی تو اس سے سائنس کی حقارت اور ناکارہ پن ثابت ہو
جائے گا۔ ایسے نتائج اخذ کرنا یقیناً انسانی عقل و فراست کی توہین ہے اسی طرح محض یہ ثابت کرکے کہ مذہب کی ابتدا اینیمزم یا اجداد پرستی
سے ہوئی یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ مذہب بالکل عبث اور بیکار ہے انسانی علم و تجربہ اور فہم و فراست کی توہین ہے
اصل بات یہ ہے کہ مذہب کی مخالفت کا جذبہ انیسویں صدی کے سائنس دانوں کے ایک طبقے میں اس

قدر ترقی کر گیا تھا کہ اس نے انہیں بالکل اندھا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کے اس طبقہ نے مذہب کی مخالفت میں پوچ سے پوچ نظریئے پیش کرنے میں تامل نہ کیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے سب سے بڑے سائنس دان ارنسٹ ہیکل نے جو مذہب کے شدید ترین مخالف تھے مذہب کی مخالفت میں دروغ بافی تک سے دریغ نہ کیا۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان ٹامسن اپنی ایک تازہ کتاب مذہب و سائنس Religion and Science میں لکھتے ہیں "ہیکل کی اس حرکت پر حق پسند سائنس دانوں کی گردنیں ندامت سے جھک جاتی ہیں کیوں کہ ہیکل نے ایسی بات کا ارتکاب کیا جس کا الزام وہ ازمنۂ وسطیٰ کے پادریوں کو دیا کرتا تھا" پس میں اپنے نوآموز جدید تعلیم یافتہ احباب سے بہ ادب عرض کروں گا کہ وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے ان سائنس دانوں کی مجذوبانہ بڑوں کو حقائق ثابتہ یقین کرنے سے پہلے خود بھی خداداد عقل و بصیرت سے کام لیں۔ ورنہ وہ سراب کو پانی سمجھ کر اس کے پیچھے پڑیں گے اور پیاس سے ہلاک ہو جائیں گے۔ عارفِ رومی نے کیا خوب کہا ہے:۔

ہر ہلاکِ امتِ پیشیں کہ بود　　زانکہ بر جندل گماں بردند عود

جہاں تک ہمارا علمِ تاریخ ہماری رہنمائی کرتا ہے اور اس میں میں آثارِ قدیمہ کے جدید ترین انکشافات کو شامل کرتا ہوں ہمیں انسان کا کوئی دور ایسا نہیں ملتا جس میں انسان نے بغیر مذہب کے زندگی بسر کی ہو۔ اور نہ آج ہی باوجود سائنس کی اس قدر ترقی کے ہم مذہب کی گرفت کو کمزور ہوتا دیکھتے ہیں۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اور پوری قوت سے موجود ہے اور سائنس کی ترقی، بالشویکوں کے بے پناہ مظالم، دہریوں کا گمراہ کن پروپیگنڈا اس کے اثر و نفوذ کو اکھاڑ نہیں سکا۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آئندہ بنی نوعِ انسان بغیر مذہب کے زندگی بسر کریں گے ایسا ہی منطقیانہ نتیجہ ہوگا جیسا کہ انسان کسی آنے والے زمانے میں بغیر قلب و جگر کے زندہ رہ سکے گا، یا بغیر پھیپھڑوں کے سانس لے سکے گا، یا بغیر ہوا کے اپنی زندگی بسر کر سکے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بالطبع مدنی ہے۔ اور مدنیت بغیر تعلقات کے قائم نہیں ہو سکتی اور تعلقات بغیر معاشرتی اور اخلاقی قوانین کے استوار نہیں ہو سکتے۔ انسان اور حیوان میں یہی مابہ الامتیاز ہے کہ حیوان اپنے افعال میں صرف اپنی فوری ضروریات اور ان کے ازالہ اور اس کے فوری نتائج پر غور کرتا ہے لیکن انسان مجبور ہے کہ اپنی نظر کو یہیں تک محدود نہ رہنے دے۔ مثلاً ایک شہد کی مکھی گرمیوں میں مختلف پھولوں سے شہد اکٹھا کرتی ہے اور اپنے چھتے میں جمع کرتی ہے تاکہ اسے موسم سرما میں کھا سکے۔ اب وہ تمام پھولوں پر جو اس کی دسترس میں ہوں گے بیٹھے گی اور میٹھا رس چوس چوس کر اپنے چھتے میں لائے گی۔ اس کے پیش نظر اپنی اور اپنے بچوں کی غذا کی فراہمی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک اود بلاؤ جب اپنا گھر بناتا ہے تو اسے اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کا خیال ہوتا ہے اور بس۔ لیکن ایک انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو وہ مجبور ہے کہ اپنی فوری ضروریات کے ازالہ اور اس کے فوری

نتائج کے علاوہ اور باتوں پر بھی غور کرے۔ مثلاً انسان کو اپنی بھوک کے لئے اناج اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے وہ کھیتی بوئے گا، باغ لگائے گا مگر اس میں بھی اسے سب سے پہلے یہ خیال کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے ہمسایہ کی زمین میں کھیتی نہ بوئے یا باغ نہ لگائے کیوں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے ہمسایہ کو خوراک کے حصول کے ذرائع سے محروم کر رہا ہے اور یہ چیز مدنیت کے منافی ہے۔ اسی طرح جب وہ کھیتی بوئے گا تو اسے اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ایسی چیز بوئے جس کی زمین متحمل ہوسکتی ہے اور موسم اس کے موافق ہے۔ مثلاً برسات کے موسم میں وہ چاولوں کی کاشت کرے گا کیوں کہ انہیں پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ اس بات کا بھی خیال رکھے گا کہ زمین کو اس طرح کاشت کرے کہ اس کی طاقت زیادہ سے زیادہ دیر تک قائم و برقرار رہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اسے بیج ڈالنے کے لئے اپنے ہمسائے کا غلہ نہیں چرانا چاہئے ورنہ وہ ہمسایہ شاید اس کا غلہ چرا لے جائے گا۔ اور اس طرح سوسائٹی میں عمل تخریب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہیں پر بس نہیں جب اس کے پاس غلہ جمع ہوتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہے تو وہ اپنی ضروریات کو کم کرکے ہمسایہ کی مدد کرنے کا خیال کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان خیالات کے پیدا ہوتے ہی اسے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ علم طبعی اس کی اس بات میں تو رہنمائی کرسکتا ہے کہ وہ اپنی کھیتی کو کیوں کر کاشت کرے کہ اس کی زمین کی قوت زائل نہ ہو یا کم سے کم محنت میں زیادہ سے زیادہ ثمرات پیدا ہوں یا کس موسم میں کس قسم کا بیج ڈالنا چاہئے لیکن یہ اس کی اس بارے میں ہرگز رہنمائی نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے ہمسائے کی حق تلفی نہ کرے یا اپنی ضروریات کو کم کرکے اپنے بھائی کی ضرورت میں اس کے کام آئے۔ اسی طرح بقائے نسل کا مسئلہ لو۔ حیوانات میں توالد و تناسل کا سلسلہ بغیر کسی خاص پابندی یا ذمہ داری کے جاری و ساری ہے لیکن انسان اس طرح اپنا سلسلۂ توالد و تناسل جاری نہیں رکھ سکتا۔ کیوں کہ سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ حیوانات کے بچے اپنی تربیت کے لئے محض وجدان کے محتاج ہیں اور بس۔ لیکن انسان کا بچہ خاص طور پر تعلیم و تربیت کا محتاج ہے اور بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے والدین پر اس کی تعلیم و تربیت کی گرانبار ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ والدین کے تعلقات زناشوئی میں کوئی دوسرا مخلل اندازنہ ہو۔ اسی طرح انسان اپنے زناشوئی تعلقات سے محض توالد و تناسل کا کام ہی نہیں لیتا بلکہ اس سے رفاقت اور دوستی یا اپنے مدنی جذبہ کی تسلی و تشفی کی بہتر بن صورت پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ امر مسلم ہے کہ سوسائٹی کی ابتدا کنبہ اور خاندان سے ہوئی ہے۔ اس لئے اور بھی ضروری ہوا کہ کوئی دوسرا شخص میاں بیوی کے تعلقات میں رخنہ اندازنہ ہو ورنہ سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ہر شخص موقع ملنے پر دوسرے کے تعلقات میں رخنہ اندازی کی کوشش کرے گا۔ سائنس اس مسئلہ میں انسان کی رہنمائی کرنے میں یہاں تک عاجز و درماندہ ہے کہ وہ زنا اور منا کحانہ تعلقات میں کوئی فرق نہیں بتلاسکتا۔ اسی طرح صداقت و دروغ گوئی، ایثار و خودغرضی

عفت وحرامکاری، عصمت و بدکاری، شجاعت و تہوّر، حب وطنی وعصبیت، غرض اعلیٰ اور ادنیٰ خلق میں سائنس کسی قسم کی حدفاصل قائم کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اور اس قسم کے سینکڑوں سوالات روزانہ انسان کے سامنے آتے ہیں اور انسان ان کا فیصلہ کرنے سے عاجز ہے اس کا ظاہری علم اور تجربہ اس کا سائنس اور اس کی تحقیقات ان امور میں اس کی یاوری نہیں کر سکتے۔ اور اگر مذہب اس کی تائید ورہنمائی کو نہ آتا تو انسان بالکل بے یار و مددگار رہ جاتا۔ اور انسانی سوسائٹی بالکل فنا ہو جاتی۔ مذہب ہی نے تاریکی میں انسان کو نور ہدایت کی روشنی دکھائی ہے انسان کو خودغرضی کی دلدل سے نکال کر اخلاقِ فاضلہ سے اس کے قلب کو منوّر کیا ہے۔ اس لئے انسان مذہب کی رہنمائی سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکا اور نہ آئندہ ہی کبھی ہو سکے گا۔

اب رہا یہ دعویٰ کہ مذہب نے ہمیشہ جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔ سو یہ بھی مدعی کی تاریخی لاعلمی کا نتیجہ ہے کیونکہ جہاں تک میرا علم میری رہنمائی کرتا ہے میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سچے مذہب سے زیادہ کسی نے بھی مظلوم کی حمایت، سرمایہ داری کی مخالفت اور جابر و ظالم بادشاہوں سے بغاوت نہیں کی۔ کیا کرشن جی کا پانڈوؤں کی تائید میں صف آرا ہونا اور گیتا سنا کر ارجن کو کوروں پر ہتھیار اٹھانے پر مجبور کرنا، مظلوموں کی حمایت کے لئے نہ تھا۔ کیا گوتم بدھ کی تعلیماتِ رہبانیت اور ترکِ دنیا سرمایہ داری کے خلاف بے پناہ جہاد نہ تھا۔ کیا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فراعنۂ مصر سے نجات نہیں دلائی۔ کیا زرتشت نے حکومتِ وقت کے خلاف نفرت وحقارت پھیلا کر اس کی برائیوں کی اصلاح نہیں کی۔ کیا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا دولت اور دولت مندوں کے خلاف وعظ کرنا سرمایہ داری اور ظلم کے خلاف بہترین جہاد نہ تھا۔ اور کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس الزام کا لگایا جانا کہ وہ حکومتِ وقت کے باغی ہیں اس لئے پھانسی کے مستوجب اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اس وقت کے جابرہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو باغیانہ تعلیم باور کرتے تھے۔ اور دل سے اس بات کے قائل تھے کہ ان کی تعلیم ایک نہ ایک دن ان کی ظالمانہ حکومتوں کا تختہ اُلٹ دے گی۔ پھر کیا پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سب سے پہلا کام یہ نہیں کیا کہ عربوں کو قیاصرہ اور اکاسرہ کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں تمام دنیا کی آزادی کا پیام دینے پر مامور فرمایا۔ کیا اسلام کی اخوت و مساوات کی عملی تعلیم جابرہ اور سرمایہ داری کی حمایت کے لئے تھی۔ کیا سود کی مخالفت اور حرمت اور وراثت اور خیرات کی فرضیت سرمایہ داری اور ظلم کی تائید کے لئے تھی یا انہیں جڑ سے اکھاڑ دینے کے لئے۔ پھر کیا دنیا کے ان تمام بڑے بڑے انبیائے بنی نوعِ انسان کی حریتِ فکر جسمانی آزادی اور اخلاقی برتری کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ سب کی سب جبر اور ظلم کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے تھیں۔ اور دور کیوں جاتے ہو دنیا کی تازہ ترین تحریکِ آزادی کا غور سے مطالعہ کرو جس کی طرف اس وقت تمام دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں یعنی ہندوستان کی ستیہ گرہ۔ کیا اس کا رہنما اس وقت دنیا میں مذہبی انسان کہلاتا ہے یا سائنس دان۔ کیا تمام دنیا اسے مادیت اور روحانیت، مغربی تہذیب

اور مذہب کی جنگ سے تعبیر نہیں کر رہی۔ کیا یہ تحریک جسے ایک مذہبی آدمی نے جاری کیا ہے اور خالص مذہبی حدود کے اندر رہ کر جاری ہے مظلوم کی حمایت کے لئے نہیں ہے۔ خدارا غور کرو اور نظر انصاف سے حقائق کو دیکھو کہ مذہب نے دنیا کو اخوت و مساوات، ہمدردی و غمگساری، آزادی اور حریّت کا سبق دیا ہے یا سائنس نے سائنس نے کس قوم کو آزادی بخشی، کسی مظلوم کی حمایت میں سینہ سپر ہوا، کس جماعت کو درسِ آزادی و حریّت دیا۔ ممکن ہے کہ سائنس کے حامی انقلابِ فرانس و امریکہ کو پیش کریں کہ یہ سائنٹیفک سپرٹ کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ بلکہ ان کے تحت میں بھی مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ فرانس کی پہلی انقلابی عدالت نے منکرین خدا کے لئے گلوٹین کی سزا تجویز کی تھی۔ ہاں موجودہ زمانے میں بولشویک انقلاب ایک ایسا انقلاب ہے جو بظاہر مذہب کی مخالفت سے معمور ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بولشوزم زیادہ دیر تک مذہب کے خلاف نہیں رہ سکتی اور اگرچہ اس کی مثال ایک تجربے کی ہے لیکن قرائن و آثار چاہتے ہیں کہ بولشویکوں کو اگر زندہ رہنا ہے تو انہیں مذہب کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑے گا۔

یہ بے شک صحیح ہے کہ مذہب کے انحطاط کے زمانے میں اس کے بعض رہنماؤں نے حکومتِ وقت کا ساتھ دیا ہے اور ہر ممکن ذریعے سے جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں کہ مذہب کا داعیہ اور مقتضا یہ تھا کہ جبر و استبداد کی تائید کی جائے بلکہ ان رہنماؤں کی خود غرضانہ فریب کاریوں کا سلسلہ حکومت وقت کی تائید کے بغیر جاری نہ رہ سکتا تھا۔

لیکن جو کام مذہب نے اپنے دورِ انحطاط میں سرانجام دیا وہ سائنس اپنے عروج کے زمانے میں دے رہا ہے۔ اور مذہب سے بھی زیادہ جابر حکومتوں اور سرمایہ داروں کا مؤید ثابت ہو رہا ہے۔ کیا تمام آلاتِ حرب اور ظلم و ستم کے تمام حربے سائنس کی ایجاد نہیں۔ کیا جس قدر ہتھیار سرمایہ دار اور اربابِ حکومت مزدوروں اور کسانوں کے کچلنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں وہ سائنس کے عطا کردہ نہیں ہیں۔ کیا ڈائنامیٹ کی ایجاد انسان کے لئے رحمت ثابت ہوئی یا بے پناہ مصیبتوں کا سیلاب اپنے ساتھ لائی۔ کیا ہوائی جہاز، بحری جنگی جہاز، تارپیڈو کشتیاں توپیں، بندوقیں، کارتوس وغیرہ جن کی مدد سے حکومتیں انتہائی مظالم کر رہی ہیں۔ ان سب کی ایجاد کا سہرا سائنس کے سر پر نہیں۔ کیا زہریلی گیس، دمدم گولیاں، آتشباز ٹینک، مسلح موٹریں اور دیگر آلاتِ ہلاکت بنی نوع انسان کے لئے بالعموم اور مزدور پیشہ جماعتوں اور غریب کسانوں کے لئے بالخصوص آیۂ رحمت ثابت ہو رہے ہیں یا ظلم کی انتہائی صورت، یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کو نافذ کر کے غالب کے مغلوب کو کچلنے کے حق کو بزور ثابت کر رہے ہیں۔ تو پھر کیا ان تمام ایجادوں کی بدولت جو کشت و خون ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اور آئندہ ہونے والا ہے۔ جو ظلم و ستم مزدوروں اور کسانوں پر ہوا ہے اور ہو رہا ہے جس بُری طرح مظلوم کچلے جا رہے ہیں اور

قوموں کی قوموں کو خدا داد آزادی سے محروم کرکے غلام بنایا جا رہا ہے ان سب کی ذمہ داری سے سائنس سبکدوش ہوسکتا ہے۔ نہیں اور یقیناً نہیں تو اگر ان سب کی ذمہ داری سائنس کے کندھوں پر ہے تو کیا یہی بات اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ سائنس بنی نوع انسان کی رہنمائی کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ کیا اسی برتے پر سائنسدان کہتے ہیں کہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ خود سائنس کے مضرات اور مہلکات سے بنی نوع انسان کو بچانے کے لئے مذہب کی ضرورت ہے تاکہ علم کو محبت اور خدمتِ خلق کو بھولا ہوا زریں سبق سکھا کر اسے بجائے ظلم کے خدمتِ خلق کا آلۂ کار بنا دے اور دنیا کو نئے سرے سے خذ ما صفا و دع ما کدر کا فراموش شدہ زریں اصول یاد دلا دے۔

میرا اس تحریر سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں سائنس کے مفاد سے انکار کروں۔ یہ جسارت تو کم علم سائنسدان ہی کر سکتے ہیں جو سرے سے مذہب کے افادات سے انکار کرکے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ میرا مقصد انسانی علم کی خامیاں ظاہر کرکے محض یہ دکھانا ہے کہ انسان لاکھ کوشش کرے کہ اپنے علم کے مضرات سے بچ جائے اور صرف مفاد ہی مفاد حاصل کرے لیکن یہ ناممکن ہے۔ درحقیقت اس کا اپنا علم اس پر الف لیلہ کے مشہور پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہوجاتا ہے اور باوجود ہر ممکن کوشش کے وہ اس کی آہنی گرفت سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

اب ہم ایک اور مشہور مغالطہ کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر سائنس دان نظریۂ ارتقاء کو مذہب پر منطبق کرنے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کے تمام شعبہ ہائے علم کی مانند مذہب بھی ارتقائے انسانی کا جزوِ لاینفک ہے اور ارتقا کا ہمہ گیر اصول جس طرح جمادات نباتات اور حیوانات میں کارفرما ہے اسی طرح انسان کے تمام علوم ہیئت و طبیعیات، کیمیا، بیالوجی، فلسفہ، سوشیالوجی، معاشیات اقتصادیات اور مذہب و اخلاق میں بھی کارفرما ہے۔ اگر معاملہ یہیں پر ختم ہوجاتا تو ہم اس کو معرضِ بحث میں نہ لاتے لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض شتاب کار سائنس دان مذہب کے متعلق نظریۂ ارتقار سے جھٹ ایک ہی جست میں اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ مذہب زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے اور بانیانِ مذہب نے بنی نوعِ انسان پر کوئی خاص احسان نہیں کیا بلکہ محض توہمات کو بنی نوع انسان میں مستقل طور پر رواج دے دیا۔ اس لئے فی زماننا ہمیں مذہب کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ نتیجہ سرتاسر غلط ہے۔

مسئلۂ ارتقار کی خامیوں پر بحث کرنے سے ہم نفسِ مضمون سے بہت دور جا پڑیں گے۔ نہ ہمارا مختصر مضمون اس مسئلہ پر کسی سیر حاصل بحث کا متحمل ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہم فی الحال اس بات کو تسلیم کرلیتے ہیں کہ انسان کے دوسرے علمی شعبوں کی مانند مذہب بھی بتدریج ارتقائی منازل طے کرکے اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل یعنی اسلام کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ لیکن اس نظریئے کے تسلیم کرلینے سے ان بانیانِ مذہب کا احسان جنھوں نے بتائید ایزدی

اس ترقی میں حصہ لیا اور اس قصرِ اخلاق کی تعمیر میں جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے ممد و معاون ہوئے بنی نوع انسان پر کیوں کر کم ہو سکتا ہے جب کہ خود علومِ طبعی میں سے نظریۂ ارتقا کو تسلیم کر لینے سے سائنس اور فلسفہ بطلیموس، اقلیدس، فیثاغورث، افلاطون، ارسطو، بوعلی سینا، فارابی، ابن رشد، گلیلیو، کوپرنیکس، نیوٹن، ہرشل، آئن سٹائن وغیرہم کے احسان سے کسی طرح بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ یہ ممکن ہے کہ نظامِ بطلیموسی کی طرح ارسطو کا فلسفہ تقویمِ پارینہ ہو جائے یا حکیم آئن سٹائن کے نظریے کی ہمہ گیری، نیوٹن کے نظریوں کو داستانِ کہنہ اور قصہ ماضی بنا دے یا خود حکیم آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت متروک ہو جائے لیکن بطلیموس ارسطو یا نیوٹن یا آئن سٹائن سائنس و فلسفہ میں ویسے ہی محبوب رہیں گے اور ان کا نام ویسے ہی عزت و احترام سے لیا جائے گا جیسا کہ کسی بڑے سے بڑے زندہ سائنس دان کا۔ لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا ابھی تک جینیس (Genius) یعنی فطین کی پیدائش کی کوئی سائنٹیفک توجیہہ پیش نہیں کر سکا اور باوجود اپنی ہمہ گیری کے بطلیموس سے لے کر آئن سٹائن تک جس قدر (Genius) جینیس پیدا ہوئے ہیں ان کا وجود اس کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہو رہا ہے اور زبردست سے زبردست حامی مسئلۂ ارتقا کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان حکما کا وجود نظریۂ ارتقا کے فریم (چوکھٹے) میں چسپاں نہیں ہو سکتا۔ جب طبعی دنیا میں جو سائنس کی جولانگاہ ہے سائنس کی درماندگی کا یہ حال ہے تو بھلا روحانی دنیا میں جو سرے سے اس کی دسترس سے ہی باہر ہے وہ کیوں کر بانیانِ مذہب و اخلاق اور رہنمایانِ معاشرت و سیاست کے وجود کی تشفی بخش توجیہہ پیش کر سکتا ہے اس لئے کنفیوشس، سقراط، سولن، زرتشت، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندر جی، کرشن مہاراج، گوتم بدھ اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے وجود اور ان کے کارنامے ارتقائی سائنس دانوں کے لئے ہمیشہ عقدۂ لاینحل رہے ہیں۔ اور وہ باوجود انتہائی کد و کاوش کے کوئی سائنٹیفک توجیہہ جس سے یہ اربابِ علم و بینش ارتقا کے جامے میں سما سکیں پیش نہیں کر سکے اسی چیز کو جس کی توجیہہ سے ارتقا قاصر ہے مذہب فضلِ ربی سے تعبیر کرتا ہے جو دنیاوی علوم میں الہام کی صورت میں اور روحانی علوم میں بھی الہام و وحی کی صورت میں انسانی ہدایت کے لئے ظاہر ہوتا ہے۔ اور انسان کو ہر ہر قدم پر یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے کہ علم کا حقیقی سرچشمہ الہامِ ربانی یا فیضانِ الٰہی ہے اور بس۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَعَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

(اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا)

اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کی تمام علمی ترقی اسی ایک آیت کی تفسیر ہے۔ مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو مقلدین کا ہے جو لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ باوجود نئی ضروریات کے احساس کے ان کے ازالہ کے لئے کوئی تبدیلی اپنے معمولِ زندگی میں نہیں کر سکتے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو مقابلۃً

زیادہ چست اور ہوشیار ہوتے ہیں وہ انسانی علم کے سرمائے سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسی پر اپنی تفریعات کی بنیاد قائم کرتے ہیں لیکن وہ بھی علم کی تخلیق میں حصہ نہیں لیتے۔ تیسرا طبقہ ان حکما کا ہے جو اللہ کی تائید سے انسانی ضروریات کو دیکھتے ہیں اور ان کے ازالہ کے لئے نئی دریافت یا ایجاد کرتے ہیں وہ اپنی (Originality) یا اپج سے انسانی علم میں اضافہ کرتے ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ روشن کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو واقعے پیش کرتے ہیں۔ حکیم ارشمیدس سے پہلے بھی دنیا پانی میں غسل کرتی تھی اور تیرتی تھی لیکن حکیم ارشمیدس نے اسی غسل سے مسئلۂ وزنِ مخصوص دریافت کیا اور اس کو نہاتے نہاتے ایسا محسوس ہوا گویا کہ یک لخت اس کا سینہ منور ہو گیا ہے چنانچہ وہ اس کی خوشی میں اپنے غسل خانے سے ننگا دوڑا۔ اسی طرح نیوٹن کا قصہ لو۔ نیوٹن سے پہلے ہزار ہا حکما نے سیب کو درخت سے گرتے دیکھا تھا لیکن قسامِ ازل نے یہ شرف نیوٹن کے لئے مخصوص کر کر رکھا تھا کہ اس کے سینے پر سیب کو گرتے دیکھ کر یک لخت نظریۂ کشش ثقل منعکس ہو جائے۔ ایک اور چیز جو یہاں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے جینیس (Geniuses) میں اکثر ایسے تھے جو کتابی علوم میں بہت زیادہ دستگاہ نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ نیوٹن اور ڈارون کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کیمبرج میں بی اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم میں حقیقی اضافہ سوائے القائے ربانی کے ناممکن ہے اور ہر ترقی میں ہم موہبتِ ربانی کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ اسی طرح روحانی دنیا میں بھی انسانوں کی تین قسمیں ہیں۔ مقلدین علما اور انبیا۔ انبیا روحانی دنیا کے (Geniuses) جینیس ہیں۔ جو براہِ راست انوار الٰہی سے مستنیر ہو کر اور وحیٔ الٰہی سے فیض حاصل کر کے دنیا کو مشعلِ ہدایت دکھاتے ہیں۔ گویا فیضانِ الٰہی جس طرح مادی دنیا میں کارفرما ہے اسی طرح روحانی دنیا میں بھی اپنے ابر کرم سے تشنہ کاموں کو ہر لحظہ اور ہر آن سیراب کر رہا ہے۔

اور اگر کوئی ایسا زمانہ علمی ترقی کا آ بھی جائے کہ سائنسدان ارسطو، بوعلی سینا، نیوٹن، آئن سٹائن وغیرہم کی رہنمائی کی طبعی دنیا میں اور حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کے روحانی دنیا میں ظاہر ہونے اور بنی نوعِ انسان کو مشعلِ ہدایت دکھانے کی کوئی صحیح ارتقائی توجیہ پیش کریں تو بھی جس طرح سائنس اور بنی نوع انسان باوجود یہ تسلیم کر لینے کے کہ ارسطو، بوعلی سینا، نیوٹن اور آئن سٹائن وغیرہم ارتقائے انسانی کا لازمی ثمرہ ہیں ان کے عظیم الشان احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور ان کے کارناموں کی تخفیف کر کے اپنی حماقت اور ناشکر گزاری کی نمائش نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بنی نوع انسان مذہب و اخلاق کے ان پیغمبروں کے عدیم النظیر اور غیر فانی احسانات کے بارِ گراں سے کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کوئی صاحب عقل و خرد ایسا کہنے کی جرات اور کوئی اہل علم و بصیرت ایسا دعویٰ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ روحانیت اور اخلاق کے ان ہادیانِ برحق کے کارنامے یعنی مذہب جہالت کا بقیہ ہے کیوں کہ ایسا کہنا خود نوع انسان کی انتہائی

توہین وتذلیل ہے۔

ہم اس پر ایک اور نقطۂ نظر سے بھی غور کر سکتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی علمی تعمیر فی الجملہ ایک ایسا محل ہو جس کے معمار اور انجنیر وقتاً فوقتاً پیدا ہو کر اس کی تکمیل میں حصہ لیتے رہے ہیں اور اس محل کی تعمیر میں حروفِ تہجی یا عربی اعداد کے موجد کا بھی اتنا ہی بڑا حصہ ہے جتنا کہ چھاپے خانے یا سٹیم انجن کے موجد یا ارسطو یا آئن سٹائن کا۔ اسی طرح سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان نے ایک اور اس سے بھی زیادہ روشن اور عظیم الشان قصرِ اخلاق و معاشرت تعمیر کیا ہے۔ جو انسان کو حیوانات سے متمیز کر رہا ہے اور اس تمام اخلاقی اور معاشرتی نظام کی تعمیر کے بغیر انسان کبھی بھی انسان کہلانے کا مستحق نہ ہو سکتا تھا۔ تاریخی طور پر اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام اخلاقی اور معاشرتی نظام انسانی قانون اور انسانی تہذیب و تمدن تمام کے تمام انبیاء کی تعلیم پر قائم ہیں۔ اور جب تک دنیا میں کسی قسم کا اخلاقی اور معاشرتی نظام قائم رہے گا کنفیوشس کا نام چین میں، زرتشت کا نام ایران میں، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا نام مصر اور شام میں، حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا نام عیسائی دنیا میں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تمام دنیا میں عزت اور احترام سے لیا جائے گا۔ کیوں کہ ان ہادیانِ برحق نے انسان کے اس قصر کی تعمیر کی۔ اس لئے اگر ہم یہ مان لیں کہ مذہب جہالت کا بقیہ اور توہم پرستی کا کرشمہ ہے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان کا تمام اخلاقی اور معاشرتی نظام، انسان کا قانون اور انسانی تہذیب و تمدن جہالت کا بقیہ اور توہم پرستی کے کرشمے ہیں کیا کوئی شخص اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ انسان کے اس عظیم الشان قصرِ اخلاق کو منہدم اور انسانی شرف و عزت کو کالعدم کر کے انسان کو دوبارہ حیوانات کے زمرے میں لا کھڑا کرے۔

ممکن ہے کہ بقول گوئٹے کے "موجودہ زمانے میں شیطانی جذبات کے ہیجان اور ابلیسی خواہشات کے تلاطم میں بہنے والے، ہوا و ہوس کے اسیر، خود غرضی اور خود پرستی کے نشہ میں سرشار، مادیت و شہوت پرستی کے دالدہ و شیدا، شک اور اضطراب کے شکار اور دنیاوی مکروہات کے گرفتار انسان" جنہیں عرفِ عام میں مہذب انسانوں سے تعبیر کیا جاتا ہے ایسا کہنے کی جرأت کر بیٹھیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ فریبِ نفس زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپین تہذیب کے مکروہ اعمال نے اس دنیا کو ان کے لئے جہنم بنا دیا ہے اور یاس و نامرادی، حرمان و خذلان، فقدانِ راحت و اطمینان چاروں طرف سے ان پر یورش کر رہے ہیں اور دنیا باوجود اپنی فراخی اور روشنی کے ان کے لئے تنگ و تاریک ہو رہی ہے اور وہ اپنے اعمال کے بھیانک اور خوفناک نتائج سے مفر ڈھونڈنے کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف نظر آ رہے ہیں اور جیسا کہ ڈاکٹر میکس نارڈو نے کہا ہے کہ "یورپ اور امریکہ میں راحت اور اطمینان کی تلاش کبریتِ احمر کی تلاش سے کم نہیں۔ جس ملک میں تم جاؤ وہیں تم پر یہ الم انگیز حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ ہر سوسائٹی میں عملِ تخریب نہایت سرعت سے اپنا کام کر رہا ہے"۔ آج

مغربی دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے اس التہاب کو تجربی علم اور سائنس کم نہیں کر سکتے اور ایک گروہ اربابِ بصیرت کا ایسا پیدا ہو رہا ہے جو اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے کہ یورپ کی اس آگ کو صرف ایمانِ ابراہیمی یا اسوۂ حسنۂ محمدی ہی گلزار بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ برناڈشا نے صاف طور پر کہا ہے کہ دُنیا یا تو بولشویک ہو جائے گی یا اسے اسلام کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی۔ مگر ظاہر ہے کہ بولشوزم دنیا کی تسلی نہیں کر سکتی کیوں اس کا دامن تعمیر سے بالکل خالی ہے اور عنقریب مغربی دنیا پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ سائنس باوجود اپنی ترقی کے ان کے روگ کا مداوا نہیں کر سکا بلکہ ان کے دُکھ کی دوا اس روحِ ایمانی میں ہے جو ایک گھاس کے تنکے سے لے کر سربفلک پہاڑوں کی چوٹیوں تک، ذرّے سے آفتابِ روشن تک، چاند کی گردش اور ستاروں کے نور میں سمندر کی موجوں اور دریاؤں کی روانی میں، صحرا کی خاموشی اور جنگل کی بادِ صرصر میں، باغوں کے درختوں پھلوں اور پھولوں میں غرض کائناتِ فطرت کے ایک ایک ذرّے میں جاری و ساری ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

ولہٗ اسلم من فی السمٰوات والارض

(اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے)

اور پھر فرمایا:-

کل لہٗ قانتون

(سب کے سب اسی کے مطیع و منقاد ہیں)

اور اگر کوئی اس روحِ ایمانی سے بیگانہ ہے تو یہی بدبخت انسان جو اشرف المخلوقات ہو کر اسفل السافلین کے گڑھے میں گر چکا ہے۔

موجودہ تہذیب کی ناکامی کی داستان اتنی طویل ہے کہ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہاں اسی قدر ظاہر کر دینا کافی ہے کہ موجودہ زمانے کی عالمگیر بے اطمینانی جو کہیں سوشلزم کی صورت میں کہیں نہلزم کی شکل میں کہیں انارکزم کی شکل میں اور کہیں بولشوزم کے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کا علی الاعلان اعتراف کر رہی ہے کہ موجودہ نظام بالکل بوسیدہ ہو چکا ہے اور شاید بنی نوعِ انسان اس روایتی بُڑھیا کی طرح جو تمام دن سوت کاتا کرتی تھی اور شام کو اسے تار تار کر دیتی تھی اب پھر اپنا تمدن برباد کر کے ایک نئے تمدّن کی تلاش میں سرگرداں ہونے کو ہیں۔

اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت فی الفور منکشف ہو جاتی ہے کہ یورپین تہذیب کا اصل مرض مذہب سے ہجر و بعد ہے۔ اس سے ہمارے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ انسان کی ہدایت کے لئے صرف

سائنس کافی نہیں اور مذہب کی ہدایت کے بغیر انسان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا پھرتا ہے جیساکہ ہم آج کل دیکھ رہے ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض سائنس دان یہ کہیں کہ تہذیب کی ناکامی میں سائنس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ ہر تہذیب کی ایک نہ ایک خصوصیت رہی ہے اور موجودہ تہذیب کی خصوصیت سائنس کی عظیم الشان ترقی ہی اور اسی لئے اس تہذیب کو سائنٹیفک تہذیب کہا جاتا ہے اور موجودہ زمانے کو عہد سائنس (Scientific age) اس لئے موجودہ تہذیب کی ناکامی دراصل سائنس کی ناکامی ہے۔ مگر باوجود اس کے اب بھی اکثر سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ فی زمانناسائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ وہ ہر شعبے میں انسان کے لئے ایک کامل اور مکمل دستورالعمل پیش کر سکتا ہے چنانچہ ایک مشہور فرانسیسی سائنس دان کا قول ہے کہ مذہب ظنیات سے اور سائنس یقینیات سے بحث کرتا ہے اس لئے سائنس کے ہوتے ہوئے مذہب غیر ضروری اور بیکار ہے۔ اسی لئے سائنس کو علم یقینی (Positive Knowledge) کہا جاتا ہے۔ سائنس دان یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ سائنس میں ظن وتخمین کو بالکل دخل نہیں اور اس کا علم ایسا کامل و مکمل ہو چکا ہے اور انسان کے ہر شعبے کے متعلق اس کی معلومات ایسی حد کمال تک پہنچ چکی ہیں کہ ان میں شائبۂ نقصان یا احتمال نقص نہیں ہے اور اس کا تمام مخزن علوم یقینیات سے لبریز ہے جس میں شک و ریب کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ دعویٰ فریب نفس سے کم نہیں۔ ایسا کوئی سائنس معرض وجود میں نہیں جو کامل و مکمل ہونے کا دعویٰ کرسکے یا ظن اور تخمین سے بالا ہو سکے کیوں کہ موجودہ سائنس باوجود اس قدر ترقی کے ابھی تک بہت ہی ناقص اور محتاج تکمیل ہے۔ پس وہ انسانی رہنمائی کا فرض کیوں کر ادا کرسکتا ہے۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

مثال کے طور پر ہم سائنس کے دو عظیم الشان اصولوں کو پیش کرتے ہیں۔ پہلا اصول علت ومعلول کا ہے۔ دوسرا اصول بقائے مادہ اور بقائے قوت کا۔ ان کی اہمیت کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر ان دونوں اصولوں سے انکار کر دیا جائے تو سائنس کا محل دھڑام سے نیچے آگرے گا۔ لیکن میں ان کے یقینی ہونے کے بارے میں دو مشہور سائنس دانوں کی رائے پر اکتفا کروں گا۔ موسیو ہنری پوانکا رے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سائنس اور مفروضات" میں لکھتے ہیں"۔ آج تک سائنس دان مسئلہ بقائے قوت و مادہ کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے جسے کوئی صاحب عقل تسلیم کر سکے چنانچہ ایک سائل نے فرانس کے سب سے بڑے ماہر طبیعیات سے یہ سوال کیا کہ آپ کے پاس مسئلہ بقائے قوت کا کیا ثبوت ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ ریاضی دانوں نے چونکہ اس مسئلے کو قیاس سے ثابت کر دیا ہے اس لئے ہمیں اس کا استقرائی ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ یورپ کے سب سے بڑے ریاضی دان کے پاس گیا اور وہی سوال اس نے اس سے کیا۔ اس نے اس کے جواب میں کہا کہ چونکہ ماہرین طبعیات اسے استقراء اور تجربے سے ثابت کر چکے ہیں اس لئے ریاضی نے اس کا قیاسی ثبوت

پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی"۔ اس پر تنقید لاحاصل ہے۔ اسی طرح مسئلہ علت ومعلول کے متعلق حکیم آئن سٹائن فرماتے ہیں کہ اس کو زیادہ سے زیادہ اتفاق واقتران سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ورنہ یوں مسئلۂ علت ومعلول کی حقیقت ایک بہت ہی کمزور مفروضے سے زیادہ نہیں۔ اسی لئے مشہور جرمن حکیم گوئٹے نے سائنس کو "غلطیوں کے بھنور اور گرداب" سے تعبیر کیا ہے۔ پس سائنس دانوں کے اس دعوٰی کی قلعی کھل جاتی ہے کہ سائنس ظن وتخمین سے بالکل پاک ہے اور اس کی عمارت مذہب کی طرح محض یقین وایمان پر قائم نہیں۔ انگلستان کے بیسویں صدی کے سب سے بڑے انشا پرداز ایڈورڈ کارپینٹر نے جسے انگریز بیسویں صدی کا پیغمبر کہتے ہیں اپنے رسائل "سائنس پر تنقید" (science, a criticism) "تہذیب کی بیماری کی علت اور اس کا علاج" (Civilisation, its cause and cure) میں سائنس دانوں کے ان خیالات کی بڑے پُرزور الفاظ میں تردید کی ہے۔ میں انگریزی دان سائنس دانوں سے بہ زور کہوں گا کہ ان دونوں رسائل کا ضرور مطالعہ کریں کیوں کہ ان کے پڑھنے سے ان کی بہت سی غلطیاں دور ہو جائیں گی۔ کارپینٹر نے نہایت معقول دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نہ تو ہیئت وفلکیات، نہ کیمیا وطبعیات، نہ بائیولوجی اور فزیالوجی، نہ سوشیالوجی اور اکنومکس اور نہ دیگر مزعومہ علوم سے ہمیں حقائق ویقینیات کا علم ہو سکتا ہے۔ اور مزعومہ قوانینِ فطرت بھی جنہیں سائنس دان اس قدر زور شور سے حقائق ثابتہ کے طور پر پیش کرتے ہیں محض تخمینی عمومیات ہیں (Vague generalisation) اور ہرگز قوانینِ فطرت کہلانے کے مستحق نہیں۔ وہ قوانین اسی وقت تک رہتے ہیں جب تک ہمارا تجربہ محدود رہتا ہے۔ جوں جوں ہمارا علم وسیع ہوتا جاتا ہے ہمیں اتنا ہی زیادہ ان کے اسقام کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ جو چیز دس سال پہلے ایک قانونِ فطرت تھی وہ اب محض ظن کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جو آج قانونِ فطرت تسلیم کی جاتی ہے غالباً دس سال بعد اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔ اس لئے جسے ہم قانونِ فطرت کہتے ہیں وہ محض ہمارے تجربے کی حدبندی ہے۔ موسیو ہنری پوائنکارے سائنس دانوں کے قوانینِ فطرت کو کنویں کے مینڈک کی آواز سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس طرح کنویں کا مینڈک اپنے کنویں کو سمندر سمجھتا ہے اسی طرح سائنس دان اپنے بہت ہی محدود علم کو اور اپنی اس سے بھی زیادہ محدود فضا کو فطرت اور عالم کے وقیع الفاظ سے یاد کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے خدا کو بھی اپنی چار دیواری میں محصور کر لیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر سائنس کے تجربات کی بنیاد اصلی حالات سے کامل انقطاع پر قائم کی جاتی ہے + ایڈورڈ کارپینٹر لکھتے ہیں کہ :-

ہر ایک سائنس عملِ تخلیل کے آلے کے استعمال سے حقائق سے منقطع ہو کر بالکل فرضی تصورات میں الجھ چکا ہے علم الاخلاق کی بنیاد افادیت وتوریث پر رکھ لی گئی ہے حالانکہ حقیقی علم الاخلاق اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے اور اس کا تعلق قلبِ انسانی کی ان مساعی سے ہے جو وہ روحانی معراج حاصل کرنے کے لئے عمل میں لاتا ہے حقیقی اقتصادیات وہی ہے جو انسان کے باہمی معاملات میں حق وانصاف، اعتدال وتوازن، خیرات واحسان، اخوت ومودت، نظم واجتماع،

کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر قاعدے اور کلیات بنائے۔ لیکن ہمارے علم الاقتصاد کی ابتدا ہی ان تمام جذبات کو نظرانداز کرکے کی جاتی ہے اور اس کی بنیاد محض خودغرضی، نفس پروری اور نفس پرستی پر رکھی جاتی ہے اور اس پر تمام عمارت کھڑی کردی جاتی ہے۔ بائیولوجی میں نباتات حیوانات اور انسانات کی شخصیت و انفرادیت کو فنا کرکے کوشش کی جارہی ہے کہ کسی طرح اسے کیمیاوی جذب و انجذاب، طبعی فعل و انفعال، نطفہ اور پروٹوپلازم اور قوانین توالد و تناسل کی صورت میں محصور کردیا جائے اور اسی طرح جسد کو روح سے الگ کرکے اس کی تحلیل و تجزیہ سے قوانین و نتائج کی ایک عمارت کھڑی کرلی جائے ———"

غرض کون سا علم ایسا ہے جس کی ترقی میں یہی رجعی عمل کارفرما نہیں ہے کہ اسے اصلیت سے ہر ممکن طریق سے منقطع کردیا جائے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ایسے جسدِ بے روح سے انسان کی کیا خاک تسلی ہوسکتی ہے۔ انسان کو ضرورت تو اس امر کی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ وہ کس طرح اور کیوں کر اپنے معاملات مہرومحبت، حق و انصاف اور خیرات و احسان کو مدِنظر رکھ کر اور جماعتی شیرازہ بندی کو قائم رکھتے ہوئے انجام دے۔ مگر اقتصادیات کا علم کہتا ہے کہ سب سے پہلے حق و انصاف مہرومحبت اور خیرات و احسان کے خیالات کو دل سے نکال دو۔ پھر ہیں تمہیں (Supply and Demand) طلب و رسد کا قانون بتاؤں گا۔ اس لئے ایسا علم بنی نوع انسان کی رہنمائی کرنے کی بجائے انہیں اندھے گڑھے میں دھکیل دے گا۔ چنانچہ موجودہ عالمگیر کسادبازاری کی سب سے بڑی وجہ ہمارا غلط اقتصادی نظام ہے۔ اور اب اکثر ماہرین اقتصادیات و معاشیات اس امر کے معترف ہوچکے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام ہی اس عالمگیر تباہی کا ذمہ دار ہے۔ یہی حال دوسرے علوم کا ہے۔ اب ذرا اس سے آگے بڑھیے +

علم ہیئت ہمیں یہ تو بتا سکتا ہے کہ آفتاب زمین سے کتنے کروڑ میل دور ہے۔ روشنی کی رفتار فضائے بسیط میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ ہے۔ ایتھر میں سرخ، سفید یا بنفشئی روشنی کتنے ملیون لہریں پیدا کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ کہکشاں کی کیمیاوی تحلیل کیا ہے یا آفتاب میں ایک نیا مفرد ہیلیم موجود ہے۔ یہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ زمین آفتاب کے گرد کیوں کر گھوم رہی ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے مگر خدارا یہ تو بتاؤ کہ اس سے انسان کو اس کا جواب کیوں کر مل سکتا ہے کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ، اپنے بچوں کے ساتھ، اپنے ماں باپ یا بہن بھائیوں کے ساتھ، ہمسایہ یا احباب کے ساتھ اور باقی دنیا والوں کے ساتھ کیا اور کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس کی روح اپنی تکمیل کے لئے بیقرار ہے اسے اس کے لئے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو علم ہیئت کیوں کر پورا کرسکتا ہے۔ اسی طرح آپ ہر علم سے یہی سوال کیجئے۔ بائیولوجی سے، کیمیا سے، فزکس سے یہی سوال کیجئے۔ کیا مادہ کی تحلیل برقیوں میں اور برقیوں کی تحلیل مثبت و منفی برق پاروں میں کرنے سے بجلی کو ایتھر کا ایک تموج ثابت کرنے سے مادہ روشنی حرارت اور بجلی کا ایک مبدأ ثابت کرنے سے انسان کے بدن کی ساخت کو یونیٹری سیلز (Unitary cells) سے متعلق کرنے سے انسان کو ان

سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ سائنس نے اپنا دائرۂ عمل انسان کے حقیقی دائرۂ عمل سے اس قدر مختلف اور بیگانہ بنالیا ہے کہ وہ کسی طرح بھی مذہب کی بجائے انسان کی رہنمائی کا فرض ادا نہیں کرسکتا اور سائنس کتنی بھی ترقی کر جائے وہ انسان کو مذہب سے بے نیاز نہیں کرسکتا۔

بے شک سائنس نے تسخیرِ فطرت سے بنی نوعِ انسان کی بہت اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس کے شواہد ہمارے سامنے ہیں ایکس ریز (X. Ray) ٹیلیفون، تار برقی، لاسلکی، سٹیم انجن، برقی لیمپ اور بیشمار دوسری ایجادیں بنی نوعِ انسان کے لئے راحت کا سامان مہیا کررہی ہیں اور ان کی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں شب و روز مصروف ہیں۔ لیکن یہ تمام فوائد ایک طرف اور ہلاکت اور تباہی کے آلات دوسری طرف رکھئے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اس خدمتِ نوعِ انسانی کی کیا حقیقت ہے اور صرف آلاتِ ہلاکت وحرب ہی پر کیا موقوف ہے۔ سائنس نے ظالم اور استعمار پسند حکومتوں کے ہاتھوں کو مضبوط کر کے قوموں کی قوموں کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ ساتھ ہی حاکم اقوام میں شہرت پرستی، ہوس کاری، ہوس رانی کا ایک ناقابلِ ضبط جذبۂ عیش و عشرت کی ایک غیر مختتم خواہش، خودغرضی اور نفس پروری کی لت محبت پیدا کردی ہے۔ چنانچہ اس امر کا خود یورپ کے اہلِ بصیرت کو اعتراف ہے مسٹر ہوور صدر جمہوریۂ امریکہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں امریکہ کے متعلق جو موجودہ سائنس اور تہذیب کا گہوارہ ہے مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔

"میرے خیال میں تمام بنی نوعِ انسان کی تاریخ ایسے تاریک زمانے کی مثال پیش نہیں کرسکتی جس میں انسانی زندگی، مال ومتاع، عزت و ناموس ایسے ارزاں ہوگئے ہوں جیسے کہ ہمارے زمانے میں اضلاع متحدۂ امریکہ میں ہوچکے ہیں"۔

امریکہ میں تخویفِ مجرمانہ اور بردہ فروشی میں جس طریق پر سائنس کا استعمال کیا جارہا ہے اور لنڈن، نیویارک، پیرس، برلن اور وائینا کی محفلہائے شبینہ کی گرم بازاری کے لئے سائنس جس طریق پر استعمال ہورہا ہے، قمار بازی، شراب خواری اور حرامکاری کو مہذب بنانے کے لئے جس طرح سائنس کو کام میں لایا جارہا ہے وہ ہمارے علم اور سائنس کے لئے قابلِ فخر نہیں۔ کیا سائنس کے پاس ان مفاسد کے روکنے کا کوئی آلہ ہے مشینوں کے ذریعے سے جو ہلاکت و تباہی مزدور پیشہ جماعتوں پر آرہی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو لنڈن، نیویارک اور برلن کے سلمز (Slums) (غربا کی رہائش کے علاقے) دیکھئے کہ وہاں کیوں کر انسان حیوانوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ دور کیوں جاؤ ہم بمبئی کلکتہ اور ہندوستان کے شہروں میں اس کا نظارہ دیکھتے ہیں کہ کیونکر سائنس کی تمام ایجادیں زیادہ تر امرا کے عیش و آرام میں ممد ومعاون اور غربا کی زندگی کو بد سے بدتر بنانے میں مصروف ہیں۔ آپ اچھی سڑکیں، خوبصورت موٹریں، برق رفتار ریلیں اور طرح طرح کی مشینیں دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سائنس کی مدد سے خوشحال ہورہا ہے۔ مگر آپ کو کیا معلوم نہیں کہ ایک شہر بمبئی میں پانچ لاکھ آدمی ہر شب اس طرح سوتے ہیں کہ فرشِ زمین ان کا بچھونا اور سقفِ آسمان اُن کا اوڑھنا ہوتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوستان میں آٹھ کروڑ آدمی ایسے ہیں جو اڑتالیس گھنٹے میں ایک دفعہ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ کیا سائنس کی ترقی سے ہندوستان کے مصائب بڑھ گئے یا کم ہوگئے۔ اور ہندوستان پر کیا موقوف ہے تمام دنیا میں جہاں جائیے آپ کو یہی حقیقت نظر آئے گی ع۔

اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

حقیقت یہ ہے کہ سائنس شمشیرِ دو دم ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے مہالک مضرات اگر اس کے مفادسی زیادہ نہیں تو مساوی تو ضرور ہیں۔ اس لئے انسان کو اس کے مہالک مضرات سے بچانے کے لئے خود اس کی روشنی کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انسان کو وحی آلہی کی ہدایت کی روشنی کی ضرورت ہے اور یہی مذہب ہے۔

قصہ مختصر خود یورپ اور مغربی دنیا کو ہلاکت سے بچانے کے لئے اس وقت صحیح اور سچی مذہبی سپرٹ کی ضرورت ہے اور مغرب میں جو فساد اور بے اطمینانی رونما ہو رہی ہے اس کا تریاق مذہب کے پاس ہے اس لئے دنیا کو غلامی اور جبر و استبداد، ظلم و فساد، تشکیک و اضطراب سے نجات دلانے کے لئے مذہب کو جلاوطن کرنے کی بجائے مذہب کے قریب لانے کی ضرورت ہے۔ اربابِ بصیرت سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اس وقت انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ شک اور الحاد کا جو اسے کامل تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہا ہے دوسرا راستہ مذہب میں ایمان و ایقان کا جو اسے اس دلدل سے نکال کر حقیقی ترقی کی شاہراہ پر لے جا سکتا ہے اور اس پر چل کر بنی نوع الانسان ایک دفعہ پھر اخوت و مساوات کے بھولے ہوئے سبق کو ازبر کر کے خدا کی بادشاہت کے قیام کو حقیقت ثابتہ بنا سکتے ہیں۔ مذہب نے انسان کے سامنے ایک بلند مطمحِ نظر رکھ دیا ہے۔ خدائی بادشاہت کا قیام، دنیا کو عدل و مساوات سے معمور کرنا بنی نوع الانسان کو بھائی بھائی بنا کر مصیبت و بیماری کو جلاوطن کرنا۔ کالے اور گورے، اسود و احمر اور امیر و غریب کے امتیازات کو بالکل مٹا کر ان کی جگہ عمل صالح کے امتیاز کو قائم کرنا۔ مہذب انسان کو دیکھنا ہے کہ کیا وہ اس مطمحِ نظر کے حصول کے لئے اپنی مساعی کو وقف کر کے اس دنیا کو جنت ارضی بنانا چاہتا ہے یا اس کے مقابل دوسرا راستہ اختیار کر کے دنیا کو جہنم بنا کر اسے تباہی کے گڑھے میں دھکیل کر خود بھی تباہ و برباد ہونا چاہتا ہے۔ اس انتخاب پر دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے۔ حق و باطل کی قوتیں ایک آخری اور فیصلہ کن کشمکش میں مبتلا ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حق ہمیشہ بے سروسامان رہا ہے اور خیلِ باطل ہمیشہ اپنی قوت کے گھمنڈ اور ساز و سامان کے غرور میں مست رہا ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ حق کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے۔

وہ زمانہ قریب ہے جب مذہب کے مخالفین اور ان کے دوسرے ہم خیال سائنس دانوں کو یہ معلوم ہوگا کہ مذہب سے موجودہ ہجر و بعد ایک عارضی اور ناپائیدار حالت تھی جس کا دور ہونا ایسا ہی بدیہی تھا جیسا کہ طلوعِ آفتاب سے ظلمتِ شب کا۔ فافہم و تدبر

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

محمد علی

مسز براؤننگ نے چارلز کنگزلے سے پوچھا "تمہاری زندگی کا راز کیا ہے؟ مجھے بتاؤ کہ میں بھی اپنی زندگی کو ویسی ہی خوشنما بنا لوں"۔ اس نے کہا "میرا ایک دوست تھا"

جذباتِ امجد

باغباں کی منت سے آپ کو رہا پایا ۔ جس نے غنچۂ دل کو باغِ دل کشا پایا

تیرے وصل کی خواہش اک غلط نمائش ہے ۔ اپنے آپ کو تجھ سے میں نے کب جدا پایا

آنکھ بند ہونے پر دید کی تمنا ہے ۔ آنکھ رکھ کے کیا دیکھا زندگی میں کیا پایا

ہم تو صاف کہہ دیں گے مل گیا خدا اس کو ۔ جس نے اس خدائی میں بندۂ خدا پایا

حیلہ ہاتھ آتا ہے خوب، پابوسی کا ۔ رکھ دیا قدم پر سر جب انہیں خفا پایا

ناامیدی و امید ساتھ ساتھ چلتی ہیں ۔ بارہا اسے کھویا اور بارہا پایا

سانس جس کو کہتے ہیں ایک پھانس ہے دل میں ۔ زندگی کے دھوکے میں موت کا مزا پایا

گرچہ یہ مسلّم ہے علم ایک نقطہ ہے ۔ نقطۂ نظر اک کا ایک سے جدا پایا

جستجو ہی اے امجدؔ رازِ کامیابی ہے
جس نے جابجا ڈھونڈا اس نے جابجا پایا

امجد

عطر کی شیشی

ایک شام احمد انار کلی میں سے گزر رہا تھا۔ جب پیر بخش بوٹ فروش کی دکان کے پاس پہنچا تو سامنے سے پہلے ایک ٹانگا پھر ایک موٹر، پھر چند بائیسکل والے پھر دو ایک اور موٹریں آگئیں۔ پیچھے سے بھی ٹانگوں کی گھنٹیاں، موٹروں کے ہارن آوازیں دینے لگے۔ آمد و رفت رک گئی۔ احمد کو بھی بائیسکل سے اترنا پڑا۔ وہ اتر کے داہنی طرف کو ہو لیا۔ بچتا بچاتا دس قدم بڑھا۔ مگر پھر وہی سماں تھا موٹر ہی موٹر، سائیکل ہی سائیکل! اس نے سوچا کہ ایک آدھ منٹ ٹھہر ہی لیا جائے تو اچھا ہوگا چنانچہ گدی پر کہنی ٹیک کر اور دائیں طرف کی دکانوں کے بالکل ہی قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ موٹر ٹانگے گزرتے گئے کہ اتنے میں اس کو پیچھے سے کسی نے آواز دی "بابو صاحب ذری بائیسکل کو سنبھالئے یہ چیزیں نہ گرا دے" مڑ کے جو دیکھا تو وہ کباڑیے کی دکان تھی اور سائیکل تھا کہ اس کے کئی ایک پیتل اور چینی کے ظروف سے جو باہر چھوٹی چھوٹی تپائیوں پر دھرے تھے، بہت ہی نزدیک ہو رہا تھا۔ یونہی ایک آدھ انچ کی کسر رہ گئی تھی۔

احمد نے جلدی سے سائیکل اپنی طرف گھسیٹ لیا اور پھر ان برتنوں کو دیکھنے لگا جو قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی الماری تھی۔ اس میں پیالیاں، گلاس، چمچے گلدان وغیرہ پڑے تھے۔ احمد کی نظر پھسلتی ہوئی نیچے جو آئی تو کتابوں پر پڑی جو وہاں قطاروں میں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ رسالے بھی تھے۔ پاس ہی ایک آدھ چاء دانی پڑی تھی، دو ایک رنگ برنگ کے انڈے دان تھے۔ احمد کبھی کبھار اس دکان سے کوئی چیز خرید لیا کرتا تھا۔ گزشتہ سال ہی ایک دری خریدی تھی، پھر دو ایک ماہ ہوئے ایک تپائی۔ اور یوں اکیلی دُکیلی چیز بھی اِدھر اُدھر گزرتے خرید لیا کرتا تھا۔ چنانچہ دوکان دار نے اسے پہچان لیا۔ کہنے لگا "اوہو آپ ہیں! معاف کیجئے چیزیں........" احمد نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں۔ وہ تو کوئی بات نہیں" اور پھر بات ٹالنے کو "کہو کوئی نئی چیز ہے؟" "دیکھئے" دکان دار بولا "بہت کچھ ہے یہ آپ نے پیالی دیکھی؟ اینمل کی ہے، چین کی بنی ہوئی ہے۔ ایک انگریز جا رہا تھا اسی کے سامان میں آئی ہے دیکھئے!"

احمد نے اسے دیکھا مگر پسند نہ آئی، کہنے لگا کچھ اور دکھاؤ، دکان دار نے ایک پاس ہی پڑی ہوئی شیشی اٹھا کر کہا "یہ دیکھئے یہ بھی دُبئی سے ہاتھ لگی ہے۔ عطر کی شیشی ہے۔ بڑی عمدہ شئے ہے۔ آپ اوپر سے دبائیں تو اس چھوٹی سی موری میں سے پھوار نکلے گی۔ بہت قابل پسند ہے" احمد نے اسے پکڑ لیا۔ بدن شیشے کا تھا۔ ڈھکنا پیتل کا۔ اندر ایک نلی تھی۔ اوپر ڈھکنے میں وہی نلی نکل کر، ایک انچ اوپر ایک گول ٹوپی میں ختم ہو جاتی تھی۔ پہلو میں ایک

سوراخ تھا۔ احمد نے پہلے بھی اس قسم کی شیشی دیکھی تھی۔ اس نے خیال کیا چیز تو اچھی ہے اور ہے بھی سالم۔ نئی معلوم ہوتی ہے لے لیتے ہیں۔ بہار کو دے دیں گے۔ اسے ہے بھی خوشبو سے شوق۔ بہت پسند کرے گی۔

بہار اختر اس کے خالو کی بھتیجی تھی۔ بہار کے والدین فوت ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنے تایا کے گھر رہتی تھی۔ اس کی والدہ اور خالہ نے جو پہلے ہی سے لاہور میں تھیں، مل کر مزنگ میں ایک بڑا سا گھر لے لیا تھا۔ گھر میں بڑا صحن تھا۔ تین طرف کمرے تھے اور چوتھی طرف باورچی خانہ اور غسل خانے۔ ایک طرف احمد کی خالہ اور ان کا خاندان رہتا تھا اور بالمقابل احمد اور باقی کنبہ۔ تیسری طرف مردانہ تھا۔ بیرونی دروازے کے دائیں بائیں دو دیوان خانے تھے۔ دایاں احمد کے والد کا اور بایاں اس کے خالو کا۔ دوسری منزل میں بھی کمرے اسی لحاظ سے تقسیم کئے گئے تھے۔

احمد شیشی خرید کر نیلے گنبد کی طرف چلا۔ اب بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ سائیکل پر چڑھ بیٹھا۔ ابھی چوک سے نہ گزرا تھا کہ خیال آیا یونہی خالی شیشی دینا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی کیا کہے گی؟ اگر چیز کسی کو پیش کی جائے تو پوری ہو یہ کیا کہ شیشی دے دی جائے اور عطر وہ ڈھونڈتی پھرے۔ خیال آتے ہی سائیکل سے اتر پڑا۔ واپس لوٹا۔ سیدھا بیلی رام کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے یاسمین کا عطر لیا۔ کیوں کہ یہ عطر اسے خود بہت پسند تھا اور اسے شک پڑتا تھا کہ بہار بھی ایک دن ایسنس آف جیسمن کی تعریف کر رہی تھی۔ شیشی لے اندر کی جیب میں حفاظت سے رکھی اور ایک خوشی کے احساس کے ساتھ سائیکل پر پھر سوار ہو گھر کو ہو لیا۔

راستے میں سوچتا آیا کہ اب بہار کو یہ عطر دیا کیسے جائے۔ شام کا وقت ہے وہ خالہ جان کے دالان میں کہیں ہو گی اور ضرور کسی کام میں مشغول ہو گی۔ یا شاید کھانا ہی کھا رہی ہو۔ یا شاید کہیں زہرا سے یا مجیدہ سے باتوں میں مشغول ہو گی۔ اور ان دونوں کے سامنے یہ چیز دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اگرچہ زہرا اور مجیدہ اس کی خالہ زاد بہنیں تھیں اور عمر میں بھی اس سے دو تین سال چھوٹی ہی ہوں گی۔ مگر بھئی اسے تو ان سے ڈر ہی لگتا تھا اور خصوصاً جب عید بھی گزر گئی اور اس نے کچھ بھی عیدی وغیرہ نہیں دی۔ مانا کہ عید کے دن اتفاق سے اس کا ایک پانچ روپے کا نوٹ کہیں گم ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں بٹوے میں سے کہاں چلا گیا، کہیں جیب سے نکل گیا یا ڈائری نکالتے وقت ساتھ ہی آگیا اور کہیں گر پڑا۔ بہرحال وہ نوٹ کھو ضرور گیا تھا۔ بہت جگہ تلاش کیا۔ مگر نہیں ملا۔ اپنے کمرے میں تو اس نے تمام جگہ ڈھونڈ ماری لیکن نشان تک نہیں ملا۔ مگر وہ کسی کو کیا بتاتا کہ روپے گم ہو گئے ہیں؟ اور پھر عید کے دن اسلم حمید، در اشرف آ گئے مجبور کر کے ساتھ لے گئے۔ کہیں ادھر، کہیں اُدھر، پھر حمید کے مکان پر چلے گئے۔ سب کی جیبوں سے کچھ روپیہ پیسہ تھا نکال لیا۔ جمع کر کے پھل اور رس گلے اور جانے کیا کیا منگوایا اور شام تک کھاتے رہے۔ عید کو پیسہ اس کے پاس خاک ہوتا!

گھر پہنچا تو سائیکل رکھ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا صحن کے دوسری طرف

بالمقابل دوسری منزل پر زہرا وغیرہ رہتی تھیں۔ دو کمرے تھے ایک بہار کا تھا ایک مجیدہ اور زہرا کا۔ کمروں کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں اس لئے احمد کے کمرے سے ان کمروں میں صاف نظر جاتی تھی۔ احمد کے ساتھ کا کمرہ محمودہ اور سعیدہ اس کی بہنوں کا تھا۔ اس نے کمرے میں روشنی کی اور کپڑے اتارنے شروع کئے۔ پہلے عطر اور وہ شیشی نکال کر اپنی میز کی دراز میں رکھ دی۔ پاجامہ پہنا، قمیص کے اوپر سویٹر پہنا۔ آرام کرسی پر بیٹھنے کو جھکا مگر پھر کھڑا ہو گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ کھڑکی میں سے صحن میں جھانکا، باورچی خانہ روشن تھا۔ آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے کی کھڑکیاں بند تھیں، بہار کی اور زہرا کی بھی۔ البتہ روشندانوں سے پتا چلتا تھا بجلی جلتی ہے۔ وہیں کھڑا رہا۔ کبھی نیچے دیکھتا، کبھی سامنے، سوچتا کہ اب یہ کیسے بہار کو دے دی جائیں۔ باورچی خانہ میں اگر جاتا ہے تو وہاں تو دے نہیں سکتا۔ گھر کے سب لوگ ہوں گے۔ کیا کہیں گے! یہ نہ کہیں گے کہ یہ خاص طور پر کیوں تحفے تحائف دئے جا رہے ہیں۔ خیال آتا کہ اچھا کل سہی مگر دل نہ مانتا۔ یہی جی چاہتا کہ ابھی دے دی جائیں ابھی۔ ابھی۔ تو کیسے؟ صحن میں جا کے اگر ٹہلنے لگ جائے تو شاید بہار ادھر ادھر گزرتی مل جائے مگر اس اچانک تحفہ سے وہ کیا سمجھے گی؟ سمجھے گی کیا! یہی کہ میں بازار سے گزر رہا تھا۔ یہ نظر پڑی تو اس کے لئے لیتا آیا۔ تو یہ سب کچھ کہنے کا کیسے موقع ملے گا؟ اور پھر وہ نہ کہے گی کہ میرے لئے کیوں خاص طور پر تکلیف کی۔ مگر یہ تو نہیں کہنے کی۔ بس میرا دل چاہا لے آیا۔ اور پھر اسے خوشبو پسند نہیں؟ اور خاص طور پر یاسمن کی؟ ہاں ہاں یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر فرض کرو اس نے انکار ہی کر دیا! اوہو! اگر واقعی انکار کر دے تو! آخر وہ کہہ بھی کیا سکتا ہے کہ ضرور لے لو۔ مجھے خوشی ہوگی اگر یہ عطر اور یہ شیشی لے لوگی! اچھا اگر وہ پوچھے کہ کیوں تمہیں کیوں خوشی ہوگی؟ مگر یہ بھی کبھی وہ پوچھ سکتی ہے؟ آخر اسے کچھ تو احساس ہوگا۔ بیسیوں دفعہ جب سے ہم یہاں رہنے لگے ہیں۔ اس نے مجھے یہاں کھڑکی کے پاس دیکھا ہے اور کئی دفعہ اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پکڑا بھی ہے اور پھر یہ نہ بھی ہو تو ہنسی کھیل میں سو دفعہ ہی تو وہ کسی خاص احساس کے زیر اثر میرے الفاظ کو سن کر اور میری نظر ہی اپنے چہرے پر گڑی ہوئی محسوس کر کے شرما چکی ہے۔ نہیں جی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ یہ پوچھے کہ بھئی تمہیں کیوں خوشی ہوگی۔ بس۔ ہو گی۔ اس سوال کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی، آخر اسے کیا معلوم ہے کہ مجھے شیشی دیکھتے ہی اس کا خیال آ گیا اور میں نے بلا تامل خرید لی اور پھر بلا مزید غور و خوض کے عطر بھی خرید لیا۔ کہیں یہ سب غلط ہی نہ ہو۔ وہ یہ نہ کہے کہ پاگل تو نہیں ہو گئے! مجھے شیشیاں دیتے پھرتے ہو! میں تمہاری رشتہ میں کیا ہوئی؟ لاحول ولا۔ یہ تو کبھی نہیں کہہ سکتی۔ آخر چار پانچ مہینے ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے، اور اس اثنا میں سینکڑوں دفعہ اکٹھے اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ تو خالہ جان ہی فرشتہ ہیں۔ انہوں نے پردہ وغیرہ لغویات کا سوال ہی نہیں اٹھایا زہرا مجیدہ کی طرح بہار سے بھی بے تکلفی رہی ہے مگر جی یہ بے تکلفی اور ہے، وہ بات ہی اور ہے۔ تو پھر کیا کروں؟ ..... "سوچتا، جھنجھلاتا، اٹھتا، بیٹھتا، کمرے میں چکر لگاتا مگر تسکین نہ ہوتی اور دل کسی طرح دما؛

کہ اب دلایا بھی ہوں تو اسے نہ دوں۔

یکدم کسی فوری خیال کے ماتحت کرسی گھسیٹ میز پر جا بیٹھا۔ قلم اٹھا پیڈ کھینچ کر کچھ لکھنا شروع کر دیا "پیاری بہار میں آج شام کو انار کلی۔۔۔۔" یہیں تک پہنچا تھا کہ خیالات نے وہ یورش کی کہ قلم رُک گیا۔ لاحول ولاقوۃ یہ کیا کرنے لگا تھا۔ خط۔ خط!! اور بہار کو!! وہ کیا کہتی! اور اگر کسی کو معلوم ہو جائے تو! فوراً ہی اس نے کاغذ پیڈ میں سے اکھاڑ کر پھاڑ دیا۔ پرزہ پرزہ کر کے نیچے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹوکری باہر کھینچ کر وہ پرزے چن لئے اور جو جو اُن میں سے بڑا تھا اس کو پھر پھاڑا۔ اس کے بعد کچھ پھر ٹوکری میں ڈال دئے۔ کچھ مٹھی میں رکھے۔ پھر پشت پر جو کھڑکی گلی میں کھلتی تھی اس میں سے ایک ایک کر کے پھینک دئے۔

مگر پشیمانی بہت محسوس کر رہا تھا۔ اور سوچتا تو دل کی حرکت تیز ہو جاتی۔ کہ یہ بھی کیا ہو جانے کو تھا۔ خط! وہ کیوں؟ اب جو سوچتا تو کوئی وجہ نہ ملتی۔ کوئی جواز نہ سوجھتا۔ اپنی عجلت پر اور اندھا دھند عجلت پر شرم آتی۔ لاحول و لا! کتنی بیوقوفی کرنے کو تھا۔ اور پھر پیاری بہار! واہ! پیاری بہار! میری پیاری بہار کیوں نہیں، میری جان سے پیاری بہار کیوں نہیں! وہ بھی کہتی اُلّو ہے کہیں کا۔ بالکل پاگل ہے بے شرم! فوراً ہی خالو کے پاس یا خالہ جان کے پاس چلی جاتی کہ دیکھئے یہ آپ کے بھانجے کیا کرتوت کر رہے ہیں۔ یا زہرہ اور مجیدہ سے کہتی یہ لو اپنے خالہ کے بیٹے کو دیکھو کیسے پیٹ سے پاؤں نکالے ہیں۔ زہرا اور مجیدہ! توبہ! قیامت آجاتی مگر یہ بات نہ انہیں بھولتی۔ کیا خالہ جان اور امی جان اور کیا محمودہ اور سعیدہ ایک آفت مچ جاتی۔ توبہ! کتنی غلطی کرنے کو تھا۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ یا شاید منہ پر مار دیتی کہ دفع ہو میرے سامنے سے شیشیاں لایا ہے کہیں سی۔۔۔۔ مگر یہ تو نہ ہوتا یہ تو کبھی نہ ہوتا۔۔۔۔ بہار تو ایسی نہیں ہے یوں تو بالکل نہ ہوتا اگر میں اسے پیش کر دیتا کہتا بہار لو یہ میں تمہارے واسطے لایا ہوں۔ یہ عطر دانی ہے یہ یاسمن کا عطر ہے یاسمن نہیں پسند ہے نا۔ وہی ہے۔ یہ لو۔ اس شیشی کو کھول کر اس میں عطر ڈال دینا پھر بند کر کے اس گول سی ٹوپی کو دبا دینا۔ یہ ہے نا چھوٹا سا منہ بنا ہوا۔ اس میں ایک باریک سوراخ ہے۔ بس اس میں سے پھوار نکلے گی کپڑوں میں لگا لینا۔ دوپٹے میں لگا لینا۔۔۔۔۔۔ بستر پر نیم دراز یہ سوچ رہا تھا۔ یہاں تک پہنچا تھا کہ فوراً خیال آیا کہ کیا بک رہا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ کیا ہو گیا دماغ کو۔ یہ بھی کیا بچپن ہے۔ لڑکیوں کی طرح! بیہودہ! جذبات پرستی! دوپٹہ میں لگا لو۔ کیوں نہ بالوں میں لگا لو، ہاتھوں پر انڈیل کر منہ پر اُبٹنے کی طرح مل لو۔ دیوار سے کھینچ مارتی۔۔۔۔ تو پھر لیا ہی کیوں تھا۔۔۔۔ لینا ہی نہ تھا۔۔۔۔۔۔ اس وقت نہ سمجھ آئی تھی۔

یونہی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ صبح سے کچھ کھایا نہ تھا۔ اس دن دوپہر کو کالج میں کوئی جلسہ تھا اس لئے گھر آکے چاء بھی نہ پی سکا تھا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر پلنگ پر سے ہلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شاید خیالات نے حرکت کرنے کے ارادہ کو بھی دبا دیا تھا۔ کیوں کہ دماغ میں خیالات اُڑے چلے جاتے تھے۔ ایسی سرعت سے تانا بانا تن جاتے تھے کہ احمد سے کچھ بن نہ

آتا تھا البتہ گزشتہ آدھ گھنٹے میں جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا۔ اس سے اس کے دل میں ایک جھجک سی پیدا ہوگئی تھی۔ سوچتا کہ اگر میں دے ہی دیتا تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں کہتا اس دن تم ذکر کر رہی تھیں ناکہ تمہارا عطر ختم ہوگیا ہے۔ یہ شیشی مجھے آج یونہی ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس لئے ساتھ میں تمہارے لئے عطر بھی خرید لایا۔ ضرور لے لیتی۔ اس میں بات ہی کیا تھی: پھر وہ کل یا پرسوں یا جس دن کپڑے بدلتی تو خوشبو لگاتی۔ مگر اسے خوشبو لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے تو جب کبھی اس کے قریب ہونے کا اتفاق ہوا ہے اس سے کوئی خوشبو آتی ضرور رہی محسوس ہوئی ہے۔ مثلاً اس دن جب صحن میں محمودہ اس کا تعاقب کر رہی تھی، شاید بہار نے محمودہ کی سہیلی کا خط چھین لیا تھا، تو میرے پاس سے بہار، بہت ہی قریب ہو کر گزری تھی بلکہ پھیرے گرد تو ان دونوں نے دو تین چکر بھی لگائے تھے تو کیسی بھینی بھینی سی لپٹ آئی تھی۔ کسی نامعلوم ہی خوشبو کی لپٹ تھی۔ دونوں کے دوپٹے اتر گئے تھے۔ اس ہاتھ سے دوپٹہ سنبھال لیتی کبھی اُس سے۔ کیسا دلکش نظارہ تھا۔ بہار گرگابی پہنے ہوئے تھی مگر پھر بھی کتنا تیز دوڑتی تھی۔ ہرنی کی طرح چھلانگیں لگا رہی تھی۔ دوڑ میں اس کے جسم میں ایسی لچک پیدا ہوتی جیسے پانی میں کوئی ہموار لہر اٹھ رہی ہے۔ کیا بل کھاتی جاتی تھی۔ سارا صحن رقص کرتا دکھائی دیتا تھا۔ جب کبھی کسی چارپائی کے آر پار کھڑے ہوکر محمودہ کو دھوکا دینے کی غرض سے ادھر ادھر اپنے بدن کو جھکاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ننھا سا خوش رنگ درخت ہوا میں جھوم رہا ہے۔ احمد ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ بہار کا جسم نہیں کسی نغمہ کی لے ہے۔ مگر اب جو خیال کرتا تو ایسے محسوس ہوتا کہ کوئی بہار کو چھینے لئے جا رہا ہے۔ ․ ․ ․ ․ ․ ․ ․

․ ․ پھر خط کا خیال آجاتا تو وہ دم بخود ہو کے رہ جاتا۔ کتنا تہور! کتنی ناسمجھی! اور پھر کس بے تکلف طور پر خط شروع کر دیا۔ "پیاری بہار" جیسے اسے کبھی اور کچھ کہا ہی نہیں۔ وہ بھی کیا کہتی؟ احمد یہ بار بار سوچتا۔ وہ بھی کیا کہتی! اسے کیا پتا ہے کہ وہ چھپ چھپ کے اپنے کمرے سے اسے صحن میں چلتے پھرتے دیکھا کرتا ہے۔ یا جب کبھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی ہو، کچھ بُن رہی ہو ․ ․ ․ ․ ․ ․ اسے تو پتا نہیں ․ ․ ․ ․ ․ اسے کیا پتا! احمد کو اب محسوس ہونا شروع ہوا کہ اسے بہار سے کتنی محبت ہے۔ مگر کہاں بہار اور کہاں وہ! خالہ جان! زہرا! مجیدہ! خالو جان! امی جان! محمودہ! سعیدہ! اتنی آنکھیں! اور وہ بیتاز! ․ ․ ․ ․ ․ کہاں بہار اپنے شباب سے بھی بے پروا! اور کہاں وہ خود ․ ․ ․ ․ ․ ․ ․ اور وہ خط! ․ ․ ․ ․ ․ ․

کمرے میں روشنی تھی۔ احمد کی نظر چھت سے ہٹ کر دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں پر رکتی ہٹتی، پھر پڑتی۔ مگر احمد ایسے محسوس کرتا جیسے وہ کہیں سخت تاریکی میں جا رہا ہے اور اسے راستہ معلوم نہیں۔ اس کی اپنی بیچارگی اور پھر خط لکھنے کی ندامت مستقبل کی دھندلی فضا میں اسے لے جا رہی تھی مگر اسے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ فقط دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ خود ہی ایک خیال اس کے دماغ پر مسلط ہو جا رہا تھا کہ اگر وہ شیشی بہار کو دے دیتا تو شاید اس چھوٹی سی رنگین دنیا میں جو بہار کے وجود سے مہک رہی تھی ایک تہلکہ مچ جاتا۔

وہ کچھ دیر ویسے ہی بستر پر بغیر کسی خیال کے لیٹا رہا۔ پھر اٹھا اور دروازہ کھول کر ان دونوں شیشیوں کو نکال کر اپنے ٹرنک میں سب کپڑوں کے نیچے ایک گوشے میں چھپا دیا۔

فیاض محمود

راحت کدہ

دل بادہ کشِ طرب نہیں ہے ہوتا تھا کبھی پر اب نہیں ہے

بے سود ہے جستجوئے راحت وہ راحتِ جاں ہی جب نہیں ہے

زخموں سے ہوں چور چور لیکن آلودۂ شکوہ لب نہیں ہے

خوشیاں تو بہت سی ہیں جہاں میں دل ہی کو مگر طلب نہیں ہے

جل بجھ کے تباہ ہو گیا دل افسردگی بے سبب نہیں ہے

کب آہِ سحر نہیں ہے ہمدم! کب گریۂ نیم شب نہیں ہے

جب دیکھو اثرؔ کو رو رہا ہے

مر جائے تو کچھ عجب نہیں ہے

اثر صہبائی

میرے ایک دوست

دوستوں کے معاملے میں مجھے دنیا سے بہت کچھ شکایت ہے۔ اُصولاً ہر معاہدے میں طرفین کی رضامندی ناگزیر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن مجھ سے ہمیشہ یہ سلوک ہُوا کہ کسی صاحب نے مجھے دوستی کے قابل سمجھا اور مجھ سے بغیر استشارہ کئے، مجھے بغیر اطلاع دئے، دوست بنا لیا۔ پھر اُن میں سے بعض تو اس قدر اخلاص و محبت کا ثبوت دیتے ہیں کہ دوست سے لے کر بلائے بے درماں بن جانے تک کے تمام منازل نہایت برق رفتاری کے ساتھ طے کر کے خود میرے گھر کو اپنا گھر تصور فرما لیتے ہیں۔ خیال کیجئے کہ لوؤں کے مہینے میں، بارہ بجے دوپہر کو میرے ایک کرم فرما قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ "اِدھر سے گزر رہا تھا، میں نے کہا آپ سے بھی ملتا چلوں!" میں سنتا ہوں اور اپنی اخلاقی بزدلی پر ماتم کرتا ہوں۔ کہ اللہ ایک یہ شخص ہے جو قصداً میرے مکان پر آنا بھی باعثِ عار سمجھتا ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود اس کی مہمانی کرنے پر مجبور ہوں۔ لیکن اس قسم کے علاوہ ایک دوسری قسم بھی ہے +

عزیز صاحب میرے ایک پرانے بلکہ "تاریخی" کرم فرما ہیں۔ ان کے متعلق اتنا تو بالکل یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسان ہیں اس لئے کہ عام انسانوں کی طرح وہ طویل القامت، مجبور الاکل اور "سگرٹ نوش" حیوان ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اُن میں چند خصوصیات ایسی بھی ہیں جو عام انسانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً چھ سال کے متواتر تعلق کے بعد بھی میں آج تک یہ پتا لگانے میں کامیاب نہیں ہُوا کہ عزیز صاحب کے ہونٹ ایک ازلی تبسم کے ساتھ اُلٹے کان کی طرف کیوں مائل رہتے ہیں۔ یا یہ کہ چلتے ہوئے اُن کا تمام جسم پیسا کے جھکے ہوئے مینار کی طرح اپنے مرکزِ ثقل کو مرکزِ حجم سے جدا رکھنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

پیشے کے اعتبار سے وکالت کو عزیز صاحب کی شمولیت سے سرفرازی حاصل ہے۔ لیکن اُن کے جاننے والوں میں سے ہر شخص کو یہ خوب معلوم ہے کہ انہوں نے یہ پیشہ محض اپنے "ذوقِ مقنّنی" کے لئے اختیار کیا ہے، ورنہ نہ وہ موکلوں کی زیادہ پروا کرتے ہیں نہ ان میں ہوشیاری و پرکاری جیسی "وکیلانہ" خصوصیات ہی موجود ہیں۔ لیکن اُن کی "سادگی" میں وہ حسن ہے جو بڑے سے بڑے وکیل کے "سنگھار" میں نہ ہوگا۔ ایک نیا موکل آتا ہے اور رسمی طور پر، محض رسمی طور پر، خواہش ظاہر کرتا ہے کہ وہ اُجرت کے متعلق جملہ امور طے کر لیں۔ لیکن عزیز صاحب ان ابتدائی مراحل کو اس قدر دلچسپی اور سرگرمی کے انداز میں طے کرتے ہیں کہ موکل کے دماغ میں اصل مسئلہ کے متعلق بہت ہی کم مواد باقی رہ جاتا ہے۔ ایک دن میں

موجود تھا کہ اُن کے بالاخانے پر جسے "وہ آفس" کہنے اور کہلوانے پر مصر ہیں، اُن کا ایک دوست ایک موکل کی حیثیت سے آیا اور ابتدائی جملوں کے بعد کہنے لگا "دیکھئے صاحب' دوستی اور بات ہے اور کام دوسری چیز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کام شروع کرنے سے پہلے تمام کا۔ وباری معاملات کا تصفیہ کرلیا جائے۔" میں سمجھ گیا کہ اُس کی مراد اجرت سے تھی۔ میں نے متوقع آنکھوں سے دیکھنا چاہا کہ عزیز صاحب کس قسم کا چالاک وکیلانہ جواب دیں گے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وکیل و موکل کے درمیان جو میز حائل تھی وہ عزیز صاحب کے پیہم پہلو بدلنے کی وجہ سے زلزلے کی سی کیفیات پیش کر رہی تھی۔ دوسرے لمحہ میں عزیز صاحب نے اپنے کان میں سے دیا سلائی کھینچی اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے چہرے سے وہ تمام سلوٹیں جو کان کریدتے وقت پیدا ہو جاتی ہیں دور ہوئیں۔ انہوں نے قلمدان میں سے اپنا قلم اٹھایا اور ریبنر پر اس کو بجاتے ہوئے نہایت بے باکی سے کہا "آپ نے سچ کہا میں خود بھی چاہتا ہوں کہ روپے پیسے کی بات چیت پہلے ہی طے ہو جائے۔" میں نہیں کہہ سکتا کہ موکل پر اس کا کیا اثر ہوا کم سے کم میں جملے کی 'نازپرور' سادگی سے یہ سمجھا کہ عزیز صاحب تلوّن کی سی باتیں کر رہے ہیں اور اُٹھ کر چلا آیا۔

لباس کے معاملے میں عزیز صاحب بہت "محتاط" واقع ہوئے ہیں۔ محتاط سے مراد میری یہ نہیں کہ وہ خوش سلیقگی کو نمایاں کرنا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ کپڑوں کا جوڑا ایک مرتبہ دُھل جانے کے بعد جس قدر طویل عرصے تک ایک بے نفس وکیل پہن سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ عرصے تک وہ اُس کی خدمات حاصل کرنے پر مصر رہتے ہیں۔ کپڑوں ہی کے سلسلے میں عزیز صاحب کی 'معاملہ فہمی' پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اُن کو یقین ہے کہ شیروانی اتار دینے کے بعد جس چیز پر لوگوں کی نظریں پڑتی ہیں وہ کُرتا ہوتا ہے نہ کہ بنیان۔ نتیجہ ظاہر ہے اگر کرتا ایک ہفتہ چل سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بنیان دو ہفتے تک نہ چل سکے۔ معاملہ لوگوں کو معلوم نہ ہوتا، اگر گرمی کی بدحواسیاں اُن کے کرتے کا گریبان نہ کھول دیا کریں۔ کیفیت سے قطع نظر عزیز صاحب کے پاس قریب قریب اجزائے لباس اُتنے ہی ہوتے ہیں جتنے ایک معمولی انسان کے پاس۔ خصوصاً رومال تو اُن کے لئے ایک ناگزیر چیز ہے۔ قلمی بڑے کھا کر، مرچ بھرے ہاتھ پونچھنے کے لئے نزلہ کے دنوں میں بینی پاک کا قائم مقام بننے کے لئے باغ میں بیٹھے ہوئے گیلی گھاس کو توڑتے رہنے کے بعد ہاتھوں کی مٹی اور سبزی صاف کرنے کے لئے ان کے پاس صرف ایک ہی چیز ہے یعنی ان کا رومال — ان متنوع فرائض کو انجام دینے کے بعد رومال میں ایک مخصوص کیفیت باقی رہ جاتی ہے۔ جسے منہ پھٹ لوگ سڑاند سے تعبیر کرتے ہیں۔ بیشتر حالات میں یہ سڑاند ان کی جیب ہی تک محدود رہتی ہے لیکن جب کبھی عزیز صاحب "ذوقِ مظاہرہ" سے مجبور ہو کر اپنے محبوب رومال کو سرِ مجلس ٹھپک ٹھپک کر گھٹنے پر سلا دیتے ہیں تو حاضرین کی ناک میں نکسیر پھوٹنے کی سی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ لباس کے سلسلے میں اُن کی دوسری خصوصیات بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں۔ مثلاً شیروانی میں ہمیشہ اوپر کے تین چار بٹن آپ کھلے پائیں گے۔ اُن کا شرعی پاجامہ ٹخنوں سے دو تین انچ اوپر ہوگا۔ اور "امریکن ٹو" کے شوز میں اُن کا سخت و کرخت پاؤں جرابوں سے ہمیشہ محروم
غالباً لباس سے عزیز صاحب کی بے اعتنائی یہ جتانے کی ایک کوشش ہے کہ انسان کی عزت اس کے لباس

پر موقوف نہیں۔ لاریب عزیز صاحب کا حلقۂ معتقدین ان کے جسم اور لباس میں خفیف سا تعلق نہ پاکر بھی اُن کی اسی قدر عزت کرسکتا ہے جتنی ایک لبادہ پوش انسان کی۔ اس لئے کہ عزیز صاحب کی دلچسپیاں اُن کے لباس کی ممنون نہیں بلکہ اُن میں اُن کے دماغی زوایا کی ترکیب نے چند ایسی خصوصیات پیدا کردی ہیں جو صرف اُن کی ہیں۔

عزیز صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی گھبراہٹ ہے یہ گھبراہٹ مختلف مقامات پر مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ تعارف کے مواقع پر، سراسیمگی کے اس قدر شدید آثار اُن پر طاری ہوتے ہیں کہ اس وقت کم ازکم ایک گز کے احاطے کے اندر ان کے قرب وجوار میں پڑی ہوئی ایک چیز محفوظ نہیں سمجھی جاسکتی۔ جس وارفتگی کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لئے وہ لپکتے ہیں اور جس شدتِ خلوص کا مظاہرہ وہ اپنی گرفت سے کرتے ہیں۔ اس کی مثال میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ عزیز صاحب کو ایک "نادرۂ روزگار" کی طرح اپنے ساتھ رکھنے کا میں عادی ہوں۔ ایک دن ان کے ہمراہ میں اپنے ایک دوست کے مکان پر گیا۔ اتفاقاً وہاں ایک اور صاحب جن کو نہ میں جانتا تھا اور نہ عزیز صاحب بیٹھے ہوئے دن کے دو بجے شیو بنا رہے تھے۔ صاحبِ خانہ نے میرا تعارف کرایا اور میں اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لئے مڑا۔ میں نے دیکھا کہ عزیز صاحب وہاں پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ عزیز صاحب میں ایک خاص بات ہے کہ وہ اگر کسی نشست کو پسند کرلیتے ہیں تو صاحبِ نشست کے اُٹھتے ہی بلا تکلف اپنی جگہ سے وہاں منتقل ہوجاتے ہیں۔ کچھ تو اس "جاگیری" کی لذّت سے سرشار ہوکر اور کچھ "شوقِ تعارف" سے بے تاب ہوکر وہ اپنی جگہ سے دوڑے۔ صاحبِ خانہ نے ان کا تعارف کرایا۔ ہمارے نو متعارف دوست، اس تمام عرصہ میں شیو کرتے رہے تھے۔ لیکن تکمیلِ تعارف کے بعد عزیز صاحب نے سب سے اہم سماجی فرض ادا کرنے کے لئے نہایت سُرعت کے ساتھ اس میز کا رخ کیا۔ جہاں شیشہ اور شیو کا دوسرا سامان رکھا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنے مقابل کو تیار نہ پاکر کچھ جھجکے۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے استرا چھینا اور آخر ہاتھ ملا کر چھوڑا۔ اس کشمکش میں شیشہ اور متفرق سامان میز پر سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

عزیز صاحب کی اس گھبراہٹ کے مناظر زیادہ تر شارعِ عام پر دکھائی دیتے ہیں۔ پٹڑی سے سڑک پر اور سڑک سے پٹڑی پر تانگوں اور موٹروں کی یورش سے بچنے کے لئے جیسا عجیب "رقصِ بسمل" اُن کے چلنے میں نمایاں ہوتا ہے اُس کی بہترین مثال کے طور پر میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ دہلی کے اس بازار میں سے جس کا نام ہی عزیز صاحب پر "حیائے دوشیزگی" کے تمام اثرات طاری کئے بغیر نہیں رہتا۔ ایک دن وہ گزر رہے تھے۔ حسبِ معمول میں اُن کے ساتھ تھا۔ لوگوں پر یہ واضح کردینے کے لئے کہ وہ محض کام کی غرض سے گزر رہے ہیں انہوں نے اپنی رفتار غیر معمولی طور پر تیز کردی اور ساتھ ہی ساتھ بہت تندی اور انہماک کے ساتھ میری طرف منہ کئے باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ عزیز صاحب کے بالکل سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک تانگہ پٹڑی سے لگا کھڑا ہے۔ اس تانگے میں ایک نوجوان عورت پیچھے کی نشست پر اپنے سامنے کچھ برتن رکھے ہوئے بیٹھی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کررہی

ہے۔ یس بربنائے احتیاط پٹڑی پر ہو گیا۔ لیکن عزیز صاحب کی گفتگو بہت شدّت سے جاری تھی اور وہ اُس میں اس قدر منہمک تھے کہ گردوپیش سے بالکل بے خبر تھے۔ یکایک عزیز صاحب کی پنڈلیوں کا وسطی حصہ نہایت بے دردی کے ساتھ تانگے سے متصادم ہُوا اور طرفۃ العین میں اُن کے دونوں ہاتھ ایک عجیب بے کسی کے عالم میں اُس عورت کے گھٹنوں سے کچھ اوپر جا ٹکے۔ جھٹکے سے عزیز صاحب کی ترکی ٹوپی اُس کی گود میں پہنچ چکی تھی عزیز صاحب کا منہ اُسی زاویۂ منفرجہ پر قائم تھا جہاں اُسے اس حادثہ سے پہلے اُن کی گفتگو پہنچا چکی تھی، رہیں اُن کی آنکھیں تو اُن کی کچھ نہ پوچھئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی مسافر کو اچانک جنگل میں شیر مل گیا یا کسی جواری کو ایک دم پولیس نے آپکڑا۔ اُن کی مسترحمانہ اور ملتجیانہ وضع یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کہیں پہلے اس عورت کو گزند پہنچا چکے ہیں اور اب بمنّت معافی کے خواستگار ہیں میں نے یہ مضحکہ انگیز منظر دیکھا اور اپنے تئیں بے قابو پاکر آگے نکل گیا۔ کوئی دو منٹ کے بعد عزیز صاحب کا ہاتھ میرے شانے پر پڑا۔ وہ کہہ رہے تھے "کس قدر بیہودگی ہوئی ہے یار! توبہ"

قدرت نے عزیز صاحب کو تخیل بھی بہت قوی عطا کیا ہے اکثر یوں ہوتا ہے کہ وہ تنہا مقامات میں جہاں آدمی کا گزر نہیں ہوتا۔ اپنے کسی دوست کو آتا ہُوا تصور کر لیتے ہیں۔ اور اس کے سلام کے جواب میں مُسکراتے ہوئے، بہت تپاک کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر خود بھی سلام کرتے ہیں۔ اس روز شام کے چھ بجے باغ میں عزیز صاحب کا اپنے "ہوائی" دوست کو سلام کرنا، پھر گھبرا کر ہمیں دیکھنا اور عرق آلود ہو جانا آسانی سے بھولنے والی چیز نہیں۔ تخیل کی فراوانی سے جہاں اُن کی حرکتیں بظاہر غیر معقول معلوم ہوتی ہیں۔ وہیں بعض اوقات ان کے کلام میں بھی گنجلک پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ ہوسٹل کے ایک کمرے میں، ایک نہایت سنجیدہ گفتگو کے درمیان اُن کا یکایک کمرے والے سے یہ پوچھ بیٹھنا کہ "آپ یہاں آخر پڑھتے کیسے ہوں گے۔" اُن کے ہر مداح کو یاد ہے۔ عزیز صاحب کے بہترین مفسروں کی شروح اور حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے کو سمجھنے سے پہلے محذوفات اور مقدرات کا ایک سلسلہ روپوش ماننا پڑے گا۔

(۱) کمرے کے قریب گرجا گھر کی موجودگی

(۲) گرجا گھر میں گھنٹے کی موجودگی

(۳) گھنٹے کا ہر اتوار کو بجنا

(۴) آواز سے کچھ عرصے کے لئے مطالعے میں خلل پڑنا۔

(۵) کمرے میں رہنے والے کا امتحان کی تیاری کرنے کی وجہ سے عین گھنٹہ بجنے کے وقت پڑھنے پر مجبور ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اسی ضمن میں ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ عزیز صاحب مجلس میں بیٹھے بیٹھے یا بازار میں چلتے چلتے، بعض اوقات اس قدر ناموزون طریقے پر اپنے آپ سے گربز کر جاتے ہیں کہ ان کے ساتھیوں کی آنکھیں حیرت و

تعجب سے "چراغ کعبہ" بن کے رہ جاتی ہیں۔ عدالت میں گزرے ہوئے یا پیش آنے والے واقعات کو، گھر میں رونما شدہ حادثات کو، یا آئندہ سے متعلق اپنے ارادوں کو، عزیز صاحب اپنی پوری وارفتگی کے انداز میں ہاتھ ہلانے منہ بنانے، آنکھیں بند کر کے کھول دینے، گردن میں خم پیدا کرنے اور اسی قسم کی دوسری حرکات بے رُسوا کرنے کے عادی ہیں ـــــــ اس حال میں کہ اُن سے اس قسم کی کسی چیز کی توقع ان مواقع پر نہیں کی جاتی۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے عزیز صاحب کی صحتِ دماغ کے متعلق اپنے شبہات ایک خوف زدہ سرگوشی میں مجھ سے بیان کئے معلوم ہوا کہ ایک شب اس نے جامع مسجد کے قریب میرے دوست کو تنہا، خود اپنی موجودگی ہی میں تقریر کرتے ہوئے پایا تھا

شدتِ تخیل کے بالکل برعکس عزیز صاحب کی قوتِ فہم بہت ناتواں ہے۔ عام طور پر اپنی نافہمی کو وہ اپنی خودداری سے چھپا لینے کے عادی ہیں۔ اگر کسی جملہ کا مطلب ان کے دماغ تک نہ پہنچ سکے تو عزیز صاحب ایک دانشمند انداز کے ساتھ مسکرا کر اپنے پاؤں پر سے میل اتارنے لگتے ہیں یا موضوعِ گفتگو بدل دیتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ہمیشہ نہ میل اتارنا ممکن ہے نہ موضوعِ گفتگو کو بدل دینا۔ ان مشکلوں میں جس قسم کا سامانِ تفریح ان کی ذلت سے پیدا ہوتا ہے اس کا شاہکار نذر ہے۔ کالج کی اردو ڈرامیٹک کلب نے گزشتہ سال "Pantomimie" (خاموش ڈراما) دکھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے عزیز صاحب کو دعوت دی کہ آپ بھی چلئے۔ انہوں نے ناپسندیدگی کے ساتھ، انکار کیا۔ میں نے پوچھا "کیوں کیا آپ کو پسند نہیں؟ یا پہلے کبھی دیکھ چکے ہیں؟" عزیز صاحب کے جواب نے میرے حواس منتشر کر دئے،

"نہ کبھی دیکھا ہے نہ پڑھا"

"نہ پڑھا کیا معنی؟"

میں قریب قریب چیخ اٹھا۔ عزیز صاحب نے ایک مطمئن کن انداز میں کہا "ارے میاں شیکسپیر کا ڈراما ہے نا!"

غالباً نافہمی ہی کی وجہ سے عزیز صاحب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن سے جو جملہ کہا جائے وہ تکمیل کے لحاظ سے کسی اضافے کا محتاج نہ ہو۔ اور جب کبھی اُن کے سامنے کوئی ایسا جملہ بولا جاتا ہے جس کا مفہوم الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے تو عزیز صاحب اس "ایجاز" کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے جہل اور حماقت کے تمام شواہد اپنے چہرے پر پھیلا کر جملے کی لغویت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک روز کیرم (Carrum) کھیلتے ہوئے یکایک عزیز صاحب پر عالمِ تجسس کی سی کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے پوچھا "کیوں بھئی یہ سٹرائیکر (Striker) کس چیز کا بنا ہوا ہوتا ہے؟ ہاتھی دانت کا؟"

"نہیں ہڈی کا"

"آدمی کی ہڈی کا؟"

(ایک زبردست قہقہہ)

"ہیں اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے!"

"عزیز صاحب یہ کسی جانور کی ہڈی کا بنایا جاتا ہے"۔

"تو مرد خدا پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ جانور کی ہڈی کا ہوتا ہے"!

عزیز صاحب کو "ہندوستانی تماشوں" سے ایک فنی عداوت ہے۔ لیکن دوستوں کی دعوت کو رد کرنا اُن کا شعار نہیں۔ ایک دن محض ان کی تنقید کا لطف اٹھانے کے لئے ان سے کہہ دیا گیا کہ آج شام آپ کو ایک نہایت دلچسپ ہندوستانی تماشا دکھایا جائے گا۔ عزیز صاحب حلوا سوہن، پسینے کی بوز، اور قلاقند کی چڑ رکھنے والے لوگوں کی طرح بہت برا بھلا کہتے ہوئے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ڈراما ہالیوڈ کی بہترین خاموش تصاویر میں سے تھا عزیز صاحب نے حسبِ توقع ڈراما شروع ہوتے ہی اپنی کوفت اور ملال کا اظہار کیا "دیکھتے ہیں آپ، یہ ہے آپ کا ہندوستانی ڈراما لاحول ولا قوۃ"، اس جملے سے قدرتی طور پر جو قہقہہ عزیز صاحب کے متعدد ساتھیوں میں پیدا ہوا اُسے انہوں نے اُس شخص کا مضحکہ سمجھا جو ہم سب کو ہندوستانی تماشا دکھانے کی حماقت کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ وہ خود بھی بے ساختہ طور پر رانوں پر ہاتھ مار مار کر گردن کو جھٹکے دے دے کر ہنستے ہوئے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بار بار فرماتے رہے "کیا اچھا ہندوستانی تماشا ہے بھائی۔ واہ" اُن کے قہقہوں سے ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور بلا مبالغہ نہ صرف اُن کے ساتھی بلکہ قریب بیٹھنے والے لوگ بھی کافی دیر تک ہنسا کئے۔

اب تک عزیز صاحب کی جو صفات بیان کی گئیں وہ "انسانی" نہ تھیں یعنی ان صفات کا ان کی ذات سے بحیثیت انسان ہونے کے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن میں ابتدا ہی میں کہہ چکا ہوں کہ عزیز صاحب کے انسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مزید ثبوت اُس غیر معمولی جذبۂ ہمدردی سے ملتا ہے، جس کا فقدان انسانیت کے منافی سمجھا جاتا ہے اور جو عزیز صاحب میں بہ فضلِ خدا بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بیشتر یہ ہمدردی صرف ناک سکڑ جانے، ہونٹوں کے کچھ پھیل جانے، یا انتہائی صورتوں میں آنکھ بند ہو جانے تک ہی محدود رہتی ہے۔ لیکن جب کبھی ان کا یہ درد لفظوں میں تبدیل ہو جائے تو ہمدردی کا مقصدِ اعلیٰ یعنی مخاطب کا غم غلط کر دینا بہت خوبصورتی کے ساتھ پورا ہو جاتا ہے۔ کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ عزیز صاحب کے پاس ان کا ایک دوست ملاقات کے لئے گیا۔ انہوں نے شکایتہً کہا کہ آپ بہت دنوں میں تشریف لائے۔

اس شخص نے کہا "جی ہاں۔ کیا عرض کروں۔ ایک ایسا ہی حادثہ پیش آ گیا تھا"

عزیز صاحب ہمدردی سے متاثر ہو کر بولے "خیریت؟"

"میری دادی کا انتقال ہو گیا تھا ———"

ہیں! کیا کہا آپ نے؟ ——— آپ کی دادی کا انتقال ہو گیا؟

مصوّر۔ شرید کیا تم بہت مصروف ہو؟

شرید۔ نہیں، کیا کوئی نئی تصویر دکھانا چاہتے ہو؟

مصوّر۔ ایک نہیں دس مگر شرط یہ ہے کہ تم کسی سے ذکر نہ کرنا

شرید۔ یہ کیوں؟

مصوّر۔ یہ دس تصویریں میری تمام زندگی کا شاہ کار ہی نہیں میری زندگی ہیں۔ جن تصویروں کو فروخت کرکے روزی کماتا ہوں وہ نقلی ہیں یہ اصلی ہیں۔ میری مشہور تصویریں اندھوں کے لئے ہیں میری یہ تصویریں جو اب تمہیں دکھاؤں گا صرف ان کے لئے ہیں جن کی آنکھیں سطح سے نیچے کی چیزیں دیکھ سکتی ہیں۔

شرید۔ تصویر کو سطح کے نیچے سے کیا تعلق؟

مصوّر۔ یہی تو بات ہے۔ یہ تصویریں کسی شخص کی نہیں، کسی مکان کی نہیں، کسی باغ کی نہیں شخص، مکان، باغ سب کچھ ان تصویروں میں موجود ہے مگر مکان یا باغ کی حیثیت سے نہیں۔ یہ تصویریں **وقت** کی تصویریں ہیں۔ دنیا میں کوئی نہیں جو وقت کو دیکھ سکے۔ مگر میرا دعویٰ ہے کہ میں نہ صرف وقت کو دیکھ سکتا ہوں بلکہ اوروں کو بھی دکھا سکتا ہوں۔ آؤ اب تصویریں دیکھو۔

(دونوں اندر ایک کمرے میں جاتے ہیں)

کمرہ بالکل تاریک ہے۔ مصور کے پاس ایک بجلی کی مشعل (Torch) ہے۔ اس کی روشنی زمین پر پاؤں کے آگے آگے پڑتی جاتی ہے۔ یک لخت مصور ایک طرف مڑ کر مشعل کی روشنی بند کر دیتا ہے۔

مصوّر۔ لو اب پہلی تصویر تمہیں دکھاتا ہوں (مصور ایک پردہ ہٹا کر ایک تصویر والے چوکھٹے پر روشنی ڈالتا ہے)

شرید۔ اف، غضب، ستم۔ یہ وقت کس پر گزرا؟

مصور۔ ایک حسین عورت پر جس کا شوہر مالدار تھا۔

شرید۔ کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ حسن اور دولت نے اس عورت کو یوں مقید کر لیا جیسے پنجرے میں کوئی طوطا ہو اور ماہ و سال میاں مٹھو، میاں مٹھو کہتا اسی پنجرے میں مر جائے یعنی انسان سی یہ عورت طوطا بن گئی؟ کس قدر تم بے رحم ہو۔

مصوّر۔ بے رحم ضرور ہوں مگر کس قدر سچا ہوں اور تم نے ابھی پورا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا اور غور سے دیکھو۔

شرید۔ ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ حسن و دولت کی قید نہیں بلکہ ان سے سخت تر قید ہے۔ سب سے کڑی زنجیر ایک مقررہ طرزِ زندگی ہے یعنی مقررہ معمول کہ نوکروں سے کام لیا جا رہا ہے۔ کھانے پر مہمان آ رہے ہیں کہیں جا رہے ہیں، کسی کو بلا رہے ہیں عزت کی آرزو ہے، دولت کے کم ہونے کا ڈر ہے، اُف ظالم یہ خیال تمہیں کیسے آیا کہ مقررہ معمول روحِ انسانی کو کچا کھا جانے والی ڈائن ہے؟

مصور۔ یہ نہ پوچھو۔ ابھی تم تصویر کو ذرا اور غور سے دیکھو

شرید۔ دیکھا، خوب دیکھا، او بے رحم ظالم خدا کے لئے اس تصویر کو پھاڑ۔ میں تو چند منٹ اگر اور دیکھوں گا (حالانکہ کافی سنگدل ہوں) تو پاگل ہو جاؤں گا۔ یہی مطلب ہے نا کہ چالیس سال کا ایک مقررہ معمول اور وہی ایک گھر اور تھوڑے سے رد و بدل سے وہی ایک فرنیچر؟

مصور۔ ہاں کسی حد تک تم سمجھ چلے ہو کہ اس معمول کی باقاعدگی، اور ایک مکان کے روزانہ توارد سے روحِ انسانی میں کیا تنزل پیدا ہوتا ہے مگر ذرا اور دیکھو۔

شرید۔ دیکھ رہا ہوں۔ چالیس سال تک وہی دولت، وہی نوکر، وہی مکان، وہی مقررہ روز کی نشست و برخاست، وہی اکل و شرب، وہی پرانے دقیانوسی قہقہے، ارے ارے غضب۔ اب سمجھ میں آیا۔ اور وہی ایک شوہر۔ اف اف میں بھاگتا ہوں۔ یہ تصویر نہیں بلا ہے۔ یہ وقت نہیں جامِ مرگ ہے +

مصور۔ تم نے دیکھا کہ یہ کیوں ہے؟

شرید۔ خوب دیکھا۔ سب اس لئے کہ اس گھر میں بچہ نہیں ہے۔

مصور۔ آؤ اور دیکھو۔

شرید۔ نہیں دوست، معاف کرو۔ مجھ میں دل گردہ نہیں ہے کہ تمہاری اصلی تصویریں دیکھوں۔

عبد العزیز

کام کی باتیں

گُن مایا[1] کے کون نہ جانے مایا سب کو بھاتی
مایا سے مُنہ مت موڑو تم دُنیا یہ سمجھاتی
سب ساتھی ہیں مایا کے سب دُنیا مایا ماتی
کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

کہنے کو سب کہا کریں "ہے دولت آنی جانی"
دھیان لگا کے سوچو جو تم ہے یہ بات پرانی
منہ سے کہیں سب آنی جانی، جی سے ہے من مانی
کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

ہے پیسے سے گھر گھر شادی اور مبارکبادی
پیسے کے سب جلسے ہیں اور پیسے کی آبادی

[1] عرفِ عام میں دولت کو کہتے ہیں

آنکھ پھاڑ کے دیکھو جگ میں پیسہ ہے آزادی

کرو کام کی باتیں لوگو کام سے مایا آتی

مات پتا پیسے کے ساتھی، ساتھی جورو جاتا

سچی بات جو پوچھے کوئی، پیسہ ہے اَن داتا

ہاتھ ہلاؤ، پاؤں چلاؤ، کام سے رکھو ناتا

کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

ہے دھن دولت سارے جگ کے بگڑے کام بناتی

روٹھے بالک کو بھی دیکھو، اس کی جھلک مناتی

سچ کہتے مقبولؔ سنو، بن مایا عزت جاتی

کرو کام کی باتیں لوگو، کام سے مایا آتی

سید مقبول حسین

(احمد پوری)

ثروت

میں سمجھتی تھی کہ دُنیا میں مجھ سا بدنصیب کوئی نہیں اور رنج و مصائب آفات و آلام بنائے گئے تھے مجھے اور صرف مجھے برباد کرنے کے لئے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ ایک دن خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے (سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں) مجھے ثروت آرا سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ کیا بتاؤں اس کے دلکش چہرے پر حزن و ملال کا کیسا دل سوز نظارہ تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ غمگین تھی، مجھ سے زیادہ آزردہ اور مجھ سے پہلے دُنیا کو اس مکار اور فریبی دنیا کو خیرباد کہنے کے لئے تیار، اُسے بھی میری طرح چُپ لگ رہی تھی۔ وہ بھی غم و الم کی اُسی منزل میں تھی جس میں کہ میں۔ یہ منزل، یہ جانکاہ اور ہلاکت بار منزل، خدا اس سے دشمن کو بھی محفوظ رکھے اپنے مسافر کو اپنی آغوش میں لے کر ہی چھوڑتی ہے۔ ہم پر وہ زمانہ گزر چکا تھا جب انسان اپنی مصیبتوں کو دیکھ کر بیگانہ وار ہنس دیتا ہے۔ اس کے لئے غم، غم نہیں رہتا۔ وہ ہر نئے غم کا اور ہر نئی مصیبت کا نہایت خندہ پیشانی سے اور بلند قہقہوں کے ساتھ اقبال کرتا ہے۔ خویش و اقارب اُس کی یہ حالت دیکھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ اب سے کوئی رنج نہیں۔ مگر ایک گھُن، ایک رنج اسے اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے اور یہ بلند قہقہے نہایت سُرعت کے ساتھ اُسے ہلاکت کے عمیق ترین گڑھے میں دھکیل لے جاتے ہیں۔ جب اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو اُسے چُپ لگ جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی وہ اُف نہیں کرتا اور اسی کے بعد کا درجہ موت ہے۔ اگر اس حالت میں وہ اپنے دل کا رنج رو کر یا کسی ہمراز کو قصۂ غم سنا کر ہلکا نہیں کر لیتا تو یہ سمجھنا چاہئے کہ موت اُس سے نہایت قریب ہے!

ثروت کی اور میری حالت بالکل یکساں تھی۔ نہ میرا کوئی ہمراز تھا نہ اُس کا۔ ہمیں پیہم آفتوں اور مسلسل مصیبتوں کی وجہ سے چپ لگ رہی تھی اور ہم دونوں دعا کرتے تھے کہ خدا ہمیں جلد سے جلد اس "نامراد" دنیا سے اُٹھائے پہلی ملاقات میں ایک دوسری کو اتنا زیادہ ہلاکِ غم دیکھ کر مجھے ثروت سے اور ثروت کو مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ آہ ـــــــ اس ہمدردی نے ہمیں اور زیادہ آفتوں میں مُبتلا کر دیا۔ کاش ہم ناآشنا ہی رہتے اور ہماری زندگیوں کا، مصائب سے مملو زندگیوں کا کبھی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

اگر کسی کے سر میں بہت زیادہ درد ہو اور دوسرا شخص بھی اسی درد میں مبتلا ہو جائے تو جتنا وہ ایک دوسرے کے درد کو محسوس کریں گے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہی حال میرا اور ثروت کا تھا۔ میں جس کے ہوش و حواس رنج و الم کی بارشوں نے اپنے طوفانوں میں کھو دئے تھے۔ جسے قدرت نے صرف مصیبتیں اٹھانے کے لئے پیدا کیا تھا

جس سے اُس کا محبوب ترین دوست، موت، ظالم اور سنگدل موت کے ہاتھوں زبردستی چھینا جا چکا تھا یہ سمجھنے لگی کہ ثروت مجھ سے کہیں زیادہ ستم زدہ ہے اور اگر میری زندگی کی قربانی سے اُس کے صدمات میں کچھ کمی آگئی تو یہ میری بقیہ زندگی کا بہترین مصرف ہوگا اور ثروت کی باتوں سے بھی یہ پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے انتہائی ہمدردی رکھتی ہے

دو مہینے ایسے کٹے کہ کبھی میں ثروت کی مہمان ہوتی اور کبھی وہ میری۔ ہمیں آپس میں اتنی محبّت ہوگئی کہ ایک کے بغیر دوسری کا حال بے حال ہونے لگا۔ میں نے اپنی زندگی کا نصب العین یہ بنا لیا کہ ثروت کو مصائب کی خوفناک بلاؤں سے بچالوں اور اس کام میں دُنیا کے دوسرے جھگڑوں کو فراموش کر کے ہمہ تن مصروف ہوگئی مجھے اپنے رنج یاد نہ رہے۔ ثروت کو، ثروت کی خراب حالت کو دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھنے لگی۔ ان دو مہینوں میں اُس نے مجھے اپنا ہمراز کامل طور پر تو نہیں بنایا۔ ہاں البتہ اپنی مصیبت کی داستان کے کہیں کہیں سے دو ایک ٹکڑے سنا دئے۔ اُس کی یہ بنپا سُن کر مجھے اُس سے اور زیادہ ہمدردی پیدا ہوگئی کیوں کہ میں بھی اسی قسم کی مصیبت کا شکار تھی۔ اس کی صحبت سے میری مصیبت میں تو بہت کچھ تخفیف ہوگئی۔ مگر ثروت کی بیماری روز بہ روز بڑھتی جاتی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کا سا زرد ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور ضعف کا یہ عالم تھا کہ دس بیس قدم بھی نہ چل سکتی تھی۔ میں اُس کی نازک حالت سے خائف رہنے لگی۔ اسے ہنسانے کی کوشش کرتی مگر ناکام رہتی۔ اُسے رُلانا چاہتی مگر وہ خاموش بیٹھی رہتی۔ کئی کئی گھنٹے خاموش بیٹھی رہتی۔ میری منتیں، میری خوشامدیں میری نصیحتیں سب بے اثر ثابت ہوتیں۔ کبھی یہ ہوتا کہ میرے لگاتار سمجھانے پر وہ اپنے نرم و گداز بازو میری گردن میں حمائل کر دیتی اور میرے شانے پر اپنا سر رکھ کر اپنی ناکامیوں پر چند آنسو بہاتی اور بیہوش ہو جاتی۔ —— بیہوش۔ یہ وقت نہایت خطرناک ہوتا کیوں کہ مجھے تنہا اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنی پڑتیں اگر کوئی اور اس اثنا میں اس کے متعلق پوچھتا تو میں کہہ دیتی آرام کر رہی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا میری جان گھٹتی جاتی اور پھر نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہو گیا کہ ایک دن اسی بیہوشی میں یہ بد نصیب مجھ کو روتا چھوڑ کر اس ناپاک اور مکروہ دنیا سے منہ موڑ لے گئی۔

ثروت کے والد چار سال پہلے جنت کو سدھار گئے تھے۔ اور شاید اُسی وقت سے اُس کی اس بے کیف اور پُر غم زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب اُن کے گھر میں ثروت، ثروت کی والدہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ مجھے اس طرح ثروت سے وابستہ دیکھ کر سبھی مجھ سے محبّت کرنے لگے تھے۔ میرا یہ حال تھا کہ اگر ثروت سو رہی تو میں نے بھی کچھ دیر کے لئے آنکھ جھپکالی اور اگر وہ جاگتی رہی تو ساری رات اُس کے ساتھ بیدار رہ کر گزار دی۔ غرضکہ جو کام کرنا وہ ثروت کے ساتھ اور اُسے ذرا دیر کو تنہا نہ چھوڑنا۔ اسی طرح ہمارے گھر والے بھی اس کی قدر کرنے لگے کیوں کہ اس کی وجہ سے صرف اُس کی وجہ سے مجھ میں از سرِ نو زندگی آگئی تھی۔ ورنہ کوئی ایسا نہ تھا

جو میری زیست سے مایوس نہ ہو چکا ہو۔ انہوں نے ثروت کی صحبت کو غنیمت جانا کہ اس سے میری طبیعت بظاہر پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اگر ثروت جئے تو میں زندہ رہوں ورنہ اس کے ساتھ ہی میں بھی اس دنیا کو خیرباد کہہ دوں۔ ثروت پر دن رات ایک والہانہ بے خودی، ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی اور کبھی کبھی کسی خیال میں ایسی مست ہو جاتی اور اتنی بے خبر کہ پاگل معلوم ہونے لگتی۔ میں ڈرتی کہ کہیں یہ کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نہ بھاگ جائے۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی چھت کو تکتی رہتی یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں سے، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے سفید سفید موتیوں کی لڑیاں بندھ جاتیں مگر اس شان سے کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے اور لبوں پر مہر سکوت لگی ہے۔ اُس کی اس بے بسی پر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی سینہ پھوٹ جائے گا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی، اُس کے خیالات کو بدلنا چاہتی تھی مگر وہ اسی بے بسی سے میرے چہرے کو تکتی رہتی اور میں اُس کی مجبوری اور ناچاری پر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی +

اُس کے پاس ایک تصویر تھی۔ میں ذرا دیر کو کہیں جاتی اور وہ فوراً اپنا سوٹ کیس کھول کر تصویر دیکھنے لگتی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ سوٹ کیس کو بند کر دیتی یا تصویر کو چھپا لیتی۔ میں نے کئی مرتبہ پوچھا مگر اُس نے کچھ نہ بتایا۔ میرے اس قسم کے سب سوالوں کا اُس کے پاس ایک جواب تھا ——— خاموشی۔ اور اُس کی اس خاموشی نے مجھے تنگ کر رکھا تھا۔ ایک روز بیٹھی تصویر کو نہایت انہماک کے ساتھ تک رہی تھی۔ میں دبے پاؤں گئی اور اُس کی پشت کی جانب کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ اُس نے جونہی تصویر کے آئینہ میں میرا عکس دیکھا فوراً تصویر کو کپڑوں میں چھپا دیا اور خود سوٹ کیس کو بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر تک مجھے گھورتی رہی۔ شاید یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔ میں نے ہر چند خوشامد کی، کوشش کی، ضد کی کہ کسی طرح وہ مجھے اس تصویر کے متعلق کچھ بتا دے مگر اُس پر ذرا اثر نہ ہؤا۔ نیچی نظریں کئے چپ چاپ کھڑی رہی۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد آنکھیں اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ آخر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں خاموش ہو گئی +

میں نے اس عرصہ میں اُس کے متعلق بہت عجیب باتیں سنیں۔ مگر اعتبار کبھی نہیں کیا۔ رشتہ دار تو اُن کے بہت تھے اور تھے بھی قریبی۔ مگر "دوست" ایک بھی نہ تھا۔ ایک رشتہ دار تو خاص طور پر ان کی دشمن تھی۔ کم بخت نت نئے طوفان اٹھاتی رہتی تھی، مگر ثروت کی ذات ان کمینہ بہتانوں اور رذیل طوفانوں سے بہت بالاتر تھی میں نے اپنی ساری عمر میں ایسی معصوم اور پاکیزہ خصائل لڑکی کبھی نہ دیکھی تھی۔ نمازی ——— تہجد گزار ——— ہر وقت قرآن شریف کی تلاوت، ہر وقت اپنے خیالوں میں محو رہنے والی اور دُنیا سے بے تعلق۔ ثروت کی طینت

اُس کے رشتہ داروں سے بہت بلند تھی۔ اُس نے اُن کی کسی بات کا کبھی جواب نہیں دیا۔ اور جب میں پوچھا کرتی تو عام طور پر چپ ہو جاتی یا صرف اتنا کہتی "خدا سب کچھ دیکھتا ہے"۔

پہلے ثروت کو بہ ظاہر کوئی ایسا مرض نہ تھا جس کا طبیبوں سے علاج کرایا جا سکتا۔ کئی مرتبہ مشہور ڈاکٹروں اور نامور حکیموں نے دیکھا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہی کہتے رہے کہ اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے اُس کی وجہ سے یہ روز بہ روز سوکھتی جاتی ہے۔ دل کی تقویت کی دوائیں دیں، فرحتِ دماغ کے شربت پلائے مگر کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ ان کی ہدایت کے بہ موجب گھر کے ہر ایک فرد نے ثروت کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اُس کے خیالات کو بدلنے کی سعی بھی، مگر اُس کی حالت میں سرِ مو فرق نہ ہُوا۔ رفتہ رفتہ بخار رہنے لگا۔ دن رات بدن تپتا رہتا۔ اور اُس کی ہذیانی کیفیت میں بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ اس مرتبہ پھر طبیبوں کی طرف رجوع کرنا پڑا اور سب نے متفق ہو کر تپِ دق تجویز کیا۔ اس مرض کا، اس نامراد مرض کا نام سُن کر ثروت کی زندگی کی رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی میں نے ہر چند کوشش کی کہ ثروت کو اپنی بیماری کا حال معلوم نہ ہو مگر وہ تو بلا کی فہیم تھی۔ آثار و قرائن ہی سے سمجھ گئی اور کبھی کبھی موت کے خیال سے مطمئن سی ہو جاتی۔

اُس کی بیماری میں شب و روز اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے گھر والوں کی مالی حالت پہلے ہی ایسی اچھی نہ تھی کہ ایسے مہلک مرض کا اعلیٰ پیمانے پر علاج کرا سکتے دوسرے لگاتار بیماری نے انہیں اور زیادہ زیر بار کر دیا تھا۔ پھر ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اُسے کس طرح کسی پہاڑی مقام پر لے جاتے، بہت غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی کہ اپنے زیوروں کو بیچ کر ثروت کو پہاڑ پر لے جاؤں۔ میں نے انتظام کر بھی لیا تھا مگر ثروت کو عین وقت پہ معلوم ہو گیا اور اس نے میری سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ دھرم پور جانے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئی اور میرے اصرار پر کہنے لگی "اگر تم مجھے زیادہ تنگ کرو گی تو یاد رکھو میں ضرور کچھ کر بیٹھوں گی" یہ فقرہ ایسا نہ تھا کہ میں معمولی سمجھ کر ٹال دیتی۔ مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ ثروت جو کہتی ہے وہ کر دکھاتی ہے اس لئے پھر میں نے اُسے لے جانے کے لئے نہ کہا۔

اُس کی زندگی سے مایوسی تو سبھی کو ہو گئی تھی مگر میرے لئے یہ مایوسی نہایت جاں گداز تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ثروت کا مرض مجھے لگ جائے۔ میں نے نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگیں ——— اُس کی چارپائی کے چکر کاٹتے ہوئے التجائیں کیں کہ ثروت اچھی ہو جائے اور میں اُس کی جگہ بیمار ہو جاؤں مگر نہ دعائیں پوری ہوئیں نہ التجا۔

ایک دن رشتہ داروں میں ایک موت ہو گئی۔ ثروت کی والدہ وہاں چلی گئیں اور بھائی اسکول۔ میں اُس کے پاس اکیلی رہ گئی۔ ثروت کی طبیعت صبح سے بہت زیادہ پریشان تھی۔ اُس کی حرکات و سکنات سے ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہتی ہے پھر خود بخود رُک جاتی ہے۔ خدا خدا کرکے ایک گھنٹے کے بعد اس کے دل کو کچھ سکون ہُوا۔ ذرا دیر چپ چاپ پڑی رہی پھر آنکھیں بند کرلیں۔ میں یہ سمجھی کہ آنکھ لگ گئی ہے۔ کیونکہ پچھلی تمام رات اس کی نہایت کرب و اضطراب میں جاگتے بسر ہوئی تھی اور اُس کے پاس سے اُٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گئی مشکل سے دس منٹ گزرے تھے کہ اُس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"عطیہ! ـــــ عطیہ!!"

میں بھاگتی ہوئی اس کے قریب گئی اور پوچھا "کیا بات ہے"؟ چند لمحوں کے سکوت کے بعد کہنے لگی "عطیہ! تم ایک مدت سے میری خدمت کررہی ہو۔ خدا تم کو اس کا اجر دے ـــــ افسوس میں تمہارے کسی کام نہ آسکی، تمہاری کچھ خدمت نہ کرسکی ـــــ خدمت تو رہی ایک طرف تمہاری معمولی سی خواہش کو آج تک پورا نہ کرسکی عطیہ! اب شاید میری زندگی کی چند ساعتیں باقی ہیں، میں چاہتی ہوں کہ آج تم پر وہ راز افشا کردوں جس کے معلوم کرنے لئے تم اتنی زیادہ بے تاب تھیں ـــــ راز نہیں مصیبت کی کہانی ہے جو ـــــ"

نقاہت کی وجہ سے آگے نہ کہہ سکی۔ میں نے خیال کیا کہ اس نازک وقت اس پُرغم قصہ کا دُہرانا ٹھیک نہیں۔ پچھلی رات سے اُس کا حال بگڑا ہُوا تھا، اس لئے میں نے کہا

"ثروت یہ وقت اس قسم کی باتوں کا نہیں۔ اور تم اپنی زندگی سے مایوس کیوں ہوگئیں۔ کل تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ بہت کچھ آرام ہے۔ خدا کرے گا پانچ دس دن میں طبیعت درست ہوجائے گی پھر سُنا دینا۔"

"اب بالکل آرام ہوجائے گا عطیہ! اب بالکل آرام ہوجائے گا۔ میں اندھی نہیں، سب کچھ دیکھتی ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں میں کئی روز سے ورم آگیا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی بلکہ منتظر ہوں اُس مبارک گھڑی کی جب میں دُنیا کو بے وفا دنیا کو الوداع کہوں گی ـــــ خیر۔ ہاں یہ وقت واقعی ان باتوں کا نہیں۔ یہ وقت خدا کی یاد کا ہے اور دوسرے میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اس پر درد کہانی کو سنا سکوں"۔

ثروت یہاں تک کہہ کر چھت کو تکنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور اضطراب کی کچھ انتہا نہ تھی۔ میں نے کہا۔

"ثروت! تم کیسی باتیں کرنے لگیں۔ خدا کے لئے اپنے دل سے اس خیال کو نکال دو۔"

ثروت رونے لگی اور روتے روتے بیہوش ہوگئی۔ بیہوشی بھی ایسی ہوئی کہ میری کئی گھنٹے کی کوشش بھی اُسے ہوش میں نہ لاسکی۔ میں بہت زیادہ گھبرا گئی اور اُس کی والدہ کے پاس اطلاع بھیج دی۔ وہ فوراً ڈولی میں آگئیں۔ ہم دونوں نے مل کر تدبیریں کیں مگر سب ناکام رہیں۔ آخر ڈاکٹر کو بلایا وہ بھی دو ایک پچکاریاں لگا کر چلتا بنا تیسرے پہر کہیں جاکر اسے ہوش آیا۔ ہوش کا آنا تھا کہ مجھ میں جان آگئی۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے کہا

"آج توخوب سوتی رہیں آپ! کب سے اٹھا رہے ہیں، اب اٹھی ہیں" ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتی رہی پھر اپنی والدہ سے کہنے لگی" امی جان! آپ کب آگئیں"۔ کچھ سوچ کر مجھ سے کہا" میں تو تہیہ کر کے سوئی تھی کہ قیامت سے پہلے نہ اٹھوں گی مگر تم نے اٹھا ہی لیا"۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اپنی بیہوشی کو تاڑ گئی ہے اس لئے نیند کے ذکر ہی کو چھوڑ دیا۔

دن بھر اُس کا حال خراب رہا۔ بے چینی اور بے تابی کی کوئی حد نہ تھی۔ شام سے خویش و اقارب اُس کا حال دریافت کرنے آنے لگے۔ رشتہ دار عورتیں رات کے گیارہ بجے تک بیٹھی رہیں۔ ثروت کی طبیعت اُن کی باتوں اور اُن کے بچوں کے شور سے اور زیادہ گھبرانے لگی۔ میں نے بڑی خوشامدوں سے عورتوں کو سمجھایا انہوں نے بُرا محسوس تو ضرور کیا مگر اٹھ کر چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی میں نے ثروت کو دوا پلائی اُس کے قریب ایک چارپائی پر لیٹ گئی دو تین دن سے میں صرف دو ایک گھنٹے سو سکتی تھی۔ تھکی ماندی بھی تھی آنکھ لگ گئی۔ تین چار بجے جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ثروت بیٹھی ہوئی لکھ رہی ہے اور اُس کی والدہ اور بھائی بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔ میں کافی دیر تک دیکھتی رہی۔ اُس کا قلم اسی تیزی سے چلتا رہا۔ میں نے اٹھنا مناسب خیال نہ کیا۔ میں سمجھی کہ اُسی کو خط لکھ رہی ہوگی جس کی تصویر اُس کے پاس ہے۔ میں پھر سو گئی۔ صبح کو اٹھی تو ثروت خلافِ معمول سوتی ملی۔ اس بیماری میں بھی وہ ہر صبح گرتی پڑتی اٹھتی تھی مگر نماز کبھی قضا نہ کرتی تھی۔ میں نے اُس کی والدہ کو جگایا اور خود نماز پڑھ کر قرآن پڑھنے لگی میری آواز سن کر وہ بھی جاگ پڑی اور شاید نماز کے قضا ہونے کے خیال سے گھبرا کر یک لخت کھڑی ہوگئی۔ آہ طاقت نے ساتھ نہ دیا۔ چکرا کر گر پڑی۔ فرش میں سر لگا اور "امی جان" کہہ کر بیہوش ہوگئی۔ ادھر سے میں لپکی اور اُدھر سے اُس کی والدہ ـــــ ایسے بُرے وقت میں گری تھی کہ پھر ہوش میں نہ آئی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اُس نے پینے کی دوا دی، انجکشن کئے مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ دوپہر تک بیہوش رہی اور اُس کے بعد ہم سب کو روتا چھوڑ کر اس مردار دنیا سے رخصت ہوگئی۔

نزع کے وقت شاید پانچ سات لمحوں کے لئے ہوش آیا تھا، آنکھیں کھول کر چاروں طرف تکنے لگی، میں نے پوچھا "ثروت! اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ خاموش رہی جواب نہ پا کر میں نے پھر کہا "کس کی تلاش ہے؟" اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُسی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتی رہی جیسے پردہ ہی بے بسی برس رہی تھی اور معصومیت بھی۔ میں پھر بولی" ثروت ثروت!! بولتیں کیوں نہیں؟" آنکھیں بند کر کے اس نے زیر لب کچھ کہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی+

ثروت کی جوانا مرگ سے جتنا صدمہ مجھے پہنچا شاید اس کی والدہ کو بھی نہ پہنچا ہو۔ میں پتھر بن کر رہ گئی۔ آنکھ ہی پھوٹے جو اس سے ایک آنسو بھی نکلا ہو اور زبان ہی گل جائے جو ایک آہ بھی کی ہو۔ نیم غشی کی حالت میں اس کے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ دیکھ سب کچھ رہی تھی مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اُس کی والدہ چارپائی کے قریب بیٹھ کر رونے لگیں بھائی سر پیٹنے لگے۔ پڑوس کی عورتیں بھی آگئیں اور آہ و زاریاں کرنے لگیں۔ ثروت کی والدہ اُن کی آہ و زاریاں سن کر اور بنیا؟

زار و قطار رونے لگیں۔ مگر میں جوں کی توں بیٹھی رہی۔ نظر سب کچھ آرہا تھا لیکن رو نہ سکتی تھی جرکت نہ کر سکتی تھی بالکل بے بس تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر پہاڑ گر گیا ہے اور میرا جسم چکنا چور ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ساری طاقت کو جمع کر کے کھڑا ہونا چاہا ــــــــ اس کے بعد کی مجھے خبر نہیں۔ سورج غروب ہونے سے تقریباً دو گھنٹے پہلے میری آنکھیں کھلیں کیا دیکھتی ہوں کہ سب عورتیں مجھے حلقہ میں لئے بیٹھی ہیں۔ فوراً سب باتیں یاد آگئیں۔ آہ۔ ثروت کو مٹی میں ملے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں اُس کی پیاری صورت کو آخری مرتبہ دیکھ بھی نہ سکی تھی ــــــ آہ میری عزیز ترین سہیلی آہ!

اتنے میں ثروت کی والدہ آئیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک لمبا سا کاغذ تھا۔ مجھے دے کر کہنے لگیں "لو۔ یہ ثروت کا خط ہے تمہارے نام" پہلے تو مجھے یقین نہ آیا۔ میں سمجھی کہ یونہی غم غلط کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ پھر جو کاغذ لے کر دیکھا تو ثروت ہی کی تحریر معلوم ہوئی۔ خط کا پڑھنا تھا کہ آنکھوں سے دو دریا اُمڈ آئے۔

ثروت نے لکھا تھا

"پیاری عطیہ! ثروت کا، اپنی ناشاد اور مجبور ثروت کا آخری سلام قبول کرو۔ میں غالباً آج رات کی اور مہمان ہوں۔ تم چار مہینے میرے ساتھ رہیں اور ان چار مہینوں میں مجھ سے جتنی ہمدردی تم نے کی کوئی عزیز ترین بہن بھی نہیں کر سکتی یہ تمہاری ہی رفاقت کے طفیل تھا کہ میں اتنا عرصہ زندہ رہی ورنہ کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی عطیہ! مجھے موت کا خوف نہیں مگر آہ تمہارے رنج و غم کا خیال کاٹے کھاتا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھو مرتے وقت بھی اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔ کاش میں بچپن ہی میں مر جاتی۔

تم میرا افسانۂ غم سننے کے لئے بہت بے تاب تھیں۔ مگر میں ہمیشہ ٹالتی رہی۔ کل میں نے خود سنانا چاہا مگر تم نہ تھیں صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں کوشش کروں گی کہ سب واقعات کو مختصراً لکھ دوں۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں مگر تمہارے پیہم اصرار کی وجہ سے قلم اٹھا رہی ہوں خدا کامیاب کرے۔ نقاہت مجبور کر رہی ہے کہ لیٹ جاؤں، ضعف زور دے رہا ہے کہ گر پڑوں، لیکن میں اپنی دُھن میں مست سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں، عطیہ! آخری وقت میں ان باتوں کو یاد کرنا جو میری اس بربادی کا باعث ہوئیں عقلمندی تو ہے نہیں، لیکن خواہ کچھ ہو اس وقت پانچ سال پہلے کا زمانہ فرحت و انبساط کا زمانہ، آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ دہلی کا مکان جنت نشان مکان، اپنی تمام مسرتوں کو جلو میں لئے میرے سامنے ہے۔ وہ وقت میری زندگی کا بہترین وقت تھا۔ احسان حسن و وفا کا پیکر احسان ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ والد اور والدہ کو رات کے وقت باتیں کرتے سنا تھا کہ وہ مجھے احسان کے ساتھ بیاہ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں میں نے خیال کیا کہ ہمیں وابستہ تو ہونا ہی ہے اور اس کے علاوہ ایک ساتھ رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ بہت جلد محبت نے عشق

کا اور عشق نے جنون کا درجہ اختیار کر لیا ہمیں باتیں کرنے کا وقت بہت کم ملتا تھا۔ اس لئے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پیاری پیاری تحریریں، محبت بھرے القاب، میٹھے میٹھے الفاظ کیا لکھوں اس کے خط پڑھ کر کیا مزا آتا تھا یہ بات ایسی نہ تھی کہ مدت تک چھپی رہتی۔ آہستہ آہستہ میرے والدین کو بھی خبر ہو گئی۔ آہ۔ انہیں خبر ہونا ہی ہمارے حق میں زہر قاتل ہو گیا۔ جو باتیں محبت کی دنیا میں جائز ہیں اُن کی نگاہوں میں کھٹکنے لگیں۔ ہمیں آنکھیں ملنے پر مسکراتا دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ دو ایک دفعہ والدہ نے ہمیں خط لیتے دیتے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا شامت ہی آ گئی۔ مجھے بھی دھمکایا اور احسان کو بھی۔ اور بہت زیادہ دیکھ بھال کرنے لگے۔ احسان نے اُن کے ہر روز کے بدلے ہوئے تیور اور دن رات کے جھگڑے سے تنگ آ کر دوسری جگہ مکان لے لیا۔ کہاں ہر وقت کا ساتھ اور کہاں ہفتہ میں ایک بار ملاقات۔ یہ مصیبت مجھ سے اٹھائے نہ اٹھی۔

پیاری عطیہ! قصہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور میں مارے ضعف کے نڈھال ہو رہی ہوں۔ شاید سب باتیں نہ لکھی جا سکیں۔

اس کے بعد اور بہت سی مصیبتیں آئیں اور میں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے دو مرتبہ کوشش کی، دو مرتبہ زہر کھایا۔ مگر کم بخت موت کو بھی مجھ بدنصیب پر رحم نہ آیا۔ دونوں دفعہ طبی امداد نے مجھے کامیاب نہ ہونے دیا۔ احسان، آہ شہید محبت احسان شادی کی آخری مرتبہ سر توڑ کوشش کر کے بے پتا ہو گیا۔ گو میرا دل کہتا ہے کہ احسان زندہ ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ مایوسی نے اسے کس حال کو پہنچا دیا ہے۔ خیر کچھ دیر میں میری روح اُس کے پاس پہنچ جائے گی۔ مجھے یقین ہے وہ جہاں کہیں بھی ہے تمہاری ثروت کی یاد اُس کے دل میں ہے اور تمہاری ثروت کا سودا اُس کے سر میں عطیہ! میں نے اور احسان نے ایک زریں شام کو عہد کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ احسان اب تک اس عہد پر قائم ہے اور جیتے جی قائم رہے گا اور میں، میں نے انتہائی کوشش کی۔ آہ! بے بس کیا اور بے بس کی کوشش کیا؟ —— یہ بھی بجائے خود ایک طویل قصہ ہے۔

دل کی حرکت لحہ بہ لحہ تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ چند لمحوں ہی میں بلیوں اچھلنے لگا ہے۔ طبیعت پر سخت پریشانی چھا رہی ہے اور دماغ پر ایک عجیب قسم کا بار محسوس ہو رہا ہے۔ آہ سچی محبت کبھی بار آور نہیں ہوتی۔ خبر نہیں خدا کیوں اس میں خوش ہوتا ہے کہ سچی محبت کرنے والے برباد ہوں، مٹ جائیں لیکن رہیں ناکام ہی۔ عطیہ میں نے بڑی کافی کوشش کی۔ والدہ —— بالکل صاف صاف بھی کہا اور لکھ کر بھی دیا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی،

عطیہ! اب مجھ سے بالکل نہیں بیٹھا جاتا۔ سر بہت ہی زیادہ گھومنے لگا۔ ہر چیز گھومتی نظر آ رہی ہے۔ اب ایک عجیب تاریکی تسلط کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ لیمپ بھی تاریک نظر آنے لگا ہے۔ اچھا رخصت!"

میں نے خط کو کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ دل کو پہلو سے زیادہ رنج پہنچا۔ آہ ثروت۔ دوسروں کی جہالت کا

شکار ہوکر یوں خاک میں مل گئی، یوں برباد ہوگئی ثروت جیسی ہمہ صفت موصوف لڑکی شاید صدی میں ایک ہی دفعہ پیدا ہوتی ہو۔

اب میری کیا حالت ہے اس کی مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی نہیں رہا جو خوشی اور غم کو محسوس کر سکے۔ اور نہ کوئی آرزو۔ ایک آرزو ہے بھی ـــــ موت کی ـــــ کاش میں ثروت کے ساتھ مر جاتی۔ کاش میں ثروت کے ہمراہ سفر کرسکتی، کاش ہم ایک ساتھ اس دنیا سے، اس رنج وغم کی دنیا سے رخصت ہوتے۔ ثروت کے بعد میری زندگی بالکل بے لطف ہوگئی ہے۔ ثروت کیا گئی میری خوشی کو اور صرف میری ہی کیا تمام دنیا کی خوشی کو اپنے ساتھ لیتی گئی۔ جسے دیکھو وہی غمگین نظر آتا ہے۔ جسے دیکھو اسی کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ درودیوار سے حسرت و مایوسی برستی معلوم ہوتی ہے۔ خبر نہیں ثروت کے بعد کیوں سارے زمانے میں رنج، حسرت، حرماں نصیبی اور مایوسی مستولی ہوگئی اور نہ جانے کس لئے ثروت کے جاتے ہی تمام عالم سے مسرت وراحت یک لخت رخصت ہوگئی۔

ظفر واسطی شاہ آبادی

خوشی دنیا کے کونے کونے سے لپکی میرے جسم کی ساخت کے لئے۔

آسمان کی روشنیوں نے اُسے بوسے پر بوسہ دیا یہاں تک کہ وہ جاگ اٹھا

تیز رو بہاروں کے پھولوں نے اُس کے سانس میں آہیں بھریں اور ہواؤں اور پانی کی آوازوں نے اُس کی جنبشوں میں گانا گایا

بادلوں اور جنگلوں کے رنگوں کی لہروں کا جذبہ اس کی زندگی میں بہ نکلا اور تمام اشیا کی موسیقی نے اس کے اعضا سے لپٹ کر اُسے سانچے میں ڈھالا

وہ ہے میرا محبوب ـــــ وہ جس نے اپنا دیا میرے گھر میں روشن کیا ہے۔

لڑکیاں جس سے دل لگی کرتی ہیں اس سے شادی نہیں کرتیں

اچھی شادی آدمی کے لئے پر پرواز ہے بُری شادی زنجیر پا۔

گلچیں

خزاں

ابھی یہ بات ہر کل کی کہ آرہی تھی بہار — نوید عیش چمن کو سنا رہی تھی بہار
بدل رہے تھے لباس اپنا شاہدانِ چمن — غریقِ زینت و تزئیں تھے گل رُخانِ چمن
لدی ہوئی تھی ہوا عطر بیزیٔ گل سے — فضا میں کیف بھرا تھا نوائے بلبل سے

مگر زمانہ نے یک لخت ایسی کروٹ لی — نہ وہ بہار تھی باقی نہ اُس کی رعنائی
وہ ظلم و جور ہوئے ہیں خزاں کے ہاتھوں سے — اجڑ گیا ہی چمن آسماں کے ہاتھوں سے
تاثراتِ خزاں کی جھلک ہے ہر شے میں — نہ لوچ نغمہ میں باقی نہ کیفیت مے میں
تمام باغ میں اک زرد پھول باقی ہے — بس ایک جانِ فگار و ملول باقی ہے

یونہی ازل سے بہار و خزاں کے ہیں ادوار — یہی ہیں گردشِ لیل و نہار کے اطوار
تو کیوں ملول ہے اے دوست اے بہار پسند — ستم ظریفِ زمانہ نہیں قرار پسند

جو زندگی ہے تو پھر بھی بہار آئے گی
بہار آئے گی اور بار بار آئے گی

ناظر اودھوی

اصلاحِ ادب

(۵)

بہ سلسلۂ اشاعت اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء

نثر

فقرہ۔ پرسوں بدھ وار کے دن سکول میں چھٹی ہوگی۔
اصلاح۔ پرسوں بدھ کے دن (یا بدھ کو) سکول میں چھٹی ہوگی۔
وجہ۔ "بدھ وار کے دن" غلط ہے کیونکہ "وار" کے معنی "دن" کے ہیں۔ اسی طرح "لیلۃ القدر کی رات" اور "کوئی ایک فردِ واحد" وغیرہ بھی غلط ہیں۔

فقرہ۔ یہ عجوبہ نظارہ تو ہم نے آج ہی دیکھا۔
اصلاح۔ یہ اعجوبہ نظارہ تو ہم نے آج ہی دیکھا۔
وجہ۔ "عجوبہ" کوئی لفظ نہیں۔ البتہ "اعجوبہ" درست ہے۔

فقرہ۔ عورتیں منہ ڈھانک کر روتی ہیں۔
اصلاح۔ عورتیں منہ ڈھانپ کر روتی ہیں۔
وجہ۔ یہ ڈھانپنے کا محل ہے۔ واضح ہو کہ "ڈھانپنا" غم کے لئے مخصوص ہے۔ اور "ڈھانکنا" چھپانے کے لئے۔

فقرہ۔ انہوں نے مشاعرہ میں یہ شعر سہ کرر پڑھا تھا۔
اصلاح۔ انہوں نے مشاعرے میں یہ شعر تین مرتبہ پڑھا تھا۔
وجہ۔ (۱) "مشاعرہ" کے آگے حرف جار (میں) آجانے کے باعث "ہ" "ے" سے بدل جائے گی۔
(۲) سہ کرر کوئی لفظ نہیں۔ "مکرر" کا مادّہ "کر" ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو بار بار کرنا۔ پھیر دینا۔ ہٹا دینا۔ دشمن پر حملہ کرنا۔ لیکن "کر" بمعنی "دفعہ" بالکل غلط ہے۔

فقرہ۔ مجھے اس کاروبار میں شراکت منظور نہیں۔
اصلاح۔ مجھے اس کاروبار میں شرکت منظور نہیں۔

وجہ۔ "شراکت" کوئی لفظ نہیں۔ اس کی جگہ "شرکت" استعمال کرنا چاہیئے۔
فقرہ۔ محمود اپنی جماعت میں اول رہا۔ اور حمید دوئم۔
اصلاح۔ محمود اپنی جماعت میں اول رہا اور حمید دوم۔
وجہ۔ "دو" کا صفتِ عددی ترتیبی دوم ہے۔ دوئم نہیں۔ اسی طرح سوئم بھی غلط ہے۔

نظم

شعر۔ اگر دیکھا نظر بھر کے تو مر ہی جاؤں گا ظالم — تری آنکھیں نہیں ہیں۔ زہر کے لبریز پیالے ہیں
اصلاح — اگر دیکھا نظر بھر کے تو مر ہی جاؤں گا ظالم — تری آنکھیں کہاں ہیں زہرِ قاتل کے پیالے ہیں
وجہ (۱) "نہیں" کے بعد "ہیں" حشو ہے۔ کہاں سے مصرع کا زور بھی بڑھ گیا۔
(۲) "پیالہ" فارسی لفظ ہے۔ لہذا "یا" کا اخفا غلط ہے۔ اعلان چاہیئے۔
شعر — صہبائے کیف آور دو روزہ زندگی ہے — ترشی چکھی قضا کی اترا خمارِ ہستی!
اصلاح — صہبائے کیف آور دو روزہ زندگی ہے — چکھی قضا کی تُرشی اُترا خمارِ ہستی
وجہ۔ "چکھی" اور "رکھی" بتشدید صحیح و فصیح ہیں۔
مصرع۔ مری عید الضحیٰ محبوب پر قربان ہونا ہے۔
اصلاح۔ ہماری عیدِ قُرباں دوست پر قرُبان ہونا ہے۔
وجہ۔ "عید الضحیٰ" عربی قواعد کے رُو سے غلط ہے۔ اس کی جگہ "عید الاضحیٰ" یا "عید اضحیٰ" استعمال کرنا چاہیئے۔ مگر یہاں یہ دونوں صحیح لفظ شعریت سے خالی ہیں۔
شعر — یہ کہہ کے رو دئے وہ ہمارے مزار پر — کیا میرے مرنے والے کی میّت اسی میں ہے
اس غزل میں "اسی میں ہے" ردیف ہے اور "صورت" "محبت" وغیرہ قافیہ
غلطی — "مَیّت" بکسر یاء مشدّد ہے۔ لہذا قافیہ غلط ہے۔
شعر۔ گُل نفس سے یہ بے ساختہ پن یاد آیا — جب قبا پہنی گریبانِ کفن یاد آیا
غلطی۔ "بے ساختہ پن" کا محلِ استعمال صحیح نہیں۔ "پن" محض قافیے کی رعایت سے لایا گیا ہے۔

نشتر جالندھری

قطبی اور بی بی

طالبانِ علم تا تحصیلِ علم　　گھر کے دھندوں سے نہ رکھیں کوئی کام

ذکر بھی شادی کا چھڑ جائے اگر　　ہے مناسب وہ کریں قطعِ کلام

کہتے ہیں اک شخص کی تعلیم کا　　سلسلہ ہونے نہ پایا تھا تمام

کر دیا ماں باپ نے خود اُس کا عقد　　زلیت جس سے ہو گئی اُس پر حرام

تھا وہ مصروفِ کتب بینی جہاں　　تھی وہیں نالاں عروسِ تشنہ کام

تنگ آ کر ایک شب کہنے لگی　　اس نگوڑی کا مجھے بتلاؤ نام

بولا شوہر کہتے ہیں قطبی اُسے　　منطقی کی جان ہے یہ لاکلام

بولی وہ جھنجلا کے ہے یہ میری سوت　　ظلم کا میں اُس سے لوں گی انتقام

واسطہ بی بی سے رکھنا ہے اگر　　بھول کر بھی تم نہ لو قطبی کا نام

اور اگر قطبی کی اُلفت دل میں ہے
لیجئے سرکار! بی بی کا سلام

سید علی منظور
حیدرآبادی

محفلِ ادب

زہرہ کے بُندے

(ایک ہسپانوی گیت کا ترجمہ)

ابوالحارث کی بیٹی زہرہ غرناطہ میں ایک فوارے کے پاس کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے:۔
ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے کنویں میں گر گئے۔ ہائے اب میں کیا کروں گی موسیٰ سے کیا کہوں گی! کنواں بہت گہرا ہے۔ میرے بندے اس کے سرد نیلگوں پانی کی گہرائی میں پہنچ چکے۔ یہ بندے مجھے موسےٰ نے اُس وقت دئے تھے جب وہ مجھ سے آخری مرتبہ رخصت ہو رہا تھا۔
آہ! جب وہ واپس آئے گا۔ میں اُس سے کیا کہوں گی!

ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے۔ موتیوں کے بنے ہوئے۔ چاندی میں جڑے ہوئے میرے موسےٰ نے مجھے اس لئے دئے تھے کہ جب تک وہ دور دراز تونس میں مجھ سے جدا ہے میں اس کو۔ صرف اسی کو والہانہ یاد کرتی رہوں۔ نہ کسی غیر کی زبان سے کوئی بات سنوں نہ کسی غیر کی بات چیت پر مسکراؤں۔ ہر وقت یاد رکھوں کہ موسےٰ نے میرے ان اچھوتے ہونٹوں کو چوما تھا۔ جو میرے گوہریں بندوں کی طرح پاکیزہ ہیں۔
آہ! جب وہ واپس آئے گا اور سُنے گا کہ وہ بندے میں نے کنویں میں گرا دئے وہ مجھے کیا سمجھے گا۔ میرے متعلق کیا خیال کرے گا۔ آہ! میں اس سے کیا کہوں گی؟

ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے! موسیٰ کہے گا۔ کاش وہ بندے موتی اور چاندی کی جگہ سونے کے بنے ہوئے ہوتے۔ کاش ان میں زبرجد اور نیلم کا رنگ ہوتا۔ ان میں الماس کی درخشانی ہوتی۔ جو روشنی کے ہر تغیر کے ساتھ اپنا رنگ بدل لیتی ہے۔ ان کی آب و تاب ناپائدار

اور بے وفا ہوتی کیوں کہ بے وفاؤں کے لئے مستقل چمک دمک رکھنے والے جواہر موزوں نہیں ہیں۔
آہ! جب موسلےؔ اس طرح خیال کرے گا۔ میں اس سے کیا کہوں گی!

وہ خیال کرے گا زہرہ بازار گئی ہو گی اور رستے میں کسی جگہ کھڑی ہو گئی ہو گی۔
وہ خیال کرے گا زہرہ نے آوارہ مزاج نوجوانوں کی باتیں دلی خواہش سے سنی ہوں گی۔
وہ خیال کرے گا کہ کسی اور عاشق کا دستِ شوق میرے گیسوؤں کے پیچ و خم میں الجھا ہو گا اور اس حالت میں موتیوں کی وہ لڑیاں جو میرے کانوں میں موسلے نے اپنے ہاتھ سے ڈالی تھیں کھل گئی ہوں گی۔
وہ خیال کرے گا جب زہرہ سنگِ مرمر کے کنویں کے پاس اس طرح رنگ رلیاں منا رہی ہو گی۔ اس کے کانوں کے بندے کنوئیں میں گر گئے ہوں گے۔
ہائے میرے اللہ میں اس سے کیا کہوں گی۔

وہ کہے گا۔ زہرہ عورت ہے اور عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔
وہ کہے گا۔ جب یہاں میری محبت کا شعلہ روشن تھا۔ زہرہ اس شعلے سے گرما رہی تھی لیکن جب میں تونس چلا گیا۔ زہرہ کی "دوشیزہ وفا" ٹوٹ گئی۔ اس نے میرا خیال چھوڑ دیا۔ وہ میری نشانی سے بے پروا ہو گئی۔
ہائے میرے بندے! ہائے میرے بندے! آہ! اے منحوس کنویں! تو نے یہ کیا ستم کیا۔ اب میں موسلےؔ سے کیا کہوں گی۔

میں موسلے سے سچ سچ کہہ دوں گی۔ وہ میری بات پر اعتبار کرے گا۔ میں اس سے کہوں گی پیارے موسلے۔ میں صبح بھی تجھی کو یاد کیا کرتی تھی۔ میں شام کو بھی تیرے ہی خیال میں غرق ہوتی تھی۔ ایک دن شام کے وقت میں تیری یاد میں محو تھی۔ آفتاب مغرب کے افق میں ڈوب چکا تھا تیرے بندے میرے ہاتھ میں تھے۔ میں فوارے کے پاس اکیلی اور اداس کھڑی تھی۔ میرا دل دور ـــــ سمندر کی لہروں پر بہا جا رہا تھا۔ میں بیخود ہو گئی۔ بندے میرے ہاتھ سے گر گئے۔

لیکن یقین رکھ، تیرا عشق میرے دل کی گہرائیوں میں اسی طرح آرام کر رہا ہے جس طرح تیرے بندے کنوئیں کی گہرائی میں پوشیدہ ہیں +

"کاررواں"

ہندوستان کا ایک نقش

ذیل کا مضمون علیاحضرت سلطانہ دُرشہوار (بیگم شہزادۂ ولی عہد بہادر مملکتِ آصفیہ) نے گزشتہ سفرِ یورپ کے زمانہ میں بزبانِ انگریزی تحریر فرمایا اور سوئٹسان (سوئزرلینڈ) کے مشہور جریدہ داوسر ریویو میں چھپا تھا۔ علیا حضرت کی اجازت سے اس کا اردو ترجمہ رسالہ معارف کے واسطے حاصل کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس جلیل القدر ترک شہزادی کے پاکیزہ مذاق اور افکارِ عالیہ سے آگہی کا موقع ملے اور وہ یہ بھی اندازہ کرسکیں کہ اس عالی دماغ و عالی نژاد سلطانہ کو اپنے نئے وطن (ہندوستان) سے کس درجۂ محبت اور دلچسپی پیدا ہوگئی ہے +

سرزمین ہندوستان ہر شخص کی خیال آفرینی کو تحریک میں لے آتی ہے۔ اپنی اصلیت کے سوا وہ ہر حیثیت سے مشہور ہے۔ وہ مجسم داستان پریوں کی کہانی یا خواب ہے۔ جسے انسانی دماغ فرصت کے وقت بہتر سے بہتر بناتا رہتا ہے وہ ایک ملک ہے جسے مغربی تصور نے حیرت انگیز اور بے جان طلسم کی صورت بخشی ہے۔ اس کا وجود تو ہے مگر زندگی نہیں؟ لفظ ہندوستان میں آہنگ ہے مگر معنویت نہیں۔ سرسبزی ہے مگر گہرائی نہیں اسے چند خصوصیتیں ضرور حاصل ہیں وہاں گاندھی نے جنم لیا۔ وہاں سانپ رہتے ہیں۔ شیروں کا شکار ہوتا ہے اور زیور پہنے ہوئے راجاؤں کو ہاتھی لئے لئے پھرتے ہیں +

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے بارے میں اس طلسم کو توڑنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جائیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان افسانوں سے الگ کرکے اس کی اصل تصویر دکھا دوں۔

ہندوستان محض نام نہیں بلکہ زندگی بھی رکھتا ہے۔ اس میں رنگینی ہے شاعری ہے اور فنا مذار پر بہار لاینحل ماضی ہے جو صرف مشرقی ممالک ہی اپنے اندر رکھ سکتے ہیں۔ یہاں گزشتہ زمانے کی نشانیاں نہیں مٹتیں نہ ان میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یورپ میں قدیم عمارات ایک خاص عہد کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں لیکن مشرق میں اس قسم کے نمونے گویا بنانے والوں کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں اس آدمی کا کردار، عزم، قوت، زندگی، سلیقہ، نفاست پسندی اور بطون تک نظر آجاتا ہے جس نے ان کو بنایا ہے۔ مذہبی عمارتوں خصوصاً مندروں کو چھوڑ کر (جن کی قدر و قیمت بلحاظِ فنِ معماری کچھ کم نہیں) وہ نہ صرف ایک عہد کو بتاتی ہیں بلکہ اپنے بنانے والوں کی یاد کو بھی قائم رکھتی ہیں۔ مشہور و معروف تاج محل کو دیکھنے سے عام مسافر کو ایک بڑے آدمی کی محبت اور عالی رتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک صاحبِ نظر کے آگے بنانے والے کے اندرونی خیالات تک افشا ہو جاتے ہیں۔ روضے کا ناقابلِ بیان سکون اور عظمت کی شان سلاطینِ گزشتہ کی فانی زندگی

کو ایک حد تک ضرور لافانی بنا دیتی ہے۔ ایک دن ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ روضہ ان کی نظر میں نہیں جچا اور انہیں شکایت تھی کہ اس میں جذبات زیادہ بھرے ہیں لیکن ایسی چیز میں جذبات کی انتہا کیوں کر ہو سکتی ہے جو ایک محبت صادق کی یادگار ہو؟

قلعۂ دہلی اور اسی طرح قلعۂ آگرہ بھی معماری کا نفیس ترین نمونہ ہیں اور ان کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن تعمیر کے عجائبات سے ہیں۔ یہ وہ نیم ربانی آثار ہیں کہ نگاہ سے بڑھ کر دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسی پر امن پسندیدہ اور ناقابل بیان چیز ہے جو ہر دیکھنے والے میں اختلاف ذوق کے باوجود وجد پیدا کر دیتی ہے، دیوان خاص کی مشرقی وضع کی کمانوں سے خاموش فواروں اور لمبے دالان سے (جس کے دریچے میں پھول بکھرے ہوئے ہیں اگرچہ ان کا رنگ اڑ گیا ہے) ایک عظمت کی شان پیدا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب سے بڑے تاجدار شاہجہان کے حضور میں باریاب ہیں اور اس کا عہد حکومت خاموشی کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سے گزر رہا ہے

یورپ کے آثار قدیمہ کے برخلاف ایشیائی عمارتیں آرائش و تجمل کے مٹ جانے کے بعد بھی ایسی ویران و سوگوار نہیں ہو جاتیں، جیسا کہ مثلاً قصر وارسٹی ہے کہ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کا یہ باعظمت و وقار محل بہت پیشتر اپنے عروج کی منزل طے کر چکا، اور اگرچہ فوارے اب بھی اپنا راگ الاپ رہے اور گزشتہ زمانے کا منہ چڑا رہے ہیں۔ لیکن وہ زمانہ نسیاً منسیاً ہو چکا۔ میں نے مشرق میں ایسی حالت نہیں دیکھی۔ گو عمارتیں خاموش کھڑی ہیں لیکن یہ خاموشی ایک چیستان ہے، موت نہیں ہے۔ جب میں قلعۂ دہلی میں داخل ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں بالکل ایک دوسری دنیا میں آگئی ہوں۔ باغ بہت عمدہ حالت میں رکھا گیا ہے جس طرح سابق میں ہوگا۔ اور دیوان خاص میں (جس کا ذکر ابھی کیا) آنے سے پہلے ایک چھوٹی سی مسجد ملتی ہے۔ جسے موتی مسجد کہتے ہیں۔ یہ مسجد اردگرد کی رُوئیدگی میں فی الواقع ایک گوہر درخشاں ہے اور اس کے اندر اس مذہب کی پاکیزگی اور امن کا جلوہ نظر آتا ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔

یہ اور اسی قسم کی کئی عمارتیں ایسی ہیں کہ ہر ایک کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ الورا اور اجنٹا کے غار جو حیدر آباد سے قریب ہیں نہ صرف معماری بلکہ نقاشی کے لحاظ سے قدیم زمانے کی نایاب یادگار ہیں۔ جن کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی طرح گولکنڈہ کے شاہی گنبد، بیجاپور کی جامع مسجد اور ابراہیم کا روضہ، سہسرام میں شیر شاہ کا مقبرہ، دہلی کی جامع مسجد، لکھنؤ کا بڑا امام باڑہ، گوالیار میں محمد غوث کا مقبرہ۔ فتح پور سیکری میں اکبر اور عیسیٰ خان کے مقبرے ارچھا، میسور جے پور کے شاہی محل، اجمیر کی مسجد حیدر آباد کی جامع مسجد، سری رنگا پٹم کی جاما مسجد، لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ، رامیشورم اور مدورا کے بڑے مندر، سری رنگم میں جمبوکیشورا کا دیول۔ قلعۂ گوالیار اور چتوڑ گڑھ کا سربلند مینار، کوہ آبو، کاشی ناتھ مندر، پٹنہ میں جینیوں کا مندر، سکھوں کا سنہری گردوارہ وغیرہ

وغیرہ نایاب عمارتیں ہیں۔ گویا صرف جواہرات، یاقوت الماس موتی ہی ہندوستان کی دولت نہیں بلکہ فن معماری سے متعلق اشکال، خاکے اور خطوط کے بے بہا خزانے بھی یہاں بکھرے پڑے ہیں۔

ہندوستان کی ایک اور حیرت انگیز زندہ یادگار اس کا رنگ ہے۔ ہندوستان کی بیٹیاں اس فن میں فطری دستگاہ رکھتی ہیں۔ بازار میں، گاؤں میں، باولی پر وہ مختلف رنگوں میں نظر آتی ہیں۔ ان کے سرخی مائل جسم پر شوخ نارنجی یا ہلکا گلابی یا گہرے سُرخ رنگ کا جوڑا ہوتا ہے۔ کسی قدر دور کیوں نہ ہوں وہ پہچان لی جاتی ہیں پہلے اس بھڑکیلے رنگ پر نگاہ پڑتی ہے۔ اور وہیں ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے۔ لپٹے ہوئے کپڑے میں سے جو اکثر پھٹا اور پیوند لگا ہؤا ہوتا ہے دو کاسے کے رنگ میں پاؤں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ہر حرکت میں ایک فطری موسیقی پوشیدہ ہے۔ سر پر جس کے پیچھے سیاہ بالوں کا جوڑا بندھا ہوتا ہے۔ پانی کا برتن رہتا ہے اس کو وہ ایک ہاتھ سے تھامتی ہے اور دوسرا ہاتھ برابر وقفے سے حرکت کرتا ہے۔ اس عورت میں جو باوجود غیر تعلیم یافتہ ہونے کے رنگ شناسی کے فن میں خداداد مہارت رکھتی ہے۔ سب سے حیرت انگیز چیز اس کی چال ہے۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی کیوں نہ ہو اس کی رفتار شاہانہ ہوتی ہے۔ اس کی باقاعدہ رفتار اس کی دوسری اقوام کی بہنوں کو متحیر کرتی ہے۔ اس میں ناقابلِ بیان خوبصورتی اور بے پایاں توازن اور غرور نظر آتا ہے۔

اس غرور کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور چونکہ اس میں تصنّع کا شائبہ نہیں۔ اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کی بنا کیا ہے۔ البتہ خوبصورتی اور توازن کی وجہ ان کی موسیقی سے محبت ہے، یہ محبت آواز کی فریفتگی سے نہیں جو صرف کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ یہ اس قوم کی ذاتی اور امتیازی صفت ہے جو یہاں کے جاہل سے جاہل میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس میں اور یورپ کی موسیقی میں کوئی مناسبت نہیں۔ جن کے کان یورپ کی موسیقی سے آشنا ہوں، ان کے سامنے اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک طویل راگ ہے۔ یہ راگ پہلے پہل تو ایک ہی طرز کا معلوم ہوتا ہے۔ جو اجنبی سامع کو ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد وہ اپنے سحر سے تسخیر کرتا اور سننے والے کو مست بنا دیتا ہے، اور پھر وہ سمجھنے لگتا ہے۔ کہ یہ راگ پوشیدہ اور مخفی طور پر قوم کی تصویر کھینچ رہا ہے۔ اس کی یکساں سامعہ نوازی ایک ایسی سرزمین کو ظاہر کرتی ہے جس سے مغربی اقوام نابلد ہیں۔ ماضی و حال کے بہترین لکھنے والوں کی شاعری کا سرمایہ پاٹ دار بھانے والی آواز اور بعض اوقات بول، یہ تمام چیزیں ان لوگوں کی حالت بیان کرتی ہیں۔ اگرچہ مذہب فرقے اور رسم و رواج کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن یہ موسیقی اور وہ نہیں جان کا مرہم ہے۔ انہیں آپس میں متحد کئے ہوئے ہے۔ یہ موسیقی گو سمجھ میں نہ آسکے [illegible]

بغیر نہیں رہ سکتی۔ الفاظ میں ہر شاعر کا اپنا فلسفہ اور طریقۂ بیان الگ ہے۔ لیکن سب کے لب ولہجہ میں گہرا تصوف مضمر ہے۔ جو وضاحت سے بالا تر ہے۔

یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ ملکِ ہندوستان قدیم وجدید، حقیقت اور افسانہ، عظمت رفتہ اور جدید ترقی کا سنگم ہے۔ میرے اس مختصر بیان سے ناظرین کے ذہن میں صرف جگمگاہٹ رنگ، حیرت انگیز عمارات اور شاندار ماضی کا (جس کی دلکشی ہنوز باقی ہے) تصور قائم ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک چیز اس ملک اور اس کے مذکورہ بالا تصور سے الگ بھی ہے اور وہ جدید ترقی ہے۔ بغیر دیکھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس قدر نئی ایجادات واختراعات سے اس ملک نے استفادہ کیا اور کس حد تک اس ملک کے باشندوں نے انہیں قبول کر لیا ہے۔ بڑے شہروں میں بہترین جدید سڑکیں، عمارتیں، دکانیں، آئین وعادات نظر آئیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ رنگ بھڑک اور نظر فریبی بھی جو ایک مشرقی ملک کا حصہ ہے۔ مدارس دواخانے اور دارالیتامے بھی موجود ہیں۔ حیدر آباد کا محبوبیہ گرل اسکول اپنی قسم کا بہترین مدرسہ ہے۔ جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ملک میں اس قدر سختی سے پردہ ہونے کے باوجود یہ کس طرح قائم ہے۔ ہندوستان کا ایک بڑا دارالیتامے بھی حیدر آباد میں ہے۔ جو نہایت خوش اسلوبی اور انتظام کے ساتھ چلایا جا رہا ہے +

اسی طرح اور بہت سے اُمور ہیں لیکن میں یہاں صرف اس قدر اضافہ کر کے اپنے مضمون کو ختم کرتی ہوں کہ مجھے اپنے ملک پر ناز ہے جو یقیناً تنوع کے وصف سے مالامال ہے۔ اگر زمانے کی تیز رفتار ترقی سے طبیعت گھبرا جائے تو دماغ کو آرام دینے کے لئے عہدِ رفتہ کے آثار موجود ہیں۔ میں نے ابھی تو اس طلسمات میں قدم رکھا ہے اور یہ کہا نہیں جا سکتا کہ اس کے اسرار کو حل کرنے کے لئے مجھے کتنی عمر صرف کرنی ہوگی +

"معارف"

تصحیح

فروری کے پرچے میں پروفیسر فیاض محمود کے مضمون میں ایک غلطی رہ گئی ہے ناظرین اس کی تصحیح کر لیں۔ صفحہ ۰۰ [illegible] ہے۔ مگر دنیا میں ایسے ناولسٹ بھی ہیں جن کی تصانیف میں زندگی کی سی وسعت پائی [illegible] میں سے ثابت ... ... الخ

تبصرہ

مرقع اکبر آباد:- یہ مولوی سعید احمد صاحب مارہروی کی قابل قدر تصنیف ہے جس میں شہر آگرہ اور ضلع آگرہ کی مفصل تاریخ کے علاوہ تمام شاہی عمارات اور آثار قدیمہ کا ذکر ہے۔ اسی سلسلے میں مختلف بادشاہوں کے عہد کی طرز تعمیر کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ آگرے کی تاریخی اہمیت مسلمہ ہے اور اسی لحاظ سے اس میں اہم تاریخی عمارات کی کثرت ہے جن کے حالات مصنف نے نہایت محنت سے جمع کئے ہیں۔ کتاب بے انتہا دلچسپ اور پُر از معلومات ہے جابجا اہم عمارتوں کی خوبصورت تصاویر بھی دی گئی ہیں جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے امید ہے کہ شائقین اس کتاب کی قدر کریں گے بڑی تقطیع حجم ۲۳۲ صفحات کاغذ نفیس سرورق خوبصورت۔ قیمت عہ

پتہ :- مولوی سعید احمد صاحب مارہروی مینجر شعیب محمدیہ ہائی سکول آگرہ

خواب و خیال:- یہ حضرت مجنوں گورکھپوری کے آٹھ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے دلچسپ ہیں اور ایک خاص قنوطی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ شاید اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض محبت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ لیکن افسانے حقیقت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور بیشتر افسانوں کے پلاٹ میں قریبی مشابہت پائی جاتی ہے۔ حضرت مجنوں کا طرز بیان دلکش اور درد میں ڈوبا ہوا ہے حجم ۲۶۵ صفحات چھوٹی تقطیع کتاب مصنف کی تصویر سے مزین ہے قیمت فی جلد عہ

ایوان اشاعت گورکھپور سے طلب فرمایئے

شمیم:- یہ علی گڑھ کے طلبہ کا ایک قصہ ہے جسے فیاض علی صاحب بی۔ اے (علیگ) نے بہت خوبی سے لکھا ہے اس میں علی گڑھ کے طلبہ کے مذاق ان کی شوخیوں اور بذلہ سنجیوں کی لطیف جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ افسانے کا موضوع محبت اور شادی ہے اور اس سلسلے میں ہندوستانی لڑکیوں کی شوخیوں اور چہلوں کے نظارے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ناول پہلے تصاویر کے بغیر چھپا تھا مگر اس کا نیا ایڈیشن مصوّر ہے۔ چنانچہ بہت سی ہاف ٹون تصاویر سے کتاب مزین ہے۔ ناول دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ دونوں حصے مجلد فروخت ہوتے ہیں قیمت فی حصہ مجلد عہ

مینجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے منگوایئے۔

اقبال:- اردو کا یہ ماہوار رسالہ وزیر آباد سے جاری ہوا ہے۔ نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ اس کے سرپرست ہیں اور جناب تبسم قریشی ایڈیٹر۔ باوجودیکہ وزیر آباد طباعت و اشاعت کے مرکزوں سے دور ہے اس رسالے کی طباعت و کتابت اپنے مضامین کی طرح قابل تعریف ہے جناب مدیر نے رسالے کی ترتیب و تدوین میں حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ حضرت تبسم خود شاعر و ادیب ہیں چنانچہ اقبال میں مضامین نظم و نثر کا انتخاب نہایت مناسب ہے چندہ سالانہ تین روپے ہے حجم ۴۸ صفحات ہمایوں کا سائز

پتا :- مینجر اقبال وزیر آباد (پنجاب)

شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد

انشاء اللہ تین ہفتے کے اندر اندر شائع ہو جائے گی

نہایت مسرت سے اعلان کیا جاتا ہے کہ شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد اللہ کے فضل و کرم سے مکمل ہو چکی ہے اور اس وقت لاہور کے ایک مطبع میں پہلی جلد سے بھی زیادہ آب و تاب کے ساتھ طباعت پذیر ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس ماہ کے اندر شائع ہو جائے گی۔

جنگ بدر جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں صرف تین سو تیرہ نہتے اور بے سر و سامان مجاہدین اسلام نے مشرکین مکہ کی بڑی فوج کے زبردست حملے کا مقابلہ کیا اور صرف جوش ایمانی سے کام لیکر دشمنوں کو شکست فاش دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح مشرک قیدیوں پر احسان فرمائے۔ مدینے میں منافقین اور یہود کی شرارتیں۔ مسلمانوں کا صبر و تحمل۔ کعب بن اشرف یہودی ہجو گو شاعر کا انجام

مکے میں مشرکین کا جوش و خروش اور انتقامی جنگ کی تیاریاں۔ ابو سفیان کا مدینے پر چھاپا۔ غزوۂ سویق۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح کی سادہ تقریب۔ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا جہیز

مشرکین مکہ کا ابو سفیان کی ماتحتی میں مدینے پر تباہ کن حملہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا مدافعت کے لئے مدینے سے نکلنا۔ منافقین کی جماعت کا عین وقت پر فوج اسلام سے الگ ہو جانا۔ صحابۂ کرام کا ثبات و استقلال۔ تیر اندازوں کی غلطی کے سبب جنگ مغلوبہ میں مسلمانوں کی فتح کا شکست سے بدل جانا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محیر العقول ثبات اور صحابہ کی جاں نثاریاں۔ آنحضرت کا زخمی ہونا۔ مشرکین مکہ کا بے نیل مرام واپس لوٹنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ اسلامی کے یہ سب حالات نہایت واضح اور آسان اردو میں اس طرح نظم کر دئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے قوم کی افسردگی اور بے چینی دور ہو سکتا ہے۔ جن حضرات نے پہلی جلد کا مطالعہ کیا ہے اگر وہ دوسری جلد کا بھی اشتیاق رکھتے ہوں تو جلد از جلد فرمائش بھیج دیں۔ یہ جلد بھی پہلی جلد کی طرح دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے کتابت طباعت اور کاغذ پہلی جلد سے بھی بہتر ہے تقطیع اور ضخامت بھی وہی ہے اور قیمت بھی وہی ہے یعنی تین روپے فی جلد علاوہ محصول ڈاک

(نوٹ) تین روپے فی جلد والے ایڈیشن کے علاوہ اس جلد کا بھی ایک خاص ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے یہ ایڈیشن محدود ہوگا یعنی صرف ۵۰ کتابیں چھاپی گئی ہیں۔ یہ مجلد اور مطلا اور مذہب ہوگا۔ بالکل جلد اول کے خاص ایڈیشن کی طرح۔ اس کی قیمت فی جلد ساڑھے سات روپے ہو گی۔ اس کا کاغذ تین روپے والی جلد سے مختلف اور بڑھیا ہے۔

جن حضرات نے پہلی جلد کا خاص ایڈیشن منگایا تھا وہ بھی جلد فرمائش ارسال کریں تین روپے والی جلد خریدنا ہے۔

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ شاہنامۂ اسلام انارکلی۔ لاہور

قواعد

۱- "ھُمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم چوسٹھ صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱؎ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹- قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۳؍ (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۶؍۔

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳- لارنس روڈ لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرست مضامین

جلد ۲۳ — نمبر ۵

"ہمایوں" بابت ماہ مئی ۱۹۳۳ء

تصویر:- موت کا انتظار

قیمت فی پرچہ ۶/ — ڈیلر بک سٹال پر ۸/ — چندہ سالانہ للعہ مع محصول

طلسمِ زندگی

روزنامہ "مدینہ" کی رائے

"یہ کتاب جو ہمارے پاس ریویو کے لئے وصول ہوئی ہے جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن بیرسٹرایٹ لا ایڈیٹر رسالہ ہمایوں" لاہور کے پاکیزہ مضامین کا مجموعہ ہے جن لوگوں نے رسالہ ہمایوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے ضرور آگاہ ہوں گے کہ جناب میاں صاحب موصوف ایک ایسے طرزِ نگارش کے مالک ہیں جو دلفریب شوخی کے ساتھ اچھوتی متانت اور پاکیزہ سنجیدگی کا حامل ہے طلسم زندگی کے مضامین اس خصوصیت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں، فاضل مضمون نگار نے اپنی شوخیِ قلم اور رنگینیِ خامہ سے ایسی فردوس نظر گلکاریاں کی ہیں جن پر ہم اردو بجا طور پر ناز کر سکتی ہے اکثر مضامین نفسیات کے اعتبار سے شاہکار کہے جا سکتے ہیں اور ان کے اسلوب و تنوع سے یہ مترشح ہوتا ہے، کہ مضمون نگار کی دقت پسند اور حقیقت بین نظروں نے فطرت کا کس قدر امعان و تعمق سے مطالعہ کیا ہے اور فلسفہ کائنات کو سمجھ کر اس کی تشریح کس قدر سلیس اور دلچسپ پیرایہ میں کی ہے بعض مضامین اس نوعیت کے ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد دل و دماغ پر انبساطی کیفیت طاری ہو جائیگی اور روح ایک غیر فانی کیف اور بالیدگی حاصل کرے گی اس کے ساتھ بعض مضامین اس قدر گہرے تاثرات سے لبریز ہیں، جن کا مطالعہ سنگدل سے سنگدل انسان کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان مختلف کیفیات تنوع اور تعدد کے بعد کمال یہ ہے کہ نفسیاتی حسن کے رنگ نظر آتے ہیں، اور بہت کم مضامین ایسے ہیں جو نفسیات پر ایک مبسوط مقالہ کی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔

افسوس ہے کہ بخوف طوالت ہم تفصیل کے ساتھ مضامین پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ طلسم زندگی پر تفصیلی تبصرہ خود ایک کتاب کی صورت اختیار کریگا کتابت و طباعت کی دیدہ زیبی بے نیاز ستائش و تحسین ہے۔ سرورق حسنِ مجسم ہے اور جلد کی پائدار رعنائی نظر نواز۔ بعض مضامین مصور ہیں (Illustrated) ہیں اور تصاویر اپنی موزونیت اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے خاص طور پر قابل قدر ہیں، بیچ بیچ میں مطلا اور رنگین خاکے بھی ہیں، جو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں، رفعتِ مضامین سے قطعِ نظر کرتے ہوئے بہ حیثیت ظاہری تزئین و آرائش کے بھی کتاب کو یورپ کی حسین ترین کتاب کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے اور ہندوستان میں تو شاید ہی اس قدر اہتمام سے کوئی اردو کتاب اشاعت پذیر ہوئی ہو ہم جناب میاں بشیر احمد صاحب کو اس کامیاب تصنیف پر مبارکباد دیتے ہیں ہم کو امید ہے کہ ملک میں اس نادر مجموعہ کو قبولیت عام حاصل ہوگی"

اس کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے۔

جہاں نما

کنگ جارج کا یادگار عہدِ حکومت

کنگ جارج کو سریر آرا ہوئے بائیس سال گزرے ہیں، ان کے عہدِ حکومت میں اس قدر تاریخی واقعات پیش آئے ہیں کہ انگلستان کے فرمانرواؤں کے اس طویل سلسلے میں سے کسی بادشاہ کے عہد میں بھی پیش نہیں آئے جس کا آغاز ولیم فاتح نے ۱۰۶۶ء میں کیا تھا ان کے عہد میں بے تار برقی نامہ و پیام کا آغاز ہوا اور برق اور بھاپ کی قوت اور ان کا استعمال غیر معمولی حد تک ترقی کر گیا، اس کے علاوہ فن پرواز نے حیرت انگیز ترقی کی، ابتدائی بے ڈھنگے اور سست رو طیاروں کے بجائے ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے ایروپلین ایجاد ہوئے اور تہذیب تمدن نے اس سرعت سے ترقی کی کہ دیکھتے دیکھتے اس منزل میں جا پہنچی جو پہلے صرف جیول ورنر جیسے مصنفوں کی خیالی جولاں گاہ تھی۔

سب سے بڑا واقعہ جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، بلا شبہ جنگِ عظیم ہے یہ چار سال بجائے خود دنیا کی تاریخ کا ایک جداگانہ باب ہیں۔ اس جنگ کے اثرات عالمگیر تھے خود انگلستان کی کایا پلٹ گئی اور وکٹوریا اور ایڈورڈ کے زمانے کی امیرانہ وضع داری کی جگہ موجودہ آزاد اور سبک طرزِ معاشرت نے لے لی۔

ایک اور اہم واقعہ عورتوں کی آزادی کا ہے، اب عورتیں مردوں کی بہت کم دست نگر رہ گئی ہیں اور مردوں اور عورتوں کے تعلقات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، عورتیں کاروبار میں زیادہ حصہ لینے لگی ہیں اور ان کے لباس اور تمدن و معاشرت میں بھی ایک اہم انقلاب رونما ہے۔

اسی عہد میں یورپ کے طول و عرض میں جمہوریت کے جراثیم پھیلنے شروع ہوئے، کئی حکمران خاندانوں کا زوال ہوا، کئی بادشاہ معزول ہوئے اور کئی نظامِ حکومت متبدل ہو گئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یورپ کے شاہی خاندانوں کی باہمی شادیوں کا وہ سلسلہ بھی ٹوٹنے لگا جس کی وجہ سے یورپ کے اکثر حکمران خاندانوں اور انگلستان کے شاہی خاندان کے درمیان قریبی تعلقات قائم تھے۔

۱۹۱۰ء میں تخت نشین ہونے کے وقت سے لے کر اب تک کنگ جارج کو اپنی سلطنت کے مختلف حصوں کے خود مختار ہو جانے کا خطرہ نظر آتا رہا ہے سلطنت پر ان کے آئینی اختیارات میں تخفیف بھی ہوئی اور ان کا خطاب بھی بدل گیا۔ چنانچہ وہ بجائے شاہِ برطانیہ و آئرلینڈ کے شاہِ سلطنتِ متحدہ برطانیہ و آئرلینڈ ہو گئے۔

انہیں کے زمانے میں (۱۹۲۴ء) برطانی حزب العمال کی حکومت پہلے پہل قائم ہوئی اور نتیجۃً کنگ جارج کو مزدوروں
پولیس والوں سے ملنا پڑا، اس کے بعد انہوں نے مختلف جماعتوں کو برسر اقتدار آتے دیکھا اور آخر یہ قومی حکومت قائم ہوئی جس
صدر بادشاہ کے دلی دوست ریمزے میکڈانلڈ ہیں۔

اس عہد حکومت میں بسرعت اور پے درپے واقعات پیش آتے رہے ہیں کئی چھوٹے اور بڑے مصائب ٹوٹتے رہے،
مہمات سر کی گئیں اور کئی اہل فن دوسروں کے مقابلہ میں حیرت انگیز سبقت حاصل کرتے رہے، اس کے علاوہ ان کے عہد میں سلطنت
ئی قابل رشک کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔

انہوں نے جمعیت اقوام کی صورت میں عالمگیر صلح کی پہلی کوشش دیکھی اور اس کے بعد اب تک صلح کے لئے لاتعداد
اس منعقد ہوتی رہی ہیں۔

انہوں نے ۱۹۳۰ء میں خود بحری تخفیف اسلحہ کی انجمن اور گول میز کانفرنس کا افتتاح کیا جس نے ہندوستان کو ایک حد تک
ادی دینے کی کوشش کی۔

انہیں کے عہد میں تقریباً سو سال کی آزاد تجارت کے بعد برطانیہ نے اپنے لئے تجارتی تحفظ کی ضرورت محسوس کی، اور اس
سلئے وسائل اختیار کئے اسی عہد میں اقتصادی مشکلات کی وجہ سے انگلستان کے لئے معیار طلائی کا التوا ناگریز ہوگیا، تاکہ لنڈن
شہرت بحیثیت دنیا بھر کے ساہوکار کے قائم رہ سکے۔

انہیں اپنی والدہ ملکہ الگزنڈرا کے انتقال کا غم دیکھنا پڑا، اس کے علاوہ ہر سال وہ اپنی رعایا کے ساتھ مل کر اُن میں
ہ سپاہیوں کا ماتم کرتے ہیں، جو گزشتہ جنگ عظیم میں کام آئے۔ خواہ کنگ جارج انگلستان کے عظیم الشان بادشاہوں میں شمار
ن کئے جائیں اور ان کا نام دوسرے بادشاہوں کی طرح آئندہ یاد نہ بھی رکھا جائے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ
، کا عہد حکومت یقیناً اہم ترین عہد ہے، ان کے زمانے میں سلطنت برطانیہ کرۂ ارض کے ایک ربع پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے، اُن
رعایا آبادی میں چھیالیس کروڑ تیس لاکھ نفوس تک بڑھ گئی ہے۔ اور یہ تعداد دنیا کی آبادی کا ¼ حصہ ہے، ان کے زیر نگیں دو سو
ں مختلف زبانیں بولنے والی اقوام آباد ہیں، اُن کی رعایا میں دنیا کے ہر مذہب و ملت کے افراد بستے ہیں، اور ان مذاہب میں
ا کے ابتدائی مذاہب سے لے کر جدید ترین مذاہب تک سب شمار کئے جا سکتے ہیں نیز نوع انسان کے یہ کروڑوں نفوس جو
ج پنجم کی رعایا ہیں سینکڑوں مختلف نسلوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابھی معلوم نہیں کنگ جارج کے عہد میں اور کیا کیا واقعات پیش نہ آئیں گے۔

بنگال میں اردو

۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق صوبہ بنگال میں ۴۶ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگال میں مختلف اقطاعِ عالم سے آکر لوگ آباد ہو گئے ہیں، بنگال کی کل آبادی ۵۱۰۸۷۰۰۰ ہے اس میں سے ۱۸۹۱۲۳۷ ہندوستانی (اردو) بولتے ہیں، اردو کے بعد غیر بنگالی زبانوں میں سب سے زیادہ تعداد اڑیا بولنے والوں کی ہے، اس کا شمار ۱۵۹۰۰۰ کے قریب ہے جو اردو کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے، صرف کلکتے میں پچاس مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں بولنے والوں کی کل تعداد ۱۱۹۶۷۲۴ ہے، ان میں سے بنگالی بولنے والے ۶۴۸۴۵۱ ہیں اور ہندوستانی بولنے والے ۴۳۶۱۲۳۔ اگرچہ انہیں اعداد و شمار سے بنگال میں اردو کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے لیکن اگر دوسرے بڑے بڑے شہروں کے اردو بولنے والوں کا مقابلہ کلکتے سے کیا جائے تو پھر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے، اُن بڑے بڑے شہروں کی آبادی حسب ذیل ہے جن میں زیادہ تر اردو زبان بولی جاتی ہے :-

دہلی	۴۴۷۴۴۲	کانپور	۲۴۳۷۵۵
لاہور	۴۲۹۷۴۷	آگرہ	۲۲۹۷۶۴
لکھنو	۲۷۴۶۵۹	بنارس	۲۰۵۳۱۵
امرتسر	۲۶۴۸۴۰	الہ آباد	۱۸۳۹۱۴
پٹنہ	۱۵۹۶۹۰		

ان شہروں میں صرف دہلی کی آبادی کلکتے کے اردو بولنے والوں کی تعداد سے بقدر ۱۱۳۱۹ کے زیادہ ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ دہلی میں ان لوگوں کی تعداد ۱۱۳۱۹ سے کافی زیادہ ہے جو اردو نہیں بولتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کلکتہ اردو بولنے والوں کا سب سے بڑا مرکز ہے، بنگال میں اردو زبان کی اہمیت تسلیم کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں ؛

تصویر

موت کا انتظار - یہ تصویر بوہیمیا کے مصور گبرائیل میکس کے کمالِ فن کی مظہر ہے، فنونِ لطیفہ کی واقفیت اور قدر شناسی میں اہلِ بوہیمیا ضرب المثل ہیں اور یہ مصور اپنے ملک کے بہترین مصوروں میں شمار کیا گیا ہے، اس کا تخیل نہایت روشن اور واضح تھا اس لئے اس کی تصاویر میں ایک مقناطیسی جذب پایا جاتا ہے، موجودہ تصویر میں عیسائی لڑکیاں اپنی موت کے لئے ان درندوں کے جاگنے کی منتظر ہیں، جن کے رحم پر ملحد حکومت کے جبر نے انہیں چھوڑ رکھا ہے ؛

محبّت اور شادی

موجودہ زمانے کی روشِ خیال کو دیکھ کر کچھ یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ عہدِ ماضی کے حالات و مسائل سے ہمیں کوئی تعلق نہیں رہا اور ہم صرف حال اور مستقبل کے لئے زندہ ہیں۔ گزشتہ زمانے میں مذہب کو ہمارے معاشرتی معاملات میں اتنا دخل تھا کہ معاشرہ کے تقریباً تمام رسوم و رواجات اس کے دائرہ عمل میں آجاتے تھے لیکن مذہبی خیالات میں جو انقلاب پیدا ہو چکا ہے اس کا اندازہ ہمارے اس مضمون سے کیا جا سکتا ہے "جو مستقبل کا مذہب کیا ہوگا؟" کے عنوان سے "ہمایوں" کے کسی گزشتہ پرچے میں شائع ہوا تھا۔

شادی کے عہد کی پابندی کرنا اور بچے پیدا کرنا بھی ایک زمانے تک خالص مذہبی فرائض شمار کئے جاتے تھے لیکن اب مذہب سے آزاد ہو کر ان مسائل پر غور کیا جا رہا ہے۔ انہیں اہلِ فکر حضرات نے جن کے خیالات "آئندہ مذہب" کے متعلق ہم پیش کر چکے ہیں ان دو مسائل پر بھی اپنی آرا کا اظہار کیا ہے کہ آیا محبت کے خاتمے پر شادی کا تعلق قطع کر دینا چاہیئے یا نہیں اور آیا بچوں کا وجود شادی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔ پہلا سوال اس لئے پیدا ہوا کہ جب ایک سچی شادی ہوتی ہے تو میاں بیوی دونوں عہد کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک جدا نہ ہوں گے جب تک کہ موت ہم کو جدا نہ کرے۔ اور یہ ایک ایسا عہد ہے کہ انسان اس کی پابندی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس حیثیت سے یہ ایک خالص مذہبی سوال معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا ایک معاشرتی پہلو بھی ہے۔ اس مضمون میں ہمارے مدِنظر یہی پہلو ہے اور ہم نے صرف ایسی آرا کا انتخاب کیا ہے جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسرا سوال اس لئے پیدا ہوا کہ کہتے ہیں دنیا کی آبادی ضرورت سے بہت بڑھ چکی ہے۔ اور اقتصادی حالات بچے پیدا کرنے کی اجازت نہیں دیتے، اس کے علاوہ جسمانی حالات بھی بعض اوقات نامساعد ہوتے ہیں۔

یہ آرا یا اقوال دراصل ایک ہی موضوع کے متعلق بہت سے چھوٹے چھوٹے اور دلکش مضامین ہیں۔ لیکن اگر ہم ان سب مضامین کو ایک مضمون اور جتنے دماغوں سے یہ پیدا ہوئے اُن کو ایک دماغ تصور کریں تو ان کی حیثیت اس ہیجانِ خیال اور تذبذب کی سی نظر آئے گی جو ایسے معاملات کو طے کرتے وقت ہمارے دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ ہم محسوس کرنے لگیں گے کہ محبت شادی کے لئے ضروری بھی ہے اور کچھ اتنی ضروری بھی نہیں۔ محبت ختم ہو جائے تو قطعِ تعلق ضروری بھی ہے اور کچھ اتنا ضروری بھی نہیں

شادی کی کامیابی کے لئے بچے ضروری بھی ہیں اور کچھ اتنے ضروری بھی نہیں۔ آخر کون کہہ سکتا ہے کہ شادیاں سب محبت کی وجہ سے ہوتی ہیں اور اسی لئے وہ برقرار ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اب محبت مردہ ہوگئی اور اس لئے شادی فسخ ہو جانی چاہیئے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ بچے شادی کے تعلق کو مضبوط نہیں کر دیتے یا ان کی وجہ سے ازدواجی زندگی بعض اوقات عذابِ جان نہیں بن جاتی؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے قیام کے لئے خیر و شر کا ایک زبردست توازن کارفرما ہے جو ہماری جلد بازانہ بلند پروازیوں کو بروئے کار نہیں آنے دیتا لیکن جو وقت پر وہی کچھ ظہور میں لاتا ہے جو بہتر ہوتا ہے۔

اگر محبت ختم ہو جائے تو کیا شادی کا تعلق قطع کر دینا چاہیئے؟

مسٹر بیورلے نکولس

شادی اور محبت کے درمیان کبھی مجھے ادنےٰ سا تعلق بھی نظر نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کامیاب شادی کا اصل الاصول ہی یہ ہے کہ طرفین میں سے کسی کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت نہ ہو۔ آخر شادی کے معنی تو یہی ہیں نا کہ ہم اکٹھے رہیں لیکن ہم صرف اپنی بیویوں کے ساتھ نہیں رہتے۔ مجھے اپنے سیکرٹری کے ساتھ، اپنی خادمہ کے ساتھ اور کم و بیش بہت سے اور لوگوں کے ساتھ بھی رہنا پڑتا ہے اور اگر ان سب کے عشق میں میرا دل ہر وقت دھڑکتا رہے تو زندگی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائے

زندگی سے ہم بہت زیادہ توقع رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شادی اور محبت کے متعلق ہم اس قسم کی بیہودہ سرائی کرتے رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے کیک کو کھا بھی جائیں اور پھر بھی وہ ہمارے پاس باقی رہے، ایک خیالی دیوی کی پرستش بھی کریں اور اُس سے ہم آغوش بھی ہوں یہ سب باتیں نہایت افسوسناک ہیں۔

مسٹر ایتھل مینن

یہ حالات پر منحصر ہے، سب سے پہلے بچوں کی فلاح و بہبود کا خیال کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر بچے موجود نہ ہوں اور شوہر اور بیوی دونوں قطعِ تعلق کرنا چاہیں۔ تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ شادی کیوں نہ فسخ کی جائے۔

مسٹر سٹارم جیمیس

اگر محبت نہ ہو تو قطعِ تعلق میں کیا مضائقہ ہے؟ لیکن اگر اس تعلق سے بچے بھی ہوں تو سب سے پہلے اُن کی فلاح و بہبود کا خیال کرنا چاہیئے اگر میاں بیوی دونوں اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی جذبہ حرمت نہیں پاتے تو قانونی عہد و پیمان کی زنجیروں میں جکڑ کر اُن کو اس پر آمادہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں اس عامیانہ نظریہ کی قائل نہیں ہوں کہ شادی کے لئے صرف محبت ایک ضروری شے ہے۔ اس کے سوا اور بھی کئی باتیں اسی قدر ضروری ہیں۔ مثلاً احترام خواہش۔ شادی ایک حالت

ہے، ایک مشین نہیں جس میں اکنی ڈالی اور مسرت نکال لی ؛

مسٹر آلیو بالڈون رکن پارلیمان

شادی کو محبت سے اتنا کم لیکن رفاقت سے اتنا زیادہ تعلق ہے کہ زیر بحث سوال کو کوئی روحانی اہمیت حاصل نہیں۔ معاشرتی حیثیت سے اِسے کوئی اہمیت حاصل ہو تو ہو ؛

مارکوئس آف ڈونیگل

بچے موجود بھی ہوں تو باہمی رضامندی سے طلاق ہو جانی چاہیئے۔ موجودہ زندگی میں قبیلہ داری کی اہمیت یا عملیت روز بروز کم ہو رہی ہے اور آئندہ بچے خود بخود پرورش پا جایا کریں گے۔ دوسری صورت جس میں بچے ایک بدمزگی اور نفرت کی فضا میں پرورش پائیں، میرے خیال میں والدین میں سے ایک کی جدائی سے بدتر ہے ؛

مسٹر سیسل بیٹن

اگر میاں بیوی دونوں کی محبت مردہ ہو جائے تو دوستو اسے حُسنِ اتفاق سمجھو اور جُدا ہو جاؤ۔ کیونکہ مشکل یہ ہے کہ عام طور پر محبت صرف ایک دل سے رخصت ہوتی ہے، اور اگر اس حالت میں شادی کا تعلق قطع کیا جائے تو محبت رکھنے والے فریق کے واسطے زندگی کچھ عرصے کے لئے ایک عذابِ الیم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ محبت کا جواب محبت نہ ملنے پر تعلقات کو بھول جانے کا بھی بہت امکان ہوتا ہے لیکن یہ بدمزگی بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک فریق کی تمام زندگی کسی ایسے شخص کی بے جا وارفتگی کی وجہ سے ایک ناقابلِ برداشت عذاب ہو جائے جس کی محبت کا معاوضہ اُس سے نہ بن پڑتا ہو ؛

مس دافنے دموریئے

طبعی جذبہ عقل و فہم سے ایک بالاتر وصف ہے ازدواجی زندگی کے چند ابتدائی سالوں کی بنیاد یہی جذبہ ہے اور مستقبل کی کامیابی کا انحصار اسی کے دانشمندانہ ضبط و اختیار پر ہے لیکن پھر بھی لوگوں کو اُس وقت تک شادی نہیں کرنی چاہیئے جب تک باہمی اعتماد، محبت اور رفاقت بھی اُن میں بدرجہ اتم موجود نہ ہو۔ شادی بالکل بیکار ہے جب تک کہ دو انسان ایک دوسرے کے لئے ہر حیثیت سے لازم و ملزوم کا درجہ نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہ نہیں تو پھر بہتر ہے کہ دونوں الگ الگ رہیں تاکہ بدمزگی اور مصیبت کا موقع ہی پیدا نہ ہو ؛

مسٹر انتھونی ایم لوڈووِسی

شادی کا تعلق یقیناً نہیں ٹوٹنا چاہیئے۔ نوعِ انسان لاکھوں برس سے دیکھ رہی ہے کہ محبت مٹ جاتی ہے لیکن شادی کی رسم پھر بھی قائم ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ شادی ایک تمدنی اور معاشرتی مقصد کی تکمیل کرتی ہے، اس کے مدنظر کوئی جذباتی مقصد نہیں ہوتا

شادی کا کچھ قصور نہیں غلطی اُن جذبات پرستوں کی ہے جو شادی کو محبت کا واحد منبع اور ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس کی ابتدا کو محبت سے متعلق سمجھتے ہیں۔ یہ ایک غلط اور بیہودہ خیال ہے شادی ایک ضروری معاشرتی حالت ہے جس میں محبت کی موجودگی کو کوئی دخل نہیں اور اگر شاذ و نادر کبھی ہوتا بھی ہے تو اُس وقت جب ابھی معاہدۂ نکاح کا احساس بحیثیت معاہدہ نہ ہوا ہو +

مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ویکفیلڈ:۔

میرا جواب نفی میں ہے۔ اگر بچے ہوں تو سب سے پہلے اُن کے متعلق غور کرنا چاہیئے۔ شوہر اور بیوی محبت کے بغیر بھی باہم خوش رہ سکتے ہیں ممکن ہے کہ اُن کے ایک جگہ رہنے سے محبت دوبارہ پیدا ہو جائے پھر شادی کو کیوں منسوخ کیا جائے ؟

مسٹر کالن کلائیو:۔

ہاں میرا خیال ہے کہ اگر محبت نہ رہے تو قطعِ تعلق کر لینا چاہیئے۔ میں اسے خلافِ اخلاق، قابلِ نفرت اور خلافِ فطرت سمجھتا ہوں کہ دو ایسے آدمی یکجا رہیں جن کو ایک دوسرے سے محبت نہ ہو۔ میرے دل میں اُن بیاہے ہوؤں کی بہ نسبت جو فریب اور منافقت میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہوں اُن محبت کرنے والوں کی زیادہ عزت ہے جو گناہ کی زندگی گزار رہے ہوں +

مسٹر ڈی جی لے لو:۔

محبت، سچی اور کامل محبت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ ایک ناقص دنیا کے ناقص انسانوں کی محبت ہی ایسی ناپائدار ہو سکتی ہے کہ اس میں کمی بھی واقع ہو سکے اور وہ مٹ بھی سکے اگر یہ بات غلط ہے، اگر عمر بھر کے اُس عہدِ رفاقت کے لئے جسے محبت کی شادی کہتے ہیں کوئی بنائے قیام باقی نہ رہے، اگر خیال اور احساس میں ایسی تبدیلی واقع ہو جائے کہ کسی مشترک مسرت سے لطف اندوز ہو سکنے کا امکان نہ ہو تو غالباً رشتۂ ازدواج منقطع ہو جانا چاہیئے +

مسٹر چارلس گریوز:۔

شادی کا انقطاع میاں بیوی کی حمیت و غیرت پر منحصر ہے جس کے ساتھ یہ سوال بھی شامل ہو جاتا کہ آیا اس شادی سے کچھ بچے بھی ہیں ؟

مسٹر آئرس بیری:۔

شادی ایک معاشرتی معاہدہ ہے، جذباتی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ شادیاں جو باہمی آسانی و آسودگی اور مشترک خواہشات اور دوستی پر مبنی ہوں معاشقہ کی شادیوں سے بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ اگر دونوں فریق آسانی سے یکجا زندگی نہ گزار سکیں۔ اگر وہ آئندہ ایک دوسرے کے دوست نہ رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اُن کو قطعِ تعلق کر لینا چاہیئے اور تین مہینے کے بعد دوبارہ شادی کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے +

لیڈی ڈاروتھی ملز :-

شادی ایک حلفِ محبت ہے یا کم از کم مروت اور احترامِ رفاقت کا ایک معاہدہ ۔ اگر یہ نہیں تو ایک بے حقیقت ذلت آمیز حالت ہے جو ایک مستقل اور فضول رنج و مصیبت کا باعث ہوتی ہے اور دونوں فریقوں کی قدر و منزلت اُن کے ہمنوں کی نظروں سے گرا دیتی ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے فسخ کر دیا جائے ۔

مسٹر ریمنڈ میسے :-

ہر معاہدے کی طرح شادی کے معاہدے میں بھی زیادہ سے زیادہ مسرت مدِنظر ہونی چاہیئے ۔ اس منظر سے زیادہ مکروہ کوئی شے نہیں کہ ایک مرد اور ایک عورت ایسی حالت میں اکٹھے رہنے پر مجبور ہوں جبکہ رشتۂ محبت ہی اُن کے اتحاد کو قائم رکھنے سے عاجز آ گیا ہو ۔

مسٹر گاڈفرے ون :-

یقیناً شادی منسوخ نہیں ہونی چاہیئے ۔ کامیاب شادیوں میں سے بہت سی ایسی ہیں جن میں شوہر اور بیوی صرف دوست دوست ہیں ۔ آخر شہوانی محبت کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اُسے پژمردہ و افسردہ ہو جانا چاہیئے ۔ پھر اگر ایسے موقع پر رشتۂ ازدواج منقطع ہو جایا کرے تو معاہدۂ نکاح کے کیا معنی اور کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے ۔ دوسری طرف ایک ایسی شادی جس کا انحصار اتنا محبت پر نہ ہو جتنا مروت، باہمی احترام اور اشتراکِ مزاج پر ہو تمام اُن مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے جو اُس کی راہ میں ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بھول گئے ہیں کہ شادی ایک معاشرتی ضابطہ ہے ۔ محض جذبات کے لئے ایک پردہ نہیں ہے ۔

مسٹر شیلا کے سمتھ :-

آپ کے سوال سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے —— کیا شادی منسوخ ہو سکتی ہے ؟ پھر محبت کی تعریف کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے محبت کی بعض اقسام ایسی ہیں کہ وہ شادی کا مقصد پورا ہونے سے پہلے ہی مردہ ہو جاتی ہیں اس کے برعکس ایک محبت لازوال بھی ہوتی ہے ۔

مس کیتھلین نسبٹ :-

اس کا انحصار اُن معنوں پر ہے جو آپ لفظِ محبت سے منسوب کرتے ہیں ۔ ابتدائی دنوں کا جوش اور ولولہ تو ایک ختم ہونے والی شے ہے اور شادی اس کے بغیر بھی ایک عمدہ رشتے کی صورت میں باقی رہ سکتی ہے ۔ لیکن اگر محبت کا لفظ وہی مفہوم ادا کرتا ہے جو دوستوں کی محبت، بچوں کی محبت اور ملک کی محبت کا ذکر کرتے وقت ہمارے ذہن میں ہوتا ہے ، اور اگر اس کے معنی

مروت، توجہ، وفاداری اور احترام کے احساس کے ہیں تو پھر میرا خیال ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں شادی ایک بداخلاقی پیدا کرنے والا رشتہ ہے اور جب اس قسم کی محبت جاتی رہے تو جس قدر بھی جلد ہو سکے اس رشتے کو توڑ دینا چاہیئے۔

مسٹر گلبرٹ فرینکاؤ:۔

تمام شادیاں باہمی رضامندی سے فوراً منسوخ ہو جانی چاہیئے۔

مس ٹینیسی ہیٹن:۔

اگر محبت کی پہلی سی وارفتگی گزر بھی چکی ہے تو کیوں دو شریف شخص ایک ہی چھت کے نیچے ایک مطمئن اور کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے؟ اور اگر انہیں یہ ناممکن نظر آتا ہے اور اُن میں سے ایک کو کسی تیسرے مرد یا عورت سے محبت ہے تو پھر ہر وقت کی گھبراہٹ اور آنکھیں چرانے سے کیا فائدہ ہے؟ اگر اُن میں سے ایک فریق دوبارہ شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے تڑپانے کے بغیر ایسا کرنے دو، عدالتوں میں تمنچوں کے مناظر اور محبت کے خطوط پیش کرنے سے کیا حاصل ہے؟

مس ایڈنا بیسٹ:۔

ہاں۔ اگر محبت حقیقت میں مرجائے تو صرف قطعِ تعلق ہی ایک دانشمندانہ فعل ہے۔ محبت دنیا کی حسین ترین چیز ہے لیکن محبت نہ ہو تو صرف قانونی پابندی میں کوئی حسن نہیں ہے؟ یہ نہایت کریہہ المنظر ہے۔

مسٹر کاپٹن میکنزی:۔

محبت کیا شے ہے؟ اور یہ فیصلہ کون کرے کہ محبت ختم ہوئی یا نہیں؟

مسٹر کینیتھ ونٹر:۔

محبت رخصت ہو جاتی ہے تو دوستی اور اتفاقِ رائے پھر بھی اکثر باقی رہتے ہیں۔ ان میں محبت سے بڑھ کر استقلالِ تعلق کا مادہ موجود ہوتا ہے جب یہ بھی رخصت ہو جاتے ہیں تو اُس وقت جس قدر جلد بھی قطع تعلق کیا جائے بہتر ہے۔

مسٹر جے جیفرسن فارجیون:۔

یہ ایک غضب کا مشکل سوال ہے۔ محبت ہے کیا چیز؟ شہوت تقریباً ہمیشہ مرجاتی ہے یا مٹ جاتی ہے لیکن ایک اور بے بہا چیز کے باقی رہنے کا امکان ہوتا ہے اگر یہ باقی رہ جائے تو ایک ایسے تعلق کے قطع کرنے سے کیا حاصل ہے جو شہوت کے مقابلے میں حیرت انگیز طور پر فائدہ مند ہو لیکن شہوت کو تسکین دینے کی مجبوری ہو تب البتہ بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ محبت کی تشریح اس لفظ کے چار حروف نہیں کر سکتے۔

مس روزیٹا فوربس :-

اگر میرا یہ خیال ہوتا کہ محبت کے اختتام پر شادی فسخ کر دینی چاہیئے تو میں کہتی کہ محبت کرنے والے کبھی شادی نہ کریں

مسٹر آئیور نویلو :-

اگر محبت مردہ ہو جائے اور بچے بھی موجود نہ ہوں تو یقیناً قطعِ تعلق کرنا چاہیئے۔ لیکن موت اور نیند میں فرق کون کرے ؟

کیا ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا وجود ضروری ہے ؟

مسٹر بیورلے نکولس :-

ہاں، ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا ہونا ضروری ہے وہ ایک رحمت ثابت ہونے کے بجائے ایک لعنت ثابت ہوسکتے ہیں، لیکن اُن کی موجودگی کم از کم شادی کے رشتے کی کمزوری کو زائل کر دیتی ہے ؛

مسٹر آلڈس ہکسلے :-

بچوں کے بغیر شادی کامیاب ہوسکتی ہے یا نہیں ؟ اس سوال کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جن کی شادی ہوئی ہے۔ شادیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب صریحاً اثبات میں دینا پڑتا ہے ؛

مسٹر ایولین واہ :-

ہاں، ایک کامیاب شادی کے لئے درجنوں بچے درکار ہیں ؛

مس ایتھل مینن :-

اس سوال کے متعلق عمومیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک شخصی معاملہ ہے ؛

مس سٹارم جیمیس :-

مجھے معلوم نہیں کہ ایک کامیاب شادی کے لئے بچے ضروری ہیں یا نہیں۔ یقیناً اس کا انحصار شادی پر ہے۔ اگر میاں بیوی دونوں کو بچوں کی خواہش نہ ہو تو یہ خلافِ قیاس ہے کہ ایک بچہ اُن کی شادی کو کامیاب بنا سکے۔ بلاشبہ ایک حیثیت سے یہ درست ہے کہ کوئی شادی اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ میاں بیوی کو ماں باپ بننے کا تجربہ حاصل نہ ہو۔ لیکن ہر شادی کے متعلق یہ بات بھی صحیح نہیں۔ بہت سی شادیاں ہونگی جو بچوں کی مسرت اور زحمت کے بغیر ہی کامیاب ہوں گی

مارکوئیس آف ڈونیگل :-

یقیناً کامیاب شادی کا انحصار بچوں کی موجودگی پر نہیں، خصوصاً تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان۔ اس مغالطے کا آغاز شاید اُس

زمانے میں ہوا تھا جب دنیا کی آبادی بہت کم تھی، اور بڑے بڑے گھرانے آباد کرنے کی ضرورت تھی ابھی یہ نظریہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ جو والدین بچے پیدا نہیں کرتے وہ اپنے ملک کا فرض بجا نہیں لاتے اس بُت کا توڑنا علمی، اختیاری اور منظم طریق تولید کی طرف جسے آخرکار موجودہ ابتری کی جگہ لینی ہے پہلا قدم ہوگا۔ ایک ایسا طریق جس سے جاہل دہاتی کے ہاں تو دس بچے پیدا ہو جائیں اور علامہ صاحب کے ہاں ایک بھی نہ ہو۔ بڑھتے ہوئے علم کی روشنی میں برقرار نہیں رہ سکتا ؛

مسٹر سیسل بیٹن :-

نہیں، بچے شادی کی کامیابی کے لئے قطعاً ضروری نہیں ہیں۔ اور ہوں کیوں ـــــ ہر وقت چیں چیں کرتے رہنے والے بچونگڑے ؟ ایک پالتو کتّے یا بلّی سے زیادہ اُن کی ضرورت نہیں ہے اور غالباً وہ اُن سے زیادہ معقول اور شریف بھی نہیں ہوتے۔ بہت سے ماں باپوں کی زندگیاں نسبتہً آسان ہو جائیں اگر نہیں اپنی اُس اولاد سے چھٹکارا نصیب ہو جو اتنا پریشان کرتی ہے کہ اُس کے مقابلے میں ان کا وجود عبث ہے ؛

مس دافنے ڈموریئے :-

ان میاں بیوی کے دماغوں میں کچھ خلل ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو چاہتے ہوں اور پھر بھی بچوں کی خواہش نہ رکھتے ہوں۔ غربت اور ایک اچھے گھر کا مہیا نہ کرسکنا ہی ان کا ایک معقول عذر ہو سکتا ہے۔ شوہر اور بیوی کے تعلق کو استوار کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اُس وجود کو پروان چڑھائیں جسے ان دونوں نے مل کر پیدا کیا ہو۔ بچوں کی وجہ سے اُن کی زندگی قدرتی طور پر کم خودغرضانہ اور کم نفس پرستانہ لیکن زیادہ دلچسپ ہو جائے گی۔ شاید بچوں کے بغیر بہت سی شادیاں کامیاب ہیں لیکن اگر ان لوگوں کے ہاں بچے ہوتے تو ان کی مسرت کے مواقع آپ سے دگنے ہو جاتے۔ عورت کا نقطۂ نظر بہرکیف یہی ہے

آنریبل ایوِن مارگن :-

اس سوال کے موافق اور مخالف دونوں صورتوں میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے بلاشبہ شادیوں کی ایک بڑی تعداد والدین کی اپنے بچوں کے لئے مشترک محبت پر قائم ہے لیکن دوسری طرف تقریباً اتنی ہی بڑی تعداد رشک و حسد اور خانگی سازشوں کا شکار بھی ہوگئی ہے، خصوصاً ایسی سازشوں کا جن کا تعلق جائداد کی وراثت، لڑکیوں کی شادیوں اور جہیز وغیرہ کے معاملات سے ہے۔ شادیاں اسی قدر کامیاب ہوں۔ اگر میاں بیوی کے علمی اور تفریحی اشغال مشترک ہوں ؛

مسٹر ڈبلیو ڈبلیو وکیفیلڈ :-

ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا ہونا ضروری نہیں۔ میں نے بعض ایسی نہایت کامیاب شادیاں دیکھی ہیں۔ جن میں بچوں کی موجودگی کو دخل نہ تھا۔ اگرچہ بچے ایک کامیاب شادی کے لئے ضروری نہیں تاہم وہ ہمارے لئے ایک امداد میں بہت

سی شادیاں ایسی ہیں کہ ان کی کامیابی کا باعث بچوں کا وجود ہے ۔

مسٹر کولن کلائیو :-

محبت، رفاقت اور مفاہمت، صرف یہ چیزیں ایک شادی کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ جب ان کا وجود باقی نہیں رہتا تو خواہ کتنے ہی بچے کیوں ہوں والدین کی زندگی کو خوشگوار نہیں بنا سکتے۔ عام طور پر لوگ بچوں کے خواہشمند نہیں ہوتے اور ہر سال ہزاروں بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی درحقیقت ضرورت نہیں ہوتی۔ یقیناً ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کی کچھ ضرورت نہیں لیکن میں صرف آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ یاد رکھیئے کہ متاہل زندگی کی مسرت کا سوال ہو تو جواب کچھ اور ہوگا ۔

مسٹر ڈی جی اے لو :-

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کا وجود ضروری نہیں ہے لیکن بچے اس کی تکمیل ضرور کرتے ہیں۔ لاتعداد بےاولاد لیکن مسرور مثالیں اس امر کی شاہد ہیں کہ ایسی شادیاں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ لیکن گہرے احساسات مثلاً کامل بےنفسی جو اولاد کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اولاد کے بغیر اس کا تجربہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ کامل ازدواجی زندگی ایک با اہل وعیال زندگی ہی کو کہہ سکتے ہیں جس میں رنج وراحت کے حقیقی تجربات اور ایثار نفس کے ہزاروں مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچے ہماری ذہنی ترقی میں بھی مدد دیتے ہیں۔ وہ والدین کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہوتے ہیں، وہ رحمت و برکت کا باعث ہیں ۔

مسٹر جان سٹریچی رکن پارلیمان :-

شادی کی کامیابی کے لئے بچوں کی یقیناً ضرورت نہیں ہے لیکن وہ شادی کے لئے کچھ مہلک بھی نہیں ہیں ۔

مسٹر مارس لین نارکاٹ :-

میرا خیال ہے کہ بچوں کا وجود ایک کامیاب شادی کے لئے ضروری ہے، کم ازکم والدین اپنے بچوں کی تصویریں دکھاتے وقت مجھ سے یہی ظاہر کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ جھوٹ بولتے ہوں ۔

لیڈی ڈاروتھی ملز :-

اس مسئلہ کا انحصار زیادہ تر ہر شخص کی ذاتی طبیعت پر ہے۔ ایک ایسی شادی جس کی بنا دنیا کے رواج اور شہوانی کشش پر ہو۔ بچوں کے ذریعہ سے شاید کچھ وقعت اور تقویت حاصل کرسکتی ہے لیکن ایک ایسی شادی جس کی بنا اتحادِ خیال، حقیقی ہمدردی، مفاہمت اور اشتراکِ مفاد پر ہو میرے خیال میں بغیر بچوں کے مکمل ہے ۔

پروفیسر اے ایم لوڈی ایس سی :-

میرا یہ عقیدہ نہیں کہ بچے ایک شادی کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ جب تک اتحادِ ازدواج پورے طور سے کامیاب ثابت ہو اس وقت تک بچے بالکل پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ہمارے نگڑدادا کی طرح ہماری ناک پر بھی ایک تل ہو تو ہم اس میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن ایک ایسے اتحاد کو کیوں جاری رکھا جائے جو دو زندہ انسانوں کے درمیان بدمزگی کا موجب ہو۔

ریورنڈ ایچ جی جی ہرکلاٹس :-

چونکہ اس کتاب کے مرتب نے تعمیم سے کام لیا ہے اس لئے ایک ایسے سوال کا کوئی قطعی جواب دینا ناممکن ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کامیاب شادیوں میں اکثریت اُن شادیوں کی ہے جو اولاد سے بہرہ ور ہوئیں، اور ناکام شادیوں میں اکثریت اُن کی ہے جو اولاد سے محروم رہیں۔ دیدہ و دانستہ ایک بے اولاد شادی کی طرح ڈالنا مشکلات کو دعوت دینا ہے۔

جے اے بانڈ، صدر آکسفرڈ یونین :-

میں کتابِ مقدس کی تقلید کروں گا یعنی سوالات کا جواب سوالات سے دوں گا۔ کامیاب شادی کیا ہوتی ہے؟ کامیابی کیا ہے؟ شادی کیا ہے؟

مس وایولٹ کارڈری :-

میرا خیال ہے کہ بچے شادی کو زیادہ خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ لیکن ایک کامیاب شادی کے لئے ان کا وجود ضروری نہیں ہے۔

مسٹر ریمنڈ میسے :-

اگر کامل مسرت حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اکثر شادیوں کے لئے بچوں کا ہونا ضروری ہے۔ شادی کا مقصد ہی بچے ہیں، اور ایک بے اولاد شادی اُس موٹر کی طرح ہے جس کا انجن نہ ہو۔

مسٹر سیول سٹوکس :-

بچوں کا وجود اکثر شادیوں کی کامیابی کے لئے ضروری ہے جب عشق کا جوش سرد پڑنے لگتا ہے تو ایک مرد اور ایک عورت کو باہم متحد رکھنے کے لئے کسی مشترک دلچسپی کی ضرورت ہوتی ہے، بچے ان کی اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ بچے اپنے والدین کو جوان رکھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ ادھیڑ عمر کی کنواریاں اور کنوارے شاذونادر ہی اتنے ترقی یافتہ ہوتے ہیں جتنے کہ ادھیڑ عمر کے والدین ہوا کرتے ہیں۔

مسٹر گاڈفرے ون :-

ذاتی طور پر میرا یہ خیال نہیں ہے کہ ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کی ضرورت ہے ہم ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جس کا ضبط و نظام عقل اور رفتار سے قائم ہے جس میں جذبات کو علم سے مغلوب ہونا پڑتا ہے، بہت سے لوگ چاہتے ہوں گے کہ اُن کے ہاں بچے ہوں لیکن بہت کم ہوں گے جو اس کی مقدرت رکھتے ہوں، کیونکہ بچے نہ صرف مالی نقطۂ نظر سے بلکہ وقت اور قوت کو ضائع کرنے کے لئے بھی ایک عیب و مستقل خطرہ ہیں۔ یہ ایک مغالطہ ہے کہ جس بیوی کے ہاں اولاد نہ ہو وہ خوشی اور خوش اخلاقی سے محروم ہوتی ہے اس کے برخلاف آج اُسی بیوی کو ہوشمند سمجھا جاتا ہے جو بے اولاد رہنے کی کوشش میں مصروف رہے ؛

مس کیتھلین نبٹ :-

میں نہیں سمجھتی کہ بچے ایک شادی کی کامیابی میں کچھ مدد دیتے ہوں گے۔ بچوں کی موجودگی کبھی کبھی اُن لوگوں کو یکجا رہنے پر مجبور کرتی ہوگی جو بصورتِ دیگر جدا جدا ہو جاتے لیکن وہ اپنے والدین کے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ایک کامیاب شادی کا انحصار کسی بیرونی اثر کے بجائے میاں بیوی کی طبیعتوں کے ملاپ اور ایک دوسرے کے احترام پر ہے ؛

مسٹر گلبرٹ فرینکاؤ :-

کیا کہیں کامیاب شادیوں کا وجود بھی ہے ؟

مس ژران دکازانی :-

غالباً بچے ہمیشہ شادی کی کامیابی کے لئے ضروری نہیں ہوتے لیکن یقیناً کوئی شادی اُن کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور یقیناً جس عورت کے ہاں بچہ نہیں ہُوا آدھی عورت ہے ؛

مس نینسی بیٹن :-

بچوں کی موجودگی سے شادی کی کامیابی کو کچھ تعلق نہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک لڑکی نے اپنی پسند سے شوہر انتخاب کیا ہے وہ کیوں اُسی کے ساتھ مطمئن نہیں ہو جاتی اور ہشیار چیخنے چلانے والے اور غالباً کریہ المنظر بچوں کا غم اور پریشانی اٹھاتی ہے۔ ہاں۔ اگر جائداد کے لئے وارثوں وغیرہ کی ضرورت ہو تو بسم اللہ پھر ہر عورت کو یہ کام فرض سمجھ کر انجام دینا چاہیئے، اور بہ تکلف چہرے پر شگفتہ ترین تبسم لاکر بچے کا خیر مقدم کرنا چاہیئے ؛

مس سونیا ہیمبرگ :-

پچھلے زمانے میں جب عورتیں ناتعلیم یافتہ ہوتی تھیں خاوند اور بیوی کی مشترک دلچسپیاں صرف بچوں تک محدود تھیں۔

معاشرہ آج سے زیادہ قبیلہ پرست تھی اور بچوں کے بغیر شادی کے ناکام ہو جانے کا امکان تھا۔ آج کل عورتیں اپنے شوہروں کے ہر معاملے میں حقیقی دلچسپی لینے کے قابل ہو چکی ہیں، اور جب سے حکومت نے والدین کو اپنے بچوں کے متعلق بہت سے حقوق سے محروم کر دیا ہے اولاد کی خواہش پہلے کی طرح شدید نہیں رہی جب شادی کی بنیاد رفاقت کے احساس اور اعتماد پر ہو تو بچوں کی غیر موجودگی میاں بیوی کی مسرت میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں کر سکتی ؛

مسٹر کاپیٹن میکنزی :-

ننانوے فیصدی شادیوں کی کامیابی کے لئے بچوں کا ہونا ضروری ہے ؛

مس آرنٹ رابرٹسن :-

اگر میاں بیوی سمجھدار دوست ہیں تو بچوں کی کچھ ضرورت نہیں۔ اگر عورت کو بچوں کے انکار سے نجات دلانے کے لئے جیب میں پیسے نہ ہوں تو بچوں سے بڑھ کر اور کوئی چیز شوہر اور بیوی کے رشتے میں خلل ڈالنے والی نہیں ہے۔ جذبات پرستوں سے قطع نظر بچوں کا مسئلہ اقتصادی حالات سے تعلق رکھتا ہے، ایک اچھی شادی بغیر بچوں کے بھی کامیاب ہوتی ہے، ایک بُری شادی ان کی وجہ سے برقرار رہ سکتی ہے لیکن اگر یہ ایک ایسا بودا رشتہ ہے کہ اس سہارے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا تو دس میں سے نو صورتوں میں اسے توڑ دینا بہتر ہے ؛

لیڈی ڈرمنڈ ہے :-

ایک کامیاب شادی لازماً ایک پُرمسرت شادی نہیں ہوتی ایک کامیاب شادی کے صرف یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ دو آدمی یکجا زندگی گزار رہے ہیں، ایسی شادیوں کے رشتے میں بچے اکثر ایک مضبوط گرہ کا کام دیتے ہیں ؛

مشرقی ممالک میں جہاں میں ایک عرصے تک رہی ہوں، بچے، بہت سے بچے تقریباً شادی کا حقیقی مقصد سمجھے جاتے ہیں لیکن اس پر بھی مشرق ہی میں شہر آگرہ کے اندر ایک مرد اور عورت کی محبت کی یادگار "تاج محل" موجود ہے جس کی نظیر تمام دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

دنیا میں ایک اولاد معنوی بھی ہوتی ہے یہ بڑے بڑے صاحبِ دماغ لوگوں۔ موجدوں، مصنفوں، مصوروں، شاعروں وغیرہ کی تخلیق ہوتی ہے، ایسے لوگوں کو بچوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی ؛

مس روزیٹا فوربس :-

ایک کامیاب شادی کے لئے بچوں کی ضرورت نہیں ہے، میں نے بچوں کے بغیر بہت سی کامیاب شادیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ بچوں کی موجودگی کی حالت میں اُن کی غیر موجودگی کی حالت کی بہ نسبت طلاق کا امکان کم ہو جاتا ہے اور ہو جانا چاہیئے اور اگر کسی شادی کے کامیاب ہونے کا بڑا ثبوت اُس کا قیام ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ بچے اس کامیابی کے حصول میں بڑی مدد دیتے ہیں ؛

منصور احمد

لوری

چمگادڑ نے دھوم مچائی — گھُسا چھایا رام دہائی[۵]
آئی رات اندھیری چھائی — ہریالی[۱] نے لوری گائی

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس[۲] کریلا پھولے[۳]

لوٹ آئے گھر موُنچھ مچھندر[۴] — ہاتھ میں رسی پیچھے بندر
دنیا بھر کے شاہ قلندر[۱] — سوئے اپنے گھر کے اندر

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

پیاری نیند کا پیارا آنا — بھاری[۲] پلکوں سے پہچانا
لو ہم گائیں پریم کا گانا — اللہ آمیں تم سو جانا

اگلا جھولے بگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے

---

۵ گھسا چھایا رام دہائی " — ایک دیہاتی نغمہ ہے مطلب یہ ہے کہ تاریکی شب آچلی خدا کی پناہ ۰

۱ ہریالی ایک دیہاتی نام ہے اس قسم کے نام — بچے کھلانے والی سہیلیوں کے ہوا کرتے ہیں ۰ ۲۔ ماس معنی مہینہ ہے

۱ یہ ایک دیہاتی نغمہ ہے جو بطور لوری کے گایا جاتا ہے اس میں ایک خاص دیہاتی کیفیت ہے۔ کریلے کے پھولوں کی خوشبو بڑی مست ہوتی ہے

۴ "مونچھ مچھندر" یعنی بندر والا جو اپنے لمبے بالوں اور خاص قسم کی مونچھوں کی وجہ سے بچوں میں بہت مشہور ہے۔ اس کو مداری بھی کہتے ہیں کبھی کبھی وہ تماشے بھی کرتا ہے۔ شام کے وقت گھر جاتے ہوئے وہ سڑک پر خاص انداز سے نکلتا ہے ۰

۱ یعنی امیر و غریب (۷) مخمور ۰

بالے میاں کا بجا ربانا — اٹھ کے سویرے میلے جانا
برفی اور بتاشے کھانا — بچے پھٹے تو گھر کو لانا

اگلا جھولے بگلا جھولے

ساون ماس کریلا پھولے

روتے روتے سونا کیسا؟ — سوتے سوتے رونا کیسا؟
آئی نیند کو کھونا کیسا؟ — آنسو سے منھ دھونا کیسا؟

اگلا جھولے بگلا جھولے

ساون ماس کریلا پھولے

حامد[9]، سرور، نیتر سویا — موہن اپنے گھر پر سویا
جو تھا باہر بھیتر سویا — سوجا سوجا سب گھر سویا

اگلا جھولے بگلا جھولے

ساون ماس کریلا پھولے

ٹامی[10] سویا ٹیگر سویا — طوطا مینا لہبر سویا
مرغا اور کبوتر سویا — لال، بیا اور تیتر سویا

اگلا جھولے بگلا جھولے

ساون ماس کریلا پھولے

گیت سہانا نیند یا گائے — چندا ماموں آئے آئے
کنول کٹورا لائے لائے — آنکھیں موند کوئی سو جائے

اگلا جھولے، بگلا جھولے

ساون ماس کریلا پھولے

سید مقبول حسین احمد پوری

---

۸ "بالے میاں" سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپکا مزار بھڑائچ (ملک اودھ) میں ہے سال میں وہاں ایک بڑا میلہ ہوتا ہے بڑے بڑے جھنڈے جن کو "نشان" کہتے ہیں میلے کی خاص دلچسپی ہیں جیسے محرم میں علم۔ "ربانا" ایک خاص قسم کا باجا ہوتا ہے جس کے بجانے والے "ڈفالی" کہلاتے ہیں۔ جب بھڑائچ کا میلہ قریب ہوتا ہے تو ڈھلی ہوئی شام یعنی تقریباً آٹھ بجے شب کو میلے جانیوالے یہ باجہ بجاتے ہوئے گاؤں کے قریب سے گذرتے ہیں اسوقت اس کو سنکر ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔

۹ یہ سب ساتھ کھیلنے والے لڑکوں کے نام ہیں۔ ۱۰ پالتو جانوروں یعنی کتوں اور پرندوں کے نام۔

تشکیلِ بیان

یعنی

مصحفی کی شاعری پر ایک نظر

تشکیل کا احساس عموماً دو طرح ہوتا ہے۔ دیکھ کر اور سُن کر۔ نگاہ کی کارفرمائی بلا واسطہ ہے البتہ سماعت کے ذریعہ سے احساسِ تشکیل" کا ہونا بغیر کسی واسطے کے ممکن نہیں۔ سامع کو ہمیشہ تمثیل و بیان کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک نابینا شخص صرف آواز ہی کے ذریعہ سے کسی چیز کا احساس اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نمونہ پیش نہ کیا جائے یعنی یہ کہ جب تک اُس کو طول و عرض اور رنگ و خاصیت سے آگاہ نہ کیا جائے گا محض سن کر اسے کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔ بالفاظِ دیگر جب تک آواز ایک نوائے مجسم نہ ہو۔ سماعت کے ذریعہ سے کسی تشکیل کا احساس ہونا امرِ محال ہے ؂

فنونِ لطیفہ میں مصوری تشکیلِ نظر ہے اور شاعری تشکیلِ بیان۔ جس طرح کہ مصوری کو "تشکلِ احساس" اور "جذبۂ مجسم" وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح علاوہ تشکیلِ بیان ہونے کے شاعری اور بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً یہ کہ کبھی تو شاعری نوائے کیف ہے کبھی کیفِ مجسم کبھی موسیقی ہے کبھی تصور کبھی احساسِ لطافت ہے کبھی خود لطافت۔ اس اعتبار سے شاعری کو ہم دو بڑی خصوصیتوں کا حامل پاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ (۱) شاعری آرٹ کی تفسیر ہے، اور (۲) خود آرٹ شاعری کی تفسیر ہے۔ پہلی خصوصیت کی مثال مغربی شاعری ہے اور دوسری کی مثال مشرقی شاعری۔ مشرقی شاعری ایک مشترکہ حیثیت بھی رکھتی ہے۔ مثلاً اہلِ چین کی شاعری۔ شاید مغرب نے یہ باتیں چینی لوگوں ہی سے سیکھی ہیں۔ اہلِ چین کی شاعری اور مصوری کا انحصار باہم ایک دوسرے پر ہے۔ چینی لوگ ازل ہی سے مصور پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی معاشرت، ان کی زبان حتیٰ کہ رسم الخط اور طرزِ تحریر سب مصوری کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ انگلستان میں چینی نظموں کے ترجمہ کرنے والے بہت سے ادیب ہیں۔ چنانچہ H. A Giles اور Arthur Waley کی حیثیت چینی زبان کی واقفیت کے اعتبار سے انگریزی میں وہی ہونی چاہیئے، جو میکس میولر کی سنسکرت زبان کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ ان کی ترجمہ کی ہوئی چینی نظموں سے پتا چلتا ہے کہ چینی نظم ایک قسم کا آرٹ ہے۔ انگریزی زبان میں اور بھی مختلف ترجمے ہیں، یہاں ایک نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو: ؎

رات کیسے بڑھ رہی ہے؟ ❖ آدھی رات ابھی نہیں آئی

نیچے میدان میں مشعل جل رہی ہے ٭ دوسرے میں ڈھول بجنے کی آواز سن رہا ہوں
رات کیسے بڑھ رہی ہے؟ ٭ رات ابھی ختم نہیں ہوئی
میں بلندی پر بگل کی آواز سنتا ہوں ٭ آنے والی روشنی میں مشعل دھیمی پڑ رہی ہے
رات کیسے بڑھ رہی ہے؟ ٭ رات ختم ہو گئی
صبح کی روشنی میں مشعل سے دھواں اٹھ رہا ہے ٭ دھوپ میں اژدر پھریرا Dragonbanner اڑ رہا ہے"

(ترجمہ از انگریزی - ماخوذ از چینی تصنیف "شی کنگ" مترجمہ Hellen Waddell)

انگریزی شاعروں میں ورڈسورتھ، ٹینسن اور شیلی نے شاعری کو آرٹ کی تفسیر ثابت کیا ہے۔ آج کل اردو زبان میں عموماً انہیں کی تقلید کی جاتی ہے۔ چنانچہ "شبان زادوں کے نعرے"۔ "مطربہ و مغنیہ کے نغمے" "سب شعرائے مغرب کی آواز بازگشت ہیں۔ قدیم اردو شعرا میں یہ باتیں نہ تھیں، اگر قدیم اردو شاعری کے ذریعے سے صورت گری کی بھی گئی ہے تو عام ہندوستانی مناظر کو مدنظر رکھکر مثلاً

ساقیا ساغر مے لا کہ منائیں ساون ٭ بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سن سن
بادل امڈے چلے آتے ہیں گھماگھم ہر سو ٭ بجلیاں کوندتی ہیں شور ہے اتر دکھن

تشکیل بیان کی یہ خالص ہندوستانی مثالیں ہیں۔ اب مغربی رنگ ملاحظہ ہو۔ شاعر قازوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اڑنے کی تصویر کھینچتا ہے۔ عام طور پر قازیں پرے باندھ کر اڑا کرتی ہیں۔ ایک قاز آگے ہوتی ہے۔ باقی قطار در قطار پیچھے۔ اگلی قاز کو مخاطب کر کے شاعر کہتا ہے ؎

آگے آگے تو ہے پیچھے ہمنوا ہیں بے شمار ٭ اڑتی جاتی ہے بصد تزئین قطار اندر قطار
تیرے منہ سے اس طرف آواز نکلی ایک بار ٭ اور ادھر چیخوں سے اک دم گونج اٹھا ابر بہار
سچ بتا اے قاز اندھیرے میں کہاں جاتی ہے تو؟

یہ تو اردو زبان میں مغرب کی تقلید ہوئی۔ اس اعتبار سے شاعری آرٹ کی تفسیر ہے۔ جب کبھی یہ انداز بیان مشرقی سوسائٹی سے ہم آہنگ ہو کر ظاہر ہوتا ہے بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حقّہ اور چلم سے متعلق یہ شعر ؎

سوزاں ہے چلم آتش رخسار کی صورت ٭ اور اس پہ دھواں گیسوئے خمدار کی صورت

غزل میں کم و بیش ہر شاعر نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ مگر عمومیت صرف عہد جدید کے شعرا کو حاصل ہوئی۔ مثلاً داغ ؎

جنبش میں یوں ہیں وہ لب نازک نفس کے ساتھ ٭ جیسے ہلے نسیم سے پتی گلاب کی

لیکن آرٹ کے ذریعہ سے بجائے داغ کو عام کرنے کے غالب کو عام کرنے کی کوشش زیادہ دیکھی جاتی ہے۔ شاید علوئے تخیل

کو مدنظر رکھ کر یہ بات پسند کی گئی۔ اقبال اس کے زیادہ مستحق تھے۔

آرٹ شاعری کی تفسیر کس طرح ہے؟ اس کی تمثیل آج کل اردو رسائل میں بہت کچھ پیش کی جاتی ہے۔ عمر خیام پر مغرب میں اور غالب وغیرہ پر ہندوستان میں جو آرٹ بلاکس تیار کئے گئے ہیں۔ مثال کے لئے کافی ہیں۔ لیکن غالب کے خیالات کو آرٹ بخوبی نمایاں نہ کرسکا[1]۔ نمایاں کرنے کی سعی قابل تعریف ضرور ہے مگر لاحاصل۔ اقبال اور جوش اس سعی کے زیادہ اہل ہیں۔ اگرچہ علامۂ اقبال کی سی حقیقت جوش میں نہیں۔ تاہم باوجود غلبۂ رنگِ مجاز کے جوش کا کلام تشکیلِ بیان کا نہایت زود فہم نمونہ ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

نظم عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے ٭ ہنس کے رباب اُٹھالیا نغمہ زنِ اَلست نے

نغمہ زنِ اَلست کی تصویر تو صرف تصور میں کھنچ سکتی ہے۔ مصور سے ممکن نہیں۔ یہی شاعری کا کمال ہے خیر یہ حضرات تو عہدِ حال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر تو ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ آیئے اردو شاعری کے قدیم اسکول پر ایک نظر ڈالیں۔ قدیم اسکول کے شعرا میں تشکیلِ بیان کی اہلیت کم رہی۔ بظاہر انشا اللہ خاں پر نظر پڑتی ہے۔ مثلاً ذیل کی "تصویر":-

بلبل اداس بیٹھی ہے اک سوکھے ٹُنڈ پر

لیکن انشا کا یہ عام انداز نہیں۔ اس قسم کی عمومیت تو اُن کے ہم چشم مصحفی کے کلام میں بہت ہے۔ بعض لوگوں نے مصحفی کے کلام کو بالکل خشک قرار دیا ہے۔ یہ بات واقعیت سے بہت دور ہے۔ مصحفی میں درد بھی ہے کیف بھی، ندرت بھی ہے واقعیت بھی۔ کہیں وہ میر ہیں کہیں میر درد، کہیں غالب اور کہیں داغ غرض میرے خیال میں وہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے مصداق ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار ؎

شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر، ٭ جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی (رنگِ میر)

وہ کبھو گل ہے اور کبھو بلبل ٭ مصحفی اس کا ایک حال نہیں (رنگِ درد)

اے مصحفی میرے دلِ ناشاد کی خاطر ٭ ایجاد کیا اُس نے بد نام تبسم (رنگِ غالب)

نامے کے میرے ٹکڑے لاڈالے میرے آگے ٭ نامے کا میرے قاصد اچھا جواب لایا (رنگِ داغ)

علی ہذا القیاس مصحفی سب کچھ ہیں۔ پھر بھی اُن کے کلام میں ایک قسم کا ضُعف ضرور ہے اس ضعف کی وجہ انشاء اللہ خاں کے جوش و خروش کے ساتھ تقابل ہے۔ انشا کا کلام مصحفی سے ہم آہنگ نہیں نہ وہ معیار ہے۔ انشا سے مصحفی کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہی اس ضعف کے احساس کا باعث ہے۔ جو بات فطری نہ ہو اکتسابی طور پر ظاہر نہیں ہوسکتی ٭

مصحفی ہمہ گیر ہیں۔ ان کا اندازِ بیان دوسرے شعرا کے بیان میں مشترک ہے لیکن باوجود اس اشتراک باہمی کے وہ ایک ذاتی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ وہ خصوصیت تشکیلِ بیان ہے تشکیلِ بیان کو مصحفی کے کلام پر ایک نئی "ریسرچ" یا تحقیق سمجھنا چاہیئے

[1] ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا لازم نہیں

اس کے دو پہلو اوپر بیان کئے گئے۔ مصحفی کی ہر غزل کے متعدد اشعار ان میں سے کوئی نہ کوئی پہلو ضرور لئے ہوتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسرا پہلو بھی ہے جس کو ہم بزبانِ حالی مرحوم "ان نیچرل تشکیلِ بیان" کہیں گے۔ دیوانِ مصحفی سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

زلف جھک کر سلام کرتی ہے ٭ رُخ کو اور رُخ کہے ہے عمر دراز

نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل ٭ شعلہ اک آشیاں سے اٹھتا ہے

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا ٭ شعلہ سمجھا تھا اُسے میں پہ بھبھوکا نکلا

یہ تمام باتیں غیر فطری ہیں۔ اسی طرح یہ شعر ؎

مری حالت سے جا کر یوں کرے اس کو خبر کوئی ٭ کہ روتا ہے کھڑا تیرے لئے بیرونِ در کوئی

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں بچپن کی خوبو ہے۔ کیونکہ اس طرح لڑکے ماں سے رو کر مٹھائی مانگا کرتے ہیں۔ عاشق کے رونے کے لئے صحرا و بیابان کی تخصیص ہونا چاہیئے۔ اسی غزل میں یہ شعر البتہ تشکیلِ بیان کی اعلیٰ مثال ہے ؎

خدایا صبر دے دل کو کہاں تک راہ میں اُس کی ٭ دھرے زانو پہ سر بیٹھا رہے دو دو پہر کوئی

تمثیلِ بیان سے جو تشکیل پیدا ہوتی ہے بعض وقت نہایت ہی دلچسپ ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

حیران ہے کس کا جو سمندر ٭ مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے

اس سے کہیں زیادہ دلچسپ کامیاب مثال مصحفی نے اس شعر کے ذریعہ سے بہم پہنچائی ہے۔ شعر ؎

نوکِ مژگاں پر کرے ہے یوں دلِ صد پارہ رقص ٭ پھول گیندے کا کرے جوں برسرِ فوّارہ رقص

شعر کا دوسرا مصرعہ تمثیلِ بیان کی نہایت دلچسپ تشکیل ہے ٭

اہلِ چین اپنے آرٹ میں نہایت استادی اور حسن و خوبی کے ساتھ شاعرانہ تخیل کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندی شاعری میں کہیں کہیں چینی رنگ ہے۔ مگر بہت کم۔ مثلاً ملک محمد جائسی؟ کا یہ شعر ؎

بھتی اور یہ پھپ نامان، ٭ جن بات بکھر رہے گھن سامان

شاعر فراقِ محبوب پر پھولوں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ سیاہ بادلوں میں بگلوں کی قطار اُڑی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح ایک یہ مشہور شعر ؎

ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے ٭ جس کارن جوگن بھئی کہوں وہی نہ جرتا ہوئے

اردو زبان میں واقعات کو اس انداز سے ظاہر کرنے کی طرف پہلے کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ اب البتہ اس طرف طبائع مائل ہوئی ہیں۔ مصحفی کے کلام میں چونکہ یہ رنگ غالب ہے۔ اس لئے یہ خوبی اُن کے کلام میں خصوصیت کا درجہ رکھتی ہے۔ البتہ یہ خصوصیت بھی

اسی قدیم مشرقی رنگِ تغزل یعنی وصال و فراق وغیرہ کے دائرے تک محدود ہے۔ مثلاً مصحفی کے یہ اشعار ؎

دیکھ اُس کو اک آہ ہم نے کرلی ÷ حسرت سے نگاہ ہم نے کرلی
جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر ÷ ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا ÷ کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی

"متحرک آرٹ" کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔ لکھتے ہیں ؎

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا ÷ تجھ پر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا
شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا ÷ دیکھ کر میں اس کو اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا
ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا ÷ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا
کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ کر کے چلے گئے ÷ ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے
ترسانہ مجھ کو کھینچ کے تلوار مار ڈال ÷ گر مار ڈالنا ہے تو اک بار مار ڈال

شاعری حسن و کیف اور آہنگ و نغمہ کا مجموعہ ہے۔ حسن کیا ہے کسی حسین احساس کی مرئی شکل کیف کیا ہے ایک روحانی شادمانی جس کی صدائے بازگشت آہنگ و نغمہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں۔ جن کی وجہ سے شاعری کو ایک فنِ لطیف کہا جاتا ہے۔ اگر کان سے سن کر دل اس سے لطف حاصل کرسکتا ہے تو آنکھ مطالعہ کے ذریعہ سے اس کو دل تک پہنچا سکتی ہے۔ موسیقی اس کو سنا سکتی ہے مصوری دکھا سکتی ہے، دیکھنا سننا ہی دو ایسے احساس ہیں جن پر فنونِ لطیفہ کا دارومدار ہے شاعری ایسی چیز ہے جس کو دیکھا بھی جائے اور سنا بھی جائے اور ہر طرح اس سے لطف حاصل کیا جائے۔ مصور اس کو دیکھنے کے قابل بنا رہے ہیں۔ مگر اردو اشعار کی طرف ابھی انہوں نے زیادہ توجہ نہیں کی ہے حالانکہ اردو میں اُن کے مطلب کی چیزیں بہت ہیں وہ زمانہ زیادہ دور نہیں جب اس طرف لوگ متوجہ ہوں گے، آیئے آخر میں مصحفی کے چند اشعار بطورِ انتخاب اور لکھ دیں جو ان کی مصورانہ شاعری کا ثبوت بھی ہوں اور مصوروں کے لئے "Muse of art" بھی ثابت ہوں:۔

صاف چولی سے عیاں ہے بدن سرخ ترا ÷ نہیں چھپتا تہِ شبنم چمنِ سرخ ترا
پہنی جو قبا جامۂ گل دوز کی تم نے ÷ طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم
پوچھیں گے تمہیں تازہ نہالان چمن کیا ÷ اب نامِ خدا سروِ سرافراز ہوئے تم
تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر ÷ شعلہ سا شب پھرے تھا سرو چمن کے اندر
جو ہاتھ دلبروں کے دامن کو کھینچتے تھے، ÷ اب کھینچ کے رہ گئے ہیں کیسے کفن کے اندر

گورے بدن کا عالم اس کا میں رات دیکھا ÷ اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

خوشوں کے مانند سر سے پاؤں تک ہیں آبلے ÷ آدمی ہے تیرا دیوانہ کہ نخل انگور کا

ہے طرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے ÷ بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے

جا رہیے اس جگہ کہ جہاں اچھی صورتیں ÷ بے پردہ ہو کے آتی ہیں سائل کے سامنے

حسرت پر اس مسافر بیکس کی روئیے ÷ جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اپنے رونے کو کوئی سمجھے تو آئینہ مثال ÷ دیدۂ خشک سے آنسو کی تری نکلے ہے

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں ÷ پابہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے

مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے ÷ کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

سید مقبول حسین احمد پوری

قطعات

محرومی

جن کو دے کے عشق دل سینہ، وہ
ہائے کیا کیا سے کھیل کھیلا کئے ہنستے ہیں
اور ہم بے نصیب اے اختر
مسکرانے کو بھی ترستے ہیں

بانسری کے نغمے

بجلی کی طرح کوند رہی ہے صدائے نے
سینے میں نیشتر سے لئے پھرتی ہے کوئی تیغ
نغمے سے کہہ رہا ہے مری داستان ہجر
دل اپنے سوز ساز کو پہنچا رہا ہو جیسے

اختر انصاری دہلوی بی اے آنرز

غزل

صحرائے جنونِ اُلفت میں دیوانۂ کامل کوئی نہیں
واماندۂ منزل لاکھوں ہیں آوارۂ منزل کوئی نہیں

انجامِ محبّت سوچتے کیا آغاز ہی کا جب ہوش نہ تھا
اِس عشق کی اندھی نگری میں سب مست ہیں عاقل کوئی نہیں

طوفانِ بلا کی موجوں میں او ڈوبنے والے ہوش میں آ
کس چیز کو نظریں ڈھونڈتی ہیں۔ اِس بحر کا ساحل کوئی نہیں

یا کشمکشِ امیدِ طرب یا حسرتِ یاس و محرومی
دُنیا کے پُجاری دنیا میں غمگین ہیں خوشدل کوئی نہیں

یا خوئے الم کی راحت میں مَیں کاہشِ غم کو بھول گیا
یا کاہشِ غم ہی دنیا میں احساس کے قابل کوئی نہیں

ہے شرطِ نظر اندازِ جنوں سب غیب کے جلوے ظاہر ہیں،
یوں نام کو پردے ہوں تو ہوں نظّارہ میں حائل کوئی نہیں

رِیاض عباسی امروہی

پنا سے اجیگڑھ تک

چاند کا منہ فق ہو گیا، ڈوبتے اُچھلتے تاروں کی محفل پھیکی پڑ چکی، صبحِ کاذب کے دھندلکے میں نسیم سحری کی سرسراہٹ سے جو میری آنکھ کھلی، میں نے ایک چھوٹی سی پوٹلی بغل میں مار، ڈور لوٹا سنبھال، میاں عبدالغفور صاحب سوداگر کو بُلایا - وہ بھی شاید گوش بر آواز ہی تھے، چارپائی سے تڑپ کر زمین پر کھڑے ہو گئے، اور لگے آنکھیں مل مل کر کہنے :-

سلام علیکم . . . . . اچھا . . . . . ہاں تو اب آپ چلے . . . . . اب جاتے ہیں؟ . . . . ہاں . . . میں نے کہا ذرا دو چار روز اور ٹھہر جاتے تو ساتھ ہو جاتا . . . . . خیر!

۱۹۱۵ء میں مجھے سوداگر عبدالغفور صاحب بریلوی کے ہمراہ ریاست اجیگڑھ[1] سے پنا جانے کا اتفاق ہوا تھا جب وہاں بہت دن پڑے پڑے جی اُکتا گیا، بے طرح وحشت اُٹھنے لگی اور کوئی دل بہلاو و مشغلہ نظر نہ آیا، تو میں نے سوداگر صاحب کو سمجھایا کہ بھائی مجھ سے تو اب یہاں خواہ مخواہ ٹھہرا نہیں جاتا، آپ کو دو چار روز کا کام اور ہے جس میں میری کوئی خاص ضرورت نہیں لہذا ادھر آپ ان لوگوں سے نبٹیں، اُدھر میں اجیگڑھ جا کر سامان و امان درست کرتا ہوں، جب آپ یہاں سے فارغ ہو کر آئیں گے تو میں چرکھاری چلا جاؤں گا۔

بعض اوقات انسان کو ایسی صحبتیں میسر آجایا کرتی ہیں جن کی دلچسپیوں میں محو ہو کر وہ چاہتا ہے کہ خدا کرے یہ محفل اسی طرح برقرار رہے، پھر ہوتا یہ ہے کہ انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں یار دوست کھیلوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ اور پھر وہ موقعہ عمر بھر نہیں آتا۔

جیسا کہ اوروں کو ارمان رہا ہے میاں عبدالغفور صاحب کی بھی آرزو تھی کہ میں اُن سے کبھی جدا نہ ہوں، سوائے قسمت کہ بہت جلد چند مجبوریوں نے ہمیں تین تیرہ کر دیا۔ اس بیچارہ کی دعا قبول نہ ہوئی۔

تین چار روز کی رد و کد کے بعد بچھڑنا قرار تو پا ہی چکا تھا، میں اُن سے رخصت ہونے لگا کہ ذرا ٹھنڈے ٹھنڈے میں پہنچ جاؤں تو اچھا ہے۔

اس وقت ہم ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے، جو آبادی سے باہر اس سڑک پر تھی۔ میں سوداگر صاحب سے مصافحہ معانقہ کر کے

[1] اجیگڑھ۔ پنا اور چرکھاری بندیلکھنڈ کی مشہور ریاستیں ہیں۔

سرائے سے اس طرح باہر آیا گویا پھر کبھی یہاں نہیں آنا +

سڑک پر قدم رکھتے ہی طبیعت بشاش ہوگئی، برکھا رُت، نور کا تڑکا، کنکر کی ڈھلی ڈھلائی سڑک کے دونوں طرف سبز سبز قالین سے بچھے ہوئے، ہرے بھرے درختوں پر چڑیوں کی چہکار بوٹے بوٹے پر نکھار، گویا آسمان سے رحمت برس رہی تھی، بس بے اختیار خدا کی حمد کرنے کو جی چاہتا تھا +

دوست سے بچھڑنے کا صدمہ تھا، تتے گھاؤ میں، تھوڑی دور تو میں ذرا یوں ہی آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا چلا، جوں ہی موٹر پر پہنچا ہوں، یکایک خیال آیا کہ بھئی اس چال سے تو کام چل چکا، کہیں نکلی جو چمک کر دھوپ تو یاد رکھیو ایک ایک پاؤں سو سو من کا ہو جائے گا، بس جناب پھر میں نے قدم اٹھایا اور لمبی ڈگیں بھرنی شروع کر دیں +

رنگ برنگ پھولوں کی خود رو بیلوں سے سجے سجائے درختوں کی سوبھا زبانِ حال سے پکارتی رہ گئی کہ اے میاں جانیوالے ذرا ادھر بھی! لیکن میں نے پلٹ کر نہ دیکھا، انہیں اُسی حالت میں کھڑا چھوڑ کر دھن باندھے چلا گیا +

کوئی میل ڈیڑھ میل نکلا ہونگا کہ ایک دقت پیش آئی، وہ یہ کہ جوتا جو پہلے کہیں کہیں سے ذرا دباتا تھا، لگاتار کرنے چند فرلانگ تو میں نے اس کی کچھ پروا نہ کی، پھر سوچا کہ واہ یہ بھی کیا حماقت ہے، اس طرح تو اجیگر ھ پہنچتے پہنچتے پیروں کا کچومر نکل جائیگا ایسے میں کہیں کیچ نہ کھاند سڑک صاف پڑی ہے۔ کچھ شہر بازار بھی نہیں کہ صاحب کوئی نام دھرے گا، یہاں کون دیکھتا ہے، اس موذی کو بغل میں مار ہلکے پھلکے ہو کر اپنی راہ لو +

سلیم شاہی نکالتے ہی لگی جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، واللہ آنکھیں سی کھل گئیں، اوہ ان ڈھائی چھٹانک کی جوتیوں نے تو جان بھاری کر رکھی تھی، پھر دو قدم چل کر آیا جو مزے میں سر کا صافہ بھی اتار ادھر اُدھر کندھے پر ڈال لیا تاکہ ذرا سر کو بھی جنگل کی ہوا لگتی چلے +

اس وقت تھی شان قابلِ ملاحظہ، جیسے کوئی ہوش سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا سویرے ہی سویرے ننگے پاؤں نہار منہ بغل میں پٹلیا دبائے ہاتھ میں ڈور لوٹا لٹکائے چلے جا رہے ہیں جنگل بیابان میں +

پنا کی سڑک کا یہ وہ حصہ تھا جہاں سے ہیرے نکلتے ہیں، کسی وقت کی لگی ہوئی کانوں کے دو طرفہ گڑھے نظر آتے تھے۔ جس زمانہ میں یہاں کان کنی ہو رہی ہوگی، تو کچھ عجیب لطف ہوگا، آج کل کہیں کام نہ تھا، پھر بھلا کون ملتا، طرہ یہ کہ اس سڑک کے آس پاس کوئی گاؤں داؤں بھی نہیں، کوہ وندھیا چل کے سلسلہ میں یوں ہی ایک مرتفع ہموار زمین حدِ نظر تک پھیلی ہوئی ہے،

پھر وہ جگہ آئی جہاں اُس رات آتے وقت سنا تھا، کہ یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر راناہانِ سابق نے پہاڑوں میں ایک رمنا بنایا تھا جس میں خانہ زاد ہاتھیوں کی نسل لی جاتی تھی۔ مگر اب وہ یوں ہی پڑا ہے +

اسی طرح میلوں راستہ طے ہوگیا۔ مگر کوئی خدا کا بندہ آتا جاتا نہ ملا۔ بس یا تو سڑک کے ادھر اُدھر کبھی کبھی درخت آجاتے تھے یا چٹیل میدان پڑا تھا۔

ویسے قاعدہ کے مطابق تو سات ساڑھے سات کا عمل ہونے کے سبب اس وقت خوب دھوپ ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن خوش قسمتی میری کہ آج ایسا نہ ہوا۔ کچھ فاختئی فاختئی بھورا بھورا سا بادل سارے آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ گویا دن رات اور اندھیرے اُجالے کی درمیانی فضا میں لطیف ہوا کے چو رُخے جھونکوں نے زمین پر بہشت بریں کی سی کیفیت طاری کر رکھی تھی وہ روح پرور سماں تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ آنا تیز چلا تھوڑی ہی دیر میں کہیں کا کہیں نکل آیا، پھر دیکھو تو تکان کا نام نہیں، بلکہ یہ ولولہ کہ یوں ہی اڑے چلو، خود بخود قدم اُٹھتے تھے اور ایک موج آرہی تھی۔

چلتے چلتے ایک چھوٹی سی پلیا دکھائی دی۔ پل مارنے میں وہاں جا پہنچا، یہاں آکر جیسے کسی نے پاؤں جکڑ دیئے اور میں تھا کہ چوکڑی بھولے ہوئے وحشی ہرن کی طرح کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

سڑک کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی سبز پوش پہاڑی تھی جس نے کچھ عجب انداز سے پلیا کی طرف بازو پھیلا دیئے تھے درمیان میں اس سرے پر جہاں یہ بازو جڑ گئے تھے موتی کی سی آب والا ایک چشمہ دو ڈیڑھ گز بلندی سے پندرہ سولہ فیٹ ہموار سنگی فرش پر گرتا تھا، کہ تین تین چار چار انچ دل کی ایک اُجلی اُجلی آبی چادر سی بچھی معلوم ہوتی تھی، جس سطح پر پانی پھرا ہوا تھا وہ اُس پتھر کی تھی جس کی موٹی سِل سے پتلے پتلے پاٹ چھانٹ چھانٹ کر عالیشان عمارتوں کی چھتوں اور فرشوں میں لگائے جاتے ہیں

پانی کے بہاؤ سے اس چٹانی سطح کے پرت جھڑ جھڑ کر ایک بے ترتیب زینہ سا بن گیا تھا جس وقت چشمہ کا پانی پندرہ سولہ فیٹ کی سطح پر پھیل کر زینہ اُترتا اور چادریں ڈوٹتیں تو یہ مزا آتا گویا انوار و تجلیات کے طبق بہتے چلے آتے ہیں۔ پہاڑی کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جن پر ہری ہری جھاڑیاں کھڑی جھوم رہی تھیں، ان ٹیلوں کے دباؤ سے تنگ ہو کر چشمہ نے نالے کی سی صورت اختیار کر لی تھی کنارے کنارے کسی خاص قسم کی گھاس کے لمبے لمبے ڈنٹھل پانی پر جھکے پڑتے تھے اس جگہ کچھ تو تنگی کے سبب اور کچھ اونچے نیچے پتھروں میں پڑ کر نالے میں ایک پُرکیف ترنم سا پیدا ہوگیا تھا گویا جب یہ چیزیں اسے روکتی ہیں تو وہ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے جھنجھلا کر بڑبڑاتا چلا جاتا ہے۔

اس مقام پر فیاض قدرت نے دلنوازی کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا، ہاں اگر کچھ کسر تھی تو یہ کہ کیا ہنستا بھلا نہ رہتا۔ سوائے محاسنِ فطرت کے وہاں کوئی ہم جنس بولتی تصویر نظر نہ آتی تھی جو اس پُرلطف نظارہ کی تکمیل ہوتی، پلیا سے کوئی آٹھ دس قدم کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی چٹان اُس نالے پر جھک پڑی تھی، اور اس چٹان پر ایک پتلے پتلے تنے والا قد آدم چھتنار درخت اس انداز سے کھڑا تھا جیسے کوئی چھتری لگائے مناظرِ فطرت کے شوقِ دید میں محو ہو، میں سڑک سے اُتر کر اسی چٹان پر جا

بیٹھا جہاں وہ مسافر نواز درخت آتے جاتوں کو متوجہ کیا کرتا تھا کہ آؤ ذرا میرے سایہ تلے دم لو۔

سبحان اللہ کیا نظارہ تھا، یہاں آکر جو اطمینان سے ایک نگاہ ڈالی، واللہ جان سی پڑ گئی، اور دل تھا کہ باغ باغ ہو گیا۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور پُرسکوت فضا میں چشمہ کی جھال سے آبی چاندنی میں متواتر سلوٹیں پڑنا اور طرح طرح کے سُر پیدا کر کرکے ادھر اُدھر بکھرتے رہنا، پھر بے ترتیب چٹانی زینہ سے ٹیڑھی سیدھی چادریں ٹوٹ ٹوٹ کر ٹیلوں کی جڑ میں جمع ہونا اور نالا سا بن کر اس چھوٹی سی چٹان سے آٹکرانا جس پر میں بیٹھا تھا، چٹان کی ٹکر سے حبابوں کا آنکھیں کھول کھول کر ابھرنا اور پھولوں کے ہاروں کی طرح چکر کھاتے ہوئے تیزی سے پلیا کی طرف بہ جانا۔

بھلا اب وہ بات کہاں نصیب ہوگی، چڑھتا خون، اعلیٰ صحت، ہر طرح کی بے فکری لاپروائی کا زمانہ، چند ہی منٹ میں یہ مزا آیا جیسے ہر رگ ریشے میں ایک نورانی اور خوشبودار رو جاری ہے، بار بار پھریریاں سی اٹھتی تھیں اور خواہ مخواہ جھومنے کو جی چاہتا تھا، میں تو جانوں وہ کوئی ایسا عالم تھا جو شاید اس دنیا میں نہیں۔

واللہ اعلم کتنی دیر یہی کیفیت طاری رہی، حتےٰ کہ بیٹھے بیٹھے بھوک لگ آئی اور بڑے زور سے (اب ویسی کبھی نہیں لگتی) معلوم ہوا جیسے کوئی کلیجہ کھرچ رہا ہے، یا پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں، خدا کے فضل سے اپنے پاس توشہ بھروسہ تو موجود ہی تھا، کھولی جو بسم اللہ کر کے پٹلیا تو جناب پورا پورا ہی انتظام نکلا، میاں عبدالغفور صاحب نے جن کی مہمان نوازی اور فیاضی اس مراق تک پہنچی ہوئی تھی کہ ناخواندہ راہ چلتوں کو قسمیں دلا دلا کر کھانا کھلاتے پھرا کرتے تھے، بڑی چترائی سے گھی میں تر بتر تین موٹے موٹے پراٹھے، کچھ بھنا ہوا قیمہ اور کوئی بیس بائیس بڑے بڑے رسیلے آم رات کو میری پوٹلی میں باندھ رکھے تھے، پراٹھوں اور قیمہ کا تو ابھی تک کچھ نہ بگڑا تھا، البتہ اُن کی چادر میں بندھے بندھے آم ضرور گرم ہو گئے تھے اور ذرا اُن میں چیپ ویپ بھی لگا ہوا تھا، میں جو جھک کر نالے میں ایک آم دھونے لگا معاً سوجھی کہ واہ بھئی یوں کب تک مل مل کر چیپ چھڑایا جائیگا، چشمہ کے رُخ ہی نہ پھینک دیں اس طرف کا ڈھال ہے آخر آئیگا تو ادھر ہی کو، وہاں سے آتے آتے خود بخود ٹھیک بھی ہو جائیگا۔

گو تھی تو یہ لڑکپن کی سی حرکت، مگر تھی کیا مزے دار، میں نے جھٹ پٹ ڈھیلی ڈھالی موری کا پائجامہ رانوں تک چڑھا لیا سر سے گھٹنوں گھٹنوں پانی والے نالے میں سرک پڑا اور پینترا بدل کر کھڑا ہو گیا، اُفوہ کس قدر ٹھنڈا پانی تھا، اکدم آنکھوں تک تری دوڑ گئی، پھر جناب پھینکتا ہوں جو ایک آم پھسلواں تو آبی چاندنی پر لکیر کھینچتا ہوا چشمہ کے آبشار میں غائب، اسی طرح باری باری سارے آم بھتا دیئے پھر دیکھا جو سامنے تو چاندنی پر لوٹتے، چادروں میں پلٹتے، سیڑھیاں اُترتے آم چلے آرہے ہیں میری طرف جوں ہی اُن میں کا ایک میرے قریب آیا اور نالے میں غٹ پٹ ہو کر نکلنے لگا، میں نے پُھرتی سے پکڑ لیا، اب کیسا چیپ بالکل صاف ہو چکا تھا، مگر میں نے اُسے چٹان پر نہ رکھا، اسی چشمہ کی طرف دوبارہ کھینچ مارا، بس جناب پانچ چھ پھیروں میں سارے آم ادلا ہو گئے

وہ رنگ نکھرا کہ صورت دیکھے سے منہ میں پانی بھر آئے ۔

میں نے آم نکال نکال کر چٹان پر چن دیئے اور اچھل کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا، آم پلپلا کر اتارا جو ایک گھونٹ، آما سینہ مہک گیا، ان ہی آموں میں کل رات کو ایسا کوئی نہ نکلا تھا، اسے ختم کرتے کرتے خیال آیا کہ یہ چیز کورے کلیجہ نقصان کرتی ہے، پہلے تھوڑا بہت ناشتہ ضرور کرلینا چاہیئے، باقی آم تو میں نے گڑھا کرکے پانی کے قریب دبا دیئے تاکہ ٹھنڈے رہیں، اور پراٹھے قیمہ سے لو لگائی، دو پراٹھے اور سارا قیمہ چٹ کر گیا، اس کے بعد آموں کی باری آئی تو ایک ایک کرکے وہ بھی ہضم، اوپر سے پیا جو پانی سُرور گٹھ گیا، خیر سے دھوپ ابھی تک نہ نکلی تھی، وہی ابر چھایا ہوا تھا، جی چاہا تھوڑی دیر اور بیٹھیں یہیں، سگریٹ سلگا کر لگایا جو ایک کش، آما تاڑی سی کھل گئی، ہر چپہ ہزار چند حسین نظر آنے لگی۔

مثل مشہور ہے، بھوکے کو تنور کی سوجھے پیٹ بھرے کو دور کی سوجھے۔" گویا یار کے لیل و نہار آنکھوں میں پھرنے لگے، محلے محلے ایک سے بڑھ کر ایک من چلا سردار پڑا ہوا ہے، جب دیکھو جلسے ہو رہے ہیں، رقص و سرود کی محفل گرم ہے کسی نہ کسی بہانہ ایک آدھ جگہ ہُو حق ہوتی ہی رہتی تھی، مجھے اکثر ایسی صحبتوں میں جانے کا اتفاق ہوا کرتا تھا، جن میں استاد سعادت خان جل ترنگیئے، امیر خان استاد ستاریئے، گردسنگھ پکھاوجیئے اور رشام راؤ کھڑتالیئے اپنے اپنے ساز ملا کر موسیقی کے کرتب دکھایا کرتے تھے، ان یگانہ روزگار استادانِ موسیقی کا بدل اب کہاں ہوگا، جنہوں نے قدرشناس امرا کی سرپرستی میں فکرِ معیشت سے بے نیاز ہو کر اس فنِ لطیف پر زندگیاں وقف کردی تھیں ۔

جس وقت ان کی بحث چھڑ جاتی، کڑاکے کی سردیوں میں پسینہ پسینہ ہو ہو جاتے، آپ دیپ راگنیاں اتر آتی تھیں، اہل محفل کی محویت کا یہ عالم ہوتا کہ دو ایک جگہ کی بوٹیاں بھی کاٹ لو تو انہیں خبر نہ ہو ۔

وہ محفلیں تو روپیہ پانی کرکے امیر امرا کے سجے سجائے عالیشان محلوں میں ہوتی تھیں، جہاں ہر کس و ناکس کی رسائی نہ تھی کیا مجال جو بلا مرضی، بغیر اجازت پرندہ پر مار جائے، اور یہاں کھلے خزانہ جنگل میں منگل ہو رہا تھا، سنسناتی ہوا میں نتھرے ہوئے چشمہ کی چھالیں چھن چھنا رہی تھیں، پانی کی چادریں ایک مسلسل جل ترنگ بجا رہی تھیں، نالے کی بڑبڑاہٹ ستار کی گت کا مزہ دے رہی تھی، اور سنسان فضا میں ایک مستقل سم چھایا ہوا تھا، اس پر لطف یہ کہ پہرہ نہ چوکی، راستے کھلے ہوئے ہیں، جس کا جی چاہے بے دھڑک چلا آئے اور زندگی کا پھل پالے ۔

اتنی سی دیر میں جی تو کیا بھرتا، لیکن سر پر سفر سوار تھا، میں نے سوچا منزل کھوٹی ہوتی ہے، اب چلنا ہی چاہیئے ، با دلِ ناخواستہ چھاتی پر پتھر رکھ کر اٹھا، بار بار اس دل دلفریب نظّارے پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالیں اور اٹلیا پٹلیا سنبھال چل کھڑا ہوا۔ سڑک کا وہ حصّہ تو پیچھے رہ ہی چکا تھا، جس میں کوہ نور کا خاندان دفن ہے، جہاں نہ معلوم کتنے ہیرے میرے پیروں تلے

نکل گئے ہونگے کہ اگر وہ عالمِ شہود میں آئیں تو ایک عالم کی نگاہیں خیرہ کر دیں، آگے اور کوئی میل ڈیڑھ میل ہی ہموار سڑک ملی، اس کے بعد کسی قدر بادل چھٹ کر دُور دُور کچھ دھوپ جھلکی اور سامنے جنگل سے ڈھکے ہوئے پہاڑ پر ایک لہریا سا چڑھتا نظر آیا، اس پہاڑ کے دامن سے ہی درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، لیکن کچھ ایسا گھنا نہیں، درخت آئے اور پہاڑ کی چڑھائی نے ساگون کے تناور درختوں میں پہنچا دیا، یہ چڑھائی کچھ زیادہ لمبی نہ تھی، دو ایک ہی ہیر پھیر میں اترائی سی جاتی پھر وہ ہی صورت اختیار کرلی، جو عام طور پر پہاڑی علاقوں کی ہوا کرتی ہے۔

شادابی کے لحاظ سے اس نواح میں دُور دُور ایسا کوئی قطعہ نہیں، جس نے ہر قسم کے پرندوں کی کثرت سے بڑے بڑے چڑیا گھروں کو مات کر رکھا ہو، کتنی ہی بار قازوں کی ڈاریں میرے سر کے اوپر سے نکل چلی گئی، جابجا طوطوں کے جھنڈ اُڑتے پھرتے تھے، تیتروں کی آوازوں سے جھاڑیاں معمور تھی، جنگلی کبوتروں کی ٹکڑیوں کا تو گویا کوئی شمار ہی نہ تھا، اکثر جگہ اونچے اونچے درختوں پر بگلے بیٹھے نظر آتے تھے، ٹیٹریاں "ہٹ ٹی ٹی، ہٹ ٹی ٹی" کرتی اڑتی پھرتی تھیں کبھی کبھی طاؤس شور مچاتے تو سارا جنگل گونج جاتا، فاختہ کی حق سرہٗ حق سرہٗ اس پاک پروردگار کی یاد دلاتی تھی، پودنے توہی توہی توہی توہی کرتے پھرتے تھے، ان کے علاوہ کتنے ہی پرند ایسے بھی دیکھنے میں آئے جنہیں نہ تو میں اس وقت جانتا تھا نہ اب پہچان سکتا ہوں۔

کبھی کبھی آفتابِ عالم تاب کسی شوخ مزاج مہرطلعت کی طرح بادلوں کی آڑ سے جھانکتا اور دور تک ایک جھلا بور زرفتی چادر سی پھینک کر سمیٹ لیتا، پھر برشگالی ہواؤں کے ہوش رُبا جھونکوں سے جنگل کے درخت شائیں شائیں کرکے دہرے ہونے لگتے، معلوم ہوتا جنت کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔

یہ سڑک پہاڑ کے گھیر میں کروٹیں سی بدلتی ہوئی بتدریج علاقہ زیر گھاٹی کی طرف اتر رہی تھی، ایک طرف اونچا پہاڑ تھا دوسری جانب نشیب کھڈ اور غار وغیرہ، کہیں کہیں پہاڑ بھی آجاتے تھے، بعض جگہ جہاں مویشیوں اور گاڑیوں کے لئے ذرا زیادہ گھماؤ تھا، وہاں پیدلوں کی آسانی کے واسطے زینے کاٹ دیئے گئے تھے تاکہ ناحق کے چکر میں نہ پڑیں، کھٹ سے نچلی سڑک پر اُتر جائیں۔

کئی ایک جگہ یہ قدرت بھی دیکھنے میں آئی کہ ایک درخت پہاڑ کی دراڑ میں جڑوں کا اڑنگا ڈالے سڑک پر جھکا ہوا ہے اور اس درخت کی کھوال میں کسی دوسری ہی قسم کے درخت کی ہری ہری شاخیں لہلہا رہی ہیں، اوپر سے کوئی پھولوں والی بیل چھائی ہوئی ہے اور بڑے درخت کی ڈالیوں میں بیہوں کی جوجھیں جھول رہی ہیں۔

اترائی پر سوائے خود کو سنبھالے رہنے کے چلنے میں کچھ ایسا زیادہ زور تو لگانا ہی نہیں پڑتا، میں نے بدن سادہ کر

ٹانگیں چھوڑدیں اور جلد جلد نظارے بدلنے شروع ہوئے۔ لیکن اس مارا مار سے کسے فرصت تھی کہ جگہ جگہ اٹکتا کتنی ہی دلفریب چیزیں عمداً نظر انداز کرنی پڑیں، کہ بھئی ہوگا چلے بھی چلو ٹھہرنے کا موقعہ نہیں۔

اس دوڑ دھوپ میں ایک زینہ آیا، جسے اترتے ہی دیکھتا کیا ہوں کہ سڑک کے اس پار دُور تک مکرمنڈیر چلی گئی ہے اور اس پختہ منڈیر میں ایک جگہ نکلنے کا راستہ ہے جس سے دوچار سیڑھیاں اُتر کر کچھ اونچی نیچی زمین کے بعد دو ایک سیڑھیاں چڑھ کر ایک ہموار چٹان پر چھوٹا سا مندر، ایک دالان اور پتھر کی چند پختہ کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جنکے درمیان اچھا خاصہ لمبا چوڑا پختہ حوض ہے، ادھر اُدھر باغ کی طرح قسم قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں، جن میں آم کے اونچے اونچے چھوٹے چھوٹے پھلوں والے پیڑ تو خاص کر گواہی دے رہے تھے کہ یہ جگہ ضرور کسی نیک دل بندے نے مسافروں کی راحت کے واسطے آراستہ کی ہوگی۔

اس سنسان بیابان میں ایسا خوشنما باغ دیکھ کر بے اختیار سیر کرنے کو جی چاہا، اور بڑا اشتیاق ہوا کہ دیکھنا چاہیئے یہ مکانات اندر سے کیسے ہیں بھئی یہ تو کچھ ایسی مزیدار جگہ ہے کہ اگر انسان یہاں رہے تو خدا نے چاہا چندہی روز میں دل دماغ روشن ہوجائیں۔ مگر جناب وہاں تک پہنچنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا، کیونکہ اس باغ اور اُن مکانات پر لنگور قابض تھے، آدمی زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی، یا پھل پھلاری کے سبب سے طرح طرح کے پرند بھی جمع ہوگئے تھے، آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں، پپیہے کی "پی کہاں، پی کہاں" کا شور تھا، آموں کی ڈالیوں پر کوئلیں کوکتی پھرتی تھیں، ابلقوں، پوتوں، میناؤں، شاماؤں اور بھٹیاریوں کا شور وشغب، طوطوں کی ٹیں ٹیں کوؤں کی کائیں کائیں اور لنگوروں کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، اس سہانے سمے اور آزاد فضا میں سب ہی امنگ پر تھے۔

خاص کر لنگوروں سے تو نچلا بیٹھا ہی نہ جاتا تھا، ذرا دم لیا اور کہ دس فیٹ اُڑ کر دوسرے درخت پر نظر آئے، وہ لنگور جو آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہوئے گرے تو ایک نے لپک کر برگدکی ڈاڑھی پکڑلی، دوسرا کسی گدّے سے جا چمٹا، کتنے ہی لنگور خواہ مخواہ بھی ڈالیوں میں جھول رہے تھے بعض لنگورنیاں پھنگوں پر بیٹھی بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں، بہت سے بچے ادھر ادھر پھدکتے پھرتے تھے بیسیوں لنگور آم کھاتے اور نیچے ٹپ ٹپ گٹھلیاں گراتے۔

میرا دل بے قابو ہوا جاتا تھا، کہ جس صورت بھی ہو ان مکانوں کی اندر سے ضرور سیر کرنی چاہیئے، مگر سوچا کہ نادان عقل تو نہیں ماری گئی ہے، اس ویرانے میں کہ آدمی نہ آدم زاد بجز ذات خدا کوئی یار نہیں، کبھی بھول کر بھی ایسا نہ کیجئے، خیر چاہتا ہے تو کان دباکر کھسک جا ورنہ کہیں یہ وحشی خوخیا خوخیا کر لپٹ پڑے، تو ڈھونڈے بوٹی نہ ملے گی۔

مگر واہ رے لنگورو! آفرین ہے تم کو نہ جانے کتنوں نے مجھے دیکھا ہوگا لیکن سوائے اچھلنے کودنے یا آپس میں خوش فعلیاں کرنے کے کسی نے نہ پوچھا تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔

میں نے سُست چال تیز کی، اور لگا فراٹے بھرنے، آگے جا کر جبکہ اُترائی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ رہ گیا ہو گا، کہیں کہیں چھدرے درختوں میں سے ریاست اجیگڑھ کا علاقہ زیرِ گھاٹی جھلکنے لگا، اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی قدرتی سین کا مرقع دیکھ رہا ہوں جس میں کہیں جنگل ہے، کہیں پہاڑ، کہیں لہلہاتے کھیت ہیں تو کہیں چراگاہیں، کسی جھیل پر مرغابیاں اترتی دکھائی دیتی ہیں، کسی تالاب کے کنارے سارس کی جوڑی پھر رہی ہے، کہیں کتے بلّی کی برابر چھوٹی چھوٹی سی گائیں بھینسیں چر رہی ہیں، کسی سبزہ زار میں ننھے ننھے سے ہرنوں کا ٹھنا چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے، کسی پگڈنڈی پر اونٹوں کی قطاریں جا رہی ہیں، کسی جھونپڑی سے دھواں اُٹھ رہا ہے، اور یہ نہیں جو میرے سر پر ہے، کسی دوسرے ہی آسمان کی بوقلمونیوں نے اُس مرقع کی دیدہ زیبی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

آخر دو تین موڑ بعد اس سڑک کا خاتمہ ہو گیا، دفعتہً ایک دھوبن چڑیا میرے سامنے سے اڑتی ہوئی کھیتوں کی طرف جاتی دکھائی دی، میری رفتار بھی اب ویسی تیز نہ رہی تھی، نگاہوں نے چڑیا کا تعاقب کیا، اور وہ تھی کہ ایک پرانی عمارت کے اوپر سے گذرتی ہوئی غائب ہو گئی، یہ عمارت ساخت کے لحاظ سے مجھے باولی سی معلوم ہوئی، کچھ تو پیاس بھی لگ آئی تھی، کچھ میں نے خیال کیا اِدھر بار یہاں کون آتا ہے، آؤ ذرا بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے چلیں۔

اندر جا کر معلوم ہوا کہ گو عمارت پرانی ہے لیکن اس کے پانی کی صفائی میں کلام نہیں، جیسے بلور کا ٹکڑا کاٹ کر رکھ دیا ہو، تہ کا ذرہ ذرہ صاف نظر آ رہا ہے، جوں ہی پوٹلی رکھ کر میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا، اور پانی کے بلوروں کی لہریں دور تک پھیلیں، کچھ عجیب سیر ہوئی، اک دم بالشت بالشت سوا سوا بالشت کی کتنی ہی سنگھی مچھلیاں دوڑ دوڑ کر کنارے کے قریب آ گئیں، ایک پراٹھا میرے پاس ابھی باقی تھا، میں نے وہ نکالا اور جو مَل مَل کر پانی پر بکھیرا، پھر کیا تھا یہاں سے وہاں تک مچھلیوں کی ایک نہ سی بچھ گئی، نری مچھلیاں ہی مچھلیاں نظر آنے لگیں، شاید انہیں کبھی کسی سفاک آدمی سے پالا نہ پڑا ہو گا، جب ہی تو بے دھڑک مجھ پر چڑھی آتی تھیں، اس وقت میرے دل میں کھوٹ تو آئی تھی، مگر میں جانتا تھا کہ یہ مچھلی بُری طرح کانٹا مارتی ہے، ورنہ ایک آدھ ضرور پکڑتا پھر چاہے فوراً ہی چھوڑ بھی دیتا۔

میں نے پراٹھے کا چورا کر کے سیڑھی پر رکھ لیا تھا، کبھی پیتل کا لوٹا مانجھنے لگتا، کبھی ایک چٹکی چورا پانی میں ڈال دیتا، پھر لوٹا مانجھنے لگتا، لوٹا مانجھ کر آہستہ آہستہ صافہ باندھا، پاؤں دھو کر جوتا پہنا، اور احتیاطاً لوٹا بھر کر آدمیوں کی سی صورت بنا کر باولی سے نکل کر راہ پر آیا۔

اب میں اجیگڑھ کے پہاڑی قلعہ کی پشت اور دھندر روڈ کی درمیانی وادی میں تھا، یہاں سڑک وڑک کوئی نہ تھی، یونہی ایک کنکریلی پتھریلی گڑواٹ سے سب آتے جاتے تھے، کچھ فاصلہ پر ایک اُجڑ سا گاؤں نظر آیا جس کے باہر باہر وہ گڑواٹ جا رہی تھی، تضیعِ اوقات سمجھ کر میں اس طرف نظر ڈالے بغیر سُدھ باندھے چلا گیا۔

گاؤں سے دو ایک فرلانگ نکل کر ننھے ننھے رنگ برنگے سنگریزوں سے گرڈواٹ چمک رہی تھی، جیسے کسی نے جواہرات بکھیر دیئے ہوں، نزدیک پہنچا تو ان سنگریزوں میں ایک خوبصورت ناگن جاتی ہوئی دکھائی دی، اس درجہ نازک اور ایسی حسین کہ صورت دیکھا کرو، مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے نرم نرم زمین کے کھیت میں چلی گئی، پہلے تو اس پر رحم آیا کہ جانے بھی دو اپنا کیا لیتی ہے، پھر سوچا کہ نہیں سانپ کا بچہ سنپولیا، اس کی ظاہری صورت پر نہ جانا بس کی گانٹھ ہے، اس کا مارا پانی نہیں مانگتا، کہیں موقعہ پاکر کسی کو چٹک لیا تو بچارا وہاں کا وہیں رہ جائیگا لہذا ایذا پہنچانے سے پہلے ہی موذی کو ٹھکانے لگا دینا چاہیئے۔

فوراً جھپٹا ابھی وہ ڈھائی تین قدم بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ میں نے تاک کر ساڑھے تین سیر پکے کا پانی بھرا لوٹا اس پر چٹک دیا، اب وہ یا تو دہری زبان لپکا لپکا کر من ٹپکتی تھی، یا تیزی سے دم ہلا رہی تھی، لوٹا ہٹا کر جو دیکھا تو ہڈی پسلی ایک ہوئی زمین میں چپکی رہ گئی ہے، تاہم لوٹا ہٹ کر لگی جو تازہ ہوا سکت آگئی لگی آہستہ آہستہ رینگنے، یقیناً وہ اس ضرب سے زندہ تو نہ رہتی، گھڑی دو گھڑی میں ضرور مر جاتی، لیکن عذاب دے دے کر نہیں مارنا تھا، اس لئے کہ جلد مشکل آسان ہو، میں نے دو ایک بار اور لوٹا دے چٹک دیا جس سے وہ فیتہ بن کر رہ گئی، اس کی پیٹھ پر ایک رنگیں زنجیر کھنچا ہوا تھا، اور دونوں طرف رنگ برنگی افشاں چنی ہوئی تھی، کم بخت آنکھوں میں کھب گئی، میں نے جو اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو کس قدر ملائم اور چکنی چکنی کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

آخر ناگن تو اٹھا کر جھاڑیوں میں پھینکی اور گرڈواٹ پر ہولیا، کھیت در کھیت چل کر قلعہ کی چٹانیں آئیں، سڑک نہ ہونے کے سبب سے یہاں گرڈواٹ بہت گڈھب ہو گئی تھی جس میں قدم قدم پر پیچ و خم تھے گمر اونچے اونچے بکثرت درخت اس قدر گھن دار کہ کہیں کہیں کچھ کرنیں چھن چھن کر آجاتی تھیں، باقی زمین نے شاید کبھی دھوپ دیکھی ہی نہ ہوگی، اس مقام پر وہ مفرح لپٹیں آئیں، میری روح تازہ ہو گئی، ہر سانس پر پردے سے اٹھتے جاتے تھے، سینہ میں ایک گدگدی سی ہوتی تھی اور میرا دل گرڈواٹ سے ملی ہوئی اس سنپولیا سوا دگھاٹی کی طرف کھنچا جاتا تھا، بو نگار رنگ خودرو پھولوں کی مہک سے طبلۂ عطار بنی ہوئی تھی، آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور جھاڑیاں پکڑتا ہوا اس قدرتی چمن میں اتر گیا جہاں زمین نے نباتاتی خزانہ اگل دیا تھا۔

بڑے بڑے باغوں میں اعلیٰ اعلیٰ درجہ کے انجینئر مصنوعی پہاڑ اور کھنگروں کے ٹیلے بناتے تھے، پھر تجربہ کار مالی کھاد اور پانی دے دے کر موقع موقع سے ہری ہری دوب لگاتے ہیں، طرح طرح کے گل بوٹوں اور خوبصورت خوبصورت گملوں سے سجاتے ہیں، مگر یہ بہشت زار گھاٹی قدرتی طور پر چھوٹی چھوٹی زمردی چٹانوں سے معمور تھی، اس میں ایسی ایسی نرم و نازک بوٹیاں جو ہزار صاحب سنبھال پر بھی گلشنوں میں کملا جاتی ہیں، کچھ اس شان سے لہلہا رہی تھیں گویا انہیں خزاں سے کبھی واسطہ پڑا ہی نہیں۔

جدھر نظر ڈالتا نگاہیں مست ہو جاتیں، مجھے عجیب و غریب بیل بوٹے، پتے، ڈنٹھل، پھول، پتیاں، پھلیاں، گھنڈیاں، زیرے اور تخم وغیرہ نظر آتے اور میری حیرت میں اضافہ کرتے، خدا جانے ان میں کون کون سے اکسیر الخواص جوہر پنہاں ہوں گے افسوس

مجھے جڑی بوٹی کی شناخت نہیں سوائے اس کے کچھ نہ کر سکا کہ انہیں دیکھوں اور رہ جاؤں۔

ایسے میں کوئی یوگی سنیاسی یا کوئی ماہر فن ہوتا تو نہ جانے کیا کیا فوائد حاصل کرتا، اس فن سے کورا ہونے کے باوجود مجھ پر وہاں کے ظاہری نظارے اور اُن جڑی بوٹیوں کی عجیب وغریب ساختوں نے وہ سحر کیا کہ میں دیوانوں کی طرح اُس بھول بھلیاں میں ادھر اُدھر بھٹکنے لگا اور اندر ہی اندر کہیں کا کہیں جا نکلا۔

ایک جگہ کسی کے بولنے کی کچھ بھنک سی پڑی میرے کان کھڑے ہوئے سامنے جو دیکھتا ہوں تو اونچی چٹان پر جھاڑیوں کی آڑ میں چند آدمی باتیں کرتے جا رہے ہیں، میں نے اس سمت قدم بڑھایا کہ دیکھوں یہ کیا مقام ہے اور جانیوالے کون ہیں، وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ تو جھاڑیوں میں غائب ہو گئے، البتہ دوسری جانب مجھے اجیگڑھ کی آبادی کے سے آثار نظر آئے میں نے وہی راستہ اختیار کیا اور کٹکھنے جوتے سے مجبور بیر گھسیٹ گھسیٹ کر پتھریلی گرد واٹ پر چلنے لگا۔

پنا سے لیکر یہاں تک ایک جگہ چشمہ سے نکل کر کسی دیہات کے میاں بیوی اپنا ننھا سا بچہ لئے ہوئے ملے تھے، اُترائی میں اجیگڑھ کے ایک شناسا سے ملاقات ہوئی تھی، یا جب میں علاقہ زیر گھاٹی کے گاؤں سے گذر رہا تھا تو کچھ پنہاریاں کنوئیں پر جاتی دکھائی دی تھیں مگر جوں ہی اجیگڑھ کا قلعہ قریب آیا کیونکہ یہاں چھ سات مہینہ سے مقیم تھا، راستہ ہی سے سلام دعا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

تالاب لہریں مارتے دکھائی دیئے، بستی آئی اور میں خیر سے اپنے میزبان قاضی محمد رسول خان کے گھر پہنچ گیا، یہاں آکر معلوم ہوا کہ اب دن کے گیارہ بجنے والے ہیں۔

کپڑے وپڑے اتار کر جو اطمینان سے بیٹھا تو تازہ خون کی تیز گردش سے کانوں میں تسائیں تسائیں ہو رہی تھی، راستہ کے مناظر آنکھوں میں پھرتے تو معلوم ہوتا، کوئی سینما دیکھ کر آیا ہوں جس میں عجیب وغریب سینریاں تھیں۔

پنا سے اجیگڑھ تک کا فاصلہ لوگ سات ساڑھے سات میل بتاتے تھے، شاید ایک آدھ میل زیادہ ہو، اگر میں جا بجا ٹھہر نہ جاتا تو یہ مسافت اس رفتار کے لحاظ سے ڈھائی تین گھنٹہ میں ختم ہو گئی ہوتی، آتنا مختصر سفر کس قدر دلچسپ تھا کہ اب بھی کبھی کبھی تصور میں ان راستوں پر اُسی طرح چل چل کر مزا لیا کرتا ہوں۔

یا سفر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پشاور سے فرانٹیر میل کے فرسٹ کلاس کی سیٹ ریزرو کرا کے ڈٹ گئے، اب ٹس سے مس ہونے کی ضرورت نہیں خدا نے چاہا بیٹھے بیٹھے ہمیں سب کچھ حاضر ہو جائیگا، یا کوئی بڑا جنکشن آگیا تو ذرا اُتر کر رسٹورنٹ میں چائے پانی سے جی بہلانے لگے، پھر گارڈ کی سیٹی ہوتے ہی وہاں سے وہیں موجود ہیں۔ تیسرے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے جو آنکھ کھلی تو آواز آئی "بمبے سینٹرل" یعنی اتنا بڑا اُلٹ پھیر ہو گیا، اس قدر ملک طے کر لیا مگر مطلق خبر نہ ہوئی کہ کیسے کیسے قابل دید عجائبات نکل گئے۔

فہیم بیگ چغتائی

سہ رنگی تصویر

(۱)

پہلا رنگ نہایت ہلکا، غنچۂ ناشگفتہ کی طرح پاک اور برف کی طرح بے داغ تھا:-

سُن کتھا میری اچھی سہیلی — رات! میں سو رہی تھی اکیلی
آئی خوشبو مجھے عطر کی سی — چھو گئی سانس مجھ کو کسی کی
چھا گئی مجھ پہ بدلی کرم کی — بند آنکھوں میں بجلی سی چمکی

ہو گیا فضلِ باری تعالیٰ
آیا گھر میں مرے عرش والا

(۲)

دوسرا رنگ نہایت شوخ، مگر کچا، دھوپ میں اڑ جانے والا میری انتہائی مسرّت، اور اس کے معنی خیز تبسم پر شامل تھا

محوِ دیدِ رُخِ یار ہوں میں — خواب میں ہوں کہ بیدار ہوں میں
اب جلے آگ میں میری سوتن — میں تو باندھوں گی دامن سے دامن
اب کہیں اس کو جانے نہ دونگی — غیر کو مُنہ دکھانے نہ دونگی

غم کدے میں مرے عید ہو گی
اب تو آٹھوں پہر دید ہو گی

(۳)

تیسرا رنگ نہایت گہرا اور پختہ، دھونے سے بھی نہ دُھلنے والا خون کی طرح جسم کی رگ رگ میں دوڑنے والا تھا

ناگہاں اک ذرا آنکھ جھپکی، کڑکڑا کر گری غم کی بجلی
ہائے تقدیر نے رنگ بدلا پھر یہ دیکھا کہ اُس کو نہ دیکھا

اس نے جلوہ دکھایا ہی کیوں تھا
جانے والا پھر آیا ہی کیوں تھا
بیٹھے بیٹھے مرا جی جلایا
چھپنے والے نے کیوں منہ دکھایا

اب وہ ہم ہیں، نہ وہ دل نشیں ہے
ہائے، سب ہو کے پھر کچھ نہیں ہے

سید احمد حسین امجد

دو خط

میری پیاری فرحت خط لکھنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ مگر الفاظ کاغذ پہ نہیں اُترتے، خیالات امڈے چلے آتے ہیں، بے اختیار ہوا جاتا ہوں، جی چاہتا ہے تم سامنے ہو اور تمہیں دیکھتا رہوں، مگر یہ کہاں نصیب! پھر بھی تم نظروں کے سامنے ہو، دیکھتا ہوں کہ چارپائی پر بیٹھی ہو، دوپٹہ زمین پر لٹک رہا ہے، دھوپ میں گال سُرخ ہو رہے ہیں، بال بکھر بکھر کے کان پر اور گالوں پر آ رہے ہیں، کبھی کبھی انہیں ہٹا دیتی ہو، مگر وہ استغراق ہے کہ میں بیٹھا ہوں میری بھی پروا نہیں، کسی کی پروا نہیں، گھر بھی یاد نہیں، کتاب ہے اور تم ہو، کتنے خوش قسمت کہانی کے لوگ ہونگے جو تم سے بھی یہ خراج لے رہے ہیں، تم سے بھی! انہیں کیا معلوم تم کون ہو کسی کو نہیں معلوم، شاید تم خود بھی نہیں جانتیں، جب تم ایسے چپ بیٹھی ہوتی ہو تو میں تم میں بہار کی شبنمیں راتوں کا سکوت دیکھتا ہوں، تم نہیں جانتیں! جب تم ہنستی ہو تو مجھے شفق کی گلنار بشاشت یاد آ جاتی ہے، جب میں تمہاری آواز سنتا ہوں تو میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے خدا تعالیٰ کے قرب میں فرشتے محبت کے گیت گا رہے ہیں، یا کسی گرجے کے مقدس ترین حصے میں طلائی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔

میری آرزوئیں کیا ہیں! کاش تم کبھی پوچھو میں کیا چاہتا ہوں، جی چاہتا ہے کسی بھرے ہوئے دریا میں ایک کشتی بہاؤ پر چلی جا رہی ہو، میں اور تم اس میں بیٹھے ہوں، تم تکیوں سے لگی آرام کر رہی ہو، دنیا ایک منتظرانہ خاموشی میں ڈوبی ہوئی ہو، دور افق پر سورج دمک رہا ہو، اس کی آخری شعاعوں نے ہماری کشتی تک ایک سنہرا راستہ بنایا ہو، ہماری کشتی اسی راستہ پہ چلتی جائے اور میں تمہیں دیکھتا رہوں یا سرسبز درختوں کے ایک گھنے جنگل میں کوئی چشمہ ہو جس کے گرد اونچے تناور درخت دائرہ بنائے ہوئے ہوں، چشمہ زمین سے پھوٹ کر گول، خوشنما، چمکیلے پتھروں پر بہ رہا ہو، ہری ہری گھاس پر تم لیٹی ہوئی ہو، ادھر اُدھر پھول کھلے ہوئے ہوں زرد گلاب کی خمار آفریں مہک سے وہ خطہ لبریز ہو رہا ہو، میں تمہاری آنکھوں کی عمیق تاریکیوں میں جگنو ڈھونڈتا رہوں، یا پہاڑوں کی کسی جنت نشان وادی میں صبح کے زعفرانی سمے میں میں اور تم اوس سے بھیگے ہوئے نیلے اور گلابی اور بسنتی پھول توڑتے پھریں، تم دن بھر اس وادی میں کرنوں سے کھیلتی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں، فرحت پیاری میں کیا کچھ نہیں چاہتا! میں چاہتا ہوں اس ملک میں بھی حسن کی پرستش ہو، زہرہ کے معبد جا بجا موجود ہوں، میں اپنی آرزوؤں کا ایک رنگین جگمگ جگمگ کرتا ہوا مندر بناؤں اور تم دیوی بن کر اس میں بیٹھو۔ یا برسات کا موسم ہو، کسی اونچے سے درخت سے ایک ریشمیں پینگ لٹک رہی ہو، میں تمہیں اس میں بٹھا کر جھولا جھلاؤں، آسمان پر بادل چھٹ رہے ہوں، سورج کی شعاعیں بادلوں میں سے نکل نکل کر نکل رہی ہوں، تمہاری

پینگ اتنی بڑھے کہ آسمانی پینگوں سے جا ٹکرائے۔

یا پھر تم میز پر کھانا کھا رہی ہو میں ایک ننھا سا لال بن کر کھڑکی کے راستے آکر تمہاری پلیٹ پر آبیٹھوں، تم اس ڈر سے کہ کہیں میں اڑ نہ جاؤں چپ چاپ بیٹھی رہو، پھر اپنا نرم سا ہاتھ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھاؤ، میں اسی چیز کا منتظر، تمہاری کلائی پر جا بیٹھوں، مجھے چمکارنے کے لئے تمہارے ہونٹ سکڑ کر غنچہ کی صورت ہو جائیں، تمہارے رس بھرے لبوں کے کنج میں روٹی کا ایک ننھا سا ذرہ ہو، میں جلدی سے اڑ کے اپنی چونچ سے اسے اڑا لوں، تم گھبراہٹ میں پہلے میری جسارت سے شرما جاؤ، پھر میری بیباکی پر ہنس دو اور تمہارے ہونٹ پھول کی طرح کھل جائیں۔

مگر کاش کبھی تم سنو، تو میں سناؤں تخیل کی مدد سے میں نے تمہارے ساتھ بہت سی دنیائیں دیکھی ہیں، میں نے تمہیں اپنی محبت کی کہانی تشبیہوں سے استعاروں سے گیتوں کی مدد سے سنائی ہے، میرے اور تمہارے درمیان کوئی حجاب، کوئی جھجک، کوئی بات حائل نہیں ہوئی، مگر میں تمہارے ہاں جاتا ہوں اور ناکام واپس چلا آتا ہوں، بیٹھتا بھی ہوں، تمہاری طرف دیکھتا بھی رہتا ہوں، کبھی کبھی تمہاری والدہ اٹھ بھی جاتی ہیں، کبھی میں اور تم اکیلے بھی رہ جاتے ہیں، دنیا کا شور گم بھی ہو جاتا ہے، مگر میں سوال ہی نہیں کر سکتا، میں ڈرتا ہوں، تم سے، تمہاری والدہ سے، تمہاری نخوریوں سے، تمہاری والدہ کی سخت گیر طبیعت سے، کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ تمہیں پیار کروں، کیا تمہاری نگاہ میں گرمی نہیں، تمہارے ہونٹوں میں ٹھنڈک نہیں؟ تمہارے نتھنوں کی نازک سی حرکت میرے لئے جنوں انگیز نہیں؟ میرے پہلو میں بھی دل ہے، دل میں خون بھی ہے، مگر جاتا ہوں، مزاج پرسی کرتا ہوں، میری والدہ، میری بہنوں، ان کے خاوندوں، ان کے بچوں کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی ہے، پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے، تمہاری والدہ سبزی بناتی ہیں یا ننھے کو نہلاتی رہتی ہیں، یا کوئی کپڑا سیتی رہتی ہیں اور تم بیٹھی ہوئی اپنی گھنی پلکوں والی بڑی بڑی مستفسر آنکھوں سے کبھی کبھی مجھے دیکھ لیتی ہو۔ تمہارے بھائی آجاتے ہیں، مجھے باتوں میں الجھا لیتے ہیں، کبھی کبھی تم اپنے مست پیارے ہونٹ کھول کر انگڑائی لے لیتی ہو تو میں سب گفتگو بھول جاتا ہوں، دنیا ایک لمحہ کے لئے مرتعش ہو جاتی ہے، در و دیوار زندہ ہو جاتے ہیں، پھر کچھ دیر بعد ہر چیز بدستور اپنی اپنی جگہ سو جاتی ہے اور میں تمہارے بھائی کے الفاظ سننے لگتا ہوں، شام ہو جاتی ہے اور میں سلام کر کے چلا آتا ہوں۔

یہ میری دنیا ہے! میرا کمرہ ہوتا ہے، باہر ہوسٹل میں لڑکے کھیلتے ہیں، باتیں ہوتی ہیں بحثیں ہوتی ہیں، ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ آمد و رفت سے ہر آن اک شور مچا رہتا ہے مگر میرا کمرہ سنسان ہے جیسے کسی وسیع صحرا میں ہو، میرے دل میں تاریک راتوں کی طرح خاموشی ہوتی ہے، بیٹھا ہوتا ہوں اور تمہارے بیٹھنے کے انداز کو یاد کرتا رہتا ہوں، تمہارا دوپٹہ تمہارے چہرہ کو آدھا چھپائے ہوئے ہوتا ہے کسی اپنے ہی کام میں مشغول ہوتی ہو کبھی اُٹھ کے باورچی خانہ جو جاتی ہو تو میرے دل کی حرکت تمہارے قدموں کے تابع

ہو جاتی ہے میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے چپ چاپ رات میں کہیں سارنگی بجنے کی آواز آرہی ہے' جب انہیں خیالات سے بیتاب ہو جاتا ہوں تو باہر سیر کو نکل جاتا ہوں' تمہاری یاد ساتھ ہوتی ہے اور میں دور دور پھر آتا ہوں۔

اب یہ خط لکھ رہا ہوں' اس لئے نہیں کہ تمہیں بھیج دوں' بلکہ اس لئے کہ شاید کچھ دل کو تسلی ہو جائے' اکثر تمہیں خط لکھ کے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں' تسکین ہو جاتی ہے پھر دو ایک دن بعد پھاڑ دیتا ہوں' اس خط کا بھی شاید یہی انجام ہوگا' مگر کاش میں تمہیں یہ خط بھیج سکوں' کاش تم میرے خطوں کو پڑھ لیا کرو' مگر یہ کیسے ہو؟ یہ ناممکن باتیں ہیں' یہی کیا کم ہے کہ تمہیں دوسرے تیسرے دیکھ لیتا ہوں' جی بھر کے دیکھ لیتا ہوں' مجھے اور کیا چاہیئے!!

دوسرا خط

پیاری مجیدہ۔ تمہیں تو شاید آج کل خط پڑھنے کی بھی فرصت نہ ہو۔ نئی نئی بھابی میکے سے آئی ہوں گی' نئے نئے چاؤ ہونگے نئے نئے پیارے بھائی جان' ہی بھابی جان گھر میں سارا دن ہوتا ہوگا' نئے نئے خوشرنگ کپڑے پہنے' قوس قزح بنی صحن میں پھرتی ہوگی' اطلسی بنارسی' کامدانی! کیا کیا بھڑک ہوگی۔ مہندی' ڈھولک' گانا بجانا' ہنسی کھیل اور پھر تمہاری ہنسی جس سے مرجھائے ہوئے پھول بھی تر و تازہ ہو جائیں! میں کون ہوں جو ان دنوں تمہیں یاد آؤں' پھر تین مہینے ملے ہونے بھی ہو گئے' تمہارے بھائی جان کی شادی بھی اب ہمارے لئے تو پرانی ہو گئی' مگر تمہارے گھر تو کل آدھی ہی اب آیا ہے' تمہاری خوشیوں کا کیا ٹھکانا ہوگا' معلوم نہیں تمہارے دل کی مسرت نے اچھل اچھل کر میری یاد کہاں کی کہاں گم کر دی ہوگی' اب سات دن ہوتے ہیں خط بھی نہیں بھیجا' ہر روز منتظر رہتی ہوں کہ خط آئے۔ دن میں کئی بار لڑکی کو لیٹر بکس کی طرف بھیجتی ہوں' مگر تم کیوں خط لکھو!

آج کل یہاں بہار شروع ہے۔ ہماری چار دیواری تک بھی ہوا باغوں کی' پھولوں کی' خبریں لے آتی ہے' صبح ہوتی ہے لوگ جاگ اٹھتے ہیں' دن گذر جاتا ہے' پھر رات میرے لئے اپنی دلنواز تاریکی لئے آجاتی ہے' مجھے رات بہت بھاتی ہے' سب سو جاتے ہیں' مجھے تسکین ہوتی ہے کہ اب میں بستر پر لیٹی خواہ جاگتی رہوں' خواہ سوچتی رہوں' خواہ فضا کی لامتناہی بلندیوں میں اپنے تئیں کھو دوں' کسی کو کیا خبر ہوگی؟ تم ہو کہ سب کچھ جانتی ہو' پھر بھی لکھنا بھول جاتی ہو' تمہاری بلا سے کوئی مرے یا جئے! تم ہوگی اور تمہاری وہ لاڈلی رقیہ! سارا دن ڈھولک ہوگی اور وہ ناچے گی اور تم اور باقی سب بہنیں گا رہی ہونگی' جب مجھے خیال آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس چھچھوندر کو دیس نکالا دیدوں مجھے نہیں معلوم تم اس سے بات کیسے کر سکتی ہو' مان لیتی ہوں کہ وہ گاتی اچھا ہے' اگرچہ جتنا بنتی ہے اتنا اچھا نہیں گاتی۔ ہاں البتہ ناچتی اچھا ہے' پاؤں خوب مارتی ہے اور بازو اور ہاتھ اچھے انداز سے پھراتی ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ تم اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤ' مجھے تمہاری یہ عادتیں پسند نہیں' مجھے تو جب میں شادی پر گئی تھی' جبھی اس کا تمہارے کندھوں پر چڑھنا زہر معلوم ہوتا تھا' اتنی بھی کیا کہ جیسے تمہارے

بغیر اس کی زندگی ہی ممکن نہیں۔ سرش کہیں کی! میرا تو کلیجہ الٹ جاتا ہے جب اُس کا خیال آتا ہے اور پھر ہر وقت تمہارے ساتھ، نہ اپنے گھر دفع ہوتی ہے نہ تمہیں چھوڑتی ہے، مجھے تو وہ جب بات کرنے کا بھی مشکل سے موقع دیتی تھی۔ کٹنی کہیں کی! میں تو حیران ہوتی ہوں کہ میں اس کا نام ہی کیسے لے سکتی ہوں چھچھوندر کی سی اس کی شکل ہے۔ توبہ ایسی ناک بھی کسی کی نہ ہو!

غصہ مجھے اس بات پر آتا ہے کہ میں کتنی ہی دل شکستہ ہوں جب مجھے یہ یاد آتی ہے تو مجھے اپنی تکلیف بھول جاتی ہے! دبی جاتی ہے مار مار کر کچھ مزہ نکال دوں مگر میں کیوں اپنا دل دکھاؤں پہلے ہی کیا کم بجھ چکا ہے معلوم نہیں انسان پیدا کیوں ہوتا ہے، اگر دنیا میں آ کے اسے یہی کچھ دیکھنا ہوتا ہے، مجبوریاں ہوں، پابندیاں ہوں تو آدمی سہہ لے نہ یہ کہ جیسے گھر میں کوئی بال کھایا ہوا مٹکا پڑا ہے نہ باہر ہی پھینکا جائے نہ استعمال ہی کیا جائے، جب کبھی سکول کے دن یاد آتے ہیں تو بے اختیار رونا آجاتا ہے، مجھے جانتی ہو رونا آیا ہی نہیں کرتا تھا تمہیں مجھے سنگدل اور جانے کیا کچھ کہا کرتی تھیں، میرا تو نام ہی تم نے برف رکھ دیا تھا، اب وہ سخت دلی کہاں! وہ دل کا انجماد کہاں! کاش میرا دل پتھر کا ہوتا ہوتا۔ نہ کسی چیز کا اس پر اثر ہوتا نہ مجھے کسی چیز کی لگن ہو سکتی، میں جب افسردہ ہوتی ہوں تو مجھے اپنی بیچارگی اور مایوسی کی وجہ سے اور بھی رونا آتا ہے، اس لئے اور بھی کہ میں جس کی آنکھ میں کسی نے آنسو نہ دیکھا تھا اسے اس آسانی سے رونا آجائے۔

میرے ساتھ چھ سال پڑھی ہو تو نہیں، دسویں میں تو ہم بہت ہی اکٹھے رہے ہیں، سکول میں کیسی کیسی حسین لڑکیاں ہوتی تھیں کبھی مجھے بھی کسی کی طرف آنکھ اٹھاتے دیکھا تھا لڑکیاں ایک دوسرے کی خاطر مر جاتی تھیں، مجھے ایسی لڑکیوں سے کتنی نفرت ہوتی تھی، یاد ہے صغرا بورڈنگ والی! توبہ!! اس نے روپ پال کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا تھا غش کھا کھا جایا کرتی تھی، اس نے روپے ملنے کے لئے کس کس کی منتیں نہیں کی تھیں، تمہارے ہی آگے اس نے ہاتھ نہیں جوڑے، خدا اور رسول کے واسطے نہیں دیئے اور مجھے کتنی بری لگا کرتی تھی جب بیچاری یاد آتی ہے تو مجھے اپنی سختی پر بہت افسوس آتا ہے، معلوم نہیں اس کے دل کو کیسی لگی ہوگی، بہتیرا گھر کے کام میں جی لگاتی ہوں، مگر وہ اتنا ہو بھی۔ اگر زیب کچھ نیچ بھی رہے تو امی کو جانتی ہو، ان سے بن کچھ کئے بیٹھا ہی نہیں جاتا، آپ ہی سبزی کاٹنے بیٹھ جائیں گی، میرے لئے کچھ کرنے کو نہیں ہوتا، کتابوں میں جی لگاتی ہوں، بھائی جان کی بے شمار کتابیں ہیں، انگریزی کے بہت عمدہ عمدہ ناول بھی ہیں، پڑھتی ہوں مگر دن ڈھلنے کو ہوتا ہے پر نہیں ہوتا۔

عصر کے وقت سے میرا دل تڑپنے لگتا ہے کہ وہ اب آئے کہ اب آئے۔ روز تو تم جانتی ہو وہ آتے نہیں، معلوم نہیں کیا وجہ ہے اور پھر سوچتی ہوں کہ آئیں بھی کیوں، ان کے لئے یہاں کون سی دلچسپی ہے، اس سال ان کا یونیورسٹی کا امتحان بھی نہیں ہے پھر بھی دوسرے دن ہی آئیں گے بعض دفعہ دو دو دن گذر جاتے ہیں اور وہ نہیں آتے، انتظار کرتے کرتے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے میرے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے، اپنے بدن کے کپڑوں سے بھی نفرت ہو جاتی ہے گھر ایسا روکھا روکھا سا دکھائی دیتا ہے جیسے اس میں کوئی بستا ہی نہیں، ننھے سے کھیلتی ہوں! امی کا ہاتھ بٹا دیتی ہوں، مگر امی تو خود مجھے کرنے نہیں دیتیں، کتاب لے کر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں، کچھ پڑھ بھی لیتی ہوں، مگر ناول کے افراد ایسے بے جان سے معلوم ہوتے ہیں، مجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں ایک دوسرے کی خاطر یوں پریشان ہوتے پھرتے ہیں، کہانی بہت

بے مزہ ہو جاتی ہے، کتاب دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

پھر جب وہ آتے ہیں تو ابھی ڈیوڑھی ہی میں ہوتے ہیں کہ میں پہچان لیتی ہوں، میرے تو بدن میں جان ہی نہیں رہتی، ہونٹ اتنے خشک ہو جاتے ہیں کہ مجھے خطرہ ہونے لگتا ہے کہ امی ہی نہ کبھی دیکھ لیں اور کہیں تجھے کیا ہو گیا ہے اور دل جو سارا دن کہیں گم رہتا ہے، ایسے زور سے دھڑکنے لگتا ہے کہ جیسے پھوٹ پڑے گا، جانتی ہو نا رشیدہ کو، کتنے اچھے نقش ہیں اس کے، اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں جیسے ان کی سیاہی میں جان پڑ گئی ہو، بس وہی آنکھیں ہیں، رشیدہ سے چار سال بڑے ہیں، مگر بہت بڑے تو نہیں معلوم ہوتے، ایسے بے پروا انداز میں آکے بیٹھ جاتے ہیں جیسے میں وہاں ہوتی ہی نہیں، امی ہی سے سلام اور انہیں سے باتیں کبھی کبھی مجھ سے بھی سلام ہو جاتا ہے۔ مگر جب تک بیٹھے رہیں گے، ایسے گویا خیالات کہیں اور ہیں، آنکھیں کہیں اور ہیں۔ آہستہ آہستہ بات کریں گے اور کس کی؟ رشیدہ کی، حمیدہ کی اپنی والدہ کی اور جانے کن کن کی اور سب امی سے۔

کبھی کبھی میری طرف جو دیکھ لیتے ہیں تو میری جان ہی نکل جاتی ہے، ایسے دیکھیں گے، جیسے فقط میں ہی میں دنیا میں ہوتی ہوں، ایک نظر ڈالتے ہی میرا دل کھینچ کے لے جاتے ہیں مگر کون جانے اس وقت کیا سوچ رہے ہوتے ہیں، خواہ اپنے کسی شاعر کے شعر ہی دماغ میں سلجھا رہے ہوں اس وقت میری حالت ایسی ہوتی ہے کہ میں حرکت ہی نہیں کر سکتی۔ پھر اور طرف منہمک ہو جاتے ہیں یا چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں، پھر جو میری طرف دیکھیں گے تو اس طرح جیسے مجھ میں اور دیوار میں کوئی فرق نہیں، مگر ان کی آنکھیں ہیں جیسے کالی رات میں کبھی دور چراغ ٹمٹما رہے ہوں، کبھی کبھی امی اٹھ کے باورچی خانے چلی جائیں تو چپ بیٹھے رہیں گے یا مجھے ٹکٹکی باندھ کے اتنا دیکھیں گے کہ میں شرما جاتی ہوں مجھ سے کہاں اُن کی آنکھوں میں دیکھا جاتا ہے؟ شام ہونے کو ہو گی تو بھائی جان آ جائیں گے، بس پھر اُن سے باتیں ہوں گی اور کسی سے نہیں میں تو گویا ہوتی ہی نہیں، میرا دل گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، کہ اب اُٹھے اور اب اُٹھے، ادھر مغرب کی اذان ہوئی اور ادھر وہ گئے، جاتی دفعہ میری طرف بھی دیکھ لیں گے، مگر ایک نظر سے کیا ہوتا ہے!

اس وقت بتاؤ میرے لئے کیا رہ جاتا ہے! دنیا یک لخت اتنی خالی ہو جاتی ہے کہ میں سن سن ہوتا اپنے کانوں سے سُن لیتی ہوں، یوں شام پڑ جاتی ہے . . . .

فیاض محمود

اے دوست!

ہائے کیا شب تھی فضائے دہر پر پھیلی ہوئی
آنسوؤں سے ابر ماتم دار کے بھیگی ہوئی

رات جو پہلی محبت کی طرح خونخوار تھی
فطرتِ بیدرد کی ڈھالی ہوئی تلوار تھی

پرسکوں گہرائیوں میں دل کی طوفاں خیز رات
وہ بھری برسات کی جذبات سے لبریز رات

گہرے گہرے رنگ کے بادل ہواؤں میں بھرے
پھر رہے تھے ہر طرف اک درد پھیلاتے ہوئے

ننھی ننھی بوندیاں گرتی تھیں فرشِ خاک پر
یا تمنائیں برستی تھیں دلِ صد چاک پر

تر بتر جھونکے ہواؤں کے امنگوں سے بھرے
ایک پیغامِ عمل تھے سرد آہوں کے لئے

منظرِ تاریک میں وہ دفعتہً اک روشنی
چونک اٹھتی تھیں امیدیں دل کی سوئی ہوئی

سرنگوں تھا خوابِ راحت لذتِ غم دیکھ کر
دل بدل جاتے تھے سینوں میں یہ عالم دیکھ کر

کروٹوں پر کروٹیں تھیں نیند ہی آتی نہ تھی
خواب کی ننھی پری تکلیف فرماتی نہ تھی

دل نے اک کروٹ ادھر بدلی زمانے کی طرح
یاد آیا تو ادھر بھولے فسانے کی طرح

دل کی سب سنسان گلیاں جاگ اٹھیں اس یاد سے
شورشوں کا سلسلہ پیدا ہوا فریاد سے

تھے جو فرشِ ضبط پر خوابیدہ نالے چونک اٹھے
جو ربابِ دل میں تھے بیہوش نغمے چونک اٹھے

صبر کی مضبوط بنیادیں یکایک ہل گئیں
سرد آہوں کو گذر جانے کی راہیں مل گئیں

لاکھ روکا درد لیکن دل کو تڑپا ہی گیا
لب پہ تیرا نام آنسو آنکھ میں آ ہی گیا

زیبا ردولوی

"زِ نگ ِ زُہد اُفتادم بہ کافر ماجرائی ہا"

(غالب)

(سانیٹ)

(عزیز دوست راشد وحیدی کے نام)

وفا و عشق کے گیتوں کو بھول جا، اے دوست!
کہ تھک گیا ہوں محبّت کی نغمہ خوانی سے،
نشاطِ وصل سے، فرقت کی خوں فشانی سے!
کوئی "فسانۂ آوارگی" سُنا، اے دوست!
مری حیات کی افسردگی مِٹا، اے دوست!
سنا وہ گیت جو بھرپور ہو جوانی سے،
کسی جوانِ ہوس کار کی کہانی سے!
مرے شباب کو تقدیس سے بچا، اے دوست!
یہ زہدِ خشک تو ہے موت زندگی کے لئے!
کہ اس سے زیست کو افسردہ دیکھتا ہوں میں!
گلِ شباب کو پژمردہ دیکھتا ہوں میں!
یہ اک خزاں ہے امنگوں کی تازگی کے لئے!
ندیم آ کہ تقدس سے دور ہو جائیں!
گُنہ اور اُس کی محبّت میں چور ہو جائیں!

عطاءاللہ سجاد

شرط

چیخوف کا ایک افسانہ

چیخوف (۱۸۶۰ ـــ ۱۹۰۴) دنیا کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے' اگرچہ اس نے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی مگر عمر بھر طب کا پیشہ اختیار نہ کیا بلکہ اپنی زندگی ادبیات کے لئے وقف کردی، لیکن اس کی علمی تحصیل نے اس باب میں بھی اسے بہت مدد دی' انسانی زندگی کا اس نے نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا' اور اس سلسلے میں اس کی ذہنیت بے انتہا متنوع اور وسیع تھی' وہ اپنے موضوع کا استعمال نہایت ہوشیاری سے کرتا تھا؛ اور الفاظ کے خرچ میں انتہائی کفایت ملحوظ رکھتا تھا' شرط میں اس نے یہ دکھایا ہے کہ ایک سادہ سا مذاق کس قدر تلخی' قنوطیت' دنیا سے بیزاری' بے تعلقی' دنائت' بدباطنی اور غداری پر منتج ہوسکتا ہے ؛

خزاں کی ایک تاریک رات تھی' بڈھا مہاجن اپنے مطالعے کے کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا' پندرہ سال گزرے یہی پت جھڑ کے دن تھے' اور ایسی ہی اندھیری رات جب اُس نے اپنے چند احباب کو ایک پُر تکلّف دعوت دے رکھی تھی' بہت سے ذہین اور طبّاع دوست جمع تھے اور کئی دلچسپ مسائل گفتگو کا موضوع بنے رہے' بات میں سے بات نکلتی آئی' اور آخر گفتگو کا رُخ سزائے موت کے مسئلے کی طرف پھرا' اکثر مہمانوں نے جن میں سے بیشتر متبحر عالم اور ادیب تھے' سزائے موت کی مذمت کی' اور بہ طورِ تعزیر اس کا استعمال خلافِ انسانیت اور قابلِ ترک ٹھہرایا بعض کا خیال تھا کہ موت کی سزا کے بجائے اقصائے عالم میں حبسِ دوام کی سزا رائج ہوجانی چاہیئے۔

میزبان نے اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ذاتی طور پر مجھے نہ سزائے موت کا اور نہ حبسِ دوام کا تجربہ حاصل ہے، لیکن انسانی عقل میں اگر قیاس کا کوئی دخل تسلیم کیا جائے تو پھر میری رائے یہ ہے کہ حبسِ دوام کے مقابلے میں موت کی سزا زیادہ نرم اور زیادہ قرینِ انسانیت ہے' پھانسی پر لٹکتے ہی جان نکل جاتی ہے لیکن قید میں انسان گھل گھل کر مرتا ہے، وہ جلاّد جو چند ثانیوں میں موت کے گھاٹ اتار دے یقیناً اُس جلاد سے زیادہ مہربان ہوتا ہے جو کئی سال تک لگاتار کرید کرید کر جان نکالتا رہے۔

ایک مہمان نے کہا "اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ دونوں یکساں مجرم سمجھے جانے چاہئیں' کیونکہ ان کا مقصد ایک ہی ہے۔ دونوں انسان کو اُس کی زندگی سے محروم کردیتے ہیں' حکومت آخر خدا تو نہیں ہے' اسے یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ کسی شخص کو

کسی ایسی چیز سے محروم کر دے جسے اگر وہ پھر چاہے بھی تو واپس نہ کر سکے۔"

مہمانوں میں پچیس سال کا ایک نوجوان وکیل بھی تھا، اس کی رائے دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ "سزائے موت اور حبسِ دوام دونوں خلافِ انسانیت اور خلافِ اخلاق ہیں لیکن اگر مجھے ان دونوں میں سے انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے تو میں یقیناً حبسِ دوام کو ترجیح دونگا۔ زندگی سے بالکل ہاتھ دھو لینے کے مقابلے میں زندہ رہنے کی ہر صورت بلاشبہ غنیمت سمجھنی چاہیئے۔"

اس پر ایک پُر لطف بحث چھڑ گئی۔ میزبان جو اُن دنوں مقابلتہً جوان اور تیز مزاج تھا، بھڑک گیا، اُس نے میز پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور نوجوان وکیل سے مخاطب ہو کر کہا "تم غلط کہتے ہو۔ میں شرط باندھتا ہوں کہ اگر تم پانچ سال کے لئے بھی ایک کوٹھڑی میں بند رہنا گوارا کر سکو تو میں تمہیں بیس لاکھ روپیہ ہار دوں گا۔

وکیل نے کہا:۔ "اگر تم یہ صدقِ دل سے کہہ رہے ہو تو میں شرط باندھتا ہوں کہ میں پانچ نہیں پندرہ سال کے لئے بند رہوں گا۔"

میزبان نے چلا کر کہا "پندرہ سال! چلو، یہ اور بھی اچھا ہے، صاحبو! میں بیس لاکھ روپے کی بازی لگاتا ہوں"

وکیل نے کہا "مجھے منظور ہے اور سنو تم بیس لاکھ روپے کی بازی لگاتے، تو میں اپنی آزادی کی بازی لگاتا ہوں۔"

اس طرح یہ لغو اور بیہودہ شرط بندھ گئی، مہاجن کے ہاں اُن دنوں روپے کی خوب ریل پیل ہو رہی تھی، کروڑوں روپے کا کاروبار تھا اور کروڑوں روپے کی ہمیانیاں اُس کے خزانوں میں محفوظ تھیں، دولت کے نشے نے اسے خود پرست اور انجام سے غافل بنا رکھا تھا، اس کا دل پُر جوش جذبات کا ایک موجیں مارتا ہوا دریا بن رہا تھا اور وہ تقریباً آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے وکیل کی طرف تمسخر سے دیکھ کر کہا "میاں صاحبزادے! وقت گزرنے سے پہلے ہوش کی دوا کر لو، بیس لاکھ روپے میرے لئے بے حقیقت ہیں لیکن تم اپنی زندگی کے بہترین تین یا چار سال ضائع کر دو گے، تین یا چار سال میں نے اس لئے کہے کہ اس سے زیادہ بند رہنے کی تمہیں تاب نہ ہوگی، آہ بدقسمت دوست دل کے کان کھول کر سُن لو کہ اختیاری قید جبری قید سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے، یہی خیال کہ اپنی آزادی تمہارے اختیار میں ہے، قید کی کوٹھڑی میں تمہاری رگ رگ کے اندر زہر بن کر پھیل جائیگا، اور تمہاری تمام زندگی کو مسموم کر دے گا، مجھے تمہاری حالت پر رحم آتا ہے۔"

آج بڈھا مہاجن اپنے مطالعے کے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے ناحق یہ شرط باندھی، فائدہ کیا ہے؟ وکیل نے اپنی زندگی کے پندرہ سال گنوا دیئے اور میں اپنے بیس لاکھ روپے اندھے کنوئیں میں جھونک رہا ہوں، اس بنا پر لوگ کیسے سزائے موت کو سزائے قید سے بہتر یا بدتر ہونے کا فیصلہ کرنے سے تو رہے، لاحول ولا قوۃ! بیہودگی کی انتہا ہو گئی، جب پیٹ بھرا ہو تو جو سوجھتی ہے الٹی سوجھتی ہے، خیر میں نے تو حماقت کی ہی تھی، یہ وکیل جو لنگوٹی میں پھاگ کھیل رہا تھا، اس کی مت بھی ٹھکانے نہ رہی۔

توبہ! روپے کی حرص بھی بُری بلا ہے۔

پھر وہ دعوت کے بعد کے واقعات یاد کرنے لگا، فیصلہ یہ ہُوا تھا کہ وکیل مہاجن کے خانہ باغ کے ایک حجرے میں شدید نگرانی کے ماتحت اپنی قید کی مدت کاٹے، یہ بھی طے ہوا تھا کہ زمانۂ اسیری میں وہ نہ صرف کسی انسان کی صورت دیکھنے یا کسی انسان کی آواز سننے کے حق سے محروم رہے گا، بلکہ دہلیز سے باہر قدم رکھنے یا اخبارات اور خطوط وصول کرنے کا بھی مجاز نہ ہوگا۔ اُسے موسیقی کا ایک ساز رکھنے کے علاوہ کتابیں پڑھنے اور خط لکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور تمبا کو اور شراب کے استعمال کا بھی اختیار حاصل تھا، سمجھوتے کے مطابق وہ بیرونی دنیا سے خاموش نامہ و پیام کرسکتا تھا اور اس مقصد کے لئے خاص طور پر دیوار میں ایک چھوٹا سا غرفہ بنا دیا گیا تھا، کاغذ کے پرزے پر مطلوبہ اشیا کا نام لکھ کر کھڑکی کی راہ سے باہر پہنچانے کی دیر ہوتی کہ شراب کتابیں گانے، غرض جس چیز کی بھی اسے ضرورت پڑتی کھلے دل سے مہیا کر دی جاتی، معاہدے میں جزوی سے جزوی تفصیلات کے لئے شرائط درج تھیں، جن کے رو سے وکیل شدید ترین قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا، اور وہ پورے پندرہ سال یعنی ۱۴ نومبر ۱۸۷۰ء کے ۱۲ بجے سے لے کر ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کے بارہ بجے تک محبوس رہنے کا پابند تھا، شرائط نامے کی خفیف سے خفیف خلاف ورزی، یہاں تک کہ مقررہ وقت سے صرف دو منٹ پہلے باہر نکل آنے پر بھی مہاجن بیس لاکھ روپے کی رقم ادا کرنے کا پابند نہ رہتا تھا۔

جہاں تک وکیل کے مختصر رقعوں سے اندازہ ہو سکتا تھا، اس نے قید کے پہلے سال میں اپنی تنہائی اور بیکاری کے عذاب کو نہایت شدت سے محسوس کیا، اس کے کمرے سے دن رات پیانو کی آواز آتی رہتی تھی، شراب اور تمباکو کے استعمال سے اس نے انکار کر دیا تھا، اس نے لکھا کہ شراب خواہشات کو برانگیختہ کرتی ہے، جو ایک قیدی کی سب سے بڑی دشمن ہیں اور تمباکو سے کمرے کی ہوا بگڑ جاتی ہے، پہلے سال کے دوران میں وکیل کو ہلکی قسم کی کتابیں دی گئیں، مثلاً محبت کے افسانے، فریب کاری کے قصے اور لطیف نظمیں وغیرہ۔

دوسرے سال پیانو کی آواز مطلق بند رہی، اور وکیل صرف متین اور مستند تصنیفات منگواتا رہا، پانچویں سال پیانو کی گتیں پھر سنی گئیں، اور قیدی نے شراب بھی طلب کی، اپنے نگرانوں کے بیان کے مطابق اس سال بھر کے دوران میں وہ محض کھاتا پیتا یا اپنے بستر پر لیٹ کر وقت کاٹتا رہا، وہ اکثر جماہیاں لیتا اور کبھی کبھی آپ ہی آپ غضب آلود باتیں کرنے لگتا، اب اُسے مطالعے سے کوئی سروکار نہ تھا، کبھی رات کے وقت بیٹھ کر وہ کچھ لکھنے لگ جاتا اور گھنٹوں ہی بیٹھ کر لکھتا رہتا، لیکن صبح اُٹھ کر سب کچھ پھاڑ ڈالتا دو تین دفعہ اس کے رونے کی آواز بھی سنی گئی۔

چھٹے سال کے وسط میں قیدی نے نہایت انہماک کے ساتھ تاریخ، فلسفے اور زبانوں کا مطالعہ شروع کر دیا، وہ ان مضامین کے مطالعے میں اس حریصانہ والہیت سے مشغول ہوا کہ مہاجن کے لئے نت نئی کتابوں کی تلاش کا کام خاصہ اہم مسئلہ بن گیا، چار سال

کی مدت میں تقریباً چھ سو جلدیں اس کی درخواست پر خریدی گئیں، اسی زمانے میں اس نے مہاجن کے نام یہ خط لکھا: عزیز دوست۔ میں یہ چند سطور چھ زبانوں میں لکھ رہا ہوں، یہ ان زبانوں کے ماہرین کو دکھاؤ اور اگر پڑھنے کے بعد انہیں ان میں ایک غلطی بھی نظر نہ آئے تو براہِ کرم باغ میں بندوق کا ایک فائر کرادو اس کی آواز سن کر مجھے معلوم ہو جائیگا کہ میری کوششیں ناکام نہیں رہیں، ہر عہد اور ہر ملک کے غیر معمولی انسان اگرچہ مختلف زبانیں بولتے رہے مگر ان سب کی باتوں کی روح مشترک ہے، کاش تمہیں میری اُس بے لوث مسرت کا اندازہ ہو سکے جو مجھے اپنے اس علم سے حاصل ہوئی ہے"۔

قیدی کی خواہش پوری کی گئی، مہاجن کے حکم سے باغ میں دو فائر کئے گئے۔

اس کے بعد جب قید کے دس سال گذر گئے تو وکیل کے نگرانوں نے دیکھا کہ وہ اپنی میز کے سامنے بے حس و حرکت بیٹھ کر ہر وقت انجیل کا مطالعہ کرتا رہتا ہے، مہاجن کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی کہ وہ شخص جس نے چار سال میں چھ سو علمی کتابوں پر عبور حاصل کر لیا تھا، اس نے اب پورا سال بھر صرف ایک ایسی کتاب پڑھنے میں گزار دیا ہے جو نہ ضخیم ہے اور نہ مشکل، انجیل کے بعد تاریخِ مذاہب اور الٰہیات کا مطالعہ شروع ہوا، قید کے آخری دو برسوں میں اس کے شوقِ مطالعہ نے غیر معمولی بوقلمونی حاصل کی کبھی وہ علومِ طبیعیہ کے مطالعے میں وقت گزارتا اور کبھی بائرن اور شیکسپیر کی تصانیف پڑھتا اور کبھی وہ ایک ہی رقعے میں طب، کیمیا، فلسفے، الٰہیات اور افسانوں کی کتابیں طلب کرتا۔ اس کے مطالعہ کی یہ کیفیت تھی گویا وہ سمندر میں کسی طوفان زدہ جہاز کے شکستہ تختوں کے درمیان تیر رہا ہے اور اپنی زندگی بچانے کی کوشش میں کبھی لکڑی کے اس ٹکڑے پر ہاتھ ڈالتا ہے اور کبھی اُس پر۔

مہاجن نے یہ سب واقعات دل میں دہرائے اور سوچا کہ "کل بارہ بجے وہ آزادی حاصل کرے گا حسبِ قرار داد مجھ کو اسے بیس لاکھ روپے کی رقم ادا کرنی ہوگی جو اگر میں ادا کردوں تو میرا کام تمام ہوا جاتا ہے، میں کوڑی کوڑی کو تنگ آجاؤں گا"۔

پندرہ سال قبل وہ کروڑوں روپے کا مالک تھا لیکن آج اس کا رواں رواں قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، خدا جانے اب اس کے پاس روپیہ زیادہ تھا یا قرض؟ تجارت قمار بازی کی سگی بہن ہے، اُس کی تقدیر کسی ایسے پیچ میں آئی کہ پھر وہ کسی طرح سنبھل سکا اور آج وہ ایک معمولی مہاجن تھا جس کا دل منڈی کے بھاؤ کے ذرا ذرا سے اتار چڑھاؤ پر دھڑکنے لگتا تھا۔

بحالتِ یاس اُس نے اپنا سر پیٹ کر کہا: "آہ اس منحوس شرط نے مجھے کہیں کا نہ رکھا یہ کمبخت آدمی مر کیوں نہ گیا، ابھی اس کی عمر بھی صرف چالیس سال کی ہے یہ میری بچی کھچی پونجی پر ہاتھ صاف کرے گا اور شادی کر کے گلچھرے اڑائے گا، ادھر مجھے ایک حاسد گداگر کی طرح ٹکے ٹکے کے لئے اس کا منہ دیکھنا پڑے گا، مجھے بار بار یہی لفظ سننے پڑیں گے:

"میں اپنی زندگی کی مسرتوں کے لئے عمر بھر تمہارا ممنون رہونگا، اور میں ہر طرح تمہاری مدد کے لئے تیار ہوں"۔

"نہیں نہیں! مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکے گا، اس ذلت سے نجات کی یہی ایک صورت ہے کہ یہ شخص مرجائے"، گھڑی نے

ابھی ابھی تین بجائے تھے، گھر میں سب لوگ سو رہے تھے، باہر درختوں پر پالا گر رہا تھا اور اُن کی خشک ٹہنیاں برف بار ہوا سے جھونکے کھا کر دھیمے دھیمے نالے کر رہی تھیں، اس نے آہستہ سے اپنی آہنیں الماری کھول کر اُس دروازے کی کنجی نکالی جو پندرہ سال سے مقفل تھا، اس کے بعد اپنا اوورکوٹ پہن کر باہر نکل گیا، باغ میں کڑاکے کی سردی تھی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ یخ بستہ ہوا کے شدید جھونکوں میں باغ کے درخت وحشیانہ چیخیں بلند کر رہے تھے۔ تاریکی اس غضب کی تھی کہ پاؤں تلے کی زمین بھی نظر نہ آتی تھی، مہاجن بہ دشواری باغ کے اُس حصّے میں پہنچا جہاں وکیل کا حجرہ واقع تھا، یہاں اس نے پہریدار کو دو آوازیں دیں لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا، غالباً پہرے والا اس طوفانی موسم کی تاب نہ لا کر کسی کوٹھڑی میں سو گیا تھا۔

بڈھے مہاجن نے دل میں کہا۔ "اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو لوگوں کو سب سے پہلے پہرے دار پر شک ہوگا۔" پھر وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اُس تنگ و تاریک ڈیوڑھی میں پہنچا جس کے پیچھے وکیل کا حجرہ تھا، یہاں اس نے دیا سلائی جلائی تو ایک طرف ایک خالی پلنگ اور ایک گوشے میں ایک لوہے کی انگیٹھی دکھائی دی، اس وقت وہاں ایک بھی فرد بشر نہ تھا۔ وکیل کے حجرے کے دروازے کی مہر بالکل سلامت تھی، جب دیا سلائی بجھ گئی تو بڈھے نے جس کا جسم شدتِ جذبات سے کانپ رہا تھا، دریچے میں سے اندر جھانکا، کمرے میں شمع کی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی، قیدی میز کی طرف رخ کئے بیٹھا تھا، صرف اس کی پیٹھ، اس کے سر کے بال اور اس کے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ میز پر، دونوں کرسیوں پر، اور میز کے قریب غالیچے پر، ہر طرف کھلی ہوئی کتابیں بکھری پڑی تھیں، پانچ منٹ گزر گئے لیکن قیدی نے خفیف سی حرکت بھی نہ کی، شاید پندرہ سال کی عزلت میں اسے اس طرح ساکت و صامت بیٹھنے کی عادت ہوگئی تھی، مہاجن نے انگلیوں سے کھڑکی پر ہلکی سی تھپکی لگائی لیکن قیدی نے جواب میں کوئی حرکت نہ کی، پھر اس نے بہ احتیاط قفل کی مہر توڑی اور اس میں کنجی گھمائی۔ زنگ خوردہ قفل میں سے دھیمی سی دردناک آواز نکلی اور دروازہ کھلنے پر ایک ہلکی سی چیخ پیدا ہوئی، مہاجن کو امید تھی کہ دروازہ کھلتے ہی قیدی چونک کر اُٹھے گا، اور حیران ہوکر آگے بڑھے گا، لیکن تین منٹ گذر گئے اور پھر بھی کمرے میں پہلے ہی کی سی خاموشی طاری رہی، اب اس نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے دیکھا کہ میز کے سامنے عام انسانوں سے مختلف ایک شخص بیٹھا ہے، یہ محض ہڈیوں کا ایک پنجر تھا جس پر کھنچا ہوا خشک سا چمڑا نظر آتا تھا، سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے اور گھونگر والے تھے اور ڈاڑھی بہت گھنی اور الجھی ہوئی تھی، اس کے چہرے کا رنگ خاکستری مائل زرد تھا اور گال اندر کو پچکے ہوئے تھے، وہ سر سے پاؤں تک بالکل فاق ہو رہا تھا، اس کی سکڑی ہوئی پیٹھ کبوتری سی معلوم ہوتی تھی اور وہ ہاتھ جس سے اس نے اپنے گھنے بالوں والے سر کو سہارا دے رکھا تھا، اس قدر دبلا اور سوکھا ہوا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا بھی دردناک تھا، اس کے بال سفید ہو رہے تھے اور چہرے کی پیرانہ لاغری کو دیکھ کر کوئی شخص اعتبار نہ کر سکتا تھا کہ اس کی عمر صرف چالیس سال کی ہے۔

مہاجن نے دل میں کہا "یہ بیچارا سو رہا ہے اور شاید لاکھوں روپے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بس اب مجھے یہ نیم مردہ چیز اٹھا کر بستر پر ڈالنی ہے اور اس کے بعد اسے کچھ دیر تک تکیے کے نیچے دبائے رکھنا ہے' اس کے بعد دقیق سے دقیق طبی معائنے پر بھی کسی کو اس کی غیر طبعی موت کا گمان تک نہ گزرے گا، لیکن پہلے دیکھیں تو اس نے لکھا کیا ہے"۔ مہاجن کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگا:

"کل شب بارہ بجے میں آزاد ہو جاؤں گا اور مجھے لوگوں سے میل جول کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن اس سے قبل کہ میں اس کمرے کو چھوڑوں اور سورج کی روشنی سے دوچار ہوں میں تم سے چند باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں' میں اپنے ضمیر کو اور خدا کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ آزادی' زندگی' صحت اور تمام ان چیزوں کو جنہیں تمہاری کتابیں دنیا کی نعمت سمجھتی ہیں نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں' پندرہ سال تک میں نے نہایت غور سے اس دنیا کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے' یہ سچ ہے کہ اس اثنا میں میں نے نہ دنیا کو دیکھا اور نہ دنیا کے لوگوں کی زندگی کو، لیکن میں نے تمہاری کتابوں ہی میں مئے احمر کے بلوریں جام لنڈھائے ہیں، رقص و سرود کی داد دی ہے، جنگلوں میں ہرنوں اور وحشی درندوں کا شکار کیا ہے اور عورتوں سے محبت کی ہے ــــ عورتیں خوبصورت' فسوں ساز' پراسرار، جنہیں تمہارے شعرا کے تخیل کے سحر نے پیدا کیا ہے راتوں کو میرے پاس آتیں اور میرے کانوں میں عجیب و غریب باتیں کہتیں جن سے میرے دل و دماغ پر ایک کیف سا چھا جاتا۔ میں البرز اور ہمالہ کی چوٹیوں پر چڑھا' جہاں سے میں نے صبح کے وقت سورج کو طلوع ہوتے اور شام کے وقت اسے آسمان' سمندر اور کوہسار کو سنہرے قرمزی رنگ میں نہلاتے پایا' وہیں میں نے اپنے سر پر بادلوں کے دامن میں جھلملاتی ہوئی بجلیاں دیکھیں' مجھے دور و نزدیک ہرے بھرے جنگل' مرغزار' دریا' جھیلیں' شہر اور بستیاں دکھائی دیں' میں نے پریوں کے گیت سنے اور خوبصورت بھتنوں کے پروں کو ہاتھ لگایا۔ . . . تمہاری کتابوں ہی میں میں نے اپنے آپ کو اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیا' میں نے معجزے دکھائے' شہر جلا کر خاک سیاہ کئے نئے نئے مذاہب کی تلقین کی اور ملکوں کے ملک فتح کر ڈالے . . . .

"تمہاری کتابوں نے مجھے دانش عطا کی ہے' انسان کے ان تھک سوچ بچار نے صدیوں میں جو کچھ پیدا کیا وہ سب کچھ دب سکڑ کر میرے دماغ میں سما گیا ہے' مجھے خوب معلوم ہے کہ میں تم سب سے زیادہ ہوشیار ہوں اور سنو مجھے تمہاری کتابوں سے بھی نفرت ہے' تمام دنیاوی کامیابیوں سے نفرت ہے اور دانش وری سے نفرت ہے' یہاں کی ہر چیز بے اصل' ناپائدار اور سراب آسا کیسر فریب ہے۔ تم لاکھ مغرور' عقلمند اور خوبصورت ہو موت تمہیں دنیا کے تختے سے اسی طرح نیست و نابود کر دے گی جس طرح بلوں کے اندر رہنے والے چوہوں کو' اور تمہاری آئندہ نسلیں' تمہاری تاریخ اور تمہارے قابل ترین افراد اس کرۂ خاکی کے ساتھ ہی اس کے میل کی طرح جل بجھیں گے۔

"تم لوگ دیوانے ہو تم نے غلط راہ اختیار کر رکھی ہے' تم باطل کو حق اور بدنمائی کو حسن سمجھتے ہو۔ اگر نارنگی اور سیب کے درختوں کو مینڈک اور چھپکلیاں لگنے لگیں اور گلاب کے پھولوں سے ہانپتے ہوئے گھوڑوں کے پسینے کی بو آنے لگے تو تمہیں اچنبھا ہوگا' اسی طرح مجھے تمہاری حالت پر تعجب ہوتا ہے کہ تم ابدی کو چھوڑ کر دنیا کے ہو رہے ہو' میں تو تمہارے حالات کو سمجھنا تک نہیں چاہتا' جن چیزوں پر تم جان

دیتے ہوئے اُن سے اپنی سچی نفرت کا عملی ثبوت دینے کے لئے میں اُس دو لاکھ روپے کی رقم پر لات مارتا ہوں، جسے میں کبھی جنت کی مسرت کا خزانہ سمجھتا تھا۔ یہ رقم حاصل کرنے کے حق سے اپنے آپ کو محروم کرنے کے لئے میں معیّن وقت سے پانچ منٹ پہلے باہر نکل کر اس معاہدے کو فسخ کر دونگا "۔

پڑھنے کے بعد مہاجن نے کاغذ پھر میز پر رکھ دیا اور اس عجیب و غریب آدمی کے سر کو بوسہ دے کر رونے لگا۔ پھر وہ حجرے سے باہر نکل گیا، اس کو کبھی شدید سے شدید تباہی کے غار میں گرتے وقت بھی اپنی ہستی اتنی حقیر اور فرومایہ نظر نہ آئی تھی جتنی آج نظر آئی وہ واپس آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا، لیکن ہیجانِ جذبات اور گریۂ افسوس نے اُسے دیر تک سونے نہ دیا۔

علی الصباح بے چارہ پہرہ دار بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس آیا، اور بولا "حضور وہ آدمی جو حجرے میں بند تھا کھڑکی توڑ کر باہر نکل گیا ہے، اس نے نکلتے ہی بیرونی دروازے کا رخ کیا اور نظروں سے غائب ہو گیا "۔

مہاجن نے فوراً اپنے ملازموں کے ساتھ وہاں پہنچ کر قیدی کے فرار کے واقعے کی تصدیق کی، وہاں پہنچتے ہی اس نے میز پر سے وکیل کی دست برداری کا قبالہ اٹھایا اور واپس آکر بہ احتیاط اُسے اپنی تجوری میں مقفل کر دیا تاکہ شہر کے بکھیڑوں کو ہلے اُٹھانے کا موقع نہ ملے ۔

حامد علی خاں

باغ بھی کتنی پیاری جگہ ہے، خدا جانتا ہے ۔

یہاں گلاب کی کیاری ۔

وہاں ندی کنارے اک جھاڑی ۔

کہیں پتیوں کا جھرمٹ ۔

گویا امن و امان کا اک مکتب ۔

اور اس پر بھی احمق جھگڑتا ہے ۔

کہ خدا موجود نہیں ۔

خدا نہیں ؟ باغوں میں ؟ جب شام سایہ ڈالے ؟

ہاں میرے پاس اک نشانی ہے :

یہ امر یقینی ہے کہ خدا میرے باغ میں ٹہلتا ہے !

گلچیں

غزل

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

ہماری دوربینی تھی ہمارے امن کی دشمن،
نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے

پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں
کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے

حرم میں بھی جب اپنے ساتھ تھی قسمت کی محرومی
تو ہم کس منہ سے آخر شکوۂ جورِ بتاں کرتے

کسی کے نازِ خود بیں نے نہ اس کی بھی اجازت دی
کہ اپنے سر کو ہم وقفِ سجودِ آستاں کرتے

نہ تھی منظور ہمکو شمع کی تقلیدِ رسوائی
کہ محفل میں بیانِ لذتِ سوزِ نہاں کرتے

ابھی ہیں قوتیں نا آزمودہ حُسن و اُلفت کی
جو تم کھنچتے تو ہم بھی جذبِ دل کا امتحاں کرتے

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

دلِ افسردہ کو اپنے جو احساسِ طرب ہوتا
تو ہم بھی دو گھڑی سیرِ بہارِ بوستاں کرتے

ہم اپنے دیدۂ مشتاق ہی سے کام لیتے ہیں
حجاب آتا ہے اُن سے آرزوؤں کا بیاں کرتے

ہمیں بیفائدہ تجدیدِ غم کی کیا ضرورت تھی
پس از بربادیٔ گلشن جو یادِ آشیاں کرتے

حرم کیا دیر کیا یکساں کشش تھی سارے عالم میں
خدائی جمع ہوتی خود نمائی تم جہاں کرتے

کیا موقوف ہم نے قصۂ دردِ نہاں وحشت
کہاں تک خامۂ حسرت رقم کو خونچکاں کرتے

رضا علی وحشت

نغمۂ حیات

(۱)

آہ! مجھے اپنا وہ عالمِ بے خبری اور وہ زمانۂ ناشناسائی یاد آتا ہے جب تو اور میں سرسبز باغیچوں کے درمیان پھولوں کی تلاش میں آوارہ پھرا کرتے تھے اور وہ رنگین ساعتیں دلکش اور مہکتے ہوئے پھولوں کے ہار پرونے اور گلدستہ بنانے میں صرف ہوا کرتی تھیں میں تیرے لئے نو شگفتہ پھولوں میں سے حسین ترین پھول انتخاب کرکے لاتا اور میرے بےچین دل کو اس وقت تک سکون نصیب نہ ہوتا جب تک کہ اس ہدیۂ رنگ و بو کو تیرے معصوم حسن کی نذر کر دیتا۔

آہ! بچپن کی وہ مسرور ساعتیں جنگلی گلاب کا وہ دلکش موسم جو فضا کو معطر کئے دیتا تھا اور بچپن کی بےفکری کا وہ زمانہ — کیا جلد گزر گیا!

(۲)

پھر ہوش آنے پر ہمارے دل نشۂ محبت سے سرشار ہو گئے، ہمارا وقت رازو نیاز اور موسیقی کے عالمِ محویت میں بسر ہونے لگا، یہاں تک کہ شب بھر کے لئے جدا ہوتے وقت اپنے تھرتھراتے لبوں کو ایک دوسرے سے پیوست کر دینے سے پہلے ہمارا قلبی ہیجان ہرگز سکون نہ پاتا تھا اور ملاقات کے وقت دل کی عزیز ترین دولت یعنی وہ گلے اور شکوے جو تمام تیری ذات سے متعلق ہوتے تیری محبوب ہستی پر نثار کر دینا میرے لئے تسکین و راحت کی کلید تھا، بیشک وہ عیش و نشاط کی دلفریب دنیا تیری ہی شرمندۂ احسان تھی، آہ! اب بھی جب کبھی مالبستان کی تمام ساکنانِ فلک سے جگمگا اٹھتی ہے تو میرے بدن میں بجلیاں تڑپنے لگتی ہیں، میری آنکھیں گرم گرم آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں اور میری طبیعت کو، آہ! میری بےقرار طبیعت کو اس شام کی یاد گدگداتی ہے جب تو اور میں جوان تھے۔

(۳)

عقد ہو جانے پر ہم اکٹھے رہنے لگے، ہمارا دامنِ امید زندگی کی خوشیوں سے بھر گیا، تیری محبت بہت زیادہ گہری ہو گئی اور ہم دنیا کی بے ثبات لذتوں میں کھو گئے، مگر آہ! ہمیں فلکِ ناسپاس نہ دیکھ سکا اور موت کے بے رحم ہاتھوں نے تجھے مجھ سے جلد ہی چھین لیا، اور اب بھی اگرچہ تیرا شیریں نغموں اور سوزِ محبت سے معمور سینہ خوشنما پھولوں کی نرم نرم جڑوں اور پھدکتے ہوئے پرندوں کے نازک پنجوں تلے دب کر سرد ہو چکا ہے لیکن میں تیری خاموش اور اداس آرامگاہ کے پہلو میں بیٹھ کر تیری وفا شعاری اور روح فرسا جدائی اور اپنی بربادی کے میٹھے میٹھے غم کو جس کی یاس و افسردگی کی ظلمت میرے خانۂ دل کو تاریک بنائے ہوئے ہے کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

انہیں شیریں خوابوں کی بدولت میں تیرے حسرتناک مدفن کے وحشتناک ماحول کی اداسی اور اس خوفناک خاموشی میں تیری جدائی کے جانگداز صدمے کو برداشت کئے بیٹھا ہوں اور حقیقت میں جب ظلمت مجھے بچپن کی سادگی اور معصومیت اور جوانی کی امنگوں اور ولولوں کی یاد دلاتی اور بڑھاپے کی مایوسی اور موت کی بیرحمی کا مرقع دکھاتی ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بچہ بھی ہوں، جوان بھی اور بوڑھا بھی!!!-

بابر بٹالوی

مسلمان اور سنسکرت ادب

ذیل کا مضمون مسٹر ایم زیڈ صدیقی کے انگریزی مضمون "مسلمان اور سنسکرت ادب" کا ترجمہ ہے جو ماہ مارچ کے ماڈرن ریویو میں طبع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ حقیقت بڑی حد تک واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے گزشتہ صدیوں میں سنسکرت ادب کی کیا قیمتی خدمات انجام دیں اور کس طرح ہندوؤں کے علوم اور خیالات کو عربی اور فارسی زبانوں میں منتقل کر کے سب سے پہلے مغرب کو ان سے روشناس کرایا۔

"اکبر نے اپنے ذاتی رجحان اور سیاسی مصالح کی بنا پر سنسکرت کی ایسی اہم کتابوں کا جو مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوں، فارسی میں ترجمہ کرانے کا عزم کیا۔ اس مقصد کے لئے فتح پوری کے دیوان خانے میں محکمہ دار الترجمہ قائم کیا گیا اور مہابھارت جیسی مشہور کتاب سب سے پہلے ترجمہ کے لئے منتخب کی گئی۔ نقیب خان ترجمہ کرنے اور متعدد پنڈت اس کی توضیح و تشریح کے لئے مقرر کئے گئے۔ اس کام کو شروع کئے تین ہی دن گزرے تھے کہ مورخ بدایونی کو بحیثیت مترجم کے نقیب خان کے شریک کار ہونے کا حکم دیا گیا اور اس ضخیم کتاب کے اٹھویں حصے کا چار ماہ میں ترجمہ ہوا۔ پھر اس کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصے کے ترجمہ کے لئے نقیب خاں اور حاجی محمد سلطان اور دوسرے حصے کے لئے ملا شیری مقرر کئے گئے اور ملا فیضی کو نگرانکاری کی خدمت سپرد ہوئی۔ کتاب کا ½ حصہ ترجمہ ہونے کے بعد حاجی محمد سلطان کو نظر ثانی کا حکم دیا گیا۔ غرض کہ ہندوستان کی اس عظیم الشان رزمیہ تصنیف کا فارسی ترجمہ کچھ دنوں بعد مکمل ہو گیا اور رزم نامہ کے نام سے شائع کیا گیا۔"

"پھر شہنشاہ اعظم کی فراست اور عمدہ مشورہ کی بدولت دربار کے مشہور علما شاہ ابوالفضل، فیضی، نقیب خان، حاجی محمد سلطان، ملا ابراہیم، ملا عبدالقادر بدایونی کے زیر نگرانی قابل پنڈتوں کی مدد سے مہابھارت، رامائن، بھگوت گیتا، اتھروید، یوگ وشِشٹ مہیشمہانند ہر بوس اور دوسری کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ بعدازاں ان ہندوؤں نے جو فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں پر دسترس رکھتے تھے سابقہ ترجموں کی نظر ثانی کی اور کچھ نئے تراجم بھی کئے۔ ۱۶۲۶ء میں گھرواردا س نے رامائن کا ایک جدید ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سولھویں صدی کے آخر میں دیبی داس کائستھ نے اس کا آزاد ترجمہ کیا۔ داراشکوہ کے ایک ہندو دوست نے جوگا واشاستا کا ترجمہ کیا۔"

"ویدوں کا فارسی ترجمہ سترھویں صدی کے وسط تک عام طور پر دستیاب نہ ہوتا تھا۔ اتھروید کا فارسی ترجمہ جو اکبر کے

عہد میں کیا گیا تھا اس قدر خراب تھا کہ بہت جلد نظر انداز کر دیا گیا، شہزادہ دارا شکوہ نے جس نے بہت سی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا اس اہم کام کو بھی اپنے ذمہ لیا اور بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے ویدوں کا فارسی ترجمہ کیا گیا جو ۱۶۷۵ء میں مکمل ہوا۔ لیکن سنسکرت کی دوسری کتابوں کے ترجمہ کا کام انیسویں صدی تک جاری رہا، سنسکرت کے فارسی ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے خیالات بھی اسلامی علوم میں منتقل ہوتے رہے فیضی کی نل دمن مسیح بیگ کی رام اور سیتا کی کہانی عبدالرحمٰن چشتی کی مرأۃ المخلوقات اور مرزا فخر الدین کی تحفۃ الہند اس کا ثبوت ہیں، ان میں سے تحفۃ الہند عالمگیر کے عہد میں اس کے پوتے جہاندار شاہ کے لئے اس کے اتالیق کوکل تاش خان کی ایماء سے ترجمہ کی گئی۔ یہ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے جن میں ہندو تہذیب اور خیالات کو نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، پہلے تمہید ہے جس میں اصل کتاب کا ذکر ہے پھر بابِ اول ہندوؤں کا علم عروض، باب دوم۔ ہندوؤں کی شاعری، بابِ سوم ہندوؤں کے حروفِ ہجا، باب چہارم۔ ہندوؤں کا فلسفۂ محبت، باب پنجم ہندوؤں کا علمِ موسیقی، بابِ ششم لذتِ مباشرت کا نظریہ، بابِ ہفتم ہندوؤں کا علمِ قیافہ، سنسکرت کے ان عربی اور فارسی ترجموں نے جو مسلمانوں کے لئے ہندوستانی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھے مغرب کے مستشرقین میں بھی مطالعہ کا ذوق پیدا کیا اور ان ہی ترجموں نے یا ان کے لاطینی ترجموں نے ان مستشرقین کو سنسکرت ادب کی خوبیوں سے روشناس کرایا اور اس کی تعریف کا ذریعہ بنے، کلیلہ و دمنہ کا اولیں ترجمہ ابن مرقفا کے عربی ترجمہ سے عبرانی، یونانی، لاطینی، اسپینی، اطالوی، ترکی، جرمنی، انگریزی، ولندیزی اور فرانسیسی زبانوں میں کیا گیا اور اٹھارھویں صدی کے ختم سے قبل تک مغرب کے علماء نے سنسکرت کی اصلی کتاب کی طرف کوئی توجہ نہ کی"۔

"ہندوستانی فلسفہ کی سب سے پہلے ستائش کرانے والا مغربی فلسفی دراصل اس لاطینی ترجمہ کے مطالعہ کا مرہونِ منت ہے جو ان عربی، فارسی ترجموں سے کیا گیا تھا، شوپن ہار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دنیا کی تمام کتابوں میں کسی کا مطالعہ اپنشدوں سے زیادہ مفید اور بلند خیالات پیدا کرنے والا نہیں ہے"۔ لیکن اس فلسفی نے بھی نہ اصل سنسکرت کتاب دیکھی تھی اور نہ اس کا کوئی راست ترجمہ بلکہ اس کا ذریعۂ معلومات پیران (Perron) کا وہ لاطینی ترجمہ تھا، جو دارا شکوہ کے عہد کے فارسی ترجمہ سے کیا گیا تھا"۔

محمد نسیم

مئے دو آتشہ

حکیم عمر خیام نیشاپوری

[illegible] بیدار [illegible] ز تو
[illegible] شدہ جنت بہ وجود
وانگاہ فرو [illegible] کجا خواہم رفت
گوئی کہ پس از مرگ [illegible]
مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

حکیم عمر خیام نیشاپوری

مے خور کہ ز دل کثرت و قلت ببرد
واندیشۂ ہفتاد و دو ملت ببرد
پرہیز مکن ز کیمیائے کہ ازو
یک جرعہ مے ہزار علت ببرد

ترجمہ

اک راز کو فیلسوف کے سر کو نہ بتاؤ
اک مست کو غیب داں سمجھ کر نہ ستاؤ
کیا پوچھتے ہو مر کے کہاں جا بیٹھے
مجھ کو پلاؤ اور جہاں چاہے جاؤ

ترجمہ

مے پی کہ غم کثرت و قلت نہ رہے
اور خطرۂ ہفتاد و دو ملت نہ رہے
پرہیز نہ کر ساغر مے سے کہ اسے
اک قطرہ سے پی کر کوئی علت نہ رہے

حکیم آزاد انصاری

شہزادہ مہر چاند کی کرن پر فریفتہ ہوگیا، دن بھر چاند کی کرن کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا مگر وہ ہاتھ نہ آتی تھی ——
ہاں، چاند کی کرن ہمیشہ شہزادے سے شرما کر چھپ جاتی اور شہزادہ مہر نشیب و فراز میں سرگرداں پھرتا تھا لیکن کرن ہاتھ نہ آتی تھی —— آہ آفتاب کی پُرجمال محبوبہ ایک طویل خنک کرن !

چاند کی کرن کا چہرہ زرِ خالص کی طرح چمکدار اور پیلا تھا، شہزادہ مہر ایک سچا عاشق محبّت کی تپش سے شعلہ گوں رہتا تھا —— محبت کی آگ سے تابندہ اور لرزیدہ !

شہزادہ مہر کے سامنے سے چاند کی ننھی کرن خواب کی طرح سے گزر جاتی تھی بس شہزادہ ایک "خواب" سا دیکھتا رہ جاتا تھا، کرن بھاگ جاتی تھی اور دُور کھڑی ہو کر اپنے برق وش حبیب کو دیکھتی رہتی تھی پھر چھپ جاتی تھی !

حبیب و محبوب کے درمیان قدرت نے ایک حجاب پیدا کر دیا تھا، شہزادۂ مہر کے حُسن کی برقِ تپاں اور شعاعِ ماہتاب کا خنک جمال کبھی متصل نہ ہو سکے
ایک دن کا ذکر سنو، شہزادہ مہر اپنی محبوبہ کی جستجو میں پھر نکلا، سنہری رتھ میں بیٹھا ہوا، تھکا ہوا دن شفق کی آغوش میں گرا جا رہا تھا، کہ شہزادۂ مہر نے چاند کی کرن کو پکڑ لیا اس طرح آخر ایک دن حبیب و محبوب مل گئے !

شہزادہ مہر کی محبّت کی گرم آغوش نے چاند کی کرن کو پکڑ لیا —— دوشیزہ کرن گھبرا کر بھاگی اور پہاڑی کے پیچھے جا چھپی، حجاب سے اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی —— شبنم رات بھر پڑتی رہی !

شہزادہ مہر برابر جستجو میں رہا اور صبح کو اپنی محبوبہ سے جاملا اور محبت کے ہیکل پر سے جا کر ختم ہونیوالے دن کے سامنے شادی کر لی ! ——
ایک حیرت انگیز حسین شعلہ زر بچہ ان کے ہاں پیدا ہوا !
آسمانی محبت کی درخشاں اولاد —— ! زمرّد !
آفتاب کے نور کی جلوہ پاشیاں ماہتاب کی دمک کی جھلکیاں —— آہ نور و جمال کا ایک کوہِ رنگیں —— جان سے پیارا زمرّد !

ظفر قریشی بی اے دہلوی

محفلِ ادب

مصطفٰے ندیم

(اردو زبان کا ایک ترک شاعر)

مصطفٰے ندیم جس کا انتقال پچھلے سال بمقامِ انگورہ ہوا ہے، جدید ترکی کے مشہور شعرا میں تھا، حکومت ترکی نے حال میں اُس کا کلام لاطینی حروف میں شائع کیا ہے۔

ہمارے اہلِ وطن کو یہ سُن کر تعجب ہوگا۔ کہ ندیم ترکی کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی شعر کہتا تھا، فارسی میں تو اُس نے ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا ہے، اردو میں بھی غزلوں اور نظموں کا اچھا خاصا مجموعہ ہے، جو ۱۹۰۹ء میں بمقام کلکتہ شائع ہوا۔

ندیم کی زندگی کے اکثر حالات پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے، تاہم ہم پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہندوستان کیوں آیا؟ اور پورے دس سال یہاں کیوں مقیم رہا؟ اسی طرح اس کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق ہمارے معلومات بہت تشنہ ہیں، ہمیں ڈاکٹر سر عبداللہ المامون سہروردی کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا ہے اُس کا ملخص یہ ہے کہ ندیم کا باپ سلیمان بک ترکی کی فوج میں کپتان تھا، وہ پلونا کے مشہور معرکے میں شریک تھا، اور روسیوں کے مقابلے میں نہایت شجاعت سے لڑا تھا۔

سلیمان بک کا ارادہ تھا کہ اپنے بیٹے کو بھی فوجی تعلیم دلائے چنانچہ اُس نے مصطفٰے ندیم کو استنبول کے مکتبِ حربیہ میں داخل کرا دیا۔ ندیم نہایت وارستہ مزاج نوجوان تھا، شعر و شاعری کے ذوق نے اُسے بالکل بیکار بنا دیا تھا، چنانچہ وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا، پھر جب انجمنِ اتحاد و ترقی نے قومیت و وطنیت کا غلغلہ بلند کیا تو ندیم نے اس مجلس کی حمایت میں کئی مضامین لکھے، جو وقت اور ترجمان وغیرہ میں شائع ہوئے، اُن دنوں ترجمان میں اُس کی بعض نظمیں بھی شائع ہوئیں، جو وطنیت کے جذبات سے لبریز ہیں۔

ندیم ۱۹۰۳ء میں ہندوستان آیا۔ اور ۱۹۱۳ء میں ترکی واپس گیا، سر عبداللہ سہروردی کا بیان ہے کہ ندیم کو محبت میں سخت ناکامی ہوئی تھی، جس نے اُسے ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ بدقسمتی سے ہمیں اس واقعہ کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

ندیم نہایت پابندِ مذہب نوجوان تھا۔ ہندوستان کے متعلق اس نے بچپن سے سن رکھا تھا۔ کہ وہاں کے لوگ مذہب کے معاملے میں نہایت پختہ ہیں، اس کے علاوہ ہندوستان کی دولت کے افسانوں سے بھی اُس کے کان آشنا ہو چکے تھے،

چنانچہ اُس نے جب وطن چھوڑا، تو سیدھا ہندوستان کا رُخ کیا، کچھ دن بمبئی رہا، پھر حیدرآباد چلا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں کلکتہ آیا اور پورے آٹھ سال وہیں مقیم رہا۔

ندیم کی اردو غزلوں اور نظموں میں جو صفائی اور گھلاوٹ ہے، اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اس نے استنبول میں ہی اردو سیکھ لی ہوگی، سر عبداللہ سہروردی کا بیان ہے کہ ندیم کے پڑوس میں ایک ہندوستانی تاجر رہتا تھا جس نے کسی ترک خاتون سے شادی کر لی تھی، اور مستقل طور سے استنبول میں اقامت گزیں ہو گیا تھا، ندیم اکثر اس سے ملتا رہتا تھا، چنانچہ اس کی صحبت میں ندیم کو اردو کا ذوق پیدا ہو گیا، ذہین آدمی تھا، تھوڑے عرصے میں بے تکلف اردو میں بات چیت کرنے لگا۔ سر عبداللہ سہروردی سے ندیم کے نہایت دوستانہ تعلقات تھے، انہیں کی تحریک پر اُس نے "عہدِ نو" کے نام سے ایک نظم لکھی، جو عظیم آباد کے رسالہ ادیب میں شایع ہوئی، لیکن اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ نظم ایک ترک نوجوان کی طباعی کا نتیجہ ہے۔

۱۹۱۱ء میں علامہ سہروردی کے ہاں ایک مختصر بزم مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں شفق عماد پوری، صفی لکھنوی، وحشت کلکتوی وغیرہ شریک تھے۔ ندیم نے اس محفل میں ایک غزل پڑھی، جس کے تین شعر ہمیں یاد رہ گئے ہیں ؎

تھا حجاب کا اُٹھنا دشمنِ شکیبائی، ✣ طور پر ہوا کیا تھا پوچھ چشمِ موسیٰ سے

لو مریضِ اُلفت نے آج پھیر لیں آنکھیں ✣ تھک گئی نظر آخر انتظارِ فردا سے

عشق وہ ہے رگ رگ سے جس کا جوش ظاہر ✣ بادہ ہو اگر بادہ پھوٹ نکلے مینا سے

علامہ سہروردی پر ندیم کی صحبت کا بہت اثر پڑا۔ چنانچہ انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا، جو کچھ کہتے تھے، ندیم کے سوا کسی کو نہیں دکھاتے تھے، ندیم نے اُن کے کلام پر بعض نہایت برجستہ اصلاحیں دی ہیں، مثلاً علامہ سہروردی نے ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا ؎

ہماری آہ نے جب راہِ چرخِ ہفتمیں پکڑی ✣ سرشکِ دیدہ نے بھی کوئے قاتل کی زمیں پکڑی

ندیم نے کہا پہلا مصرع اچھا ہے، دوسرا مصرع بدلئے اور پہلے مصرع میں "ہماری آہ" کے بجائے "غبارِ آہ" کر دیجئے۔

ندیم کی اردو نظموں کا مجموعہ "سبدِ گل" کے نام سے ڈاکٹر سہروردی نے ۱۹۱۱ء میں شائع کیا تھا۔ جب ندیم کو معلوم ہوا۔ تو بہت جز بز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے پاسِ خاطر سے "سبدِ گل" کی فروخت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور جتنی کاپیاں چھپی تھیں، اب تک ڈاکٹر صاحب کے ہاں جوں کی توں پڑی ہیں۔

ندیم ۱۹۱۳ء میں اپنے وطن گیا۔ اور ۱۹۳۱ء میں جبکہ اُس کی عمر تقریباً پچپن سال کی ہوگی، انتقال کر گیا۔"

ندیم کے مفصل حالات کے لئے تو اُس کے سوانحِ حیات کا انتظار کیجئے جنہیں عبداللہ سہروردی عنقریب شایع

کر رہے ہیں، ہم یہاں اس کے چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جو ہمیں علامہ سہروردی کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں

راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی ؛ جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

خجل ہی سیکدہ تنا ہماری روسیاہی سے ؛ کہ ہر شیشہ نظر میں قطرۂ اشکِ ندامت ہے

آغاز میں ہستی کے اجل آگئی اے دل ؛ جو چیز موخر تھی مقدم نظر آئی

اے عندلیبِ باغِ جہاں ہیں تنگِ شمع ؛ گل بھی ہوا تو میں نہ ہوا آشنائے رنگ

وطن کی یاد دھر دیتی ہے اس کو لعل و گوہر سے ؛ ہماری چشمِ گریاں کشتیِ سوغات بنتی ہے

ہر شے میں تیرے نور کی تصویر کھنچ گئی ؛ سادہ پڑا ہے اک ورقِ آفتاب اور

اردو غزل میں ندیم کا کوئی خاص انداز نہیں بعض غزلیں داغ کے انداز میں ہیں بعض میں لکھنؤ کی شاعری کا تتبع ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے، افسوس ہے کہ ہمیں اس کی کوئی نظم دستیاب نہیں ہوسکی، ورنہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس نے کیسے کیسے اچھوتے موضوعوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ندیم کے فارسی کلام کا بھی تھوڑا سا نمونہ دیدیا جائے، اس نے رباعیاں خوب لکھی ہیں، ایک رباعی سنئے

ایں بادِ وزندہ مدِ آہے بودہ است ؛ از سینۂ زار دادخواہے بودہ است

ایں خار کہ ہست درچمن بود رقیب ؛ ایں غنچہ باغ کج کلاہے بودہ است

اے ساقی ماہ منظر و حور سرشت ؛ باشد دہنت کوثر و رخسار بہشت

برخیز و می از سبوئے درجام بریز ؛ زاں پیش کہ خاک من و تو گردد خشت

ندیم فارسی اشعار میں اکثر مقامات پر جدید فارسی شعرا کی طرح حرفِ صحیح بھی گرا دیتا ہے۔ فکِ اضافت کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں، لیکن اس کے اردو اشعار میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی فارسی میں اس کی ایک طویل غزل ہے جس کا مطلع ملاحظہ ہو

دوش درخواب شمے ہمدمِ دلدار شدم ؛ کاش می مردم ہماں لحظہ کہ بیدار شدم

دوسرے مصرع میں ہائے ہوّز گرا دی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ آج تک ندیم پر اردو زبان میں ایک مضمون بھی نہیں لکھا گیا، اردو کے جو تذکرے گذشتہ دس سالوں میں شائع ہوئے ہیں، ان میں بھی ندیم کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ حالانکہ ندیم اپنی شاعرانہ عظمت کے اعتبار سے بہت توجہ کا مستحق ہے۔

ندیم کا فارسی اور اردو کلام ڈاکٹر سہروردی کے پاس موجود ہے، اردو کلام کا ایک مجموعہ چھپا ہوا موجود ہے، امید ہے کہ ندیم کی موت کے بعد ڈاکٹر صاحب کو "بدگل" کی جلدیں فروخت کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔

نیرنگِ خیال

ایوانِ عدل

آسکر وائیلڈ کی ایک منثور نظم

ایوانِ عدل میں خاموشی طاری تھی اور ایک ننگا دھڑنگا انسان خدا کے حضور میں پیش ہوا۔

اور خدا نے انسان کے اعمال کی کتاب کھولی۔

اور خدا نے انسان سے کہا "تیری زندگی بُری تھی، تو نے اُن پر ظلم کیا جو بے کس تھے، اور جن کو مدد کی ضرورت تھی اُن سے تو نے تلخ مزاجی اور سخت دلی کا برتاؤ کیا غریبوں نے تجھ کو بلایا اور تو نہ بولا، اور تیرے کان میرے دکھی بندوں کی پکار پر بند ہوگئے، بے باپوں کے ورثے پر تو قابض ہوگیا اور ہمسائے کے تاکستانوں کی طرف تو نے لومڑیوں کو بھیجا، تو نے بچوں کی روٹی اٹھائی اور کتوں کے آگے ڈال دی، اور میرے کوڑھی بندے دلدلوں میں امن سے رہتے تھے اور میری حمد کرتے تھے تو نے انہیں پہاڑوں کی طرف نکال دیا، اور میری زمین پر جس سے میں نے تجھے بنایا تھا تو نے بیگناہوں کا خون بہایا؟"

اور انسان نے جواب دیا اور کہا "ہاں میں نے ایسا ہی کیا"۔

اور خدا نے پھر انسان کے اعمال کی کتاب کھولی۔

اور خدا نے انسان سے کہا۔ "تیری زندگی بُری تھی، تو حُسن کے جنون میں رہا جس کو میں نے ظاہر کیا اور نیکی کی تلاش نہ کی جس کو میں نے چھپایا۔ تیرے مکان کی دیواریں بتوں کی تصویروں سے سجی ہوئی تھیں اور تیرے ناپاک بستر میں سے ارغنوں کی آواز تجھے جگاتی تھی، جن گناہوں کو میں نے معاف کیا اُن کے لئے تو نے سات قتل گاہیں تعمیر کیں اور جن چیزوں کو میں نے حرام کیا اُن کو تو نے کھایا، اور تیری قبا کے ارغوانی رنگ پر تیرے گناہ کے تین نشان نمایاں تھے، تیرے بُت نہ سونے کے تھے نہ چاندی کے جو پائدار ہوتے بلکہ گوشت کے تھے جو مرجاتا ہے، تو ان کے بالوں میں خوشبوئیں لگاتا تھا اور انار اُن کے ہاتھوں میں دیتا تھا، تو اُن کے پاؤں میں زعفران لگاتا تھا اور قالین اُن کے آگے پھیلاتا تھا۔ تو سرمہ اُن کی آنکھوں میں لگاتا تھا اور مُر میں ان کے جسم بساتا تھا تو اپنا سر اُن کے آگے زمین پر جھکاتا تھا اور ان کا رتبہ آفتاب سے بڑھاتا تھا، تو اپنی رسوائی آفتاب کو دکھاتا تھا اور اپنا جنون چاند کے سامنے پیش کرتا تھا"

اور انسان نے جواب دیا اور کہا "ہاں" "میں نے ایسا ہی کیا"۔

اور خدا نے تیسری دفعہ انسان کے اعمال کی کتاب کھولی۔

اور خدا نے کہا تیری زندگی بُری تھی کہ بھلائی کے عوض تو نے بُرائی کی اور نیکی کے عوض بدی، جن ہاتھوں نے تجھے پالا تو نے ان کو زخمی کیا اور جن چھاتیوں کا تو نے دودھ پیا ان کی تو نے تحقیر کی، جو پانی لے کر تیرے پاس آیا وہ پیاسا ہو کر گیا، اور باغی لوگ جنہوں نے اپنے خیمے میں تجھے پناہ دی، صبح ہونے سے پہلے پہلے تو نے انہیں پکڑوا دیا، اور تیرا دشمن جس نے تجھے چھوڑ دیا تھا

تو نے گھات میں بیٹھ کر اُس کو زخم لگایا اور تیرا دوست جو تیرے ساتھ چلا تو نے اُسے روپے کے عوض فروخت کر دیا اور جنہوں نے تجھے محبت کا تحفہ دیا تو نے نفس پرستی اُن کے سامنے پیش کی۔"

اور انسان نے جواب دیا اور کہا۔ "ہاں میں نے ایسا ہی کیا۔"

اور خدا نے انسان کے اعمال کی کتاب بند کر دی۔ اور کہا "یقیناً میں تجھے جہنم میں بھیجوں گا ہاں میں تجھے جہنم میں بھیجوں گا۔"

اور انسان نے چلّا کر کہا، "تو ایسا نہیں کر سکتا۔"

اور خدا نے انسان سے کہا "میں کیوں ایسا نہیں کر سکتا اور اس کی کیا وجہ ہے؟"

انسان نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ میں ہمیشہ جہنم ہی میں رہا۔"

اور ایوانِ عدل میں خاموشی چھا گئی۔

اور تھوڑی دیر بعد خدا بولا، اور اس نے انسان سے کہا۔ "یہ دیکھ کر کہ میں تجھے جہنم میں نہیں بھیج سکتا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تجھے جنت میں بھیجوں ہاں میں تجھے جنت ہی میں بھیجوں گا۔"

اور انسان چلا کر بولا۔ "تو ایسا نہیں کر سکتا۔"

اور خدا نے انسان سے کہا "میں کیوں تجھے جنت میں نہیں بھیج سکتا اور اس کی کیا وجہ ہے؟"

انسان نے جواب دیا "اس لئے کہ کبھی اور کسی جگہ بھی میں اس کا تصور نہیں کر سکا۔"

اور ایوانِ عدل میں پھر خاموشی چھا گئی۔

کہیں جاتے ہوئے

(سید شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی)

پھر اس طرف رواں ہوں فسانہ لئے ہوئے — ماضی کا ہر نفس میں ترانہ لئے ہوئے

پھر گامزن ہوں میکدۂ دوش کی طرف — رفتار میں خمارِ شبانہ لئے ہوئے

پھر بزمِ رنگ و بو کی طرف مڑ رہا ہے دل — بے رنگ زندگی کا فسانہ لئے ہوئے

پھر جا رہا ہوں دورِ خرد آرمیدہ میں — بھولا ہوا جنوں کا زمانہ لئے ہوئے

کیا نارِ عشق ہے کہ اُدھر جا رہا ہوں جوش

باوصفِ فقر طبعِ شہانہ لئے ہوئے

(افسانہ)

مطبوعات

تجدید عمل - اس کتاب میں مذہب کی سائیکالوجی پر ایک مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہر مذہب اپنے زمانے اور قوم کے ضروریات کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کی اصلیت ان ضروریات کے بدلنے پر بجز نام کے اور کچھ نہیں رہ جاتی، اس بحث سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسی وجہ سے کوئی مذہب قومیت کو نہیں بدل سکتا، بلکہ قومیت خود مذہب کو اپنے رنگ میں ڈبو لیتی ہے، اس سلسلے میں بعض مثالیں بھی دی گئی ہیں، کتاب کی زبان اچھی ہے مصنف مرزا عسکری علی خان مجازی ہیں قیمت آٹھ آنے ہے، اور **گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو لاہور** سے مل سکتی ہے۔

ادبی دنیا - اپریل کا پرچہ ہمارے پیش نظر ہے، یہ رسالہ پہلے مولانا تاجور کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا اس کی ادارت سے عملاً دستکش ہو گئے ہیں اور اب اس کا انتظام و ادارت کلیتہً جناب منصور احمد صاحب سابق جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں کے ہاتھ میں ہے، صاحب موصوف نے جس خوبی اور تن دہی سے "ہمایوں" کی خدمات انجام دیں اس کا ایک زمانہ شاہد ہے، ان کے ادبی ذوق کو روشناس کرنے کی ضرورت نہیں "ہمایوں" میں ان کے گرانقدر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ ان کی کتاب "دنیا کے بہترین افسانے" نقادانِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے عزم و ہمت اور انتظامی قابلیت سے ادبی دنیا کو ہر طرح نہایت باقاعدہ رسالہ بنا دیں گے، موجودہ پرچے کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق بہت سی امیدیں ہو جاتی ہیں، سالانہ چندہ پانچ روپے چھ آنے دفتر **ادبی دنیا لاہور** سے منگوائیے۔

افسانہ - اس رسالے کا ابھی پہلا نمبر ہی شائع ہوا ہے اور ہم اس کے قابل مدیر جناب ملک محمد اسلم خان صاحب ایم اے (کینٹب) بیرسٹرایٹ لا کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی ادبی کوششوں کا یہ نقش اول ہی نہایت کامیاب ہے، رسالے کا مقصد ادب و افسانہ کا فروغ اور اس کے متعلق صحیح ذوق پیدا کرنا ہے، چنانچہ اس مقصد کے لئے نہ صرف اعلیٰ درجے کے افسانوں کا ترجمہ کیا جائیگا، بلکہ ملکی افسانہ نگاری کی حوصلہ افزائی بھی کی جائیگی، اس کے علاوہ افسانے کے موضوع پر تنقیدی مضامین شائع ہوا کریں گے، یہ مقاصد بہت بلند ہیں اور جیسا کہ پہلے نمبر ہی سے ظاہر ہوتا ہے ہمیں امید ہے کہ ملک صاحب اپنے فرائض سے بوجہ احسن عہدہ برا ہوں گے۔ چندہ سالانہ اعلیٰ کاغذ تین روپے، معمولی کاغذ دو روپے ہے، دفتر **افسانہ انارکلی لاہور** سے طلب فرمائیے۔

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل الیکٹرک پریس جیمبرلین روڈ میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ ۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴ - ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵ - خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶ - ہمایوں کی ضخامت کم از کم چوسٹھ صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے

۷ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جا
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸ - جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹ - قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۲؍ (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۱

۱۰ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱ - خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳ - لارنس روڈ لاہور